تذکرے

معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن باور فرمائیے کہ جو مشکلات تذکروں کی فراہمی میں مجھے پیش آئیں اُن کے خیال سے بھی اب روح پر گرانی محسوس ہوتی ہے۔ "آگرہ اسکول نمبر" یا "کاروان" کا حصۂ مضامین بھی ادبی حصہ کی طرح نظم و نثر مضامین کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔ میں تمام محترم مضمون نگار حضرات پر فرداً فرداً روشنی نہیں ڈال سکتا۔ مختصراً میں اُن تمام شعرا اور ادبا کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے "آگرہ اسکول" یا حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ پر مضامین لکھے ہیں۔ "آگرہ اسکول" پر اس کثرت سے مضامین وصول ہوئے ہیں کہ ابھی سَو صفحات اور بڑھائے جا سکتے تھے۔ میں اپنے معنوی بھائیوں اور حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے عزیز شاگردوں سے معافی خواہ ہوں کہ اُن کے مضامین اور نظمیں جو اُنھوں نے اپنے اُستادِ محترم کے متعلق عقیدتاً لکھی ہیں، شائع نہ کر سکا۔ مقصد یہ تھا کہ اس حصے کے تمام مضامین اور نظمیں غیر متعلق لوگوں کے نتائج افکار ہوں۔ اگر زیادہ اصرار ہوا تو نظمیں جون نمبر میں شائع کر دی جائیں گی۔ "آگرہ اسکول نمبر" پر جن حضرات نے مضامین لکھے ہیں۔ اُن میں سے بعض محترم مقالہ نگاروں نے ساتھ ہی ساتھ اپنے اختلاف کو بھی مضمون میں ظاہر کیا ہے۔ یہ چیز مجھے تنقید کی اقتبار سے بہت ہی پسند ہے، اختلافِ رائے میرے نزدیک بُری چیز نہیں، میں نے اپنی معلومات اور استعداد کے مطابق اُن اختلافات پر اپنی رائے بھی بطورِ حاشیہ ظاہر کر دی ہے۔ اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ اختلاف صحیح ہے یا خیال۔ اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

سالنامۂ "شاعر" پر محنت و وقت کے علاوہ کتنا روپیہ صرف ہوا ہے؟ اس کا اندازہ کچھ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اس قسم کے ذمہ دارانہ کاموں سے واقف ہیں۔ ابھی اخراجات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ لیکن بڑی بڑی رقموں کو ملانے کے بعد ایک ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ ہوتے ہیں جس میں تین سو پچاس روپیہ محصول کے شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ یہ وہ رقم ہے جس سے ایک اچھا ذاتی پریس یا ایک جائداد خریدی جا سکتی تھی۔ ایک دیوان شائع ہو سکتا تھا۔ لیکن بھلا ہو ذوقِ ادب کا کہ ہر ذوق پر غالب رہا۔ غریب "شاعر" نے اتنے روپیہ کا انتظام کس طرح کیا۔ اس کے ذکر سے میں ناظرین کا دماغ پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ کم از کم اپنے ایک دوست کیلئے ہر "شاعر" کا خریدار سالنامہ کی ایک کاپی منگا کر میری مشکلات میں حصہ گیر ہو۔

شکریہ میں سب سے پہلے اپنے محترم عزیز محمد خلیل صاحب سائرؔ صدیقی اکبرآبادی مالک رفاہِ عام پریس آگرہ کا انتہائی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے "شاعر" کو مسلسل انہماک کے ساتھ وقت پر چھاپ دیا۔ "شاعر" کی طباعت اتنی کم مدت میں ہوئی ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اُنکی پیہم اور دن رات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ شاعر باعتبارِ طباعت اپنا جواب آپ ہے۔ تمام تصاویر، ٹائٹل، رنگین نظمیں اور سادہ طباعت رفاہ عام پریس ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے علاوہ میں سائرؔ صاحب کے شریک کار جناب عبد الحمید صاحب کوثرؔ اکبرآبادی کا بھی ممنون ہوں۔

اس کے بعد میرے شکریے کے مستحق عزیزی میاں سجاد حسین صدیقی سلمہٗ ناظم شاعر ہیں۔ خدا اُنکی عمر میں ترقی عطا فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام بالائی انتظامات، ظاہری زیبائش اور کاپیوں وغیرہ کی ترتیب کا اہتمام انہی کی انتھک مساعی سے ہوا ہے۔ علاوہ ازیں میں ان دیگر حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی صورت سے مجھے مدد پہونچائی۔

آگرہ اسکول نمبر کی اشاعت میں نذیر احمد صاحب نذیرؔ بنیشر کوٹی، رفیع احمد صاحب صبا متھرادی، سید اشفاق حسین صاحب کوثرؔ نقوی، عبد الحمید صاحب برقؔ صدیقی فتحپوری، کرتا رناتھ صاحب شفقؔ صحرائی سیالکوٹی، پیر احمد صدیق شاہ صاحب فاتحؔ لکھنوی اور ہدایت اللہ خاں صاحب شجرؔ کوٹی نے میری بطورِ خاص اعانت فرمائی جس کا میں بدل ممنون ہوں۔ ان کے علاوہ میرے تمام معنوی بھائیوں نے اور محترم خریدارانِ شاعر نے بھی بہت کچھ اپنی اعانت سے میرا بار ہلکا کیا ہے میں اُن کا اور محترمی حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہجہانپوری کا انتہائی شکر گذار ہوں اور اُن سب سے جنھیں میری ادبی خدمات سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے "سالنامۂ شاعر" کی ترقیِ اشاعت کی درخواست کرتا ہوں۔

دارفتۂ ادب
اعجاز صدیقی

پردۂ مجاز

از ——— حضرت مولانا کیفؔ قدوسی گنگوہی

جبیں و سجدہ میں باقی نہ امتیاز رہے
جو سنگِ در پہ کسی کا سرِ نیاز رہے

مری طرف یونہی وہ چشمِ دلنواز رہے
خدا کرے کہ مرے دل کا راز راز رہے

نگاہِ شوق دکھا دے مجھے حقیقتِ حسن
کہ درمیاں میں نہ یہ پردۂ مجاز رہے

ہمارا ذوقِ طلب کتنا کیف ساماں ہے
ہے آرزو یہی دل کی وہ بے نیاز رہے

ترے مریض کی وہ حالتیں معاذ اللہ
کہ چارہ ساز بھی محتاجِ چارہ ساز رہے

خوشا نصیب وہ پیدا ہو رنگ یکجہتی
کہ مجھ میں اور کسی میں نہ امتیاز رہے

نیاز و ناز میں اک ربطِ خاص پیدا ہو
نظر میں اُس کی جو اندازۂ نیاز رہے

پلائے ساغرِ صہبا جو بے طلب ساقی
وہ پاکباز نہیں ہے جو پاکباز رہے

وہ بے نیاز ہی رہتے ہیں کیفؔ اگر تو رہیں
مرا نیازِ محبت شریکِ ناز رہے

اشتراکی شاعری

از ـــــ حضرت سعادت حسن منٹو

انقلاب کے زمانے میں روس کے وسیع و عریض سینے پر کروڑوں مزدور سرمایہ دارانہ نظام کو پاش پاش اور غلامی کے بندھن توڑنے کے لئے سرگرم عمل تھے، وہ ایک ایسے اشتراکی نظام کی بنیادیں قائم کرنے کے درپے تھے جس کی فضا میں غلام اور آقا کا امتیاز مٹ جائے اور جس میں انسانیت کا پودا پھول پھل سکے۔ جیسا کہ ایک روسی مقالہ نگار بیان کرتا ہے "ان دنوں زندگی روس کے بازاروں، چوکوں اور جنگ کے میدانوں میں سمٹ کر چلی آئی تھی" اس زندگی نے اپنے ہنگامی بطن سے ایک ایسی شاعری کو جنم دیا جس کا خطاب لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے ہجوم کی طرف تھا۔

شاعر ولادی میٹر مایا کوسکی کا حکم تھا کہ "تمام مستقبل پرست، خواب دیکھنے والے دلفریب، اور شاعر، گھروں سے باہر نکل آئیں"۔

جس طرح بالشویکوں اور سوویٹ یونین کے محنت کش لوگوں کی مسلسل اور انتھک کوششوں سے کارل مارکس اور لینن کے آتشیں افکار نے ملوکیت اور نظام کہن کے خس و خاشاک کو آگ لگا کر خاکستر بنا دیا اور اس خاکستر کی کھاد بنا کر سماج کی کھیتی میں نئے درخت لگائے، ٹھیک اسی طرح شعلہ نفس شاعروں اور ادیبوں نے فرسودہ لٹریچر کو جلا کر ایک نئے ادب کو تخلیق کیا ہے۔

سوویٹ ادبا نے اپنے ملک کی اشتراکی تشکیل میں بیش از بیش حصہ لیا ہے اور انسانی ارواح کو بیدار کرنے کے لئے وہ وہ کام انجام دئے ہیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ قدیم اور فرسودہ تخیل کی عمارت ڈھا کر نئی دیواریں کھڑی کرنا سوویٹ روس کے انشا پردازوں کا کام ہے جس کو انہوں نے بڑی سلیقے سے انجام دیا۔

دی لگودسکی، اشتمالی شاعر کے مندرجہ ذیل اشعار روس کی اشتراکی شاعری کے دیباچے کا کام دیتے ہیں ؎

میری شاعری! میری شاعری
لڑائی کے میدان میں مارنے اور جلا دینے کیلئے ہو
زندگی کی مضبوط کلیت ہٹا کر
اس کے حقیقی معانی فاش کرنے کیلئے ہے۔
حوادث و واقعات کے اسرار میں اصرار کرکے
بہرے کو سماعت اور گونگے کو گویائی عطا کرنا چاہتی ہے
کہ وہ قدرت کے قوانین جان سکیں

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سوویٹ روس کی اشتراکی شاعری اس منزل کے قریب پہونچ گئی ہے جو اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ ہم یہ چاہتے ہیں ہم وہ چاہتے ہیں ـــ روس کی طرف سے ہوا کے جھونکے یہی شور ہمارے کانوں تک پہونچاتے ہیں اور اس شور کو سنکر ہم یہی نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ جو کچھ وہ لوگ چاہتے ہیں اُن کو مل جائے گا۔ روس کی اشتراکی شاعری ابھی تک اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہے اور وہ دن قریب ہے جب لینن کے الفاظ میں روس کی موجودہ شاعری اور اس کا موجودہ ادب "انسانیت کے صناعانہ ارتقا میں ایک نیا اسٹیج" قائم کرنے کا موجب ہوگا۔

سوویٹ روس میں اب نئی پود بوڑھے شاعروں کی مدد کے لئے آگے بڑھ رہی ہے۔ اشتراکیت کے نوجوان علمبرداروں کی آواز سوویٹ شاعری پر

اب روز بروز زیادہ اثر کرتی جا رہی ہے چھاپہ خانے کا ایک مزدور، یاروسلاو سملیاکوف ان دنوں سوویٹ روس کا بہت بڑا شاعر ہے۔ اُسے جدید شاعری کی تکنک میں دستگاہِ وافی حاصل ہے اُس کا شاعرانہ پروگرام یہ ہے۔

ــــ میں اپنی تصانیف میں
جوانی کی حرارت
اور صناع کے فن کو سمو دینا چاہتا ہوں۔

سرمایہ پرست سوسائٹی اس امر کی مدعی رہی ہے کہ مزدوری پیشہ جماعت میں تخلیقی قوت نہیں ہوتی اس لئے آرٹ کلچر، لٹریچر اور تکنک کے میدان میں وہ ہمیشہ ناکام رہیگی، لیکن روس کی موجودہ حیرت خیز ترقیوں کو دیکھنے کے بعد یہ دعویٰ باطل ثابت ہو جاتا ہے کہ مزدوری پیشہ جماعت نقش کہن مٹانے کے ساتھ ساتھ نئے نقش بھی پیدا کر سکتی ہے جب انکولائی تخونوف کی زبان میں

ــــ آگ، دار ورسن، گولیوں اور کلہاڑیوں نے
غلاموں کی طرح ہمارے آگے سر جھکا دئے
اور ہمارے پیچھے پیچھے چلی آئیں
ہر بوند میں ایک طوفان سو رہا تھا۔
کنکریوں کی بڑی بڑی چٹانیں بن گئیں،
اور ہر وہ شاخ جو پاؤں کے نیچے روندی گئی تھی
ایک شورانگیز جنگل بن گئی
سکوں کی قدر و قیمت اور اُن کی کھنکھناہٹ غائب ہو گئی۔
لاشیں بچوں کے دلوں میں ڈر پیدا نہ کر سکیں

اس وقت ہیں خوبصورت، تلخ اور درشت الفاظ معلوم ہوئے تو سرمایہ داروں کے اُس دعوے کی بنیادیں ہل گئیں۔ وہ "خوبصورت تلخ اور درشت الفاظ کیا تھے جو انہیں معلوم ہوئے؟" ــــ یہ کہ "نگاہ کی ہر جنبش میں ایک ستارہ چمکتا ہے اور "مکان" (Space) ہر قدم پر وسیع ہوتا ہے۔

ان دنوں شاعری کی طرف لوگوں کا رجحان کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ دن گذر گئے ہیں جب گوئٹے، ماٹنے، ہیوگو، غالب اور میر کے کلام پر لوگ سر دھنتے تھے۔ حال سے ماضی کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں کا کلام نسبتاً بہت کم مطالعہ میں آتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ــــ کیا یہ انقلاب کی معرکہ آرائیوں کا باعث ہے؟ ــــ ہاں ایک حد تک انقلاب کی معرکہ آرائیوں کو اس رجحان کی تبدیلی میں دخل ہے مگر اصلی وجہ کیلئے ہمیں اور زیادہ گہرائیوں میں جستجو کرنی چاہیئے۔ اصل باعث جدید سرمایہ دارانہ زندگی کے فقدانِ اتحاد میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اتحادِ شعور، اور حقیقت کے متعلق لوگوں کا اتحادِ تصور سوویٹ شاعری کیلئے اجنبی ہے۔ سوویٹ روس میں شاعری زندگی سے الگ تھلگ نہیں ہے۔ وہاں شاعری زندگی کا عضوی (Organic) تسلسل ہے زندگی کا ایک جزو ہے۔ سوویٹ روس میں شعر کی ضرورت عوام کو ہے اشتراکیت کے زیر سایہ بسنے والے عوام کو ہے، اس لئے کہ یہ اُن کے خیالات و محسوسات کو تازگی بخشتی ہے، انہیں تعلیم دیتی ہے اور اُن کو پاک و صاف بناتی ہے۔ سوویٹ روس میں شاعر ایسا "خود پسند گوشہ نشین" نہیں ہے جو انفرادی افکار کی دم گھونٹنے والی فضا میں زندگی بسر کر رہا ہو ــــ وہ انسانیت کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا پیغامبر ہے۔

یو، ایس، ایس، آر میں مزدوری پیشہ جماعت نے ایسے نئے ادیب، شاعر اور فلسفی پیدا کئے ہیں، جنھوں نے ایک نئے لٹریچر کی بنیاد ڈالی ہے، ایسے لٹریچر کی جو ہزار ہا پہلو رکھتا ہے اور جس کے اندر جملہ خوبیاں موجود ہیں۔ پُرانے روس یعنی سرمایہ دارانہ نظام کی موجودگی میں ادب حاکم جماعتوں کی (Ideology) کا اظہار ہے۔ اس میں یاس و قنوط کروٹیں لیتا ہے، اس کے علاوہ حزن و ملال، یاس

ونا امیدی اور بیکسی و ناچاری کی تصویر پیش کرتا ہے ۔ انقلاب سے پہلے ادیب زندگی پر کوئی ایمان نہیں رکھتے تھے ، چنانچہ الگزنڈر بلوک اپنے اشعار میں اس بات کا شکوہ کرتا ہے کہ " وہ بیس سال کی عمر میں ایک رنگین لاش تھا " ۔ اصلیت اور زندہ جذبات کے بجائے لٹریچر کا رجحان مصنوعی محسوسات کی طرف تھا اور ایک ایسی چھوٹی سی دنیا میں آباد تھا جس میں انشاپرداز زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کو فراموش کرنے کی سعی کرتی تھی ۔ مگر اب حالات بالکل تبدیل ہو چکے ہیں ۔ حزن و ملال کی جگہ امید و رجا نے لے لی ہے ۔ قنوطیت ، رجائیت کا رنگ اختیار کر گئی ہے اور اب سوویٹ لٹریچر کی زندگی تمام تر تازگیوں اور شوخیوں سے لبریز ہوتی ہے ۔ سوویٹ ادب دنیا کے المناک سے المناک مسئلے کا حل رجائیت کی روشنی میں پیش کرتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوویٹ ادب اور شاعری میں موت اور اس کی ہیبتوں کا اقرار موجود ہے مگر کشاکشِ زیست میں روح کی پرواز اور انسانیت کے لئے مسرت مہیا کرنے کی کوشش میں زندگی کا خاتمہ سوویٹ لٹریچر میں زندگی کی تصدیق کا مظہر ہے ۔

سوویٹ ادبا و شعرا کے پیشِ نظر یہ چیز ہے کہ وہ اشتراکی نظام کے مسائل کو صناعانہ طریق پر حل کریں اور اس طرح اپنے ادب کو غایت درجہ حقیقی بنا دیں ۔ انفرادیت کی طرف سوویٹ روس کے ادیب بہت کم توجہ دیتے ہیں ۔ ان کی حقیقت پسندی اور ان کے اشعار جو جماعتی فضا میں پیش کئے جاتے ہیں ، افراد کی ان سرگرمیوں کی تصویر کشی کرتے ہیں جو تاریخی تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں ۔ سوویٹ ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے انہی کو نئی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔

سوویٹ لٹریچر جو اشتراکیت کی تعمیر و تاسیس کا رفیع الشان تخیل پیش کرتا ہے ، اسی بنا پر لاکھوں اور کروروں مزدوری پیشہ افراد کو اپنے دامِ الفت میں گرفتار کر چکا ہے اور سچ پوچھئے تو وہ اس چیز کا استحقاق بھی رکھتا ہے ، اس لئے کہ سوویٹ ادب ناکارہ اور کاہل الوجود لوگوں کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا لٹریچر ہے جو ملک و قوم کے اشتراکی نظام کی ترفیع چاہتا ہے ۔

سوویٹ روس کے ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کا یہ خیال بالکل باطل ہے کہ " جب گولے برستے ہیں تو تخیل خاموش ہو جاتا ہے " ۔ ——— ارضِ احمر کے سُرخ قلموں کی ہر جنبش اس یقین پر خطِ تنسیخ کھینچتی ہے ۔

* * *

رباعی

ظاہر کو جلا کے تو وہ خاک تو ہے
پوشیدہ تجلیوں کا ادراک تو ہے
باطن میں ہی آراستہ اک بزمِ جہاں
پیراہنِ زندگی ابھی چاک تو ہے

حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ

انیسویں صدی کا پیغمبرِ ادب

از ——— حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی مدظلہ

یہ نظم فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور کی برسی پر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے قبلہ حضرت مولانا مدظلہ نے براڈ کاسٹ کی تھی۔ نظم کی قبولیت اس سے ظاہر ہے کہ اقطاع و جوانب ملک سے ابتک سیکڑوں درخواستیں اس کی نقل کی آچکی ہیں۔ خدا کرے یہ نظم ان تمام حضرات کی نگاہ تک پہونچ جائے جنکی سماعت اس سے متاثر ہو چکی ہے۔

ایڈیٹر

(۱)

خلط مبحث تک جب آجاتی ہے دنیائے ادب
خم بہ خم ہوتا ہے جب گیسوئے لیلائے ادب

ڈھیلے ڈھیلے جب بگڑ جاتی ہے ہیئت شعر کی
سست پڑجاتی ہے جب نبضِ لطافت شعر کی

خشک ہو جاتے ہیں جب کوثر کدے تخیئل کے
بادہ باری جب تھکا دیتی ہے پر جبریلؑ کے

جب سکڑ جاتی ہیں ذہن و فکر کی پہنائیاں
جب تخیئل لے نہیں سکتا نئی انگڑائیاں

جب عروسِ حسن کا بے نور ہوتا ہے لباس
جب نگاہِ جلوہ خواہِ عشق ہوتی ہے اداس

جب تصور میں نہیں اٹھتی نئی کوئی امنگ
جب غبار آلودہ ہو جاتا ہے تصویروں کا رنگ

جب تراشِ نو سے تھک جاتا ہے ذہنِ بت تراش
نقش جب پیدا نہیں کرتی مصور کی تلاش

بتکدوں میں برہمن ہوتے ہیں جب مجبورِ خواب
جب حریمِ کعبہ ہوتا ہے حجاب اندر حجاب

فکرِ شاعر سے نیا جب شعر ڈھل سکتا نہیں
شعر سے جب کام جادو کا نکل سکتا نہیں

جب زبان گنگ، اور سازِ نطق ہوتا ہے خموش
جب نہیں رہتا تکلم کی مئے کہنہ میں جوش

جب نظر آتے ہیں دھندلے آئینے جذبات کے
صبح پر جب سائے ہوتے ہیں اندھیری رات کے

کارواں ہوتے ہیں جب مایوسِ آوازِ درا
جب نہیں ملتا حدی خوانِ طریقِ ارتقا

روح جب سوزِ نوا سے آشنا رہتی نہیں
بربطِ انسانیت میں جب صدا رہتی نہیں

سنا اک مجدّد فطرتاً اٹھتا ہے بطنِ خاک سے
ایک سورج مسکراتا ہے خس وخاشاک سے

(۲)

خلقتاً ملتا ہے اسکو منصبِ پیغمبری
روح میں پاتا ہے وہ الہام کی جلوہ گری

گونجتی ہے اُس کے سازِ دل میں فطرت کی نوا
ہر نفس اس کا بشارت، وحی اسکی ہر صدا

دل ہلا دیتا ہے وہ نطقِ مہیب انداز سے
ساری دنیا کو جگا دیتا ہے اک آواز سے

شعر کو کرتا ہے اک پیراہنِ تازہ عطا
ذوق کی افسردگی کو قوتِ نشو و نما،

اک شرابِ تند جامِ نو میں بھر دیتا ہے وہ
کل کو پھر نشہ سے مخمور کر دیتا ہے وہ

زاویے ترتیب دیتا ہے نئی تخئیل کے
لفظ لکھتا ہے نئے، اوراقِ پارینہ چھیل کے

بخشتا ہے حسن کو اپنی جوانی سے سہاگ
عشق کی فطرت میں بھڑکاتا ہے عالم سوز آگ

ایک موزوں خود روی ہوتی ہے اسکے عزم میں
وہ امیرِ کارواں بنتا ہے رزم و بزم میں

وہ مصوّر کو سکھاتا ہے توازن رنگ کا،
رُخ بنا دیتا ہے بت گر کو مزاجِ سنگ کا

بتکدوں میں وہ پہنچتا ہے بھجن گاتا ہوا
برہمن کی غفلتوں پر طعن فرماتا ہوا،

روحِ کعبہ کو اذاں دے کر جگا دیتا ہے وہ
اک نظر سے عرش کے پردے اٹھا دیتا ہے وہ

آگ برساتا ہے اپنی گرمیٔ جذبات سے
شعلۂ و شبنم بناتا ہے اندھیری رات سے

فکرِ روشن سے بنا کر ماہتاب و آفتاب
صبح و شامِ بزمِ ہستی سے الٹتا ہے نقاب

زندگی کا نور بھر کر شعلۂ آواز میں
پھونکتا ہے روحِ نو انسانیت کے ساز میں

(۳)

اے فصیح الملک اے پیغمبرِ ملکِ سخن!
آفتابِ شامِ دہلی نیّرِ صبحِ دکن،

اے جہاں استاد اے فخرِ ادیبانِ وطن!
طالعِ بیدارِ دہلی، خوابِ شبہائے وطن

بلبلِ ہندوستاں، اے موجِ گلبانگِ وطن!
شاعرِ دہلی نژاد، آسودۂ خاکِ دکن

مدتوں کے بعد پھر دہلی کو یاد آئی تری
آج پھر گونجی ترے مولد میں شہنائی تری

یہ نہ باور کر کہ دنیا بھول سکتی ہے تجھے
زندگی محفلِ اقوام میں نغمے ترے

لمحے لمحے پر ترا چرچا ادب گاہوں میں ہے
ذکر تیرا عمکدوں میں ہے طربگاہوں میں ہے

گائی جاتی ہے حسینوں میں ابھی تیری غزل
ہے جہانِ رنگ و بو اب بھی ترے زیرِ عمل

دنگ ہیں اب بھی سخن تیرا سخنداں دیکھ کر
لوگ بن جاتے ہیں شاعر تیرے دیواں دیکھ کر

حُسن کی خلوت میں ہے تو عشق کی محفل میں ہے
تو بقول اپنے درخشاں عاشقوں کے دل میں ہے

کس ہمہ گیری سے تکمیلِ فصاحت تو نے کی
دل میں گھر کر کے زباں پر بادشاہت تو نے کی

تو نمایاں ہے ہر اک اسلوب، ہر آہنگ سے
رنگ جتنے ہیں وہ ہیں ماخوذ تیرے رنگ سے

قائد و صدر الصدورِ محفلِ ایجاد ہیں
آج دنیا میں ترے شاگرد سب استاد ہیں

تیری ٹکسالی زباں کو دخل ہے اشعار میں
تیرا سکہ آج بھی جاری ہے ہر بازار میں

یہ ترے فیضان کا سینچا ہوا اک باغ ہے
جنّتِ شعر و ادب پر ثبت مُہرِ داغ ہے

(۴)

اے زباں دانوں کے مرشد نکتہ دانوں کی امام
نام سے باقی ہے تیرے مرکزِ دہلی کا نام

قلعۂ شاہی کو اب تک شعر تیرے یاد ہیں
ہر کھنڈر کے دل میں تیری محفلیں آباد ہیں

نقش تیرا صفحۂ عالم مٹا سکتا نہیں
تجھ کو ہندوستان صدیوں تک بھلا سکتا نہیں

کون کہتا ہے کہ یہ گلشن ہے خالی داغ سے
ہاں نشیمن ہے بلندی پر ترا اس باغ سے

پہلے سرخوش تھی زمیں اب آسماں محظوظ ہے
چاند کے دل میں تخلص بھی ترا محفوظ ہے

اب بھی ہے تصویر تیری ہر حجابِ ذہن میں
شعر بن کر چھپ گیا ہے تو نقابِ ذہن میں

حشر کے دن اپنی بزمِ خواب سے پُر التہاب
تو جو نکلے گا تو نکلے گا دکن سے آفتاب

شعریت انگیز اگر الفاظ ہوگا حشر کا
تیرے اس مطلع سے مطلع صاف ہوگا حشر کا

”تنگ ہے دل وسعتِ دامانِ محشر دیکھ کر“
”اے جنوں ہم پاؤں پھیلاتے ہیں چادر دیکھ کر“

زندگی، موت، اور بعد الموت کے اے ترجماں
تیرا ہر اک شعر ہے تیری حیاتِ جاوداں

بولتا ہے شاعروں کے سازِ جاں پر ورمیں تو
جلوہ گر ہے شاعری کے معنوی پیکر میں تو

ہیں تجلی بار تیرے ماہتاب و آفتاب
صبحِ مشرق کی جوانی، شامِ مشرق کا شباب

تیرے ایواں پر رہیگی ”شاعری“ صرفِ سجود
”اور زباں“ پڑھتی رہے گی تا ابد تجھ پر درود

بارشِ رحمت ترے آغاز اور انجام پر
خطبۂ شعر و ادب ہے ختم تیرے نام پر

اچھوت

ایک ایکٹ کا مختصر ڈراما

از ——— جناب مرزا ادیب بی اے، مدیر "ادب لطیف"

منظر

ایک مختصر سا غریبانہ کمرہ۔ کمرے کی جنوبی دیوار میں دروازہ ہے۔ دروازے کے بعد چند چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں ہیں اور پھر گلی ہے۔ شمالی دیوار میں دو کھڑکیاں ہیں جو بازار میں کھلتی ہیں۔ مشرقی دیوار میں بھی ایک دروازہ ہے جو ایک کوٹھری میں کھلتا ہے۔ یہ کوٹھری نانی کی خوابگاہ ہے۔ کمرے کی ہر ایک چیز سے اہل خانہ کی ناداری اور مفلسی ٹپک رہی ہے۔ آدھا کمرہ تو دو بڑی اور ایک چھوٹی چارپائی نے روک رکھا ہے۔ جو مغربی اور شمالی دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی ہے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ٹوٹا ہوا چرخا لٹک رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک پرانی چھتری نظر آ رہی ہے۔ دروازے کی دائیں طرف، جنوبی دیوار کے پاس چولھا ہے جس میں آگ سرد ہو چکی ہے۔

اس وقت شام کا وقت ہے۔ چولھے کے پاس دیوار کے ساتھ ایک ٹین کا چراغ جل رہا ہے جس کی مدھم لو دیوار کی سیاہی میں اضافہ کر رہی ہے۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ مینہ کا پانی ایک طرف کی دیوار کے شگافوں میں سے ٹپک ٹپک کر کمرے میں بہہ رہا ہے۔ چولھے کے پاس ایک فرسودہ مونڈھے پر شامو بیٹھی ہوئی ایک پرانی جراب ادھیڑ رہی ہے، ایک چارپائی پر رامو گڑیا کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ دوسری چارپائی پر رتن شیشے کی گولیاں گن گن کر ٹین کے ایک ڈبے میں ڈال رہی ہے۔ شامو منتظرانہ دروازے کو دیکھتی ہے اور پھر آہ بھر کر نگاہیں جراب پر گاڑ دیتی ہے، رتن چارپائی سے نیچے اترتا ہے۔ آہستہ آہستہ چل کر دروازے کے پاس پہنچتا ہے۔ اسے کھول کر باہر دیکھتا ہے۔ شامو اسے حسرت انگیز نگاہوں سے دیکھتی ہے۔

شامو۔ بند کر دے دروازہ رتن! ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔

رتن۔ بڑی بھوک لگی ہے ماتا! وہ تو ابھی تک نہیں آئے!

شامو۔ وہ آ ہی رہے ہیں لا

رتن۔ دوپہر سے کہہ رہی ہو وہ آ ہی رہے ہیں، وہ آ ہی رہے ہیں۔

شامو۔ دروازہ تو بند کر دے لا

رتن۔ (دروازے میں سے دوبارہ جھانک کر، اور پھر اسے مایوسانہ بند کرتے ہوئے) معلوم نہیں کہاں جا کر بیٹھ رہے ہیں۔ انہیں ہماری بھوک کی کیا پروا ہے؟

رامو۔ (چارپائی سے) پتاجی! کہاں چلے گئے ہیں؟
شامو۔ وہ ابھی آجائیں گے۔ اور تمہارے لئے مٹھائی لائیں گے۔
رامو۔ (چارپائی سے اُٹھ کر) کتنی مٹھائی!
شامو۔ جتنی تم کھا سکو!
رامو۔ میں تو تمام کھاؤں گی۔ صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔
شامو۔ بیشک جی بھر کر کھا لینا۔
رامو۔ دیکھو نا ماتاجی! پرسوں دو جلیبیاں، لیلا کے پتا نے مجھے دی تھیں ان میں سے ایک رتن نے چھین لی۔ میں مٹھائی میں سے رتن کو کچھ بھی نہیں دوں گی۔
شامو۔ رتن بڑا خراب لڑکا ہے۔
رتن۔ تو ماتاجی میں بھوکا ہی رہوں گا۔
شامو۔ (آہ بھر کر) میرے لال تم کیوں بھوکے رہو —— بھوکے رہیں تمہارے دشمن۔
(رتن دروازہ سے ہٹ جاتا ہے۔ نانی آتی ہے)
نانی۔ جیون آیا۔
رامو۔ کوئی نہیں نانی!
نانی۔ کیوں نہیں آیا! اب تک تو اُسے آجانا چاہیئے تھا۔
شامو۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔
نانی۔ پرماتما رحم کرے۔ جیون لاپرواہ آدمی تو نہیں۔ ابھی آجائیگا!
شامو۔ کہہ کر تو گئے تھے کہ میں دوپہر تک ضرور آجاؤں گا۔ اور اب رات ہوگئی ہے۔ (دھاگا ایک طرف ٹوکری میں ڈالدیتی ہے) بچوں کا کیا حال ہوگا۔
نانی۔ ان ظالموں پر پرماتما کی مار ہو جنہوں نے کارخانے میں ہڑتال کرادی۔
شامو۔ رتن کے پتاجی تو کہتے تھے کہ ہڑتال کرانے والے ٹھیک کام کررہے ہیں۔

نانی۔ جیون تو پگلا ہے۔ اتنا نہیں سوچتا اگر ہڑتال نہ ہوتی تو یہ مصیبت کیوں آتی؟
شامو۔ ہم کیا جانیں (دوسری جراب اٹھاتی ہے اور اسے ادھیڑنے لگتی ہے)
رامو۔ نانی!
نانی۔ کیوں رامو!
رامو۔ بڑی بھوک لگی ہے۔
نانی۔ بھوک کیوں نہ لگے۔ صبح سے کھایا کیا ہے؟
شامو۔ ہماری تو کوئی بات نہیں، بچوں کی حالت نہیں دیکھی جاتی! (اسکی آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں، اور وہ منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے)
نانی۔ وہ آجائے گا۔ (دونوں بچوں کو پیار سے دیکھتے ہوئے) رامو اور رتن کے لئے پوریاں لائے گا۔ حلوہ لائے گا مٹھائی۔
رتن۔ (نانی کے الفاظ کاٹ کر) کب نانی؟
نانی۔ ابھی دیکھ لینا۔ جب تک وہ آئے میں تمہیں بڑی اچھی کہانی سناتی ہوں۔
رتن۔ مجھے بھوک لگی ہے۔
نانی۔ نہیں سنتے تو نہ سنو (شامو سے) گھر میں اور کچھ بھی نہیں؟
شامو۔ کچھ ہوتا تو اب تک انہیں بھوکا کیوں رکھتی۔ کسی دیگچی میں تھوڑا سا گڑ ہے اور کچھ بھی نہیں!
نانی۔ تو میٹھے چاول ضرور پکانا۔ میری رامو میٹھے چاول بہت پسند کرتی ہے۔ ہیں نا رامو؟
(رامو خاموش رہتی ہے۔ شامو کے ماتھے پر تیوریاں پڑجاتی ہیں۔ نانی اپنی کوٹھری میں چلی جاتی ہے۔ شامو جراب ادھیڑنے میں مشغول ہوجاتی ہے۔ کمرے کے کونے سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آتی ہے۔ شامو اس طرف دیکھتی ہے۔ رتن کے ہاتھ میں گڑ کی ایک ڈلی ہے ایک دیگچی زمین پر گری ہوئی ہے)

شامو - کیا کر رہے ہو وہاں رتن!

رامو - رتن نے گڑ نکالا ہے - (رتن سے) مجھے بھی دو -!

(رتن گڑ لیکر ہاتھ میں وہیں کھڑا رہتا ہے)

شامو - کان میں بھنک تو پڑ گئی کہ گھر میں گڑ ہے - بس چیزوں کی تلاشی لینی شروع کر دی!

رتن - بڑی بھوک لگی ہے ماتاجی!

شامو - دیگچی اٹھا کر رکھ دے -

رامو - (رتن کے پاس آکر، ڈلی کو آرزو انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) ماتاجی! رتن سے کہو مجھے بھی دے -

شامو - گڑ کیا کھاؤ گے تمہارے پتا ابھی حلوہ، پوریاں اور مٹھائی لائیں گے!

(دونوں چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں - اور ڈلی آپس میں تقسیم کرنے لگتے ہیں - چند منٹ گزر جاتے ہیں - یکایک کمرے کی فضا میں رونے کی ہلکی سی آواز آتی ہے - شامو بچوں کو دیکھتی ہے)

رتن - ماتاجی!

شامو - کیا ہے؟ کون رو رہا ہے؟؟

رتن - رامو رو رہی ہے ماتاجی!

شامو - کیوں؟

رتن - کہتی ہے مجھے بہت بھوک لگی ہے -

شامو (بھوک ٹھنڈی آہ بھرتی ہے، اٹھ کر چارپائی پر جاتی ہے بچی کو گود میں اٹھا لیتی ہے) میری رامو کیوں روئے؟ ابھی ذرا بھی کی تو لمبا کر کے) پتاجی آ سکے!

نانی - (ضد سے) رامو روتی ہے؟

شامو - ہاں بھوک کے مارے بچوں کا برا حال ہے -

نانی - رامو! تمہارے پتاجی ابھی آئے - اندر آؤ نا میں تمہیں بڑی مزے دار کہانی سناؤں -

شامو - (جھنجلا کر) کہانی کیا سنے - بیچاری کو بھوک لگی ہے -

نانی - کیا کیا جائے! بچوں کو پیار دلاسا دو

شامو - پیار دلاسے سے کیا ہوتا ہے -

(دروازہ کھلتا ہے - جیون، جس کے چہرے سے حسرت و مایوسی ٹپک رہی ہے - اور جس کا لباس پانی میں شرابور ہے، اندر داخل ہوتا ہے)

رتن - پتاجی آ گئے!

(شامو، جیون کے خالی ہاتھ دیکھ کر مایوس ہو جاتی ہے رامو اپنے باپ سے لپٹ جاتی ہے -

رامو - پوریاں، حلوہ لائے؟

نانی - ہمارا نہیں تو ان بچوں کا خیال تو کرنا تھا - بیچارے بھوک سے مر رہے ہیں -

جیون - کیا کروں؟ جان عجب مشکل میں ہے - اس زندگی سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے -

نانی - ہوا کیا؟

جیون - کارخانے کے مالک کچھ دیتے ہی نہیں!

نانی - رشوا ان کی جانوں کو جنہوں نے خواہ مخواہ ہڑتال کرادی

جیون - ہڑتال تو ہم نے خود کی - دس گھنٹے محنت کرنے پر بھی اتنی تنخواہ ہے، تو کیوں ہڑتال نہ کریں؟

شامو - پچھلے مہینے کی تنخواہ کیوں نہیں دیتے؟

جیون - ہڑتال جو ہم نے کر دی ہے اور اس سے ان کا سخت نقصان ہو رہا ہے -

نانی - نقصان تو تمہیں ہو رہا ہے انہیں کیا پروا ہے -

جیون - (بیوی سے مخاطب ہو کر) کسی ہمسائے سے کچھ مانگ لیتی -

شامو - کس سے مانگتی - محلے میں ہر ایک کا ہمیں دینا ہے - اب کس منہ سے مانگیں؟؟

جیون ۔ سب قرضہ اتار دیں گے ۔

شامو مگر اب تو کوئی بھی دینے کو تیار نہیں ۔ سب جانتے ہیں یہ غریب ہیں ۔ کہاں سے دیں گے ۔ گلی میں صرف ایک گھر ہے جہاں سے قرض نہیں مانگا ۔ اور وہ گھر مسلمان کا ہے ۔ ماتا جی کہتی ہیں اس سے قرض ہرگز ہرگز نہ مانگنا ۔

جیون ۔ کیوں ؟

نانی ۔ مسلمان سے ہمارا کیا واسطہ

جیون ۔ کارخانے میں تو ہندو مسلم کا کوئی سوال نہیں ہر ایک مزدور ایک دوسرے کا ہمدرد ہے ۔

نانی ۔ کیا پتہ تم نے کن بدمعاشوں کی رائے پر ہڑتال کر رکھی ہے ۔ میرا اختیار ہو تو اُن کے بال نوچ لوں ۔

جیون ۔ ماتا جی اور تم سے امید بھی کیا ہے ؟ تم خواہ مخواہ ہندو مسلم سوال لے بیٹھتی ہو ۔ میرا دعوٰی ہے اگر خاں صاحب سے ہم مانگیں تو وہ کبھی انکار نہ کریں گے ۔ جب سے ہڑتال ہوئی ہے ، وہ ہر روز مجھ سے پوچھتے ہیں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے ؟ کارخانے میں ہمارا منیجر مسلمان ہے وہی ہمیں تنخواہ دیتا تھا ۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کارخانہ والے ہمارا خون بالکل چوس لیتے ۔

نانی ۔ میں تو پہلے ہی سمجھی بیٹھی تھی کہ یہ اسی شخص کی کارروائی ہے ۔ تم نے اس نامراد کا کہنا کیوں مانا ؟

جیون ۔ ماتا جی ! جب تمہیں کسی چیز کی خبر نہیں تو خاموش کیوں نہیں رہتیں ۔ خواہ مخواہ بیچارے کو نامراد کہہ دیا ۔ حالانکہ وہ ہمارے ساتھ ہے ۔ اور ہمارے ساتھ ہر طرح کی ہمدردی کر رہا ہے ۔

نانی ۔ کیا ہمدردی کر رہا ہے ؟

جیون ۔ وہ بھی ہم میں شریک ہیں اور کارخانہ والوں سے ہمارے مطالبات پورا کرنے کو کہہ رہے ہیں ۔

نانی ۔ اوہ ۔ پرماتما جانے تمہیں کب عقل آئے گی ۔

جیون ۔ ماتا جی ! کارخانے میں سب مزدور ایک دوسرے کے بھائی ہیں ۔ کانگریس والے بھی کہتے ہیں کہ جب تک ہندو مسلم ایک دوسرے کو بھائی بھائی نہیں سمجھیں گے ۔ ملک کو سوراج نہیں ملے گا !

نانی ۔ بڑے آئے موئے سوراج لینے والے !

(غصے سے کمرے میں چلی جاتی ہے)

رتن ۔ بڑی بھوک لگی ہے ۔

رامو ۔ صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا ۔

جیون ۔ ابھی بازار جاتا ہوں

شامو ۔ بازار جا کر کیا کرو گے ؟

جیون ۔ کیا کروں گا ۔۔۔ ؟ کچھ نہ کچھ تدبیر کروں گا ۔ اس کے سوا اور چارہ کیا ہے ۔

شامو ۔ ہمیں بچوں کی بڑی فکر ہے ۔ ماتا جی بوڑھی ہیں ۔ وہ دو وقت کا فاقہ کیوں کر برداشت کریں گی ؟

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

جیون ۔ رتن ! دیکھو دروازے پر کون ہے ؟

(رتن دروازہ کھولتا ہے ۔ خاں صاحب دروازے پر کھڑے نظر آتے ہیں ان کے پیچھے اُن کا خادم ایک طشت اٹھائے کھڑا ہے ۔ طشت پر رومال پڑا ہے)

(جیون جلدی سے دروازے پر پہنچ جاتا ہے)

خانصاحب ۔ ذرا تکلیف دینی چاہتا ہوں ۔

جیون ۔ میں حاضر ہوں خانصاحب !

خانصاحب ۔ بھائی ! (طشت کی طرف اشارہ کرکے) یہ لایا ہوں قبول کرو ۔

جیون ۔ خانصاحب ! آپ نے کیوں تکلیف کی ۔۔۔۔ بھگوان کی کرپا سے ہمیں سب کچھ حاصل ہے !

خانصاحب ۔ اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے ۔ ہمسائے کو ہمسائے کی مدد کرنی چاہیئے (خادم سے) کلو! ذرا آگے بڑھو اور چیزیں اتار دو ۔ جیون! چند برتن لے آؤ ۔

جیون ۔ خانصاحب! آپ تکلیف نہ کریں ۔ میں خود کچھ نہ کچھ انتظام کروں گا ——

خانصاحب جیون کے الفاظ کاٹتے ہوئے، تمہیں ہم سے نفرت ہے جو ایسی باتیں کرتے ہو؟

جیون ۔ رام، رام، یہ خیال کبھی نہ کیجئے خانصاحب! آپ تو غریبوں پر احسان کر رہے ہیں ۔

خانصاحب ۔ تو پھر یہ لے لو بھائی! خدانخواستہ میری حالت تمہاری حالت ایسی ہو جائے تو کیا تم میری مدد نہیں کرو گے ۔

جیون ۔ پرماتما نہ کرے آپ کی ایسی حالت ہو!

خانصاحب ۔ دنیا میں سب کچھ ممکن ہے ۔

(کلو رومال ہٹاتا ہے اور طشت دروازے کے اندر رکھ دیتا ہے دونوں بچے بھاگ کر وہاں آجاتے ہیں)

جیون ۔ خانصاحب! آپ نے بڑی کرپا کی ہے ۔

خانصاحب ۔ تو اب سوچ کیا رہے ہو بھائی ۔ برتن لاؤ ۔

(جیون وہاں سے ہٹ کر، شامو کے پاس پہنچتا ہے ۔ شامو دروازے کی طرف پشت کئے بیٹھی ہے ۔ جیون اسے برتن دینے کیلئے کہتا ہے وہ سر کی جنبش سے برتنوں کی طرف اشارہ کر دیتی ہے ۔ برتن لیکر جیون پھر دروازے کے پاس آتا ہے اور طشت سے پوریاں، چاول، روٹیاں وغیرہ نکال لیتا ہے ۔ بچوں کی نگاہیں ان پر گڑی ہوئی ہیں

جیون ۔ حیران ہوں آپ کا شکریہ کیونکر ادا کروں؟

خانصاحب ۔ آخر شکریہ ادا کرنیکی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں نے حق ہمسائیگی ادا کیا ہے ۔ میں تمہاری جگہ ہوتا اور تم میری حالت میں تو کیا تم بحیثیت ہمسائے کے میری مدد نہ کرتے ۔ دیکھو نا! اگر ہمسایہ ہی ہمسائے کی مدد نہ کرے تو اور کون کرے گا؟ شاید تم یہ سوچتے ہو گے کہ میں مسلمان ہوں اور تم ہندو —— اس لئے ہمارے تمہارے درمیان بہت بڑی دیوار حائل ہے!

جیون ۔ خاں صاحب! میں ہندو مسلم کے سوال کو نہیں مانتا ۔ کارخانے میں ہم تمام مزدور ساتھ کھاتے ہیں ۔

خانصاحب ۔ وہاں صلح صفائی ہوئی یا نہیں!

جیون ۔ ابھی تو نہیں ہوئی ۔ کچھ دن میں ہو جائے گی ۔ کارخانے کے مالکوں نے ہمارے مطالبات ابھی پورے نہیں کئے ۔

خانصاحب ۔ وہ کیا کہتے ہیں؟

جیون ۔ وہ کہتے ہیں کہ پچھلے مہینوں کی جتنی تنخواہیں ہیں وہ نہیں دیجائیں گی! آگے کام کرو اور مزدوری لو ۔

خانصاحب ! تو یہ مطالبہ وہ مان جائیں گے!

جیون ۔ امید تو ہے ۔ ہڑتال سے انہیں سخت نقصان پہنچ رہا ہے ۔

خانصاحب ۔ (رامو کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) تمہیں بھوک لگی ہو گی؟

رامو ۔ کانصاب! صبح سے کچھ نہیں کھایا

خانصاحب ۔ تو تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا؟

(رامو باپ کی طرف دیکھتی ہے)

جیون ۔ یہ ثریا کی سہیلی ہے ۔

خانصاحب ۔ ثریا تمہاری سہیلی ہے نا؟

رامو ۔ ہاں کانصاب! "ثیا" میری بڑی اچھی سہیلی ہے!

خانصاحب ۔ مجھے نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ تمہاری یہ حالت ہے یہ کہیں ادھر سے گزرا اور تمہاری باتیں اس کے کانوں میں پڑ گئیں ۔

بھائی! تمہیں چاہیئے تھا کہ مجھ سے مدد طلب کرتے۔ یہ تمہارا حق ہے! اور
میرا فرض! دیکھو بچوں کے چہرے آدھے بھی نہیں ہے۔ اب میں جاتا ہوں
ہاں جب تک ہڑتال جاری ہے۔ تم میرے مہمان ہو۔ صبح، شام میرے
گھر سے کھانا آیا کرے گا!

جیون۔ خانصاحب! آپ ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں!

خانصاحب۔ تمہیں شرمندہ ہونیکی بالکل ضرورت نہیں صبح نوکر آئے گا۔

جیون۔ بڑی کرپا۔

خانصاحب۔ دیکھو تمہیں ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ ہڑتال تین چار
دن اور رہے گی۔ اس کے بعد تمام مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔

جیون۔ ٹھیک ہے خانصاحب! پرماتما آپ کو اس کا اجر دے!

(خانصاحب چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد نوکر خالی طشت لے کر
روانہ ہو جاتا ہے۔ ایک منٹ کے بعد جیون دروازہ بند
کر دیتا ہے۔ بچے کھانا دیکھ کر خوشی کے مارے تالیاں بجانے
لگتے ہیں۔

شامو۔ کتنا اچھا آدمی ہے ــــ لیکن مسلمان ہے!

جیون۔ مسلمان ہے تو کونسی برائی ہے۔ بیچارے نے کتنی ہمدردی
کی ہے! کہتا ہے جب تک ہڑتال ختم نہ ہو تم میرے مہمان ہو۔ اب اٹھو ــ

شامو۔ آپ کھائیں بچوں کو کھلائیں ــ ماتاجی شاید سو گئی ہیں۔ رامو۔
لیکن ماتاجی تو نہیں کھائیں گی!

(رامو دوڑتی ہوئی کوٹھری میں چلی جاتی ہے، دفعۃً اور لے سے
باہر لاتی ہے۔

نانی۔ رامو کہتی ہے۔ تم نے کھانیکا انتظام کر لیا ہے!

جیون۔ ہم نے انتظام نہیں کیا، خود بخود ہو گیا ہے۔

نانی۔ کیوں کر؟؟

(جیون خاموش رہتا ہے)

رامو۔ نانی کانصاب دے گئے ہیں۔

نانی۔ کانصاب کون؟

رتن۔ وہی کانصاب، نانی! جو ہماری گلی میں رہتے ہیں۔

نانی۔ وہ مسلمان ــــ؟ اچھوت؟؟

رامو۔ کانصاب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کی لڑکی مُنیّا، میری
سہیلی ہے۔

نانی۔ تو وہ کھانا دے گیا ہے ــــ اور

جیون۔ کہہ تو دیا ہاں!

نانی۔ بیٹا رام رام کرو، اچھوت کے گھر کا کھانا کھاؤ گے ــ اتنا
مہاپاپ ــــ؟؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

جیون۔ اس میں حرج کیا ہے۔ وہ ہمارا ہمسایہ ہے ــ اور
بھائی ہے!!

نانی۔ میری آنکھوں کے سامنے یہ بات نہیں ہو سکتی! دھرم بھرشٹ
کرنا چاہتے ہو؟؟

رامو۔ (ماں سے، ماتاجی! ہمیں پوریاں بھی کھاؤں گی ــ اور
چاول بھی ــ!!

رتن۔ اور میں بھی ماتاجی! ہمیں دیتی کیوں نہیں ہو؟؟

نانی۔ ٹھہرو (بچے سہم کر چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں) میرے
سامنے یہ نہیں ہو سکتا، جب آنکھیں بند ہو جائیں تو جو جی چاہے کرنا!

جیون۔ ماتا! آپ بھی عجیب ہیں اپنی حالت نہیں دیکھتیں۔ آخر
مسلمان بھی اسی ملک میں رہتے ہیں جس ملک کے ہم باشندے ہیں۔

نانی۔ پھر بھی اچھوت ہیں۔

جیون۔ اچھوت نہیں ہمارے بھائی ہیں۔

نانی۔ اچھوت ہمارے بھائی نہیں ہو سکتے ــ اگر ایسی باتیں
کرنی ہیں تو میرا گلا گھونٹ دو۔ میرے مرنیکے بعد جو جی میں آئے کرنا۔

جیون ۔ ماتا! آپ نہ کچھ سمجھتی ہیں نہ سوچتی ہیں۔

نانی ۔ سمجھنے سوچنے والے تم جو ہو ـــ موئے کانگریس والوں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے!

جیون ۔ میں ہر مسلمان کو بھائی سمجھتا ہوں ـــ پھر بھائی کی چیز کیوں نہ کھاؤں۔

نانی ۔ مجھے زیادہ بحث کرنی نہیں آتی ـــ زیادہ بولوگے تو میں سر پیٹ کے یہاں سے نکل جاؤں گی۔

۔ جو جی چاہے کرو ـــ!

(نانی پہلے دو برتنوں کو اٹھاتی ہے، اور ان کی چیزیں کھڑکی کی راہ سے نیچے پھینک دیتی ہے ـــ پھر دوسرے برتنوں کیساتھ بھی یہی سلوک کرتی ہے۔

(شامو سر جھکائے رو رہی ہے۔ جیون غصے سے منہ دوسری طرف پھیرے ہوئے ہے۔ بچے تیزی سے، چارپائی پہ چڑھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتے ہیں۔ روٹیاں، سالن چاول، پوریاں وغیرہ کیچڑ میں مل گئی ہیں)

شامو ۔ تو بچے کیا کریں۔ ان کا کسی کو خیال نہیں ـــ تم لوگ انھیں بھوکا مارنا چاہتے ہو ـــ

نانی ۔ اب تو انھیں سلادو۔ صبح (ہاتھوں کی چوڑیوں کی طرف اشارہ کرکے) انھیں بیچ دیں گے اور کیا کریں ـــ؟؟

(کوٹھری میں چلی جاتی ہے)

جیون دیکھی ماتا کی عقل ـــ!

شامو ۔ بچوں کو بھوکا مارنا چاہتے ہو؟

جیون ۔ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــ ماتا مسلمان کو پرش نہیں سمجھتی ہیں!

شامو ۔ اب ہوگا کیا؟

جیون ۔ بازار جاتا ہوں ـــ رات کے دس بج گئے ہیں اور پاس ایک پیسہ بھی نہیں! تم بچوں کو سلادو۔

(جیون باہر چلا جاتا ہے۔ بچے وہیں کھڑے نیچے دیکھ رہے ہیں۔

شامو ۔ رتن! رامو! ادھر آؤ۔

(دونوں بچے آتے ہیں۔ شامو کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ وہ محبت مادری سے مجبور ہوکر، ان کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگتی ہے) تمہارے پتا ابھی کھانا لیکر آتے ہیں۔

(بچے متحیرانہ نظروں سے ماں کو دیکھتے ہیں)

دوسرا منظر

(اسٹیج پر چند منٹ خاموشی طاری رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ غمگین آواز سنائی دیتی ہے۔ رامو اور رتن چارپائی پر لیٹے ہیں۔ ماں سر جھکا کر، آنسو بھری آنکھوں سے ان کی چہروں کو دیکھ رہی ہے)

رامو (عالم نیم ہوشی میں) پوریاں ـــ چاول ـــ!!

رتن (اسی عالم میں) ماتا ـــ پتا جی مٹھائی لے آئے ـــ مٹھائی ـــ پوریاں۔ بھوک ـــک ـــ!!

رامو ۔ پوریاں، چاول ـــ

(شامو اپنا ہاتھ رامو کی پیشانی پر رکھتی ہے۔ پیشانی بخار سے تپ رہی ہے۔ ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں ـــ پھر وہ اپنا ہاتھ رتن کی پیشانی پر رکھتی ہے۔ وہ آنکھیں کھولدیتا ہے ـــ اور اٹھ بیٹھتا ہے

رتن ۔ مٹھائی ـــ پوریاں ـــ کہاں ہیں۔

شامو (اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے) وہ ابھی آجائیں گے۔ ذرا ٹھہرو۔ (رتن مایوس ہوکر پھر لیٹ جاتا ہے ـــ پر وہ کراہتا ہے ـــ بچوں کی خفیف آواز برابر آرہی ہے ـــ)

جادوگر

از ـــــ حضرت ایم اسلم

میں اور حامد برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شام ہو چکی تھی اور نیلا نیلا آسمان خوب نکھرا ہوا تھا۔ جنوب مشرق کی جانب عارضِ فلک پر ایک چھوٹا سا ستارہ کچھ اس طرح چمک رہا تھا جیسے کسی حسینہ کے ماتھے پر بندی۔ ہوا تیز تھی اور لیمپ کی بتی شمیم صحرا کی چھیڑ چھاڑ سے مسرور ہو رہی تھی۔

حامد بولا۔

کوئی نیا ریکارڈ تو نہیں لائے؟

"ہاں! میں نے جواب دیا" ایک دو لایا تو ہوں۔ سنو گے؟"

"ضرور!"

گراموفون کمرے میں رکھا تھا۔ میں اٹھ کر اندر گیا اور اسے چابی دینے لگا۔ حامد بھی اُٹھ کر اندر آگیا۔ میں نے ریکارڈ رکھا ہی تھا کہ لیمپ گل ہو گیا۔ ساتھ ساتھ ہی دو ایک چمگادڑیں بھی کہیں سے اندر گھس آئیں اور لگیں اندھیرے میں فرّاٹے بھرنے۔

"لے خدا کیلئے بتی روشن کرو جلدی!" حامد نے ذرا خوفزدہ آواز میں کہا۔

"ہاں کرتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

یہ کہہ کر میں دیا سلائی تلاش کرنے لگا۔ حامد پھر بولا:

"میرے یار روشنی کرو گے بھی یا نہیں"

"بھئی! میں نے کہا۔ "گھبراتے کیوں ہو۔ دیا سلائی تلاش کرتا ہوں"

"جہنم میں گئی تمہاری دیا سلائی" حامد جھنجلا کر بولا۔

"اگر جہنم میں گئی" میں نے ہنس کر کہا" تو بس دوسری بازار سے ہی منگوانی پڑے گی"

"لتنے میں میرا نوکر آگیا۔ اور اس نے لیمپ روشن کر دیا۔ حامد کمرے کے ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا

"کوئی بھوت تو نہیں گھس آئے تھے۔ جو تم یوں دبکے بیٹھے ہو"

"چمگادڑیں تھیں" حامد بولا۔

"چمگادڑیں؟" میں نے تعجب سے کہا" پھر کیا؟"

"میری تو ان سے روح کانپتی ہے" حامد نے کہا۔

"بڑے بزدل ہو تم" میں نے ہنس کر کہا

"بزدل نہیں"! حامد بولا

"تو احمق ہی" میں نے پھر ہنس کر کہا

"احمق تو تم ہو" حامد بولا" جو دوسرے کی سنتے نہیں اور اپنی ہی ہانکے جاتے ہو"

"تو کیا!" میں نے کہا" کبھی چمگادڑیں چمٹ بھی گئیں تھی تم سے؟"

"جادو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے" حامد نے میری طرف دیکھ کر کہا

"اسے کہتے ہیں۔ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی!" میں نے کہا" ذکر چمگادڑوں کا ہو رہا ہے اور تم جادو کی پوچھنے لگے"

"تم میری بات کا تو جواب دو" حامد نے کہا۔

"ذاتی طور پر تو مجھے کچھ تجربہ نہیں" میں نے جواب دیا" قصے کہانیاں بہت سنی ہیں"

"قصے کہانیاں ؟" حامد نے کہا۔
"تو اور کیا؟" میں نے جواب دیا "جتنے منہ اتنی باتیں"
"میں ایک چشم دید واقعہ سناتا ہوں" حامد نے کہا
"چشم دید؟" میں نے ہنسکر کہا "آپ بیتی ہی کہہ دیا ہوتا"
"خدا کی قسم!" حامد نے کہا "آپ بیتی!"
میں تعجب سے اپنے دوست کیطرف دیکھنے لگا۔

"یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ میں سیام سے بھی ہو آیا ہوں"
"تم تو سیام کی کہتے ہو" میں نے ہنسکر کہا "لیکن میں تو یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ تم کالے پانی سے بھی ہو آئے"
"کالے پانی بھی تو انسان ہی جاتے ہیں" حامد نے مسکرا کر کہا "خیر! بات سنو گے یا مذاق کرو گے"
"بات یا آپ بیتی؟" میں نے پوچھا "فضول بک بک سے تو یہی بہتر ہے کہ کوئی ریکارڈ سنیں"
"آپ بیتی!" حامد نے کہا "سنو گے؟"
"ضرور!"
"یہ سیام کا واقعہ ہے"
"کہئے!" میں نے کہا "لیکن پہلے یہ بتلاؤ وہاں کرتے کیا تھے"
"کام!" حامد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا
"کام!" میں نے کہا "شاید پیڑ کاٹا کرتے ہو گے۔ ٹھیک ہے نا؟"
"تمہارے حسن ظن کی تو میں داد دے نہیں سکتا" حامد بولا "لیکن یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک لکڑی کے اجارہ دار کے پاس ہی ملازم تھا۔ میرے ذمہ حساب کتاب تھا۔ اس شخص کو جس کے پاس میں ملازم تھا لوگ باوا کہتے تھے۔ باوا کے ہاں چند روز قیام کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ صرف لکڑی کا سوداگر ہی نہیں بلکہ بردہ فروش بھی ہے۔ باوا پچاس کے لگ بھگ ہوگا

درمیانہ قد۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ آبنوسی رنگ اور چہرہ پر چیچک کے داغ۔ تیل چاولی ڈاڑھی یہ اس شخص کا حلیہ تھا۔
باوا کی نہ جورو تھی نہ کوئی بچہ۔ گھر کا انتظام باوا کی چچی کے سپرد تھا۔ جس طرح باوا ایک سخت گیر آقا تھا۔ اسی طرح اس کی چچی بھی خانگی معاملات میں بہت سختی سے کام لیتی تھی۔

گاہے گاہے باوا کے یہاں ایک خمیدہ کمر بوڑھا بھی آیا کرتا۔ یہاں کے رہنے والے اسے "کبڑا حکیم" کہتے یہ شخص ہمیشہ پالکی میں سوار ہو کر آتا۔ کبڑے حکیم کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کی سانپ نما لاٹھی ہوتی۔ اور کندھے سے ایک چمگادڑ چمٹی ہوتی۔ لوگ اسے جادوگر بھی کہتے تھے۔ لیکن مجھے نہ تو ابھی تک اس کی حکمت کا اور نہ جادو ہی کے امتحان کرنیکا موقع ملا تھا ہاں! اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ باوا کی طرح یہ بھی بردہ فروش ہے۔ اور دونوں ملکر کام کرتے ہیں۔
مجھے باوا کے ہاں کام کرتے تین چار مہینے ہو چکے تھے۔ لیکن اس تمام عرصہ میں مجھے اس کبڑے حکیم یا جادوگر سے بات چیت کرنے کا کوئی موقع نہ ملا تھا۔ ایک تو وہ خود مجھے کچھ مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا دوسرے اس کی گھناؤنی شکل وصورت سے مجھے بیحد نفرت تھی۔ وہ جب باوا کے یہاں آتا میں اٹھ کر دوسری طرف چلا جاتا۔

ایک روز میں باوا کے پاس بیٹھا مزدوروں کو ہفتہ بھر کی اُجرت تقسیم کر رہا تھا کہ یہ کبڑا حکیم بھی آگیا۔ جب وہ پالکی سے اترا تو سب نے اسے تعظیم دی لیکن میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔
کبڑا حکیم ایک چوکی پر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھ کر باوا سے پوچھا۔
"یہ کون ہے؟"
"میرا منشی ہے!" باوا نے جواب دیا۔

"بہت گستاخ ہے" اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں ادھر ادھر گھما کر کہا "خیر! درست کردوں گا کسی روز"

"کیسے؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

کبڑے کے ماتھے پر بل پڑ گئے اس نے وہی سانپ نما سیاہ لاٹھی اٹھا کر کہا۔

"خون پی جاؤں گا!"

"کیا بکتے ہو؟" میں نے پھر غصے سے کہا "کیا سمجھے ہو مجھے!"

"کیا سمجھا ہوں؟" کبڑے نے نفرت آمیز قہقہہ لگا کر اور سر ہلا کر کہا "محض بے تمیز!" اور باوا غالباً اسے خوش کرنے کے خیال سے بولا

"جانگلو کہو جانگلو!"

"ٹھیک ہے!" میں نے غصے سے کہا "جانگلو بھی اور بدتمیز بھی لیکن بردہ فروش نہیں"۔

لیکن پیشتر اس کے کہ ان دونوں میں سے کوئی بولے۔ باوا کی چچی اندر سے نکل آئی اور باوا کو مخاطب کر کے بولی

"کبھی کچھ سوچ سمجھ کر بھی بات کیا کرو"

اور مجھ سے بولی

"آؤ بھیا! ذرا بات سنو میری!"

میں اٹھ کر بڑھیا کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہ رازداری کے طور پر کہنے لگی

"اس کبڑے پاجی سے بچ کر ہی رہنا اچھا ہے"

"میرا کیا بگاڑے گا" میں نے کہا۔

"نہیں! نہیں" بڑھیا بولی "پاگل مت بنو۔ یہ تمہارا دیس نہیں۔ اور یہ کبڑا جادوگر ہے۔ جس کے پیچھے پڑ جائے بس جان ہی لیکر رہتا ہے۔

"میں چاہوں!" میں نے غصے سے کہا "تو اس حرامزادے کو ابھی گرفتار کرا دوں"

"دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو" بڑھیا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میری بات کا اعتبار نہ ہو تو دوسروں سے پوچھ لو لیکن خیر! تم خود سمجھدار ہو۔ کام وہ کرو کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" یہ کہہ کر بڑھیا گھر کے دھندوں میں لگ گئی۔

میں باہر برآمدے میں جو مکان کے پچھواڑے تھا آ بیٹھا۔ اتنے میں اندر سے باوا اور کبڑے کی آواز آنے لگی۔ باوا کہہ رہا تھا

"نہ دینے والے کی ایسی تیسی!"

"ہوش کی دوا کرو" یہ کبڑے کی آواز تھی۔

"کیا ہوش کی دوا کروں" باوا کہنے لگا "تم نے آج کل کرتے کرتے پورے تین مہینے گزار دیئے"

"کوئی کام کی لڑکی تو ملی نہیں!" کبڑا بولا۔

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہاری لڑکیاں!" باوا نے جواب دیا "اگر دو ایک روز تک روپے نہ ملے تو میں اور تدبیر کر دوں گا"

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر کبڑے کو میں نے پالکی میں واپس جاتے ہوئے دیکھا۔

رات کا کھانا کھا چکنے کے بعد باوا مجھ سے ملا۔ اور شام کی باتوں پر کچھ معذرت کرنے لگا۔ اتنے میں اس کی چچی بھی آ گئی

"تم نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے" بڑھیا نے کہا

"کسے؟" باوا نے پوچھا

"اس کبڑے کو اور کسے؟" چچی نے جواب دیا

"دو ایک روز میں دیکھنا سب بل نکال دوں گا" باوا بولا

"جلد بازی اچھی نہیں" بڑھیا نے کہا "کم بخت کوئی نقصان نہ پہنچا دے تجھے؟" باوا نے ذرا سر ہلا کر کہا "خیر! دیکھا جائے گا۔

"تاہم!" بڑھیا بولی "دشمن کی طرف سے چوکس ہی رہنا اچھا ہے"

اور میں نے پوچھا

"تو کیا واقعی یہ کبڑا جادوگر بھی ہے"

"مشہور تو ایسا ہی ہے" باوا نے جواب دیا۔

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

باوا علی الصبح بیدار ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج خلاف معمول وہ دیر تک اپنے کمرہ سے نہ نکلا۔

میں جب مزدوروں کی حاضری لکھ چکا تو کام تقسیم کرنے لگا کہ اتنے میں اندر سے بڑھیا کی ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ میں بھاگ کر اندر گیا۔ باوا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا لیکن روح جسم سے جدا ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے سے پرلے درجے کی دہشت ہویدا تھی۔ ہم رات اسے چنگا بھلا چھوڑ کر آئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ مرا کیوں کر۔

کوئی دس گیارہ بجے کے قریب کبڑا پالکی میں سوار ہو کر آیا۔ اس نے باوا کی موت کے متعلق کسی قسم کا تعجب ظاہر کیا نہ تاسف۔ جب لوگ لاش لے کر چلے تو اس نے ایک خادم کو بلا کر کہا

"دیکھو! رات میری لاٹھی اور جمگادڑ اندر ہی رہ گئی تھی۔ ذرا دو تو اٹھا لائیو"

نوکر اندر سے دونوں چیزیں اٹھا لایا اور کبڑا حکیم پالکی میں سوار ہو کر اپنی قیام گاہ کو واپس لوٹ گیا۔

باوا کو مرے کچھ اوپر دو مہینے ہو گئے تھے اور اب سب کاروبار بڑھیا خود کرتی تھی۔ پہلے میں محض منشی تھا اب میری حیثیت ایک ایجنٹ کی تھی۔ کئی لوگوں کے ذمے باوا کا روپیہ تھا۔ کبڑے حکیم کے ذمے سب سے زیادہ رقم تھی۔ اور بڑھیا مجھے کبڑے سے تقاضا کرنے کے لیے اکثر کہا کرتی۔

باوا کی وفات کے بعد کبڑے نے ہمارے یہاں آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ اس لئے میں خود ہی اس کے پاس جا کر روپیہ کی ادائگی کا تقاضا کیا کرتا۔ ایک روز میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ جیسے بھی بنے روپے کا جلد انتظام ہونا چاہیئے۔ کبڑے نے میری طرف ذرا حقارت سے دیکھا اور کہا

"میں نے ٹکسال تھوڑے ہی لگا رکھی ہے"

"ٹکسال لگاؤ یا چوری کرو مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں" میں نے کہا "بس دو چار روز تک روپے کا انتظام کر دو"

آج وہ بہت مدت کے بعد باوا کے یہاں آیا تھا۔ بڑھیا موجود نہ تھی۔

"تو گویا اب تم کارمختار ہو" کبڑے نے حقارت سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی تم سمجھو" میں نے جواب دیا۔

وہ ہنس کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے یہ اس کرسی کی تاثیر ہے کہ جو شخص اس کرسی پر بیٹھتا ہے ضدی بن جاتا ہے"

میں اس وقت اتفاق سے اسی کرسی پر بیٹھا تھا جس پر باوا بیٹھا کرتا تھا۔

"دینا ہمیشہ تلخ ہوا کرتا ہے" میں نے کہا۔

"دینا جو ہوا" کبڑا بولا "خیر! کل شام تک فیصلہ ہو جائے گا" بڑھیا سے سلام کہہ دیجیو"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور پالکی میں سوار ہو کر چلا گیا۔

اس وقت نو بجے تھے۔ کچھ جھکڑ سا چل رہا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر بارش کے سامان ہو رہے تھے۔ جس کمرے میں میں بیٹھا تھا اس کا ایک دروازہ تھا۔ اور شمال کی جانب ایک کھڑکی۔

کھڑکی بند تھی لیکن شیشوں میں سے بجلی کی چمک نظر آتی تھی۔ ہوا کچھ اس طرح سائیں سائیں کر رہی تھی جیسے کوئی دورِ کرب کی حالت میں کراہ رہا ہو۔

کمرے کی ایک طرف ایک بھدّی سی الماری تھی۔ کھڑکی والی دیوار کے ساتھ میز تھی اور دو کرسیاں۔ میز کی بائیں جانب ردّی کے کاغذات کی ٹوکری تھی۔ اور آتشدان پر لیمپ رکھا ہوا تھا جو ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے خندہ زن معلوم ہوتا تھا۔

اتنے میں بادا کی چچی آ گئی اور آتے ہی بولی

"آج تو طوفان کی آمد آمد معلوم ہوتی ہے"

"کبڑا حکیم آیا تھا" میں نے کہا

"کب؟" اس نے پوچھا "کیا بات چیت ہوئی؟"

"وہ تو شام ہوتے ہی آ گیا تھا" میں نے جواب دیا "اسے گئے بھی تھوڑی دیر ہوئی ہے"

"روپیہ کے متعلق کیا کہا؟" بڑھیا نے پوچھا

"کہہ تو گیا ہے" میں نے کہا "کہ کل تک انتظام کر دے گا"

"کل تک؟" بڑھیا نے تعجب سے پوچھا "سچ؟"

"کہتا تو یہی تھا" میں نے جواب دیا۔

بڑھیا کچھ دیر چپ رہی۔ پھر بولی

آؤ کھانا تو کھالو

میں اٹھ کر کھانے والے کمرے میں چلا آیا۔ کوئی دس ساڑھے دس تک ہم دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر میں واپس آ کر حساب کتاب دیکھنے لگا۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب مجھے اونگھ آنے لگی۔ میں حساب کی کتاب اٹھا کر الماری میں جو رکھنے لگا تو الماری کے ساتھ ہی کونے میں کبڑے حکیم کی وہی سانپ نما لاٹھی نظر آئی۔

"کم بخت! بھول گیا آج بھی" میں نے اپنے آپ سے کہا "خیر! کل جب آئے گا لے جائیگا"

کتاب الماری میں بند کر کے جو میں ہٹا تو اسی کرسی سے جس پر وہ کبڑا بیٹھا تھا۔ مجھے ایک چمگادڑ چمٹی ہوئی نظر آئی۔

"اسے بھی چھوڑ گیا" میں نے چمگادڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پاجی کہیں کا۔ لے تو باہر پھینکتا ہوں آج"

یہ کہہ کر میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی چیز مل جائے تو اس سے اس منحوس جانور کو پکڑ کر باہر پھینک دوں۔ لیکن اتنے میں وہ چمگادڑ اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے میں فراٹے بھرنے لگی۔ میں نے جو سر اٹھا کر دیکھا تو وہ میری طرف جھپٹی لیکن میں نے جلدی سے سر جھکا لیا اور وہ اوپر سے نکل گئی۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ وہ پھر لوٹی اور پے در پے اس طرح حملے کرنے لگی جس طرح شاہین اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

الماری کے اوپر کچھ پرانے اخبار رکھے تھے۔ میں جھکا جھکا جلدی سے الماری کی طرف گیا تاکہ کوئی اخبار اٹھا کر اس موذی کی مدافعت کی تدبیر کروں۔ اچانک میری نگاہ اس سانپ نما سیاہ لاٹھی پر پڑی۔ توبہ ہے! میرے تو دیکھتے ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب وہ لاٹھی نہیں تھی بلکہ سیاہ رنگ کا سانپ تھا جو گردن اٹھائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے بدن میں حرکت پیدا ہو گئی اور وہ میری طرف رینگنے لگا۔ میں نے لپک کر وہی ردّی کے کاغذات والی ٹوکری اٹھا لی ٹوکری میرے ہاتھ میں آئی ہی تھی کہ اس موذی نے مجھ پر حملہ کیا۔ پہلا حملہ میں نے اسی بانس کی ٹوکری سے روکا۔ جب وہ اپنے پہلے حملے میں ناکام رہا تو تڑپ کر پیچھے ہٹا۔ لیکن بیشتر اس کے کہ میں کوئی تدبیر کروں وہ کمبخت چمگادڑ مجھے پھر پریشان کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ ناگ پھر میری طرف آیا۔ میں نے وہی ٹوکری پھر بڑھا دی۔ خوش قسمتی سے ٹوکری کی تیلیاں بہت گھری تھیں۔ سانپ کا سر ٹوکری

میں پھنس گیا۔ میں نے جلدی سے ایک رجسٹر اٹھا کر سانپ کے اوپر رکھ دیا اور خود اس پر کھڑا ہو گیا۔ سانپ سر نکالنے کے لئے بہت زور مار رہا تھا۔ اور میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ اس کا سر کس طرح کچلوں۔ ادھر جھگا ڈر پے در پے حملے کر رہی تھی۔ میری جیب میں قلم بنانے کا ایک چھوٹا سا چاقو تھا۔ میں نے جلدی وہ نکال لیا اور سانپ کی گردن کاٹنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ اچانک لیمپ کی روشنی بہت مدھم پڑ گئی اور مجھ پر کچھ نیم بیہوشی سی طاری ہونے لگی۔ مجھے صرف اس قدر معلوم تھا کہ میں سانپ کی بجائے اس کبڑے حکیم یا جادوگر کی گردن دبوچے بیٹھا ہوں اور وہ سنت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ یہ حالت کب تک رہی کچھ یاد نہیں۔ ہاں صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں میز کے پاس ہی فرش پر پڑا ہوا تھا اور کبڑے حکیم کی لاٹھی میرے ہاتھ میں تھی اور جھگا ڈر کرسی سے چمٹی بیٹھی تھی۔

آج وہ کبڑا صبح صبح ہی آ گیا میں برآمدے میں بیٹھا رات کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ کبڑا میرے پاس ہی آ بیٹھا میں نے پوچھا

"روپے لے آئے ؟"

"بھائی!" وہ بولا "لا ہی دوں گا"

"تو پھر آئے کیسے ؟"

"رات میری لاٹھی اور جھگا ڈر یہاں رہ گئی تھی۔ وہی لینے آیا ہوں" اس نے جواب دیا

میں اندر جا کر لاٹھی اٹھا لایا۔ کبڑا بولا "

"اور جھگا ڈر ؟"

"وہ بھی لاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر میں اس پاجی کی طرف دیکھنے لگا

"کیا دیکھتے ہو ؟" اس نے مسکرا کر پوچھا

"دیکھتا ہوں" میں نے کہا "کہ انسان کے روپ میں شیطان کیسے آ گیا ؟"

"کیا مطلب ؟" اس نے پوچھا

"مطلب ؟" میں نے کہا "تم بردہ فروش ہی نہیں بلکہ شیطان بھی ہو۔ اور شعبدہ باز بھی ہو"

"بردہ فروش۔ شیطان۔ شعبدہ باز" یہ الفاظ اس نے رک رک کر دہرائے

"ٹھیک ہے نا" میں نے پوچھا "اور باوا کے قاتل بھی"

"آج بھنگ تو نہیں پی تم نے" وہ مسکرا کر بولا۔

"تم یہ لاٹھی اور جھگا ڈر رات یہاں کیوں چھوڑ گئے تھے ؟" میں نے پوچھا

"چھوڑ نہیں گیا تھا" اس نے جواب دیا "بلکہ بھول گیا تھا"

"اور جس رات باوا مرا اس رات بھی تم یہ دونوں چیزیں یہاں بھول ہی گئے تھے" میں نے کہا

"ٹھیک ہے نا ؟"

"ممکن ہے" اس نے جواب دیا

"بدمعاش!" میں نے غصّے سے کہا "مجھ پر یہ منتر نہ چلیں گے"

"بدمعاش!" اس کے منہ سے نکلا

"بدمعاش بھی اور پاجی بھی!" میں نے پھر اسی انداز سے جواب دیا "رات تمہاری خباثت سے پریشان تو میں ضرور رہا۔ لیکن اتنا تم بھی مانو گے۔ کہ یہی تمہارا آخری حربہ تھا۔ اب کیا اصلاح ہے ؟"

"بھائی!" وہ بولا "معلوم ہوتا ہے تم نے تو لڑنے کی ٹھان لی ہے"

"رات والی حرکت سے تمہارا آخر مطلب کیا تھا" میں نے پوچھا

"اب چھوڑو گے بھی اس قصّے کو!" وہ سر ہلا کر بولا "جھگڑا تو میرا باوا کے ساتھ تھا۔ تم مفت میں الجھ رہے ہو"

"میں مفت میں الجھ رہا ہوں" میں نے غصّے سے کہا "میں تمہیں ابھی پولیس کے حوالہ کر دوں گا"

"کس خطا پر" اس نے پوچھا

"بردہ فروش اور ......"

"کچھ ثبوت بھی!" اُس نے کہا

"یہ لاٹھی!" میں نے جواب دیا

"سیانے ہوکر بچوں ایسی باتیں کرنے لگے" اُس نے کہا۔

"حکیم!" میں نے کہا "بڑے خوش قسمت ہو!"

"خوب" وہ بولا "میں تمہیں خوش قسمت سمجھ رہا ہوں"

"لیکن یہ بتاؤ تم مفت کا جھگڑا کیوں مول لیتے ہو"

"میں اس بڑھیا کا ملازم جو ٹھہرا" میں نے جواب دیا

یہ سن کر وہ چپ ہوگیا۔ پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولا۔

"بھائی! معاف کردو مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ میں بہت نادم ہوں"

میں چپ ہو رہا۔ وہ پھر کہنے لگا

"اس بڑھیا سے تو میں ایک دو روز میں نبٹ لوں گا لیکن میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ پردیس میں لوگوں کو دشمن نہیں بنا لینا چاہیئے تم چاہو تو میں ہر طرح تمہاری خدمت کرنیکو تیار ہوں"

"کل تک تو میری جان لینے پر تلے ہوئے تھے" میں نے ہنسکر کہا "اور تم خدمت کرنے پر آمادہ ہوگئے"

"میں نادم ہوں" وہ بولا "مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ کہنے لگا

"اب تو میں جاتا ہوں۔ اگر ہوسکے تو کل میرے ڈیرے پر ذرا آنا"

"کیوں؟" میں نے پوچھا

"باتیں کریں گے" وہ بولا "کچھ اپنی کہیں گے کچھ تمہاری سنیں گے"

"خیر" میں نے کہا "کل تو آئے"

کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔ اور شام ہونے سے پیشتر میں اپنا بوریا بستر اٹھاکر ریلوے اسٹیشن پر جا پہنچا۔

"وہ کیوں" میں نے ہنسکر پوچھا

حامد بولا

"تو اور کیا کرتا! اس پاجی کے ایک وار سے تو بچ گیا۔ جانے پھر کیا افتاد پڑتی"

"لیکن جب اُس نے معافی مانگ لی تھی تو پھر کیا خوف تھا" میں نے کہا۔

"اُسے معلوم تھا" حامد بولا "کہ میں اس کے راز سے واقف ہوں اور بردہ فروشی ایک سنگین جرم ہے اس لئے اس کی دوستی اور دوستی میں بھی مجھے مکاری اور عیاری کی بو آرہی تھی"

"خیر!" میں نے ہنسکر کہا "یہ تم نے عقلمندی کی کہ وہاں سے چلے آئے"

"کیا خیال ہے تمہارا" حامد نے پوچھا

"اچھی مزے کی داستان ہے" میں نے مسکراکر کہا

"داستان" حامد بولا

"چلو گپ سہی" میں نے ہنس کر کہا۔

"خیر! جو کچھ تم سمجھو" حامد نے کہا۔ "اب کوئی ریکارڈ سناؤ"

رباعی

شیطان کا جو کام تھا ہوتا ہی رہا
انسان ستم دیدہ سے روتا ہی رہا
زاہد کا خدا بھی فرشتوں کو لئے
خلوت کدۂ عرش میں سوتا ہی رہا

از [illegible] اکبرآبادی بی اے

اعترافِ شکست

از ــــ جنابِ جلال الدین صاحب حمید دہلوی

جس وقت کہ ایسے ہی دوچار ہیں ہم
تم حسن کی زینت سے خبردار نہیں تھے

ہر راز کھلے بندوں کہا کرتی تھی مجھ سے
تم میرے لئے عقدۂ دشوار نہیں تھے

بے مائیگیٔ عشق تھی ممنونِ ترحم
بیچارگیٔ عشق سے بیزار نہیں تھے

آسائشِ مجبورِ محبت میں تھی مصروف
آرامِ دل و جان تھے دل آزار نہیں تھے

وابستگیٔ اہلِ وفا ۔ مدِ نظر تھی
بے عیب تھے تم زیرِ الزام نہیں تھے

شیریں لب و لہجہ تھا تبسم کی جھلک تھی
لب واقفِ بیجا کی گفتار نہیں تھے

بدلی ہوئی چشمِ کرم انداز نہیں تھی
بگڑے ہوئے تیور دمِ رفتار نہیں تھے

مجھ سے ہی فقط عادتِ پیمانِ وفا تھی
غیروں سے مرے سامنے اقرار نہیں تھے

تھی سادگیٔ حسن ۔ قیامت کا نمونہ
تم اپنے سراپا سے خبردار نہیں تھے

کیا ہوش نہیں جوشِ جوانی میں نہیں تھا
وہ ناز نہیں تھے جو دل آزار نہیں تھے

مجبور کبھی حسن نہ تھا حسنِ ظنی پر
تم طرۂ طرار تھے طرار نہیں تھے

کیا حسن کو پہلے نہ تھی منظور نمائش
کیا پہلے حسیں اور طرحدار نہیں تھے

کس رسم کے برتاؤ کا حق تم کو نہیں تھا
کیوں سود فراموش زیاں کار نہیں تھے

سب قابلِ اظہار تھے اوصاف تمہارے
لاریب کہ ناقابلِ اظہار نہیں تھے

اچھا تو چلو حسن پہ مغرور رہو تم
نظارے کی طاقت نہیں اب دور رہو تم

آسودۂ نومیدی و آزار رہوں میں
آمادۂ بیداد بدستور رہو تم

تا حشر نہ مجھ تیرہ مقدر کو نظر آؤ
لیکن یونہی سر تا بہ قدم نور رہو تم

للہ مجھے صبر کی توفیق عطا ہو
اللہ کرے جبر پہ مجبور رہو تم

تم سے بہت اچھا ہے تعلق مرے نزدیک
کیوں سامنے آتے ہو بس اب دور رہو تم

اک جا نہ رکھے تم کو طبیعت کا تلون
ہر وقت اسی انداز پہ مجبور رہو تم

اس چاند سی صورت پہ ہو انگشت نمائی
دنیا میں اسی شان سے مشہور رہو تم

ان مدھ بھری آنکھوں میں خمار آئے نہ آئے
نشے میں جوانی کے یونہی چور رہو تم

لغزش ہی تو ہے مستیٔ حسن کی پہچان
تعبیرِ بد و نیک سے معذور رہو تم

احساسِ جمال اتنی لطافت تمہیں بخشے
اب عام نگاہوں سے بھی مستور رہو تم

احباب کی تلقینِ حق آگاہ نہ سمجھو
اغیار کی توصیف پہ مغرور رہو تم

ایرادِ حواس پہ توجہ رہے پیہم
اعجازِ افادات بدستور رہو تم

چھوٹے نہ کبھی مدعی ساحری اطوار
نکلو نہ کبھی دام سے مسحور رہو تم

نیرنگِ زمانہ بھی کوئی شے ہے تمہیں کیا
مسرور رہو تم ابھی مسرور رہو تم

جو بات نہیں تھی کبھی مدِ نظر اب ہے
خود بینی و خود رائی کا پورا اثر اب ہے

اب مستحقِ داد نہ بیداد رہوں میں
یاد آؤ مجھے تم نہ تمہیں یاد رہوں میں

عہدِ حاضر کا نوجواں

از ـــــ جناب محمد صادق صاحب ضیا چنیوٹوی بی۔ اے

بادلوں کے ساتھ اُڑتی تھی کبھی اپنی نظر
طائرِ تخئیل کی یہ آسماں تھے رہ گزر

ذہن پُر عظمت، جواں ہمت دلوں میں جوش تھا
زندگی بادہ تھی لب پہ ذکرِ نا و نوش تھا

لفظِ "ناممکن" سے تھی ناآشنا اپنی لغات
اک اشارے سے ہلا دیتی تھی ساری کائنات

جب قدم اُٹھتے تھے اُٹھتے تھے سوئے میدانِ جنگ
کوندتی تھی جب نظر دنیا نظر آتی تھی تنگ

قوت و ہمت اٹل تھی کوہساروں کی طرح
ساری دنیا رقص میں تھی آبشاروں کی طرح

جادۂ دشوار کو منزل بنا دیتے تھے ہم
کارواں کو ایک ٹھوکر سے جگا دیتے تھے ہم

ہم خودی و خود شناسی کے علم بردار تھے
خود ہی اپنی رفعت و عظمت کے ذمہ دار تھے

ہر روش میں زندگی کی جلوہ گر رہتے تھے ہم
شورشِ طوفاں میں بھی سینہ سپر رہتے تھے ہم

یا یہ حالت ہے زمیں سے اب نظر ہٹتی نہیں
سانس کی کمزوری سے زندگی کٹتی نہیں

ذہن میں کمزوریوں نے آ کے لی ہے پناہ
اب تصور بھی جواں رنگینیوں کا ہے گناہ

نظمِ ہستی کیا، نظامِ نفس بھی دشوار ہے
عہدِ حاضر کے جواں پر اپنی ہستی بار ہے

اب قدم اُٹھتے ہیں لیکن ناتوانائی کے ساتھ
اب ہے رسم و راہ انفاس مسیحائی کے ساتھ

پہلے اس کا جوہرِ خوں دشنہ و خنجر پہ دیکھ
اور اب اس نوجواں کو ڈاکٹر کے در پہ دیکھ

از — حضرت مولانا قمر بدایونی

قمر تم یہ نہ سمجھو وہ ستمگر اب پشیماں ہے
کسی تازہ ستم کی فکر میں سر در گریباں ہے

جسے دیکھو پریشاں حال ہے شاکی ہے نالاں ہے
مجھی پر کیا ہے دنیا آپ کی ممنونِ احساں ہے

نظر صیاد کی ہر وقت ہو جس کے نشیمن پر
وہ اپنے دل میں کیا سمجھے یہ گلشن ہے کہ زنداں ہے

وفا سے ضد ہے لیکن ذکر کچھ اس ڈھب سے کرتے ہیں
کہ جیسے واقعی ان کو وفا کرنے کا ارماں ہے

ستم سے باز آنا کیا ستم کی انتہا کر دے
قیامت دور ہے ظالم ابھی سے کیوں پشیماں ہے

بھلا ہو جورِ گردوں کا مساوات اس کو کہتے ہیں
کہ دنیا بھر ہے آفت میں زمانہ بھر پریشاں ہے

مسلماں سے کسی خطرے کا اندیشہ نہ ہو لیکن
یہ اس کا جرم کیا کم ہے کہ وہ اب بھی مسلماں ہے

یہ ہے کایا پلٹ بن کر بگڑنا اس کو کہتے ہیں
جو امیدوں کا مسکن تھا وہ دل اب وقفِ حرماں ہے

تقابل عیش کے بندوں سے کیا ہم غم نصیبوں کا
انھیں جینے کی حسرت ہے ہمیں مرنے کا ارماں ہے

تمناؤں کے مدفن داغہائے دل سے روشن ہیں
خدا کی شان ہے گورِ غریباں میں چراغاں ہے

یقیناً کچھ کمی ہے میری وحشت میں قمر ورنہ
یہ کیوں پہچانتا ہوں میں کہ یہ میرا گریباں ہے
(خاص)

حُسنِ قوافی

از ——— حضرت مولانا حسرت موہانی

هم عاشقِ فاسق تھے ہم صوفیٔ صافی ہیں　　پی لیں جو کہیں اب بھی در خورِ معافی ہیں

عقلوں کو بنا دے گا دیوانہ جمال اُن کا　　چھا جائیں گی ہوشوں پر آنکھیں وہ غلافی ہیں

ہم شکرِ ستم کرتے کیوں شکوہ کیا اُن سے　　آئینِ محبت کے شیوے یہ منافی ہیں

جھوٹی بھی گوارا تھی باقی بھی غنیمت ہے　　دو گھونٹ بھی ساقی سے مل جائیں تو کافی ہیں

ہم اُنکی جفا سے بھی راضی تھے مگر ناحق　　اب ہو کے وہ خود نادم سرگرمِ تلافی ہیں

جدّت میں ہے لاثانی حسرت کی غزلخوانی
کیا طرفہ مطالب ہیں، کیا تازہ قوافی ہیں

(خاص)

انشادِ آزاد

از ——— حضرت حکیم آزاد انصاری سہارنپوری

کچھ آثارِ رخ سے عیاں اور بھی ہیں　　کچھ اسرارِ دل میں نہاں اور بھی ہیں

فقط وجہِ قربِ خدا ہی نہ سمجھو　　مفاداتِ عشقِ بتاں اور بھی ہیں

حرم میں پناہیں نہ پا سکنے والو!　　مقاماتِ امن و اماں اور بھی ہیں

ابھی ظرف قابل ہی جانچا گیا ہے　　ابھی سیکڑوں امتحاں اور بھی ہیں

وہ اپنی وفا کو وفا ہی نہ سمجھیں　　کہ انکی وفا پر گماں اور بھی ہیں

زباں گرمِ اظہارِ الفت ہے لیکن　　نظر سے ارادے عیاں اور بھی ہیں

سن اے یارِ اندازہ دانِ وفا سن　　وفا کے کچھ اندازہ داں اور بھی ہیں

کبھی مے، کبھی دُردِ مے کے علاوہ　　مراعاتِ پیرِ مغاں اور بھی ہیں

جو شیخِ حرم درپئے دشمنی ہے　　تو پروا نہیں، آستاں اور بھی ہیں

نذرِ قتلِ عالم روا رکھنے والو!　　تدابیرِ فتحِ جہاں اور بھی ہیں

غلامانہ خو اتفاقی ہے، ورنہ

روایاتِ ہندوستاں اور بھی ہیں

(خاص)

خطِ نستعلیق کے چار باکمال استاد

از ـــــ خاں صاحب حکیم محمود علیخاں صاحب ماہر اکبرآبادی

اہلِ عجم ہمیشہ سے جدّت پسند اور حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔ جب اُن کو خطِ نسخ میں بھدّاپن اور ایک ناموزوں تناسب نظر آیا تو وہ اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ خطِ نسخ میں ہر دائرہ اوّل سے آخر تک یکساں رہتا تھا۔ اور حرفوں میں کسی قدر ناہمواری تھی۔ یعنی دائرے گول نہ تھے بلکہ نچلا حصّہ چپٹا ہوتا تھا۔ جس میں کونے یا زاویے نکل آتے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے حروف میں تقاسنی (شانِ مُصَوَّری) پیدا کی اور حروف کی نوکیں، گردنیں اور نیچے کا حصّہ باریک کر دیا۔ اور دائرے گول بنا دئے۔ چنانچہ اسی خط کا نام نستعلیق قرار پایا۔

خطِ نستعلیق یا **قلم** فارسی بقول علامہ ابنِ ندیم خطِ **قیراموز** سے ماخوذ ہے۔ جو خطِ کوفی کی ایک شاخ ہے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ خطِ تعلیق اصلاح شدہ عربی خط سے ماخوذ ہے۔

لفظی ترکیب سے ظاہر ہے کہ نستعلیق کا ماخذ "**نسخ تعلیق**" ہے۔ جب خائے معجمہ کو تخفیفاً حذف کر دیا۔ تو تعلیق رہ گیا۔ اساتذۂ فن اور اربابِ لغت کا بھی یہی قول ہے۔ لیکن غور کرنے سے حقیقت کھلتی ہے کہ **نستعلیق** کی ایجاد میں جملہ قلموں کی شان پیشِ نظر تھی جو ایران میں رائج تھے۔ علمِ خط کے علاوہ اہلِ عجم نے علوم و فنون کی بھی عربوں سے زیادہ خدمت کی ہے۔ جس کی تفصیل **کشف الظنون** وغیرہ سے معلوم ہوسکتی ہے۔ دورِ حاضرہ میں بھی ایران، ہندوستان پر فوقیت رکھتا ہے۔ نسخ اور تعلیق کے اساتذہ اب بھی وہاں موجود ہیں اور عام مراسلت کا خط **شفیعہ** ہے۔

نستعلیق کتابی خط ہے جو ایران اور ہندوستان وغیرہ میں جاری ہے اور مراسلت کا قلم **شفیعہ** ہے جو نہایت خوبصورت اور دلکش ہے۔ نستعلیق کے حسنِ قبول کی بڑی دلیل یہ ہے کہ لفظِ نستعلیق سے متعدد محاورات ایجاد ہوتے ہیں جو زبان زد ہیں۔ ایرانی ابجد میں بتیس۳۲ حروف ہیں۔ کیونکہ عربی ابجد میں پ۔ چ ژ اور گ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

(۱)
نستعلیق کا پہلا مصلحِ اعظم
خواجہ میر علی علوی تبریزی

خطِ نستعلیق کے موجد خواجہ میر علی علوی تبریزی ہیں۔ یہ امیر تیمور کے عہد (۷۷۱ - ۸۰۷ھ) کے نامور خطاط تھے۔ جو فن کے اعتبار سے عدیم النظیر مانے گئے ہیں۔ لیکن علامہ ابوالفضل[1] دیباچہ مرقع بادشاہی (البم قطعاتِ خوشنویسانِ ہند و ایران مرتبہ شاہ جہانگیر) میں لکھتے ہیں کہ میں نے امیر تیمور کے زمانہ سے قبل کی نستعلیق وصلیاں دیکھی ہیں

[1] دفتر سوم ابوالفضل صفحہ ۲۵۵ مطبوعہ نولکشور

لہذا میر علی تبریزی خطِ نستعلیق کے موجد نہیں ہو سکتے۔ ابو الفضل کی شہادت نہایت معتبر ہے۔ میر علی خطِ نستعلیق کے موجد نہیں ہیں بلکہ اس کا موجد کوئی اور تھا۔[1] اور یہ چیز ہنوز تحقیق طلب ہے لیکن یہ امر بلا شک و شبہ قابلِ تسلیم ہے کہ میر صاحب نستعلیق کے مصلح اوّل ہیں اور صرف انکے حسنِ عمل سے نستعلیق کو یہ عروج حاصل ہوا ہے۔ جسکی تکمیل میں میر صاحب کے شاگردوں کا بھی حصہ ہے۔

مولانا غلام محمد صاحب دہلوی نے اپنے تذکرۂ خوش نویساں میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ میر علی اگرچہ نستعلیق کے موجد نہیں ہیں لیکن انھوں نے اس خط کے قواعد مرتب کئے اور نوک پلک میں خاص نزاکت پیدا کی۔

علامہ ابو الفضل نے میر علی[2] کے نامور شاگردوں میں مولانا جعفر تبریزی، مولانا اظہر اور موسیٰ سلطان علی مشہدی کا نام لیا ہے۔ مولانا جعفر شاہ رخ مرزا کے زمانہ میں تھے اور اظہر کے ہمعصر تھے۔ لیکن سلطان علی کا درجہ سب سے بلند ہے۔ مولانا جعفر نے میر علی کے علاوہ اظہر کی وصلیوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

میر علی کو اپنے شاگردوں میں سلطان علی مشہدی پر فخر تھا۔ کیونکہ انھوں نے سب سے زیادہ استاد کی خدمت کی تھی۔ اور میر صاحب کے حالات ایک[2] مثنوی میں لکھے ہیں۔ جس کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں

سیرۃ میر علی تبریزی

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی است — واضع الاصل خواجہ میر علی است
حسبش بود با علیٔ ازلی — نسبتش نیز می رسد بہ علی
تا کہ بود است عالم و آدم — ہرگز ایں خط نہ بود در عالم
وضع فرمودہ او ز ذہنِ دقیق — از خطِ نسخ و ز خطِ تعلیق
نے کلکش ازاں شکر ریز است — کا صلش خاک پاک تبریز است
کاتباں ہر کہ کہنہ و لونید — خوشہ چینانِ خرمنِ اوئید
در جمیع خطوط بود شگرف — ز اوستاداں شنیدہ ام ایں حرف
خطِ پاکش چو شعرِ او موزوں — ہست تعریف او زحد افزوں
بد معما خرد بہ مجمع افضال — شیخ شیریں مقال، شیخ کامل[3]
آنکہ شعرش چو میوہ ہائے خجند — ہست شیریں تر از نبات و ز قند

سلطان علی مشہدی ایک جگہ اپنے استاد کے اُن اقوال کو جو خوش نویسی کے سلسلے میں ہیں اس طرح لکھتے ہیں۔

ایں چنیں گفتہ است میر علی — صبح مشقِ خفی و شام جلی
مشق آہستہ کن شتاب مکن — قلمِ مشق را خراب مکن

میر علی خطاطی کے ساتھ شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ میر صاحب کے مقلدین میں ایرانی اور ہندوستانی دونوں ہیں۔ لیکن ہندوستان میں کشمیریوں نے نستعلیق کو بہت زیادہ ترقی دی۔ دربارِ اکبری کے نامور خوش نویس محمد حسین کشمیری اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ اور خطاطانِ ترکستان بھی میر علی کے مقلد ہیں۔ میر صاحب کی وصلیوں کا بڑا ذخیرہ ایران اور انڈیا آفس (لندن) میں موجود ہے آٹھویں صدی کے آخر تک میر صاحب بہ قیدِ حیات تھے۔

میر کے ہمنام اور ہمعصر میر علی ہروی۔ ملا علی شیرازی اور میر علی خراسانی ہیں۔ اِن سب کی شانِ خط جداگانہ تھی۔

(۲)

میر علی الکاتب الہروی

ہرات کے باشندے اور سید تھے۔ مشہدِ مقدس میں سلطان علی سے نستعلیق کی تکمیل کی اور اُستاد سے بڑھ گئے۔ شاعری اور خطاطی میں اوّل اپنے باپ محمد رفیقی سے اصلاح لی۔ اس کے بعد زین الدین محمود عبدی کے شاگرد ہوئے۔ شاعر بھی تھے۔ مجنوں تخلص تھا فنِ خطاطی پر دو رسالے نظم میں لکھے ہیں۔ خصوصاً وہ رسالہ جس میں

[1] بعض مورخین نے یاقوت معتصمی کا نام لکھا ہے۔ [2] مجالس المومنین قاضی نور اللہ ششتری [3] کمال خجندی متوفی ۸۰۳ھ۔ یہ میر علی کے ہمعصر تھے۔

خطوط سبعہ کے قواعد نظم کئے ہیں۔ بہت مشہور رہے۔ اپنی تعریف میں متعدد رباعیاں اور اشعار لکھے ہیں۔ سنہ ۹۰۹ھ میں رسم الخط پر ایک رسالہ لکھا جو برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔ یہ رسالہ **سلطان مظفر** کے نام پر معنون ہے۔ سنہ ۹۳۵ھ میں ملکی بدامنی کی وجہ سے ماوراء النہر چلے گئے۔ اور عبد اللہ خاں اوزبک (متوفی سنہ ۹۴۶ھ) کے ملازم ہوئے۔ اور شہزادہ مومن کے اُستاد مقرر ہوئے۔ بعدہٗ سلطان عبد العزیز بخارا کے ملازم ہوئے۔ یہاں رہ کر **گلستان** اور مطلع الانوار امیر خسرو لکھی۔ **گلستان** پیرس کی لائبریری میں اور **مطلع الانوار** پٹنہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ خوانینِ بخارا سنی المذہب تھے۔ بخارا میں اختلافِ مذہب کی وجہ سے پریشان رہے۔ میر صاحب کا یہ قطعہ مشہور ہے جس سے بخارا سے ناخوش معلوم ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی زمانہ کے شاکی بھی۔

عمر از مشق دو تا بود، قدم ہمچوں چنگ   تا کہ خطِ من بیچارہ بدیں قانون شد

طالبِ من ہمہ شاہانِ جہاں اند و مرا   در بخارا جگر از بہرِ معیشت خوں شد

خوش نویسانِ جہاں ساغرِ عشرت نوشند   ساغرِ عیش مرا بیں کہ سراسر خوں شد

حسنِ خط بہرِ خلاصی زجنوں می جستم   وہ کہ خط سلسلۂ پائے منِ مجنوں شد

میر علی تبریزی اور اُن کے شاگردوں کے بعد ابو الفضل نے مولانا میر علی ہردی کو نستعلیق کا اُستاد تسلیم کیا ہے۔ میر علی ہردی نے تکمیلِ فن کے بعد اپنے اساتذہ کے خلاف ایک جدید روش نکالی اور عجیب و غریب تصرفات کئے جو آج تک یادگار ہیں۔ باوجود اِس کمال کے میر صاحب، سلطان علی مشہدی کے **تمکینی خط** کے معترف تھے۔

مرقعِ بادشاہی (جہانگیر) میں میر علی ہردی کی بھی وصلیاں تھیں ایک قطعہ میں اصولِ خوش نویسی لکھے ہیں۔ وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

چند در داوریِ خط بکنی اے دل تنگ گوئے   بشنو ایں نکتہ و چوں من بنشیں فارغ بال

پنج چیز است کہ تا جمع نہ گردد باہم   ہست خطاط شدن نزدِ خرد امرِ محال

قوتِ دست، و تونے زخط و دقتِ طبع   طاقتِ محنت و اسبابِ کتابت بکمال

گرازیں پنج قصور لیست یکے را خفا   ندہد فائدہ گر سعی نمائی صد سال

تقریباً سنہ ۹۵۰ھ میں انتقال کیا لیکن سنہ[1] وفات میں بھی اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ سنہ ۹۵۱ھ کے بعد فوت ہوئے۔ کیونکہ سام میرزا نے **کتاب تحفۂ سامی** میں اُن کو سنہ ۹۵۷ھ میں بقیدِ حیات لکھا ہے۔

(۳)

آقا عبد الرشید دیلمی قزوینی

یہ آقا رشید کے نام سے مشہور ہیں۔ **میر عماد** کے بھانجے، داماد اور انہی کے شاگرد تھے۔ میر علی۔ میر عماد اور آقا کی وصلیوں کی شناخت کرنا اور اُنکی تحریر میں امتیاز کرنا صرف ماہرِ فن کا کام ہے۔

میر **عماد** کے واقعۂ قتل سے خوف زدہ ہو کر آغازِ حکومتِ شاہجہانی میں آقا واردِ ہندوستان ہوئے۔ لاہور ہوتے ہوئے تباہی اور خستہ حالی میں آگرہ پہونچے۔ لباس میل کچیل سے موم جامہ بن کر بوسیدہ ہوگیا تھا۔ آقا نے شاہجہاں کی خدمت میں یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا[2]

قطعہ

ایا خجستہ خصالے کہ ساکنانِ فلک   بر آستانِ تو دارند میل دربانی

چہ حاجت است کہ گویم حالِ خستۂ خود   کہ حالِ خستہ دلاں را تو خوب میدانی

شہنشاہ شاہجہاں نے اظہارِ خوشنودی فرمایا۔ اور انتہائی احترام کے ساتھ اپنا درباری خوشنویس اور شہزادہ دارا شکوہ کا اُستاد مقرر کیا۔ اور پندرہ سو روپیہ ماہانہ مقرر فرمائے۔ اور حکم دیا کہ خطِ نستعلیق کو ہندوستان میں عام رواج دینا چاہیئے۔

آقا کا مرتبہ کتابت میں بہت بلند ہے۔ ائمہ فن اُن کو خطاطی کا پیغمبر سمجھتے ہیں۔ خدمتِ اتالیقی کے علاوہ شاہجہاں نے خدمتِ بیوتات پر

---

[1] مسٹر ایڈورڈ گارتھ مصنف مغل رول ان انڈیا نے میر علی ہردی کی وفات سنہ ۱۵۵۵ء لکھی ہے۔

[2] آقا عبد الرشید دیلمی کی مطلا وصلی شاہجہاں بادشاہ کی خدمت میں بھیجی گئی تھی جو بونے گیارہ انچ لمبے اور سات انچ چوڑے کاغذ پر لکھی۔ ۔ ۔ [illegible]

سرفراز کر دیا تھا۔ امیرانہ شان سے رہتے تھے۔ آگرہ میں شاندار عمارتیں اور مسافر خانے تعمیر کئے۔ بڑھاپے تک مشق جاری رہی۔ ۱۰۸۱ھ یا ۱۰۸۵ھ میں بمقام آگرہ عہدِ عالمگیری میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ اس صاحب کمال کا جانشین آجتک پیدا نہیں ہوا۔ میر علی تبریزی کا سلسلہ آقا عبد الرشید پر ختم ہو جاتا ہے[1]۔

آقا کے شاگردوں میں شاہزادہ دارا شکوہ۔ محمد اشرف خواجہ سرا سعیدائی اشرف۔ میر عبد الرحمٰن ہروی۔ اور میر حاجی بہت مشہور ہیں۔

آقا عبد الرشید کا طبقۂ متاخرین پر سب سے بڑا احسان ہے۔ جس نے ائمۂ فن پیدا کئے اور ہندوستان کے چاروں دار الخلافوں یعنی آگرہ۔ لاہور۔ دہلی اور لکھنؤ میں انھیں کی ذات گرامی سے فنِ خطاطی عروج پر پہونچا۔ انکی وصلیاں انکی زندگی میں جواہر کے مول فروخت ہوتی تہیں۔

لاہور، دہلی۔ آگرہ اور لکھنؤ کے جملہ اساتذہ میر علی تبریزی کو نستعلیق کا آدم اور میر عماد کو آدمِ ثانی تسلیم کرتے ہیں۔ آج ہندوستان میں جس قدر خطاط ہیں۔ اُن کی شاگردی کا سلسلہ میر عماد اور آقا عبد الرشید پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

(۴)

سیّد محمد امیر رضوی "میر پنجہ کش"

خطاطانِ دہلوی میں یہ آخری اُستاد تھے جو میر پنجہ کش کے لقب سے مشہور تھے۔ صحیح النسب سادات تھے۔ نیک چلن۔ نیک طینت، مہذب اور خلیق تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خوشنویسی کے ذوق کے ساتھ، پنجہ کشی، کُشتی اور بانک کا بھی شوق تھا۔ اور خطاطی کے ساتھ ساتھ مصوری نقاشی، لوح، جدول نگاری۔ صحافی، علاقہ بندی اور سنگ تراشی میں بھی اُستادِ کامل تھے۔

ایک فردِ واحد میں یہ جامعیت انتہائی کمال کی دلیل ہے۔ میر صاحب ابتدا میں **فلاطون** نامی ایک ارمنی ایبر کے معلم تھے نستعلیق قدما کے طرزِ تحریر پر لکھتے تھے۔

مولانا غلام محمد دہلوی (صاحب تذکرہ خوشنویسان) لکھتے ہیں کہ جب میں نے اس سید زادہ کو ہونہار دیکھا تو ہدایت کی کہ میاں تم **عبد الرشید** کے طرز پر لکھا کرو۔ لیکن اس زمانہ میں آقا کی وصلیاں نایاب تھیں۔ کوئی شخص ان کو دینا بلکہ دکھانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ تلف ہو جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن میں نے سید کو آقا کی وصلیاں دے دیں۔ جن کو سامنے رکھ کر سید نے مشق شروع کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر صاحب اُستاد ہو گئے۔ اور اُس کے بعد اُنھوں نے بطور خود کافی ذخیرہ وصلیوں کا جمع کیا۔ یہ سید کی خوش نصیبی تھی کہ آقا کی وصلیاں اُن کو کم داموں پر مل گئیں۔ جس کو اُنھوں نے مطلّا و مذہب کیا۔ اس کے بعد وصلیوں کی نقل شروع کی اور اُن پر عبد الرشید کا نام لکھ دیا۔ چنانچہ یہ وصلیاں آقا کے نام سے فروخت ہوئیں۔ اور کوئی اصل و نقل میں تمیز نہ کر سکا۔ اِس ترکیب نے آقا کو زندۂ جاوید کر دیا۔ اور خود مالی نفع اُٹھایا۔ میر صاحب ہر سال ماہِ محرم میں آقا عبد الرشید کا عرس کیا کرتے تھے۔ جس میں تمام خوشنویس جمع ہوتے تھے اور فاتحہ کے بعد علمی تذکرے شروع ہوتے تھے۔ جس میں علم الخط پر بحث ہوتی تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء میں کسی باغی نے گولی مار دی۔ میر صاحب نے نامور شاگرد تیار کئے اور ان کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مہاراجہ الور نے میر صاحب سے گلستاں لکھوائی تھی یہ نسخہ ریاست کے کتب خانہ میں موجود ہے جس میں نامی مصوروں نے ہر حکایت کے متعلق تصویریں بنائی ہیں۔ یہ نسخہ قیمت میں ایک لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہے۔

یہ نسخہ سترہ سال میں تیار ہوا تھا۔ احقر نے بچشم خود اُن کا دولت خانہ

---

[1] بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ آقا رشید نے لاہور میں کچھ دن قیام کیا اسی دوران قیام میں آپ کے متعدد شاگرد ہو گئے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو نستعلیق کا پہلا مرکز لاہور کو سمجھنا چاہیے۔

۷۸۶

تعارف

جدید ادبِ اردو میں "آگرہ اسکول" سے مراد وہ ادارۂ خیال ہے جو زمانے کی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر عالمِ وجود میں آیا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں دنیا نے جو ترقی کی ہے اور دنیا کے اداروں میں جو روشن خیالی پیدا ہوئی ہے ناممکن تھا کہ ادبِ اردو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ چنانچہ ہندِ جدید میں جہاں اور بہت سی تحریکیں شروع ہوئیں وہاں ادبِ اردو نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ اور علم و ادب میں نئی زندگی کا پیغام لیکر "آگرہ اسکول" سب سے آگے بڑھا۔

بار بار اس بات کا اعادہ کیا جاچکا ہے کہ "آگرہ اسکول" سے مراد کوئی شخصیت نہیں ہے اور نہ آگرہ کی مقامی حالت سے اس کی توضیح کی جاسکتی ہے۔ بلکہ یہ ایک جماعت ہے جس کا نام بعض خصوصیات کی بنا پر "آگرہ اسکول" رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے وہ ناقد جو ادبِ اردو میں انفرادیت کو بروئے کار دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں "آگرہ اسکول" کو بھی انفرادی انجمنوں میں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کوئی کہتا ہے "آگرہ اسکول" سے "مراد" "سیماب اسکول" ہے۔ کوئی سمجھتا ہے "آگرہ اسکول" آگرے کے مقامی شعرا کی پوزیشن واضح کرتا ہے۔ اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک بھی کلیتاً آگرہ اسکول نہیں۔ یہی غلط فہمی ہے جو "آگرہ اسکول" پر مضامین لکھنے والوں کو طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا کردیتی ہے۔

تاریخِ ادبِ اردو کا یہ ایک بڑا نقص ہے کہ اس میں صرف شعرا اور ادبا کی ذاتی کاوشوں کا ذکر قلم بند ہوا ہے۔ جماعتی نقطۂ نظر سے ہمارے ادب کی تعیین نہیں ہوئی۔ اگر اس ذہنیت سے قطعِ نظر کرکے "آگرہ اسکول" کا مفہوم سمجھا جائے تو اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ "آگرہ اسکول" کیا ہے؟

مولانا سیماب مدظلہ کی ذاتِ خاص آگرہ اسکول نہیں ہے بلکہ وہ بھی آگرہ اسکول کے ایک نمائندۂ جلیل ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس جماعت کے دوسرے افراد ہیں۔ اور چونکہ کسی ادارۂ خیال میں مقامیت کی تخصیص نہیں ہوسکتی اس لئے اس اسکول کے پیرو کار ہندوستان کے ہر حصے میں موجود ہیں۔

"آگرہ اسکول" کا مفہوم سمجھنے کیلئے دو باتوں کا علم رکھنا نہایت ضروری ہے:

سب سے پہلے تو انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی کی شاعری کی خصوصیات نگاہ میں رکھنی چاہئیں۔ اُن تمام قدیم الایام پابندیوں کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیئے جن میں ہمارے ادبا اور شعرا گھرے ہوئے تھے۔ اور دوسری بات جدید زمانے کی ضروریات نیز دوسری قوموں اور دوسری زبانوں کی ترقی کا علم بھی نہایت ضروری ہے۔

تعارف

جدید ادبِ اردو میں "آگرہ اسکول" سے مراد وہ ادارۂ خیال ہے جو زمانے کی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر عالمِ وجود میں آیا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں دنیا نے جو ترقی کی ہے اور دنیا کے اداروں میں جو روشن خیالی پیدا ہوئی ہے ناممکن تھا کہ ادبِ اردو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ چنانچہ ہندِ جدید میں جہاں اور بہت سی تحریکیں شروع ہوئیں وہاں ادبِ اردو نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ اور علم و ادب میں نئی زندگی کا پیغام لیکر "آگرہ اسکول" سب سے آگے بڑھا۔

بار بار اس بات کا اعادہ کیا جا چکا ہے کہ "آگرہ اسکول" سے مراد کوئی شخصیت نہیں ہے اور نہ آگرہ کی مقامی حالت سے اس کی توضیح کی جا سکتی ہے۔ بلکہ یہ ایک جماعت ہے جس کا نام بعض خصوصیات کی بنا پر "آگرہ اسکول" رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے وہ ناقد جو ادبِ اردو میں انفرادیت کو بروئے کار دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں "آگرہ اسکول" کو بھی انفرادی انجمنوں میں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کوئی کہتا ہے "آگرہ اسکول" سے مراد "سیماب اسکول" ہے۔ کوئی سمجھتا ہے "آگرہ اسکول" آگرے کے مقامی شعرا کی پوزیشن واضح کرتا ہے۔ اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک بھی کلیتاً آگرہ اسکول نہیں۔ یہی غلط فہمی ہے جو "آگرہ اسکول" پر مضامین لکھنے والوں کو طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

تاریخِ ادبِ اردو کا یہ ایک بڑا نقص ہے کہ اس میں صرف شعرا اور ادبا کی ذاتی کاوشوں کا ذکر قلم بند ہوا ہے۔ جماعتی نقطۂ نظر سے ہمارے ادب کی تعیین نہیں ہوئی۔ اگر اس ذہنیت سے قطع نظر کر کے "آگرہ اسکول" کا مفہوم سمجھا جائے تو اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ "آگرہ اسکول" کیا ہے؟

مولانا سیماب مدظلہٗ کی ذاتِ خاص آگرہ اسکول نہیں ہے بلکہ وہ بھی آگرہ اسکول کے ایک نمائندۂ جلیل ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس جماعت کے دوسرے افراد ہیں۔ اور چونکہ کسی ادارۂ خیال میں مقامیت کی تخصیص نہیں ہو سکتی اس لئے اس اسکول کے پیرو کار ہندوستان کے ہر حصے میں موجود ہیں۔

"آگرہ اسکول" کا مفہوم سمجھنے کیلئے دو باتوں کا علم رکھنا نہایت ضروری ہے: سب سے پہلے تو انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی کی شاعری کی خصوصیات نگاہ میں رکھنی چاہئیں۔ اُن تمام قدیم الایام پابندیوں کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیئے جن میں ہمارے ادبا اور شعرا گھرے ہوئے تھے۔ اور دوسری بات جدید زمانے کی ضروریات نیز دوسری قوموں اور دوسری زبانوں کی ترقی کا علم بھی نہایت ضروری ہے۔

اس نمبر سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ آگرہ اسکول کے پیرو آج زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں - ان میں وکیل بھی ہیں ڈاکٹر بھی - فاضل بھی ہیں عالم بھی - مدرس بھی ہیں کلرک بھی - ایڈیٹر بھی ہیں مصنف بھی صاحبزادگانِ ریاست بھی ہیں اور خداوندانِ دولت وجاہ بھی - شاہی نسلوں کے فرزند بھی ہیں اور سرکاری ملازم بھی - تاجر بھی ہیں اور خطاب یافتہ بھی - مذہب پرست بھی ہیں اور قوم پرست بھی - بی اے بھی ہیں اور ایم اے بھی - المختصر آگرہ اسکول آج ہندوستان کی تمام فضاؤں پر چھا رہا ہے - جس میں ایک مکمل اور جامع ہمہ گیر زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں - ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء -

اعجاز صدیقی اکبرآبادی
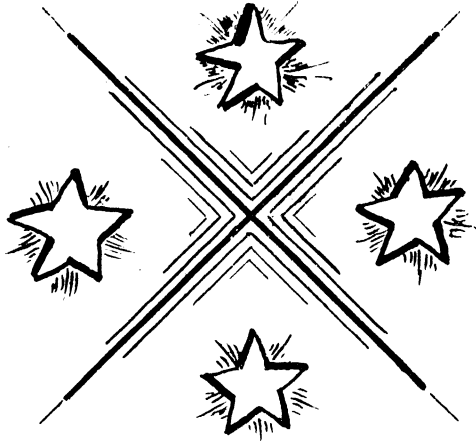
امیرِ کارواں

از ——— جناب مولانا محی الدین صاحب قائد بی اے مدیر الجمعیۃ دہلی

مشاہیر عالم کی سوانح نگاری ایک قدیم رسم ہے جس کا سلسلہ آغاز تاریخ سے قائم ہے اور وہ اپنی افادیت کے اعتبار سے ہر دور میں فضلائے عصر اور ماہرین فن کا شغل مخصوص رہی ہے۔ فن سوانح نگاری بظاہر سہل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اپنی گوناگوں ذمہ داریوں اور اہم پیچیدگیوں کے باعث یہ فن بیحد دشوار اور صداقت آزما ہے۔ سوانح نگار کو کسی جلیل القدر انسان کے واقعاتِ زندگی مدون کرتے وقت ہر منزل پر انواع واقسام کی مشکلات ومضائق پیش آتی ہیں۔ وہ اگر دیانت وامانت کیساتھ ان دشوار گذار گھاٹیوں میں سے گذرتا ہے تو "معتمد ومستند" کہلاتا ہے اور اگر تنگ نظری وجنبہ داری یا تنقیص وتحسین کا مرتکب ہے تو "کمزور وضعیف" کہلاتا ہے۔

سوانح نگاری کے اجزاءِ ترکیبی

میرے زاویہ نظر سے اگر حقیقی سوانح نگاری کا تجزیہ کیا جائے تو وہ حسب ذیل عناصر سے مرکب نظر آتی ہے۔

(۱) واقعات وکوائف زندگی بہ تمام وکمال موجود ہوں۔

(۲) سوانح نگاری کی طرف سے ناجائز عصبیت اور نارواتنقیص وتحسین نہ ہو

(۳) ترتیب وتدوین میں افادیت ملحوظ رہے۔

(۴) موصوف کیساتھ انصاف مدنظر ہو۔

ان تمام عناصر کے امتزاج لطیف سے سوانح نگاری کا وہ مکمل شاہکار تیار ہوتا ہے جو درحقیقت سوانح نگار اور جمہور دونوں کے لئے ایک قیمتی اور حیات آفریں سرمایہ ثابت ہوتا ہے اور اس کی افادیت یگانہ وبیگانہ سب محسوس کرتے ہیں۔

سوانح نگاری کا کمزور پہلو

فن سوانح نگاری کی یہ تعریف وتحدید بظاہر نہایت جامع اور مانع ہے لیکن شاعر کی سوانح نگاری پر یہ تعریف بھی صادق نہیں آتی اور اس کی متنوع الجوانب اور جذباتی زندگی کو سمجھنے کیلئے ایک نیا معیار سوانح نگاری تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر کی زندگی میں ٹھوس واقعات ہنگامہ آرا کارنامے۔ اور دور آفریں سوانح نہیں ہوتے اور نہ اس کی اقلیم حیات میں اقتصادی سرگرمیاں۔ سیاسی مظاہرے اور مذہبی ہنگامے ہوتے ہیں جن کو ترتیب وطبع کیساتھ مدون کر کے سوانحِ حیات مرتب کرلی جائے۔ شاعر کی زندگی احساسات وتاثرات اور ادراکات ووجدانیات کا ایک لطیف مجموعہ ہوتی ہے جس کے آثار ومظاہر سطح عالم پر کم نمودار ہوتے ہیں لیکن اس کے اشعار کے ایک ایک مصرعہ اور ایک ایک لفظ میں جلوہ طراز رہتے ہیں۔ شاعر کی زندگی کو اس کی شاعری سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ شاعر کے افکار وخیالات۔ جذبات ومحسوسات افعال واعمال اور سیرت وکردار سب کچھ شاعرانہ ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کی ہر چیز

میں شعریت محسوس کرتا ہے۔ کائنات میں شاعرانہ روح دائر و سائر دیکھتا ہے ہر چیز کو شاعرانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ شاعرانہ دماغ سے ادراک کرتا ہے۔ اور شاعرانہ قلب سے محسوس کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ شاعر کیلئے تمام کائنات شعر ہے اور وہ اس کا شاعر۔

سوانح نگاری کا شاعرانہ معیار

متذکرۂ صدر حالات و اسباب کی بنا پر سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ شاعر کے حالات زندگی مدون کرتے وقت سوانح نگاری کے عام مروج اور معیار سے علیحدہ ایک شاعرانہ معیار قائم کرے اور ٹھوس حالات و واقعات کی بجائے شاعر کے نتائج فکر کا مطالعہ کرے اور اس کی اشعار کی گہرائیوں میں پہونچ کر اس کے جذبات و خیالات معتقدات و رجحانات و ذہنی نشو و نما اور روحانی ترقی و تجلی کا اندازہ لگائے اور یہ معلوم کرے کہ خارجی اثرات و عوامل اور تحریکات و ترغیبات نے کس کس طرح اس کے قلب و دماغ کو پرورش کیا ہے۔ سوانح نگار جس قدر وسعت احاطہ اور گہنہ رسی و عمق نظر کیساتھ کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرے گا اسی قدر بسط و تفصیل کیساتھ شاعر کی زندگی اس کے سامنے آ جائیگی اور اسکو زندگی کے خارجی آثار و مظاہر اور داخلی محرکات و عوامل میں مطابقت پیدا کرنا آسان ہو جائے گا میں سمجھتا ہوں کہ سوانح نگاری کا یہ معیار شاعر کی زندگی کو بہ تمام و کمال پیش کر سکتا ہے اور سوانح نگار اس معیار پر عمل پیرا ہو کر ان تمام اہم فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو شاعر کی ناہموار و عجوبہ کار زندگی کے عجیب و غریب واقعات کو مدون کرنے میں پیدا ہوتے ہیں۔

شاعر کو "ملہم علیہ" کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ فلسفیانہ یا شاعرانہ نہیں بلکہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس کے محیر العقول مظاہرے روزانہ دیکھنے میں آتے ہیں اور ہر صاحبِ دل انسان، اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ فلسفہ و منطق دلائل و براہین۔ ثروت و وجاہت۔ قوت و سطوت سحر و طلسم اور دنیا کی بڑی سے بڑی قوت جو کارنامہ نہیں کر سکتی۔۔۔ وہ شاعری کر دکھاتی ہے شاعر کی قوتیں کسبی نہیں۔ بلکہ وہبی ہیں۔ فلک ہشتم سے اس کے دل پر الہام ہوتا ہے اور وہ الہامی قوتوں کیساتھ وہ اعجاز نمائی و طلسم آفرینی کرتا ہے جو زندگی کے معمولی حالات میں نظر نہیں آتی حقیقت یہ ہے کہ شاعر کی کار فرمائیاں خرق عادات کے مترادف ہوتی ہیں اور اس لئے وہ سطح زمین پر ذہنی و قلبی۔ اخلاقی و مذہبی۔ اقتصادی و سیاسی اور وہ وہ انقلابات رونما کر سکتا ہے جو بشری طاقت سے باہر ہیں۔ شاعر اپنی الہامی قوتوں سے افراد کی اصلاح و تباہی قوموں کے عروج و زوال اور ملکوں کی ترقی و تنزلی کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ایک موزوں، موثر اور درد انگیز شعر سے وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو آتشبار مشین گنیں، بمبار طیارے اور حیات سوز تیر و تفنگ نہیں کر سکتے۔ شاعر کی یہ تمام کرشمہ سازیاں فہم و تدبر اور عقل و دانش کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ اسی ملہم حقیقی کی اعجاز نمائیاں ہیں جو کسی قانون و ضابطہ اور دستور و آئین کا پابند نہیں۔ بلکہ اپنی مشیت ربانی سے جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے وہ ہوتا ہے " ویفعل اللہ ما یشاء " شاعر کی یہی اعجاز آفرینیاں یا بہ الفاظ دگر تلون کاریاں ہیں جو اس کی زندگی میں ناقابلِ عبور نشیب و فراز پیدا کر دیتی ہیں۔ اور بالخصوص سوانح نگار کے لئے جو ہموار سطح واقعات پر چلنے کا عادی ہے۔ ایسی ایسی اڑیل چٹانیں اور سنگ گراں کھڑے کر دیتی ہیں جو ہٹائے نہ ہٹیں اور نہ قابلِ گذر ہوں۔

سوانح نگار کیلئے یہ منزل نہایت کٹھن اور دشوار گذار ہوتی ہے لیکن اس کی وسعت مطالعہ۔ تعمق نظر۔ عدم عصبیت اور افادی نظریہ اس کی مشکلات کا حل پیدا کرتا ہے اور وہ کامیابی کیساتھ الفاظ کے جامہ میں شاعر کی رنگین و متلون زندگی کو پیش کر دیتا ہے۔

حضرت سیماب

سوانح نگاری کا شاعرانہ معیار متعین ہو جانے کے بعد، میں سمجھتا ہوں کہ میرے پیش نظر خاکہ کے بنیادی خطوط قائم ہو گئے ہیں اور اب میں سہولت کیساتھ سیماب کو

اور اُن کی شاعرانہ زندگی کو صفحۂ قرطاس پر پیش کر سکتا ہوں۔ سیماب شاعر ہیں اور اُن کی زندگی بھی ٹھوس حوادث و واقعات کی بجائے ان پُرکیف تعزیت و احوال اور شاعرانہ تاثرات و محسوسات کی سرمایہ دار ہے جو ایک شاعر کا خزینۂ حیات ہوتے ہیں اور جن کا امتزاج لطیف اور اظہار موزوں اُسکی زندگی کا دلچسپ مشغلہ اور اُس کی تخلیق کا اہم کارنامہ ہوتا ہے۔ شاعری سیماب کا طبعی و فطری ذوق ہے۔ بچپنے میں یہ ذوق نمودار ہوا۔ جوانی میں نشو ونما پائی اور بڑھاپے میں پختہ کار ہو کر جلوہ طراز ہو گیا۔ سیماب کی تمام زندگی ایک مربوط و مسلسل شعر ہے جس کے بعض اجزا پست اور مدھم ہیں اور بعض اجزا بلند آہنگ و غلغلہ انداز۔ بچپنے کی نادانیاں جوانی کی شعبدہ سامانیاں اور بڑھاپے کی سنجیدگیاں بظاہر حیات سیماب کے تین مستقل باب ہیں لیکن وہ درحقیقت ایک ہی شعر کے مختلف ارکان ہیں اور ان میں ارتقائے شعریت ہی کے مختلف مدارج نظر آتے ہیں شعریت کی تخلیق شعریت کی نشو و نما شعریت کا عروج و کمال اور شعریت کی مدارج ترقی و تحلی۔ "سیماب کے "سوانح حیات" ہیں اور انہی کی ترتیب و تدوین اگر کسی حد تک ہو جائے۔ میری جد و جہد کا اساسی مقصد و منشا رہیں جانتا ہوں کہ مجھ کو اس سلسلہ میں خارجی حالات و سوانح سے امداد نہیں ملے گی بلکہ محض سیماب کے نتائج افکار سے استصواب و استفادہ کرنا پڑیگا اور سیماب کو خود سیماب کے کلام کی گہرائیوں میں۔ جذبات کی رفعتوں میں اور اکات کی لطافتوں میں اور تخیلات کی وسعتوں میں تلاش کرنا پڑیگا اور ظاہری حالات سے بے نیاز ہو کر باطنی کوائف پر اعتماد کیا جائے گا۔

اساس کار۔ لائحہ عمل اور نصب العین کے تعین کے بعد اب صرف یہ سوال بحث طلب رہ جاتا ہے کہ سیماب کے سوانح حیات سے اُن کی زندگی کے خارجی پہلو کو بالکل خارج کر دیا جائے یا ظاہر و باطن۔ محسوسات و احساسات اور روحانیت و مادیت میں ربط قائم رکھنے کیلئے داخلی پہلو کیساتھ ساتھ خارجی پہلو کو بھی پیش کیا جائے اور سیماب کے تاثرات و ادراکات پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی بتایا جائے کہ خارجی ماحول میں ان کا سرچشمہ کیا ہے اور کس قسم کے محرکات و عوامل سے کس قسم کے اثرات و نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر زندگی کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کو بھی قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا تو سوانح نگاری کا حق ادا نہ ہوگا بلکہ موضوع بحث تشنۂ تکمیل رہ جائے گا۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ زندگی کے دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ پیش کیا جائے۔

حضرت سیماب کے سوانح حیات کو میں دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہوں اول وہ جو سیماب کی زندگی کا خارجی رُخ پیش کرتے ہیں اور سیماب کو دنیاوی ماحول میں چلتا پھرتا۔ او تنعمات زندگی سے خوش وقت و مسرور اور مضائق حیات سے مغموم و کبیدہ خاطر ہوتا دکھائیں گے اور دوسرے وہ جو سیماب کی شاعرانہ زندگی کے مختلف لمحات۔ اس کے دل و دماغ کے مدارج نشو و نما۔ اس کے خیالات و معتقدات جذبات و محسوسات اور امیال و رجحانات پیش کریں گے۔ مقدم الذکر کو میں سطحی طور پر بعض اہم اقتباسات کیساتھ پیش کروں گا اور موخر الذکر کو جو موضوع زیر نظر کا اہم ترین حصہ ہے سیماب کے افکار و اشعار کی شہادت سے قلمبند کرنے کی کوشش کروں گا۔

جناب سیماب کے خارجی رخ کو تسہیل مقصد کیلئے میں چار دوروں میں تقسیم کرتا ہوں اور ہر دور میں وہ حالات و کوائف پیش کروں گا جنہوں نے خارجی طور پر سیماب کی شاعرانہ زندگی کی تشکیل و تعمیر کی اور سیماب کو "سیماب" بنا دیا۔

دورِ اول سیماب ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں بروز دوشنبہ وقت صبح آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم اپنے زمانہ کے ایک مقتدر و متبحر عالم تھے۔ وہ اجمیر شریف میں ٹائمز آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے۔ اور اپنے دنیاوی مشاغل کیساتھ ساتھ دینیات کے دلدادہ اور شرع شریف کے پابند تھے۔ مذہب اور فلسفۂ اخلاق سے ان کو خاص شغف تھا اور ان کی

کے اہم ترین مقاصد عامۃ المسلمین کی رہنمائی۔ تزکیۂ قلوب اور تبلیغ مذہب تھے۔ مولانا موصوف کو تصنیف و تالیف سے بھی بیحد دلچسپی تھی۔ آپ کی تصانیف مجموعۂ شہادت، کرامات غوثیہ اور گلدستۂ عطار کے چار حصے آج تک مقبول و مروج ہیں۔ ایک ماہوار رسالہ "مشعر الحدیث" آپ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور رسالہ "رہنما" کی ترتیب و تدوین بھی آپ کی ہی رہین منت تھی۔ مولانا مرحوم حکیم امیر الدین عطار اکبر آبادی کے ایک ممتاز شاگرد تھے اور انہی کے فیض صحبت سے شعر و شاعری سے بھی مناسبت رکھتے تھے۔ لیکن آپ کی شاعری مروجہ اسلوب شاعری سے سراسر مختلف تھی اور اس میں فلسفۂ اخلاق اور معارف مذہب کا رنگ غالب تھا۔ فن خطابت و وعظ گوئی میں آپ تمام راجپوتانہ میں فقید المثال واعظ تسلیم کئے جاتے تھے اور ہزارہا بندگان خدا آپ کے مواعظ حسنہ سے بہرہ اندوز اور مستفیض ہوتے تھے۔ آپ نے ۱۶ اپریل ۱۸۹۷ء کو بمقام آگرہ انتقال فرمایا۔

ایسے باپ کی آغوش تربیت میں سیماب نے آنکھ کھولی۔ اور ان کی روح پرور فیض و برکات کے سایہ میں نشو و نما پائی۔ بچپنے میں مشاہیر علمائے عصر حضرت مولانا جمال الدین سرحدی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حضرت مولانا قمر الدین اور حضرت مولانا عبد الغفور کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اور ان سے فارسی و عربی اور علوم مروجہ ادب، اصول اور منطق اور علم عروض کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد انگریزی مدرسہ میں داخل ہو کر انگریزی تعلیم پائی۔ برانچ اسکول کے مدارج درس طے کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے اور وہاں مولوی سعید الدین قریشی اکبر آبادی مولوی تحسین علی اجمیری اور مولوی عابد حسین کی عالمانہ مجالس اور فاضلانہ صحبتوں سے استفادہ کیا۔

سیماب کو عہد طفولیت ہی سے شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا۔ بہ الفاظ دیگر اس کا فطری ذوق جو باپ کی جانب سے اسے بطور میراث ودیعت ہوا تھا۔ بچپنے ہی میں بیدار ہوا اور اسنے ۱۸۹۲ء میں جبکہ وہ فارسی و عربی کی کتب متداولہ پڑھنے میں مصروف تھا رسمی طور پر شعر گوئی شروع کر دی۔ اس وقت سیماب کی عمر ۱۲ برس سے زیادہ نہ تھی اسکے ادراکات و احساسات معصوم تھے۔ معلومات محدود تھیں۔ لیکن اس کا فطری ذوق جو ازل سے ودیعت ہوا تھا۔ تعینی کیساتھ کارفرما تھا اور وہ انتہائی شغف کیساتھ سنے سنائے اشعار کا چربہ اتارنے یا فارسی و عربی کے درسی اشعار کا منظوم اردو ترجمہ کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ سیماب کا دستور تھا کہ وہ ہاتفی، جامی، سعدی، عرفی اور قاآنی وغیرہ کے اشعار و قطعات کا ترجمہ اردو نظم میں کر کے اپنے اساتذہ کے سامنے پیش کیا کرتا تھا اور یہ مقدس حضرات ازراہ کرم اس جسارت کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ یہ جسارت رفتہ رفتہ اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی سیماب فارسی نظم کا ترجمہ اردو میں کرنے لگا اور ارباب ذوق ممتحنین نے اس بدعت حسنہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سیماب کا ذوق شعر وسعت علم کیساتھ روز بروز بڑھتا گیا اور اب اس کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ روزانہ رات کو تمام کاموں سے فارغ ہو کر ایک پرسکون گوشہ میں شمعدان سامنے رکھ کر بیٹھتا تھا اور کسی ایک زمین میں جس قدر قوافی اسکو یاد آتے تھے ان کی مناسبت سے اسی قدر اشعار لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اگر کوئی قافیہ عسیر العبور ہوتا تھا تو وہ کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں ایک ہی شعر موزوں کرنے میں صرف کر دیتا تھا۔

۱۷ برس کی عمر تک شعر گوئی کا یہ پرسکون طریقہ بدستور جاری رہا اور مشق کی کٹھن منازل عافیت و اطمینان کیساتھ طے ہوتی رہیں۔ لیکن ۱۸۹۷ء میں جب سیماب کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور تمام خانگی ذمہ داریاں ایک سترہ سالہ بچہ کے نحیف دوش پر آپڑیں تو اس وقت سیماب کی زندگی کا ایک نیا عنوان قائم ہوا۔ اور اس کو نئے حالات سے روشناس ہونا پڑا۔ اقتصادی مشکلات نے سیماب کو چاروں طرف

آگھیرا اور بالآخر اس نے کالج کی حیات آفریں زندگی کو خیرباد کہہ کر ایف اے کا امتحان دینے سے قبل ہی سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا اور گرہستی کی زندگی کے اہم فرائض بجا لانے کیلئے وسائل معیشت کی طرف اقدام عمل کیا والد ماجد کے انتقال اور ترک تعلیم کے بعد سیماب

دورِ دوم

کی شادی ہو گئی اور اس طرح زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا، مشق سخن اب بھی جاری تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کیساتھ گو مشاعروں کی شرکت یا غزل سرائی کیلئے طبیعت آمادہ نہ تھی تاہم ایسی صحبتوں میں شریک ہونا ہی پڑتا تھا۔

گردشِ روزگار اور انقلاب زمانہ سے سیماب کو بھی دوچار ہونا پڑا ظاہر ہے کہ خانہ داری کی ذمہ داریاں بہت اہم ہوتی ہیں، اسی سلسلے میں بصیغۂ ملازمت کانپور جانا پڑا اور یہاں لکھنؤ کے اکثر شعرائے معصر کے ساتھ شعر و سخن کی صحبتیں رہیں، ذوق بڑھتا رہا، مشق جاری رہی طبیعت کی ذہانت حوصلے بڑھا رہی تھی، اور دل کی امنگیں برق رفتاری کیساتھ سروشِ غیب سے راز و نیاز میں مصروف تھیں لیکن ابھی اپنی فکرِ سخن سے اطمینان نہ تھا اور کسی رہنما کی جستجو تھی آخر ۱۸۹۸ء میں فصیح الملک مرزا داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور اب ترقی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہ تھی۔ فاضل و کامل استاد کی رہنمائی اور اپنی شب و روز کی محنت سے بہت جلد غزل کے میدان کو جیت لیا مشقِ سخن کی تکمیل اور کئی سال تک اصلاح لینے کے بعد طبیعت کے جوہر کھلے استاد کی بعد اصلاح کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اور اپنی فطری استعداد کے سہارے یہ نوجوان سال شاعر برابر ترقی کرتا رہا۔ اسی زمانے میں اکبرآباد کے چند حضرات سیماب کے شاگرد بھی ہوئے اور اس طرح اس کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

کل فکرِ سخن کی ابتدا ہوئی تھی، پھر ایک رہنما کی ضرورت ہوئی اور پھر اس کی بھی ضرورت نہ رہی اور آج فطرت نے خود موقع دیا کہ وہ دوسروں کے کلام پر اصلاح دے۔ یہ سب کچھ اس قدر جلد اور اتنے مختصر عرصے میں ہوا جو ایسے اہم ترین واقعات کے لئے بالکل ناکافی ہوتا ہے ایسی صورت میں اسکے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ فطرت نے خود سیماب کی رہنمائی کی اور اسکے درخشاں مستقبل کی ایک جھلک ابتدا ہی میں دکھا دی۔ واقعات کی رفتار دیکھتے ہوئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ سیماب نے جس قدر جلد اور جتنی قابلِ رشک ترقی کی اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

سلسلۂ شعر و سخن جاری تھا، مشاعروں میں کامیابی شریکِ حالِ سیماب تھی، شہرت عزت اور قبولیت قدم بوس تھی اور ہندوستان کا یہ نوجوان شاعر برابر ارجمندی حاصل کرتا جا رہا تھا کہ روحانی تشنگی محسوس ہوئی، دل کی آنکھوں نے کسی کا جلوہ دکھایا، تشنگی کچھ اور بڑھی، طلب صادق تھی، ذوق راسخ تھا جو ایک دن دیوہ شریف لے پہنچا اور سیماب نے حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے دست پاک پر بیعت حاصل کی۔ مرشد کی توجہ اور نگہہ کرم نے نوازا، "فصیح" کا خطاب ملا، ذوقِ شعری کو سندِ قبولیت عطا ہوئی اور شاعر روحانی برکات سے مالا مال کر دیا گیا۔

کسے خبر تھی کہ مرشد کا ارشاد مشیت کا اعلان تھا؟ کون جانتا تھا کہ سیماب کی شہرت عالمگیر ہو گی؟ اور کسے یقین تھا کہ اس کی گرم نوائی ہندوستان کو ایک نئی کروٹ بدلوا دے گی، لیکن ایسا ہی ہوا، ہندوستان کے گوشے گوشے پر سیماب چھا گیا کسی نے "افصح الملک" کا خطاب دیا تو کسی نے "اکمل الشعرا" کا، کسی نے "ہندوستان کا شاعرِ اعظم" تسلیم کیا تو کسی نے عرفی ہند اور عصرِ حاضر کا سب سے ممتاز ادیب مانا۔ غرضکہ سیماب کو وہ قبولِ عام حاصل ہوا اور وہ شہرت و عزت نصیب ہوئی کہ باید و شاید اس وقت کے رسائل اور اخبارات میں سیماب خوب خوب جلوہ گر ہوا۔ ان میں صوفی، نظام المشائخ اور صبح بنارس خاص طور پر

قابلِ ذکر ہیں۔ جب آگرہ آنا ہوا تو کچھ نئے طلبائے شعر شاگرد ہو گئے اور اس طرح یہ تعداد برابر بڑھتی گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ سیماب کو بسلسلۂ ملازمت پھر اجمیر شریف جانا پڑا مگر اس تغیر کیساتھ کہ پہلے یہاں بچپن کا زمانہ بسر کیا تھا۔ تعلیمی زندگی گذاری تھی، شاعری کی ابتدا کی تھی اور اب اُس کے بالکل برعکس تھا، اس شان اور اس ترقی کیساتھ سیماب کا اجمیر آنا بہت گہرے اثرات رکھتا تھا تمام اجمیر میں دھوم ہو گئی بڑے بڑے معرکے کے مشاعرے پڑھے اور یہاں بھی چند حضرات نے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ یہیں سے اپنی ادارت میں رسالہ "فانوسِ خیال" جاری کیا۔

اجمیر شریف سے آگرہ واپس آنے کے بعد شاگردوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا رسالہ "مرصّع" کی ادارت کی۔ شاید فطرت کو منظور نہیں تھا کہ ابھی سیماب کسی ایک شہر میں مستقلاً مقیم رہے اس لئے آگرہ میں کچھ زیادہ قیام نہیں رہا اور ملازمت کی ضرورت ٹونڈلہ لے پہنچی وہاں کئی سال تک کام کیا، شعر و شاعری کے بڑے چرچے رہے یہاں بھی کئی شاگردوں کا اضافہ ہوا۔ "آگرہ اخبار" کی ادارت کے فرائض بھی اسی زمانہ میں انجام دیئے۔ غرضکہ ٹونڈلہ کے قیام تک سیماب کی زندگی مختلف درجات سے گذرتی رہی لیکن ذوقِ شعری یا مشقِ سخن میں سرمو فرق نہیں آیا۔ اور یہی وہ چیز ہے جو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ سیماب کا ذوقِ شعری زمان و مکان کا محتاج نہ تھا۔ غالباً فطرت اپنے ایک پیغمبر کی مستقل مزاجی کا امتحان لے رہی تھی ورنہ ضروری نہ تھا کہ اسے ایسی ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا جاتا۔ لیکن خدا جسے اپنے لازوال خزانوں سے ذوقِ حقیقی کی دولت عطا فرماتا ہے اس پر ماحول کی پراگندگی، وقت کی ناسازگاری، حالات کی غیر آہنگی کچھ بھی اثر نہیں کرتی۔ ایسا ہی سیماب کیساتھ ہوا۔ اس نے ہر حال اور ہر رنگ میں اپنے ذوق و شوق کو جاری رکھا اور آخر کار اپنی منزلِ مقصود کو پا لیا۔

دورِ سوئم: اپنی عمر کا کافی حصہ ملازمت کی نذر کرنے کے بعد سیماب نے محسوس کیا کہ اس کا مقصدِ حیات غلامی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ اس نے اسی جذبے کے ماتحت ہمیشہ کے لئے ملازمت کو خیرباد کہہ دیا ہر چند کہ اس طرح بہت سے مادی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا مگر اس ذیل میں جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ بہر طور غالب رہا اور سیماب نے مستقلاً اپنے وطن آگرہ میں قیام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ترکِ ملازمت کے بعد سب سے اہم سوال کسی خوبصورتی کیساتھ خدمتِ ادب و شعر کی ابتدا کا تھا، اُن کے شاعرانہ دماغ نے اس کا انتظام بھی بہت معقول کر دیا۔

سیماب نے اگست ۱۹۲۹ء میں "پیمانہ" جاری کیا اور ذہنی اشتغال کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پیمانہ کے اجراء کے بعد ہی ادبی خدمات کی نئی نئی راہیں نکل آئیں جن کی ذمہ دارانہ حیثیت بہت اہم تھی، شاگردوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا، اور ادبی ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی تھیں "پیمانہ" ترقی کر رہا تھا اور سارا ہندوستان اسکی ادبی خدمات کا اعتراف کر رہا تھا۔ "پیمانہ" کی بڑھتی ہوئی اشاعت و ترقی نے دنیائے صحافت میں گونج پیدا کر دی۔ اس وقت "پیمانہ" ہندوستان کا سب سے کامیاب رسالہ تھا مگر اس کی یہ کامیابی ایک فوری انقلاب کا شکار ہو کر رہ گئی یعنی اسے آگرہ سے لاہور منتقل کیا گیا اور اس غیر ضروری نقل و حرکت نے اسے بحدِ کافی نقصان پہونچایا۔ ادھر لاہور کی آب و ہوا راس نہ آئی اور مجبوراً آگرہ واپس آنا پڑا۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں سیماب نے ایک ایسا کارِ عظیم انجام دیا جسے اب تک عہدِ حاضر کا کوئی شاعر مکمل نہ کر سکا تھا وہ کارِ عظیم مثنوی مولانا رومؒ کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ سیماب نے اپنی زندگی میں جہاں اور بہت سے کارنمایاں کئے ہیں اُن میں سب سے افضل کارنامہ یہی ہے جسے قیامت تک دنیا فراموش نہ کر سکے گی۔

آگرہ آنے کے بعد ابھی کاروبار کے از سرِ نو استحکام کے متعلق غور ہی کیا جا رہا تھا کہ سردار دیوان سنگھ مفتوں نے اخبار ریاست

کی ادارت کے لئے دہلی بلالیا۔ جن لوگوں نے عہد سیماب کا "ریاست" دیکھا ہے وہ گواہ ہیں کہ اس وقت اس اخبار کی کیا شان تھی "پیمانہ" پھر دہلی سے جاری ہوا مگر چل نہ سکا۔ آخرکار سیماب کو پھر آگرہ واپس آنا پڑا۔ اور اب استقلال کیساتھ یہیں قیام کرنے کا ارادہ کرلیا گیا۔

دور چہارم

ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں سے اب بھی سیماب کو بلایا جارہا تھا۔ مگر سرزمین تاج کی کشش سب پر غالب آگئی اور پھر آخر یہیں کام شروع کردیا گیا۔ اب سیماب نے ۱۹۲۹ء سے ایک ہفتہ وار اخبار "تاج" کے نام سے جاری کیا جو بے حد مقبول ہوا ۱۹۳۰ء میں قصر الادب سے ایک نیا رسالہ "شاعر" جاری ہوا اور "پیمانہ" بھی جاری کیا گیا یہ تینوں جرائد بڑی کامیابی کیساتھ عرصے تک جاری رہے۔ مگر اس کو کیا کہئے کہ اردو صحافت کے احیاء و استحکام کے لئے ہندوستان کی فضا مناسب نہیں ہے یہاں ہر روز نئے اخبار اور رسالے نکلتے ہیں مگر انہیں دوام نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہندوستانی بڑی تعداد میں کور ذوقی کا شکار ہیں۔ ایسے ہی حالات سے "تاج" اور "پیمانہ" کو بھی دوچار ہونا پڑا اور افسوس کہ دونوں بند ہوگئے۔ تاج کا "بہار ایام" آج تک ادب نواز اور علم دوست حضرات کے دماغوں میں شور افگن ہے اور پیمانہ کی رنگینیاں آج تک کہانیوں اور افسانوں کی طرح ادبی حلقوں میں دہرائی جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ "شاعر" ان حادثات سے محفوظ رہا جو اب تک جاری ہے اور اپنی خدمات سے تمام ہندوستان کے شعراء کو مستفیض کر رہا ہے۔

سیماب نے اپنی عمر میں اس قدر مشاعرے پڑھے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ قریب قریب ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر کے مشاعروں میں شرکت کی ہے لیکن اب مشاعروں کی شرکت بہت کم ہوگئی ہے۔ کچھ تو عمر کا تقاضا ہے اور کچھ مصروفیت زیادہ سفر کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

سیماب صاحبِ اولاد ہیں اور اس اعتبار سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ چاروں صاحبزادے باپ کی قائم کی ہوئی شاہراہِ ادب پر گامزن ہیں اور ادب و شعر کی خدمت کو اپنے لئے فرض سمجھے ہوئے ہیں اسوقت سیماب کے تلامذہ کی تعداد کافی ہے جو ہندوستان کے ہر گوشے میں موجود ہیں جب تک قدرت خاص قسم کا دماغ عطا نہ فرمائے اتنی بڑی جماعت کی قیادت کس طرح ممکن ہے؟

سیماب کی جنبش قلم اور کاوش و توجہ سے ہندوستان کی ایک بڑی جماعت کی ذہنی و فکری تربیت ہو رہی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ادب میں سیماب کا یہ ایثار و خدمت سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

سیماب کی تصانیف کی تعداد بھی کافی ہے جن میں ہر موضوع پر مفید کتابیں موجود ہیں۔ عورتوں بچوں مردوں اور لڑکیوں غرض کہ سب کے لئے سیماب نے پر از معلومات اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں ان میں سے اکثر کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں بھی ہوچکے ہیں۔ مذہبی نظموں کا ایک مجموعہ "ستاں" عرصہ ہوا شائع ہوچکا ہے۔ ادبی اور سیاسی نظموں کا مجموعہ "کارِ امروز" اور ایک دیوان "کلیم عجم" بھی شائع ہوچکا ہے اور ابھی چند نادر ترین تصانیف زیر ترتیب و تسوید ہیں۔

مشاعروں میں خطبہ خوانی کا رواج صرف سیماب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ نظموں کے رواج میں سیماب کی توجہات کو بڑا دخل ہے۔ اور بہت سے فنی و شاعرانہ نکات کی عقدہ کشائی بھی سیماب ہی کی کاوش و محنت کا نتیجہ ہے۔ گو اس وقت عمر ۵۰ سال کے قریب ہے مگر عملی جد و جہد اور خدمتِ ادب و شعر کا جذبہ ہنوز جوان ہے۔ ترقی کی نئی نئی منزلیں سامنے آرہی ہیں اور یہ شہسوارِ ادب سب کو طے کرتا ہوا منتہائے کمال تک پرواز کرتا چلا جارہا ہے۔ ان ہی کم و کاست حالات کے مطالعہ سے سیماب کے سوانح حیات

بطور مختصر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ہمیں اسے پہچاننے میں آسانی ہوجاتی ہے کسی باکمال شاعر کی زندگی اور اور اس کے عہد کی مختلف روداد پر روشنی ڈالنا سوانح نگار کا فرض ضرور ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان حالات کی تکمیل کے لئے بڑی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر دیتا ہوں۔

اس کے بعد ہمارا موضوع ثانی سیماب

سیماب کی شاعرانہ زندگی

کی شاعرانہ زندگی ہے ۔جس کا اشارہ صفحاتِ اوّلین میں کیا گیا ہے۔

شاعرانہ زندگی کی ابتدا ہمیشہ فکر مندانہ ماحول سے ہوتی ہے۔ یہاں اگر شاعر اپنی معاشرتی اور روزانہ زندگی کی پابندیوں کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔اقتصادی مشکلات کا مقابلہ، ماحولی دشواریوں کا سامنا، گرہستی کے کھیڑوں کی صبر آزمائی، ایک ادیب اور ایک محقق شاعر کے لئے لوازمِ کمال ہیں۔ ہم نے ابتک کسی شاعر کو نہیں سنا کہ اس نے بے فکر اور آزاد زندگی بسر کی ہو سیماب خود اس کلیہ کی دلیل دیتا ہے اور کہتا ہے کہ

شاعر کے نصب العین میں ہے کامیابی خلق کی ۔ مقصد میں ہے اس لئے وہ فطرتاً ناکام ہے

وہ خود بھی اس کلئے سے مستثنیٰ نہ رہا۔ امارت و ریاست اس کی زندگی کے کسی حصے میں تہ یک حال نظر نہیں آتی۔ آج بھی نہ اس کے پاس فٹن ہے نہ موٹر ہے نہ کوئی عالی شان حویلی ہے نہ کوئی جاگیر ہے ۔نہ کوئی منفعت تجارت ہے۔ گو وہ اپنی مسندِ ادب پر بیٹھ کر حاکمیت اور محکومیت کی لعنتوں سے بے نیاز، تمام دنیا پر اپنے قلم سے حکومت کر رہا ہے لیکن شاہی سکون و آرام اور مادی طمطراق و احتشام اسے نہ کبھی میسر ہوا، نہ آج میسر ہے۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتا، تعلق پسند اور شخصیت پرست ہوتا تو حیدرآباد اور بھوپال یا کسی اور اسلامی ریاست کی منصب پذیری اس کے علم و فضل اور ذہن و دماغ کی موجودگی میں مشکل نہ تھی۔ اگر وہ جاہ و دولت پسند کرتا، تو آج سرکاری دفاتر میں کسی بڑے عہدے پر ممتاز ہوتا۔ اگر وہ قوم فروش ہوتا تو آج اس کا اخبار لاکھوں کی تعداد میں اشاعت پذیر ہوتا۔ اگر وہ بے ضمیر ہوتا تو کسی رئیس کی مصاحبت، یا "شاعر دربار" ہونے کی فضیلت تو اُسے ضرور ہی مل جاتی۔ لیکن وہ شاعر ہے۔ صرف شاعر ہے۔ اس لئے اس نے ادبی فقیری کو دنیا کی امیری پر ترجیح دی۔ اُس نے دُنیوی وجاہت کو ٹھکرا دیا اور اس نے ظاہری امارت و دولت کو لات مار دی۔

اس کا یہ ایثار اگر صرف انہیں قربانیوں تک محدود رہتا تو چنداں افسوس ناک نہ تھا لیکن یہ معلوم کرکے ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ باوجود اس ایثار و قربانی کے بھی ملک نے "اپنے شاعر" کی قدر نہ جانی۔ قوم اُس کی سکونِ حال کی طرف متوجہ نہ ہوئی اور خود اس کی عظیم و وسیع جماعت نے بھی اُسے آلامِ حیات سے سبکدوش کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

"مرض نواسیر" کے ابتدائی شدید دوروں میں وہ راتوں کی تنہائی میں تڑپ کرا رہتا رہا۔ اور اسی حالت میں "روزانہ لبتہ" کی دس کتابیں اپنے اہل و عیال کی پرورش کے لئے اُس نے لکھیں، مگر اُس سے کسی نے یہ نہ کہا کہ مرض کی تکلیف میں یہ دماغی کام ترک کردو ہم تمہاری معاش کے کفیل ہوتے ہیں ———— وہ اسی مرض کی موجودگی میں، لاہور کی فولاد آمیز آب و ہوا، اور تحلیلِ روح گرمی میں مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ کرتا رہا مگر کسی نے اس کی جراحت آگینی کا خیال نہ کیا —— وہ اسی حال میں اپنے وطن سے سیکڑوں میل دور بڑے بڑے مشاعروں میں بلایا گیا، سیکڑوں راتیں ایک پہلو سے اس نے صبح کردیں۔ مگر کسی نے اس پر ترس نہ کھایا ——— وہ اسی عالم کرب و اضطراب میں تاج، پیمانہ، اور شاعر کی ادارت کا فرض ادا کرتا رہا۔ مگر کسی نے اُسے روزانہ ۱۷۔ اور ۱۸ گھنٹے کی محنت سے سبکدوش کرنے کی ہمت نہ کی۔ وہ اب بھی اسی حال میں اپنے سیکڑوں شاگردوں کی خدمت کررہا ہے۔ وہ اب بھی ایک بڑی جماعت کا امیر ہے۔ لیکن کیا

اس کے شاگردوں میں کوئی ایک بھی ایسا ہے جو اس کی کسی نہ کسی طرح مدد کرتا ہو؟

یہ ہے سیماب، یہ ہے ایک حقیقی شاعر اور اُس کی زندگی!۔ ایک حقیقی شاعر کو اتنے ایثار کرنے کے بعد منصبِ امیری تفویض ہوتا ہے۔ باوجود ان مشکلات و مصائب کے کسی نے کبھی سیماب کی پیشانی کو پرشکن نہ دیکھا۔ اللہ اکبر!

سیماب کے شاعرانہ معتقدات

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ سیماب جیسے حقیقی شاعر کے معتقدات شاعرانہ کیا ہیں؟ اس کے لئے ہمیں زیادہ جد و جہد کی ضرورت نہیں۔ سیماب نے اپنے دیوان "کلیم عجم" کے ساتھ جو "خطباتِ شاعری" شائع کئے ہیں انہیں بالاستیعاب پڑھنے سے ہمیں سیماب کے معتقداتِ شاعری پر عبور ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"ہماری شاعری ماحولی خصوصیات کی حامل ہونی چاہیئے۔ اور زیادہ سے زیادہ فطری۔ ہمارا ہر شعر جامعیت، اکملیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہونا چاہیئے۔ ہماری ہر نظم ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اہل ملک اور فرزندانِ وطن کے لئے مستقبل کا ایک پیغام ہو۔ اور ہماری ہر غزل، حقائق و معارف اور جذباتِ عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہو جس میں ہمارے نوجوان ماضی، حال اور مستقبل کا صحیح ادراک کر سکیں، جو ہمیں تدبیر منزل اور شاہراہِ ترقی بتا سکے اور بلند و لطیف محاکات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کر سکے"۔ (خطبات شاعری صفحہ ۲۸) آگے چل کر وہ اپنے ایک خطبے میں کہتا ہے۔

"ہم شاعر ہیں ہمیں فطرت کے الہام کدے سے ایک فلک بوس ذہن عطا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے خیالات میں ترفع پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمیں کاغذ پر ذہن سے وہ چیز لانی چاہیئے جو ہمارے بعد کاغذ سے ذہنوں میں منتقل ہو سکے۔ اور جو ہمارے ملک اور فرزندانِ ملک کے مستقبل کیلئے ایک ابدی پیغام بن سکے"۔ (خطبات شاعری صفحہ ۴۳)

وہ بقائے جماعت اور ادبی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے کچھ شرطیں پیش کرتا ہے۔

"جب تک ہم اپنی شاعری کو مفید، متین، مہذب اور با اثر نہ بنائیں گے جب تک ہم اپنے تغزل میں رفعت، اپنی نظم میں شوکت اپنے خیالات میں بلندی، اور اپنے ادراکات میں ترفع پیدا نہ کریں گے ہمیں دنیا میں زندہ رہنے اور اپنی ادبی روایات کو زندہ رکھنے میں کبھی کامیابی نہ ہوگی"۔ (خطباتِ شاعری صفحہ ۴۸)

شاعری کی "زبان" کے متعلق اس کا بے تکلف دعویٰ اور اُس کی آزاد رائے ملاحظہ فرمائیے:۔

"میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں غلط خیال کرتا ہوں، غزل کی صحیح زبان اور صورت یہی ہو سکتی ہے کہ زبان علمی، الفاظ منضبط و لطیف، پر شوکت و نغمہ بار ہوں اور خیالات و جذبات بلند اور پاکیزہ ہوں"۔ (خطبات شاعری صفحہ ۸۶)

"غزل کے معیار" کے متعلق سیماب کہتا ہے۔

"چونکہ شاعری کا معیار معیّن نہیں لہذا غزل کا معیار بھی معین نہیں اسالیب بیان مختلف ہیں بعض محض روزمرہ کی ترویج کے حامی ہیں بعض فلسفہ و تصوف کو شامل کرتے ہیں۔

دراصل شاعری، شاعر کے باطن سے تعلق رکھتی ہے شاعر جس قدر قوی روحانی ہوگا اسی قدر اُس کی شاعری پختہ ہوگی"۔

"جدید رنگِ غزل" کے متعلق ایک خطبے کا خلاصہ یہ ہے:۔

"ایک طرف، قدامت، فرسودگی اور عمومیت ہے۔ دوسری طرف فلسفۂ حسن و عشق حقیقت شناسی اسرار کشائی درس و پیغام، واردات و جذبات و محاکات ہیں۔ آگرہ اسکول اسی رنگ کا مبلغ و ناشر ہے۔ ہمیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے، مفروضہ خیالات کے اظہار کی

ضرورت نہیں - اسی کے ساتھ طرز پُر اثر پیرایہ متین، اسلوب نیا، طریقہ اچھوتا، روزمرہ درست، محاورات برمحل، ترکیب چست، الفاظ بے ساختہ اور جملے شستہ ہوں۔"

سیماب اپنے ادارۂ ادب "آگرہ اسکول" کی وضاحت یوں :-

"عہدِ متوسط کے شعرا نے مرزا غالب مرحوم سے ان کی زندگی تک استفادہ کیا۔ پھر بعد چندے یہ رنگ ماند پڑ گیا۔ علوم و فنون کی ترقی سے سنہ ۱۲ء میں پھر غالب کا رنگِ تغزل چمکا۔ اور غالب و داغ کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے ایک نیا رنگ پیدا ہوا۔ "آگرہ اسکول" اسی کا موید و مبلغ ہے اور یہی اس وقت معیارِ شاعری ہے۔" (اقتباس خطبات صفحہ ۱۰۱-۱۰۵-۱۰۶)

سیماب کے نزدیک غزل کا مفہوم :-

"میں غزل میں پاکیزہ تغزل کا مخالف نہیں۔ لیکن شاعری کو تغزلِ محض تک محدود رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ تغزل کی تعریف میں "معاملہ بندی" کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے۔ تغزل کو قدرتی طور پر نفسانیت سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہئے۔ تغزل کے مختلف اسکول ہیں لیکن حقیقی تغزل وہ ہی ہے جس کی بنیادیں جذباتِ لطیف پر قائم ہوں اور جس میں ابتذال و رکاکت کا شائبہ بھی نہ ہو۔" (خطبات شاعری صفحہ ۷۰)

اب ہمیں یہ دکھانا ہے کہ سیماب کا کلام اُن کے قائم کردہ نظریات پر کہاں تک پورا اترتا ہے۔

سیماب نے اپنی شاعری کے خود ہی تین دور قائم کر دئے ہیں پہلا دور سنہ ۱۸۹۸ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک۔ دوسرا دور سنہ ۱۹۰۹ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک۔ تیسرا دور سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۳۵ء تک۔ سیماب کی شاعرانہ زندگی کا چوتھا دور سنہ ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کا کلام ہنوز محفوظ ہے۔

دورِ اوّل - دورِ اوّل میں جو غزلیں ہیں وہ سن و سال کے حساب سے اُس زمانے کی ہیں جب کہ سیماب کی عمر ۱۸ سال تھی۔ ان غزلوں میں وہ تمام قدیم موضوعات پائے جاتے ہیں جو عام شاعری کا مطمحِ نظر رہے ہیں۔ یعنی معاملہ بندی بھی ہے ہجر و وصل بھی ہے گل و بلبل بھی ہے۔ شمع و پروانہ بھی ہے اور قفس و آشیانہ بھی ہے۔ لیکن باایں ہمہ متانت اور سلیقہ بھی موجود ہے۔ اس دور کی شاعری کی زبان بہت صاف اور روزمرہ نہایت سادہ اور بے تکلف ہے۔ اس دور میں سیماب مرزا داغ دہلوی مرحوم کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں مگر کہیں "رقیب" یا "عدو" کا ذکر اس دور میں بھی نہیں ہے۔ نہ واعظ کی مٹی محض تقلیداً پلید کی گئی ہے۔

کر رہے تھے جانے ہم اللہ سے کس کا گلہ — آپ اپنا سر جھکا کر کیوں پشیماں ہو گئے

تم مرے پاس رہو پاسِ ملاقات رہے — نہ کرو بات کسی سے تو مری بات رہے
میں نے آنکھوں سے نہ دیکھی سحرِ شامِ فراق — شمع سے پہلے بجھا ایک پہر رات رہے

باغباں تختۂ گل دیکھ کے کلیاں گن لے — وہ گیا پھاند کے دیوارِ گلستاں کوئی!

حقائق و معارف بھی ہیں، مگر کہیں کہیں۔

کر غور رنگ و بو کے احساس ہو گذر کر — یہ پھول اور کلیاں دھوکے ہیں سب نظر کے
مآلِ آفرینش ہو لحد کی آخری منزل — یہیں تو ابتدا کی انتہا معلوم ہوتی ہے

اس دور کے جرعات کا انتخاب بہت اچھا ہے۔

ہم اپنی موت پر دیکھیں کسی کی آنکھ تر کرنا — ہمیں بھی انعقادِ بزمِ ماتم کی خبر کرنا

ستم زدوں پہ گراں تھی ہوا زمانے کی — جھکی تو پھر نہ اٹھی شاخ آشیانے کی

دورِ ثانی - اس دور کی بعض غزلوں سے دورِ ثانی کی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ سیماب دورِ ثانی میں دورِ اوّل کے رنگِ تغزل سے

کچھ اور بلند ہو جاتے ہیں۔ اب اُن کی غزل میں واردات و احساسات بھی ہوتے ہیں۔ محاکات و نکات بھی ہوتے ہیں۔ اور لفظی شکوہ بھی علوئے تخیل کے دوش بدوش نظر آتا ہے۔

پانی میں ایک جوش ہی مٹی میں اک گداز　　بنتا نہیں مزار ترے بیقرار کا
کہتے ہیں جس کو نزع کا عالم فغاں شعار　　پچھلا پہر ہے میری شبِ انتظار کا

مری ہستی زندگی کی کہیں مثال نہیں　　میں ایک ہی تو غم اندوزِ روزگار رہا
ہے تیرگی شبِ غم میں کیسی ویرانی　　الٰہی گھر نہ ہوا گوشۂ مزار ہوا

اس دور تغزل کا رنگ سلجھ کر زیادہ دلنشیں اور روح گیر ہو گیا ہے۔ متانت اور سلیقہ جو دورِ اول میں بھی موجود تھا اب اور زیادہ نکھر گیا ہے، تخیل بھی نسبتاً بلند ہو گیا ہے۔

حسبِ مرضی بیٹھنے اٹھنے کی آزادی رہی　　بیخودی نے بے نیازِ نظمِ محفل کر دیا
واہ ری صورت گرِ فطرت یہ تیرا انتظام　　مار ڈالا جب مجھے جینے کے قابل کر دیا

ذہن نے نئی انگڑائیاں لینی شروع کر دی ہیں۔ اور بصیرت میں وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

تجھے سجدہ کیا تھا میں نے اک دن جوشِ الفت میں
یہی ہو جائے گا جزوِ عبادت میں نہ سمجھا تھا

اک نعمتِ عجیب ہے یہ منصبِ وفا　　انسان کو ملا تو فرشتہ بنا دیا

یہ عشق کی بربادی اور یہ ترا استغنا　　اے حسن کبھی تجھ پر یہ وقت پڑا ہوتا

مگر جوانی کی شوخی، طبیعت کا چلبلا پن، اور جذبات کی بے تکلفی ابھی کہیں کہیں موجود ہے۔

رات بھر بیٹھا رہا محفل میں ہم پہلوئے دوست　　گو رہا سب کی نگاہوں میں مگر اچھا رہا

زبان و بیان کی حلاوت، محاورات کا صحیح محل، اور جذبات کی گہرائی دیکھیے۔

نہ تم آئے نہ خط بھیجا، اٹھی چھولی، گیا ساون　　کوئی جھولا کہے کب تک تمہارے عہد و پیماں میں؟

اس دور کی غزلوں میں جدید تراکیب اور شوکتِ الفاظ سے سیمابؔ پر مرزا غالبؔ کی تقلید کا گمان غالب ہوتا ہے۔ اور غالباً اسی دور سے وہ مرزا داغؔ کے قدیم و مرحوم رنگ سے بلند ہو جاتے ہیں۔

تجھے ہم نے جو اپنا دوست اے بیداد گر جانا　　تو کیا جانِ وفا شیوہ کا دشمن جان کر جانا!

تری محفل میں اپنی آمد و شد کا یہ عالم ہے　　بشکلِ رنگ آتے ہیں برنگِ نکہت نکلتے ہیں

دیکھا محویت لطفِ شکر خوابِ خیال　　جیسے کوئی فی الحقیقت گرمیٔ آغوش ہے

فلسفہ بھی اسی دور سے شریکِ تغزل ہو جاتا ہے۔

تو کیا سمجھے گا اے بت ساز یہ پردے کی باتیں ہیں
تراشا جس کو، تھی پہلے سے وہ تصویر پتھر میں

فنا در اصل ہے جذبات کا افسردہ ہو جانا　　نہ میرا عشق فانی ہے نہ تیرا حسن فانی ہے

میں خصوصیاتِ کلام، قوتِ بیان، اور شاعرانہ نکات کی وضاحت سے دانستہ گریز کر رہا ہوں۔ ورنہ سیمابؔ کے اشعار کی صوری و معنوی خوبیاں اور فنی بلندیاں اگر ہر شعر کے ساتھ ساتھ بیان کی جائیں تو شاید یہ سالنامہ اس مضمون کے سوا کسی دوسرے مضمون کا متحمل ہی نہ ہو۔ اس لئے مثالاً صرف دو دو تین تین اشعار نقل کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں اس دور کی غزلوں میں بعض اشعار بہ اعتبار جذبات و محاورہ ضرب المثل بنانے کے قابل ہیں۔ اور بعض اشعار اپنی ندرت و نفاست کے لحاظ سے ذہن و دماغ میں محفوظ رکھنے کے لائق، مثلاً

شورش کدۂ حشر کہاں اور کہاں ہیں　　یہ دیکھنے آیا ہوں، یہاں تو تو نہیں ہے

آئے ہزار گردشِ دوراں سے انقلاب — لیکن میں کیا کروں مری دنیا وہی ہی

سیر ہو نیت تو دیتا ہے خدا بھی برکتیں — جتنی پی لی ہو ابھی اتنی ہی پیمانے میں ہے

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا — دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیگی دنیا مجھے

سب کعبے ہی پہ موقوف نہیں ضد ہی تو کی — جس گھر میں رہیں گے اسے برباد کریں گے

تجھ کو در پردہ سمجھ کر ہو رہا ہوں بیقرار — کیا تماشا ہو جو کوئی دوسرا پردے میں ہو!

ہر چیز پر بہار ہر اک شے پہ حسن تھا — دنیا جوان تھی مری عہدِ شباب میں

دورِ ثالث - سیماب کی شاعری کا یہ دور دراصل ایک اجتہادی اور پیغمبرانہ دور ہے۔ اس دور کی غزلیں سیماب کو اپنے معاصرین سے نہ صرف ممتاز کرتی ہیں بلکہ اُسے اپنے رنگِ جدید کا واحد علمبردار ثابت کردیتی ہیں۔ اس دور میں سیماب نے اچھوتے خیالات، نادر جذبات انوکھے احساسات، معصوم واردات، اور قوتِ تخیل کی فلک پروازیاں دکھا کر یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام الہامی شاعر ہے۔ اور جس مقام پر پہونچکر شعر کہتا ہے وہاں اس کے معاصرین کی ہوا بھی نہیں پہونچتی۔ سیماب نے اپنے اس دور کی شاعری میں ڈاکٹر اقبال کے اس نظریئے کو غلط ثابت کردیا ہے کہ "اردو زبان میں درس و پیام" کی گنجائش نہیں ہے۔ "نشیدِ نو" کے باب میں بیشتر اشعار ایسے ہیں جو اردو شاعری میں اختراعِ فائقہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جن کی تخلیق صرف سیماب کے عرش پرورد‌ۂ الہام آسودہ ذہن و دماغ ہی تک محدود نظر آتی ہے۔ فلسفہ، حقائق و معارف، اور امعانِ نظر و فکر، تو متقدمین و متاخرین کے اشعار میں بھی موجود ہے۔ مگر سیماب کے یہاں ایک ایسی چیز ان تمام خصوصیات کے علاوہ اور بھی ہے جس کا کوئی نام نہیں رکھا جاسکتا۔

سہل ممتنع کی حدود کو خوش بیانی، صفائی، سلاست، فصاحت اور برجستگی کیساتھ عبور کرجانا بغیر الہام کی اعانت کے ممکن ہی نہیں۔ اس لئے ہم سیماب کی اس دور کی شاعری کو کم سے کم "الہام" ہی کہہ سکتے ہیں گو اس سے بھی کچھ زیادہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مثالاً چند اشعار سنئے۔

مری رسائی سے دور ہے تو مگر ابھی تجھکو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں لٹا دیا تھا نقاب تیرا

زندگی دو دن کی ہو لمبی سہی میعادِ قید — آج آیا ہے قفس میں کل رہا ہو جائے گا

نہ پوچھ مجھ سے ماتری جبر و اختیار کی خیر — گناہ ہو نہ سکا یا گناہ کر نہ سکا

عمر بھر سینے میں ارماں کی خلش باقی رہی — ایک کانٹا چبھ گیا تھا آرزوئے خام کا

معارف نگاری، اسرارِ حقیقت کا اظہار و اعلان، صحیح وارداتِ قلب کی ترجمانی، اس دور کی سب سے بڑی خصوصیات ہیں۔ سیماب وحدت شہود کے قائل ہیں۔

ہزار رنگ کے پردوں میں چھپ کے پھیل گئے — یہ اک ظہور کی ترکیب تھی حجاب نہ تھا

خیال کی سراب آفرینی و طلسم کاری سے نالاں ہو کر کہتے ہیں۔

آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے — جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں
تنگ آکے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو — یا مطمئن کرو کہ تمہیں ہو خیال میں

وہ زیست کو بھی سراب ہی سمجھتے ہیں۔

دنیا ہے خواب حاصلِ دنیا خیال ہے — انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

منازلِ محبت سیماب کے طے کردہ راستے معلوم ہوتے ہیں۔

آثارِ منازل کے اکتشاف میں وہ بڑے تجربہ کار اور مبصر کی حیثیت رکھتے ہیں

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

خیال کی ندرت و بلندی اور فکر کا اچھوتا پن دیکھئے۔

صدائے صور سے میں قبر سے جاگوں گا　　کسی سُنی ہوئی آواز سے پکار مجھے

ذرا کھل کر پکار اے صورِ محشر دیوانِ الفت کو　　یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیابان میں

سیماب کے واردات میں صداقت ، اور جذبات میں پاکیزگی والوہیت پائی جاتی ہے۔

نہ پوچھ اُس پاکبازِ آرزو کا مطمحِ الفت　　جو پیمانِ وفا میں بھی خدا کو درمیاں سمجھے

ادراک و عرفان ، اور کُنہہ حقیقت کے سمجھنے میں سیماب کا ذہن بہت رسا ہے۔

ہے روزِ ازل سے دنیا کی اس وسعت میں محفل میری
ہر ذرّے سے واقف ہوں میں ہر ذرّہ ہے محرم میرا

جو کچھ کھویا ہے پروانے نے یا ہو بہا ہے شمع کے آنسو　　یہ سب کچھ ایک دن خاکسترِ محفل سے نکلیگا

عرفانِ نفس ہی مجھے عرفانِ دوست تھا　　خود آشنا ہوا تو خدا آشنا ہوا

جو قدسیوں کے درس میں تھا درسِ آخری　　اک جزوِ مختصر وہ مری آگہی کا تھا

غرض کہ پورا باب ایسے ہی اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ جو شہپرِ جبرئیل کی آواز سے ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ درس و پیام کے بھی کچھ نمونے دیکھ لیجئے۔

یہ نکما پن جمودِ دل کا اک انجام ہے　　دل سے کوئی کام لو، دل کام کا ہو جائے گا
مصلحت یہ ہے خودی کی غفلتیں طاری رہیں　　جب خودی مٹ جائیگی بندہ خدا ہو جائیگا

تمہید خرابی کی تکمیلِ خرابی ہے　　اک بت کا بنانا ہے بتخانہ بنا دینا

کاوشِ غم ہی مداوا ہے غمِ ایام کا　　ہے شفق کے خون سے رنگین گیسو شام کا
ہے فریبِ طولِ عشرت محفلِ ہستی کی شام　　صبح ہونے تک ہے وقفہ گردشِ یک جام کا

لُطف یہ ہے کہ اس خشک تبلیغ میں بھی سیماب اپنی موسیقیت اور شیریں کلامی نہیں بھولتے۔

عشق کے عنوان سے تجدید ایماں کیجئے　　بے مزہ نکلا فسانہ کفر اور اسلام کا

وفا کی سطح سے گذری ہوئی ملی دنیا　　غرض کے رنگ میں ڈوبا ہوا زمانہ ملا

خدا کی جستجو کر یا نہ کر، رکھ بیخودی طاری　　وہ خود تیری خودی کے پردۂ حائل سے نکلیگا

مثالِ نکہتِ آوارۂ گُل چار سو ہو جا　　سکوں چاہے تو آزادِ قیودِ رنگ و بو ہو جا
سپردِ گردِ بادِ دشت کر دے اپنی خاکستر　　کہیں مل جائیگی منزل خرابِ جستجو ہو جا
اگر تو چاہتا ہے آرزو تیری کرے دنیا　　تو دل پر جبر کر کے بے نیازِ آرزو ہو جا
سُنادے اپنی غفلت پھر جگا اربابِ غفلت کو　　انھیں سونے دے پہلے خواب سے بیدار تو ہو جا

سب سے الگ پرستشِ جانانہ چاہیئے　　اے برہمن خیال میں بتخانہ چاہیئے
رنگِ بساطِ دیر و حرم ہے بہت خراب　　ان خشکیوں میں بارشِ پیمانہ چاہیئے
نیرنگِ انقلاب ہیں راتیں بہار کی　　صبحِ چمن کو روز اک افسانہ چاہیئے
ہر انجمن میں موقعِ وجدان و رقص ہے　　آزادیٔ طبیعتِ پروانہ چاہیئے

غلط سمجھا جو تو محدود سمجھا راہِ ہستی کو　　جہاں ہوتی ہے منزل ختم وہ آغازِ منزل ہے

نہ جا بر علمِ حقیقت پر حقیقت اور ہی کچھ ہے　　کبھی اک نقشِ باطل حاصلِ ایجاد ہوتا ہے

وہ اُسکی سنتی ہیں جو بات کہ نہیں سکتا   وہ ہی کلیم جو ہر لفظ پر اٹکتا ہے
تصورات کی خلوت میں کر تلاش اُسکو   تحیرات کی دنیا میں کیوں بھٹکتا ہے؟

ان سے کہتا ہو جو ہیں شاکیٔ دلطفیٔ عشق   غم الفت کو شریک غم دنیا نہ کریں

معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو   اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

سیماب کے کلام میں درس و پیام کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ ہر غزل میں چند شعر اس موضوع پر مل جاتے ہیں "کلیم عجم" کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ناظر کے دماغ پر خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

سیماب اپنی آزادیٔ خیال میں اعلیٰ وجہ بصیرت اس قدر بے تکلف ہیں کہ وہ بعض اوقات کارکنانِ فطرت سے اور کبھی خدا سے بھی دو بدو ہو جاتے ہیں۔ اور وہ باتیں کہہ دیتے ہیں جن کے کہنے پر انسان جیسیر ہو ہی نہیں سکتا۔ کہتے ہیں اور کس انداز سے کہتے ہیں کہ۔

اے خادمانِ حسن، یہ کیا انتظام ہے؟   اب تک چراغِ طور پڑا ہی بجھا ہوا!

فطرتِ حسن سے کہو اور کلیم سے کہدے   خامشی ناگوار ہے انجمنِ نیاز میں

یہ سوچتا ہوں تو سجدے سے سر نہیں اٹھتا   جو تھا فرشتوں کا مسجود کیا وہ ہی ہو میں

دیکھیے فطرت کو کس خوبصورت انداز میں چھیڑتے ہیں۔

گو غلط سہی، فطرت آرزو سمجھتی ہے   تحت کی دعا مانگی اور بوریا پایا

اب براہ راست خدا سے مخاطب ہیں۔

کم سے کم فرشتوں کو چین تو ملا دل کا   آپ کی محبت میں آدمی نے کیا پایا؟

تیرا جلوہ میرا جلوہ، جو ہی تو میں ہوں وہ ہی
پردہ اتنا ہے کہ میں ظاہر ہوں تو مستور ہے

کیا پتہ اپنا دیا ہے اس معمّی کی نثار   جان دیکھی ہو تو نزدیک رگ جاں دیکھیے

آدابِ تجلّی میں ہے گنجائشِ ترمیم   نظارہ ترے حسن سے بیباک نہیں ہے

دنیا کے رطب و یابس، خوشی اور غم، موت اور زندگی کے مشاہدات پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد خدا کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کیجا رہی ہے۔

تیری دنیا ہے، دنیا الٰہی مگر، مطمئن ذہن دنیا نہیں ہے۔
کاوشِ زندگی، کاہشِ مرگ کا کچھ نتیجہ بھی ہے یا نہیں ہے؟

اظہار خیال کے لئے کس قدر برجستہ اور برمحل الفاظ ملتے چلے جاتے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے مصرعے مگر حشو و زوائد سے پاک نہ کہیں جھول۔ نہ کہیں اغلاق۔ شروع سے آخر تک ہر شعر سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

یہ تو رسماً ہے اک عادتِ بندگی ورنہ میں کیا مری التجا کیا
آپ چاہیں تو کونین دیدیں مجھے آپکے ہاتھ میں کیا نہیں ہے

سجدے کے متعلق اب تک تو ہم اور ساری دنیا یہی سمجھتی رہی کہ سجدہ عجز عبودیت کا اظہار اور خبر و طاعتِ الٰہی ہے مگر سیماب اس کے متعلق ایک نیا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

یاد صبحِ ازل کو ہے وہ ماجرا، جب فرشتوں کا مسجود یہ تھا
ہے یہ تاوان اُس جرمِ تقدیس کا، سجدہ انساں کا سجدہ نہیں ہے

سجدے کو "جرمِ تقدیس" کا "تاوان" کہنا کتنی نئی بات اور کتنا نیا خیال ہے۔

انسان کہتا ہے کہ میری کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی۔ خدا بھی فرماتا ہے کہ "ام للانسان ما تمنّٰی" (کیا انسان کو وہ ہی مل جائے جو اس کی تمنا ہے) اس عدمِ تکمیلِ تمنا کا سبب سیماب بتاتے ہیں اور ذہنِ انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ جو تمنا وہ کرتا ہے

حقیقت میں تمنا نہیں ہوتی۔ بلکہ فریبِ تمنا ہوتا ہے۔ تمنا اُس طلبِ صادق کا نام ہے جو مادیت اور نفسانیت سے منزا ہو۔ ایسی تمنا خدا بھی پوری کر دیتا ہے۔ "ادعونی استجب لکم" ایسی ہی تمناؤں کیلئے ارشاد ہوا ہے۔ انسان کی تمنا ناقص ہوتی ہے۔ اس لئے وہ پوری نہیں ہوتی۔ شعر سنئے

تو ادراک ماں حرص و ہوا و ہوس، اس کی تکمیل فطرت کرے کیوں
یہ تو اک اب و گندم کی انگڑائی ہے، یہ تمنا، تمنا نہیں ہے

یہ ہے وہ جدید رنگِ شاعری، جو سیماب نے اپنے معاصرین کے علی الرغم اختیار کیا ہے۔ اور جس کی وہ ترویج چاہتے ہیں۔ وہ مشاعروں کی شاعری پسند نہیں کرتے بلکہ ایسی شاعری چاہتے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے مفید ہو۔ ان اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ سیماب نے شاعری کے جو نظریے اپنے خطبات میں پیش کئے ہیں، اُن کی شاعری اُن نظریوں کے بالکل مطابق ہے۔ اور وہ اُن شعرا کی صف سے بالاتر ہیں جن کے لئے قرآن مجید میں "و انہم یقولون ما لا یفعلون" آیا ہے۔ بلکہ "الا الذین آمنوا" کے مستثنیات میں ان کا شمار ہے۔

سیماب بحیثیت نظم نگار

یہ وہ زمانہ ہے کہ غزل اور غزل گو شعرا کا دور ختم ہوتا جا رہا ہے اور نظم گوئی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ مگر ابھی مستند اور معتبر نظم گو شعرا کا شمار دو چار سے زیادہ نہیں۔ غزل میں آپ نے سیماب کا درجہ دیکھ لیا غزل ایک محدود صنفِ شاعری ہے۔ جو اکثر مشاعروں میں سنائی پڑتی ہے۔ اس لئے مشاعرے کے ماحول اور مذاق کا اُس میں خیال رکھنا پڑتا ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ "کلیم عجم" میں ایسی سیکڑوں غزلیں شائع نہیں ہوئیں جن کے پڑھنے سے بقول شخصے مشاعروں کی چھتیں اُڑ چکی تھیں۔ ایک صاحب نے مجھ سے ذکر کیا کہ جب حضرت سیماب نے اجمیر کے ایک مشاعرے میں یہ مطلع پڑھا۔

پری بن کر بہار آئی ہے ابکی بادہ خواروں پر　　پرندوں کی طرح کاگ اُڑ رہے ہیں سبزہ زاروں پر

تو مشاعرہ جاگ اٹھا۔ کئی مرتبہ یہ مطلع پڑھوایا گیا۔ مگر کلیم عجم کی غزلوں میں یہ غزل نہیں ملتی۔

مطلع بہت خوبصورت اور مناسب الفاظ سے سجایا گیا ہے۔ لیکن سیماب جانتے تھے کہ اس مطلع کا اثر صرف مشاعرے تک محدود رہ سکتا ہے۔ اس لئے انھوں نے مطلع کیا پوری غزل کو نظر انداز کر دیا۔

میرا مقصد بیان یہ ہے کہ غزل اکثر مشاعرے کے لئے ہی لکھی جاتی ہے۔ مگر نظم مشاعروں کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کے اثرات بھی غیر محدود اور عالمگیر ہوتے ہیں۔

نظم سے شاعر کے ان رجحانات کا اظہار ہو جاتا ہے جو غیر ارادی طریقے سے اُس کے ذہن و دماغ میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ آیئے اب دیکھیں کہ نظم نگاری میں سیماب کا کیا مقام ہے؟

"کارِ امروز" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب جس طرح ایک نغز گو غزل نویس ہے اسی طرح ایک بلند فکر نظم نگار بھی ہے جب وہ غزل میں بھی درس و پیام کا عنصر لازمی سمجھتا ہے تو پھر نظم میں اُسکی درسی و پیامی قوتوں کے لئے گنجائش ہونی ہی چاہیئے۔

"کارِ امروز" میں اُن تمام موضوعاتِ حیات پر سیر اور کامیاب نظمیں ہیں جن کا تعلق انسانی ضرورتوں کے ہر شعبے سے ہے۔ یعنی سیاست، مذہب، معاشرت۔ قومیت، انسانیت، وطنیت، آزادی، وغیرہ وغیرہ۔

سیماب کا نظریۂ سیاست

رسم و آئینِ محبت پہ تباہی آ گئی　　صبحِ فطرت کی سپیدی میں سیاہی آ گئی
بھول بیٹھا آدمی انجام کارِ زندگی　　سرنگونی میں ادائے کج کلاہی آ گئی

ذرۂ ناچیز سورج بن کے اترانے لگا　　خاک کے سر میں ہوائے بادشاہی آگئی
جوشِ نخوت میں سیاست نے کئی ایسے گناہ　　تنگ اپنی جان سے خود بیگناہی آگئی
محفلِ مہر و وفا سے بیخودی رخصت ہوئی　　خودنمائی صورتِ قہرِ الٰہی آگئی

مستقل جو عہدِ شخصیت کی لعنت ہوگئی
نام اس قانونِ دشمنی کا "سیاست ہوگیا"

نظریۂ قومیت،

گلشنِ ہستی میں یکرنگی کا عالم عام تھا　　پہلے صرف اک قوم تھی "انسان" جس کا نام تھا

قومیت، فرقہ پرستی، اور نسلی امتیاز　　پیکرِ انسانیت پر اک طرح کا ہیں عذاب
قلعۂ پندار کو مسمار کردو توڑ دو　　چاک کرکے پھینک دو یہ مادیت کا حجاب
صرف تم انسان بنکر اپنی دنیا میں ہو　　پُرسکوں، آزاد، یکسو، کامگار و کامیاب

مذہب کی تعریف،

مذہب اک رشتہ ہے مابینِ عباد و معبود　　نہیں اغراض پرستی کیلئے جس کا وجود
مذہب اک رشتہ ہے جمعیتِ عالم کیلئے　　عشرتِ فطرت آزاد میں مذہب کی قیود
مذہب امن اور تسلّی کا ہے مضبوط حصار　　اس کے پیرو یہ ہیں شیطان کی راہیں مسدود

وطنیّت کا مفہوم،

زمیں کی سطح سے تا آسماں میرا وطن ہے　　یہ فیصلہ ہے کہ سارا جہان میرا وطن ہے

آزادی کا تخیّل،

وہ اک حورِ مجسّم ضد بہار و صد چمن در بر　　نشاطِ دو جہان در دل حیاتِ انجمن در بر
خلش گُل کی جگر میں اور دل میں درد لالہ کا　　اِدھر اک ہاتھ میں مسجد اُدھر گنبد شوالہ کا
ہمالہ کی پری اور طور زادی جلوۂ رعنا　　جو اس کی اک نظر زمزم تو اسکی اک نظر گنگا

غریبوں اور مزدوروں سے ہنسکر بولنے والی　　یتیموں اور بیواؤں کی عقدے کھولنے والی
زمین و آسماں اسکے حریمِ ناز کے آنگن　　مہ و خورشید سے اس کی بساطِ انجمن روشن
چمن اسکے بیاباں اسکے کوہ و آبشار اسکے　　سمندر اسکے میداں اسکے امصار و دیار اسکے

وہ فطرت سے براہِ راست رشتہ جوڑنے والی
غلامی اُس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی

آزادی کی یاد،

وہ حقیقی عید، فطرت جسکی تھی عادی کہاں　　اب وہ اگلی عشرتیں وہ کیفِ آزادی کہاں؟
ہم وہیں ہیں کر چکے گو طے ہزاروں منزلیں　　دیکھئے ہو ختم جاکر دورِ بربادی کہاں؟
عزمِ عشرت بھی کریں اگر یہ رہائی کا گماں　　ہم نشیں، ہم تو ہیں قیدی بے میعادی کہاں؟
دل غلام، آہیں غلام، آنکھیں غلام آنسو غلام　　ہے غلامی ہی غلامی، آہ آزادی کہاں؟

ماتمِ انسانیت،

آہ اے انساں تیری رو جاتی رہی نیت　　وہ فرشتوں کی سی مطلق محویت جاتی رہی
ماتم اے انساں کہ تیری بیکرِ غلطیدہ میں　　بربریت رہ گئی - انسانیت جاتی رہی

محاسبۂ معاشرت،

اے مسلماں اے خرابِ نشۂ نام و نمود　　ہو چکا مسرور سفر و فاتِ روزِ عید سے
تو لباسِ نو پہن کر خوب اتراتا پھرا　　سانپ لہراتا ہو جیسے کھال کی تجدید سے
صبح کھانے اور پینے میں رہا مصروف تو　　اپنا معدہ صاف کر کے مسہل و تبرید سے
شام کو تھا زینِ ادارہ تراکیفِ نظر　　تھیں عیاں بدمستیاں تیری مذاقِ دید سے
تو رہا خوش قامتوں سے خوش ہن بھر ہمکنار　　بوالہوس کی طرح حظِ نفس کی امید سے

آگ پھیلے گی نہ کیا تیرے برے اعمال کی
تیری نسلیں کیا نہ بگڑیں گی تری تقلید سے

اسی طرح سرمایہ داری کی لعنت اور مزدور کی فلاکت پر بھی سیماب کے یہاں کئی نظمیں ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات بطور نمونہ طویل نظموں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ جن سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ انسانی حیات کے تمام شعبوں پر سیماب کی نگاہ ہے اور وہ ان کے متعلق اپنی ایک آزاد اور بے خوف رائے رکھتا ہے۔

اپنی نظموں میں وہ اگر کہیں مغلوب نظر آتا ہے تو صرف "محبت" سے۔ مگر پھر بھی محبت، صداقت اور حسن کی تحقیق و تبلیغ سے باز نہیں آتا۔

حسن تھا، روحِ صداقت تھی، محبت تھی جہاں   مجھ کو وہ فردوسِ گم گشتہ ابھی تک یاد ہے
جذبۂ حسن و محبت پھر بڑھانا چاہیئے   پھر جہنم زار کو جنت بنانا چاہیئے

متعلقات "حسن و محبت" پر سیماب نے بڑی کشادہ دلی سے نظمیں کہی ہیں۔ صبحِ محبت۔ جنون۔ دل کی پیاس۔ تیرے ماضی کی یاد۔ نیا عہد نامہ۔ انتباہ۔ صبحِ صادق۔ صبوحی۔ برقِ سر نگندار۔ حسن کو دعوتِ سکون۔ تم کاش وہ ہی ہوتے۔ محبت۔ سرگذشت حسن آوارہ۔ انتظار۔ حسن مجبور۔ حسن کا آخری حربہ۔ دعائے نیم شبی۔ اسی قبیل کی جذباتی نظمیں ہیں۔ جن میں صحیح واردات قلب کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب کو محبت کا عملی اور ذاتی تجربہ بہت زیادہ ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے کسی کا ایک مقولہ سنایا تھا کہ "جب تک شاعر کو کسی سے محبت نہ ہو اس کے شعر میں اثر پیدا ہو نہیں سکتا، اور اس کی شاعری محض نقالی ہوتی ہے" سیماب کی نظمیں پڑھ کر مجھے اس قول کی تائید کرنی پڑتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ سیماب انسان اور انسانیت سے محبت کرتا ہے۔ صحیح تاثرات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرنے میں سیماب کی ہمت قابلِ داد ہے۔

سیماب کی نظمیں اپنے اندر عالمگیر جذبہ رکھتی ہیں۔ اس کی تخئیل اپنے ماحول ہی میں چکر نہیں کاٹتی۔ وہ کہیں تمام اہلِ عالم کو پیغام دیتا ہے۔ کہیں بودھ اور کرشن کا پجاری نظر آتا ہے۔ اور کہیں اس کی اسلام دوستی مترشح ہو جاتی ہے۔ اس کی نظموں پر بالاستیعاب نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشتراکیت اور نازکزم سے نافر ہے۔ وہ سکون اور شانتی کا آئین پسند مبلغ ہے۔ وہ جہاں بین الاقوامی اور بین القومی شاعر ہے وہاں اسے اپنی قومِ مسلم کا بھی بطورِ خاص خیال ہے اور وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ

نظامِ ہستیٔ مسلم بدل دے حدِ ممکن تک   قلم کو لوح پر پھر زحمتِ قسمت نگاری دے

شخصیت نگاری اور مناظر نگاری میں بھی سیماب کسی مغربی یا مشرقی صاحب فکر سے کم نہیں۔ گاندھی، جواہر لال نہرو، محمد علی۔ ابوالکلام آزاد۔ داغ۔ غالب میر ناصر علی خاں وغیرہ شخصیات پر اس کی نظمیں تاریخی ہیں۔ حقائق و معارف بھی اس کی نظموں میں چھلک رہے ہیں۔ وہ اخلاقیات کا بھی معلم ہے۔ اپنے وطن کی تاریخی عمارتوں، تاج، قلعۂ معلیٰ۔ سکندرہ۔ اعتماد الدولہ، فتحپور سیکری، جامع مسجد۔ چینی کا روضہ اور آرام باغ پر سیر حاصل نظمیں کہہ کر سیماب نے ان کی تاریخی اور ادبی عظمتوں کو دوبالا اور جاوداں بنا دیا ہے۔ شاعر اور شاعر کے نصب العین پر اس کی متعدد نظمیں نہایت بصیرت افروز اور قابلِ غور ہیں۔ اپنی ایک نظم "شاعر امروز" میں اس نے غیر حقیقی اور نام نہاد شعرا کو ایسا للکارا اور پھٹکارا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے اس نظم کو پڑھ کر ہندوستان سے معتدبہ شعرا کی تعداد کم ہو جائیگی

فلسفۂ و الٰہیات کے درس بھی سیماب کی نظموں میں موجود ہیں۔ وہ صرف ارضی شاعر نہیں بلکہ ناظرِ فلک بھی ہے۔ کہیں "آئینۂ افق" دیکھتا اور دکھاتا ہے کہیں "سایۂ زہرا" میں محبت کے لطف اٹھاتا ہے۔ کبھی اس کی نظر "شہاب ثاقب" پر پڑتی ہے۔ اور وہ بے چین ہو کر کہتا ہے۔

ستارہ ٹوٹ کے بکھر ہو گیا فروغِ نظر   چراغ بزمِ فلک کے کوئی بجھا نہ سکا
مگر ستم کشِ شبہائے غم کے پہلو میں   وہ دل جو ٹوٹ گیا پھر نمو دیا نہ سکا

وہ کبھی عبودیت کے انتہائی مقام پر اور کبھی "طور کی چوٹی پر" پہونچکر اپنے معبود سے "عرضِ تجلی" کرتا ہے۔ اور پھر "خدا کی آواز" بھی سنتا ہے۔ وہ "نقصِ ہستی" پر آزادانہ تبصرہ بھی کرتا ہے۔ اور پھر "اپنی ہستی" کے جلو کا معترف بھی پایا جاتا ہے۔ وہ "منافق" کو للکارتا اور پھٹکارتا ہے۔ وہ "سازش" سے آگاہ ہو کر "جوشِ انتقام" کے شعلے اڑاتا ہے اور دنیا میں "اعلانِ جنگ" کر کے موجودہ نظامِ ہستی کو "دعوتِ انقلاب" دینے سے بھی نہیں چوکتا۔

یہ ہے سیماب کی نظم نگاری پر مجمل تبصرہ۔ اس کے بعد اس نتیجہ پر پہونچنا آپ کا کام ہے کہ جس کائنات گیر شاعر یعنی سیماب اکبر آبادی کی سوانح حیات اور شاعری پر میں نے یہ مقالہ لکھا ہے اس کا آج آپ کی قوم اور آپ کے ملک کی ادبیات میں کیا درجہ ہے اور کیا درجہ ہونا چاہیئے؟

فتفکروا یا اولی الابصار!

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم

آگرہ اسکول کا معیارِ تخیّل

از ——— حضرت مولانا ارشد تھانوی

۷ر جنوری ۱۹۳۷ء کو ۱۱ بجے شب کو پراونشل اگزیبیشن لکھنؤ کے آل انڈیا مشاعرہ میں بیٹھا نواب آف بانپت کیپٹن جمشید علیخاں صاحب صدر مجلس استقبالیہ کا خطبۂ صدارت سن رہا تھا، اور اس کی مطبوعہ کاپی زیر نظر تھی کہ پچھلی کرسی سے کسی نے ٹھوکا دے کر کہا "سننے وقت ضروری نہیں ہے کہ پڑھا بھی جائے"۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو حضرت نیاز فتحپوری اڈیٹر نگار تھے، جنھوں نے مشاعرہ کمیٹی کے رکنِ انتظامی ہونے کی حیثیت سے اپنے اختیارات تمیزی کا بطور خلوصِ مخاطبت نفاذ فرمایا تھا۔ میں بجز ایک تبسم تسلیم کے جواباً کچھ نہ کہہ سکا، کیونکہ میری پوری توجہ خطبہ کے زیرِ ارشاد الفاظ کی جانب تھی، وہ فرمارہے تھے۔

اس زمانہ میں اردو شاعری کے اندر مغربی لٹریچر کی دراندازی سے جو انقلاب رونما ہوا، اس کی پیش نظر متاخرین کو دو جماعتوں میں تقسیم کرنا ناگزیر ہے، ایک وہ جو اردو شاعری کے قدیم اسکول کی پیرو رہی دوسری وہ جس نے تغزل کی فرسودہ راہ سے ہٹ کر ایک جدید اسلوب شاعری اپنے لئے پیدا کیا۔ مقدم الذکر جماعت کے علمبردار داغ۔ امیر۔ جلال۔ اسیر اور موخرالذکر کے قائد حالی و چکبست، آزاد - داکبر وغیرہ تھے۔

قدرتاً میں منتظر تھا کہ "اردو شاعری کے عہد بعہد ارتقا پر بحث فرماتے ہوئے نواب صاحب عصر حاضر تک آئیں گے۔ اور اقبال۔ حسرت سیماب، جوش وغیرہ نے اردو شاعری میں جو جدید اضافے اور قدیم اصلاحات کی ہیں، ان پر تبصرہ کرکے موجودہ دور کی خصوصیات اور امتیازات پر روشنی ڈالی جائے گی لیکن یہ موضوع اسی حد تک پہونچکر ختم ہوگیا - اور شاعری کے صحیح مفہوم، شاعروں کی اصلاح اور دوسرے مسائل زیر بحث آگئے۔ حالانکہ سب سے زیادہ ضرورت اس کی تھی کہ زمانۂ حال کی شاعری پر گفتگو کی جاتی - اور دہلی و لکھنؤ اسکول کے قدیم اور ہزار ہا مرتبہ زیر بحث لائے ہوئے مسائلِ فن و زبان سے آگے بڑھ کر اس وقت کے اہم ترین احساسات شعری اور ترقیات پر تبصرہ ہوتا۔ دہلی اور لکھنؤ میں جو کچھ اپنے وقت پر ہوا، اس پر ضخیم ترین لٹریچر موجود ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اب وہاں کچھ ہو بھی نہیں رہا ہے موجودہ دنیائے ادب و شعر میں لاہور و آگرہ اسکول جو اہم ترین خدمات انجام دے رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کی زندگی اب انہیں کی رہین منت ہے، پنجاب کے ہر شعبۂ حیات میں زندگی ہے۔ سر سید نے وہاں والوں کو اسی لئے زندہ دلوں کا خطاب دیا تھا مگر یوپی میں ہر اعتبار سے درماندگی و افسردگی غالب آتی جارہی ہے مولانا حالی نے جس نکبت و ادبار کے مناظر اپنے مقبول عام مسدس میں پیش کئے ہیں، وہ سب باشندگان یو۔پی کے اجتماعی حالات کا صحیح عکس ہیں ادبی و شعری ترقی نتیجہ ہوتی ہے "کشمکش حیات سے فراغت اور ذہنی یکسوئی و دماغی سکون کا، ظاہر ہے کہ یو۔پی کی اکثریت پریشاں روزگاری اور کشاکشِ حیات کی زوال پذیر و یاس آمیز سعی ہائے نامشکور میں مبتلا ہے۔ اور کسی علمی، ذہنی، دماغی کام کے لئے اس کے پاس نہ وقت ہے، نہ احساس صحیح، اور جو طبائع اپنے فطری رجحانات سے ان مشاغل کی طرف توجہ بھی کرتی ہیں - وہ ماحول کی ناسازگاری اشتراکِ ذہنی کے

نقدان، اور علمی وسائل کی عدم موجودگی سے بالآخر اپنے تئیں ٹھوس کام کرنے سے معذور پاتی ہیں، ان حالات میں قدرت کا یہ ایک معجزہ ہے کہ غالب کے مولد آگرہ میں اردو شاعری ایک ایسے جدید اسلوب اور مستقل رفعت کے ترقی پذیر پیکر میں منتقل ہو رہی ہے جس کو دنیائے شعر وادب کی لطیف و پاکیزہ ترین مخلوق قرار دیا جاسکتا ہے، اور مشرق و مغرب کی تمام زبانوں کے ادب و شعر کے پہلو بہ پہلو اس کو امتیازی جگہ حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اس کا حقیقی کریڈٹ تنہا علامہ سیماب کی ذات کو حاصل ہے۔ جنھوں نے اپنی پر از کشمکش زندگی کا نصب العین ابتدا ہی سے فن شعر کو بنالیا۔ اور اس فرض کی بجا آوری میں سخت سے سخت حالات اور نازک سے نازک مواقع پر بھی بددلی ظاہر نہ کی، اور اپنی طبعی صلاحیتوں و دماغی استعدادوں سے ہمیشہ اپنے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری میں مشغول رہے، اسی جد وجہد اور ایثار کا نتیجہ ہے کہ آج "آگرہ اسکول کا معیار تخیل" مشرق کی پوری روحانی رفعتوں کیساتھ ساتھ، مغرب کی علمی لطافتوں اور جذباتی نزاکتوں سے معمور نظر آتا ہے، اور ہندوستان کے ہر گوشہ میں آج اس کا اتباع کیا جارہا ہے، اور یہ زبان اردو ہی کی نہیں بلکہ ہندوستان کی ایک ایسی خدمت ہے، جس کی داد نہ صرف ہندوستان ہی کی آئندہ نسلیں دیں گی بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادیب و شاعر بھی اس کا اعتراف کریں گے علاوہ اُن منظومات کے جو وقتاً فوقتاً کتابی صورت میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مولانا کا ایک ضخیم دیوان "کلیم عجم" کے نام سے حال ہی میں شائع پذیر ہوا ہے۔ فرصت کا محتاج ہوں۔ اس کو سامنے رکھکر جی چاہتا ہے کہ ان تمام امتیازی خصوصیات پر نمونے پیش کرکے روشنی ڈالتا چلا جاؤں۔ جس نے اردو شاعری کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے، اُن کے عزیز ترین شاگرد جناب ساغر کا ضخیم مجموعۂ نظم بھی بادۂ مشرق کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور اُن کا اتباع کرنیوالے کثیر التعداد اصحاب ذوق کے نتائج افکار ہنوز کتابی صورت میں ملک کے سامنے نہیں آئے

مختلف رسائل واخبارات سے بطور سرسری اقتباس اشعار ذیل میں پیش کیا جاتا ہے، جس سے "آگرہ اسکول" کے معیار تخیل کا اندازہ ہوسکے گا۔ ذوق صحیح رکھنے والے اصحاب اوّل تو وجدانی جاذبیت سے خود ہی اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ دوسروں کے الفاظ وعبارت سے منّت کش ہونا۔ ان کے نازک احساسات کی منقبت پر مبنی ہوتا ہے، دوسرے اشعار کی جامعیت بیان اور تاثیر ترتیب کا تبصرہ اور ریویو میں اظہار کردہ معروض تجزیہ وتحلیل میں آجاتی ہے اور تا وقتیکہ مکمل فراغت اور ایک عمیق یکسوئی خاطر حاصل نہ ہو، لطائف شعری کو بحث میں لے آنا اور بطور سرسری بعض حسین خصوصیتوں کی طرف اشارے کر دینا حقیقت میں قطعی غیر شاعرانہ ظلم ہے۔ گو اس کا ارتکاب کتنا ہی کثرت سے ہو رہا ہو، مگر میں ایسا نہیں کرتا، اور بغیر کسی تشریح وتفسیر کے ان شعری شہ پاروں کو سامنے رکھے دیتا ہوں۔

عیش وآرام تو احساس کی دھوکہ ہیں فقط — سچ تو یہ ہے کہ مصیبت میں ہیں راحت والے
موت اک حسن کی گم کردہ وضاحت نکلی — سوزِ الفت جسے سمجھے تھے محبت والے
موت کی ہچکی نہیں صوتِ شکستِ ساز ہے — یہ مرے تارِ نفس کی آخری آواز ہے

(ارمان اکبرآبادی)

پھر کہہ رہا ہوں قصۂ یارانِ رفتگاں — جیسے بیاں کرے کوئی تعبیر خواب کی

(میر احدی اجمیری)

آثار ہیں پیدا سحرِ وصل کے شاید — نکہت کی طرح روح مری مائل رم ہے

شفیق کوٹی

پھونکدی یہ روح کس نے حسرتِ تقریر میں — میری گویائی کو لرزش ہے لبِ تصویر میں
میری حیرانی ہے حسنِ جلوہ گاہِ کائنات — جوہرِ آئینہ ہوں آئینۂ تصویر میں

(آغاز برہانپوری)

یہ حسین شب، یہ طوافِ کعبۂ حسن وجمال — چادرِ مہتاب مجھ کو جامۂ احرام ہے
سایہ میں گل کی منزلِ آخر بنائے — آوارہ کیوں چمن بہ چمن کارواں ہے

شاید قریب تر ہیں رہائی کی ساعتیں
میرے قفس پہ سارا چمن ہی جھکا ہوا

اختیارِ ناممکن ننگِ آزادی رہا
میری جانب سے اسے بھی نذرِ زنداں کیجیے

پھر انہیں ذرّوں سے بن سکتی ہے اک دنیا نئی
رائیگاں کیوں دل کے ذراتِ پریشاں کیجیے

یوں اگر پڑھیے تو ہے لطفِ نمازِ حریت
سجدہ زیرِ سایۂ زنجیرِ زنداں کیجیے

(اثر اکبرآبادی)

مری سرگشتگی محسوس خود مجھ کو نہیں ہوتی
مری فطرت میں گردش ہے کہ میں لغزیدہ ساغر ہوں

مری فریادِ بے ہنگام کوئی سن نہیں سکتا
میں اپنی حسرت و امید کا خاموش محشر ہوں

بہائے تھے مری رودادِ غم پر ایک دن آنسو
چمن کی آج تک وہ شبنم افشانی نہیں جاتی

(رعنا بلسوی)

تصور میں پہونچ جاتی ہیں اکثر حدِ منزل تک
ہم اپنا قافلہ صحرا بہ صحرا دیکھ لیتے ہیں

(شفق صحرائی)

دہر میں انسانیت کے ساز و ساماں کیجیے
میرے دل کی خاک سے تخلیقِ انساں کیجیے

(مخمور جالندھری)

نشاطِ عیش سے معمور ہے مگر کیا ہے
تصورات کی دنیا کہ پائیدار نہیں

دنیا کہ اپنے جلوۂ رنگیں سے خلد ہے
ہے صرف اک حقیقتِ باطل ترے بغیر

(رضا قریشی)

جو خستہ حالِ الفت ہیں وہی برباد ہوتے ہیں
تباہی ڈھونڈتی پھرتی ہے دنیا میں تباہی کو

مسرت کوش ہوں لیکن مثالِ قطرۂ شبنم
لرز اٹھتا ہے دل اک موجۂ بادِ بہاری سے

نشیمن کو جلا کر مجھ کو زندہ اس لئے چھوڑا
کہ میں آنکھوں سے اپنی دیکھ لوں اپنی تباہی کو

(خنداں جیلی)

جوہر اشیا میں ہوتا ہے تقابل سے فروغ
بت پرستی شرط ہے تمیزِ ایماں کیلئے

(فضائی ٹونکی)

فنا کے بعد احساسِ طرب کیوں رائیگاں ہوگا
مری تربت کے ذرّے ڈھونڈ لیں گے تو جہاں ہوگا

(جمال صابری)

اُن کا ہر اک تبسمِ خاموش
جلوۂ برقِ طور ہوتا ہے

وہ بھی کیا فرقت ہے مسافر کا
جب وہ منزل سے دور ہوتا ہے

ہوں بیخودی میں سجدہ گدازِ حریمِ دوست
میری جبین جبیں ہی نہیں آستاں بھی ہے

مست تھی آزاد بھی بزمِ ازل کی کیف سے
روح جبتک قیدی زندانِ آب و گل بھی تھی

سیکھنا تھا اضطرابِ موجِ دریا سے سبق
ورنہ آموز ہی خاموشی ساحل نہ تھی

بلندی پر ستارہ ہے جنونِ فتنہ ساماں کا
نظر میں چاند بن جاتا ہے ہر ٹکڑا گریباں کا

محبت کیوں نہ ہو جائے اسیرِ فطرتِ انساں
بساطِ قلب میں اک جال پھیلا ہے رگِ جاں کا

گدازِ عشق میری دور میں کیوں عام ہو جائے
پتنگا میرے سوز آباد میں آتش بجاں کیوں ہو

زمیں میں دفن کیوں ہو لالہ و گل کی تنگ کی تکمیل
ہماری خاکِ تزئینِ سوادِ خاکداں کیوں ہو

(آلم مظفرنگری)

سوادِ شام کی پھر بڑھ رہی ہے تاریکی
کہیں غروب مرا کارواں نہ ہو جائے

ہر ایک ذرّے کو ہے فکرِ عظمتِ خورشید
زمیں بھی آخرِ کار آسماں نہ ہو جائے

سکا ہشیں جب نیند اڑ جانے کا ساماں ہوگئیں
کیسی کیسی چاندنی راتیں پریشاں ہوگئیں

چاند میں چمکیں ستاروں میں نمایاں ہوگئیں
پھر ابھر آئیں وہ تصویریں جو پنہاں ہوگئیں

تھی نہ محتاجِ چراغانِ چمن شامِ بہار
جب شگوفے کھل گئے شمعیں فروزاں ہوگئیں

چمن میں اور نہر کے کنارے، نہ ہیں یہ جگنو نہ ہیں ستارے
یہ ہیں مری نطق کے شرارے بہار کا کارواں نہیں ہے

زوال کیا انحطاط کیسا جمال ہے رنگِ مستقل میں
یہ اوج میرے خیال کا ہے یہ چاند کا آسماں نہیں ہے

(ضیا چنیوٹی)

ان سے آگے بڑھ کہ یہ دیر و کلیسا و حرم
سنگِ راہِ منزلِ مقصود ہیں منزل نہیں

انکی نظر نہ سکہ ہے بالیدگی بخشِ حیات
غنچۂ دل پر نظر ڈالی گلستاں ہو گیا

دے وہ مے اور اتنی دے ساقی کہ جس کی کیف سے
عشرتِ امروز میں فکرِ غمِ فردا نہ ہو

بقیہ مضمون صفحہ ۲۰۵ پر ملاحظہ فرمائیے

شاعرِ اعظم

از ــــــ حضرت خلیق برہانپوری

پیغمبرِ سخن تری ہستی جہاں میں ہے
آوازہ تیرا وسعتِ کون و مکاں میں ہے

ہندوستان کو ذاتِ گرامی پہ تیری ناز
دنیائے شاعری ہے ترے دم سے سرفراز

مشرق کا اک خطیبِ ادب فطرتاً ہے تو
محبوب و دلنواز تری طرزِ گفتگو

الوارِ شعریت کا ترے منہ سے ہے ظہور
جولائی خیال تری موجِ جوئے نور

ہر نظم ہر جہت سے ترا شاہکار ہے
گلریز تو کہیں ہے کہیں شعلہ بار ہے

پہونچا کبھی تو خدمتِ شاہِ حجاز میں
فریاد کی ہے نغمۂ سوز و گداز میں

پیغامِ آشتی جو وطن کا سنا دیا
اک سوز نوجوانوں کے دل میں بڑھا دیا

اے سرزمینِ تاج کے نقادِ خوش کلام
ٹوٹے ہوئے دلوں کی تسلی ترا پیام

نغموں میں تیرے رقص کناں موجِ سلسبیل
ہر شعر تیرا مظہرِ الہامِ جبرئیل

اے قادر الکلام فصیح البیان ادیب
فکرِ بلیغ کا ترے انداز ہے عجیب

آئینہ دارِ ظاہر و باطن تری نگاہ
ہر شعر میں ترے ہے نہاں جذبِ بے پناہ

دنیائے شاعری میں کیا تو نے انقلاب
اک صورِ حشر ہے ترے انفاس کا رباب

سیماب اک نکتۂ اعظم ہے تیری ذات
حل تو نے شعر میں کئے مشکل ترین نکات

اے پاکباز رندِ خمستانِ وارثی
کہہ ڈالے تو نے کتنے ہی اسرارِ بیخودی

پیغام اپنا اہلِ جہاں کو سنائے جا
اے حق پرست شورشِ باطل مٹائے جا

آگرہ اسکول کا رنگِ تغزل

از ــــــ حضرت نہال سیوہاروی

مولانا حسرت موہانی کا قول ہے کہ رنگ تغزل کی تین قسمیں ہیں۔ عارفانہ، عاشقانہ، اور فاسفانہ، اس نظریہ کے تحت میں جب ہم آگرہ اسکول کے رنگ تغزل کا تجزیہ کرتے ہیں تو بلاشبہ ہم کواس مدرسۂ شعر وسخن میں جسکی شہرت سے دیارِ ہند گونج رہا ہے۔ اوّلین دو اصنافِ تغزل کا امتزاج نظر آتا ہے جس کا ہنوز کوئی نام نہیں۔

بسیار شیوہ ہاست غزل را کہ نام نیست

غزل کے متعلق نقادانِ فن کا کیا اچھا فیصلہ ہے کہ یہی ابتدائے شاعری اور یہی انتہائے شاعری ہے۔ ولی دکنی کے زمانے سے تا دورِ موجودہ عروسِ شعر جامہائے نو بنو سے مزین رہی ہے۔ میر۔ سودا مصحفی۔ جرأت۔ آتش ناسخ۔ غالب۔ ذوق۔ مومن۔ داغ اور امیر نے اپنی عمرہائے گرانمایہ اس کو نکھ سکھ سے آراستہ کرنے میں صرف فرمائی ہیں۔ اور انہیں اساتذۂ ماسبق کا فیضان ہے کہ اردو غزل کو آج وہ مقبولیت حاصل ہے کہ یہ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہندوستان کے گوشہ گوشہ پہ چھائی ہوئی ہے۔

غزل کے وہ اسکول جو انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں۔ چار ہیں۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ آگرہ۔ اور لاہور۔ جن میں ہر ایک اپنی منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ اور اپنے کام پہ ایک جداگانہ محاکمہ چاہتا ہے۔ آگرہ اسکول جس کا تعلق مضمونِ زیر بحث سے ہے۔ کوئی نیا مدرسۂ سخن نہیں۔ اس کی عہدِ عتیق وجدید ہر دو شاندار روایات سے پُر ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ میر۔ نظیر غالب۔ مہر۔ آہ۔ وگیر۔ بزم اور سیماب جیسے اساتذۂ شعر کی سرپرستی کا فخر اس کو حاصل رہا ہے۔ اور ہے۔ آج ارضِ تاج حضرتِ سیماب پر بجا طور سے ناز کرسکتی ہے۔ کہ آپ نے اس سرزمینِ ادب کو یہاں تک فروغ بخشا ہے کہ ایک عالم اس کے انوارِ فیض سے بہرہ ور ہے

معلمانِ نفسیات کا قول ہے کہ ہنگام ریاضت یکسوئی خاطر کیلئے انسان نے اصنام پرستی کو رائج کیا' اور یہی اصنام پرستی طالبانِ حق کو بتدریج جادۂ مجاز سے شاہراہ حقیقت کی جانب لے گئی۔ یہی حال اردو غزل کا ہے۔ جس کے ابتدائے دور میں حدیثِ عارض و کاکل کا ایک وافر حصہ پایا جاتا ہے۔ کبھی اس کی تعریف "گفتگو بازناں" تک محدود تھی۔ اور آج آگرہ اسکول "سرمایۂ الہام" سے موسوم کرتا ہے۔ کسی زمانے میں اس دودِ چراغ کا نزیا کی ایک معاملہ گو کے نام سے پکارا جاتا تھا' اور آج اُس کو پیغمبرِ سخن کہتے ہیں۔

فصیح الملک داغ دہلوی کی روحِ پاک پر خدا کی بےشمار رحمتیں ہوں کہ اس خدائے سخن نے کاشانۂ غزل کو خوب سے خوب تر بنایا اور اس کی بناد ارذاتِ قلب پر رکھی۔ یہ کہنا انکشافِ حقیقت ہے کہ غزل کی موجودہ ارتقائی صورت اسی بلبلِ ہند کی ممنونِ احسان ہے حضرت سیماب جو آنجہانی کے جانشین اور یادگارِ صحیح ہیں۔ ان کے مشن ر[illegible] کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سرگرمِ کار ہیں۔ آگرہ اسکول جسکو ایوانِ تغزل کے دلفریب بنانے میں ایک امتیازی شان حاصل ہے۔ ایک سیر حاصل مضمون چاہتا ہے۔ جس میں اس کی

ہر ایک فنی نشو و نما کو اُجاگر کیا جائے۔ یہ کام مجھ سے بہتر نقادانِ بالغ نظر کا ہے۔ جو مناسب وقت پر آئندہ اس کو انجام دیں گے۔

مولانا سیماب اپنے نصب العین کو واضح فرماتے ہوئے ایک مقام پر یوں رقم طراز ہیں "وہ زمانہ قریب ہے کہ سماعت فریب جالِ اوراقِ پریشاں کی طرح منتشر ہو جائیں گے۔ اور یہی اجتہاد و اختراع جس پر آج سب و شتم کے تاریک پردے ڈالے جاتے ہیں دوپہر کی دھوپ کی طرح دنیا پر چھا جائے گا۔ اور تقلید و اتباع کے سیاہ نقطے مرکز تعدیم تک پہنچ جائیں گے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اُردو کی تعمیر و تنظیم کے لئے جو اسالیب میں کام میں لا رہا ہوں یا میرا مسلک جنکی تکمیل کر رہا ہے۔ وہ اُردو کو مفید۔ مرصع۔ عالی۔ اور حسین بنانے کے ذرائع ہیں۔ میرا مسلک خاموش کاری اور صلح ہے۔ اس لئے باوجود سخت ترین حملوں کے بھی میں خاموش رہتا ہوں۔ مگر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میرا مسلک کامیاب ہے۔" تحریر بالا سے اپنے مدرسۂ شعر کی حقیقت کا اظہار پیر مدرسہ کی زبان سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ مگر حضرت سیماب نے اِسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے مقصد کے وضاحت کیلئے متعدد خطبات ارشاد فرمائے ہیں۔ چنانچہ ایک دوسرے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں "اس وقت تین قسم کے شاعر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ زوالی۔ حالی۔ اور استقبالی۔ زوالی شعراء وہ ہیں جو ہندوستان کے اس عہدِ زوال میں ہنوز انھیں متقدمین کے پیرو ہیں۔ جو ہندوستان کی مجلسی و اخلاقی اور ثقافتی عظمتوں کے زوال کا باعث ہوئے۔ جنکی نشاطی۔ بازاری۔ معاملاتی اور غیر سنجیدہ شاعری نے ملک کی تمام سوسائٹیوں اور حکومت کے ایوانوں میں عیش پرستی اور غفلت شعاری کا زہر پھیلا کر اُن کی قوتِ عاملہ کو ماؤف کر دیا تھا۔ یہ شعرا زبان اور محاورات کی آڑ لے کر اب بھی اُسی شاعری کے مبلغ و مرید ہیں جو انشا اور امانت کے عہد میں زوالِ مدنیت کا باعث ہوئی تھی۔

زوالی شاعر عہدِ موجود، کی ترقی کے بعد بھی یادگارِ زوال کے باعث رہیں گے۔ اور تاریخ ہند نفرت و عبرت کے ساتھ بقائے زوال کا اُن کو ذمہ دار ٹھہرائے گی۔ دوسری قسم حالی شعرا کی ہے۔ یہ وہ شعرا ہیں جو تعلیم کی برکات سے مستفیض ہو کر اپنی روشِ افکار کو بدل چکے ہیں اُنکی شاعری کا معیار بہت بلند ہے۔ یہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے میرؔ و سوداؔ اور غالبؔ و مومنؔ کے اُس حصۂ کلام کی تقلید کی ہے جو فلسفۂ حیات و غم اور فلسفۂ حسن و صداقت پر مبنی ہے۔ تیسری جماعت استقبالی شعرا کی ہے۔ گو یہ شعرا معدودے چند ہیں لیکن انھیں فی الحقیقت مستقبل کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ مادیت اور روحانیت کے حجابوں کو اُنکی آتش نوائی نے چاک کر دیا ہے۔ اور انسانیت اور بربریت کا فرق اُنکی اسرار کشا نواؤں نے صبح کی روشنی کی طرح آشکار کر دیا ہے"

آگرہ اسکول کے خضرِ ادب اور اُس کی کلاس کے مطالعۂ کلام کے بعد یہ حقیقت صبحِ ازل کی طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ قصر الادب محض بلند بانگ دعاوی کا نام نہیں بلکہ یہ حالی اور استقبالی شعرا کی اُس جماعت کا مرکز ہے۔ جو معیارِ تغزل کو بلند کرنے میں بیش از بیش مصروفِ کار ہے۔ ذیل کے انتخابات کو ملاحظہ فرمائیے اور خود فیصلہ کیجئے کہ اس درسگاہِ سخن کے رنگِ تغزل پر کیا کیا احسانات ہیں۔

علامہ سیماب اکبر آبادی

رہینِ لامکاں ہوں بے نیازی میری فطرت ہے — مذاقِ آرزو تو بر بنائے آدمیت ہے
وہ سجدہ کیا ہے احساس جسمیں سر اُٹھانے کا — عبادت اور بقیدِ ہوش توہینِ عبادت ہے

دیوانے کو تحقیر سے کیوں دیکھ رہا ہے — دیوانہ محبت کی خدائی کا خدا ہے
کس درجہ ہے معصوم مرا عالمِ ہستی — اب ذہن و نظر میں نہ خودی ہے نہ خدا ہے
سچ ہے کہ خدا تک ہے محبت کی رسائی — اور تجھکو یقیں ہو تو محبت ہی خدا ہے
یہ جاتی ہوئی رات کا گاتا ہوا عالم — خاموش ہر اک چیز ہے دل بول رہا ہے

سر بر قدمِ حسن و قدم بر کلہ و تاج　　دیوانہ بڑی شان سے دیوانہ بنا ہے

سحر پرست ہوں پروائے التہاب نہیں　　مرے چمن کا ہر اک پھول آفتاب نہیں
جہانِ عشق پہ طاری ہے اک مسلسل رات　　جہاں تک اُنکی خدائی ہے آفتاب نہیں
پلائے جا نگہِ مست سے پلائے جا　　ابھی سکون بمقدارِ اضطراب نہیں
ہو کسطرح کوئی میرا شریکِ خلوتِ شوق　　یہ بیخودی ہے کہ میں خود بھی باریاب نہیں
حجابِ ہستیِ انساں پہ مجھکو حیرت ہے　　یہاں تو خاک کا ذرہ بھی ذی حجاب نہیں
کریں نہ دل کو مری خاک میں نہ کہتا تھا　　اب اُنکے حسن کو آئینہ دستیاب نہیں

جو قدسیوں کے درس میں تھا درسِ آخری　　اک جزوِ مختصر وہ مری آگہی کا تھا

مجھے پروائے تغافل نہیں، شکوہ یہ ہے　　کہ ترے علم میں کیوں ہے غمِ پنہاں میرا

کیوں درد دیوار بھی ہوں واقفِ حالِ تباہ　　توڑ دیتے ہیں چراغِ شام ماتم خانہ ہم

تیرے دیوانے نے چھیڑا سازِ غم کچھ اسطرح　　جھوم کر زنداں کی دیواریں غزلخواں ہوگئیں

آہ غم خانۂ غربت کی جنوں سامانی　　ہے جہاں تک مری دنیا کوئی آباد نہیں

جتنے ستم کئے تھے کسی نے عتاب میں　　وہ بھی ملا لئے کرمِ بے حساب میں

صدائے صور سے میں حشر میں نہ جاگوں گا　　کسی سنی ہوئی آواز سے پکار مجھے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے　　کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

یوسف غیور، فطرتِ یوسف غیور تر　　کیا اعتبارِ خوابِ زلیخا کرے کوئی

طور پر جانیکا کیا دے گا یدِ بیضا ثبوت　　حضرتِ موسیٰ دکھائیں پاؤں میں چھالا مجھے

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے　　وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے؟

مندرجۂ بالا اشعار اور اسی شان کے سینکڑوں نشتر ایک صاحب نظر کو مولانا کے مجموعۂ کلام میں بغیر کسی جستجو اور کاوش کے مل سکتے ہیں۔ جس میں تمدن، اخلاق، تصوف، اور فلسفۂ حیات کو اس خوبی سے آب رنگِ غزل میں سمویا گیا ہے کہ بے ساختہ منہ سے آہ اور واہ نکل جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ مولانا اپنے عہد کے میر و سودا ہیں۔ اور اُن کے کمالِ شعر سے انکار کرنا اعجازِ شعر سے منکر ہونے کے مترادف ہے۔ آپ نے بالکل بجا ارشاد فرمایا ہے۔

میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں　　ہر رنگ کی شراب پیالی میں ہے مرے

(سیماب)

مذاہبِ شعر کے صحائف سے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ پیغمبرِ سخن جس پیام کا خود مبلغ ہوتا ہے۔ اُسی کی گرمی تاثیر سے اپنے ماحول اور تلامذہ کی طبائع کو متاثر کرتا ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملاحظہ فرمائیے کہ زلہ ربایانِ سیماب نے پامال زمینوں میں کیسی کیسی شگفتہ کاریاں کی ہیں اور جولانیٔ فکر کے کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔

ارمانؔ اکبر آبادی

شکارِ صبر ہوں پامالِ اختیار ہوں میں　　کہ نامراد ہوں پھر بھی اُمیدوار ہوں میں

میرؔ احدی اجمیری

یہ چرخ یہ زمین کسی کو نہیں ثبات　　اس کارواں سرا کی ہر اک شئی سفر میں ہے

یاور نقوی

ہر نفس فطرت مجھے کام آشنا کرتی رہی　　اس عنایت پہ بھی میں ناکام کا ناکام تھا

وہ ایک لمحہ بہت ہی جو عیش میں گذرے　　نہ دے مجھے غمِ عمرِ دراز رہنے دے

ضیا فتح آبادی

دیکھ کر مجھ کو ستاروں کو نہ پھر نیند آئی　　اور کیا اس سے زیادہ غمِ ہجراں ہوتا
دل اگر عشرتِ فردا کی نہ رکھتا اُمید　　کیوں مہیا غمِ امروز کا ساماں ہوتا

تشفیق کوٹی

ٹھہرائے موجِ گردابِ بلا اتنی بھی جلدی کیا　　سلامِ شوق پہنچادوں ذرا اربابِ ساحل کو

کوثر کشمیری

تمامِ فرقت آتشِ غم کی فراوانی نہ پوچھ　　اپنی ہستی کو سمجھتے ہیں چراغِ خانہ ہم

آغا زبرہانپوری

تجھ سے سکون چاہوں توہین ہے یہ میری　　ٹھکرا چکا ہوں تجھ کو اے گردشِ زمانہ

احساسِ وفا پیدا نہ ہوا تو اور پھر اے دل کیا ہوگا　　جو عشق کے لائق ہو نہ سکا وہ حسن کے قابل کیا ہوگا

اک جہاں ہے اداشناسِ جمال　　تو کہاں آج بے نقاب ہوا

انور بھوپالی

جذبِ دل کھینچ کے مجھ تک انھیں لایا ہی تھا　　اس سے پہلے تو یہ عالم نظر آیا ہی نہ تھا
ہائے یہ اس کی تلافی کی ادائیں انور　　جیسے اس نے مجھے دیوانہ بنایا ہی نہ تھا

نظامِ زندگانی ہی محبت سے عبارت ہے　　محبت زندگی ہے زندگی کیا ہے محبت ہے

اثر اکبرآبادی

پھر التفاتِ حسن نے بخشی حیات لو　　اچھا ہے کچھ دن اور ابھی دنیا جواں ہے

اتنا تو ہوش ہے انھیں دیکھا تھا بے نقاب　　پھر اس کے بعد کچھ نہیں معلوم کیا ہوا

اخگر سہسرامی

الٹ دیتی ہے پردے ہوش کے جب میری بیہوشی　　نظر کے سامنے اُن کا حریمِ ناز ہوتا ہے
چمن میں اوس پڑ جاتی ہے کلیوں کے تبسم پہ　　ہماری داستانِ غم کا جب آغاز ہوتا ہے

رعنا بلسوی

ہے قایم ابتدا و انتہائی کارواں مجھ سے　　جو پیچھے ہوں تو رہبر وہ ہوں جو آگے ہوں تو میر ہوں

حیرت لدھیانوی

ہے جستجو وفا کی جہانِ خراب میں　　آبِ حیات ڈھونڈھ رہا ہوں سراب میں

مخمور جالندھری

اپنا دلِ شکستہ ترے پاس لائے ہیں　　سنتے ہیں ہم نظر تری آئینہ ساز ہے

حسن کی گرم نگاہی سے الٰہی توبہ　　عشق پہ آجائے تو کونین کو ویراں کردے

اپنے مسکن سے محبت ہے انھیں بھی آخر　　کیوں ہمیں لوگ نشیمن سے جدا کرتے ہیں

رضا قریشی

مانا کہ فکرِ برق و غمِ باغباں نہیں　　پھر بھی قفس قفس ہی تو ہے آشیاں نہیں

خنداں جہلمی

شمع لائے ہیں تری بزم میں مطلب ہے　　یاد آئے تجھے بھولے ہوئے پروانوں کی

نذیر بشیر کوٹی

بڑھ گئی ہے یہ ادا مجھ میں ترے عشق کے بعد　　خود بخود اپنی طبیعت سے الجھتا ہوں میں

تم نے کئے پیدا دلِ خاموش میں نغمے　　یہ ساز کسی سے ترنم نہ ہوا تھا

خیال یہ ہے کہ ہے آشیاں مرا ویراں　　ملالِ بیکسیٔ بال و پر نہیں ہے مجھے

فضائی ٹونکی

آپ کیوں کر دیں مجھے ترکِ تعلق سے تباہ　　اک سہارا ہے یہی عمرِ پریشاں کے لئے

تو دیا بر خفتہ بختی اگر گذرے صبا　　ڈھونڈ ھتا اک نیند میری چشمِ گریاں کیلئے

جمال صابری

جنھیں تاریخ پایانِ محبت یاد ہے اب تک　　وہ ہر ذرہ کو اک گذری ہوئی دنیا سمجھتے ہیں

آلم مظفر نگری

چارہ سازوں کی غلط سامانیاں دیکھو کوئی　　ہے جنوں آزاد میرے پاؤں میں زنجیر ہے

تری آنکھ میکدہ ہو تو خیالِ زہد کیسا　　جو شراب تو پلائے تو کہاں کی پاکبازی

ضیا چنیوٹی

چمن کے ربط و تعلق سے ہو نہ مایوسی　　الٰہی ڈھونڈھتا پھرتا ہو آشیاں مجھ کو

برق فتحپوری

برق گلشن میں آشیاں رکھ کر　　توبہ توبہ یہ نامرادے توبہ

شفیق ٹونکی

عشق کے میں جن فسانوں پر تھا گل تک خندہ زن　　آج وہ میری ہی یارب داستاں کیوں ہو گئے

حسنِ برہم کا یہ عالم کس سے دیکھا جائیگا　　آئینہ منگوایئے زلفیں پریشاں ہو گئیں

قمر سہسرامی

آتشِ شوق کو کچھ اور ذرا بھڑکا دے　　تجھ کو اپنے کرمِ جنبشِ داماں کی قسم

ساغر نظامی

سنا مغنی مجھے وہ نغمہ کہ جھوم جائے شباب تیرا　　اگر ذرا بھی کیا تکلف تو چھین لونگا رباب تیرا

ہاں یہی رہزن ہے میر کارواں کو گھیر لو　　کارواں لٹتا رہا یہ بدگماں دیکھا کیا

تیرا گھر دور سہی، دور سہی، طور سہی　　ہاں مگر مستِ تصور کیلئے دور نہیں

ان نو رس آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے کیا رونا ہے　　برسی ہوئی ہے موتی ہیں بہتا ہوا خالص سونا ہے

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے　　حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

شمع بھی تھی رہی پروانے بھی سنتے رہے　　اور وہ سوتے رہے کہتے رہے افسانہ ہم

بدل گئیں ہیں فغاں میں جرس کی آوازیں　　کوئی خرابِ محبت تو کارواں میں نہیں

منظر اکبرآبادی

ذوقِ باطن اس طرح بیخودی کا آہی گیا　　نزع کے عالم میں لب پہ ذکرِ یار آہی گیا

مجھ سے وعدہ کر رہے ہیں اس یقین کے ساتھ وہ　　جیسے میرے دل کو ان کا اعتبار آہی گیا

جس وقت تک جنوں کے قدم درمیاں رہے　　معلوم خود ہمیں بھی نہیں ہم کہاں رہے

جس پر قفس بھی بارِ نشیمن بھی تنگ ہو　　وہ نامرادِ موسمِ گل میں کہاں رہے

برباد کرکے دے نہ فریب التفات کے　　اب ہم تری نگاہ کے قابل کہاں رہے

اضطرابِ دل کی مجبوری نہ پوچھ　　جو نہ کہنا تھا ہم اُن سے کہہ گئے

ماجرا یہ ہے کہ جینا موت تھا　　معجزہ یہ ہے کہ زندہ رہ گئے

اعجاز اکبرآبادی

ازل کیا اور ابد کیا ہر جگہ گذری کی مشکل سے　　نہ جب تسکین تھی دل سے نہ اب تسکین ہے دل سے

محبت کی روش میں کاش کوئی انقلاب آتا　　یہ حسرت تھی کہ اپنا دل بدل لیتا تری دل سے

کیوں برقِ طور یہ بھی نہ پوچھا کلیم سے　　چھپنے سے کیا ہوا اگر آنے سے کیا ہوا

آپ نے آگرہ اسکول کی تاریخ، اُس کے ماضیِ ادب کا نصب العین، اور اُس کا منتخب کلام ملاحظہ فرمایا۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اُس کے پیرو اُس کے اتباع کا حق کس خوبی سے ادا کر رہے ہیں۔ اب مجھے آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ درسگاہ ایک آزاد درسگاہ ہے جس کا مسلک ہے موت، جانکنی اور دلو آزنا۔ ان سے ہذیان نکالنا نہیں بلکہ مذاقِ سلیم کی پرورش ہے۔ صفائی زبان میں یہ اسکول زبانِ شمع کا مقلد اور افکار میں ایک خوشگوار انقلاب کا حامی ہے۔ راز چاندپوری، نیر احمدی اجمیری، ساغر نظامی، منظر اکبرآبادی، آلم مظفر نگری جیسے ادیب اس کے فیضان کے ناقابلِ انکار ثبوت ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب آزاد ہندوستان کی تاریخ ادب مرتب ہوگی تو اس اسکول کا نام زریں حروف سے لکھا جائیگا۔

آگرہ اسکول کا ارتقائے نظم

از ــــــــ حضرتِ مولانا ماہر القادری

دریا کی تہ ان گنت سیپیوں سے لبریز ہوتی ہے، مگر ہر سیپی کے آغوش میں موتی نہیں بنتا۔ بارش کے لطیف جھالے ہر جگہ برستے ہیں۔ مگر ہر قطعۂ ارض میں گل و لالہ نہیں اُگتے۔ اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر ایک جگہ زعفران کی دُوب لہلہاتی ہے۔ اور دوسری جگہ خار دار جھاڑیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک چشمہ کا پانی اس قدر شیریں ہوتا ہے کہ زبان حلاوت میں ڈوب جاتی ہے، اور دوسرے چشمہ کا پانی اتنا بدمزہ اور تلخ ہوتا ہے کہ قوتِ ذائقہ کو مجبورِ فریاد ہونا پڑتا ہے۔ اس اختلاف و تباین سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے ہر خطہ کو ایک خاص وصف و خوبی کے لئے مخصوص کیا ہے۔ امتیازات کی اسی رنگارنگی اور اختلافات کی بوقلمونی سے متاثر ہو کر خاقانیٔ ہند بے اختیار پکار اُٹھا تھا:—

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن ۔۔۔ اے ذوقؔ اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

اکبر آباد کی سرزمین کو قدرت نے شعر و سخن کی پیداوار کے لئے منتخب کیا، اور اس زمین کے ذرّہ ذرّہ میں قابلیتِ شعری پیدا کر دی۔

تاج محل کو لوگ فنِ تعمیر کے زاویۂ نگاہ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ مگر میں تو علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اکبر آباد کے ماحول نے جو شاہِ جہاں کے دماغ کو شعری ذوق عطا کیا تھا۔ تاج محل اُسی کا نقشِ مکمل ہے۔ تاج محل کچھ نہیں ہے، سوائے شعر ہونے کے، لیکن شعر بن جانے کے بعد پھر کوئی اور چیز بننے کی ضرورت ہی کب باقی رہتی ہے۔ اس لئے تاج محل کی اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ "مجسم شعر" ہے جس کے ہر پتھر میں شاہ جہاں کی محبت انگڑائیاں لے رہی ہے۔ جو لوگ اینٹ پتھر کی زیارت کرنے کے لئے جاتے ہیں، وہ تاج محل کی قدر کیا جانیں؟ دردمند دلوں اور حسن شناس نگاہوں سے پوچھئے تاج محل کی قدر، قدم قدم پہ ایک ایک پتھر تصور کا دامن تھام کر کہتا ہے۔

عشق از اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع
ایں شرابے است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

اسی شعریت نواز سرزمین سے میاں نظیر پیدا ہوئے، جو ہر حیثیت

سے مکمل شاعر تھے' اور جن کے میٹھے بول آج بھی سامعہ پر دودھ اور شہد کا مینہ برساتے ہیں۔ تمیر نے بھی ارضِ تاج ہی میں جنم لیا اور یہ وہی اکبرآبادی میر تھا جو سوز وگداز کا آتش فشاں ہمارے درمیان چھوڑ گیا ہے۔ اور جو اردو کے ہر شاعر کے مقابلہ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق رکھتا ہے۔

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر ٭ یہ ہماری زبان ہے پیارے

اسی اُفق سے شعر وسخن کا وہ آفتاب طلوع ہوا جسے دنیا غالب کے نام سے جانتی ہے۔ اور جس کے پیدا ہوتے ہی دنیائے شعر وادب کا ذرہ ذرہ پکار اُٹھا۔

آمد آں یارے کہ من میخواستم

اکبرآباد کی سرزمین پر خدا رحمت کے پھول برسائے کہ اُس کے آغوش سے اردو کا یہ شاعرِ اعظم پیدا ہوا۔ اور آج دنیا میں اُس کی عظمتِ شاعری کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ جب کہ وہ خود اپنی الہامی زبان سے کہہ گیا تھا:—

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است ٭ شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبرآباد کی سرزمین کو شعر وادب سے خاص مناسبت ہے۔ اور قدرت نے کمال فیاضی کے ساتھ یہاں شعر وادب کے چشمے بہائے ہیں۔

انقلابی دَور

۱۸۵۷ء کے غدر سے لے کر اب تک ہندوستان میں بہت سے انقلابات رُونما ہوئے۔ اول تو غدر ہی ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا' جس نے ہندوستان کے تمدن و تہذیب کو تہ وبالا کر دیا۔ اُس کے بعد انقلابات کی آندھیاں مسلسل چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں کانگریس کی قربانیوں اور کوششوں کی بدولت ہندوستان نے اس چیز کو محسوس کر لیا کہ "مزدور" اور "کسان" بھی بساطِ حیات پر اہم مہروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ انقلابات کا اثر ملک کے لٹریچر پر بھی پڑتا ہے۔ ماحول کے انقلابات کے ساتھ ادب میں تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں روس میں جب انقلاب شروع ہوا تو ہر شاعر اور ادیب کا قلم کسانوں اور مزدوروں کی حمایت کرنے لگا۔ ایران نے جب زندگی کی کروٹ لی تو وہاں کا ادب ٹھوس علمی ہو گیا۔ ہندوستان میں اردو ادب پر بھی انقلابات کا اثر ہوا خصوصاً اردو شاعری اس انقلاب سے بہت کچھ متاثر ہوئی۔ غالب اردو کا شاعرِ اعظم تھا لیکن غالب کے تصور میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی' کہ اردو شاعری کا کسی زمانہ میں "کسان" اور "مزدور" موضوع بن جائے گا۔ اردو شاعری کے اسی انقلابی دور میں اکبرآباد کی سرزمین کو بھی اس انقلاب میں حصہ لینے کا حق تھا۔ اس ہنگامہ پرور دَور میں جب کہ ہندوستان کے ذرّہ ذرّہ سے شعر وادب کے چشمے اُبل رہے ہیں' اکبرآباد نے ایک خاص حلقۂ خیال (The School of Thought) دنیا کے سامنے پیش کیا' جس کا سہرا حضرت سیماب اکبرآبادی کے سر ہے۔ شاعر کی عظمت اور اس کا کمال یہ ہے کہ دوسرے لوگ اُس کے اندازِ بیان اور حلقۂ خیال کی تقلید کریں۔ اور اُس کے مقلدین' عام شعراء سے ممتاز نظر آئیں۔ جناب سیماب کو قدرت کی طرف سے اس شاعرانہ عظمت کا عطیہ دیا گیا۔ اور آج آپکے مقلدین ایک خاص طرزِ بیان' اسلوبِ نگارش اور حلقۂ خیال کے پیرو اور مقلد سمجھے جاتے ہیں۔ اسی حلقۂ خیال کو ہم "آگرہ اسکول" کہتے ہیں۔

آگرہ اسکول کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اُس نے اردو شاعروں کے سامنے بیشمار موضوعات پیش کر دئے ہیں۔ اور نئی ترکیبوں اور دلچسپ بندشوں کی ایجاد کی طرف طبیعتوں کو مائل کر دیا ہے۔ دوسرا امتیاز شکوہِ الفاظ کا شکوہ اور ترنم کا اہتمام ہے۔ آگرہ اسکول کا ہر شاعر شکوہِ الفاظ کا دلدادہ اور اہتمام ترنم اور رعایت موسیقی کا عاشق ہے۔ آگرہ اسکول کی شاعری میں نمو کی قابلیت بہت زیادہ ہے۔ اور یہ اُس کونپل کی طرح ہے جو سورج کی کرن کے پڑتے ہی انگلوں نہیں بالشتوں

بڑھتی ہے۔ آگرہ اسکول نے رومانی اور انقلابی، دونوں قسموں کی نظموں کو پیش کیا ہے۔ اور اُس کا صدر تو عرفان و تصوّف کے سبزہ زار دل میں بھی گلگشت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ اُس کے مقلدین کے اس منزل میں بڑائے نام نقشِ پا نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم آگرہ اسکول کے بانی سیمابؔ کی شاعری پر اجمالی تبصرہ کرتے ہیں تاکہ آگرہ اسکول کا صحیح خاکہ آپ کی نظروں کے سامنے آجائے۔

"محبت شاعری کا موضوعِ خاص ہے، حضرت سیمابؔ نے "صبحِ محبت" کے عنوان پر اظہارِ خیال فرمایا ہے:۔

دہ بھی کیا محبت کی صبحِ پُر مسرت تھی — حسن کی فضاؤں میں جب نمودِ جنت تھی
جذبۂ محبت سے تھی بھری ہوئی دُنیا — یہ فلک محبت تھا، یہ زمیں محبت تھی
رات کے حجابوں میں کوندتے تھے سیارے — زلفِ شام سے پیدا صبح کی صباحت تھی
سر تھا دہی تاباں، جو ازل میں چمکا تھا — دل میں ذرہ ذرہ کی جلوہ گر حقیقت تھی
ہر تبسم اُس کا تھا زندگی کا گہوارہ — ہر ادا تھی اک مژدہ، ہر صدا بشارت تھی
انکھڑیوں کے پیمانے، مستیوں کے میخانے — اک نظر محبت تھی، اک نظر صداقت تھی
ٹھوکروں میں پلتی تھی، جاہ و حشمتِ عالم — کیا خیال دولت کا جب نظر ہی دولت تھی
خشت و گل پہ کیا کرتی وہ سریرِ جہاں بانی — دل پہ اختیار اُس کا رُوح پر حکومت تھی
جب خفا ہوئیں نظریں تھا رسن ہر اک تیور — جب جبیں پہ بل آئی، ہر شکن سیاست تھی
اُس کے عہد میں عالم اک جوانِ رعنا تھا — اُس کے سایہ میں دنیا اک جہانِ عشرت تھی

آہ پھر گئی جب سے وہ نگاہ فطرت کی
یہ فنا زدہ دنیا قبر ہے محبت کی

سیمابؔ نے "محبت" جیسے پامال موضوع کو اس قدر دلنشین انداز میں پیش کیا ہے کہ اس موضوع پر اچھوتے ہونے کا گمان ہوتا ہے، ایک ایک مصرع میں ترنم و موسیقی کی روح بیقرار ہے۔ اس شعر کا لطف آلودۂ بیان اور شرمندۂ اظہار نہیں ہو سکتا کہ:۔

اُس کے عہد میں عالم اک جوانِ رعنا تھا — اُس کے سایہ میں دنیا اک جہانِ عشرت تھی

ایک نظم کا عنوان "سری کرشن" ہے اُس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

گذشتہ صبحِ محبت کو ڈھونڈنے نکلا — اک آفتاب محبت کی روشنی لے کر

اندازِ بیان جتنا سلیس ہے۔ اُس سے زیادہ دلنشیں اور وجدان نوا ہے۔

آگرہ اسکول کے بانی سیمابؔ نے اہلِ عالم کے نام ایک پیغام دیا ہے جس کا ایک ایک بند اپنی جگہ ایک مستقل شعر کی دنیا ہے:۔

رفتہ رفتہ سادگی کے پیرہن بدلے گئے — کچھ نئے پہلو میانِ انجمن بدلے گئے
آدمیت کو پسند آیا درندوں کا لباس — فکر کے تیور نظر کے بانکپن بدلے گئے
خود پرستی نے حکومت کی حدیں تیار کیں — جنگلوں میں انقلاب آیا چمن بدلے گئے
کی گئی تقسیم مقبوضات میں سطحِ زمیں — دہر کے نقشے بہ عنوانِ "وطن" بدلے گئے
جن میں پھولوں کی نزاکت تھی ستاروں کی چمک — سب محبت کے وہ اندازِ کہن بدلے گئے
آگ میں لوہے کو بدلا، اور ڈھالا اُس سے تیر — پھر کمانداری سے دلداری کے فن بدلے گئے
سجدہ گاہوں میں تعصب نے نئی تفریق کی — خانقاہوں میں عبادت کے چلن بدلے گئے

جادۂ صدق و وفا پر ظلمتیں طاری ہوئیں
کارواں پر خود روی کی لعنتیں طاری ہوئیں

اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

کھو گیا انسان ظاہر داریوں کے سیل میں — روح کی قوت تقدیرِ مادّیت کم ہوئی

"تقدیرِ مادیت" کی بے پناہی اندازہ سے باہر ہے۔

نالہ نے لگا دی آگ دشت و کوہ میں — آتشِ گل سے پریشاں محفلِ شبنم ہوئی
آدمی نے کی گوارا خوئے جبر و اختیار — فطرتِ تخلیق کی معصومیت برہم ہوئی
لی تمدن نے نئے قانون اور آئیں کی آڑ — ظلم کے پردے میں بنیادِ ستم محکم ہوئی

آخری شعر شعبدہ بازانِ مغرب کی سیاسی ذہنیت کا ترجمان ہے، ابھی حال کی بات ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے فرعون مسولینی نے حبش کی آزادی کو یہی کہہ کر ختم کیا کہ ہم حبش میں تمدن و تہذیب کا اُجالا پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس تشریح کو ذہن میں رکھ کر اب اس شعر کو پڑھئے

لی تمدن نے نئے قانون اور آئین کی آڑ　　نظم کے پردے میں بنیاد ستم محکم ہوئی

ہندوستان کے قائد اعظم، مزدوروں اور کسانوں کے غمخوار جواہر لال نہرو پر سیماب کا شعری تبصرہ ملاحظہ ہو[1]

اے نوید منتظر، ویرانیٔ محفل میں آ　　شمعِ منزل بن کے ظلمت خانۂ منزل میں آ

اے امیر کارواں، اے دستگیر کارواں　　اے سکونِ کارواں، ہنگامۂ مشکل میں آ

ہو جہاں سے مصلحت تیری ہمیں آزاد رہے　　شورشِ طوفاں میں آ، آبادیٔ ساحل میں آ

دور پہونچیں ظلم اور انصاف کی آویزشیں　　فیصلہ کرنے کو اس جنگِ حق و باطل میں آ

دے ہمیں مینارِ منزل سے پیامِ صبحِ نو　　جلوۂ امید بن، تصویرِ مستقبل میں آ

آگرہ اسکول کی انقلابی شاعری کا یہ ایک ناتمام نقش ہے۔ ہم کو مسرت ہے کہ "آگرہ اسکول" کے دل و دماغ پر ہر آزادی کی کرنیں ضیا گستر ہیں، اور اس اسکول کے شعراء ملک و قوم میں خودداری اور حریت کا جذبہ پیدا کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اوپر جو شعر پیش کئے گئے ہیں، اُن میں کا یہ شعر تو اس درجہ مکمل اور پُر شکوہ ہے کہ شاعر کی عظمت کا اعتراف کئے ہی بنتی ہے۔

ہو جہاں سے مصلحت تیری ہمیں آزاد رہے　　شورشِ طوفاں میں آ، آبادیٔ ساحل میں آ

"ہو جہاں سے مصلحت تیری" قیامت کا ٹکڑا ہے جو شعر کے قالب میں سمو دیا گیا ہے۔ انقلابی شاعری کا ایک اور نقش آپ کی نگاہوں کے سامنے پیش ہے۔ نظم "کانگریس" کا آخری بند ہے۔

ہوا اعلان ہر اک شاخ پر سر کی ضرورت ہے　　ہر اک برگِ چمن پر دیدۂ تر کی ضرورت ہے

وہ پھانسیں جذب کر لیں، دل میں جن سے درد بنتا تھا　　رگِ جاں کیلئے اک اور نشتر کی ضرورت ہے

سرود و نغمہ سے غفلت کی آنکھیں کھل نہیں سکتیں　　ہماری خوابگہ میں صورِ محشر کی ضرورت ہے

اٹھا دی جائیں یہ پھولوں کی سیجیں، مخملی تکیے　　تڑپنے کیلئے کانٹوں کی بستر کی ضرورت ہے

لبِ خاموش پر اک نالہ ہو دل چیرنے والا　　نہ پیکاں کی ضرورت ہے نہ خنجر کی ضرورت ہے

ہمارا ہر نفس ہو ترجمانِ گرمیٔ محفل　　ہماری ہر ضرورت انجمن بھر کی ضرورت ہے

آگرہ اسکول کا معیار پیش کرنے کے بعد اس کے ممتاز شعراء کا کلام آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ افسوس ہے کہ میں ان دنوں عدیم الفرصت ہوں اس کے سوا شعراء زیر بحث کا مجموعۂ کلام بھی میرے پاس نہیں ہے، اس لئے اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔

ساغر نظامی آگرہ اسکول کے نہایت ممتاز شاعر ہیں، ادبی دنیا "بادۂ مشرق" کے مصنف کو اچھی طرح جانتی ہے۔ ہندوستان کے بہت سے مشاعروں میں ساغر کی آواز نے نغمہ کی شراب برسائی ہے ۔ گذشتہ سال انہوں نے ہندوستان کی سب سے بڑی انجمن (کانگریس) کے اسٹیج سے اپنے انقلابی پیغام کو نشر فرمایا۔ ساغر کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ترنم اور موسیقی ہے۔ اُن کے اشعار میں الفاظ کی نشست ساز کے پردوں کی طرح ہوتی ہے۔ کہ ایک پردہ کو چھیڑا اور نغمہ پیدا ہو گیا۔ ساغر کے خیالات کس قدر حسین اور ترنم ریز ہیں۔ اُس کا اندازہ ذیل کی نظم سے کیجئے۔

شاعر اپنے ماضی میں!

(۱)

وہ عشق و جوانی کے عجب کار نظارے　　اللہ کہاں ہیں وہ گئے وقت ہمارے

وہ ایک شکستہ سا مکاں گاؤں کے باہر　　وہ پاک زمیں اور مقدس وہ ستارے

اک لعبتِ بیباک کا وہ بام پہ آنا　　وہ نیند کی آغوش میں سوئے ہوئے تارے

وہ نرگسِ پُر بادہ کا بربادکن انداز　　جیسے ہو کنول صبح کو ندی کے کنارے

وہ دوریٔ اجسام وہ ارواح کی قربت　　انگشت حنائی سے مسلسل وہ اشارے

وہ اُس کا تبسم وہ تبسم کا تواتر!　　وہ مست نگاہوں میں محبت کے شرارے

خاموش وہ اک گفتگوئے شوقِ مسلسل　　وہ اُس کی نگاہوں کا یہ کہنا مرے پیارے

اللہ
کہاں ہیں وہ گئے وقت ہمارے
وہ عشق و جوانی کے عجب کار نظارے

(۲)

[1] اس نظم کا مخاطب "آزادی" ہے ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نہیں ہیں ۔ (ایڈیٹر)

وہ صبح سویرے ترا اک گیت سنانا
آہستہ مجھے دیکھ کے تالی کا بجانا

آواز وہ چکّی کی وہ سیلاب ترنم
سارس کے وہ نغمات وہ کوئل کا ترانا

چھپ چھپ کے تری آہ وہ گلبازیٔ پیہم
وہ جان کے چادر میں مرا منہ کو چھپانا

کیونکر ہو یقیں دل کو کہ ایسا بھی ہوا تھا
وہ روٹھ کے جانا وہ ترا اشک بہانا

ہر طرح ہر اک طور ہر اک ڈھنگ سے ظالم
وہ پیار سے اٹھنا وہ ترا مجھ کو جگانا

پنگھٹ پہ ملاقات وہ رستے میں اشارے
سکھیوں سے کنوئیں پر ترا پوجا کا بہانا

وہ صبح کے دامن پہ مرا سجدۂ الفت
مندر میں محبت کے مہکتے ہوئے آنا

وہ

عشق و جوانی کے عجب کارنظارے

اللہ کہاں ہیں وہ گئے وقت ہمارے

(۳)

برسات میں وہ ابر سیہ فام کے سائے
وہ شام کو آنا ترا گنگا کے کنارے

کنگن وہ سنہری وہ ترا دستِ منوّر
وہ فرشِ زمیں اور منڈیر دل کے تکیے

وہ دور ٹھمری کی صدا کیفیت انگیز
وہ ہلکے سروں میں ترے احساس کے نغمے

وہ دل میں مرے آہ کے طوفان کا اٹھنا
وہ درد کے نغمے وہ کبھی یاس کے نوحے

وہ ہم سے بہت دور کسانوں کی صدائیں
وہ ہم سے بہت پاس سرِ چرخ ستارے

وہ جنبشِ آویزۂ رنگیں کا تماشا
وہ بیٹھنا تیرا مرے بازو کے سہارے

سینہ پہ مرے وہ ترا پاجا سا بجانا
آسودگیٔ حسن و محبت کے وہ نغمے

اللہ

کہاں ہیں وہ گئے وقت ہمارے؟

وہ عشق و جوانی کے عجب کارنظارے

ساغر

اسی نظم کا پہلا بند کتنا شگفتہ اور رومان خیز ہے۔ اس شعر کا تصور دل میں کتنی طرب انگیز چٹکی لیتا ہے۔

خاموش وہ اک گفتگوئے شوقِ مسلسل
وہ اسکی نگاہوں کا یہ کہنا "مرے پیارے"

ساغر نے فلسفیانہ موضوعات پر بھی فکر کو جنبش دی ہے۔ "غم" کے عنوان پر کہتے ہیں:-

غم

از۔ ساغر نظامی

فضائے ماضی کی گود میں جلوہ نما ہو کر
اٹھا انسان محفل سے ازل کی آئینہ ہو کر

شعاعیں آئینہ کی کثرتِ انوار سے چمکیں
تجلّیاتِ تازہ پردۂ اسرار سے چمکیں

ربابِ عشق کی آواز سے بزمِ ازل گونجی
جمودِ مستقل میں ایک دنیائے عمل گونجی

تبسم سے ترنّم نے کیا عہدِ ہم آغوشی
بڑھا ہنگامۂ ہستی میں احساسِ طرب کوشی

ہوا دھندلا سوادِ خامشی اکنافِ وحدت میں
تکلّم نے نوائے روح چھیڑی سازِ کثرت میں

نمودِ ہستیٔ انساں ہوئی سو ساز و ساماں سے
مرتّب اک کتاب نو ہوئی خلقت کے عنواں سے

ملک چلّائے کیا انسان مکیں عیش و عشرت ہے
فلک گھبرائے یا رب کیا یہی معیارِ فطرت ہے

زمیں کو پائمالی سادگی دی آسمانوں کو
مہیا کر دئے سو عیش خاک آلود جانوں کو

مساواتِ ازل میں ایک جوشِ ارتقا اٹھا
فضائے عرش سے اک ابر لہریں مارتا اٹھا

دھواں سا بن کے پھیلا وسعتِ دنیائے امکاں پہ
غبارِ صندلیں کی طرح چھایا قلبِ انساں پہ

رگیں دل کی تڑپ اٹھیں محوِ نوائے ہو
مسرت کا مزا پردہ بنا پردہ سرائے ہو

برودت سے خوشی کی منجمد جو قطرۂ خوں تھا
پگھل کر سوز فطرت سے اب اک طوفانِ جیحوں تھا

بنا گھرائیوں تک جاتے جاتے ہر نفس نالہ
جب آئی سانس باہر بن گیا ہونٹوں پہ تبخالہ

دیارِ قلب سے اک ٹیس اٹھی لرزشیں لے کر
جگر پہلو سے دوڑا درد کی گنجائشیں لے کر

اداسی چھا گئی عشرت کے رودِ ارغوانی پہ
ہزاروں نفرتیں برسیں مذاقِ زندگانی پہ

ہوا مجروح پندارِ تعیش روح گھبرائی
رواقِ گوش میں الہام خانہ سے ندا آئی

"یہ وہ نعمت ہے جو حاصل فقط انساں کو ہوتی ہے
یہ بیداری ہے وہ جس میں ہماری یاد سوتی ہے"

نویدِ عیش و شانِ کامرانی بے مزہ ہوتی
نہ ہوتا غم تو جنسِ شادمانی بے مزہ ہوتی

نہ اُٹھتا پردۂ غفلت کبھی چشمِ بصیرت سے   نہ ہوتا آدمی فائز وقارِ آدمیت سے

نہ لذت سوز میں ہوتی نہ کچھ لطفِ گداز آتا   نہ ذوقِ عاشقی ہوتا نہ اندازِ نیاز آتا

فلک کو کسطرح بیدار کرتے آہ کے نعرے   فرشتوں کو سناتا کون یا اللہ کے نعرے

[illegible] قدس میں یہ رحمتِ مقسوم رہ جاتی   صدائے ہو طوافِ عرش سے محروم رہ جاتی

"تسلسل" ناگوارِ فطرتِ انسانِ فانی ہے   "تواتر" کسطرح کا ہو وبالِ زندگانی ہے

تنوع مانگتی تھی روح کی اجسام آرائی   ملا جب غم ہوئی حسِ طرب کی عزت افزائی

مکمل قوتِ برداشت پہلے جان کو دیدی
پھر اک بالکل اچھوتی بیکلی انسان کو دیدی

یہی حالت ہے وہ جو وجد میں لاتی ہے انساں کو   یہ وہ دولت ہے جو مشکل سے دی جاتی ہے انساں کو

یہ اک پردہ ہے جسمیں سو ادا اوس سے نہاں ہم ہیں   یہ اک جلوہ ہے جسمیں آرزو منکر عیاں ہم ہیں

یہ وہ آتش ہے ہر شعلے میں جس کے ایک جنت ہے   یہ وہ کاہش ہے جو روحِ نسیمِ باغِ فطرت ہے

یہ وہ نشتر ہے جس کے زخم پھولوں کے خزانے ہیں   یہ وہ جوہر ہے جسمیں بند سو آئینہ خانے ہیں

یہ وہ قوت ہے جو انسان کو آگے بڑھاتی ہے   سہارا دیکے بامِ ارتقا تک اُسکو لاتی ہے

یہ وہ اکسیر ہے ہوتا ہے دل کا تزکیہ جس سے   یہ وہ تفسیر ہے کھلتا ہے رنگِ مدعا جس سے

یہ وہ دنیا ہے جسکی سیر کو قدسی ترستے ہیں   یہ وہ عالم ہے جسمیں بندگانِ عشق بستے ہیں

یہ ہے وہ سوز جس سے رقص میں ہیں ساز کے پردے   یہ ہے وہ شور اُٹھ جاتے ہیں جس سے راز کے پردے

یہ جذبہ ہے جو جسم و روح کو مانوس کرتا ہے
یہ وہ لذت ہے تنہا دل جسے محسوس کرتا ہے

ساغر برابر ترقی کر رہے ہیں، اگر زمانہ کی داد و تحسین نے اُن میں "احساسِ کمال" پیدا نہ کردیا، تو مستقبل میں اُن کی بہت کچھ قدر کی جائے گی۔

محمد صادق صاحب ضیا چنیوٹی بی۔اے آگرہ اسکول کے ہونہار اور نہایت ذہین و طباع شاعر ہیں۔ ضیا کی شاعری کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ مگر اس عرصہ میں اُنھوں نے بہت زیادہ ترقی کی ہے، عام نوجوان شاعروں کی طرح ضیا میں بے راہ روی نہیں پائی جاتی۔ وہ بہت سمجھ کر کہتے ہیں اُن کے خیالات میں تنوع ہے اور مطالعہ نے اُنکی فکر کو نارسیدہ ہونے کے الزام سے پاک کر دیا ہے۔ ایک نظم جس کا عنوان "سرسیّد کے مزار پر" ہے یہاں درج کی جاتی ہے

سرسیّد کے مزار پر

اثر: محمد صادق ضیا۔ بی۔اے

چراغِ علم روشن ہے حقیقت کی ہواؤں میں   حکومت کر رہا ہے ایک گوشے سے فضاؤں پہ

یہ سرسبزی و شادابی جو ویرانی کا حاصل ہے   رگوں میں اسکی پوشیدہ تموج خیز اک دل ہے

ابھی تک انجمن میں گونج باقی ہے صداؤں کی   ابھی تک کھیلتی ہے خاک سے شوخی ہواؤں کی

یہ بزمِ خوابِ سرسیّد یہ نقشِ اوج سامانی   غم و ایثار سے لبریز ہے اک جامِ نورانی

محبت کی طرح آباد رکھے گا خدا اس کو
مٹا سکتی نہیں دنیائے حادث کی ہوا اس کو

میں ذوقِ علم لے کر تربتِ سیّد پہ آیا ہوں   عقیدت کے شگفتہ پھول اپنے ساتھ لایا ہوں

مری وحشت لئے پھرتی ہے گرمِ جستجو مجھ کو   سکوں اندوز ہونیکی بہت ہے آرزو مجھ کو

فضاؤں سے محبت کی مسرت آشنا ہوں میں   اک آغوشِ ادب میں پرورش پاتا رہا ہوں میں

بقدرِ ذوقِ تکمیلِ تمنا کی تمنا ہے   اسی آغوش میں معراجِ فردا کی تمنا ہے

تمنا ہے جہانِ علم میں چمکوں شہاب بن کر   جمود و ظلمتِ ہستی پہ چھا جاؤں ضیا بن کر

تمنا ہے کہ دنیا مجھ سے یکسر نور ہو جائے   یہ تاریکی سمٹ کر ایک دن کافور ہو جائے

تمنا ہے کہ سرسیّد بنوں یا شبلی و حالی
کہ ان اربابِ محفل کی ابھی تک ہے جگہ خالی

الٰہی خاکِ سرسیّد سے کچھ چنگاریاں دیدے   مذاقِ دل ترستا ہے تپش سامانیاں دیدے

مری قسمت میں اس میخانہ کا ساغر نہیں یا رب   عوض میں اسکے مجھ کو مشربِ پیرِ مغاں دیدے

جہاں اک طائرِ سدرہ کسی دن چہچہایا تھا   انھیں شاخوں پہ مجھکو اختیارِ آشیاں دیدے

جو میرے سازِ فطرت میں نیا اک سوز بھرنا ہے   تو جوہرِ اور ظفر کی سی زبانِ نغمہ خواں دیدے

مجھے درکار ہے پھر ملک و ملت کی حدی خوانی   نذیر و شبلی و حالی کا اندازِ بیاں دیدے

غبارِ رہگزارِ دہر میں آلودگی کب تک؟   مرے زریں خیالوں کو بساطِ کہکشاں دیدے

دماغ و ذہن میں اک جنگ برپا ہی خیالوں کی
انھیں ہموار کرکے اک سکونِ جاوداں دیدے

اگر ہی قافلے کیساتھ چلنا میرا ناممکن
تو مجھ کو رہنما کردے مجھی اک کارواں دیدے

زمیں پہ پاؤں پھیلانے کی گنجائش اگر کم ہی
مجھے بادل بنادے سیر کو اک آسماں دیدے

اگر تخیل بسر سیدہ ہے اب گلدستۂ ماضی
جوانی کی امنگوں کو نئی انگڑائیاں دیدے

پیامِ کامیابی دے مجھے ایوانِ رفعت سے
میں خالی ہاتھ جا سکتا نہیں تیری تربت سے

یوں تو تمام نظم شگفتہ ہے، مگر یہ شعر تو "قیامت مجسّم" ہے۔

زمیں پہ پاؤں پھیلانے کی گنجائش اگر کم ہے
مجھے بادل بنادے سیر کو اک آسماں دیدے

زبان کی گھلاوٹ، مصرعوں کی چستی، الفاظ کی نشست، معنویت پر مستزاد!

دوسری نظم کا عنوان "انتباہ" ہے:-

انتباہ!

ایک طائر کو اپنے آشیاں سے مائل پرواز دیکھکر

اثر:- محمد صادق ضیا بی۔ اے

کہاں جاتا ہی اس شورش کدے میں ٹھوکریں کھانے
یہاں تو ہر قدم لغزش ہی اے نادان دیوانے!

یہ دنیا جسکو تو نے خواب کی تعبیر سمجھا ہے
نہیں آغوشِ مادر بلکہ اس کا نام "دنیا" ہے

یہ دنیا ہر ہوا کی موج سے طوفاں اٹھاتی ہی
پر پرواز دے کر دام میں اپنے پھنساتی ہی

مجھے معلوم ہی اڑنے کو للچاتا ہے دل تیرا
ہواؤں کے جھکولوں سے اڑا جاتا ہی دل تیرا

تری نظروں میں اک نادیدہ سی وسعت ہی دنیا کی
یہ سرسبزی چمن کی اور لہریں موج دریا کی

پہاڑوں کی سنہری چوٹیاں ہیں تیری نظروں میں
یہ لہراتی ہوئی ندیاں مچلتی ہیں نگاہوں میں

تجھے دیتی ہیں دعوت چہچہے رنگیں نواؤں کے
بلاتے ہیں تجھے اپنی طرف دامن گھٹاؤں کے

مگر ناداں سن مجھ سے کہ یہ سب ہے نظر بندی
حقیقت میں یہاں پرواز کے معنی ہیں پربندی

مرے نغمے سے طائر بیٹھ اپنے آشیانے میں
ترے ہم جنس سرگرداں ہیں لاکھوں اس زمانے میں

یہ دنیا خود غرض خود کام ہی اور خود نما بھی ہی
فریبی، لالچی، مکار، پاپی، بے وفا بھی ہی

شناور بحرِ ہستی کا ہوں طوفاں آشنا ہوں میں
جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہی تجھ سے کہہ رہا ہوں میں

یہاں موجوں کی پہنائی میں چھپ کر سانپ بیٹھے ہیں
یہاں پھولوں کی رگ رگ میں ہزاروں خار بیٹھے ہیں

یہاں سب سے الگ رہنا ہی اصلِ شادمانی ہی
یہاں گوشہ نشینی ہی حقیقی حکمرانی ہی

یہاں اک اور خطرہ ہی جسے انسان کہتے ہیں
یہ انسان رات دن غارت گری میں محو رہتے ہیں

یہ چھپ چھپ کر تمدن کے لباسِ خود نمائی میں
بظاہر اشرف المخلوق بنتے ہیں خدائی میں

مگر ان کے وتیرے کچھ درندوں سے بھی بدتر ہیں
یہ مردے چیرنے والے پرندوں سے بھی بدتر ہیں

یہ تجھ کو اپنے اپنے دامِ رنگیں میں پھنسائیں گے
یہ اپنی رہزنی سے تیری آزادی چرائیں گے

زباں پر انکی مرہم اور نظر میں انکی نشتر ہیں
دکھانے کیلئے شہد و شکر باطن میں خنجر ہیں

تو پہلے آشیاں میں اپنی قوت منضبط کر لے
پھر پرواز میں غم جھیلنے کی ہمتیں بھر لے

تو پہلے واقفِ رازِ فضائے گلستاں ہو جا
پھر اپنے آشیاں سے جس طرف چاہے رواں ہو جا

ابھی معصوم ہے نافہم ہے ناآشنا ہے تو
کہاں اس خود غرض سنسار میں لٹنے چلا ہی تو

ہوائیں ناموافق چل رہی ہیں اس زمانے میں
سمیٹ اپنے پروں کو بیٹھ اپنے آشیانے میں

اس نظم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیا درسِ کتاب سے گذر کر مشاہدۂ فطرت کے بھی خوگر ہیں اور اُن کے حسیات بہت لطیف اور ذکی ہیں۔

راز چاند پوری، اور ساغر نظامی دونوں کی شہرت غالباً ایک ہی نقطہ سے شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔ آگرہ اسکول کے یہ دورِ اوّل کے شاعر ہیں۔ راز پر تخلص کا بہت کچھ اثر پڑا ہے اور وہ اسرارِ حقائق بے نقاب کرنے کی ہمیشہ کوشش فرماتے ہیں۔ اُن کے خیالات میں پختگی اور گہرائی ہے، آگرہ اسکول کے شعرا پر ترکیبوں کی ایجاد کا الزام لگایا جاتا ہے راز چاند پوری کا کلام اُن سے پاک ہے، ایک نظم ملاحظہ ہو۔
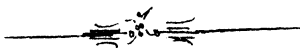
اللہ رے یہ سلسلہ جذباتِ خیال حد سے سوا تصورِ جاناں ہے آجکل
جگنو ہیں، اور پھول ہیں تارے ہیں اور چاند ان سب کے ساتھ روح غزلخواں ہے آجکل
وا ہو چکا ہے میرے لئے بابِ آرزو "مستقبلِ حیات درخشاں ہے آجکل"
ہیں وجد میں ہوں کیفِ تصور سے ان دنوں اور کائناتِ دل ہے کہ رقصاں ہے آجکل
اے شامِ عشق کسبِ ضیائے جمال کر "ماہِ تمامِ حسن" درخشاں ہے آجکل

اندازِ نو سے چھیڑ رہا ہے ربابِ شوق
منظر حریفِ بزمِ سخنداں ہے آجکل

اس شعر کو پڑھئے اور پڑھ کر نغمہ و طلعت کی فضاؤں میں گم ہو جایئے۔

جگنو ہیں، اور پھول ہیں تارے ہیں اور چاند ان سب کے ساتھ روح غزلخواں ہے آجکل

منظر کا شعری مستقبل یقیناً تابناک ہے، کاش زمانہ اُن کو جینے دے۔

فضل الدین اثر اکبرآبادی (بی۔ اے) آگرہ اسکول کے ممتاز شعراء میں ہیں۔ اثر کے کلام میں اثر کے ساتھ پختگی اور شگفتگی ہے۔ اثر بے مقصد شاعر نہیں ہیں۔ وہ دنیا کو پیام دیتے ہیں۔ اور میرے خیال میں وہ صرف تفریح اور دفع الوقتی کے لئے شعر نہیں کہتے۔ وہ شعر سے کام لینا چاہتے ہیں "دیہات کی شام" ملاحظہ کیجئے۔

دیہات کی ایک شام

از۔ اثر اکبرآبادی

جھٹپٹے میں شام کے ہے آسماں کھویا ہوا جیسے دن بھر کا مسافر ہو کوئی سویا ہوا
گر رہا ہے یوں افق سے رنگ بالائے زمیں جیسے سجدے میں کسی مومن کی جھکتی ہو جبیں
سو چلا ہے مضطرب ذرّوں کا دردِ مستقل جس طرح آسودۂ آغوش ہو شاعر کا دل
نسترن کے کنج میں ٹھیرے ہوئے سے رنگ و بو ڈوبتی کرنوں سے رنگیں تتلیوں کی گفتگو
نازپرور کھیتیوں میں لہلہاتی سی بہار جس طرح جنت بداماں مطمئن دل کا قرار
بیریا کا پیڑ تھراتا ہے کانٹوں میں اسیر جیسے زاہد کا شکیب اور جیسے مجرم کا ضمیر
دور سنبل میں مصوّر کی نظر الجھی ہوئی جیسے پھولوں میں کہیں دب جائے کوئی تیتری
نرم جاں پودے سکوں کی گود میں محوِ خواب جیسے دیکھیں بلبلیں ہنستی ہوئی پھولوں کے خواب
خشک کانٹوں کی زباں پر زندگانی کا پیام آشیاں بھولے ہوئے طائر کا شاخوں میں قیام
ہلکی ہلکی سی ہوا سرگوشیاں کرتی ہوئی گلستاں کی غنچگی میں بجلیاں بھرتی ہوئی
رہگذر کے پاس اک جھاڑی میں جگنو کی چمک قلبِ ہستی میں ہو جیسے نورِ عرفاں کی جھلک
فاصلہ پر ہلکا ہلکا جھلملاتا اک چراغ کفر کی گمراہیوں میں جیسے ایماں کا چراغ
اک پرانے پھوس کے چھپر میں بیٹھا ہے کسان رنگ و بو کی مملکت کا بادشہ کھیتوں کی جان
انگلیوں سے دیکھتا رہتا ہے نبضِ کائنات بادلوں سے کھیلتا ہے برق سے کرتا ہے بات
اس کے کس بل پر اکڑتا ہے سیاست کا دماغ خون سے جلتا ہے اس کی شہریاری کا چراغ
یہ پھٹے کپڑے یہ میلے پاؤں یہ بختِ سیاہ دیکھ لے تو زندگی کے دل سے بھی نکلے اک آہ
عمر کی گہرائیوں میں کھوئی جاتی ہے نگاہ ابر کے دامن میں جیسے لے کبھی سورج پناہ
بزمِ اسرارِ حقیقت کا دوامی رازدار زندگی کے تیز کانٹوں پر ہمیشہ بے قرار
رنگِ دنیا بھی اگر کروٹ بدلتا ہے کبھی سب سے پہلے زد میں آتی ہے اسی کی جھونپڑی
ساری دنیا کو کھلائے اور خود بھوکا مرے سب کو روٹی دے خود اپنا پیٹ پتھر سے بھرے
علم کی گمراہ کن کرنوں سے یہ بیگانہ ہے سب کی قسمت کے ستم سہہ لے یہ وہ دیوانہ ہے
کردگارِ صبحِ ہستی! داورِ کون و فساد کب مٹے گا فطرتِ انساں کی حالت کا تضاد

ننگِ نظارہ بنا جاتا ہے انساں ہائے ہائے
تیرگی سے کہدو اس منظر کو جلد آکر چھپائے

اثر محاکات نگار بھی ہیں اور تشبیہات کے مصور بھی۔ میرے خیال میں تشبیہات کے اعتبار سے وہ آگرہ اسکول کے شعرا میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، اس شعر کی تشبیہی عظمت کا اندازہ فرمائیے۔

فاصلے پر ہلکا ہلکا جھلملاتا اک چراغ کفر کی گمراہیوں میں جیسے ایماں کا چراغ

ایک اور شعر کا شکوہ ملاحظہ ہو:—

اس کے کس بل پر اکڑتا ہے سیاست کا دماغ خون سے جلتا ہے اس کی شہریاری کا چراغ

دوسری نظم "احتجاج" کس قدر فلسفیانہ ہے۔

احتجاج

میری گستاخی معاف اے خالقِ فطرت کہ آج
کر رہا ہوں تیری قانونِ قضا پہ احتجاج

تجھ کو زیبا ہے ترا آئینِ جبر و اختیار
تھا اگر انساں بھی شائستۂ صبر و قرار

ظرفِ انساں میں تحمل کی جو گنجائش نہیں
جان لیوا یہ ادائیں قابلِ نازش نہیں

سینۂ ہستی میں قائم اک مسلسل درد ہے
روح پہ چھائی ہوئی ہے خامشی دل سرد ہے

ہیں تمناؤں کی لاشیں یاس کی آغوش میں
یہ وہ نالے ہیں جو پلتے ہیں لبِ خاموش میں

ناتواں انسان ایسا جبر سہہ سکتے نہیں
سب اسے محسوس تو کرتے ہیں کہہ سکتے نہیں

اپنے گھر میں دیکھکر معصوم اک بچے کی لاش
ہو گیا ہے رنج و غم سے میرا سینہ پاش پاش

تجھ سے کرتے آج ہیں تیرا گلہ آ ہی گیا
نالہ دل سے تا بہ لب بے ساختہ آ ہی گیا

سن کہ ہے مخلوق آئینِ قضا سے اشکبار
زندگی پر موت کو دینا نہ تھا یوں اختیار

ایک بچہ بطنِ مادر سے جو آتا ہے یہاں
انبساطِ تازہ سے ہوتا ہے گھر بھر شادماں

اُس سے ہو جاتی ہیں وابستہ امیدیں سینکڑوں
ایک اسکی دید میں ہوتی ہیں عیدیں سینکڑوں

باپ اسکی پرورش کرتا ہے ارمانوں کیساتھ
پالتی ہے گود میں ماں اسکو ارمانوں کیساتھ

مامتا ماں کی ہنڈولوں میں جھلاتی ہے کبھی
پیار کرتی ہے کلیجے سے لگاتی ہے اُسے

کمسنی میں موت آجاتی ہے اسکو ناگہاں
بے خبر ہوتی ہیں جس سے مطلقاً باپ اور ماں

روح ہو جاتی ہے زخمی دل میں پڑ جاتی ہے داغ
یک بیک بجھتا ہے جب یوں اک بھرے گھر کا چراغ

باوجود ضبط ماں کی ہچکی جاتی نہیں
کیا ترے کانوں میں ماتم کی صدا آتی نہیں؟

جب ریاضِ عمر سے پاتا ہے پھل اک نوجواں
اُس پہ ہو جاتا ہے طاری موت کا خوابِ گراں

لاش پہ ہوتی ہے اسکی ساری دنیا سینہ زن
عبرت نظارہ ہوتا ہے جوانی کا کفن

ختم جب ہوتی ہے حد تعلیم اور تہذیب کی
جب قریب آتی ہے منزل نظم اور ترتیب کی

جب بہار آتی ہے اسکی فطرتِ مجہول میں
جب کلی تبدیل ہوتی ہے شگفتہ پھول میں

جب وہ ہو جاتا ہے شایانِ نشاطِ زندگی
قوتِ بازو وہ بنجاتا ہے جب ماں باپ کی

چونک اُٹھتی ہیں جب اُسکی شاعرانہ قوتیں
جاگ اُٹھتی ہیں جب اُسکی الہامی قوتیں

شعر کہہ سکتا ہے جب وہ گرمیٔ افکار سے
وحی جب ہوتی ہے اُس کو عالمِ اسرار سے

جب وہ کر سکتا ہے پیدا انجمن میں انقلاب
اخذ جب کرتا ہے ہر ذرے سے لاکھوں آفتاب

بادۂ عشرت کو جب ہوتی ہے سرجوشی نصیب
جب عروسیت سے ہوتی ہے ہم آغوشی نصیب

ناگہاں موت آکے دیتی ہے اسے پیغامِ خواب
خاک میں ملتا ہے اسکا گلستانِ پر و شباب

ہو جواں ہو کر کوئی مجبور مرنے کے لئے
کس کا دل لائیں یہ غم برداشت کرنے کیلئے

صبح سے پہلے بجھائے جائیں جب لوئن چراغ
ہستیٔ انسان کے سینے میں نہ کیوں پڑ جائیں داغ

اسکو ہوتا ہے میسر ارتقائے زندگی
جس کو ہوتا ہے عطا نشوونمائے زندگی

جب وہ ہو جاتا ہے اس دنیا میں فطرت آشنا
جب اُسے دنیا کا ہو جاتا ہے کامل تجربہ

جب سمجھ لیتا ہے وہ رازِ جہانِ بے ثبات
جب وہ کر لیتا ہے طے ہر راہِ دشوارِ حیات

رفعتِ مطلق پہ جب آتی ہے تعمیرِ حیات
قبر کی پستی میں گر جاتا ہے یہ پیرِ حیات

الغرض اس دہر میں دستورِ فطرت ہے یہی
جبر کی فرماں روائی ہے حکومت جور کی

جب معین کمسنی کی موت ہو تقدیر میں
کیوں بھرا جائے سرابِ زندگی تصویر میں؟

چار دن کو کیوں کیا جائے شگفتہ کوئی پھول
زحمتِ تخلیق کیوں دیجائے انساں کو فضول

زندگی اور موت پر جب ہو نہ اپنا اختیار
موت ہے بے کیفیت اور زندگی ناخوشگوار

جب نہیں قیدِ تعین زندگی اور موت میں
بے تعین جی کے اس دارِ فنا میں کیا کریں

موت کا ڈر ہمتِ انساں بڑھا سکتا نہیں
بے تعین کوئی کام انجام پا سکتا نہیں

ہے مناسب مقصدِ تخلیق رسوا ہی نہ ہو
ہے اگر انسان ناپیدا تو پیدا ہی نہ ہو

زندگی اور موت یوں بھی نسبتاً دو میل ہیں
کھیل ہیں دستِ قدرت کے مگر کیا کھیل ہیں!

ساعتِ تخلیق سے تعدیم کے ہنگام تک
بزمِ انساں میں نہیں عیش و سکوں کا نام تک

ہر نفس غم آشنا صرفِ الم ہر سانس ہے
تیر بن کر ہر رگِ جاں میں نئی اک پھانس ہے

جبر ہی پر ہے اگر دار و مدارِ زندگی
تو یہ بہتر ہے کہ ہر انسان کر لے خودکشی!

اس نظم کا ہر بند غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔

شفق ٹونکی آگرہ اسکول کے ذہین وطباع شاعر ہیں۔ انکا اندازِ بیان پُرجوش اور خطیبانہ ہے۔ شفق نہایت تیزی کے ساتھ شعر کی بلندی پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فضل الدین آثمہ کی طرح شفق بھی تشبیہات کو "سحرِ حلال" بنانا جانتے ہیں۔ جس کے ثبوت میں ذیل کی نظم پیش ہے:-

بغاوت

از- شفق ٹونکی

چھلک جائے وفورِ غم سے جب پیمانہ تسکیں ‏ ‏ قیامت آفریں جب جوششِ تابِ شکیبا ہو

سیاست تنگ ہو جب بربریت کی شکنجوں میں ‏ ‏ اصولِ نظم کی بنیاد برباد و شکستا ہو

حکومت میں ابھر آئی ہو جب فرعونِ سامانی ‏ ‏ وفورِ جوشِ استبداد جب حد سے زیادہ ہو

سکوت دامن ہو جائے فنا جب غرورِ بربریت سے ‏ ‏ حقیقت کی نوا باطل کی آوازوں میں پنہاں ہو

حق و انصاف کی گہرائیاں جب غصب ہو جائیں ‏ ‏ خدا سامانیوں میں جب اضافی شانِ پیدا ہو

وفاؤں کی نمود احساس میں گنجائش نہ باقی ‏ ‏ فریبِ مکر کی لعنت سے جب محصور دنیا ہو

نفس جب ڈوبنے لگتا ہو گمراہی کے طوفاں میں ‏ ‏ غلط رنگی کی موجِ تند میں ماحول تھپلا ہو

تمدن پر ہو طاری بدعت و اوہام کی تلخی ‏ ‏ فضا اندر فضا بیداد کا جب جال پھیلا ہو

بھڑک اٹھتے ہیں اسدم شعلہ ہائے گرمِ باطل کے
بغاوت میں ابھر آتے ہیں جذبے گرمیٔ دل کے

بغاوت ہی کا زورِ خاص اسکو روک دیتا ہے ‏ ‏ غلط کاری سمانا چاہتی ہے جب سیاست میں

جفائیں تازہ سہنا اور اُن کو ضبط بھی کرنا ‏ ‏ نیا اک جوش کر دیتا ہے پیدا آدمیت میں

نہ رہ سکتا اگر یہ امنِ عالم برقرار اتنک ‏ ‏ بدل جاتا سکونِ دہر اک دن جبر و وحشت میں

غریبوں کی یہی اسوقت عزت کو بچاتی ہے ‏ ‏ بہا پھرتا ہے جب بیچارگی کا خون غفلت میں

یہی تدبیر آسانی وہاں تعلیم کرتی ہے ‏ ‏ تدبر کی جہاں ہوتی ہے بندش حکومت میں

نہ تسکیں تھا جب ملک کی ذہنیتِ ناقص ‏ ‏ سیاست رفتہ رفتہ پھر بدلجاتی ہے بدعت میں

ستم پر باوجودِ علم امید کرم رکھنا ‏ ‏ نئی جرأت بڑھاتا ہے دماغِ کبر و نخوت میں

بغاوت ہے حقوقِ عام پر سینہ سپر ہونا ‏ ‏ بغاوت ہے ابھرنا ملک و ملت کی اعانت میں

بغاوت ہے خلافِ ظلم اک طوفاں بپا کرنا
حفاظت کیلئے جینا حفاظت کے لئے مرنا

اگر مہاتما گاندھی کی "اہنسا" اجازت دے، تو آئندہ سال کانگریس کے پنڈال کے صدر دروازہ پر شفق کے اس مصرع کو لکھ کر آویزاں کردیا جائے۔ "بغاوت میں ابھر آتے ہیں جذبے گرمیٔ دل کے"

شفق الفاظ کی نشست اور ترکیبوں کی ایجاد میں حضرت سیماب کے قدم بقدم نظر آتے ہیں۔ اور نظم کے آغاز و اختتام میں بھی "سیمابیت" پائی جاتی ہے۔

ساحل ٹونکی کے کلام میں جوش و اثر کے ساتھ تعمق پایا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کی نگاہ گہرائیوں میں اتر کر نطق کو جنبش میں لاتی ہے۔ "اینرنا" کی پہاڑی کو دیکھ کر ساحل کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"اینرنا" کی پہاڑی پر

از ساحل ٹونکی

تماشا کر ہوائے غنچہ و گل کا گلستاں میں ‏ ‏ ادھر آکے چلوں تجھکو اک ایسی کاخِ ویراں میں

کہ جسکی رفعتوں سے گو یہی پستی برستی ہے ‏ ‏ مگر پھر بھی یہ ویرانہ ثباتِ نقشِ ہستی ہے

وہ ویرانہ جہاں عبرت ہی عبرت رقص کرتی ہے ‏ ‏ وہ ویرانہ جہاں ہر وقت حسرت آہ بھرتی ہے

وہ ویرانہ جہاں ہیبت فزا ہے خامشی طاری ‏ ‏ وہ ویرانہ جہاں ہر ذرہ سے وحشت ابھرتی ہے

وہ ویرانہ جہاں ظلمت ہی ظلمت کا نظارا ہے ‏ ‏ وہ ویرانہ جہاں خود روشنی جانے سے ڈرتی ہے

وہ ویرانہ کہ جس سے چاند بھی دامن کشاں نکلا ‏ ‏ وہ ویرانہ کہ جس پہ چاندنی آ کے نکھرتی ہے

وہ ویرانہ جو یکسر اب ابابیلوں کا مسکن ہے ‏ ‏ جو زاغ و بوم کا مامن ہے اور چیلوں کا مسکن ہے

یہ ویرانہ کبھی آباد تھا آثارِ انساں سے
نسیمِ صبح بہرِ سیر آتی تھی گلستاں سے
سحر ہوتے ہی مندر کی پجاری جاگ جاتی تھی
پرستش کے ترانے اور بھجن لوگ گاتے تھے
پرستش کرنیوالے جمع رہتے تھے یہاں ہر دم
عقیدت مندیوں کے پھول مندر پر چڑھاتے تھے
بتوں کے سامنے سجدہ تھی قیامت تھی حسینوں کے
کہ اپنے ہی پرستاروں سے بُت شرمائے جاتے تھے
غضب تھی سیکڑوں پیشانیوں پر احمریں قشقہ
فروزاں شام ہو جاتی تھی جب جگمگاتے تھے

معطر دیر رہتا تھا نسیمِ شنک پر دہ سے
فضا پُر کیف ہوتی تھی بخارِ عود و عنبر سے
مرادیں مانگی جاتی تھیں مرادیں پائی جاتی تھیں
تھا بہرہ یاب ہر سائل تبانِ فیض گستر سے

فضائے کوہِ "انیرنا" بہار آشام ہوتی تھی
یہاں کی شام بھی گویا سحر ہنگام ہوتی تھی
چراغوں سی پہاڑی جگمگا اٹھتی تھی راتوں کو
ضیا اسکی عجب اک کیف زا پیغام ہوتی تھی
کھلا رہتا تھا بابِ تبکدہ آٹھوں پہر یونہی
صدا ناقوس کی گویا صلائے عام ہوتی تھی
حوادث کا اثر اتنا ہی ہوتا تھا پہاڑی پہ
کہ بعدِ شب سحر ہوتی سحر سی شام ہوتی تھی

یہ اک فردوس زارِ حسن تھا اپنے زمانے میں
یہ اک مرکز تھا حسن و عشق کا اپنے زمانے میں
یہاں ضبط و وفا و صبر کی تعلیم ہوتی تھی
یہاں حسن و محبت کی نئی تنظیم ہوتی تھی

فروکش تھی یہاں "انیرنا" نامی اک حسیں عورت
عفیف و پاک دامن پاکباز و پارسا صورت
اُسی کے نام سے منسوب ہے یہ ٹیکری اب تک
اسی کی داستانِ عشق کی ہے آج تک شہرت
کہ ربیا نامی اک درویش سے اسکو محبت تھی
فدا محبوب پر رہتی تھی اپنے وہ قمر طلعت
ہے ربیا اور انیرنا میں دوری وہی فرسخ کی
تھا اُس کا منتقر اک قلۂ کوہِ فلک رفعت

نہ تھی حائل میانِ حسن و الفت کوئی مجبوری
نہ تھا کچھ فاصلہ ایسا نہ تھی کچھ اسقدر دوری
ہے لیکن جدا اک دوسرے سے عمر بھر دونوں
فراق و ہجر میں کرتے ہیں شام و سحر دونوں

تسلی دہ گئے ہو دے تصورِ ہمدمسازی
گئے اوقاتِ فرصت رائیگاں سے تشکیں تنگبازی

اس شعر کو پڑھئے غور سے پڑھئے، اور شاعر کی دقت نظری کی داد دیجئے

وہ ویرانہ کہ جس سے چاند بھی دامن کشاں نکلے
وہ ویرانہ کہ جس سے چاندنی بچ کر نکلتی ہے

مصرعہ ثانی تخیل کے اعتبار سے ابداعی ہے۔

ٹونک کی سرزمین بھی بڑی "شاعر خیز" واقع ہوئی ہے، ابو العرفان فضائی صاحب بھی اسی سرزمین کے رہنے والے ہیں، کمیت کے اعتبار سے فضائی اشعار کے ذریعہ عرفان و حقیقت کی ترجمانی کی کوشش فرماتے ہیں۔ خیالات مائل بہ رفعت ہیں۔ اور شاعرانہ فطرت ایک نئی راہ پیدا کرنا چاہتی ہے "وحدتِ تعلق" ایک نظم کا عنوان ہے :-

وحدتِ تعلق

از ابو العرفان فضائی ٹونکی

کثرتِ امید پر قائم ہے بنیادِ حیات
جس کو دل کہتے ہیں ارمانوں کا اک گلدستہ ہے
ہے تعلق کی فراوانی سے نظمِ کائنات
ربطِ باہم سے نظامِ زندگی وابستہ ہے

محفلِ نجم و قمر سے زینتِ افلاک ہے
رونقِ بزمِ گلستاں ہیں گلوں کے قہقہے
پیکرِ حیوانِ ناطق آبروئے خاک ہے
بہرِ گل کیفِ جوانی ہیں بلبلوں کے چہچہے

لحنِ طاؤسی سے آسودہ ہے وحشت دشت کی
نیلگوں امواجِ سطحِ بحر پہ ہیں نرم سیر
مرغزاروں میں ہوس ہے نکہت کو گلگشت کی
اور بخارِ بحر ہے دوشِ صبا پہ گرم سیر

ہے تہِ دامانِ عصمت مضمحل مستیٔ شوق
خواہشِ خلوت میں ہے دوشیزگی اضطراب
ہاتھ پھیلاتی ہے جب گھبرا کے مجبوریٔ ذوق
چاک دامن ہو کے رہ جاتی ہے شرمِ اجتناب

ضیا فتح آبادی ایم اے کی نظمیں طویل غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں خیالات میں گہرائی اور زبان سلیس ہے۔ "اضطراب" کو پڑھئے اور بے چین ہو جائیے

اضطراب

(سانیٹ)

از ضیا فتح آبادی

ستارے آسماں پر مضطرب ہیں خاک پر ذرے
نہ اُن کو چین حاصل ہے نہ ان کو چین حاصل ہے
فضا لرزاں، ہوا بے کل، سکوں نا آشنا پتے
پریشاں موج ہائے بحر ہیں، بے تاب ساحل ہے

گل و لالہ ہیں سینہ چاک، بے چینی کا ماتم ہے
فضا میں تھرتھراتی ہیں نوائیں عندلیبوں کی
اسیرِ اضطراب و درد و غم کُل بزمِ عالم ہے
تمناؤں سے ٹکراتی ہیں آہیں ناشکیبوں کی

مجھے بھی فطرتِ سیماب نے بخشی ہے اک دولت
مرا دل بھی کسی کی یاد میں بے تاب رہتا ہے
حقیقت میں یہی بے چینیاں ہیں باعثِ راحت
اسی تسکیں کی موجوں میں مرا ہر شعر بہتا ہے
شباب و اضطراب و عشق سے تخلیقِ ہستی ہے
اسی تثلیث پر قائم نظامِ کیف و مستی ہے

ضیا اگر نظم پر زیادہ وقت صرف کریں تو برج نرائن چکبست کی یاد تازہ ہو سکتی ہے۔

جمال صابری کی نظمیں رنگین اور ترنم خیز ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جمال محسوس فرمانے کے بعد نظم کہتے ہیں۔ "آمدِ بہار" کو غور سے پڑھئے

آمدِ بہار

از جمال صابری

(۱)

بہار آتے ہی بن گئی ہے کسی حسیں کا خیال دنیا
حجابِ مستی کے اُٹھ رہے ہیں لُٹا رہی ہے جمال دنیا
ہے گلستاں میں گلاب دنیا ——— فلک پہ ہے ماہتاب دنیا
——— کہیں ہے آنکھوں میں کیف مستی ——— کہیں ہے حسن نقاب دنیا ———
——— کہیں تبسم کہیں ترنم ——— کہیں ہے برقِ حجاب دنیا ———
——— کہیں صراحی کہیں ہے ساغر ——— کہیں ہے مست شباب دنیا ———
——— کہیں ہے نغمہ کہیں ترانہ ——— کہیں ہے کیف رباب دنیا ———
جمیل و رنگین خلوتوں میں ہے جاذبِ رنگِ حال دنیا
بہار آتے ہی بن گئی ہے کسی حسیں کا خیال دنیا
حجاب مستی کے اُٹھ رہے ہیں لٹا رہی ہے جمال دنیا

(۲)

کبھی چمکتی ہے بادلوں میں کبھی ہے نورِ ہلال دنیا
خدا بچائے نگاہِ بد سے یہ کہہ رہی ہے کمال دنیا
بنی ہے اک گلعذار دنیا ——— ہے اپنے پر خود نثار دنیا
ہے مست خود اپنی نکہتوں سے ——— گلوں کو کرتی ہے پیار دنیا
شراب عشرت بہار ہی ہے ——— ہے ساقیٔ نو بہار دنیا
فضاؤں میں اضطراب سا ہے ——— کہ خود بھی ہے بیقرار دنیا
مئے محبت سے جھومتی ہے ——— ہے جیسے پھولوں کا ہار دنیا
رباب و نغمہ کی محفلوں میں ہے لذتِ حال و قال دنیا
کبھی چمکتی ہے بادلوں میں کبھی ہے نورِ ہلال دنیا
خدا بچائے نگاہِ بد سے یہ کہہ رہی ہے کمال دنیا

اعجاز صدیقی اکبر آبادی اتنے کمسن ہیں کہ غالباً سیس بھی پوری طرح پر نہیں بھیگیں۔ مگر "الولد سر لابیہ" کی ضرب المثل آپ پر صادق آتی ہے۔ اعجاز کی تخیل اس ناشگفتہ غنچہ کی مانند ہے جو نسیم سحری کی گدگدی کی منتظر ہوتی ہے۔ اعجاز کی طبیعت نئے طرز کی نظموں کی طرف مایل ہے "صبح بہار" کو پڑھ کر لطف اندوز ہوجیئے۔

صبح بہار

اعجاز صدیقی اکبر آبادی

رنگ و نوا در نظر و لالۂ و گل در کنار ——— ہائے یہ صبح بہار
ایک ہی عالم ہے یہاں باغ ہو تا کوہسار ——— ہائے یہ صبح بہار

(۱)

رنگ میں ڈوبی ہوئی جاتی ہے جدھر بھی نگاہ
پھول ہیں یا ہے گیاہ
خاک کے ذرّوں سے ہے تاروں کی فضا آشکار ——— ہائے یہ صبح بہار

(۲)

کیف سے لبریز ہے سارے چمنستاں کی گود
نغمۂ و چنگ و سرود
موجِ صبا رقص میں ہے گل فگن و غنچہ بار ——— ہائے یہ صبح بہار

(۳)

مست ہے بھونرا تو کہیں وجد میں ہے عندلیب
صحنِ چمن خوش نصیب
کھیل میں مصروف کہیں تیتریوں کی قطار ——— ہائے یہ صبح بہار

(۴)

حسنِ جواں نور فشاں دستۂ گل ہائے تر
پُر اثر و پُر ثمر
بار ور و بار چکاں یہ شجرِ سایہ دار ——— ہائے یہ صبح بہار

(۵)

کوثرِ مطلق ہے نگاہوں میں ندی ہو کہ جھیل
چشمہ ہے یا سلسبیل
خلد سمجھتی ہے چمن کو نظرِ اعتبار ——— ہائے یہ صبح بہار

(۶)

ساری فضا نشۂ نو خیز سے بہکی ہوئی
رنگ سے دہکی ہوئی
عطر سے مہکی ہوئی گلریز ہر اک شاخسار ——— ہائے یہ صبح بہار

(۷)

آکہ یہاں ابر بھی ہے نکہتِ مستانہ بھی
پھول بھی پیمانہ بھی
آکے بھرے باغ میں ہے صرف ترا انتظار ——— ہائے یہ صبح بہار

(۸)

پھر یہ چمن اور یہ ہنگام صبوحی کہاں
لوٹ لے کچھ مستیاں
شام خزاں تک تو رہے بادۂ نو کا خمار ——— ہائے یہ صبح بہار

تبسم نظامی بھی غالباً آگرہ اسکول کے مقلد ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن کی کوئی نظم میرے سامنے نہیں ہے۔

آگرہ اسکول کے ماہنامہ شاعر نے مناظمہ" قائم کر کے نظم کی صنف کو مقبول اور ہر دلعزیز بنایا ہے۔ "شاعر" آگرہ اسکول کا آرگن ہے۔ اور شعر و سخن کی خدمت نئے اسلوب اور جدید روش کے تحت کر رہا ہے۔

دوسرا رُخ تنقید کے دو پہلو ہیں، محاسن پیش کرنا، اور معایب

پر سختی کے ساتھ اظہار خیال کرنا۔ میں نے تنقید کے ایک پہلو کو پیش کیا ہے دوسرا رُخ نہایت ہی اختصار کے ساتھ یہاں پیش کرتا ہوں۔

آگرہ اسکول کے شعرا قدوسیوں کی جماعت اور فرشتوں کا گروہ نہیں ہے، کہ لغزشیں نہ ہوں، انسان کی فطرت میں لغزشوں اور خطاؤں کے لئے لچک رکھی گئی ہے، جب تک انسان ٹھوکر نہیں کھاتا جادۂ منزل کے اسرار اس پر منکشف نہیں ہوتے۔ جس طرح تاریکی کے بعد روشنی کی قدر ہوتی ہے، اسی طرح لغزش کے بعد سنبھلنے میں لطف آتا ہے۔ قدرت کا یہ نہایت ہی دلچسپ بھید ہے، اُس سے زیادہ شرح کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ جبر و اختیار کی پرخار وادی اس نقطہ سے کچھ زیادہ دور نہیں۔

(۱) آگرہ اسکول کے شعرا نئی ترکیبوں کی ایجاد میں بہت زیادہ آزاد اور بیباک ہیں۔ میں ترکیبوں کی ایجاد سے اختلاف کرکے زبان کی ترقی کا گلا گھونٹنا نہیں چاہتا، ہر شاعر کو ترکیبوں اور جدید تشبیہوں کے ایجاد کا حق ہے۔ مگر اس کی کچھ حدود ہونی چاہئیں۔ شاعر کو کسی جدید ترکیب استعمال کرتے وقت الفاظ کو اچھی طرح پرکھ کر اپنے وجدان سے اس مسئلہ پر فتویٰ طلب کرنا چاہئے کہ آیا زبان اس ترکیب کے بار کو سنبھال سکے گی۔؟ اور اہل زبان میں یہ ترکیب رواج پاسکے گی؟ خوشنما الفاظ اگر مہمل ہوں تو وہ کس کام کے! آگرہ اسکول کی نظموں نے کوئی شک نہیں۔ بعض حسین ترکیبوں کا اردو زبان میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن بہت سی ترکیبیں محل بحث و نظر، اور بعض قابلِ اصلاح بھی ہیں۔

اس بحث کو یہیں ختم کرنے کا ارادہ تھا، لیکن جی چاہتا ہے کہ وضع ترکیب پر کچھ بحث کی جائے تاکہ نفسِ مسئلہ نگاہوں کے سامنے آسکے میں تو اس مسئلے میں بہت زیادہ محتاط ہوں لیکن کہیں کہیں [illegible] کا مرتکب ہوجاتا ہے تاہم میری غزل کا ایک شعر ہے

ہے جذبۂ کامل کے دم تک نظارے کی یہ فردوس گری
اے قیس! بگولا صحرا کا محمل بھی ہے اور محمل بھی نہیں

فردوس گری ایک جدید ترکیب ہے، جذبہ خود ستائی اور احساس پندار سے دور رہ کر عرض کرتا ہوں کہ اس ترکیب کو زبان قبول کرسکتی ہے، اب اگر کوئی شخص ضرورت شعری کے لئے "خلد گری" یا "جنت گری" استعمال کرے تو مطلب ادا ہوجائے گا، مگر ان ترکیبوں کو زبان کبھی قبول نہ کرے گی۔ اور وجدان ہمیشہ خلش محسوس کرے گا۔ موجد ترکیب کی نظر الفاظ کی روح پر ہونی چاہئے۔ خوبصورت اور پرشکوہ الفاظ کے جوڑ دینے سے ترکیب نہیں بنتی[۱]

(۲) آگرہ اسکول کے شعرا معنویت سے زیادہ الفاظ کے شائق ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض جگہ الفاظ کا طوفان تو اُمنڈ کر رہ جاتا ہے، مگر معنویت کی سطح کو حرکت بھی نہیں ہوتی[۲]

(۳) آگرہ اسکول کی نظموں میں ایک ہی خیال کو بار بار دہرایا جاتا ہے اور بعض وقت مختلف موضوعات کی نظموں میں تشبیہات و ترکیبات کی تکرار بھی پائی جاتی ہے[۳]

یقین ہے کہ آگرہ اسکول کے شعرا جن کے احترام سے میرے قلب کا ہر گوشہ لبریز ہے اس تنقید پر مجھے معاف فرمائیں گے۔ لغزشوں سے وقار کو صدمہ نہیں پہنچتا۔ سرو ترشنے کے بعد ہی زیادہ شاداب ہوتا ہے۔ مضمون طویل ہوگیا، مگر میں کہہ دوں :-

"لذیذ بود حکایت [illegible] دراز تر گفتم"

---

[۱] آگرہ اسکول کی یہ خصوصیت ایک سے زیادہ مرتبہ معرضِ بحث میں آچکی ہے۔ اور اس موضوع پر مخالف و موافق آرا تنقید کا حق ایک حد تک ادا کرچکی ہیں اور اس سے یہ اعتراض قابلِ اعتنا نہیں۔ "شاعر" کا "کارِ امروز نمبر" اس سلسلہ میں ملاحظہ کیا جائے۔

[۲] شاید ناظرین نظموں کا خود مطالعہ فرمانے کے بعد اس کی تائید نہ کرسکیں گے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ بغیر الفاظ کے کسی چیز میں معنی اور مفہوم کیونکر پیدا کئے جاسکتے ہیں؟

[۳] آگرہ اسکول نے ادبِ اردو میں جن موضوعات کا اضافہ کیا ہے وہ بجائے خود اتنے اہم ہیں کہ کسی خیال کو بار بار دہرانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا۔ آگرہ اسکول نے نہ صرف زبان کو وسعت دی ہے بلکہ خیالات کی بنا کو بھی وسیع کیا ہے۔ بہرحال نظموں کے مطالعے پر ہی ہر بات کا

بعض اصحاب کا خیال ہے [illegible] (ایڈیٹر)

آگرہ اسکول اور تصوّف

از ــــ حضرت صبا رشیدی ایم۔ اے۔ بی۔ ایل

سرزمینِ تاج مدتوں سے علم ادب کا سرچشمہ رہا ہے۔ آثار الصنا دید جہاں نینوا اور بابل کے کھوئے ہوئے نغموں سے گونج رہے ہیں ہاں اکبرآباد کے قدسی ترانے فضائے شعر وسخن میں ہمیشہ ابدی ارتعاش پیدا کرتے رہیں گے۔

اردو شاعری کی بنیاد اگر مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ قدس سرہٗ یا حضرت خواجہ امیر خسروؔ قدس سرہٗ کے ہاتھوں رکھی گئی۔ اگر اس کا پودا قطب شاہیوں کے چمن زاروں میں اُگا اگر اُسکی کونپل ولیؔ دکنی کے ہاتھوں پھوٹی اگر حاتمؔ، آبروؔ، ناجیؔ، مضمونؔ سوداؔ نے اُسکی کونپلوں کو کلی اور کلی کو پھول بنا دیا۔ تو میرؔ اور غالبؔ کے رنگین ہاتھوں نے ہر پھول کو ابدی بہار چمن بنا کر دکھا دیا۔

پانچ ندی کے کنارے براجنے والی نے اردو جیسا لال تو پیدا کیا، لیکن اس بچے نے شروع ہی سے شیرازی ماں کا دودھ پیا، رکنا بادی لوریوں سے بہلا، نیشاپوری گہواروں میں سویا، جہاں ترک بچوں کے سبزۂ خط کی جگہ برہمن بچوں کے زنار و قشقہ نے لی، جہاں کرشن، گوپیوں کی پریم کتھا، وادیٔ نجد کی حدی خوانیوں اور باغِ ارم کے نغموں میں کھوگئی وہاں وادیٔ ہمالہ کے یوگ ادھیاس کی موجیں خلیج فارس کی تصوّف آمیز لہروں میں سوگئیں۔

تصوّف کی ابتدا اگرچہ طلوعِ اسلام کے ساتھ ساتھ ہوئی، اگرچہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ لیکن تصوّف کا نیر تاباں اگرفاران کے اُفق پر طلوع ہوا۔ تو فارس کے خطِ استوا پر خورشید درخشاں بن کر چمکا جس کی کرنوں سے ہمالہ کی چوٹیاں بھی جگمگا اٹھیں۔

اردو نے اگر ایک طرف بزم جم کی ٹھاٹھ جمائی، اگر ایک طرف اسکی محفلوں میں کرشن اور رکمنی نے قیس عامری اور لیلائی نجد کے سوانگ کھائے تو دوسری طرف اپنے یوگ و دیا کے مندروں میں حضرات غوث اعظم سعدیؔ و حافظ کی جلائی ہوئی روحانی شمعیں لاکر رکھدیں۔

آپ تاریخ اردو کا مطالعہ کیجئے۔ ابتدا ہی سے اردو نے تصوّف کا دیپک راگ الاپا۔ حضرت امیر خسرو کا زمانہ یاد کیجئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ طفلِ اردو نے زندگی کی پہلی سانس لی تھی۔ اس دور میں اس نوخیز بچے نے کیسے کیسے روحانی نغمے سنائے۔ قطب شاہ المتخلص بہ ظلِ اسد جس کا زمانہ ولیؔ دکنی سے پہلے گذرا ہے کہتا ہے ؎

جہاں ہے سیمیا کا نقش اوس تھے
کہے ہیں عارفاں سب اُس کو تمثال

خواجہ محمود بحری کو نہ بھول جائیے۔ اُنکی مثنوی مَن لگن اُس دور کی یادگار ہے۔ خواجہ صاحب نے ساری مثنوی صوفیانہ رنگ میں لکھی۔

اب وہ زمانہ یاد کیجئے۔ جب اردو شاعری صاف ستھری ہوکر بزمِ سخن میں جلوہ گر ہوئی۔ خواجہ میر دردؔ صوفیانہ خیالات کے لئے بہت نمایاں اور ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ اُسی دور کے تمام شعرا۔ مثلاً میرؔ۔ سوداؔ۔ میر حسنؔ۔ راسخؔ اعظیم آبادی کے کلام میں تصوف کی چاشنی ہے لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا وہ محض تمہیدی بکواس تھی۔ آجکی صحبت میں آپ کو سرزمینِ تاج کی وہ کہانی سناؤنگا جسکے ہیرو میر نظیر اور غالب تھے جنھوں نے تصوّف کے غیر فانی آبشار بہائے

آج بھی خطۂ اکبرآباد کی مردم خیزی نے سیماب جیسا لال جنا جس نے صرف میر و غالب کے کھوئے ہوئے نغموں کو یکجا کرنے کی کوشش کی بلکہ نئی دھن نئے سُر میں نئے نئے راگ الاپے۔

پہلے میر ہی سے شروع کیجئے۔ دیکھئے اس دل جلے فطری شاعر اور خدائے سخن کے دل میں جہاں محبت مجاز کے سینکڑوں جہنم فروزاں آتشکدے دہک رہے ہیں۔ وہاں اسکی روح کی گہرائیوں میں سینکڑوں ایمن زار بھی آباد ہیں۔

وحدت الوجود یا ہمہ اوست (Pantheism) کو میر نے کس اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ   عالم آئینہ کے مانند در باز ہے ایک

وجہ بیگانگی نہیں معلوم   تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

ذاتِ خداوندی کی تعیین میں صرف عبارت کا فرق ہے۔ اس نظریہ کو میر نے ذیل کے شعر میں بیان فرمایا ہے ؎

تحقیق کرو کس سی حقیقت کے نشہ کو   خضر آب اسے کہتا ہے آتش کہے موسیٰ

میر نے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی عجب اچھوتے انداز میں تفسیر بیان کی ہے ؎

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں   معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

خدا کے لئے ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ کس طرح میر نے خودی کو عرفانِ کامل ثابت کیا ہے۔

بیخودی کا سُر الاپنے والے حضرات آئیں اور یہ نغمۂ موسیقار سنیں۔ "آپ تک پہونچنا" اگر بیخودی ہے تو شاید تخلیق کائنات بھی بیخودی کا نتیجہ ہے۔

اسی فلسفۂ حقیقت کی ترجمانی نظیر اکبرآبادی نے نہایت سنجیدگی سے ذیل کی نظم میں کی ہے ؎

اے آئینہ کو ہاتھ میں لے اور بار بار دیکھ   صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ

خالِ سیاہ اور خطِ مشکبار دیکھ   زلفِ دراز و طرۂ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے؟ جان ترا پاک صاف دل   اور خال کیا ہیں تیرے سویدا کی رخ کے تل

زلفِ دراز فہم رسا سے رہی ہے مل   لاکھوں طرح کے پھول رہے ہیں تجھی میں کھل

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشک تتار و مشک ختن بھی تجھی میں ہے   یاقوت سرخ و لعل یمن بھی تجھی میں ہے

نسرین و سوسن و سمن بھی تجھی میں ہے   القصہ کیا کہوں میں چمن بھی تجھی میں ہے

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

سورج مکھی کے گل کی اگر دل میں تاب ہے   تو اپنے منہ کو دیکھ کہ خود آفتاب ہے

گل اور گلاب کا بھی تجھی میں حساب ہے   رخسار تیرا گل ہے پسینہ گلاب ہے

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

باغ و چمن کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر   قمری کی سن صفیر نہ بلبل کی سن صفیر

اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیا ہے ارے حقیر   ہیں حرف من عرف کے یہی معنی اے نظیر

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آگے بڑھئے اور کچھ غالب کے قدسی ترانے سنئے دیکھئے میکدۂ "تاج" کے اس بادہ پرست نے کس طرح حقیقت کی شرابِ رنگیں برسائی ہے۔ غالب نے مقام حیرت کی کیفیات کو ذیل کے شعر میں بیان کیا ہے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے   تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

یہ شعر لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔

کی تفسیر منیر ہے۔

سلوک کے خارزاروں سے گذرنے والے اپنے سارے خواہشات جذبات
دمطلوب کر بیٹھتے ہیں۔ انفرادیت کے سارے جذبے فنا ہو جاتے ہیں اُن کی
ساری عبادتیں عذاب و ثواب سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ راہِ سلوک میں
اس منزل کا نام مقام تسلیم و رضا ہے ـــــ یہی وہ مقام ہے جسکی
طرف آیۃ اِنّ اولیاء اللہ لا خوفٌ علیھم ولاھم یحزنون ط
اشارہ کرتی ہے۔

اس حقیقت کی ترجمانی غالب نے کس طرح کی ہے ـــــ
سنیے اور وجد کیجئے۔ ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

سلوک کی راہ میں ایک ایسا مقام بھی ملتا ہے جس کے ہر ذرے میں
بوقلمونی کا ایک حسین طلسم خانہ ہوتا ہے۔ جسکی نیرنگیاں کائنات ہوش و حواس کو
مسحور کر دیتی ہیں۔ حریم حسن کے پردے اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن
آنکھیں جلووں کو جذب نہیں کر سکتیں۔ نغمے فضا میں تڑپتے ہیں، کان سنتے
ہیں۔ لیکن سمجھ نہیں سکتے ـــــ نہ وہ کیفی حالتیں ہیں جن کا نام بیخودی
یا تصوف کی اصطلاح میں "صحو" ہے۔ اسی مقام کو بعض کتب میں حضرت
سلوک کی آخری منزل کہتے ہیں یہ مقام حیرت ہے۔ غالب نے مقام حیرت
یا صحو یا بیخودی کے کیفیات کو اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

یہاں تک تو جو کچھ میں نے عرض کیا وہ آگرہ اسکول کے عہد عتیق کی داستان
پاستاں تھی۔ بطور نمونہ چند اشعار آپ کے سامنے پیش کئے۔ پھر اگر تیرہویں صدی
کے دوادین کا تجزیہ کیا جائے تو نہ معلوم تصوف کے کتنے خمخانے نظر آئیں گے
آج کی صحبت میں چند گھونٹ ہی پر اکتفا کیجئے۔ اور خمکدۂ تاج کی نئی نئی
شراب کے چند جرعے چکھئے۔

قدیم میکدے تو اب خمارِ روح بن کر رہ گئے۔ لیکن خدا
قائم رکھے مولانا سیماب کو جنھوں نے اُجڑے ہوئے میکدوں کی خاک سے
نیا میکدہ بنایا ـــــ آئیے اب ذرا اس میکدہ کی مے خانہ ساز کے
چند جرعے لیجئے۔

مولانا سیماب آگرہ اسکول کی صحیح نمائندگی کر رہے ہیں۔ اگر آپ
نہ ہوتے تو سرزمین تاج کی فضائے شعر و سخن ہمیشہ کیلئے تاریک ہو جاتی
غالب کے بعد کوئی نہ تھا۔ جو کھوئے ہوئے نغموں کو یکجا کرتا۔ وہی حال
آگرہ اسکول کا ہوتا۔ جو آج ہمارے اسکول کا ہے۔ یہاں بھی بڑے بڑے
خمخانے بسائے گئے۔ نئی نئی شرابیں بنائی گئیں۔ لیکن سرزمین سخن
کا آخری تاجدار ناشاد اپنے ساتھ تمام رنگینیاں بھی لے کر چلا گیا۔ اب
اگر نظر اٹھائیے تو میکدے ویراں، جام و صراحی ٹوٹی ہوئی۔ نہ مغبچے نہ ساقی
ـــــ کوئی نام لیوا تک نہیں ـــــ ناشاد کے میکدے کی آخری
یادگار رتیباب کے ساتھ ختم ہو گئی۔

آئیے سیماب ہی سے شروع کیجئے۔ جہاں سیماب نے حسن و عشق
کی کیفیات کو مجاز کی آنکھوں سے دیکھا وہاں روح کے نغمہ زاروں
میں حقیقت کے نغمے بھی سنئے۔ وحدت الوجود کی حقیقتوں کو کس طرح شعر
میں بے نقاب کیا ہے۔

عروسِ فطرت مری نگاہوں میں چھا رہا ہو شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیر نقاب تیرا
زوال آمد رنگ ہے نیاز و احتیاج ہی تو
حدوث کی خفتہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا

آگے بڑھکر مولانا ارشاد فرماتے ہیں ؎

غم عذاب و ثواب کیسا یہ دونوں تیری ہی نعمتیں ہیں
نہ اختیاری کرم ہے تیرا نہ اختیاری عذاب تیرا

اس شعر میں مولانا نے نصِ قرآنی وتعزّ من تشاء وتذل من تشاء
بیدک الخیر انک علی کل شیءٍ قدیر کی حقیقت پر

روشنی ڈالی ہے۔ سلوک کی راہ نہایت خطرناک اور اپنے دامن میں سینکڑوں سراب زار لئے ہوئے ہے۔ اس راہ میں کبھی کبھی انسان کو اپنے علوئے مرتبت کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں غرور و عجب کی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ چونکہ اسنے اتنی عبادتیں اور ریاضتیں کی ہیں اس لئے یہ مدارج ملے لیکن قدرت غرور و خود بینی پسند نہیں کرتی اور ایسوں کو ایسی سزا دیتی ہے کہ وہ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق بنجاتے ہیں۔ بلعم باعور کی عبرتناک تاریخ آج بھی انسانی دل و دماغ سے محو نہیں ہوئی۔ اس شعر میں مولانا نے بتا دیا کہ عذاب و کرم قدرت کا فعل ہے۔ انسان کے اختیار کی بات نہیں کہ وہ تعفو بیٹا یا مغضوب۔ قرآن مجید کا بھی یہی فیصلہ ہے۔

ذیل کا شعر پڑھئے ــ معلوم کس وجدانی کیفیات اور بیخودی کی مستیوں میں مولانا نے فرمایا ہے ؎

رہنے دے محو بیخودی خاطر پُر خروش کو
راز کہیں نہ فاش ہو قید تعینات کا

کنت کنزاً مخفیاً کی شراب روحانی پینے والے اس شعر کی حلاوت آگینیوں سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ حسن ازل عدم آباد کی رنگینیوں میں مستور رہتا۔ لیکن جب اُسے جلوہ نمائی منظور ہوئی تو تعینات کے پردوں سے جلوے چھن چھن کر نکلے اگر قید تعینات نہ ہوتی تو حسن ازل ہمیشہ کے لئے مستور رہتا۔ اسی حقیقت کیطرف مولانا سیماب نے اشارہ فرمایا ہے ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں۔

سرگشتۂ جمال کی حیرانیاں نہ پوچھ — ہر ذرّے کے حجاب میں اک آئینہ ملا
کسی کو تو نہ ملا اور کھو دیا سب کو — تری تلاش میں گمراہ اک زمانہ ملا

ان اشعار کو پڑھئے اور جھومئے۔ الفاظ کی رنگینیاں اور اسلوب نگارش کے محاسن نہ صرف احساسِ جمالی کو بیدار کرتے ہیں۔ بلکہ روح کے نورانی کالبد میں اک نئی روح پھونکتے ہیں ــــ انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ مقام حیرت کی طلسم بندیوں میں آکر انسان منزلِ مقصود کو کھو دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے نتائج حقیقی کے جلوے دیکھے ــــ لیکن یہ محض نفس کا دھوکا ہوتا ہے۔ انسانی نگاہ وادیٔ حیرت میں بھٹکتی ہے حریم حسن تک پہونچتی ہے لیکن حجاباتِ حسن نہیں اٹھا سکتی ــــ یہاں کے ذرے آنکھیں نکالتے ہیں ــــ ہر ذرہ آئینہ بن کر انسان کو محو حیرت بنا دیتا ہے ــــ وہ خود بھی صورت دیکھتا ہے۔ لیکن سمجھتا ہے کہ اسکی نگاہیں، کامیاب ہوگئیں۔ قرآن کا فیصلہ ہے۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر (انسان خدا کو نہیں دیکھ سکتا) مولانا نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہی مقام بیخودی ہے اور مجاذیب کی منزل ہے۔

انسان حصار وسعود کی طلسم سامانیوں میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ وہ جلوۂ نور رنگ کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن جب رنگ و بو کے چمن زاروں سے نکل جاتا ہے تو اس کی نگاہوں میں ہر ذرہ حسنِ ازل کا آئینہ دار ہو جاتا ہے۔ جب وہ مرئیات و تعینات کے حدود سے نکل جاتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے ؎

جسے نہ دیکھ سکیں میری ظاہری آنکھیں — وہ مجھ سے روح کی خلوت میں غائبانہ ملا
(سیماب)

نحن اقرب من حبل الورید کی روشنی میں یہ شعر پڑھئے ــ یہی مقام خودی یا عرفانِ کامل ہے۔ آگے بڑھئے اور حدیثِ قدسی قلوب المومنین عرش اللہ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔

رفتہ رفتہ ہوگئے جذب اس میں جلوے سینکڑوں
دل مرا سیماب اک آئینہ خانہ ہوگیا

یہاں تک جو کچھ میں نے عرض کیا وہ مولانا سیماب سے متعلق تھا

اب آگے بڑھیے اور دیکھیے کہ اُن کی ذات سے فضائے شعر و سخن میں کتنے ذرّے ستارے بن کر جگمگا اُٹھے۔ مثنوی تو نہ خودداری ملاحظہ ہو

کنتُ کنزاً کہہ کے آپ اپنی حقیقت کہہ گئے
میں نے پوچھا میری ہستی ؟ بولے میرا راز ہے — ارمان اکبرآبادی

یہ شعر مولانا سیماب کے شعر کی بازگشت ہے۔

ہٹنے دے مجھ کو خودی خاطر پہ خرمش کو
راز کہیں نہ فاش ہو قیدِ تعینات کا !!

خود حجابِ نورِ مطلق پردہ دارِ نور ہے
آنکھ میں رہتا ہے لیکن آنکھ سے مستور ہے — ارمان اکبرآبادی

یہ شعر بھی مولانا کے شعر کی بازگشت ہے۔

جسے نہ دیکھ سکیں میری ظاہری آنکھیں
وہ مجھے روح کی خلوت میں غائب نہ ملا

وحدت الوجود کے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

برقِ ایمن خود فریبِ جلوہ زارِ طور ہے
تو سمجھے ہو جسے وہ تو حجابِ نور ہے — ارمان اکبرآبادی

تو دل کے ہر حجاب سے جلوہ نما ہوا
ہر ذرہ آفتاب کا اک آئینہ ہوا — اثر اکبرآبادی

کھل گیا میری حقیقت اور مری ہستی کا راز
یعنی ہیں جس نور کا پرتو ہوں تو وہ نور ہے — ״

کبھی کبھی نظر ہے نظر میں ہے تو کبھی
اے کوئے یار کیا ترے دیوار و در میں ہے — اَبر احمدی اجمیری

اے حسن کائنات یہ آنکھیں ترے نثار
تو ہے اگر نظر میں تو سب کچھ نظر میں ہے — پیر احمدی

جو رہِ مقصود میں گم ہو گئے کام آ گئے
یہ اُنھیں کی ہمتیں تھیں یہ اُنھیں کا کام تھا
(تفسیر ومن یقتل فی سبیل اللہ الخ)

جس میں سما نہ سکتا تھا اک قطرہ خون کا
وہ دل ہے آج حاصلِ صد راز دیکھیے — حسن یاور نقوی

پروانہ پھنک جائے جواب بھی تو ستم ہے
جو شمع کلیسا ہے وہی شمع حرم ہے — (شفیق کوٹی)

وحدت الوجود:

ہم کو نہیں مجاز و حقیقت میں امتیاز
ہیں دونوں عالم ایک ہمارے خیال میں — شفیق کوٹی

حسن کثرت میں کہاں گرم تماشا نہ ہوا
لاکھوں جلووں سے عیاں جلوۂ جانانہ ہوا — آغا زیبا پوری

کیا کہوں جلوہ گہِ حسن کا عالم آغا
دعوئے ہوش کیا جس نے وہ دیوانہ ہوا

کمالِ ہوش ہے خود پر ترا گماں ہونا
خودی کی داد مجھے دے سزائے دار نہ دے — رعنا بلسوی

آخر یہ رازِ الفت افشا ہوا کہاں سے
یا تیرے رازداں سے یا میرے رازداں سے — حیرت لدھیانوی

اے اعتبارِ منزل اتنا مجھے بتا دے
نزدیکِ آستاں ہوں یا دورِ آستاں سے — حیرت ״

بت شکن لاکھوں ہیں لیکن آہ! وہ آذر کہاں
دل کے بتخانے میں جو نورِ خدا پیدا کرے — شفیق ٹونکی

جس کے دل میں ہو براہِ راست ذوقِ کوئے دوست
کیوں وہ راہِ عشق میں ما و شما پیدا کرے — شفق صحرائی

انا کے پردے میں تھے آپ ہو گیا معلوم
وگرنہ شورِ انا الحق کا مدعا معلوم — ״

پلا دے ساقیٔ کوثر وہی شرابِ کہن
ہو جس کے کیف سے معدوم ما سوا معلوم — ״

بات حق کی ہے گو ذرا سی ہے
خود شناسی ہی حق شناسی ہے
(شفق صحرائی)

آسکے نظر آسکے گا ترا جلوہ مستور
آنکھوں سے مظاہر کو جو بیگانہ بنادے
(مخمور جالندھری)

ذوق نظر ابھی ترا حسن آزما نہیں
جلوہ نما ہی ہے جو جلوہ نما نہیں
(مخمور جالندھری)

رہبر دو جہاں گر ہے تو وہی ہے نقامِ دوست
لیکن یہ جانتے ہوئے گزر ناروا نہیں
مخمور جالندھری

یہ ہو سکتا ہے نہ ہوں ماورائے چشم نظارہ
یہ ممکن ہے حقیقت تک نہ پہنچی ہو نظر اپنی
رضا قریشی

کوئی بسمل نہ کوئی قاتل ہے
کار فرما حقیقتِ دل ہے
اے دل ناشناس راہِ طلب
نقشِ منزل سرابِ منزل ہے
رضا قریشی

جب مجاز کے پردے اٹھ گئے محبت میں
رخ میں حقیقت کی روشنی سی پیدا تھی
نذیر بشیر کوٹی

معصیت زارِ کہن دنیا ہی انساں کیلئے
دوسرا عالم بنادی چشم عرفاں کے لئے
چشمِ ظاہر پہ ہو سرِ نحن اقرب آشکار
بیخودی اک نیشتر لادے رگِ جاں کے لئے
فضائی ٹونکی

نہ دی الزامِ تنگئ نظر گوشہ نشینوں کو
اٹھادیں دل سے گر پردہ تو سیر دو جہاں کرلیں
آلم مظفر نگری

دیکھا تو پردہ دار تھا وہم و حجاب خود مرا
آج بس خود چلا گیا پردہ سرائی رازمیں
آلم مظفر نگری

بیخودی رتبۂ عالی پہ پہونچ جاتی ہے
گر خودی چھوڑ دے انسان تو انسان نہ رہے
آلم مظفر نگری

فلک نشیں ہیں ابھیں آستاں نشینوں میں
نشان سجدوں کے محدود ہیں جبینوں میں
ضیا جھنجھوٹوی

کفر کے عرفان سے اور اک ایمان چاہیئے
بے نیاز این و آں ہونے کا سامان چاہیئے
فی الحقیقت پیکرِ خاکی نہیں حق سے جدا
ہاں مگر نفس آشنا ادراکِ انساں چاہیئے
فدا کھیم کرنوی

محصور کرکے مجھکو عناصر کی قید میں
سو سو طرح حجاب سے وہ جلوہ گر ہوا
قمر سہسرامی

آجا حریمِ روح سے بامِ نگاہ تک
نازک سا یہ حجاب بھی کیوں درمیاں رہے
منظر صدیقی

مذاقِ جلوہ آرائی سے تم تو بے نیاز ہو
نگاہِ شوق پر قیدِ مکان و لامکاں کب تک
اعجاز صدیقی

نشاطِ مقصود چشمِ شوق سے مستور ہے
اس قدر نزدیک ہونے پر بھی کتنا دور ہے
راز چاندپوری

آپکے سامنے چند اشعار مختلف شعرائے آگرہ اسکول کے پیش کردے۔ چند اشعار پر مختصر سا نوٹ بھی دیدیا اگر کل اشعار پر تبصرہ کردوں تو غالباً مضمون بہت طویل ہوجائیگا۔ اسلئے چند اشعار پر اکتفا کیا۔ اب اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ خدا کرے آپ میری بکواس سے ناخوش نہ ہوں اور میری ہرزہ سرائی کو شرفِ قبولیت بخشیں —

ہندوستان کا پہلا قادرالکلام ادیب

از ——— محسنِ ادب بالو ہرگوبند دیال صاحب نشتر وکیل اٹاری

پیشۂ وکالت کی مصروفیتیں کچھ سوہانِ روح نہیں ہوتیں۔ گو یہ عدیم الفرصتی میرے لئے نہایت مبارک ہے۔ کیونکہ یہ چیز میرے ہم پیشہ حضرات کو خوش قسمتی ہی سے ملتی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ادبی زندگی کے لئے یہ خشک اور ہمہ وقتی مصروفیت ایک ضرب کاری ہے۔ جو شعریت اور مضمون آفرینی کو یکسر فنا کر دیتی ہے۔ جس وقت میں نے "شاعر" کے "آگرہ اسکول نمبر" کا اعلان دیکھا تھا اُس وقت میرے دماغ میں کچھ لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور میں چاہتا تھا کہ ایک بسیط مضمون آگرہ اسکول کے کسی موضوع پر لکھوں۔ لیکن اپنی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے بسیط تو کیا دو چار صفحے کا مضمون لکھنا بھی مشکل تھا۔ موضوع کی تلاش میں بھی کچھ عرصے تک سرگرداں رہا۔ آخر طے کیا کہ مولانا سیماب ہی پر ایک مضمون کیوں نہ لکھ دوں۔ جن کی زندگی کے بیشتر واقعات سے میں وقتاً فوقتاً دوچار ہوتا رہا ہوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ اسی ردّ و کد میں ایک مہینہ اور گذر گیا جب جنوری کے شاعر سے مجھے معلوم ہوا کہ آگرہ اسکول نمبر مارچ میں شائع ہوگا تو میں نے مصمم ارادے کے ساتھ ایڈیٹر صاحب "شاعر" کو لکھ دیا کہ میں بھی ایک مضمون عنقریب بھیج رہا ہوں۔

میں محترم مدیرِ "شاعر" کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے وہ ریویو روانہ فرما دئے جو مختلف رسائل اور اخبارات نے مولانا کے کلام پر کئے ہیں۔ میں نے یہ مضمون ان ہی ریویوز کو دیکھنے کے بعد اور کچھ اپنی معلومات کی بنا پر لکھا ہے۔ یہ میری بدبختی ہے کہ میں اتنے اہم کام پر چند روز سے زیادہ صرف نہیں کر سکا ہوں اور اسی لئے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میری مساعی کہاں تک کامیاب ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ میری یہ تحریر مولانا سیماب صاحب کے بلند درجے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور شاید میرا مضمون "آگرہ اسکول نمبر" کو کوئی زینت نہ دے سکے۔

نشتر

صبح کا نور، شام کی تاریکی۔ ابنِ آدم کی جولانی، بیل و بہار کی نمود۔ حسن کا نیاز، انقلابِ زمانہ کی مشتے از خروارے زندہ مثالیں ہیں۔ ابتدائے دورِ عالم سے انتہائے دورِ عالم تک یعنی وہ زمانہ جس کی ابتدا لامعلوم ہے اور جس کو ازل کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور وہ زمانہ جس کی انتہا لامعلوم ہے۔ اور جسے ہم ایک لفظِ ابد کے نام سے پکارتے ہیں۔ تازہ بہ تازہ نو بہ نو واقعات سے معمور ہے۔ معلوم ہوا کہ فطرت بھی انقلاب کا گھر ہے۔ بھگوت گیتا کی تعلیم دینے والا دیوتا۔ رامائن کے اشلوک وجود میں لانے والا اکمل انسان، جب مختلف اوتاروں میں جلوہ نما ہوا تو انقلاب نے زندگی کی زندہ مثال پھر پیش کی اور حسنِ تقویم کے علمبردار نے کائنات کی تاریخ اپنے ہاتھ میں لی۔ فطرت کی وسعتِ نظری اور یکتائی نے نئے سبق دینا شروع کئے

اور قد و قامت کے لحاظ سے مڈل کلاس سے نہ بڑھنے والے حضرتِ انسان کے سینے کو الم نشرح کے خلعتِ گراں بہا سے منور کیا۔ جمادات و نباتات، حیوانات کے تابع ہوئے۔ حیوانات کے گروہِ اوّل نے حیوانِ مطلق کی صورت اختیار کرکے نباتات اور جمادات کی طرح حیوانات کے رکنِ اعظم "انسان" کو اپنے کارنامے، اپنی خدمات اور اپنے معاملات سپرد کئے اور اس طرح سپرد کئے کہ کہیں تو گئو ماتا نے دودھ کی دھاریں پلائیں اور کہیں اسپ تیز رفتار نے ایک عرب کے دل میں "خلف الصدق" سے زیادہ جگہ حاصل کی۔ صحرا کی رہنے والی قوموں نے شترِ بے مہار کی ضرورت کو ضروریاتِ زندگی کا جزو لاینفک سمجھا۔ جزیرۂ لاپلینڈ کے ہرن نے تخلیقِ اعلیٰ کی خدمت میں اپنی کھال لباس کی صورت میں، مینگنیاں ایندھن کی شکل میں، آنتیں چارپائی کے بان کے بجائے، اور ہڈیاں چارپائی اور چھت وغیرہ کے لئے پیش کیں۔ ہر نوع کائنات کی بہترین صناعی نے انسان کی صورت اختیار کرکے ایک ایک ہنگامہ خیز زندگی شروع کر دی۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، انسان ہی کی تاریخ کروٹیں لے رہی ہے۔ اور قیامت تک لیتی رہے گی۔ پہلا انسان آدم کے نام سے موسوم ہوکر ایشیا کے کسی حصے میں پہونچا۔ شریکِ زندگی نے مفارقت کا سفر طے کرتے ہوئے کہیں ایشیائے کوچک میں ہم آہنگی پیدا کی اور صبح و شام تناسل و توالد کا سلسلہ جاری ہونے لگا۔ آدمِ ثانی تک زندگی کہیں سے کہیں پہونچ گئی۔ وہی انسان جو پتھر کے زمانے (Stone age) اور دھات کے زمانے (metal age) کی ترقیوں تک محدود تھا اب لکڑی کی کشتیاں چلانے لگا اور وہی کشتیاں آگے چل کر ڈریڈناٹ (Dread Naught) اور ایروپلین (Airoplane) کی صورت میں جدتِ رفتار و پرواز کی مظہر ہیں۔ تہذیبِ انسانی بامِ عروج پر گامزنی کا سبق استادِ ازل سے سیکھ کر آئی تھی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ انسان نے فطرت کے سکھائے ہوئے اکثر اسباق ضرور بھلا دئے ہیں۔ مگر عروجِ تہذیب، عروجِ تمدن اور عروجِ ادب کا سبق نہ کبھی بھلایا تھا اور نہ کبھی بھلائیگا۔ اسی سبق میں ایک وہ چیز شامل ہے۔ جس کا تعلق قوموں کے عروج و زوال سے ہے۔ اور وہ ادب ہے۔

ادب کا پہلا حرف اپنے قامتِ کشیدہ کے ساتھ کسی تیر انداز کی نگاہِ ناز سے یا کسی حسنِ عالم افروز کی ابروئے خمدار سے یا کسی ماہر و کی سبزۂ نو دمیدہ کے الفِ زار سے سرکشیدہ ہوکر ابجد کی بنیاد ڈالنے میں مصروف ہوا یہ تو علمائے ادب سے پوچھو کہ حروفِ تہجی کب اور کیونکر پیدا ہوئے۔ اگرچہ اس باب میں وہ مستند دلائل بصد کاوش پیش فرما چکے ہیں لیکن دلیلِ راہ کے لئے اشارتاً توضیحِ مزید سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ ہمارا تعلق اس مسئلہ کی ارتقائی صورت سے صرف اس قدر وابستہ ہے کہ دنیائے ادب نے اپنے کمالات سے برہمنوں کو دیوتا اور یونانیوں کو دیوتا گر بنا دیا اور پتلیوں کو آدمی کی شکل دے کر کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ کوئی قوم اور کوئی ملک اس وقت تک شاہراہِ ترقی میں گامزن نہیں ہوتا جب تک وہ ملک یا قوم اپنی زبان میں استعداد کما حقہٗ پیدا نہ کرے۔ مثال کے طور پر سنسکرت کی ویاکرن، یونانیوں کا علم و کمال، عربوں کی ٹکسالی زبان، وید کے اشلوک دنیائے ادب کی وہ چند مثالیں ہیں جنھیں سینے سے لگانے کے بعد آج تک ان کے بغلگیر کرنے والوں کے دل گرم ہیں۔ لاطینی دستور العمل اور یونانی علم ادب عربی زبان، سنسکرت کی قواعد خود ہی زندہ نہیں، بلکہ دنیا ان سے زندہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ تحفظِ زبان کا مسئلہ تحفظِ ایمان سے زیادہ اہم سمجھا جاتا رہا ہے۔ بدیہی بات ہے کہ "سو کا مرنا پسند مگر سوکے پالنے والے کا مرنا ناپسند" یہی وجہ ہے کہ بھکشوؤں نے بودھ مت کی پروا نہ کی مگر کتب کا مطالعہ نہ چھوڑا۔ برہمنوں نے حکومت ٹھکرا دی لیکن پورانوں کو محفوظ رکھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ سکندر کو ارسطو کا تابع ہونا پڑا۔ اور یہی وجہ ہے کہ لقمان کی حکمت کا اعتراف

کرنا پڑتا ہے کہ سلطنتِ برطانیہ کی عالمگیر وسعت شکسپیر کی تصنیف سے منسوب کی کیجاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ رستم کی شجاعت فردوسی کے اس شعر کا مرقع ہے۔

منم کردہ ام رستم داستاں   دگر نہ یلے بود در سیستاں

یہی وجہ ہے کہ آج ہر اُس شخص کو جس کے سامنے ہم بے چون و چرا گردن جھکا سکتے ہیں۔ افلاطون کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ بہر حال ادب کا ایک لفظ ہزار مسلح نوجوانوں سے زیادہ کارآمد ہے۔ نپولین بونا پارٹ میدانِ جنگ میں (سپاہی) ([illegible]) کے بجائے اپنی افواج کو (مہذب انسان) ([illegible]) کہہ کر یہ سمجھا دیتا ہے کہ لڑنے والو تم تہذیب کے حامی ہو۔ مذہب کے محافظ، ملک کے دلدادہ، قوم کے جاں نثار، حق کے شیدائی اور تمدنِ حقیقی کے مالک ہو۔ تم سپاہی نہیں بلکہ ظلم کا انسداد اور حق کا اعلان کرنے والے فرشتے ہو۔ حقیقتاً نپولین کا یہ خطاب، جرأت و ہمت بڑھانے والی ایک رجز تھی جس نے میدانِ جنگ سر کرا دیا۔ ورنہ تمام فوجیں تمام اسبابِ جنگ اور تمام آلاتِ حرب بیکار تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ احمد شاہ نصرانی سے ہرات چھڑانے والا رودکی کا یہ شعر تھا۔

اے بخارا شاد باش و شاد زی   شاہ سویت میہماں آید ہمی

یہ امر حقیقت سے دور نہیں کہ ادب، عالمِ آب و گل کی روحِ رواں ہے۔ مٹ جانے والی ہستیوں کے نہ مٹنے والے کارنامے ادب ہی کے [illegible] (تجوری) میں اس طرح محفوظ ہیں جس طرح طبقۂ علیین میں اُنکی پاک روحیں گویا عالمِ ارواح کو اُنکی روحوں سے زینت ہے۔ اُن کے کارناموں سے عالمِ آب و گل میں بے بحث ترقی پا بد" کا مسئلہ اسی لئے پیدا کیا گیا تھا کہ خلیفہ ارضی چند شاعر پیش نظر رکھکر تہذیب انسانی کے عروج میں چار چاند لگاتا رہے۔ دیکھا جا رہا ہے کہ قومی انحطاط، ادبی انحطاط کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تجدید علم ([illegible]) نے سلطنتِ عثمانیہ کے عروج کو یورپ کے ہاتھوں دے کر چار دانگِ عالم میں پھولوں کی مہک بنا کر چمن چمن میں چھوڑ دیا۔ قرطبہ اور تاہرہ کی یونیورسٹیاں، دار العلوم ہیئتین، برلن، آکسفورڈ اور پیرس کی یونیورسٹیوں نے اُن کی رکاب میں پاؤں رکھا۔ اہلِ یورپ نے ادب کی حفاظت کی۔ ادب نے اہلِ یورپ کو ممتازِ خلائق کیا اور اس طرح کہ آج ماسوائے یورپ و امریکہ یا جاپان دنیا حقیقی ادب سے خالی ہے۔ اور اسی لئے محکوم ہے۔ آؤ عرب سے پوچھیں وہ زبانِ حال سے کہے گا۔ کہ عرب کی عظمت اُس دن گئی جس دن عرب میں سب سے زیادہ شاعر پیدا ہونے بند ہو گئے۔ یا یہ رسمِ عرب مٹ گئی یا عربوں نے یہ رسم مٹا دی کہ اُس گھرانے کو مبارکباد دینا ترک کر دیا جہاں کوئی بچہ شاعر پیدا ہو۔ اس میں شک ہی کیا ہے کہ طلسم ہوش ربا کے اُڑن کھٹولے کسی اہلِ ادب کے قلم سے اب سے تقریباً ایک صدی پہلے اس لئے تراشے گئے تھے کہ ہوائی جہازوں کی دنیا کو ضرورت تھی۔ سائیکالوجی کا مسئلہ ہے کہ فضائے عالم میں کوئی وہ خیال انسان پیدا نہیں کرسکتا جس کا وجود ناممکن الوقوع ہو۔ شاعر یا ادیب اُن اختراعات اور ایجادات کا پیش گو اور پیغمبر ہوتا ہے جن کا عملی نمونہ صدیوں بعد دنیا پیش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی اور قومی ترقی کے لئے ملک میں اچھے ادیب اور شاعر کا پیدا ہونا ملکی اور قومی عروج کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

ہندوستان بھی اسی اصول کا محتاج ہے۔ چندر گپت موریہ کی شوکت چانکیہ کی ممنونِ منت ہے۔ بکرماجیت، کالیداس کا، ہرش۔ بان کا اور اکبر ابوالفضل کا ممنونِ کلام و بیان ہے۔ شاہجہاں کو سعد اللہ خاں کی قابلیت اور اورنگ زیب کو ذاتی استعداد سنبھالے رہی۔ اورنگ زیب کی غلط اور بھیانک تصاویر سے صفحۂ تاریخ جس قدر سیاہ ہے اُسی قدر وقائع عالمگیری، رقعاتِ عالمگیری اور فتاوے عالمگیری سے اُس کا نام آفتابِ عالمتاب کیطرح درخشاں ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کا زوال اُسی روز ہو چکا تھا جس روز عالمگیر کے ملفوظات کا جواب دینے والا دنیائے ادب میں کوئی نہ تھا۔ بدقسمتی سے اُسی دور میں ایک نئی زبان عالمِ خروج تھی جبکہ قدیم سلطنت کے زوال و جابر سلطنت کے حملوں نے تزلزل پیدا کرکے اُس دور کے شاعروں کو قومی شاعری اور قومی ادب سے محروم کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ ہماری زبان جس کو ہم اردو کے نام سے تعبیر کرتے ہیں [illegible]

کچھ معصومانہ اور کچھ جوانانہ حملوں سے اپنی بدمقابل انگریزی زبان کے منہ زور حملوں کو روک نہ سکے۔ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئی۔ لیکن جب نئی سلطنت کی داغ بیل نے اپنے ایوانِ سلطنت کو انگریزی ادب کے ستونوں سے مستحکم بنا کر کھڑا کر دیا تو اس دل آویز اور قابلِ رحم زبان کیطرف بھی توجہ فرمائی گئی۔ لیکن ہندوستان کی انحطاطی صورت اور کمزور قوی نے جو بگڑنے والی سلطنتوں کے مابعد جمودی حالت میں آجایا کرتے ہیں اپنا تسلط کرکے اُس کو گل و بلبل کے افسانوں تک محدود کر دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری مطمحِ نظر اُردو زبان کے نازک خیال شعرا ذوق غالب۔ مومن۔ انیس اور آتش و ناسخ وغیرہ نے حسن و عشق کے تاثرات، شاہی مدحت نگاری، ناقدردانی کا شکوہ، عشق کی کوفت، فقیری کا ٹکا اور رئیسی کی شان دکھانے تک اس ہمہ گیر زبان کو محدود رکھا۔ خدا بھلا کرے سر سیّد کا جو (Father of Urdu Literature) کہلاتے ہیں۔ جنھوں نے اُردو سے سیاسی۔ مذہبی۔ اخلاقی اور معاشرتی کام لے کر اُس حد تک پہونچا دیا کہ اُردو اہلِ زبان کی نگاہوں میں "زبان" نظر آنے لگی۔ اِسی دور میں مولوی نذیر احمد ایل ایل۔ ڈی۔ مولانا شبلی۔ خواجہ الطاف حسین حالی پیدا ہوئے اور اب ہندوستانی جاگے۔ یہی اُردو زبان کا دورِ متوسط تھا۔

ابھی تک اُردو زبان نے ایسا کوئی شاعر پیدا نہیں کیا تھا۔ جو ترقیٔ ملک کا باعث ہوتا اور اس میں وہ جمیع اوصاف ہوتے جو اہلِ ہند کو آزادی کا سبق سکھاتے۔ آخر اقبال پیدا ہوئے اور مسدسِ حالی کی طرح شکوہ۔ جوابِ شکوہ اور بانگِ درا لکھ کر ایک نئی شاہراہ پر ہندوستانیوں کو لے چلے۔ لیکن اُن کا دقیق فلسفہ قومی گتھی سلجھانے کے لئے رو براہ نہ آسکا۔ ہندوستان کسی ایسی ہستی کی تلاش میں تھا جو زبان کے ہر شعبے میں ہندوستانیوں کی تسکین کر سکے یہ امر مسلّم ہے کہ قوموں کے بننے اور بگڑنے میں ایک زمانہ چاہیئے۔ لیکن جگانے والے بیداری کی لہر خوابیدہ ہستیوں میں بجلی کی سرعت کے ساتھ پیدا کر دیتے ہیں۔ بشرطیکہ سونے والے حشر تک سونے کی قسم کھا کر نہ سوئے ہوں۔ ہائے وہی ہندوستان جہاں نورتن جیسے جواہر پارے بار بار پیدا ہو رہے تھے۔ اب سنہ ۱۶۰۶ء سے لیکر سنہ ۱۸۸۰ء تک کوئی گوہرِ نایاب نہ پیدا کر سکا۔ اس مابین دور میں ہندوستان دو زبانوں کا ماتمی بنا۔ عربی کو دفن کیا۔ فارسی کا جنازہ نکالا۔ اور میر کو اُردو زبان کا ابنِ ربیعہ بنا کر کھڑا کیا۔ جس نے اپنے نشترآفریں تغزل کا رنگ حافظ شیرازی کے ہاتھ پہ بیعت کرکے اس طرح پیش کیا

اُن کو آتا ہے پیار پہ غصّہ   مجھ کو غصّہ پہ پیار آتا ہے

زوال پذیر قوم کے لئے یہ رنگِ شاعرانہ سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ تھا ذوق دستاربندی سے فرصت نہ پا سکے۔ غالب شکوہ سنجی کا شکار رہے تاہم قابلِ شکریہ ہیں کہ جدید فلسفے اور شاہراہِ نثر کی شاخیں بالیدگی کے لئے چھوڑ گئے۔ لیکن قومی عروج اور ملکی ترقی کے لئے اُن کی شاعری تسکین بخش نہ تھی۔ حضرت مومن "آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے" کا شکار رہے۔ اور (Gold Smith) کی دلسوزی عشق بتاں میں صرف کی۔ رُخ کو بدلتے ہوئے تغزل کی شان دکھانے والے دیارِ لکھنؤ کے شعرا میں سے ناسخ اور آتش بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ناسخ شاعر کی بجائے ترجمان کے نام سے یاد کئے جائیں تو بہتر ہے۔ اس وجہ سے کہ اُنکی تمام شاعری دوسری زبانوں کے اچھے اچھے اشعار کا ترجمہ ہے۔ زبان کا تیور نکھرا ہوا ہے۔ آتش زبان کی سلاست کے ساتھ اپنا رنگِ تغزل عشقیہ فلسفے تک محدود رکھتے ہیں۔ البتہ دورِ گذشتہ کے شاعر حضرت حالی غزل میں بھی نظم کا رنگ پیدا کرکے شاعرانہ عظمت نہیں چھوڑتے۔ مثلاً

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا

کچھ کر لو نوجوانو، اُٹھتی جوانیاں ہیں

گذشتہ دور میں اُردو رنگِ تغزل سنبھلا اور اقبال کے فلسفے نے جس کا تعلق دورِ حاضرہ سے بھی ہے۔ غالب کے فلسفے کی تجدید کی لیکن دنیا وہ راستہ نہ پاسکی جو عروجِ قوم کے لئے جادۂ صحیح تھا۔ القصہ فطرت کو رحم آیا۔ غیرتِ حق نے ہندوستان اور زبانِ اُردو پر کرم فرمایا اور سنہ ۱۸۸۰ء میں مضطرب اور متجسس ہندوستان اور دنیائے ادبِ اُردو کو ایک ایسی

ہستی کے وجود سے حصولِ ارتقا اور اکتسابِ ترقی کی قوت بخشی جس نے جلوہ فگن ہوتے ہی یوں زمزمہ سرائی کی سے

جب روح محوِ خواب ہو جب خواب سکر تاثیر ہو | جب ہر جمود آگیں فضا غفلت کی مستی تیز ہو
جب محفلِ افراد میں ہو انتشارِ مستقل | جب شورشِ ایام کی ہر موج طوفاں خیز ہو
پھیلی ہوئی ہو جب وبا دنیا میں استبداد کی | جب ہر نفس ہو مضطرب ہر آنکھ اشک انگیز ہو
جب نشترِ احساس خود دل کی رگوں کو چھیڑ دے | جب خاطرِ مجروح کا ہر سانحہ خوں ریز ہو
جب آدمی مظلوم ہو اور زندگی مظلوم تر | جب بیکسی کے سامنے فرعون ہو چنگیز ہو

اُس وقت شاعر سے کہو تخییل کو تکلیف دے
اجزائے نظم و شعر کو پیرایۂ تصنیف دے

یہی وہ آواز تھی جس نے ہندوستان کو نئی کروٹ بدلوا دی۔ اسی تخیل کی ہندوستان کو ضرورت تھی نظموں کی صحیح بنیاد نظیر اکبرآبادی مرحوم نے ڈالی تھی لیکن زبان اس قدر پست تھی۔ اور کہیں کہیں خیالات ایسے پوچ تھے کہ انھیں متانت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی نظموں کی طرف رُخ کیا اور نئے عنوانوں سے اس رنگ کو جا بجا پیش کیا لیکن اہلِ ہند کی انحطاطی صورت کو روکنے کیلئے کسی اور چیز کی ضرورت تھی اس کا احساس سر سید کو پیدا ہوا جو یہ احساس کرتے ہوئے گئے نظم کے لئے نہیں پیدا ہوا اس میدان میں بھی مثبت نتیجہ [illegible] ہوا کہ باوجود ہونے نظم کا زور نثر میں نہ پیدا کر سکے۔ حالی نے مسدس لکھوایا مگر غفلت کے مارے باشندگانِ ہند نہ کھلے کے جگائے جاگے اور نہ سر سید کے جھنجھوڑنے سے بیدار ہوئے۔ بہر حال اہلِ ہنود دلشۂ غفلت سے بیدار ہوئے اور تازہ احساس نے کسی ریفارمر کی ضرورت باقی نہ رکھی۔ مگر اہلِ اسلام محتاجِ رہبر رہے۔ لیڈروں کی اُن کے یہاں بھی کوئی کمی نہیں رہی۔ لیکن تخیل کو بیدار کرنے والا کوئی شاعر نہ تھا۔ ٹھیک اُسی وقت حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی اپنے اہلِ ملک کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے سر پر بین تاج سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے۔

تھے ہم صاحب اورنگ تھے اورنگ نشیں | آج اک نان جویں کے لئے بیتاب ہیں آج
نہ حکومت ہے نہ ثروت ہے نہ دولت ہے نہ راج | اس سے پہلے تو نہ تھے ہم کبھی ایسے محتاج

گوہر و لعل سے مملو تھا خزانہ اپنا
ہائے وہ دن کہ موافق تھا زمانہ اپنا

چرخ کچھ دور نہ تھا آہِ رسا سے پہلے | عرش چھو لیتے تھے ہم دستِ دعا سے پہلے
کر چکے شکوۂ ادبار خدا سے پہلے | یہ سنا تھا کہ وہ سنتا ہے صدا سے پہلے

لیکن اُس نے بھی کبھی گریہ وزاری نہ سنی
اور پھر کس کی سنے گا جو ہماری نہ سنی

مسلم دنیا کو اسکی ضرورت تھی اور اسی کا بہترین ملکہ فطرت نے مولانا سیماب کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا یہ بات خلافِ اختصار ہوگی اگر مولانا کے جمیع اوصاف جو آپ کے ایک باکمال شاعر ہونے سے تعلق رکھتے ہیں۔ فرداً فرداً سپردِ قلم کئے جائیں اور آپ کا ممتاز کلام بہ تمام و کمال اہلِ ہند کے مطالعہ کے لئے پیش کیا جائے۔ میں نے عملاً موقع بموقع ایک معتد بہ وقت تک مختلف پہلوؤں سے ہندوستان کے مشہور اور صاحبِ کمال شعرا و ادبا کا رنگ دیکھکر مولانا موصوف کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اور ہر شخص اپنے تجربے اور قابلیت کی بنا پہ کسی نتیجہ پہ پہونچتا ہے اور اس شخص کی وہ رائے کبھی غلط نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ طرفداری۔ عناد۔ بیجا حمایت یا للّہی دشمنی سے اُس کا دل پاک ہو اور اظہارِ حقیقت نیز تحقیق و جستجو پیشِ نظر ہو۔ بایں ہمہ اتمامِ حجت کے لئے میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے الفاظ کو دشمنی اور دوستی سے تعبیر نہ کرتے ہوئے۔ اگر نقادانِ ادب اپنے ذہن و دماغ کو خطرات و خیالات۔ توہمات۔ بغض و حسد، اور رشک و رقابت کی آگ سے پاک کر کے مولانا سیماب اکبرآبادی کے کلام کو سینہ پر رکھ کر میری طرح مطالعہ فرمائیں گے تو بے شک و شبہ کمالِ نازک خیالی۔ ندرت۔ اور جدت سوزی کی حیرت انگیز شان اسی شاعرِ بے مثال میں پائیں گے۔

اور میرے اس مضمون کو حرف بحرف صحیح دیکھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ فرقہ بندی اور ذاتیات کا سوال اگر میرے معزز احباب نے ایک طرف رکھ دیا تو میری تحریر سے زیادہ مولانا کی عظمت اُن کے دل میں جاں گزیں ہوگی۔

مجھے اس کا اعتراف کرنے میں بھی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ دورِ حاضر میں ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ حضرت مولانا ظفر علیخاں۔ حضرت جوش ملیح آبادی حضرت اختر شیرانی اور حضرت چکبست آنجہانی نظم نگاری میں جس پایہ کمال کو حاصل کئے ہوئے ہیں اسکی مثال دورِ گذشتہ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی طرح تغزل میں حضرت مولانا حسرت موہانی۔ حضرت فانی بدایونی۔ حضرت احسن مارہروی حضرت قمر بدایونی۔ حضرت سائل دہلوی۔ حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت اصغر گونڈوی مرحوم۔ حضرت عزیز لکھنوی مرحوم حضرت منظر خیر آبادی مرحوم۔ حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم۔ حضرت جگر مرادآبادی حضرت صفی لکھنوی۔ اور حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم حضرت سرور جہاں آبادی اپنا جواب نہیں رکھتے یہاں یہ بیان کردینے کی ضرورت ہے کہ قدما کا رنگِ تغزل کیا باعتبارِ زبان۔ کیا باعتبارِ تخیل اور کیا باعتبارِ محاکات موجودہ رنگِ تغزل سے کہیں کم پر کیف ہے۔ یہ حضرات غزل گوئی کے پیغمبر ہیں۔ جن کا ثبوت ان کا کلام ہے۔ یہاں تک تو اقسامِ نظم کے باکمال شعرا سے تعلق تھا لیکن جن حضرات نے نثر میں نئی قوتِ بیان۔ نرالی طرزِ ادا۔ سادگی۔ اثر اور زور پیدا کیا ہے اُن کے اسمائے گرامی بھی تاریخ ادبِ اردو پر تا قیامت ثبت رہیں گے۔ میں اُن میں سے چند حضرات کے نام تحریر کرتا ہوں۔ مصورِ غم علامہ راشد الخیری مرحوم۔ مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم حضرت سید سلیمان ندوی۔ حضرت مولانا عبدالماجد صاحب بی۔ اے۔ نواب نصیر حسین صاحب خیال مرحوم۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی میرناصر علی خاں مرحوم۔ حضرت مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی مولانا تاجور نجیب آبادی۔ مولانا شرر لکھنوی مرحوم۔ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ جناب اسلم جے راجپوری۔ حضرت رشید احمد صاحب صدیقی وغیرہ ہم۔

ہمارا ہندوستان خوش قسمتی سے مغربی ترقی کی تقلید میں ہر شعبہ میں گامزن ہے۔ چنانچہ افسانہ نویسی میں بھی حضراتِ ذیل نے افسانے کی نئی دنیا کو نئے خیال۔ نئے ڈھنگ اور نئے روپ سے سجا کر عروج میں آسمانِ حقیقت تک پہونچا دیا ہے۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ حضرت نیاز فتحپوری قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے علاوہ یہ حضرات بھی آسمانِ افسانہ کے درخشاں ستارے ہیں۔ جناب منشی پریم چند مرحوم۔ جناب ایم اسلم جناب قاضی عبدالغفار خاں صاحب مرادآبادی۔ حضرت ل۔ احمد اکبرآبادی اور حضرت مولانا عبدالحلیم شرر۔ یہ امر بھی خالی از مسرت نہ ہوگا کہ ڈرامہ نویسی میں ہندوستان نے گذشتہ چوتھائی صدی کے مابین صحیح معنی میں قدم بڑھانا شروع کیا۔ اور آغا حشر کاشمیری کے وجود میں شکسپیر نے جنم لے کر ہندوستان کو محبت کا گہوارہ بنا دیا۔ اُن کے ہمرکاب حضراتِ ذیل بھی قابلِ ذکر اور قابلِ تحسین ہیں۔ مہدی حسن احسن لکھنوی۔ پنڈت بیتاب دہلوی۔ طالب بنارسی۔ اور حکیم احمد شجاع وغیرہم۔

الحمدللہ کہ ادبِ اردو نے ایسی مایۂ ناز اور صاحبِ کمال ہستیاں پیدا کیں۔ لیکن تاریخ ادبِ اردو میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ایک ہی شخص میں یہ تمام کمالات موجود ہوں۔ یعنی وہ بیک وقت ایک اعلیٰ ادیب ایک باکمال شاعر۔ ایک بہترین ناظم۔ ایک عمدہ تاریخ گو۔ ایک اچھا ڈرامہ نویس۔ ایک قابلِ تحسین مضمون نگار۔ ایک حیرت انگیز افسانہ ساز زبان کا دھنی۔ اصلاح کا استاد۔ زود گوئی میں فرد۔ اجتہاد میں یکتائے عصر۔ قومی عروج کا حامی۔ خوشامد و تملق سے متبرا۔ ابداعیات میں [illegible] کا ہمنوا۔ فلسفہ میں افلاطون کی زندہ یادگار۔ موعظمت میں سعدی کا پیرو۔ فرد میں فردوسی کی طرح فرد۔ [illegible] میں مولانا روم کی [illegible]

تازہ کرنے والا۔ غزل میں میر کی سادگی کا وارث۔ غالب کے فلسفے کا مالک داغ کی فصاحت کا حامل اور تاریخ گوئی میں مومن کا ہمپایہ ہو۔ اس کا مصداق ہمارا نیا مجدد اور آگرہ اسکول کا موسسِ اول **سیماب اکبرآبادی** ہے یہ جمیع اوصاف اُس کی ذاتِ واحد میں پائے جاتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ثبوتِ دعوے کے لئے ہر صنفِ کلام میں آپ کو جو کمال حاصل ہے۔ وہ علٰحدہ علٰحدہ مختصراً بیان کر دیا جائے۔

تغزل۔ میر کے بعد بوسیدہ شاہراہ سے ہٹ کر غالب نے جو حسن اتفاق سے آگرہ اسکول ہی کے ایک فردِ اعلیٰ تھے۔ غزل گوئی کا نیا اسلوب پیدا کیا۔ عام تراکیب کو سلام کیا۔ حسن ترتیب، شوکت الفاظ، چست بندش وغیرہ سے مفہوم شعر کو بلند کیا اور فلسفہ کو مکمل طریقہ سے شاعری میں جگہ دی۔ اردو شاعری پچھلی تین صدیوں سے ہر صدی میں ایک مجدد پیدا کرتی رہی ہے۔ گیارہویں صدی کا مایۂ ناز مجددِ فن میر اکبرآبادی تھا۔ بارہویں صدی کا غالب علیٰ کل غالب اکبرآبادی تھا اور چودھویں صدی کا فخرِ روزگار مجدد ثالث سیماب اکبرآبادی ہے۔ جس کے دیوان غزلیات کے متعلق ہندوستان کے مشاہیر ادبا شعرا اور اہلِ قلم حضرات کی صائب رائیں۔ تنقید و تنقیح کی صورت میں اکثر و بیشتر صفحۂ قرطاس پر رونما ہوتی رہی ہیں۔ سیکڑوں اور ہزاروں رایوں سے صرف چند ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

(۱)

مدیر تیج مورخہ ۷ / اپریل کے "تیج ویکلی" میں فرماتے ہیں

"حضرت سیماب کی ذات کو تعریف کی ضرورت ہے اور نہ "کلیم عجم" تبصرہ کا محتاج ہے۔ ملک کے بہت کم ایسے ادبی رسائل ہوں گے جن میں سیماب کا کلام عزت و افتخار کے ساتھ شائع نہ کیا گیا ہو۔ اور ہندوستان میں کوئی ایسا شاندار و وقیع آل انڈیا مشاعرہ نہ ہوا ہوگا جس میں حضرتِ سیماب کو زحمتِ شرکت پر مجبور نہ کیا گیا ہو۔ اس لئے سیماب کے کلامِ بلاغت نظام کی خوبی۔ تخئیل کی پرواز اور معنی آفرینی سے صرف شعر و ادب کا حلقہ ہی نہیں بلکہ تمام قدر دانانِ سخن اچھی طرح واقف ہیں۔"

(۲)

از "منادی" دہلی ۱۳ / مارچ ۳۶ء

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی فرماتے ہیں "شیخ عاشق حسین سیماب اکبرآبادی فقط رسمی شاعر ہی نہیں بلکہ فنِ شعر کے محاسن سے خبردار اور اصنافِ سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ وہ شاعر ہی نہیں بلکہ باغ جیسے باکمال شاعر بنانے بھی ہیں۔ "کلیم عجم" اُن کا مجموعۂ کلام ہے۔ سیماب صاحب ہندوستان کے مشہور استادوں میں سے ہیں اور اُن کے کلام کا تعارف اتنا ہی کافی ہے کہ یہ سیماب کا کلام ہے"

(۳)

از روزنامہ "وحدت" دہلی - ۱۴ / مئی ۳۶ء

ایڈیٹر صاحب "وحدت" نے "کلیم عجم" پر ریویو کرتے ہوئے لکھا کہ "کلام میں از اول تا آخر بلندیِ تخئیل۔ ندرتِ فکر، فلسفۂ حسن و عشق اور محسوسات کی لطافت موجود ہے۔ سیماب صاحب نے بعض اشعار میں ایسے بلند حکیمانہ اور صوفیانہ جذبات کا اظہار کیا ہے کہ جن کی مثال مشکل سے کسی دوسری زبان کی شاعری میں مل سکتی ہے"

(۴)

از ماہنامہ "کلیم" دہلی۔ مارچ ۳۶ء

حضرت جوش ملیح آبادی مدیر "کلیم" اس طرح اپنے رسالے میں فرماتے ہیں۔ "حضرت سیماب کا کلام کسی خاص تعارف کا محتاج نہیں۔ کلام کے سرسری مطالعہ سے صاف نظر آرہا ہے کہ جوں جوں شاعر عمر رسیدہ ہوتا جاتا ہے اُس کی بلندیِ فکر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور استادانہ پختگی ہر شعر میں جلوہ فرما نظر آتی ہے۔ بعض شعر

ایسا ہوتا ہے کہ ناظر جھوم جاتا ہے۔کبھی دل پکڑ کر رہ جاتا ہے۔ اور کبھی مدہوش ہو جاتا ہے۔ زبانِ سیماب کا کیا کہنا۔ اُردوئے معلٰی کے مالک ہیں۔

(۵)

از ماہنامہ " ادبِ لطیف" لاہور افسانہ ایڈیشن مئی و جون ۳۶ء

محترم مدیر" ادبِ لطیف" کی رائے ہے کہ" مولانا سیماب اکبرآبادی موجودہ دور کے بہت بلند پایہ اور مسلم الثبوت شاعر ہیں۔ عرصے سے ملک کی وسعتوں میں آپ کی شاعری کا آوازہ گونج رہا ہے "کلیم عجم" آپ کے خطباتِ شاعری اور غزلیات کا مجموعہ ہے۔ دنیائے اردو میں مولانا سیماب سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مشاعروں میں خطبۂ شاعری پڑھنے کی رسم ڈالی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ رسم اردو شاعری کے حق میں بہت فائدہ بخش ہے۔ غزلیات میں پختگی۔علوئے تخیل۔ جدتِ تراکیب۔ رنگین نگارش الغرض وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو کامیاب غزل میں ہونی چاہئیں"۔

(۶)

از رسالہ" جامعہ" دہلی دسمبر ۳۶ء

مدیر" جامعہ" یوں رقمطراز ہیں۔" آپ کی غزلوں کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ کی شاعری کی صحیح ترجمان ہیں۔ سیماب ایک پختہ کار اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اور اس مشق کی بدولت آپ کو تمام اصنافِ سخن پر پوری قدرت حاصل ہے۔اس کے علاوہ آپ کو شعر گوئی کے لئے کسی خارجی اثر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ آپ اُس ساز کی طرح ہیں جو ہمیشہ نغموں سے معمور رہتا ہے۔ جہاں چھیڑ دیں اُس میں سے موسیقی نکلی۔ آپ کی غزلوں میں بے ساختگی ہے۔ زندگی ہے روح ہے۔ کشش ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سچ مچ سیماب بول رہے ہیں"۔

(۷)

از ماہنامہ زمانہ کانپور۔جون ۳۶ء

رائے صاحب منشی دیا نرائن صاحب نگم بی۔اے زمانہ میں اسطرح فرماتے ہیں" مولانا کی شاعری پر ہم اس سے قبل کارامروز" کے سلسلے میں ریویو کرچکے ہیں۔اب مزید قلم فرسائی کی ضرورت نہیں ہے۔آپ کے پختہ کار۔کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت آپ کا کلام تعریف سے مستغنی ہے

(۸)

از ماہنامہ" شاہکار" لاہور جولائی ۳۶ء

حضرت مولانا تاجور نجیب آبادی یوں خامہ فرسائی فرماتے ہیں "بلاشک" کلیم عجم" اِس پذیرائی کا مستحق ہے کہ اُسے ہندوستان کی یونیورسٹیاں اپنے اردو نصاب میں شامل کریں۔صوبہ کی ٹکسٹ بک کمیٹی کو اس پر اول درجہ کا انعام دیکر مصنف ممدوح کی قدرشناسی کا ثبوت دینا چاہئے۔

سیماب کی شاعرانہ خصوصیات کے متعلق کچھ کہنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ اُن کے کلام سے دنیائے اردو اچھی طرح روشناس ہوچکی ہے۔ اُنکی شاعری زلف و خال، مسی اور آرسی کی فرسودہ اور بیہودہ مدح سرائیوں سے پاک اور ادبِ عالیہ کا دلکش نمونہ قرار دی جاسکتی ہے۔ وہ اردو شاعری میں ہادیانہ حیثیت رکھتے ہیں۔اُن کے کلام کو اُستادانہ قدرتِ بیان۔پختہ کاری و پختہ مشقی، بلند اور خرد افروز خیالات، پاکیزہ اور گداز آفریں نفیس جذبات نے ممتاز بنا دیا ہے۔ سیاسی حیثیت سے وہ اونچے درجے کے قوم پرورانہ خیالات نظم کرتے ہیں مختصر یہ کہ اُردو زبان کے پہلے مرکز (اکبرآباد) کے اس نادر سحر کار نے اپنے تاریخی شہر کی روایات کو تازہ کردیا ہے"۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے مولانا سیماب کے پایۂ تغزل کی بلندی ثابت ہو گئی

نظم نگاری یہ وہ میدان ہے جس میں گامزن ہونے والے صنفِ شاعری میں دورِ حاضر کے مذاق اور ضرورت کے موافق بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں پہونچکر مولانا کی جدّتِ طبع نے اہلِ ہند کو جو پیام دیا ہے اُس کا زندہ ثبوت "کارِ امروز" ہے۔ جس نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی "بانگِ درا" کے بعد ملک میں ہر طبقہ اور ہر قوم کے دلوں میں نئی امنگیں نئے ولولے اور نئی روح پھونکدی۔ "کارِ امروز" کو موجودہ دور میں جس قدر قبولیت حاصل ہوئی۔ وہ ماہنامہ "شاعر" کے "کارِ امروز" نمبر سے جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا شمیم گل کی طرح گلستانِ ہند میں اُفقِ خیال و شمال پر عطر بیزی کر رہی ہے۔ جمیع اصنافِ نظم پر جس قدر زود گوئی اور قادر الکلامی کے ساتھ مولانا سیماب قلم اٹھا سکتے ہیں۔ اُس کی مثال نظر نہیں آتی۔ چنانچہ آپ نے "کارِ امروز" میں ہر قسم کی نظمیں اس پیرایہ اور ندرت سے اہلِ ملک کے لئے پیش کی ہیں کہ ایک مدبّر ایک سیاست داں۔ ایک فلسفی، ایک قوتِ متخیلہ کا دلدادہ، تدبیرِ منزل کا متلاشی تمدن کا جویا۔ محاکات کا خوگر۔ تخیّل و تخئیل کا بندہ۔ مناظرِ قدرت کا دلدادہ مشاہدات کا طلب گار۔ حسن و عشق کا پجاری۔ صلح کل اور بین الاقوامی اتحاد کا حامی، اپنے مذاق، اپنے معیار، اپنی تعلیم، اپنی تہذیب اور تربیت کے لئے مولانا کے اس شاہکار کو دلیلِ راہ اور خضرِ منزل بنا کر ہر گونہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

مضمون نگاری یہاں قلم کو جنبش دیتے ہوئے تجربے کی انتہا نہیں رہتی۔ سیاست داں اہلِ شمشیر نہیں ہوتے شاعر ناثر نہیں ہوتا، ناثر ناظم نہیں ہوتا، ایسے فرزندِ مادرِ گیتی نے شاذ ہی پیدا کئے ہیں مستثنیات میں تیغ سخن کی مثال ضرور ملتی ہے۔ وہ بھی رزم میں آکر درماندہ ہو جاتے ہیں لیکن ہمارا ہیرو لڑائی کے نقشے اور عیش کی محفلیں اس خوبی کے ساتھ آراستہ کرتا ہے کہ دیکھنے والے عالمِ محویت میں دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ نشہ اُن کے سر سے نہ اترے۔ ادبی مضامین کے ثبوت میں "خطباتِ شاعر" موجود ہیں۔ جن پر ملک آج تک سر دھن رہا ہے۔ جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک جاویدتا ہراہ ہیں۔ مولانا نے نثر میں تقریباً دو سو سے زیادہ کتابیں سپردِ قلم کی ہیں۔ جن میں زندگی کے ہر فلسفہ کے ساز کو اس خوبی سے چھیڑا ہے کہ ماں کی گود سے لے کر زندگی کی آخری منزل تک غرض ہر دور کے لئے مفید، سبق آموز، تربیت کن، تعلیم دہ، حوصلہ زا، ولولہ انگیز، تدبّر آفریں، نصیحت خیز، تسلّی بخش، روح افزا، سلیقہ انگیز، امورِ خانہ داری سے خبردار کرنے والے، فرائض سے آگاہی بخشنے والے، مخلوقِ خدا کی محبت پیدا کرنے والے، بگڑوں کو بنانے والے اصول ایسی سادہ زبان، ایسے لطیف پیرایہ، اور ایسے انوکھے طرز میں بیان کئے ہیں کہ الفاظ کا ایک نیا ذخیرہ ترقی کا ایک نیا سبق۔ کامیابی کا ایک نیا گُر، فکر و غور کا ایک دلخواہ خزانہ عورتوں، بچّوں، ضعیف العمر انسانوں اور نوجوانوں کے لئے موجود ہے مثال کے طور پر مولانا کی تصانیفِ نثر میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ نوجوانوں کے لئے "آفتابِ زندگی" "شبابِ زندگی"۔ "لاڈلا بیٹا" وغیرہ وغیرہ بچوں کیلئے لوری نامہ، چڑیا چڑے کی کہانی، ستّرہ کہانیاں، ادبی موتی، چہار حصّے وغیرہ وغیرہ۔ عورتوں کے لئے "زنانہ لبتہ"، جڑاؤ جھپا کلی، نیا باورچی خانہ، معلمہ، گھڑ سہیلی، وغیرہ وغیرہ، بوڑھوں کے لئے سوانحِ خواجہ غریب نواز، سیرۃ الحسین حالاتِ حالی۔ چراغِ داغ۔ الہام منظوم ترجمہ مثنوی مولانا روم، عزیز الخطب ہشت بہشت وغیرہ۔

فسانہ نگاری تقریباً ہر رسالہ اور ہر اخبار آپ کے افسانوں کا حامل ہے۔ آپ کے افسانوں کا رنگ اس قدر مضبوط اور اس قدر دلآویز ہے کہ ملک آپ کے ہر افسانہ پر داد تحسین دئے بغیر نہیں رہتا آپ اپنی جدتِ طبع اور اختراعی نوکوں کو یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے پلاٹ میں باہمی ربط، زبان کی عمدگی، واقعہ نگاری کے پہلو، تخئیل کا زور الفاظ کی مناسبت اور نفسیات کی تحلیل اس عمدگی سے افسانوں میں نظر آتی ہے کہ ہر افسانہ کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ "اساطیر" کے نام سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

ڈرامہ نگاری

اس مضمون کو لکھتے وقت دو حسرتوں کا شکار بننا پڑتا ہے۔ پہلی تو یہ کہ اگر آغا حشر کاشمیری مرحوم زندہ ہوتے تو مولانا کے ڈراموں کے متعلق اُن ہی کا تجربہ کار قلم کچھ لکھتا اور زمانہ زیادہ حقیقت آشنا ہو جاتا۔ مولانا کے ایک ڈرامہ "کرشن کنول" کے کسی حصے کو سننے کے بعد مرحوم نے یہ الفاظ ادا فرمائے تھے۔ "مولانا مجھے ڈر ہے کہ آپ ہم لوگوں کی روزی نہ چھین لیں۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے آغا حشر ہی بول رہا ہے۔" اب تک آپ گیارہ ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ جن میں سے بیشتر کلکتہ اور بمبئی میں اسٹیج بھی ہو چکے ہیں اور کچھ شائع بھی ہو چکے ہیں ابھی حال ہی میں آپ نے ایک فلمی ڈرامہ تصنیف فرمایا ہے۔ جسے کئی مشہور فلم کمپنیاں مانگ رہی ہیں۔ اور وہ جلد پردۂ فلم پر آنے والا ہے۔ میری دوسری حسرت میری وہ آرزو ہے جو مولانا کی عدیم الفرصتی کا شکار ہے مولانا جیسا کہ ہر صاحب کمال اپنے جوہر کمال کی بنا پر گوشۂ قناعت اختیار کرکے استغنا کا شکار ہو جاتا ہے۔ مولانا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور اس طرف حسب ضرورتِ ملک توجہ نہیں فرماتے۔ ورنہ آج ہندوستان میں بھی انگلستان کی سی بیداری آپ کے ڈراموں کے ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور آغا حشر مرحوم کے برپا کئے ہوئے محشر میں اور نئے فتنوں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

ترجمہ کی اہلیت

مولانا کی قابلیت زبانِ اردو ہی تک محدود نہیں۔ آپ ایک زبردست لائبریری کے مالک ہیں۔ آپ کی علمی قابلیت زبانِ انگریزی سے کماحقہ آشنا ہے۔ آپ اکثر ٹینیسن۔ بائرن۔ گولڈسمتھ۔ اور شیکسپیئر کی تصانیف کا مطالعہ فرماتے رہتے ہیں۔ فارسی کے ہر مشہور شاعر مثلاً نظامی گنجوی۔ فردوسی۔ سعدی۔ خاقانی۔ انوری۔ عرفی۔ نظیری۔ وغیرہ وغیرہ کے خیالات اور کمالات سے برابر مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔ عربی میں آپ کو کافی دسترس حاصل ہے۔ عربی ادب کی مشہور کتابیں آپ کی نگاہ اور مطالعہ میں رہتی ہیں۔ آپ نے مولانا روم کی مثنوی کے چھ دفتر اس حسن و خوبی کے ساتھ شاعرانہ نکات اور رموز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے منظوم ترجمہ فرمائے ہیں کہ ملک اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اس کے علاوہ عربی خطباتِ عزیزیہ کا منظوم ترجمہ فطرت کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو مسجدوں میں عوام و خواص کی نصیحت کے لئے خطبے کی صورت میں ترتیب کر دیا گیا ہے۔

سیاست

شاعر کبھی کبھی کچھ کہتا ہے۔ اور ملک اُسکی حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد اُس پر عمل پیرا ہوتا ہے لیکن مولانا یہاں بھی فطرت کے غیر معمولی عطا کردہ عطیے کی بدولت ممتاز اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں۔ آگرہ کو جریدۂ "تاج" سے زینت بخشتے ہیں۔ اور اس توانائی و اہتمام کے ساتھ کہ ملک کو آپ کے تدبر کا لوہا ماننا پڑتا ہے ہندوستان کا مشہور ہفتہ وار اخبار "ریاست" ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار بطور پیش کش دیتے ہوئے۔ آپ کے قلم سے ایک سال تک سیاسی گتھیاں سلجھاتا رہتا ہے۔ "مدینہ" بجنور اور "زمیندار" لاہور بھی آپ کو مسندِ سیاست پر جگہ دینے کے لئے یاد فرماتے رہے ہیں۔ تاج کے ذریعہ مولانا نے جو منظوم پیغامات وقتاً فوقتاً دئے ہیں وہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ گوئی

یہ تو مسلم الثبوت امر ہے کہ فنِ تاریخ گوئی کے معاملے میں قدرت نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے اس نادر فن کا بیش بہا ملکہ مخصوص اور محدود ہستیوں ہی کی طبیعتوں میں ودیعت کیا ہے۔ چنانچہ قدما میں سے حکیم مومن خاں دہلوی قابلِ ذکر ہیں۔ مابعد کوئی ہستی ایسی نمایاں نہیں ہوئی جس نے اس فن میں شہرت عام حاصل کی ہو۔ البتہ سرزمین لکھنؤ ضرور اس فن کو راس آئی اور لیکن وہ ہستیاں اُس خاک سے اٹھتی رہیں۔ لیکن فطرت اپنی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی اور ایک معتد بہ مدت تک پس پردہ رہ کر درخشاں چہرہ کہیں نہ کہیں نمود کے ساتھ وا کر ہی دیتی ہے۔ تجدید جو فطرت کا ایک لازمی فعل ہے۔ ہر فن اور ہر شعبہ میں رونما ہوتا رہتا ہے

دہلی اور لکھنؤ کے بعد تناسب تقسیم نعمت کا خیال رکھتے ہوئے فطرت نے اکبر آباد کو یا تو اس خیال سے کہ اردو ادب کا نمایاں اسکول رہا ہے یا تکمیل فن کے لحاظ سے مولانا ممدوح کو فن تاریخ گوئی میں دست رس کامل عطا فرمائی۔ آپ مختصر سے مختصر مگر دلچسپ، زود فہم۔ فصیح۔ بلیغ اور سریع التاثیر الفاظ میں تاریخ پیدائش۔ تاریخ وفات۔ تاریخ تعمیر مکان و باغات وغیرہ۔ عربی فارسی اور اردو میں اس قدر جلد، حسب منشا اور حیرت انگیز لکھ کر دیتے ہیں کہ تحیر کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جس کا ہر لفظ پڑھنے کے بعد انسان اپنا دل تھام لیتا ہے۔

آپ کے قلم سے ہزارہا تاریخیں نکل چکی ہیں۔ آپ کی تاریخ کے مقابلہ میں ذی علم، امرا۔ عوام غرض ہر طبقہ کے لوگ دوسری تاریخوں کی وقعت دل سے نکال دیتے ہیں۔ یہ فن اس اعتبار سے انتہائی مشکل ہے کہ طبیعت کو مخصوص دن محدود سال۔ اور خاص مقصد سے وابستہ کر کے مادہ تاریخ نکالنا پڑتا ہے۔ لیکن "ایں سعادت بہ زور بازو نیست" فطرت نے اس فن کو بھی مولانا کی اکملیت اور تجدید سے نوازا، مولانا کے فن کی شہادت کے لئے زندہ انسان تو درکنار مردے بھی بول اٹھیں گے۔ انسان کا دل تو کیا پتھر کا سینہ بھی نقش کالحجر بن کر ابھرے ہوئے الفاظ میں شہر خموشاں کے چپے چپے سے سر اٹھا کر گواہی دینے کے لئے سینہ سپر نظر آئے گا۔ ہندوستان کے کسی بڑے شہر اور قصبے کا قبرستان آپ بطور امتحان جا کر دیکھئے۔ وہاں مولانا کی تاریخیں آپ کو ضرور ملیں گی۔

زُودگوئی شاعری کا ذوقِ وجدانی، فطرت کا مخصوص عطیہ ہے اکتسابی کاوشیں یہاں کارفرما تو ضرور رہوتی ہیں لیکن کہنے اور سمجھنے کو، ورنہ رودکی ہو یا اعشیٰ۔ ہومر ہو یا ورجل یہ سب شاعر قدرت نے گھڑ کر بھیجے تھے۔ دنیا کو ان کی تعمیر کا کوئی فخر حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم کا زور اور ان کی موجزن طبع دریائے معانی کی گہرائیوں میں غواصی کر کے نت نئے گوہر ناسفتہ چشم زدن میں سطح ساحل پہ پھینکتی رہتی ہے۔ زود گوئی کمال شاعری کا ایک ثبوت ہے اور مولانا موصوف کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اس معاملہ میں دنیا کا ریکارڈ توڑ رہے ہیں۔ تو دور از حقیقت نہ ہوگا۔ مولانا تا عمر اگر چاہیں تو بجائے نثر کے نظم میں گفتگو کا انتظام فرما سکتے ہیں۔ مولانا ممدوح کو شعلۂ فکر سے صاعقۂ نظم بنانے میں اتنی دیر بھی نہیں لگتی جتنی کہ خیرگیٔ نگاہ کو برق جہندہ کے اثر سے آزاد ہونے میں لگتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب وہ ناول یا افسانے لکھتے وقت، مولانا حسب تقاضائے موقع غزل ہو یا ٹھمری۔ دادرا ہو یا داسوخت فضائے قرطاس پہ اس طرح ثبت کرتے چلے جاتے ہیں جس طرح ایک خوش لحن حافظ ماہِ صیام میں فضائے دہر کو بلا تشابہ آیاتِ قرآنی کے نور سے منور کرتا جاتا ہے۔ یا ایک قابل برہمن ہنومان جی کی مقدس گڑھی میں بیٹھ کر عقیدت مندی کے پھول بھگوت گیتا یا راماین کے باغ سے آنِ واحد میں چن چن کر ان کی متبرک اور پاک روح پر نچھاور کرتا رہتا ہے۔ کمالِ زود گوئی یہ ہے کہ اس طرح جو آمد ہوتی ہے وہ اُس آورد سے جو ہزار سعیٔ پیہم کے بعد پیش کی گئی ہو بہتر ہوتی ہے مولانا سیماب جلد سے جلد بھی جو کہتے اور لکھتے ہیں وہ اُس معیار اور پائے کا کلام ہوتا ہے۔ جو نظر ثانی سے پاک تحریف سے مبرا اور تحسین سے مملو ہوتا ہے۔ جہاں محاکات کا اعلیٰ نمونہ اور تخییل کا بہترین پہلو ہمرکابی کا فخر ظاہر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ عطیہ خداداد ہے۔ جو قدرت کی جانب سے آپ کو عطا فرمایا گیا ہے۔ اور دوردراز عظیم الشان مشاعروں میں شرکت عملی اس صورت سے نمودار ہوتی ہے کہ اُس شہر میں قیام گاہ پہ پہونچنے کے بعد آغاز مشاعرہ سے کچھ دیر پہلے طرح پر غزل کہنا شروع کرتے ہیں۔ گویا کسی حفظ کردہ مضمون کو تحریر کی صورت میں لا رہے ہیں۔ قبل از وقت غزل کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ٹرین کی حرکت کے ساتھ ساتھ مضمون غزل کو بھی حرکت دی جائے اور ان دونوں حرکتوں کی ہم آہنگی سے وہ تحریک

غزل کی صورت میں پیش کی جائے جو تغزّل میں نُدرت، بلند حوصلگی، متانت تصوّف اور اخلاق وغیرہ کا بہترین درس دے۔

قوّتِ اصلاح

اصلاح جزوِ کمال ہے اور اہلِ کمال کا شعارِ خاص۔ ہر اہلِ کمال کی نگاہ عیب پر پڑتی ہے۔ وہ چشم زدن میں محاسن اور عیوب علیحدہ علیحدہ نکال کر عیوب کی جگہ محاسن بھر دیتا ہے۔ اور جس طرح ایک باکمال مصوّر تصویر کے ہر رخ کو محاسن سے آراستہ کر کے تصویر کو تصویر بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک باکمال شاعر آنِ واحد میں شعر کے محاسن اور عیوب پر نگاہ ڈالتی ہوئی قوتِ متخیلہ کا صحیح اندازہ کر لیتا ہے۔ اور اگر کوئی شعر بغرضِ اصلاح اُس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ فوراً ہی تخیّل کا اعلیٰ ترین پہلو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہت معمولی ردّ و بدل کے بعد شعر کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا تا ہے۔ لیکن قوتِ اصلاح ہر شاعر میں نہیں پائی جاتی

مولانا سیماب اہلِ کمال سے ہیں فطرتاً آپ کی قوتِ اصلاح اعلیٰ پائے کی ہے۔ آپ ادق سے ادق اور سنگلاخ سے سنگلاخ زمین کے اشعار پر بھی اس خوبی کے ساتھ اصلاح دیتے ہیں کہ کہنے والا اپنے حقیقی مطلب کو اُس سے زیادہ اچھے اور خوش اسلوب اندازِ بیان میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ آپ بڑی سے بڑی غزل کو بھی اس قدر تیزی کے ساتھ اصلاح دے کر واپس فرماتے ہیں کہ کوئی خامی کسی نوع سے باقی نہیں رہتی۔ آپکی اصلاح، آپ کی معلوماتِ علمی اور ذوقِ فطری کی ترجمان ہے۔ آپ اصلاح کے اُستاد اور زبان کے دھنی ہیں۔ دنیا میں ایسے بہت سے شاعر موجود ہیں جو آپ کی قوتِ اصلاح کے بھروسہ پر دورانِ مشاعرہ میں اصلاح کیلئے غزل پیش کر دیتے ہیں۔ اور فوراً ہی حسب دلخواہ ایک مکمّل اور بے عیب غزل کے مالک ہو جاتے ہیں۔ آپ کی اصلاح کے ہر ہر لفظ پر لوگ سر دھنتے ہیں۔ قوّتِ اصلاح کا کمال آپ کو اُستاد داغ مرحوم کا ایک روحانی عطیہ ہے۔

خوفِ طوالت اور طلبِ اختصار، ولولۂ جوش کے دشمن ہیں۔ جوشِ صداقت کی وسعتیں بحرِ ناپیدا کنار کے سواحل سے وسیع تر ہیں صبر وسعتِ ظرف کے معیار سے ٹکرانے والی شے پر اکتفا کرنے کا نام ہے اور دوسروں کے جذبات کو رواداری کے احترام سے مزیّن کرتا ہے۔ میں بھی اسی صبر کا شکار ہو کر روائی قلم کو خاموشی کے دریا میں غوطہ دینے سے پہلے اس قدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ تلاشِ مقصد اور تلاشِ حقیقت سے مدد لیتے ہوئے شعرائے ہند اور اہلِ آرا ملاحظہ فرمائیں کہ تحمید کا بندہ۔ نعت کا شیدائی۔ اصلاح کا دھنی۔ زود گوئی کا مالک۔ جدید رنگِ تغزل کا رہبر۔ موجودہ نظم گوئی کا بلند پرواز ہادی، جمیع اوصافِ شاعری میں یکتائے روزگار۔ سادہ مزاج مسکین طبع۔ روشن خیال، حقیقی مصلح، کامل اُستاد۔ واقفیتِ عامہ سے ماہر۔ رسالوں کا سردار، بہترین نثّار، مولانا سیماب اکبر آبادی کو اطمینانِ قلب اور حقیقتِ نفسِ امری کے زیرِ تحت پر کھا جائے تو اُنکی ذات اُس سے کہیں زیادہ مکمّل دارفع نظر آئے گی جو دوستوں کو حسب درجاتِ محبت نظر آیا کرتی ہے۔ یا دشمنوں کو حسب درکاتِ حسد و تعصب محسوس ہوتی ہے۔ غنیمت ہے یہ وقت اور یہ زمانہ کہ ہماری آسودگیٔ ادب کے لئے ایک ایسی ہستی فیض رساں ہم میں موجود ہے۔ قابلِ رشک ہیں وہ لوگ جو اِس سے فیض پا رہے ہیں اور افسوس ہے اُن پر جو اِس کی ذات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

سیماب صاحب اور آگرہ اسکول

(ایک بے تکلف مضمون)

از ——— جناب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری

"میرے محترم جناب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری نے جو مضمون آگرہ اسکول نمبر کے لئے مرحمت فرمایا ہے۔ میں اُسے شکریہ کے ساتھ بہ تمام کمال درج کر رہا ہوں۔ قادری صاحب اپنی مدت العمر میں ادارہ ہائے شعر و ادب کے کئی انقلاب دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے قدیم اسلوب بیان سے انھیں چونکنا ہی چاہئے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اُن کے تنقیدی اشارات کا جواب تحت الصفحہ دیدیا ہے۔ اس کے لئے میں اُن سے معافی کا آرزومند ہوں۔ "آگرہ اسکول" کے متعلق اُن کے اختلافی نظریات کا جواب آپ کو "تعارف" میں ملے گا۔ جسے عام اختلاف رائے کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے یہ مضمون وصول ہونے سے پہلے ہی مرتب کر لیا تھا۔ اختلاف رائے یا اختلافِ خیال کوئی بری چیز نہیں۔ لیکن اگر واضع کے نقطۂ خیال تک رسائی حاصل کر لی جائے تو پھر موضوع کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ (ایڈیٹر)

سیماب صاحب کو بڑا اصرار ہے کہ آگرہ کا ایک الگ شاعرانہ اسکول یا ادارۂ فکر مانا جائے۔ مجھے اُن کی یہ ادا ایک اور وجہ سے بہت پسند ہے۔ سیماب صاحب اپنے وطن کے عاشق ہیں، صرف نام کے عاشق نہیں، کام کے عاشق، اور میرا یہ مسلک ہے کہ

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے   مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

سیماب صاحب میں لاکھ باتوں کی ایک بات یہی ہے کہ وہ اپنے اکبرآباد کو ہر حیثیت سے اکبر و اعظم ممتاز و سرفراز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور صرف دیکھنا نہیں، بنانا چاہتے ہیں۔ خوش قسمتی سے سیماب صاحب نے آگرہ کے دورِ شعرا کی آخری بہار دیکھی ہے۔ اسکی یاد اُن کے دل پر نقش ہے۔ اور وہ پھر گردشِ ایام کو پیچھے کیطرف لوٹانا چاہتے ہیں۔ یہ خواہش و کوشش کس قدر ممدوح و محمود ہے!

رہا آگرہ اسکول کا ماننا نہ ماننا، اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ کو پیش کرنا اور سنوانا اس زمانہ میں غیر ضروری ہے یہ تو اگلے زمانہ کی باتیں تھیں جب اُردو شاعری شروع ہوئی تو لکھنؤ کی بھی کوئی ہستی و حیثیت نہ تھی دہلی کی سلطنت تھی، دہلی کی زبان، دہلی کی شاعری، یہی حال آگرہ کا تھا کہ اُردو شاعری کو رواجِ عام سے پہلے مرکزِ سلطنت آگرہ سے دہلی کو منتقل ہو چکا تھا اس لئے آگرہ کی شاعر بھی دہلی ہی جا رہی۔ بلکہ آگرہ میں پیدا ہوئی اور دہلی میں جا کر شاعر بنے، میر و غالب اکبرآبادی ہو کر اپنے آپ کو دہلوی کہا اور کہلوایا میر صاحب کا ارشاد مشہور ہے۔

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب   ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

پھر جب لکھنؤ میں نوابی قائم ہوئی اور دہلی کے شاعر میر و سودا وغیرہ وہاں گئے تو وہاں بھی طرز دہلی ہی کا اتباع شروع ہوا۔ لیکن جرأت و انشا نے رنگ بدلنا شروع کر دیا، اور اُن کے بعد ناسخ و آتش اور اُن کے شاگردوں نے دہلی کے طرز سے بالکل الگ انداز پیدا کر لیا۔ ایسا کہ دہلی و لکھنؤ کا فرق نمایاں نظر آنے لگا۔ اس امتیاز کو ظاہر کرنے کی ضرورت سے دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے نام نکلے ہیں۔

رفتہ رفتہ لکھنوی رنگِ تخیل و طرزِ ادا نے دہلوی شاعروں کو بھی متاثر کیا۔ اور امیر لکھنوی کے ساتھ داغ دہلوی بھی اسی رنگ میں لکھنے لگے۔ تاہم داغ کے یہاں "لکھنویت" پر "دہلویت" غالب رہی۔ یہ فرق ناسخ

ے یہ شعر قطعہ کے دو الگ الگ مصرعوں سے مرکب ہے۔ اختصار کے سبب سے یہ ترکیب دیدی ہے۔

کے وقت سے امیر و داغ تک رہا۔ یا اب ان کے پیرانہ سال تلامذہ جلیل، نوح سائل وغیرہ میں ہے۔ ورنہ اب لکھنؤ کے کبیرالسن شعرا، آرزو لکھنوی، محشر لکھنوی نے بھی رندی و بیباکی کو اپنی غزل سے خارج کر دیا ہے۔

اور موجودہ صدی کے شعرانے تو لکھنویت سے بیزاری کیا معنی دہلویت قدیم سے بھی زیادہ متانت اور شائستگی اختیار کر لی ہے۔ یہاں شعرا سے مراد اساتذہ و مشاہیر اور ارباب طرز ہیں۔ عوام کا ذکر نہیں۔ اب مضمون تخئیل و جذبات کے لحاظ سے لکھنؤ کا شاعر بھی "لکھنوی" نہیں رہا۔ زبان و محاورہ کا فرق البتہ فطری ہے۔ وہ ہے اور رہے گا۔ ورنہ حسرت موہانی عزیز لکھنوی۔ فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، اقبال لاہوری حفیظ جالندھری۔ وغیرہ وغیرہ یوپی۔ پنجاب، دکن، بنگال، بہار، تمام ممالک کے شعرا اصلاحِ غزل میں متحد ہو گئے ہیں۔

تو جب یہ برسوں اور قرنوں کا فرق مٹ رہا ہے اور دہلی اسکول و لکھنؤ اسکول کے ناموں کی بھی موجودہ غزل کے لئے ضرورت نہیں رہی تو آگرہ اسکول کو ایجاد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور یہ اُن سے الگ کونسا اسکول ہے؟ اس الگ ہونے کی تاویل سیماب صاحب نے یوں کی ہے کہ "خطباتِ شاعری" صفحہ ۱۰۵ پر تحریر فرماتے ہیں۔

تعلیم یافتہ اور ترقی مآب طبقوں میں دہلی و لکھنؤ کے تصنع و تکلف کی زیادہ قدر نہ رہی۔ کچھ افراد ملک میں ایسے پیدا ہو گئے جو ان دونوں اسکولوں سے الگ ایک جدید رنگ کے علمبردار ہوئے یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے بقدرِ معتدل پیدا ہوا تھا۔ "آگرہ اسکول" بھی آج اسی رنگ کا متبع و مؤید ہے۔

لیکن اوّل تو جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں یہ امتزاجی و معتدل رنگِ تغزل آجکل تمام ہندوستان کی غزل پر چھایا ہوا ہے۔ (یاد رہے کہ "تمام" سے عوام کو میں پہلے خارج کر چکا ہوں) آگرہ کی خصوصیت نہیں۔ دوسرے تقلید داغ کو "آگرہ اسکول" نہیں کہہ سکتے۔ صرف جدید اسکول کہنا چاہئے۔ اس کے مقلدین میں آگرہ و لاہور و حیدرآباد وغیرہ سب ہیں۔ اور اگر کہہ سکتے ہیں تو کم سے کم ہر بڑے شہر کا ایک اسکول ماننا چاہئے۔ آگرہ کی خصوصیت کیوں ہو؟

اس خصوصیتِ آگرہ اسکول کی بھی سیماب صاحب نے اسی خطبہ میں صفحۂ آئندہ پر یہ تعریف کی ہے:-

"آگرہ اسکول کا ایک طالب علم اپنی غزل والدین، استاد، بہنوں، بیٹیوں، اور ملک کی تمام خواتین کے سامنے بے تکلف پڑھ سکتا ہے۔"

یہاں اوّل تو نفس غزل کی تعریف مسلّم نہیں۔ اور تعریف گھڑنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ کوئی کہے کہ ہماری غزل ہسٹاریکل سوسائٹی میں (جہاں تاریخی مقالات پڑھے جاتے ہیں) بے تکلف پڑھی جا سکتی ہے۔ اور نمونہ کے طور پر یہ مطلع پیش کرے۔

کس قدر معصوم تھا ہستی کا عنوان دیکھئے — سب سے پہلا صفحۂ تاریخ انساں دیکھئے

تو یہ اُسکی زبردستی ہے۔ کسی خاص جماعت یا جنس کے سامنے پڑھ سکنا معیارِ غزل نہیں ہو سکتا۔

دوسرے، آگرہ اسکول کی صرف غزل میں اس خصوصیت کا ہونا اصلاحِ اخلاق و ادب و شعر کے لئے چنداں مفید نہیں۔ آگرہ اسکول کے ادیبوں شاعروں، رسالوں، کے فسانے، تنکوریات، تصاویر، ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو سنانے اور دکھانے کے قابل نہیں ہیں تو اُن کے سامنے غزل سرائی کی بھی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ سالنامۂ "کنول" کی وہ غزل جس کا عنوان ہے "محبت ہی خدا ہے" زیادہ جاذبِ نظر و توجہ نہیں ہے اسی پرچہ کے "افسانۂ دوش سے" اور فردوسِ رنگ و بو کی تصویر سے، اور فردوس رنگ و بو کی نظم کے ان اشعار سے:-

کنارِ آب فروکش ہے ایک مہ پارہ — طلوع یا لب کوثر ہوا ہے اک تارہ

دراز زلف، سیہ چشم، اور تبسم ریز　　جوانی اور صباحت، دو آتشہ اور تیز
کہیں تخیل فطرت کا شاہکار جیسے　　نظر یقین کرے جنت بہار جیسے
نہاں قیامتیں جس کے دراز بالوں میں　　جواں ہے جس کا تصور مرے خیالوں میں
بجا بجا مجھے اے خالق جمال بجا　　نہ لوٹے کہیں یہ حسن بے مثال بجا

تیسرے، آگرہ اسکول کی غزل بھی اس خصوصیت کے منافی اشعار سے بالکل خالی نہیں ہے۔ راز چاند پوری، منظر اکبر آبادی، ساغر نظامی علیگری وغیرہ طلبۂ آگرہ اسکول کی غزلیں حسن و شباب کے پُر کیف جذبات و مناظر سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن اس وقت سرسری انتخاب سے سیماب صاحب کے چند اشعار کلیم عجم سے پیش کرتا ہوں۔

تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا　　ہم کس کے ساتھ عمر محبت بسر کریں
عالم تصویر میں سو سو کے تو اٹھتا رہا　　ہم تصور میں تری انگڑائیاں دیکھا کئے
پھر تصور میں مرے زلفیں بکھیرے آئیے　　پھر مجھے اپنے تصور میں پریشاں کیجئے
گیا شباب بھی پیری بھی آگئی سیماب　　مگر یہ تکیۂ پہلو کہیں سرکتا ہے

پھولوں کے گجرے، کلیوں کے گہنے، سینے پہ جوبن، رُخ پہ پریشاں
شامیں معطر، راتیں سہانی، ہائے محبت، ہائے جوانی
سینے میں گرمی، منہ پر پسینہ، آنکھوں میں شعلے، دل میں شرارے
نظروں میں دنیا لیلائے ثانی ہائے محبت ہائے جوانی
وہ اُن کا جانا دامن جھٹک کر، وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر
وہ اُن کا آنا، وہ شادمانی، ہائے محبت، ہائے جوانی
وہ شام فرقت آفت کی گھڑیاں، اشکوں کی لڑیاں ساون کی جھڑیاں
آنکھوں سے دل تک پانی ہی پانی، ہائے محبت ہائے جوانی
وہ چاندنی میں نظریں بچا کر، ان کے مکاں کا طوفِ مسلسل
سب سے چھپانا رازِ نہانی ہائے محبت ہائے جوانی
خط اُن کو لکھنے راتوں کو اٹھ کر، صفحے کے صفحے دفتر کے دفتر
پیغام پھر بھی دینا زبانی، ہائے محبت، ہائے جوانی

آگرہ اسکول کا ایک طالب علم یہ اشعار والدین، استاد، بہنوں، بیٹیوں اور ملک کی تمام خواتین کے سامنے بے تکلف نہیں پڑھ سکتا۔

چوتھے، اس خصوصیت یا اس کی اکثریت میں آگرہ اسکول تنہا نہیں ہے، اس سے پہلے میرٹھ اسکول ہے۔ جہاں کے مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے نظموں کے علاوہ غزلیں کی غزلیں اسی رنگ میں لکھی ہیں اور اس کے بعد بدایوں اسکول، سوہان اسکول، لاہور اسکول، کلکتہ اسکول، حیدرآباد اسکول سبھی شریک ہیں۔ آرزو، عزیز، صفی، حسرت، فانی، اصغر، اقبال وغیرہ کی پوری پوری غزلیں اسی خصوصیت کی حامل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ میرے نزدیک "آگرہ اسکول" دہلی اسکول کی طرح ایک علٰحدہ ادارۂ فکریہ نہیں ہے اور ایسا دعویٰ کرنے اور اس کو تسلیم کرنے کی اصلاح و ترقی اردو کیلئے ضرورت بھی نہیں بلکہ ایسا دعویٰ جسکو دوی ثبوت نہیں اور جسکو تسلیم کرنے کیلئے لوگ تیار نہوں فیض رسانی کا سدراہ ہو سکتا ہے۔

اب میں "آگرہ اسکول میں" "اسکول" کے دوسرے معنی لیتا ہوں، جو اصل میں پہلے ہیں۔ یعنی تعلیم اور ان کے معنوں میں آگرہ اسکول کو ایک علٰحدہ ادارۂ تعلیم شاعری تسلیم کرتا ہوں۔ اس "آگرہ اسکول" کی کامیابی کا سیماب صاحب کے سر سہرا ہے۔ سیماب صاحب نے اپنے اسکول سے کتنے ہی شاعر بھی ایف اے۔ اور بی۔ اے پیدا کر دئے ہیں۔ غالباً ابھی کوئی ایم اے کی ڈگری حاصل نہیں کر سکا ہے یا مجھے علم نہیں[ه]۔ خود سیماب صاحب بلاشبہ اس فن میں ڈاکٹری کا ڈپلوما رکھتے ہیں۔ سیماب صاحب سالہا سال سے اپنے قصر الادب میں بیٹھ کر اپنی نظموں، غزلوں، مضامین، خطبوں، شاعروں اصلاحوں، رسالوں، کتابوں کے کثیر و وسیع ذریعوں سے شعر و ادب کی اتنی بڑی خدمت کر رہے ہیں کہ شاید تمام ہندوستان میں کوئی ایک شخص اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں اُن کا یہ دعویٰ بالکل درست مانتا ہوں۔

چمن نے ناعدن سیماب ہے فیض سخن جاری　　عرب بھی ہیں میرا عجم بھی خوشہ چیں میرا

یعنی عرب و عجم میں اقامت پذیر شعرائے اردو۔ عربی، و فارسی زبانوں کی شاعری و اصلاحِ سخن کا دعویٰ مقصود ہے۔

ه۔ ایم۔ اے ایک بہن کئی موجود ہیں۔ (ایڈیٹر)

شعرا اپنے نقص و کمال کا اظہار غزل کے مقطع میں اکثر کرتے آئے ہیں جو شاعرانہ عادت جاریہ کے سبب سے قابل اعتنا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ اس قسم کے مضامین خصوصاً اعتراف قصور صرف "برائے بیت" اور "زیب داستاں" ہو۔ جہاں کلیم عجم میں سیماب صاحب کے یہ دعوے موجود ہیں:۔

همنوائے طائر سدرہ ہوں اے سیماب میں — همنوائے بلبل ہندوستاں ہونے کے بعد

جب اے سیماب اٹھتی ہیں کبھی الہام کی بادل — برس جاتی ہیں کچھ نغمے مری قلب غزلخواں پہ

وہاں ایسے شعر بھی ہیں۔

سیماب ہم میں عیب و ہنر خود ہیں بےحجاب — ہم کیا کسی کے عیب و ہنر پہ نظر کریں

ازل سے سہو و خطا ہی سرشت میں ہے مری — ہے اعتراف کہ سیماب آدمی ہوں میں

اسی قبیل کا شعر بہت ہی خوب کہا ہے۔

مری فطرت میں ہی سیماب بناز آگینی — ناز ہے مجھ پہ زمانے کو، مجھے ناز نہیں

کیا ناز آگیں نیاز آگینی ہے۔ میرے نزدیک اس ناز پر بھی ناز جائز ہے اس نیاز پر بھی، اور اس انداز پر بھی۔

تنقید[^1] و تبصرہ شعر و ادب کی اصلاح و ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے، لیکن نقاد کو عناد سے کوئی تعلق نہیں۔ تنقید تنقیص کے لئے نہ ہونی چاہئے اعتراض کرتے وقت دیکھنا چاہئے کہ غلطی کی کیا نوعیت ہے۔ اور شاعر کا کیا مرتبہ ہے۔ مثلاً سیماب صاحب فن شاعری کے یقیناً استاد ہیں۔ تو اب ان سے جس قسم کی بھی غلطیوں کا امکان ہو، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ عروض و قافیہ کی غلطی ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ علی الاعلان ایطاء کا استعمال جائز قرار دیں اور قافیۂ معمولہ کو ترک کر دیں اور میرے نزدیک ایطاء کا ترک اور قافیۂ معمولہ کا اختیار اولیٰ ہو۔ بہر حال یہ ممکن نہیں کہ سیماب صاحب کا کوئی مصرع ناموزوں ہو، یا جوش ملیح آبادی کی طرح ایک نظم میں دو مختلف بحریں داخل کر دیں۔ اگرچہ اس اعتراض کے معاملے میں بھی میرا مسلک اول روز سے جدا ہے۔

اس بات سے خود جوش صاحب بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ان کے نقش و نگار کی پہلی نظم کے بعض مصرع ایک بحر کے ہیں۔ بعض دوسری بحر کے، اور یہ غلطی جوش صاحب جیسے شاعر سے نہایت غیر متوقع تھی۔ تاہم میرے نزدیک جوش صاحب جیسے باکمال کو محض شاعر تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دینا معترض کی جسارت بیجا ہے۔ اور شاعری و نقادی کی توہین۔

مجھے اس وقت جوش صاحب سے بحث نہیں، سیماب صاحب سے ہی۔ سیماب صاحب فن عروض کے ایسے ماہر ہیں کہ ان سے اس فن کی غلطی نہیں ہو سکتی۔ کہیں سہو و فرد گذاشت ہو جائے تو ممکن ہے۔ مثلاً کلیم عجم کے صفحہ ۲۲ پر ایک ذو بحرین غزل ہے۔ اس کے مقطع کے پہلے مصرع میں یہ صنعت نہیں رہی مقطع یہ ہے۔

فصل رنگیں کا ہوا سیماب اثر جلوہ نما — اڑ کے پروانہ چلا شمع فروزاں کیطرف

اسکا دوسرا مصرع تو غزل کے باقی ۱۶ مصرعوں کیطرح ان دو اوزان میں پڑھا جا سکتا ہے:۔

[^1]: تنقید کا لفظ بیسویں صدی کی ہندوستانی ایجاد ہے۔ عرب و ایران کے لغات و محاورات میں "تنقید" کا وجود نہیں ہے۔ اس مادے سے نقد اور انتقاد مستعمل ہیں۔ یا اس کی جگہ تبصرہ۔ فارسی جدید میں جا بجا یہ الفاظ ملتے ہیں۔ "فن انتقاد" "قواعد انتقاد" "از روئے انتقاد" "ادبیات"۔ ہندوستان کے قدیم علمائے عربی و فارسی نے بھی تنقید کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ لیکن اس زمانے میں اس لفظ کا رواج ہو گیا ہے کہ خواص بھی استعمال کرتے ہیں اور اب اس کا ترک مشکل نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں محاورۂ عرب و عجم کے خلاف ایک بھی لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ اور بھی بہت ہیں۔ مثلاً حسین بجائے جمیل۔ عزیز رشتہ دار کے لئے۔ رئیس دولت مند کے لئے اہل عرب ان لفظوں کے ان معنوں سے واقف بھی نہیں۔ لیکن اب ہماری بول چال یا ادبیات سے ان کا نکلنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے میری رائے میں مصلحین زبان کو ان کے ترک پر اصرار نہ کرنا چاہئے۔
(قادری)

ا۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

۲۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

لیکن پہلا مصرع صرف پہلے وزن میں درست ہے، دوسرے میں نہیں ہے[1] میں اس کو محض فرو گذاشت سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے یہ مصرع اس طرح ہو۔

فصلِ رنگیں کا ہے سیماب اک اثر جلوہ نما

معنوی اعتبار سے بھی اگر سیماب صاحب کے کلام میں کہیں کوئی کوتاہی یا کمی رہ گئی ہو تو عجیب بات نہیں۔ "بے عیب تو ذات ہے خدا کی" مثلاً فرماتے ہیں۔

کثرتِ تعمیرِ عالم وجہ بربادی ہوئی　　بڑھ گئیں آبادیاں اتنی کہ ویراں ہو گئیں

یہاں دونوں مصرعوں کا مفاد ایک ہی ہے۔ ایک دوسرے کی نہ تشریح ہے تمثیل نہ تعلیل، کچھ نہیں، صرف ایک جگہ عربی فارسی میں کثرتِ تعمیرِ عالم ہے دوسری جگہ اردو میں "بڑھ گئیں آبادیاں"۔ ایسے ہی دوسرے ٹکڑے ہیں اس لئے ایک مصرع بیکار رہتا ہے[2]۔ اس کے علاوہ اس شعر میں شعریتِ تغزل مضمون آفرینی وغیرہ بھی کچھ نہیں ہے۔

سیماب صاحب خود بیسویں صدی کے شاعر ہیں، لیکن انیسویں صدی کے بہترین غزل گو فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہیں۔ اور اسی دور کے بعض مشاہیر واساتذہ کی صحبتیں دیکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے سیماب صاحب کے کلام میں قدیم وجدید رنگِ تغزل کی خوشنما آمیزش ہے۔ اور انھوں نے طرزِ قدیم کو نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ لیکن یہ صورتِ ایجاد ذرا احتیاط طلب ہے۔ اس روش کو سیماب صاحب سے کچھ پہلے مرزا "عزیز" لکھنوی وغیرہ اختیار کر چکے تھے لیکن سیماب صاحب اس شاہراہ پر سب سے آگے نکل گئے ہیں۔ اگر سیماب صاحب فرمائیں کہ اُن کا "کلیمِ عجم" صرف آئندہ نسلوں کیلئے ہے جو ابھی نوجوان یا نومولود منتظرِ تخلیق ہیں۔ تو میں "کلیمِ عجم" کو بند کر کے رکھے دیتا ہوں اور اپنی اولاد کے لئے چھوڑے دیتا ہوں۔ لیکن نہیں سیماب صاحب ہم سے بھی طالبِ داد ہیں۔ تو پھر ہماری رائے سننے کے لئے بھی تیار رہوں۔

اس میں شک نہیں کہ غزل جدید عصرِ جدید اور زمانۂ مستقبل کے لئے لکھی جاتی ہے۔ تاہم نفسِ غزل کی زبان، مضمون، طرزِ ادا، دیگر اصنافِ سخن سے ممتاز ہونے چاہئیں اور نئے الفاظ، نئے محاورے، نئے اسلوب کے اخذ وانتخاب میں مانوس وموزوں ہونے کا خیال رکھنا ضروری ہے سیماب صاحب جدید الفاظ بڑی آزادی سے استعمال کرتے ہیں، اور یہ مختلف نوعیت کے ہیں۔ یعنی مغربی زبانوں کے الفاظ بھی، اور عربی وفارسی کے وہ الفاظ بھی جو اب تک زبانِ غزل پر جاری نہ ہوئے تھے۔ میں اس معاملہ میں سیماب صاحب سے ایک حد تک متفق ہوں۔ مثلاً سیماب صاحب کو رومان کا لفظ بہت پسند ہے۔ یہ لفظ اب اردو لٹریچر کا ایسا جزوِ لازم ہو گیا ہے کہ ادبِ لطیف کا کوئی رسالہ اور کوئی کتاب بمشکل سے اس لفظ سے خالی ہو گی معنوی لحاظ سے بھی "رومان" کا مترادف کوئی ایک لفظ عربی وفارسی کا موجود نہیں ہے۔ اس لئے فارسی جدید میں بھی یہی لفظ اختیار کر لیا گیا ہے۔ سیماب صاحب فرماتے ہیں :-

واقعاتِ عشق کا تھا ایک لمحہ اک صدی　　ہر نفس میں میں نے اک رومان پورا کر دیا

دامانِ سحر پر کندہ ہے اب تک رومانِ غم میرا　　یہ تارے میری آنکھیں ہیں، یہ گریہ ہے شبنم میرا

سیماب صاحب رومان کو مفرد ومرکب دونوں صورتوں میں استعمال کر کے سکۂ رائج الوقت بنانا چاہتے ہیں۔ قدامت پسند طبائع کو یہ لفظ کھٹکے گا۔ میں خود بھی بہت قدامت پسند ہوں اور ہر نئی چیز پر چونکتا ہوں۔ لیکن غور کرنے کے بعد میں رومان کو دل سے نہیں تو عقل سے پسند کرتا ہوں۔

---

[1] غالباً قادری صاحب نے مصرع کی تقطیع کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ ورنہ انھیں اپنی رائے واپس لینی پڑتی۔ مصرع معلومہ کی تقطیع یہ ہے :-
فصلِ رنگیں فاعلاتن کا ہوا سی فعلاتن باب اثر جل فعلاتن وہ نما فعلن۔ قادری صاحب کا پیش کردہ مصرع خود تقطیع سے خارج ہے۔ "ایڈیٹر"

[2] ہرگز نہیں۔ پہلا مصرع میں ایک نظریہ پیش کیا گیا ہے اور دوسرے مصرع میں اسکی مثال ہے۔ ایڈیٹر

سیماب صاحب کے دوسرے شعر کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس کے دوسرے مصرع کے آخری ٹکڑے میں تعقید پیدا ہو گئی ہے اور ایسی ناگوار ہے کہ سیماب صاحب کو اس سے بچنے کے لئے مطلع کی قربانی گوارا کرنی چاہئے تھی۔[1] الفاظ یہ ہیں۔ "یہ گرہ یہ شبنم میرا" اور مفہوم یہ ہے "یہ شبنم ہے گرہ یہ میرا" "یہ" اور "میرا" کیسی غلط جگہ رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ کندہ بھی بے محل ہے۔ اور دامن پر کوئی چیز کندہ نہیں کی جا سکتی۔[2] مغربی زبان و تہذیب کے نئے محاورے بھی سیماب صاحب نے نظم کئے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

ممنون ہوں تری نگہ دل نواز کا لے دوست شکریہ، مگر اب دل نہیں رہا

تھینک یو، مائی ڈیر اور اس کا ترجمہ دو توں "جج اکبر" (اکبر الہ آبادی مرحوم) ہی کی زبان و موضوع پر زیب دیتے ہیں۔ یہ اسلوب بول چال میں تو عام ہو گیا ہے[3]، لیکن متانتِ غزل کے لئے مضحکہ خیز ہے۔ اور یہاں تو ممنون ہوں کے بعد تکرارِ شکریہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔

سیماب صاحب نے اپنی زبانوں کے بھی ایسے الفاظ کثرت کے ساتھ استعمال کئے ہیں جو مذاقِ تغزل کیلئے عجیب بھی ہیں اور "غریب" بھی۔ مثلاً

ہر اک نگاہ میں تھا شوق کچھ نہ کچھ تیرا مگر میں تجزیہ ہر نگاہ کر نہ سکا

ایک ہی سا ہے نظامِ عشق کا ماضی و حال میری تجویزِ وفا ناکام تھی ناکام ہے

دل کی تنقیدِ مناسب نہ یوں تیور بدل مدتوں نکھرا ہے تو آئینۂ دل دیکھ کر

ان الفاظ میں تجزیہ و تنقید خاص علوم کی اصطلاحیں ہیں۔ تجویز میں خاص و عام دونوں شامل ہیں۔ لیکن یہاں "نظام" "ماضی و حال"، "ناکام" کے الفاظ نے تجویز میں بھی قانونی و دفتری شان پیدا کر دی ہے سیماب صاحب سے پچاس برس پہلے امیر مینائی نے اور سو سال قبل ناسخ لکھنوی نے اصطلاحی الفاظ کو غزل میں استعمال کیا اور ان پر اعتراض کیا گیا۔ مثلاً۔

(۱) فرق ہے دونوں میں استدراج اور اعجاز کا (ناسخ)

(۲) طلایہ پھر رہا ہے آنکھ میں طوقِ طلائی کا (امیر)

(۳) وہی اس متن کا شارح بھی ہے ماتن ہی نہیں (امیر)

تاہم غزلِ جدید کیلئے میں سیماب صاحب کے الفاظ کو جائز اور موزوں سمجھتا ہوں۔ بشرطیکہ سیماب صاحب کی طرح ان الفاظ سے وسعتِ نظر رفعتِ خیال اور لطافتِ بیان پیدا کی جائے۔ اوپر کے اشعار میں تیسرا شعر سیماب صاحب کی جدتِ ادا کا نہایت نادر نمونہ ہے۔ ممکن ہے بعض اشخاص اس طرزِ بیان کو پسند نہ کریں، لیکن میری طبیعت ذرا جدت طلب اور دقت پسند ہے۔ مجھے مومن و غالب، خصوصاً مومن کا یہ انداز کہ وہ ایسے الفاظ اور اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ جو مفہوم پر چند واسطوں سے دلالت کریں، نہایت عجیب و غریب و دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ سیماب صاحب کا یہ شعر عصرِ جدید کی جدتِ فکر کا نتیجہ ہے۔

سیماب صاحب نے جدید مفرد الفاظ کے علاوہ جدید ترکیبیں بھی بے شمار پیدا کی ہیں۔ مثلاً۔

سنا ہے حسن کا مستقبل سلکِ وفا ہوگا وفا ہے حسن کا جوہر کسی سے سن لیا ہوگا

آ گئی ہستی فریبِ عشرتِ تخلیق میں ایک دھندلا سا خوشی کا نقشِ باطل دیکھ کر

یہاں لفظِ تخلیق کی ضرورت نہ تھی۔ فریبِ عشرت کافی تھا تخلیق کے معنی عالم و کائنات کے لینا اختراعِ جدید ہے[4]

یہی قطرے جھلکتے ہیں یہی ذرے چمکتے ہیں فضائے شبستاں سے بساطِ شبنمستاں تک

سیماب صاحب کو "ستاں" کا لاحقہ نئے نئے لفظوں کے ساتھ لگانے کا بہت شوق ہے۔

---

[1] قافیہ کی ضرورت سے یہ نوعیت تعقید متقدمین و متاخرین میں ہمیشہ جائز سمجھی گئی ہے۔ (ایڈیٹر) [2] شعر میں صرف دامن نہیں بلکہ دامانِ سحر ہے۔ جو ایک منظر کی حیثیت رکھتا ہے۔

[3] جب بول چال میں یہ اسلوب عام ہے۔ تو شعر میں بھی قابلِ اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ (ایڈیٹر)

[4] تخلیق کے معنی عالم کائنات نہیں بلکہ پیدائش و ظہور ہیں۔ (ایڈیٹر)

شبستاں میں ہو شمع پروانہ جبیں تم　　گلستاں میں ہو بوئے غنچہ نشیں تم
کبھی مصر کی نکہتِ نازنیں تم　　کبھی طور کا جلوۂ سرمگیں تم
اشاروں میں بجلی کے تم کوندتے ہو　　ستاروں میں لرزشِ شرمگیں تم

یہ سب ترکیبیں خوب ہیں، خصوصاً تیسری نہایت لطیف ہے۔

جو تھی مخدوش ترے بے انتہا جلووں کے طوفاں میں　　وہ بجلی جذب ہو کر رہ گئی ترکیبِ انساں میں

(تر) اور (بے انتہا) دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ صرف ایک کافی ہے اور "بے انتہا" بہتر ہے [1]

خالی نہیں جہاں میں کوئی نظر اثر سے　　دنیا محیط نکلی ہنگامۂ نظر سے

محیط کی جگہ محاط ہونا چاہئے۔ یعنی دنیا ہنگامۂ نظر سے گھری ہوئی نکلی۔ اگر اسم فاعل ہی کو کھینچ تان کر درست کیا جائے پھر بھی پہلے مصرع کے دعوے کا ثبوت کسی صورت میں نہیں ملتا [2]۔

سرفرازِ شانِ محبت کو نوید امتیاز　　محشرِ اہلِ وفا میں پرسشِ قاتل نہیں

کیا خوب کہا ہے سبحان اللہ! یہ شعر، یہ ترکیبیں، یہ انداز، یہ مفہوم سب لاجواب ہیں:—

اُس مرکزِ جمال پر اب ہے مری نگاہ　　جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

کیا کہنا ہے! واہ واہ! یہ ترکیب و اسلوب نہایت نادر ہے۔

شگفتِ غنچہ و گل سی صبوحی پی رہا ہوں میں　　ابھی سو کر عروسِ صبح گلشن نہیں اُٹھی

پھر یہ عجیب ترکیبیں اور عجیب تر تخئیل اور عجیب ترین اسلوب آگیا ہے میں ایسے مضامین کو شعر سازی اور سخن آرائی سے تعبیر کرتا ہوں۔ مفہوم یہ ہے کہ ابھی صبح نہیں ہوئی اور میں سیرِ غنچہ و گل میں مست و محو ہوں۔ شگفتِ غنچہ و گل پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ صبح کی سیر باغ کو شغلِ صبوحی سے تشبیہ دینا درست ہے۔ بلکہ لطیف و موزوں ہے۔ صبح کو عروس اور عروسِ باغ کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ تشبیہ بھی نازک و خوشنما ہے۔ اس طرح یہ شعر صنعتِ مراعاۃ النظیر کی عمدہ مثال بھی ہے۔ لیکن یہ شاعرانہ آرائشیں پورے مضمون میں کوئی ندرت پیدا نہیں کرتیں۔ بلکہ دوسرے مصرع کی تشبیہ کو پہلے مصرع کے استعارہ و تشبیہ سے کوئی مناسبت نہیں۔ یعنی عروس کے سو کر اُٹھنے کو شغلِ میکشی سے کچھ تعلق نہیں۔ اور اگر ہے تو ابتذال سے خالی نہیں۔ اور جب تک یہ تعلق نہ ہو شعر میں ان ترکیبوں اور تشبیہوں کو جمع کرنے سے کوئی حسن پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح کے شعروں سے یہ فائدہ ضرور ہے کہ زبان و ادب میں جدید اسالیب و تراکیب کا اضافہ ہوتا ہے اور ترکیب و اسلوب پیدا کرنے کے طریقے نظر آتے ہیں۔

سیماب صاحب معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ وہ کثرت سے "نئے الفاظ"، "نئی ترکیب"، "نیا انداز" پیدا کرنے کی اس لئے بھی کوشش کرتے ہیں کہ "خطباتِ شاعری" کے صفحہ ۱۰۶ پر اُنھوں نے شعر کی بہت سی تعریفوں میں ایک یہ تعریف بھی بیان کی ہے کہ۔

"شعر وہ ہے جو باوجود کوشش جاہل یا کم علم موزوں طبع شخص نہ کہہ سکے"۔

تو اب وہ اپنے اشعار کو سطحِ عام سے بلند کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر عمل میں لاتے ہیں، یہ خواہش و کوشش بیشک بجا و مناسب ہے اور انکی سعی اکثر و بیشتر مشکور رہتی ہے۔ اگرچہ اشکال و دقت معیارِ رفعت و لطافت نہیں ہے۔ چند معنی خیز، اشعار وسیع و بلند مضامین جدید الفاظ و تراکیب بلیغ اسالیب اور دیکھئے۔

شوخیِ جلوۂ طغرائے ازل ہم سے ہے　　ہم جو افسانہ نہ بنتے تو یہ عنواں ہوتا؟
نقصِ نظارہ سے ہے حاصلِ نظارہ تمام　　دیکھتا تجھکو سمجھ کر تو نہ حیراں ہوتا
بہتی ہے درد آشنا نظروں کو صرفِ التفات　　تکملہ جب تک نہ ہو میری جنونِ خام کا
تقدیر میں اضافۂ سوز وفا ہوا　　تم نے جو دل میں آگ لگادی تو کیا ہوا

---

[1] بے انتہا، جلووں کیلئے ہے۔ بجلی کیلئے نہیں۔ (فافہم) [2] شعر کے معنی و مفہوم پر عبور ہو تو ثبوت مل سکتا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظر ایسی نہیں جسمیں کچھ نہ کچھ تو تاثر نہ ہو اور تمام دنیا میں صرف نظر ہی کی کارفرمائی ہے مثلاً کوئی نظر کے اثر سے مسمریزم اور ہپناٹیزم کے کرشمے دکھا رہا ہے کوئی تاروں کے اثرات واضح کر رہا ہے کوئی سائنس کے انکشافات میں مصروف ہے۔ یہ سب تاثیرِ نظر کی کارفرمائیاں نہیں تو کیا ہیں۔ ایڈیٹر۔

محشرِ پندار بپا تھا بقدرِ خودی — بت نہ تھے تخیّلِ عالم میں مگر تھا نہ تھا

اس قسم کے مضامین اور طرزِ ادا وسعتِ زبان کے لئے ضروری و مفید ہیں۔ سیماب صاحب کو اُن کے اختراع میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ شعرائے جدید میں سے ایک کیا دو چار متغزلین کے کلام میں بھی اس کثرت سے یہ چیزیں نہ ملیں گی۔ جتنی تنہا سیماب صاحب کے "کلیمِ عجم" بلکہ اُس کے ایک حصہ (نشیدِ نو) میں موجود ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض الفاظ اور ترکیبوں سے مجھے یا کسی کو اختلاف ہو، لیکن ان کی ضرورت و اہمیت و افادہ سے اور سیماب صاحب کے کمال سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تاہم میرے نزدیک اس سے زیادہ شاعر کا کمال یہ ہے کہ ان اختراعات سے بے نیاز ہو کر بھی نازک و لطیف، کیف انگیز و اہتزاز آفریں، موثر و دلنشین شعر کہہ سکے۔ سیماب صاحب کا کلام ایسے اشعار سے بھی خالی نہیں ہے مثلاً

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر — پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

نہ پوچھ مجھ سے ترے جبر و اختیار کی خیر — گناہ ہو سکے یا گناہ کر نہ سکا

فطرت ہی ازل سے ہے برقِ جمال کی — اس نے جسے تباہ کیا طور کر دیا

شامِ فرقت انتہائے گردشِ ایام ہے — جتنی صبحیں ہو چکی ہیں آج سب کی شام ہے

اس طرح دنیا ہے اک معمورۂ ناز و نیاز — ذرّے ذرّے پر مرا سجدہ تمہارا نام ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے — کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

آنکھیں ہیں مری بندہ عشق میں یا رب — آگے کوئی اس راہ میں ٹھوکر تو نہیں ہے

اس طرح کے "سادہ و پُرکار" اشعار سیماب صاحب کے ہاں اور سخنورانِ عصرِ حاضر سے زیادہ نہیں ہیں۔ پھر بھی بہت ہیں اور خوب ہیں۔

سیماب صاحب فنِ شعر و عروض کے بڑے ماہر اور قادر الکلام ہیں۔ اس قدرت و مہارت کے بہت سے ثبوت "کلیمِ عجم" میں موجود ہیں سیماب صاحب نے ایسی متعدد بحروں میں غزلیں لکھی ہیں جو عام طور پر اردو میں رائج نہیں ہیں۔ ان میں بعض ہندی بحروں اور گیتوں کا ترنم رکھتی ہیں۔ میرے لئے یہ چیز ہمیشہ سے نہایت دلکش رہی ہے۔ سیماب صاحب نے ایسی غزلوں میں تخیّل و زبان بھی، ترنم کے لحاظ سے نازک و شیریں اختیار کی ہے۔ مجھے ایک غزل بہت پسند ہے۔ پوری نقل کرتا ہوں۔

ہم اک دن چلتے چلتے خاکستر ہو جائیں گے — دیکھیں وہ خاکستر میں کیونکر آگ لگائیں گے

غم کے ناکام افسانے بس اتنے کام آئیں گے — میں کہہ کر پچھتاؤں گا وہ سن کر پچھتائیں گے

جوشِ طلب ہے غیرت کیا ہم تو مانگے جائیں گے — کچھ تو انھیں شرم آئے گی جب دامن پھیلائیں گے

ہم کو یارانِ محفل شمعِ سرِ محفل سمجھیں — شب بھر جل کر کاٹیں گے صبح ہوئی بجھ جائیں گے

بادل تھے گھٹا تھی، جھولی تھی پیمانے تھے — پوچھ رہا ہوں ساقی سے ساون پھر کب آئیں گے

آپ نے حکمِ عام دیا کوئی ہمارا نام لے — اب ہم دیوانے دل کو کیا کہہ کر بہلائیں گے

دید سے اُن کی مطلب ہے گھر نہ سہی محشر ہی سہی — ہم دانستہ دیکھیں گے وہ مجبوراً آئیں گے

خیر وہ ہم موسیٰ نہ سہی آپ بھی شمعِ طور نہیں — جس دن آنکھیں چار ہوئیں پردے خود اٹھ جائیں گے

تجھ سے ہم کو رشتہ ہے دونوں عالم جان گئے — دنیا ہو یا عقبیٰ ہو تیرے ہی کہلائیں گے

نذر گذاری کا سیماب وہ محفل میں اذن تو دیں

ہم بھی اپنی آنکھوں میں کچھ آنسو بھر لائیں گے

بعض ایسی بحروں میں غزلیں لکھی ہیں جن میں ترنم معروف یا بحر مکمل سے کچھ کمی یا بیشی ہے۔ یہ بات ایران کی شاعری میں ہمیشہ سے ہے۔ اور اب تک رائج ہے کہ پورے وزن میں بقدرِ نصف رکن کے کم یا زیادہ کر دیتے ہیں ایسے وزن میں نظم لکھنی بغیر عادت و مشق دشوار ہوتی ہے۔ اردو شاعروں نے اس کو شروع ہی سے ترک کر دیا۔ ایران میں بھی اس کی کثرت دورِ جدید کی جدت ہے۔ سیماب صاحب نے بھی چھوٹی بڑی بحروں میں اس طرح کا تصرف کر کے اپنے کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً ایک بہت طویل بحر یہ ہے کہ (فاعلن) ایک مصرع میں آٹھ بار آئے۔ سیماب صاحب نے آٹھواں رکن بقدرِ فاع رفع، باقی رکھا ہے اس غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے۔

تیری دنیا ہے دنیا الٰہی مگر مطمئن ذہنِ دنیا نہیں ہے

کاوشِ زندگی کا ہے حاصل، مرگ کا کچھ نتیجہ بھی ہے یا نہیں ہے

فکر کے وقت سیماب خونِ جگر عرش کا طوف کرتا ہے اکثر

شعر کہنا ہے دراصل پیغمبری شاعری ہے تماشا نہیں ہے

اس غزل میں سیماب صاحب نے اپنے رنگِ جدید کے بعض شعر خوب نکالے ہیں مثلاً۔

یاد صبحِ ازل کو ہے وہ ماجرا جب فرشتوں کا مسجود میں تھا

ہے یہ نادان اُس حرمِ تقدیس کا سجدۂ انساں کا نہیں ہے

تیرے ہونے کا اقرار ہے ہر عدم لیکن اقرار وا نکار کیسا

ہستی و نیستی کا تو اذن ہی کیا، لا ممتنع اِلا نہیں ہے

لیکن مجھے یہ شعر بہت پسند ہے۔

اک نشیمن (وہ خاشاک و خس کا مکاں) اور اُس پر یہ غرّہ برطوفاں[1]

کس قدر تنگ بیں ہی مرا باغباں جیسے دنیا میں صحرا نہیں ہے

یہاں مجھے لفظ "غرّہ" میں ذرا تامل ہے۔ غرّہ (بالفتح) کے معنی غرور کے ہیں۔ یہاں غرّانے سے بالضم ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ فصیح نہیں ہے میں نے فصحاء کی نظم و نثر میں کہیں نہیں دیکھا۔ اس کی جگہ غصّہ کیوں نہ ہو؟

بعض بحریں اس قدر ترنم ریز، کیف انگیز اور وجد آفریں ہیں۔ کہ اُنکی غزلیں پڑھنے سننے ہی سے شعر و موسیقی کا ذوق پیدا ہو سکتا ہے لیکن ہمارے شعرائے قدیم نے ان کی طرف بہت کم توجہ کی ہے ان میں ایک وزن تو وہ تھا جس میں سیماب صاحب کی غزل (آگ لگا گئے) پہلے نقل کر چکا ہوں۔ دوسرا وزن ہے:- مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن اساتذۂ سلف میں سے شاید ہی کسی نے اس میں غزل کہی ہو۔ سیماب صاحب کی جدت آفریں تخیل اور نغمہ پرور شعریت نے اس بحر کا انتخاب کر لیا۔ اور وزن کے ترنمِ نشاط آگیں کی مناسبت سے مسلسل غزل لکھ کر کیف و سرور کا ایک عالم پیدا کر دیا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

پھر اپنے دل میں شورشِ شباب دیکھتا ہوں میں[*]

الٰہی جاگتا ہوں میں کہ خواب دیکھتا ہوں میں

حیات کے نشاط کے کھلے ہوئے ہیں میکدے

تمام مستیوں کو بے نقاب دیکھتا ہوں میں

جسے ترس گئی تھی دیکھنے کو چشمِ آرزو

اسے بقدرِ شوق بے حجاب دیکھتا ہوں میں

لو یہ میرے نالہ ہائے سحر اعتبار کو

کسی کے دل میں اپنا اضطراب دیکھتا ہوں میں

جو گر رہی ہیں میری آستیں پہ چشمِ حسن سے

اُن آنسوؤں میں موتیوں کی آب دیکھتا ہوں میں

نظر فروز و عقل سوز و روح تاب و جلوہ ساز

پھر اپنی گود میں اک آفتاب دیکھتا ہوں میں

سمٹ کے رہ گیا ہے حسن تنگیٔ کنار میں

نظر کو بے اٹھائے کامیاب دیکھتا ہوں میں

دماغ میں مہک رہا ہے اک جہانِ رنگ و بو

نگاہ میں بھرے ہوئے گلاب دیکھتا ہوں میں

نفس میں بو ہے پھر کسی حنائی دستِ ناز کی

لبوں کے پاس شیشۂ شراب دیکھتا ہوں میں

جو لب فسردگی سے بے نیازِ کیف و رنگ تھے

لب و عذار پہ انھیں خراب دیکھتا ہوں میں

ورود و دست کی یہ سب جوانیاں ہیں واردتی[2]

نہ یہ فریبِ نشہ ہے نہ خواب دیکھتا ہوں میں

اس سے زیادہ کمال سیماب صاحب نے ایک اور بحر کی تلاش

---

[1] اور شعر میں بھی اس لفظ کے معنی یہی لئے گئے ہیں۔ ایڈیٹر۔

[*] اس غزل کے ضمن میں آگرہ اسکول کی ادعائی خصوصیت کا دوبارہ ذکر چھیڑنا نہیں چاہتا۔ (قادری)

[2] یہاں سیماب موزوں نہیں ہو سکتا وہاں وارثی کو تخلص قرار دیتے ہیں۔

میں کیا ہے۔ اور یہ دیکھ کر کہ فنِ عروض سے ناواقف اشخاص اس کو موزوں بھی سمجھ اور پڑھ نہ سکیں گے۔ اس کا وزن بھی لکھدیا ہے۔ یعنی مفاعیلن فعولن مفاعیلن فعولن اس کمال پر کمال یہ ہے کہ اگر یہاں (مفاعیلن) کی جگہ (مفاعلن) ہو یعنی مفاعلن فعولن مفاعلن فعولن، تو ترنم فہمِ عام سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ اور نظم کہنے کیلئے زیادہ آسان۔ سیماب صاحب نے مشکل تر صورت اختیار کی ہے۔ اور ایک کامیاب غزل لکھ کر پیش کر دی ہے۔ چند شعر یہ ہیں:-

دل اک قطرہ لہو ہے یہ ہے اسکی سوا کیا — پھر اسکی آرزو کیا، پھر اس کا مدعا کیا
حریمِ دل رہی گالیوں ہی بے آشنا کیا — نہیں دُنیا میں کوئی پرستارِ وفا کیا
سرِ وادیٔ ایمن گھٹائیں اُٹھ رہی ہیں — کہیں سے جام در کف کوئی پھر آگیا کیا
تخیّل کی حدوں سے نکل کر ڈھونڈھ چلئے — ہو جب صورت نظر میں تصور کا مزا کیا

پریشاں ہو چکے ہیں محبت میں ہزاروں دل
پھر اے سیماب میں کیا مرا خوابِ وفا کیا

یہ اصل میں شاعرانہ پہلو ایناں ہیں۔ لیکن استادی و کمال میں بھی شک نہیں، اگر حسنِ نظم پیدا ہو جائے، جیسا سیماب صاحب کے یہاں ہے تو یقیناً یہ فکر ممدوح اور سعی مشکور ہے۔ مجھے ان اداءِ عجائب سے دلچسپی ہے۔ اس لئے بھی میری نظر میں مستحسن ہیں۔

میں شاعری کو مصوری سمجھتا ہوں۔ اس تصویر کشی کے لئے اگرچہ جدید الفاظ، شاندار اسلوب، عربی و فارسی ترکیبوں کی ضرورت ہو تو اُن کو احسن و اولیٰ سمجھتا ہوں۔ لیکن مقصدِ مصوری کا فوت ہو جانا جائز نہیں رکھتا۔ اور کیف و اثر میں اس شعر کا مصداق دیکھنا چاہتا ہوں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی لئے غالب کی اس غزل میں یہی شعر مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اس شعر کو بھی صحیح تصویر سمجھتا ہوں۔

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائیگی — یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

اور اس مقطع کی سخن آرائی و نکتہ سنجی کا بھی مداح و معترف ہوں۔

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب — رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

اس لئے مجھے سیماب صاحب کا یہ شعر:-

ہے حقیقت میں یہی پردہ حجابِ جزو و کل — غور سے نظارۂ ترکیبِ انساں کیجئے

اتنا پسند نہیں ہے جتنا یہ شعر:-

ایک عالم اور بھی ہے صد بیاباں صد چمن — سرنگوں ہو کر کبھی سیرِ گریباں کیجئے

سیماب صاحب کے یہ اشعار بیشک شاندار ہیں:-

وفا اک لذتِ پُر کیف ہے اک آیتِ تسکیں — وفا کا نام لینے سے لرزتی ہے زباں پھر بھی
حجاب اندر حجاب امواجِ طوفانِ تجلّی ہیں — فروغِ شمع سے پروانہ ہے آتش بجاں پھر بھی

لیکن میں اس مطلع میں بہتر مصوری پاتا ہوں:-

مری فطرت وفا ہی دے رہا ہوں امتحاں پھر بھی — وہ فطرت آشنا ہے اور مجھ سے بدگماں پھر بھی

میں اس شعر کی خوشنما ترکیب اور ندرتِ بیان کا قائل ہوں:-

بیداریٔ جمال کی آسودگی بخیر — کیوں آپ میرے خوابِ پریشاں میں آگئے

لیکن جذب و اثر ان شعروں میں زیادہ ہے:-

خود اُٹھ کے میرے ہاتھ گریباں میں آگئے — شاید قدم جنوں کے گلستاں میں آگئے
کیا ہوگا چار پھولوں سے اے موسمِ بہار — یہ تو ہماری گوشۂ داماں میں آگئے

اس غزل کا ایک اور شعر ان سب سے بہتر تھا اگر ذرا تغیر ہو جاتا شعر یہ ہے:-

بھاری قدم نظر متحیر، نفس دراز — کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آگئے

"نفس دراز" سے وہ محاکات پیدا نہیں ہوتی جو طویل سانس یا لمبے سانس سے ہوتی۔ یہ لفظ بھاری قدم کی طرح سُبک و فصیح اور روزمرہ میں شامل نہیں ہے۔ فارسی میں درازنفسی "طویل کلام" کو کہتے ہیں۔ اس سے قطع نظر کر کے مضمون لاجواب ہے۔

سیماب صاحب کا یہ شعر انتخاب الفاظ اور حسنِ ترتیب کے لحاظ سے بہت خوبصورت اور شاندار ہے۔

کریں ارباب جادہ کیا تعین اپنی منزل کا مسلسل اک سفر ایوانِ ہستی سے عدم تک ہے

لیکن ایسے محاسن لفظی کے ساتھ مضمون کی خوبی میرے نزدیک اس شعر میں زیادہ ہے :-

مرا کفر محبت ہے فروغ جادۂ ایماں وہ شمع دیر ہوں جس کی روشنی جبکی حرم تک ہے

سیماب صاحب کو مضمون آفرینی میں بھی کمال حاصل ہے، اور مختلف اسالیب سادہ دمرصع آسان و مشکل پیدا کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ مثلاً اپنا مجتہدانہ اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں تو شعر کو کس قدر بلیغ و پر شکوہ بنا دیتے ہیں، دیکھئے۔

آداب تجلی میں ہے گنجائش ترمیم نظارہ ترے حسن سے بیباک نہیں ہے

اور سادگی و اثر سے کام لیتے ہیں تو کیسے نازک و شیریں الفاظ منتخب کرتے ہیں۔

آنکھوں سے ہر اک پردۂ موہوم مٹا دے اتنی نگہ شوق ابھی چالاک نہیں ہے

چالاک کا معمولی سا لفظ اور اس کا عامیانہ مضمون یہاں کس قدر فصیح و شستہ نظر آتا ہے۔ اس غزل میں یہ شعر بھی کیا خوب کہا ہے :-

کر چاک گریباں سے نہ اندازۂ وحشت دیوانے ابھی دامنِ دل چاک نہیں ہے

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے تخیل کی کار فرمائی وہیں پسند آتی ہے جہاں تصویر کھنچ جائے۔ یا تاثیر پیدا ہو جائے۔ مثلاً۔

دل اور نفس کی یکجائی ساز کا رنہیں ہے بقیدِ نفس محبت کا اعتبار نہیں ہے

انھیں کمال تصور نے جذب کر لیا شاید مری نگاہ میں اب رنگِ انتظار نہیں ہے

دل انکو دیکے میں دل سے نجات پا تو چکا ہوں یہ اور سینے میں کیا ہے جسے قرار نہیں ہے

ہر ایک ذرہ ہے اک نقشِ پائمالِ خرابی وہاں بھی قبر بنا دو جہاں مزار نہیں ہے

یہ شاید میری ندرت پسندی ہو کہ اس بحر کے آخر میں ذرا سے ٹکڑے کا (لقدر رنع یا ہے) بڑھا ہونا مجھے بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرع کا آخری لفظ (ہوں) اور دوسرے کا (ہے) نکال دیا جائے تو متعارف وزن نکل آئے گا۔ اور اتفاق سے نظم و مضمون میں بھی کوئی فرق نہ آئے گا۔ یعنی۔

دل ان کو دیکے میں دل سے نجات پا تو چکا یہ اور سینے میں کیا ہے جسے قرار نہیں

"شاعر" کے بعض ناشاعر ناظرین تو اسی وزن و شعر کو بہتر سمجھیں گے لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں ذرا سا اضافہ کرنے سے جو لے بڑھ جاتی ہے۔ اس کے ترنم اور آواز میں درد و اثر بڑھ جاتا ہے۔ اور سوز و گداز کے مضامین کیلئے زیادہ موزوں ہو جاتی ہے۔ غالب نے اس میں اور بھی ستم ظریفی کی ہے۔ یعنی آخر میں اسقدر اضافہ کر کے ابتدا میں ذرا سی کمی کر دی ہے۔ اور وہ وزن ترنم میں اور بھی کم ہو گیا ہے۔ لیکن مجھے وہ بھی بہت پسند ہے۔ کیا شعر کہا ہے :-

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے[1]

اور دیکھئے، ایک ہی مرکزی خیال ذرا سی کمی وبیشی اور ردو بدل سے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ سیماب صاحب فرماتے ہیں۔

اس کو اکثر سورش عالم نے برہم کر دیا جس لفافے میں مرے معیار کی تصویر تھی

شعر دلچسپ ہے، مضمون عمدہ، مرے معیار کی تصویر بہت خوب لیکن یہی بات جب سیماب صاحب نے اس طرح کہی تو عمدگی کے ساتھ تاثیر و دلکشی بھی بڑھ گئی۔ فرماتے ہیں :-

اڑ رہے ہیں گرد بربادی میں کچھ اوراقِ دل ان میں وہ صفحہ نہ ہو جس پر تری تصویر تھی

---

[1] یہ اتفاق کی کس قدر دلچسپ نادرہ کاری ہے کہ دیوانِ غالب مطبوعہ ۱۸۶۳ء جو غالب (متوفی ۱۸۶۹ء) کی زندگی میں چھپا ہے۔ اور جرمنی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۲۳ء دونوں میں یہ لفظ یہاں بجائے (تیری) کے (تری) چھپا ہے۔ اور تقریباً اس پون صدی کے عرصے میں جو صدہا ایڈیشن چھپے ہوں گے سب میں (تری) ہی ہوگا۔ حالانکہ تقطیع میں (تیری) آتا ہے، اب اس میں کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو سیماب صاحب جانیں وہ اس فن میں مجھ سے زیادہ ماہر ہیں۔ (قادری)

تری تصویر اور مرے معیار کی تصویر میں جو فرق ہے۔ اسی کی مناسبت سے "اوراقِ دل" اور "تصور" ہیں۔ اور اسی توازن سے گرد و برباد میں اُڑنا اور شورشِ عالم کا برہم کرنا۔ اور اسی بنا پر دونوں میں، جذب و اثر کا فرق ہے۔

میں اسی طرح "کلیمِ عجم" کی ورق گردانی کرتا رہا اور اشعار میں تحسین و تنقید کے پہلو نکالتا رہا تو شاید نصف کتاب نقل کر دوں گا۔ سیماب صاحب کی فرمائش اور میرے وعدے کو اب بھی اتنی دیر ہو گئی ہے کہ میں دل ہی دل میں نادم ہوں۔ میں سیماب صاحب کے شاعرانہ کمال کو تقریباً ایک چوتھائی صدی سے دیکھ رہا ہوں اور اُن کا مداح ہوں، یعنی ۱۹۱۳ء سے جب شاہ دلگیر مرحوم کے رسالہ "نقاد" میں اُنکی نظمیں شائع ہونی شروع ہوئی ہیں۔ لیکن اُن کے کمالِ غزل گوئی کا "کلیمِ عجم" کے دیکھنے سے پہلے مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس مضمون کے دورانِ تحریر میں جس قدر دیکھا، اور سب نہیں تو بہت سا دیکھ لیا، اس سے اندازہ ہوا کہ سیماب صاحب کے ذہن میں اس قدر جودت، فکر میں جدّت، بیان میں تازگی، قلم میں زور ہے کہ عصرِ حاضر کے اساتذۂ غزل میں اُن کو یقیناً مرتبۂ امتیاز حاصل ہے۔

میرا یہ مضمون بظاہر ادبی و تنقیدی ہے۔ اس لئے اس میں "من دتو" کا دخل نہ ہونا چاہیئے تھا، لیکن میں نے مظاہرۂ ادب و تنقید کے ارادے سے قلم نہیں اُٹھایا تھا۔ اور سیماب صاحب سے ٹھرا لیا تھا کہ جو کچھ لکھوں گا بالکل بے تکلفی کے ساتھ لکھوں گا۔ اس لئے پہلے ہی عنوانِ مضمون کے نیچے (ایک بے تکلف مضمون) لکھدیا تھا۔ اِسی بے تکلفی پر مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی آخر میں سیماب صاحب کی دو پوری پوری غزلیں نقل کرتا ہوں۔ ایک اُن کے مذاق کی، ایک اپنی پسند کی۔

(۱)

نظر کو عجزِ رفعت ہے تجلی گاہِ جاناں تک ... تجلی خود چلی آئے کسی دن چشمِ حیراں تک
ہوائے قبر لینی آئے خاکِ آشیاں میری ... ہوائے گل اگر تکلیف فرمائی بیاباں تک
نظر کو علم ہے چشمِ تماشا کی اسیری کا ... پشیماں کیوں ہو جا کر رودِ زندانِ دل تک
بڑے تاریک، لمبے اور پیچیدہ دوراہی ہیں ... تری زلفِ پریشاں سے مری قلبِ پریشاں تک
تماشا در تماشا محوِ نازش، صرفِ حیرانی ... نظر کس رنگ سے پہونچی تجلی گاہِ جاناں تک
یہی قطرے جھلکتے ہیں یہی ذرّے چمکتے ہیں ... فضائے شبنمستاں سے بساطِ انجمستاں تک
الٰہی کام آجائے دعا یارانِ ساحل کی ... تباہی کھینچ لائی ہے مری کشتی کو طوفاں تک
شعاعِ آفتابِ عشق کتنی شوخ فطرت تھی ... فرشتوں کی نظر سے چھپ کے پہونچی قلبِ انساں تک
جسے کہتے ہیں رنگِ بزم ہے موقوفِ ویرانی ... یہ سب رونق ہی پروانوں کی اجزائے پریشاں تک
مبارک ہو دلِ سیماب کو آشوبِ سینائی ... نگاہِ شوق جا پہونچی تجلی گاہِ جاناں تک

یہ ساری غزل سیماب صاحب کے جدید اسلوب و تخئیل کا نمونہ ہے اور خوب ہے لیکن اسمیں میرے لئے دلکشی کے سامان بہت کم ہیں۔ برخلاف اس کے یہ غزل میری نظر میں سراپا دلکش اور سراسر انتخاب ہے:۔

(۲)

دل تیری تغافل سے خبردار نہ ہو جائے ... یہ فتنہ کہیں خواب سے بیدار نہ ہو جائے
انساں کہیں سرگشتۂ پندار نہ ہو جائے ... بیزارِ گنہ ہو کے گنہ گار نہ ہو جائے
دشواریِ جادہ سے ہے آسانیِ منزل ... ہو جائے یہ دشوار جو دشوار نہ ہو جائے
مدت سے یہی پردہ یہی پردہ دری ہے ... ہو کوئی تو پردے سے نمودار نہ ہو جائے؟
بکتا پھرے یوسف کی طرح حسن ہمیشہ ... کوتاہ اگر ظرفِ خریدار نہ ہو جائے
سجدے ہی سے تقدیس پرستار روا ہے ... سر اپنا اُٹھائے تو گنہ گار نہ ہو جائے
مجھ سے مرا افسانۂ ماضی نہ سنو تم ... افسانہ نیا پھر کوئی تیار نہ ہو جائے
مستیِ الفت سبقِ کفر دئے جا ... جبتک مجھے ہر چیز سے انکار نہ ہو جائے
ہونا ہے جو ہستی کو مری خاک ہی سیماب ... پہلے ہی سے کیوں خاکِ درِ یار نہ ہو جائے

اس وقت یہ غزلیں نقل کرنے کے بعد سوچتا ہوں تو یہ انتخاب ہم دونوں کے یا کم سے کم میرے مذاق کی ضرور غمازی کر رہا ہے۔ بقولِ غالب

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مولانا سیماب اکبرآبادی کا ایک کارنامۂ عظیم

"الہامِ منظوم" ——— ترجمۂ مثنوی مولانا رومؒ

از ——— حضرت مولانا مفتی انتظام اللہ الشہابی

یہ کتاب مولانا سیماب اکبرآبادی کا شاہکارِ ادب ہے۔ مثنوی معنوی کی شہرت اور جلالت شان کا غلغلہ چھ سو سال سے دنیائے اسلام میں بلند ہے۔ عام و خاص حضرات پڑھتے اور سنتے اور سر دھنتے ہیں۔ آج تک لاکھوں ہزاروں آدمیوں نے پڑھا ہے۔ خدا کو علم ہے کہ ان میں سے کتنے دل اسکی معرفت و شوق کی چاشنی سے آشنا ہوئے اور کتنی ارواح حرارت عشق سے سبک جولاں بنیں۔ معرفت اور حقیقت کا ایک بحر ذخار موجزن ہے اس میں غوطہ لگانا اور دُرِ مقصود حاصل کرنا آسان کام نہیں۔

مثنوی کے اشعار سے بیان میں گرمی و اعظ پیدا کرتا ہے۔ بہت سے سامعین کے گوش اس روحانی کلام سے آشنا ہوتے ہیں مگر بہت کم ایسے ہوں گے جنھوں نے مثنوی کا باقاعدہ مطالعہ کر کے اس کے مطالب پر عبور حاصل کیا ہو۔ باوجودیکہ بیسیوں شرحیں لکھی گئی ہیں۔ بہت سے خلاصہ ہوئے ہیں۔ ترجمہ کئے گئے۔ بلکہ یہ تک التزام کیا گیا کہ منظوم ترجمہ ہوا۔ مثنوی کی تصنیف کا آغاز سنہ ۶۶۲ھ میں ہوا

مطلعِ تاریخ ایں سودا و سود
سال اندر ششصد و شصت و دو بود

مولانا روم نے مثنوی منطق الطیر کے مثل یہ مثنوی لکھی چھ دفتر تصنیف کئے ان کے مطالعہ سے صدہا اولیا ہو گئے۔ اگر کوئی شخص مضمون میں بطریق اقتباس اس کے اشعار نقل کر دیتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس کتاب سے علما و فضلا نے جس قدر اعتنا کیا ہے۔ کسی اور فارسی کتاب سے نہیں کیا۔ بہت سی نایاب اور مستند کتابیں مثلاً شاہنامۂ فردوسی و حدیقۂ حکیم سنائی و منطق الطیر و الٰہی نامہ و اسرار نامہ و پندنامۂ خواجہ فریدالدین عطار و گلستان و بوستاں موجود ہیں۔ لیکن اُن کو مثنوی کی سی قبولیت نہ ہو سکی۔

مثنوی کی کثرت سے شرحیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے شرح مثنوی موسومہ کنز الحقائق (سنہ ۸۴۰ھ) جواہر الاسرار مرتبہ حسین بن حسن (سنہ ۱۰۲۰ء) شرح کمال الدین خوارزمی (سنہ ۱۰۴۰ھ) شرح العصل افقروی ۶ جلد (سنہ ۱۰۴۴ھ) شرح عبدالمجید سیواسی (سنہ ۱۰۴۹ھ) شرح شاہ محمد افضل الہ آبادی۔ شرح مولانا محمد ایوب لاہوری۔ (سنہ ۱۱۵۵ھ) شرح مولانا ولی محمد اکبرآبادی (سنہ ۱۱۴۰ھ) مولانا محمد رضا۔ مولانا عبداللطیف۔ مُلّا نظام الدین سہالوی (سنہ ۱۱۶۱ھ) مولانا عبدالعلی بحر العلوم (سنہ ۱۲۲۵ھ) کشف العلوم شرح مثنوی مولانا روم۔ سر المکتوم ...... وغیرہ کو زیادہ شہرت اور قبولیت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مثنوی کو اہمیت و عظمت حاصل نہ ہوتی تو ایسے ایسے فضلا و علما کو اس کی شرحیں لکھنے کا خیال ہی کیوں پیدا ہوتا؟

اردو میں مثنوی مولانا روم کے ترجمے کئی کئے گئے ہیں۔ نثر میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ مگر منظوم ترجمہ سب سے پہلے کیا گیا ہے۔ حضرت درد کاکوروی نے لکھا ہے۔ کہ سنہ ۱۱۷۹ھ میں منظوم ترجمہ مثنوی کا ہوا ہے۔ قلمی مسودہ اس کا

اُن کے پاس موجود ہے۔

سینو نے سو کیا حکایت کرتی ہے — کیوں جدائی سے شکایت کرتی ہے
جب سے کی ہے کاٹ کر تن سے جدا — جس کے منہ لگنے ہی نالاں ہے صدا
پارہ پارہ کرکے یہ سینہ لے فراق — تا کہوں بیخود ہو دردِ اشتیاق

اس مثنوی کی نقل کی تاریخ ۱۲۵۰ھ ہے۔ مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا اس کے ایک عرصہ بعد منظوم انتخابات شائع ہوئے۔ نثر کے تبصرہ کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ صرف اس جگہ منظوم تراجم کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

منظوم اردو تراجم مثنوی معنوی

پیراہنِ یوسفی ۱۲۸۸ء محمد یوسف علی شاہ ولد محمد جلال الدین خاں۔
منتخبات مثنوی مسمی بہ شجرۂ معرفت ۱۸۹۶ء مولوی غلام حیدر گوپاموی
باغ ارم ترجمۂ منظوم ۱۲۷۰ھ شاہ مستعان مرید افضل العلما قاضی ارتضا علیخاں گوپاموی۔

ان کے علاوہ اور بھی انتخاب شائع ہوئے مگر ضرورت اس کی تھی کہ کامل ترجمہ منظوم ایسا شائع ہو کہ وہ تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

باغ ارم کا آغاز یہ ہے۔

حمدِ حق جو نے زباں پر لا سکے — بے نشاں کا کب نشاں بتلا سکے
ممکن و حادث ہیں سب نا مستقیم — یاد ہیں کب واجب کے اسرارِ قدیم

یہ تمام منظوم ترجمے بہ لحاظِ زبان و محاورہ ناقص سمجھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ اب تک کثیر التعداد ارباب علم و فضل مثنوی کو صرف تصوف کی کتاب سمجھا کئے۔ باوجودیکہ وہ علم کلام کا بہترین مجموعہ بھی ہے۔ جہاں اخلاقیات کو حکایات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ وہاں مسائل کلام توحید ثبوت روح و معاد وغیرہ بھی قصص کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں۔ اردو داں حضرات کے سمجھنے کے لئے بعض حضرات نے ترجمہ کئے مگر جو غرض عام قبولیت پیدا کرنے کی تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔ ضرورت یہ تھی کہ مثنوی کے تراجم سے وعظوں میں کام لیا جاتا مگر نہیں لیا گیا۔ فارسی داں طبقہ جو فیض مثنوی سے حاصل کیا ہے۔ ان ترجموں سے اردو داں طبقہ حاصل نہ کر سکا۔ یہ ایک بہت بڑی کمی تھی۔ نثر میں ترجمہ بھی ہوئے۔ شرح بھی لکھی گئی مگر عام قبولیت نصیب نہ ہو سکی۔ ہم مولوی فیروز الدین صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی سے چھ دفتروں کا ترجمہ "الہامِ منظوم" کے نام سے مکمل کرا لیا۔ چنانچہ وہ خود "الہام منظوم" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں

"مثنوی مولانا روم کے اردو منظوم و منثور ترجمے گو پہلے سے موجود تھے۔ مگر اول تو اکثر ناتمام اور پھر منظوم ترجمہ تو باعتبار زبان غالباً شمار کے بھی قابل نہ تھا۔ لہٰذا میری دیرینہ آرزو تھی کہ کوئی باکمال صاحب حال اس کام کو انجام دے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے جناب امیر مینائی مرحوم کی خدمت میں یہ تحریک کی۔ ضرورت اور خیال کو تو انھوں نے پسند کیا مگر اپنی ضعیفی کو کام کی گرانباری کا متحمل نہ پایا آخر رفتہ رفتہ میری نگاہِ انتخاب جناب شیخ عاشق حسین صاحب سیماب صدیقی الوارثی پر پڑی جو شعرائے عصر میں ایک استادانہ درجہ و رتبہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ . . . . انھوں نے ترجمہ کیا

غرض کہ اس منظوم ترجمہ کرنے کے بعد ساتوں دفتر شائع کئے گئے اور انھیں خاص قبولیت حاصل ہوئی۔ مولوی فیروز الدین نے چھوٹے خوبصورت سائز میں شائع کئے ہیں اس کے ساتھ یہ قابلِ افسوس بات ہے کہ خود مولوی صاحب کو اس امر کا اعتراف ہے کہ یہ ترجمہ مولانا سیماب کا کیا ہوا ہے۔ مگر سرورق پر "الہام منظوم ترجمۂ اردو مثنوی مولانا روم مرتبہ مولوی فیروز الدین لکھا ہے۔ یہ طریق اخلاق کے خلاف ہے۔ جس کی تلافی آئندہ ایڈیشنوں میں ہونے کی ضرورت ہے۔ "الہام منظوم" کا درجہ دور ماضی کی مثنویوں سے

بہت بلند ہے کہ گو یہ فارسی کا ترجمہ ہے۔ لیکن اگر متن سے علٰحدہ کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے تو بجائے خود ایک مثنوی معلوم ہوتی ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ترجمہ کیا کیا گیا ہے۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سیماب کا یہ ترجمہ منظوم ادب کے شاہکاروں سے ہے۔ ترجمہ کرنے میں مولانا نے اصل ترجمہ کے ساتھ لطفِ زبان کو قائم رکھا ہے۔ اور شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے نظم میں کسی قسم کی کوتاہی نہ آنے دی اور اردو داں جماعت کے لئے مثنوی کے طرز میں پڑھنے کے لئے بھی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ اس جگہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے نمونہ پیش کرتا ہوں۔

آغاز دفتر اوّل

سن تو کیا کرتی ہے باتیں بانسری — یہ شکایت کر رہی ہے ہجر کی
جب سے کاٹا ہے نیستاں سے مجھے — مرد و زن روتے ہیں میری شور سے
پارہ پارہ کر دے سینہ جب فراق — تو کہیں ہو شرحِ دردِ اشتیاق
جا رہا ہو اصل سے جو اپنی دور — اپنا عہد وصل ڈھونڈے گا ضرور

فارسی عبارت ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر ترجمہ ہونا مشکل تھا جیسا اصل عبارت میں زور ہے وہی بات ترجمہ میں موجود ہے۔ فارسی داں مثنوی پڑھ کر وجد میں آتا ہے۔ اسی طرح اردو داں "الہامِ منظوم" کے مطالعہ سے لطف اندوز اور متکیف ہوتا ہے۔ غرضکہ مولانا سیماب کی یہ سعی مشکور ہے۔

مولانا سیماب سے ہمیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مثنوی کے بعض اشعار میں مولانا فیروز الدین نے تصرّف کر کے ان میں متروک الفاظ اس لئے بھر دئے ہیں کہ انھیں عوام سمجھ سکیں۔ گو ایسا بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی جہاں کہیں تصرّف کیا گیا ہے۔ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اتنے بڑے کام کا انجام دینا مولانا سیماب اکبرآبادی کا ایک ادبی معجزہ ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ اردو زبان میں تجاوز و اختصار کی قوت فارسی سے نسبتاً بہت کم ہے اس کے باوجود ہر شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں اپنے مکمل مفہوم کے ساتھ کر دینا معمولی بات نہیں ہے۔ اردو میں سہلِ ممتنع کی مثالیں شاذ ملتی ہیں۔ مگر یہاں چھ بحرِ ذخّار اسی صنعت کے جواہر پاروں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ ایک ادبی فضیلت ہے جو مولانا سیماب اکبرآبادی کے لئے قدرت نے مخصوص کر دی تھی۔

ترجمہ سے قطع نظر اتنا بڑا کام اتنی کم مدت میں کر لینا ہی بجائے خود قادرالکلامی اور سیر گوئی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

آج ہندوستانی شاعر کا معراج کمال صرف غزل گوئی تک محدود ہے لیکن مولانا سیماب کا یہ کارنامہ اُن کے کمالِ شاعری کا ایک نقشِ غیر فانی ہے جس سے اُنکی شاعرانہ زندگی کا افادی پہلو بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

"الہام منظوم" کے یہ چھ دفتر بیک وقت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام آسانی کیساتھ کسی طرح انجام نہ دیا جا سکتا تھا۔ الا ماشا اللہ۔ اس ادبی امتیاز نے مولانا سیماب کی ادبی عظمتوں کو اُنکے معاصرین میں بہت بلند درجہ دیدیا ہے۔ ہٰذا فضل ربّی یعطیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

حضرتِ سیمابؔ کی الہامی شاعری

از ــــــــــ حضرت مولانا صدرالدین صاحب سرشارؔ کمنڈوی

حضرت سیمابؔ اکبرآبادی مدظلہٗ العالی سے غالباً ۲۳-۱۹۲۲ء میں جب میں چھاؤنی سیہور میں تعینات تھا۔ پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کیساتھ رسالۂ ''ایشیا'' کے ایڈیٹر جناب ساغرؔ صاحب اور حامدؔ صاحب بھوپالی بھی تھے، میرے لئے وہ دن اور وقت نہایت مبارک و قیمتی تھا جب میں ٹھیک اسطرح موصوف کے حضور نگاہ خاموش و مؤدب حاضر تھا۔ جس طرح مشرقی فرزند اپنے بزرگوں کے سامنے مؤدب و سرنگوں رہتے ہیں۔ ممکن ہے خالص نئی روشنی والے اصحاب اب اس طرزِ عمل کو مضحکہ خیز سمجھنے لگے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کچھ اسی قسم کے متین و مہذب ماحول میں پرورش پائی ہے، اور یہی کچھ دیکھا ہے۔ بہرحال میں خاموش و مؤدب تھا اور حضرت سیمابؔ میری سعادت مندانہ گذارش پر اپنی آتش نوائیوں سے مجھے دیوانہ و مسحور بنا رہے تھے۔ گو آپ کی طبیعت موسم کی خرابی کے باعث کسی قدر کسل مند تھی۔ لیکن میرے شوق و ذوق کی حوصلہ افزائی کے خیال سے آپ نے دو، تین آتشیں غزلیں نہایت دلنشین انداز میں پڑھ کر سنائیں۔ مجھے آپکا یہ شعر اب تک یاد ہے۔

> نہ غرض حرم کے وقار سے نہ صنم کدے کی بہار سے
>
> ہمیں کام ہے در یار سے در یار پھر در یار ہے

میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس شعر نے کس قدر لطف دیا اور کس عالم میں پہونچا دیا۔ ''ہمیں کام ہے در یار سے در یار پھر در یار ہے'' اس مصرعہ میں جذبہ اور کیف ہے۔ وہ بیان کرنے کی چیز نہیں اُسے دل اور صرف دل محسوس کر سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ آج تک پھر کبھی باوجود انتہائی شوق کے آپ سے ملاقات کی مسرت دوبارہ میسر نہ آسکی، میری غلامی (ملازمت) کی شرطیں اور پابندیاں، کچھ اسی قسم کی ہیں جن میں نہ فرصت ہے نہ رخصت کی کوئی گنجائش، ورنہ میں اپنی اس آرزو کو آگرہ جا کر ضرور پورا کرتا۔

سیہور کی ملاقات بالکل اتفاقیہ تھی۔ لیکن میرے لئے وہی بہت کچھ تھی۔ مجھے آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ایک جملہ ابھی اب تک یاد ہے۔ اور ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ یہ تھا کہ جب آپ فضا اور ماحول کو بجلیوں اور شعلوں سے بھر چکے تو مجھ سے کچھ سنانے کیلئے ارشاد فرمایا۔ مجھے تعمیلِ ارشاد میں تو کوئی عذر نہ تھا۔ لیکن سچ جانئے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ڈر اور خوف سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ آپ کا کلام سن کر جو دماغی اور روحانی کیف مجھے مل چکا تھا میں اُسے ضائع کرنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے عذر کیا کہ میں کچھ عرض نہ کروں گا، اس لئے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا، ایک جاہل اور بے پڑھا لکھا شخص ہوں۔ شاعر ہونا تو درکنار معمولی شعروں کا مفہوم بھی نہیں سمجھ سکتا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ میں ''ناخواندہ ہوں لیکن خواندہ ہوں''

مطلب یہ تھا کہ بے طلب اور بغیر اطلاع آگیا ہوں مگر اُس کے معنی یہ نہیں کہ تمہیں جانتا نہیں۔ آخر میں لاجواب ہو گیا۔ اور بجبالی خود اپنا منتخب اور چیدہ کلام عرض کیا۔ جسے سن کر آپ نے اور آپ کے حضرات ہمراہیوں نے کافی داد دی، جس کے متعلق مجھے ہمیشہ یہی گمان رہا کہ وہ محض حوصلہ افزائی کے لئے تھی۔

حضرتِ سیمابؔ کی الہامی شاعری

از ــــــ حضرت مولانا صدر الدین صاحب سرشارؔ کسمنڈوی

حضرت سیماب اکبر آبادی مدظلہ العالی سے غالباً ۲۳-۱۹۲۲ء میں جب میں چھاؤنی سیہور میں تعینات تھا۔ پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کیساتھ رسالہ "ایشیا" کے ایڈیٹر جناب ساغر صاحب اور حامد صاحب بھوپالی بھی تھے، میرے لئے وہ دن اور وقت نہایت مبارک وقیمتی تھا جب میں ٹھیک اسطرح موصوف کے حضور نگاہ خاموش ومؤدب حاضر تھا۔ جس طرح مشرقی فرزند اپنے بزرگوں کے سامنے مؤدب و سرنگوں رہتے ہیں۔ ممکن ہے خالص نئی روشنی والے اصحاب اب اس طرز عمل کو مضحکہ خیز سمجھنے لگے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کچھ اسی قسم کے متین و مہذب ماحول میں پرورش پائی ہے، اور یہی کچھ دیکھا ہے۔ بہرحال میں خاموش ومؤدب تھا اور حضرت سیماب میری سعادت مندانہ گذارش پر اپنی آتش نوائیوں سے مجھے دیوانہ و مسحور بنا رہے تھے، گو آپ کی طبیعت موسم کی خرابی کے باعث کسی قدر کسل مند تھی۔ لیکن میرے شوق و ذوق کی حوصلہ افزائی کے خیال سے آپ نے دو، تین آتشیں غزلیں نہایت دلنشین انداز میں پڑھ کر سنائیں۔ مجھے آپکا یہ شعر اب تک یاد ہے۔

نہ غرض حرم کے وقار سے نہ صنم کدے کی بہار سے
ہمیں کام ہے در یار سے در یار پھر در یار ہے

میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس شعر نے کس قدر لطف دیا اور کس عالم میں پہونچا دیا۔ "ہمیں کام ہے در یار سے در یار پھر در یار ہے" اس مصرعہ میں جو جذبہ اور کیف ہے۔ وہ بیان کرنے کی چیز نہیں اُسے دل اور صرف دل محسوس کر سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ آج تک پھر کبھی باوجود انتہائی شوق کے آپ سے ملاقات کی مسرت دوبارہ میسر نہ آسکی، میری غلامی (ملازمت) کی شرطیں اور پابندیاں کچھ اسی قسم کی ہیں جس میں نہ فرصت ہے نہ رخصت کی کوئی گنجائش، ورنہ میں اپنی اس آرزو کو اکبرآباد جاکر ضرور پورا کرتا۔

سیہور کی ملاقات بالکل اتفاقیہ تھی۔ لیکن میرے لئے وہی بہت کچھ تھی۔ مجھے آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ایک جملہ اور بھی اب تک یاد ہے۔ اور ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ یہ تھا کہ جب آپ فضا اور ماحول کو بجلیوں اور شعلوں سے بھر چکے تو مجھ سے کچھ سنانے کیلئے ارشاد فرمایا۔ مجھے تعمیلِ ارشاد میں تو کوئی عذر نہ تھا۔ لیکن سچ جانئے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ڈر اور خوف سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ آپ کا کلام سن کر جو دماغی اور روحانی کیف مجھے مل چکا تھا میں اُسے ضائع کرنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے عذر کیا کہ میں کچھ عرض نہ کروں گا، اس لئے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا، ایک جاہل اور بے پڑھا لکھا شخص ہوں۔ شاعر ہونا تو درکنار معمولی شعروں کا مفہوم بھی نہیں سمجھ سکتا؛ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ میں "ناخواندہ ہوں لیکن خواندہ ہوں" مطلب یہ تھا کہ بے طلب اور بغیر اطلاع آگیا ہوں مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ نہیں جانتا نہیں۔ آخر میں لاجواب ہوگیا۔ اور بخیالِ خود اپنا منتخب اور چیدہ کلام عرض کیا۔ جسے سن کر آپ نے اور آپ کے معزز ہمراہیوں نے کافی داد دی، جس کے متعلق مجھے ہمیشہ یہی گمان رہا کہ وہ محض حوصلہ افزائی کے لئے تھی۔

زمانہ اور وقت کو جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ تیرہ چودہ سال کی طویل مدت معلوم ہوتا ہے۔ پلک جھپکاتے گزر گئی، اس درمیان میں کئی مرتبہ خیال ہوا کہ حضرت سیماب کے سحور کن کلام کے متعلق کچھ لکھوں، جس طرح بعض اور لوگ اکثر لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن میں ہمیشہ یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ "چھوٹا منہ بڑی بات" کیونکہ حضرت سیماب میرے شفیق اُستاد حضرت محوی صدیقی لکھنوی مدظلہ کے دوستوں میں بھی ہیں۔ اور معاصرین میں بھی، اس خیال سے مجھے کبھی جرأت و ہمت نہیں ہوئی، ساتھ ہی مجھے اپنی کم نگاہی، کم عقلی اور علمی بے مائگی کا بھی خوف و اعتراف رہا۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ دنیائے صحافت و ادب میں میرا مسلک اور مطمح نظر ہمیشہ تنگ نظری اور تنگ خیالی سے مبرا اور منزہ رہا ہے نہ میں بلا وجہ کسی کی پگڑی اچھالنے میں کوئی مسرت محسوس کرتا ہوں نہ کسی کی بیجا تعریف و توصیف کرکے اپنے ضمیر و دل کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن میں اس وقت مجبور ہو جاتا ہوں جب کسی شاعر کا اچھا کلام میرے سامنے ہو۔ اور میں اُسے پڑھ کر سر دھننے کی آرزو اپنے دل کے اندر لرزاں دیکھ رہا ہوں، ایسی حالت میں خاموش بھی نہیں رہا جاتا۔ اور جن الفاظ میں بھی تعریف و توصیف بن پڑتی ہے۔ کہ گزرتا ہوں۔ عام اس سے کہ وہ کسی مشہور و معروف شاعر کا کلام ہو یا کسی طالب علم مبتدی کا۔

رسالہ شاعر غالباً میرے پاس اُس وقت سے آتا ہے، جب سے کہ جاری ہوا ہے۔ اور اس کی تمام وہ تدریجی اور ارتقائی ترقیاں میری نگاہ میں ہیں۔ جو چشم بدور اس قابل قدر اور گرانبہا رسالہ نے اپنے مایۂ ناز اور لائق و فائق "نگران اصول" کی جولانیٔ طبع اور کاوش فکر کے طفیل حاصل کی ہیں۔ آپ نے پڑھا اور سنا ہوگا، کہ عنقریب "شاعر کا آگرہ اسکول نمبر" شائع ہونے والا ہے۔ اس اعلان کو دیکھ کر میری دیرینہ آرزوئیں تلملا اُٹھیں اور میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس موقع پر تو ضرور حضرت سیماب کی شاعری کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ مانا کہ میں آپ سے عمر میں، رتبہ میں، علم و فن میں کم اور بہت کم ہوں، پھر بھی مجھے اپنے جذبات دلی کے اظہار کا بہر حال حق حاصل ہے کم از کم میں خود کچھ نہیں ہوں تو "کچھ ہونے والوں" کی آنکھیں تو میں نے بھی دیکھی ہیں اور اُن کی علمی صحبتوں سے بھی مستفید ہوا ہوں میں نے سوچا اور میں نے غور کیا کہ اگر یہ زرین موقع بھی تذبذب اور تامل کی نذر ہو گیا تو میری جذبات اور میری تمناؤں پر بڑا ظلم ہوگا۔ ایسا ظلم جسکی شاید مدت تک کوئی موزوں تلافی نہ ہو سکے چنانچہ دل و دماغ کو آمادہ کرنے کے بعد "تعین عنوان" کا سوال پیدا ہوا۔ اور کامل غور و خوض کے بعد حضرت سیماب کی "فلسفیانہ شاعری" تجویز کرکے جناب اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" کو اطلاع دیدی کہ میرے لئے بھی صفحات شاعر میں کچھ گنجائش رکھی جائے۔ چنانچہ اعجاز صاحب نے اعلان بھی کر دیا کہ اس موضوع پر میں کچھ لکھ رہا ہوں۔ لیکن بعد کو مجھے خیال ہوا کہ ایسا کیوں کروں، عنوان کا تعین کرکے کچھ لکھنا اپنے تخیلات و احساسات کو محدود کرنا ہے، صرف اُنھیں اشعار کے متعلق لب کشائی کی جرأت کیوں نہ کروں۔ جنھوں نے اپنی بے پناہی اور ندرت انگیزی کے باعث برسوں مجھے تڑپایا ہے اور میرے فرصت کے لمحات کو پُر کیف اور سرور انگیز بنایا ہے، شاید آپ اسے باور نہ کریں اگر میں یہ کہوں کہ مجھے حضرت سیماب کا جدید کلام اس قدر یاد ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے کو یاد ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریباً سنہ ۲۲ء سے اس وقت تک ہندوستان کو باستثنائے چند تمام رسائل میری نگاہ سے گزرتے رہے ہیں۔ اور ان رسائل میں جہاں کہیں جناب سیماب کی غزل یا نظم نظر آئی ذوق و شوق

کی نگاہوں سے پڑھی۔ اور اُس کے کیف واثر کو دماغ و دل کی انتہائی گہرائیوں میں جگہ دی، اور اب تو ایک سال سے "کلیمِ عجم" زیرِ مطالعہ ہے۔ جس نے میرے وجدان و حافظہ کی گنجائشوں میں ایک قابلِ قدر اضافہ کر دیا ہے۔ اور اب میں نے بجائے "فلسفیانہ شاعری کی الہامی شاعری" کا عنوان اختیار کیا ہے۔ اور اُن شعروں کو نقل و اخذ کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہوں۔ جن کی لطافتوں اور پاکیزگیوں نے مجھے پہروں محو و بیقرار رکھا ہے۔ مجھے منصف مزاج "ناظرینِ شاعر" سے توقع ہے کہ میری اس جسارت کو جسے میں حق بجانب سمجھ رہا ہوں محض ستائش پر محمول نہ کریں گے۔ بلکہ ان ادبی اور الہامی نشتروں سے زیادہ سے زیادہ لذّتِ اضطراب حاصل کی جائے گی جنھیں میں نے یکجا کر دیا ہے۔

عروسِ فطرت مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمالِ زیرِ نقاب تیرا
نہ حسن پرتو سے تیرے خالی، نہ بے نیاز آب و رنگ تجھ سے
تمام کافر جوانیوں پر برس رہا ہے شباب تیرا
مری رسائی سے دور ہے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں اُلٹ دیا تھا نقاب تیرا

پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "جمالِ زیرِ نقاب" کی لطافت دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "کافر جوانیوں" کی نُدرت، اور تیسرے شعر کے مصرعہ اوّل میں "مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا" کی شعریت پر غور کیجئے، ہر شعر بندش، روانی اور جدّت کے باعث وجد انگیز ہے۔

فضائے گوشۂ دل میں تجھے جب جلوہ گر دیکھا — مری نظروں نے حیرت سے تجھی کو عمر بھر دیکھا
نظر آتا نہ تھا جو گردِ افکار و حوادث میں — وہ ساحل آنکھ نے طوفانِ غم میں ڈوب کر دیکھا

مصلحت یہ ہی خودی کی غفلتیں طاری رہیں — جب خودی سمجھائے گی بندہ خدا ہو جائیگا
صفحۂ تاریخ پر کام آئے گا میرا لہو — کم سے کم رنگین عنوانِ وفا ہو جائیگا

بنا لیا مجھے دریا نے جانشینِ حباب — جہاں میں ڈوب کے اُبھرا وہاں حباب نہ تھا
اک انقلاب زمانے میں تھا شباب کے بعد — نظر اُٹھی تو کسی چیز پر شباب نہ تھا

تمہیں تو حدِ نظر تک ورود آساں تھا — اگر بلند میں اپنی نگاہ کر نہ سکا
جسے تمہاری نگاہیں تباہ کر نہ سکیں — کبھی پھر اُس کو زمانہ تباہ کر نہ سکا

اشعار مندرجۂ بالا میں طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان بھی مضامین کی بلندی اور شستگی کے ساتھ ساتھ قابلِ ملاحظہ ہے، خیالات و جذبات میں جو اثر و دلاویزی ہے وہ حضرت سیمابؔ کی قادر الکلامی اور لطیف نگاری کی ایک معمولی سی مثال ہے، اور ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کے مجموعۂ کلام میں ایسے ایسے بے شمار نشتر محفوظ ہیں۔

شامِ غربت کی درخشانی کا یہ ہی انتظام — بن گیا ہے صبح کا آنسو ستارہ شام کا
وہ تری خود مست آنکھیں، وہ تبسم بادہ ریز — آج تک نظروں میں عالم ہے چھلکتے جام کا

اب مایوسی اُمید مری، اب عین خوشی ہے غم میرا
اب عشق نئے عالم میں ہے، اب دیکھ ذرا عالم میرا
ہے روزِ ازل سے دنیا کی اِس وسعت میں محفل میری
میں ہر ذرّے سے واقف ہوں، ہر ذرّہ ہے محرم میرا

چند اجزائے پریشاں سی تھی میری ترکیب — اب نہ ہوتا تو بس مرگ پریشاں ہوتا
موت سنتی ہیں کہ ہے دردِ محبت کا علاج — مر نہ جاتا میں اگر قابلِ درماں ہوتا
نقصِ نظارہ سے ہے حاصلِ نظارہ تباہ — دیکھتا تجھکو سمجھ کر تو نہ حیراں ہوتا

خدا کی جستجو کر یا نہ کر رکھ بیخودی طاری — وہ خود تیری خودی کی پردہ حائل سے نکلیگا
تو دلکو دیکھتا رہ اور پچھلی رات ہونے دے — جلوسِ حسن تیری جلوہ گاہِ دل سے نکلیگا

ایوانِ تصور سے اپنے، نکلا نہ طلب کی دنیا میں
جب تک ہر ذرے کو میں نے پھیلا کر دنیا کر نہ دیا

عشق ہے اک جوشِ سیلابِ جوانی تند و تیز — حسن ہے اک موجِ رنگین طوفانِ شباب
دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے پنہاں ہو گئی — لائی تھی عمرِ شفق شامِ گلستانِ شباب

ان اشعار میں جو فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے گئے ہیں، ذرا اُن پر توجہ کیجئے۔

"صبح کا آنسو" "تبسمِ بادہ ریز" "نقصِ نظارہ" "حاصلِ نظارہ" "جلوۂ حسن" "ایوانِ تصور" "موجِ رنگین" "عمرِ شفق" وغیرہ ایسی درخشاں ترکیبیں ہیں جنھوں نے اشعار کے معنوی حسن و جمال میں بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔ پھر اسلوبِ بیان کے ساتھ ساتھ اعلیٰ جذبات کی عکاسی بناء بخدا کس قدر زندۂ جاوید شاعری ہے۔

سیکڑوں شمعیں جلا دیتی ہے فیضِ سوز سے — خندہ پروانوں کی مٹی رائیگاں ہونے کے بعد
وسعتِ ذوقِ طلب کو ختم ہوتا دیکھ کر — لوٹ جاتا ہوں قریبِ آستاں ہونے کے بعد
آ گئی آگ اشک، پھر کھیچ دل کی ٹکڑے پھر لہو — یوں ہوا ہے مرتب کارواں ہونے کے بعد

سبحان اللہ کیا ترتیب اور کیا حسنِ بیان ہے، کس قدر پُر جوش تغزل ہے لفظ لفظ دل میں ایک ارتعاشی کیفیت پیدا کرنے کا ضامن و ذمہ دار ہے

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

اس شعر کی مضمون آفرینی اور نزاکت آگینی کی صفحات کے صفحات سیاہ کر دینے کے بعد بھی تعریفِ واقعی ناممکن معلوم ہوتی ہے، ظاہری نہیں بلکہ باطنی آنکھیں گریۂ خونیں کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اس شعر میں باعتبار بندشِ و روانی، صفائی و شستگی جس قدر حسن ہے۔ اُسی قدر بلحاظِ تاثیرِ جذبات دردناک بھی ہے، میری تعریف سے کہیں بلند اور پُر کیف ہے، اور دیکھئے۔

مری تصویر کس نے کھینچ دی دیوارِ زنداں پہ — نہ رہ جائے یہیں نقشِ غلامی بعدِ آزادی

اس مضمون کا اس سے زیادہ شاندار اس سے زیادہ با اثر آج تک کوئی شعر میری نگاہ سے نہیں گذرا، اور مجھے یقین ہے کہ آپ نے بھی نہ دیکھا ہوگا، اس شعر کا نہ صرف معنوی حسن و جمال ہی تابناک ہے۔ بلکہ صوری آرائش و شائستگی بھی نگاہوں کو خیرہ کرنے والی ہے، "نقشِ غلامی" اور "تصویر" دونوں کا محلِ وقوع دیکھئے کس قدر جاذبِ توجہ ہے، یہ شعر بجھے ہوئے دلوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے والا ہے۔ اور غلامی کی لعنت میں جکڑے ہوئے دلوں اور دماغوں کو خوابِ غفلت سے جگانے والا ہے۔ تعریف سے بالاتر ہے۔

جنونِ عاشقی اور قیدِ زنداں ہے معاذ اللہ — مری کیفیتیں خود رہ گئیں زنجیر پا ہو کر
خودی و بیخودی سیماب کچھ مجھ میں نہیں لیکن — مرے پندار میں کوئی جھلکتا ہے خدا ہو کر

رفتہ رفتہ سمجھ میں آئے گا — میرا نغمہ ہے دور کی آواز
کر رہی ہے خود آشیاں سے قریب — میرے لیل و نہار کی پرواز

شمعِ ایوانِ حرم ہو یا چراغِ طاقِ دیر — ہم کو دونوں سے تعلق ہے کہ ہیں پروانہ ہم
دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا — کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

تجلیاتِ حقیقت کا آئینا ہوں میں — خدا نمائی یہی ہے کہ خود نما ہوں میں
اسی سے فیصلہ کر مشکلاتِ طوفاں کا — خدا پکار رہا ہے کہ ناخدا ہوں میں

تجلی کے لئے انساں ہے آوارۂ عالم — تجلی خود بنا ہیں ڈھونڈھتی پھرتی ہے انساں میں
ذرا کھل کر پکار اے صورِ مجذوبانِ الفت کو — یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا　　ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں
اُس مرکزِ جمال پہ اب ہے مری نگاہ　　جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

مضامین کی بلندی، الفاظ کی شیرینی، تمام تر صنائع و بدائع کے ساتھ حسنِ دلکش انداز تکلّم میں مقید کی گئی ہے وہ دریا کو کوزے میں بھر دئے جانے کے مترادف ہے۔ "تشکلاتِ طوفاں" "آوارۂ عالم" "مجذوبانِ الفت" "عمرِ محبت" "مرکزِ جمال" "طوافِ نظر" وغیرہ کس قدر اچھوتی اور دلپذیر ترکیبیں ہیں، یہ سب مولانا سیماب مدظلہ کی قدرتِ کلام، وسعتِ نظر، پاکیزگیِ مذاق، کی اتنی کثرت سے شہادت ادا کر رہی ہیں کہ کوئی تردید کی ہمت نہیں کر سکتا۔

وہاں چمن میں ہے تعمیرِ آشیاں پہ عتاب　　یہاں ہوا پہ نشیمن بنائے جاتے ہیں
لگاؤ ہے مری تنہائیوں سے فطرت کو　　تمام رات ستارے جگائے جاتے ہیں

سمیٹا دفترِ غم میں نے اک نقطۂ تمنا تک　　مجھے محفل میں حکمِ اختصارِ داستاں کیوں ہے
جوانی اور مرگِ عشق! یہ ہے رقص کا موقع!　　غزلخواں ہو سرِ ماتم یہاں کوئی نوحہ خواں کیوں ہے

حسنِ زنگار رنگ کی ندرت بداماں نہ پوچھ　　ہر مصوّر کے تخیّل میں نئی تصویر تھی
میں کشکل بھی نہ محفل سے کسی کی اٹھ سکا　　ایک نامعلوم قوت تھی کہ دامنگیر تھی

اُٹھے ابر جھوم کے چار سو، ہو اصافِ مشرقِ رنگ و بُو
مگر ایک مطلعِ آرزو، کہ اسیرِ گردِ غبار ہے
نہ غرض حرم کے وقار سے، نہ صنم کدے کی بہار سے
ہمیں کام ہے دریار سے دریار پھر دریار ہے

یہ تم ہنس ہنس کی باتیں کر رہی ہو　　کہ تقسیمِ جراحت ہو رہی ہے

لبِ لعلیں پہ نظریں جم گئی ہیں　　بڑی رنگیں عبادت ہو رہی ہے

اوّل اوّل اک ہیولٰی مائلِ تماشا تھے　　رفتہ رفتہ ہستی کی ہر اٹھان موسیقی تھی
میں فریبِ صورت میں بے نیازِ معنی تھا　　میری زندگی سیماب اک حسین دھوکا تھی

غم کے ناکام افسانے بس اتنے کام آئیں گے　　میں کہہ کہہ کے پچھتاؤنگا وہ سُن سُن کر ترسائیں گے
بادل تھے گھٹائیں تھیں، جھولے تھے پیمانے تھے　　پوچھ رہا ہوں ساقی سے ساون پھر کب آئیں گے

وہ کوئی حیلہ نہ کردیں نیتِ وعدہ بخیر!　　آج کچھ افسردہ افسردہ چراغِ شام ہے
اس طرح دنیا ہے اک معمورۂ راز و نیاز　　ذرے ذرے پہ مرا سجدہ تمہارا نام ہے

ہوش کی دنیا جہانِ خواب بن کر رہ گئی　　اک نظر ہنستی ہوئی سی کر گئی غافل مجھے
تو خدا پر چھوڑ دی کشتی تو خود اے ناخدا　　آئے لینے کیلئے طوفان تک ساحل مجھے

باوجود نیتِ اختصار مضمون طویل ہوا جا رہا ہے۔ اور طبیعت کا یہ عالم ہے کہ ہر شعلۂ طلب بیقرار کئے دیتا ہے، ابھی سیکڑوں شعر نظرِ انتخاب کے دامن میں محفوظ ہیں۔ لیکن میں اس سرمایۂ لاجواب اور لذّتِ اضطراب کو بیک وقت تقسیم کر کے خود ایک بے کیفی پیدا کرنا نہیں چاہتا، اس لئے چند شعر اور پیش کر کے باقی آئندہ کے لئے اٹھا رکھتا ہوں، بشرطِ زندگی پھر کبھی دیکھا جائیگا۔ دیکھئے ذیل کے اشعار کو اگر آپ الہامی نہ کہیں گے تو پھر کیا کہیں گے فنِ کمال کا ایک طوفانِ عظیم اور زبان و محاورات کا ایک سیلابِ لطیف ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے، فنِ شعر کی جملہ اصناف میں کون سی ایسی صنف اور خصوصیت ہے جو حضرت سیماب کے آتشیں کلام میں نہ پائی جاتی ہو، ہمتِ یک نگاہ اور قوتِ صدا رکھتے ہو تو اُن میں سے کوئی ایک بھی شعر دُہرا لیجئے، دہرایئے اور وجد و کیف

سمندر میں غرق ہو جائیے، خیالات و تخیلات کی بلندیاں فنی داد بی سنجیدگیاں، زبان و مذاق کی ترقیاں اور شگفتہ الفاظ و تراکیب کی محشر سامانیاں، پھر عروسِ فطرت کی جابجا فطری انگڑائیاں آپ کی متین و باوقار شاعری کی ایسی نادر الوجود خصوصیات ہیں کہ بہت کم حکیموں، شاعروں، ادیبوں اور دیباصنوں کے حصے میں آئی ہوں گی، مضامین و تخیلات جس قدر اعلیٰ ہیں الفاظ بھی اُسی نسبت سے صاف و شستہ، میٹھے اور رنگین ہیں۔ اگر ایک طرف طالبانِ فن و زبان کے لئے آپ کا کلام شمعِ راہ بن سکتا ہے۔ تو دوسری طرف باکمال حضرات کے لئے نشاطِ روح، اور تسکینِ دماغ کا سامان بھی مہیا کرنے کی صلاحیت و قدرت رکھتا ہے، اتنی خوبیوں اور رعنائیوں کا ایک جا جمع ہو جانا یا جمع کر دینا کسی معمولی دل و دماغ رکھنے والے انسان کا کام نہیں ہو سکتا حضرتِ سیماب کی غیر معمولی قدرتِ کلام کا اندازہ کرنا ہو تو آسان طریقہ یہ ہے کہ اُنکی کسی غزل کا کوئی شعر سامنے رکھ کر ہم قافیہ شعر کہنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کیجئے پھر آپ کو اپنے عجزِ طبیعت اور میرے دعوے کا اعتراف خود بخود ہو جائے گا۔ . . . . معاف فرمائیے میں جوشِ عقیدت میں کہاں سے کہاں جا پڑا، لیجئے آخری نشتر بھی پیش کئے دیتا ہوں۔

بہت دلوں میں جو اُس جلوہ گاہ تک پہنچا — تجلیوں نے کیا خوب شرمسار مجھے
یہ جوشِ رنگ، یہ سیلِ نمو، یہ شوخیِ لو — کہیں اُچھال نہ دے دامنِ بہار مجھے
صدائے صور سے میں قبر میں نہ جاگوں گا — کسی شکستہ ہوئی آواز سے پکار مجھے

ابھی لا انتہا ذرّوں کو ہے پرواز کی حسرت — کوئی آندھی بقدرِ ظرفِ ویرانہ نہیں اُٹھی
تصوّر جلوۂ مستور کو صد رنگ کر دیگا — بنا فتنہ اُٹھا، دیوارِ بت خانہ نہیں اُٹھی
بھڑک اُٹھی ہو کیوں دنیا میری آگ محبت پہ — یہ شورش کیوں خلافِ شمع و پروانہ نہیں اُٹھی
بسا طِ بزم اُٹھی، شمع اُٹھی، جام مے اُٹھا
مگر سیماب اب تک نعشِ پروانہ نہیں اُٹھی

یہ انتخاب ۱۹۳۵ء تک کے کلام کا ہے۔ ہنوز مولانا سیماب اکبرآبادی بزمِ سخن میں خدا کے فضل و کرم سے مسلسل الہام آفریں ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر کی عمر جس قدر بڑھتی جاتی ہے، قوتِ کلام اور زورِ طبیعت بھی بڑھتا جاتا ہے۔ خدا جانے مستقبل میں مولانا کا جب اور کلام شائع ہوگا تو اُس میں الہامی قوتیں کس قدر بے پناہ اور ناقابلِ برداشت ہوں گی۔ بیسویں صدی عیسوی اور چودھویں صدی ہجری کا یہ ممتاز عصرِ شاعر" ادبِ اردو" کو ایک دوامی زندگی عطا کر رہا ہے۔ اب صدیوں کسی مجدّدِ فن اور امامِ شعر کی دنیا کو ضرورت نہ ہوگی۔

میں آرزومند ہوں کہ مولانا کا جدید دیوان "توراتِ مشرق" بھی جلد از جلد شائع ہو تاکہ دنیا مولانا کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہو سکے۔

مقدمۂ شعر و شاعری اور خطباتِ شاعری

از ——— جناب شریف احمد صاحب بی۔ اے

ادب اردو میں مولانا حالی کی تصنیف مقدمۂ شعر و شاعری کو جو اہمیت حاصل ہے اسکے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی زمانہ نظمِ اردو میں جو زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اُن کی تخلیق میں مولانا حالی اور اُن کے مقدمۂ شعر و شاعری کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ اردو شاعری میں مقدمۂ شعر و شاعری ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے اردو شعرا کو زمانے کی ضروریات سمجھنے کی طرف متوجہ کیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب شاعری کے رجحانات زوال کی آخری حد تک پہونچ چکے تھے۔ اور موضوعاتِ قدیم کی پرستش علی رؤس الاشہاد ہو رہی تھی اس وقت مولانا حالی مرحوم کو قوم کی ذہنی تباہی کا احساس ہوا۔ اور انھوں نے ایک طرف قوم کی اخلاقی تربیت کے لئے مسدس مدوجزرِ اسلام تصنیف کیا اور دوسری طرف شعرا کی ذہنی تربیت کے لئے اپنے دیوان کا دیباچہ "مقدمۂ شعر و شاعری" کے نام سے لکھا۔

مقدمۂ شعر و شاعری دراصل ہماری معراجِ ترقی کا پہلا زینہ ہے اس میں مولانا حالی نے وہی باتیں تحریر کی ہیں۔ جن کی انیسویں صدی کے نصفِ آخر اور بیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں ضرورت تھی۔ مقدمۂ شعر و شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جہاں شعرا کو رنگِ زمانہ دیکھ کر قدم اُٹھانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ وہاں وہ علمی معلومات کا بھی ایک ضخیم ذخیرہ ہے۔ شعر و شاعری پر بالتفصیل تبصرہ شعر کی تعریف، مختلف شعرا کے کلام کی مثالیں نیچرل شاعری کی توضیح زبان و محاورہ کی تشریح اور پھر اپنے بیان کردہ نظریات کی روشنی میں اردو شاعری پر محاکمہ۔ الغرض اس میں وہ سب باتیں آ گئی ہیں جو ایک نئے دور کی پیداوار میں معاون ہو سکتی ہیں۔

انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں مولانا حالی کی تصنیف مقدمۂ شعر و شاعری کے بعد ضرورت تھی کہ بیسویں صدی میں اُن کے پیام کی پھر تجدید کی جائے۔ اور ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اس پیام میں کچھ اضافہ کر کے معیارِ شاعری کو اور زیادہ بلند کیا جائے۔ خطباتِ شاعری کا وجود اسی ضرورت کا ایک عملی پیرایہ ہے۔ جو چیز مولانا حالی کے یہاں شروع ہوئی تھی۔ خطباتِ شاعری میں وہ معراجِ کمال تک پہونچ گئی ہے۔ اور ہم دونوں کو ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں کہہ سکتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ مقدمۂ شعر و شاعری ایک مسلسل کتاب ہے۔ اور خطباتِ شاعری اُن مختلف خطباتِ صدارت کا مجموعہ ہیں۔ جو علامۂ سیماب اکبرآبادی نے پندرہ سال کے عرصہ میں ملک کی ادبی مجالس میں پڑھے۔ لیکن دونوں میں موضوعات کی ہم آہنگی صاف بتا رہی ہے کہ ہم ایک باغ کی دو ہوائیں ہیں۔ اور ایک ہی جذبے سے پیدا شدہ دو صدائیں ہیں۔ اگر مقدمۂ شعر و شاعری اور خطباتِ شاعری کا بالترتیب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقدمۂ شعر و شاعری ایک تاریخی کتاب سے زیادہ علمی کتاب ہے۔ لیکن خطباتِ شاعری میں علمی معلومات کے علاوہ ہندوستان کی پندرہ سالہ تاریخ بھی ضمناً آ گئی ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری اس زمانہ میں لکھا گیا۔ جب کہ ہماری سوسائٹی حالتِ زوال تک پہونچ چکی تھی۔ اور مولانا حالی نے زوال کی بڑھتی رو کو روکنے پر کمر باندھی۔ خطباتِ شاعری کے زمانہ ترتیب میں ملک کا ذہن علمی اعتبار سے، علاوہ سیاسی اعتبار سے بھی بیدار ہو چکا تھا اور ضرورت تھی کہ شاعر لکھیں

سیاست کو بھی شامل کر لیا جائے۔ آپ مقدمۂ شعر و شاعری کا زمانۂ تصنیف نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن خطباتِ شاعری کے مطالعے میں آپ کو ہندوستان کی پندرہ سالہ تاریخ کا علم ناگزیر ہوگا

اس فرق کے علاوہ ایک اور فرق بھی ہے جو بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ مولانا حالی نے دیگر مصنفین کے بیان کردہ نظریاتِ شعری پر بہت زیادہ اعتماد کیا ہے اور جابجا اُن کے حوالے دیئے ہیں۔ مولانا سیماب کے نظریاتِ شاعری ایک جدید دائرۂ خیال کی بنیاد کہے جا سکتے ہیں۔ مولانا سیماب نے دیگر مصنفین کے کلام سے استفادہ ضرور کیا ہے۔ لیکن اپنے نظریات کی بنیاد ان مصنفین کے بیانات پر نہیں رکھی مولانا حالی کے بیان کردہ نظریات کو اس وقت صحیح مانا جا سکتا ہے جب اُنکے ماخذ پر بے چون و چرا ایمان لے آیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص ماخذ ہی کو غلط قرار دے دے تو نظریات کی دیوار اگر منہدم نہیں تو متزلزل ضرور ہو جاتی ہے۔

مولانا سیماب کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ وہ اپنے نظریوں کی بنیاد زمانۂ حاضرہ کی ضروریات، مشاہدات، واقعات، اور تجربات پر رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زمانے کی ضروریات بدل جائیں لیکن مشاہدات، اور تجربات کبھی نہیں بدل سکتے۔

مثلاً مقدمۂ شعر و شاعری میں مولانا حالی نے جہاں شعر کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ وہاں اپنے نظریئے کی بنیاد صرف "ملٹن" کے مسلمات پر رکھی ہے جنکی تشریح میں انھوں نے کافی صفحات صرف کئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ملٹن کے اس بیان کو تسلیم نہ کرے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ "سادہ ہو جوش سے بھرا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو" تو مولانا حالی کی یہ تشریح طویل بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس مولانا سیماب کسی مصنف کے بیان کردہ نظریئے کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ وہی کچھ کہتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں

شاعری کی اصلاح کے ضمن میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ زمانے کی ضروریات پر مبنی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعراء صرف غزل نوائی تک اپنی قوتوں کو محدود کئے ہوئے ہیں۔ تو اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ موضوعات کی تلاش کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ملکی واقعات فطرت کے مشاہدات، انسانی ہمدردی اور محبت و صداقت اظہارِ خیال کے لئے بہترین موضوع قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان کے تمام خطبے اسی نوعیت کے درس و پیام سے مملو ہیں۔ صفحات الٹتے چلے جایئے اصلاحی مواد کے سینکڑوں سمندر موجزن نظر آئیں گے۔ اس مرحلے پر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مولانا سیماب کا نظریۂ اصلاح منقولات کا تابع نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے ہر جگہ معقولات سے بحث کی ہے۔ "زمانے کی ضرورت" اُن کے یہاں بہترین ماخذ ہے۔

اب اس کے بعد ہم وہ مقامات واضح کریں گے جہاں مقدمۂ شعر و شاعری اور خطباتِ شاعری میں ربط و توازن ہے۔

شعر کی عظمت دونوں مصنفین یکساں محسوس کرتے ہیں۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ "یہ خاصیت خدا نے شعر میں ودیعت کی ہے کہ وہ ہم کو محسوسات کے دائرے سے نکال کر گذشتہ اور آئندہ حالتوں کو ہماری موجودہ حالت پر غالب کر دیتا ہے۔ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعے سے اخلاق پر ہوتا ہے۔ پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاقِ فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے۔ قومی افتخار، قومی عزت، عہد و پیماں کی پابندی، بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنا، استقلال کے ساتھ سختیوں کی برداشت کرنا ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہو سکیں اور اسی قسم کی وہ تمام خصلتیں جن کے ہونے سے ساری قوم تمام عالم کی نگاہ میں چمک اٹھتی ہے۔ اور جن کے نہ ہونے سے بڑی سے بڑی قومی سلطنت دنیا کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے۔ اگر کسی قوم میں بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا نہیں ہو جاتیں تو بلاشبہ اُنکی بنیاد تو اس میں شعر ہی کی بدولت پڑتی ہے"۔

اسی موضوع پر مولانا سیماب فرماتے ہیں۔

"شاعر ضروریاتِ زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ حیاتِ حاضرہ کی صحیح ترجمانی اور واقعات ہائلہ پر حقیقی تبصرہ جس خوبصورتی اور دقتِ نظر کے ساتھ ایک شاعر کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

"شاعری جس طرح جذبات قومی کے نشر و اعلان کے لئے ایک ذریعۂ مخصوص ہے۔ اسی طرح مذہب کے اثرات کو سامعت گزیں اور دل نشیں کرنے کا بھی ایک خاص وسیلہ ہے۔ نصیحتیں جو نثر میں کی جاتی ہیں۔ وہ اصلاحی نظموں سے زیادہ اثر آفریں نہیں ہوتیں۔ نثر عبارتیں خواہ کیسی ہی خوش ترکیب کیوں نہ ہوں۔ زبانوں سے نکل کر دلوں میں محفوظ نہیں رہتیں مگر ایک درد میں ڈوبا ہوا شعر مدتوں آغوشِ سامعت میں جھولا کرتا ہے۔ اور اس کی موجیں فضائے شوق سے باہر نہیں نکلتیں۔

شاعر سماج کا ایک رکنِ عزیز ہے۔ ایک مضبوط ستون ہے۔ ایک ترجمانِ حقیقت ہے۔ اس سے بے نیاز رہنا سماج کو علمی و ادبی قوتوں سے محروم رکھنا ہے۔ ملکی انجمنوں کی تاریخ میں یہ حقیقت موجود ہے کہ شعرا کی گرم نوائی نے جذباتِ انسانی میں تحریک کی آگ بھڑکا دی ہے۔ اور سرد سے سرد ماحول کو بھی گرم و پُرجوش بنا دیا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوگا کہ شاعری کے افادی پہلو سے دونوں مصنف متفق ہیں۔ لیکن شاعر کی اہمیت کا اعتراف اور شاعر کے کریکٹر کا اعتبار جس درجے تک مولانا سیماب کرتے ہیں۔ اُس درجے تک مولانا حالی نہیں کرتے۔ مولانا حالی نے اس باب میں شاعری کے تاریک پہلو کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ اگر اُن کے یہاں روشن خیالی ہے تو صرف اس قدر کہ "شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے۔ بلکہ بعض طبیعتوں میں اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے۔ پس جو شخص اس عطیۂ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہونچے۔"

لیکن مولانا سیماب نے شاعر کے درجے کو بہت زیادہ بلند و ارفع دکھا کر اس کی اہمیت کو مضبوط کر دیا ہے۔ شعرائے جدید کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا سیماب حقیقی شاعر کا درجہ اس طرح واضح کرتے ہیں:-

"ابھی آپ کو اپنی عظمت و اہمیت کا صحیح اندازہ و احساس نہیں آپ کی قوم پیغمبروں کی قوم ہے۔ آپ کے دماغ پر خود تنبید الہام براہِ راست ضیا باری کرتا ہے۔ آپ خدائے سخن آفریں کے شاگردِ رشید کہلاتے ہیں۔ ادب آپ کے نفوسِ جاریہ کی صدا ہے۔ زبان آپ کے کلمات و ملفوظات سے عبارت ہے۔ آپ قومِ غالب ہیں ملتِ دائع ہیں"۔

ایک اور جگہ پر مولانا سیماب، مولانا حالی کے مندرجہ بالا بیان سے بایں الفاظ اتفاق کرتے ہیں۔

"شاعری ایک فطری جذبہ ہے۔ جو ہر انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے اور جس کا کام میں لانا نہ لانا امرِ اختیاری ہے، اس فطری جذبے میں علم و ادراک، غور و فکر تحقیق و تخیل، ایجاد و اختراع اور نظر و نقد سے ایک قسم کی فنی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شاعر کا الہام انسانوں کی سامعت کے لئے ایک ایسا دلکش گیت بن جاتا ہے۔ جس کا کیف و سرور کبھی کم نہیں ہوتا اور جس کے سازِ مترنم پر دل وجد کرتا ہے۔ اور روح رقص کرتی ہے۔"

مولانا حالی موجودہ اردو شاعری کی روش سے مطمئن نہ تھے۔ اس لئے وہ اس کے مستقبل سے مایوس نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے

"ظاہر ہے کہ جن ذریعوں سے ایشیا کی شاعری ہمیشہ ترقی پاتی رہی ہے۔ وہ اردو کی شاعری کے لئے فی زمانہ مفقود ہیں۔ اور ہرگز اُمید نہیں ہے کہ کبھی آئندہ زمانے میں ایسے ذریعے مہیا ہو سکیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ قدرتی سرچشمہ جو ہمیشہ ہر قوم کی ترقی کا منبع رہا ہے۔ یعنی سیلف ہیلپ۔ اس کی سوتیں بھی ہماری قوم میں مدت

سے بند ہیں۔ پس ایسی حالت میں اردو شاعری کی ترقی کا خیال بجانا
گویا زمانۂ ناساز گار سے مقابلہ کرنا ہے۔ خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ
اردو سے نہایت اعلیٰ اور اشرف زبانوں کی شاعری بھی معرضِ زوال
میں ہو۔ سائنس اُس کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ اور سویلیزیشن اس کا طلسم
توڑ رہی ہے۔ اور اس کے جادو کو حرفِ غلط کی طرح مٹا رہی ہے لیکن
چونکہ یاس اور امید دونوں حالتوں میں آخر وقت تک ہاتھ پاؤں مارنا
جاندار کا طبعی اقتضا ہے۔ مذبوح کی حرکت اور مدقوق کی امید دم
واپسیں تک باقی رہتی ہے۔ اس لئے جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اس سے
یہ جتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ ہوگا۔ بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ کاش ایسا ہوتا"۔

لیکن مولانا سیماب اردو شاعری کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ وہ
فرماتے ہیں۔

"شاعری کی قدامت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا ایک حد تک
بجا ہے کہ اب شاعری میں نئے اور تازہ خیالات کی گنجائش نہیں رہی
لیکن انسان شاعری سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ جب اس کی تخلیق میں
ہنوز ندرت و تنوع باقی ہے تو کیا سبب ہے کہ شعر الہامی مخلوق ہونے
کی حیثیت سے اب بھی نادر و متنوع نہ ہو۔

نہ دنیا کی کوئی صبح نئی صبح ہے نہ کوئی شام نئی شام ہے نہ تارے
نئے ہیں نہ چاند نیا ہے نہ سورج نیا ہے۔ نہ دریا نہ پہاڑ نہ آبشار نہ لالہ زار
مگر پھر بھی ہر صبح میں ایک نئی طلعت۔ ہر شام میں ایک نئی نزہت ہر
رات میں ایک نئی پھبن غرض کہ ہر چھپ کر طلوع و نمودار ہونے والی
چیز میں ایک نیا پن موجود ہے۔ اسی طرح موجوداتِ عالم، واقعات
و کیفیات کے لحاظ سے اپنا رنگ و اثر اور اپنے ماحول کا عالم بدلتے
رہتے ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ لا تعداد اشعار کہے جانے کے بعد بھی
کوئی نیا شعر دماغ سے پیدا نہ ہو۔ یا اس میں کوئی ندرت محسوس نہ کی
جا سکے؟ ——— اِلّا ماشاءاللہ"۔

"جس طرح فطرت کی قدامت نئے واقعات و حادثات سے ہمارے
لئے تنوع پذیر کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہماری شاعری میں بھی الفاظ
نہ سہی کم از کم خیالات و احساسات اتنے نئے ہونے چاہئیں جو ہمارے
اشعار کے نئے اور نادر سمجھے جانے پر دنیا کو مجبور کر دیں۔

اسی نظریئے کے ماتحت اردو شاعری کا وہ رنگِ قدیم جسے تغزل بھی
کہتے ہیں۔ بتدریج مٹتا جا رہا ہے۔ اور اسکی جگہ جدید خیالات کو مل رہی
ہے۔ جسے جدید شاعری کہتے ہیں وہ حقیقت میں جدید شاعری نہیں
بلکہ شاعری کا جدید اسلوب ہے۔ فنِ شاعری تو اب تک انھیں اصولوں
اور بنیادوں پر مبنی ہے۔ جو واضعانِ فن نے اب سے صدیوں پہلے قائم
کی تھیں مگر نفسِ شاعری بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اور یہ تبدیلی نہ صرف
وقت اور زمانے کے مطابق ہے بلکہ دنیا کا مستقبل بھی اس تبدیلی کے
بعد خوش آئند نظر آتا ہے۔ اب ہماری شاعری میں جذبات کے ساتھ
درس و پیام بھی ہے یعنی جو کڑوی سے کڑوی بات ہم نثر میں نہیں
کہہ سکتے وہ نظم میں بے تکلف کہہ جاتے ہیں۔ اور سننے والے پر اس کا کوئی
تلخ اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اب ہمارے اشعار ایک خاندان کے ہر بزرگ
اور ہر فرزند کے سامنے سنائے جانے کے قابل ہیں۔ اور اب ہمارے
خیالات اس درجہ مہذب پاکیزہ اور ستھرے ہو گئے ہیں کہ ہم صرف اپنی
شاعری سے اصلاح و تہذیب اور تعمیر و تاسیس کا کام بہ آسانی لے
سکتے ہیں"۔

اس کے علاوہ اور متعدد مقامات پر بھی مولانا سیماب نے تصویر
کا روشن پہلو نمایاں کیا ہے۔ شعر و شاعری اور اردو شاعری کی ہئیت
ترکیبی کے بعد شاعروں کا ذکر آتا ہے۔ مولانا سیماب شاعروں کی موجودہ
روش کے بالکل خلاف ہیں۔ انھوں نے جا بجا لکھا ہے کہ شاعروں
کا موجودہ نظامِ انتقاد تبدیل ہونا چاہئے۔ اور انھیں زیادہ سے
زیادہ اہم ادبی مجالس بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اسی سلسلے

ہیں مولانا سیماب نے شاعروں میں خطبہ خوانی اور محاکمہ کو رواج دیا ہے اس کے برعکس مقدمۂ شعر و شاعری میں مشاعروں کی اصلاح پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ مولانا حالی کا مقصد شاعری کی توضیح تھا اور انھوں نے ایک کورس بک کی حیثیت سے مقدمۂ شعر و شاعری کو مرتب کیا۔ اسی لحاظ سے اس میں موضوعات کا تسلسل ہے۔ اور ایک خاص ترتیب سے عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔

مگر خطباتِ شاعری میں ہر خطبہ ایک تقریر مکتوب ہے۔ مختلف ادبی مجالس میں مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں تسلسل نہیں ہے۔ بلکہ انفرادی حیثیت سے ہر خطبے میں مختلف و متعدد عنوانوں کے تحت نظریات قائم کئے گئے ہیں۔

غزل کے متعلق بھی دونوں کتابوں میں بہت زیادہ مواد موجود ہے۔ اور دونوں مصنف غزل کی اصلاح چاہتے ہیں۔ مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری کا ایک حصہ غزل کے لئے وقف کیا ہے۔ اور مولانا سیماب نے بھی ایک خطبہ صرف غزل کے لئے مخصوص کیا ہے۔ ان دونوں حصوں کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ غزل کیا تھی۔ کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہئے۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں چند باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر خطباتِ شاعری میں نہیں۔ اسی طرح خطباتِ شاعری میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو مقدمۂ شعر و شاعری میں جگہ نہیں دی گئی۔

مثلاً مولانا حالی نے مندرجہ ذیل عنوانات پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ شعر کی علمی تعریف اور اس کے متعلق مختلف مصنفین کے بالترتیب نظریئے۔

۲۔ اصنافِ شاعری کی تقسیم۔ اور ان پر تفصیلی تبصرہ۔ مثلاً۔ قصیدہ، مثنوی مسدس وغیرہ۔

لیکن مولانا سیماب نے انکا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ یہ باتیں دیا... فن سے تعلق تھیں۔ مقدمۂ شعر و شاعری کے علاوہ اور بہت سی کتابوں میں بھی انکا ذکر پایا جاتا ہے۔ مولانا حالی کے بیان میں صرف خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قدیم اور اپنے عہد کے موجودہ شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا سیماب کا اُن موضوعات کا ذکر نہ کرنا اس بات پر بھی مبنی ہے کہ مولانا حالی ان کے متعلق بالتصریح لکھ چکے ہیں اور وہ بارہ اُن کا ذکر کرنا تقلید اور اعادۂ محض تھا۔ ایک کورس بک میں تو ان موضوعات کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک تقریر میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

مقدمۂ شعر و شاعری کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ابتدا میں مولانا حالی نے چند اصول مرتب کرکے اُنکی تشریح کی ہے وہ اصول اس قدر نمایاں ہیں کہ اگر اُن کو الگ قلم بند کر لیا جائے تو ایک صفحے سے زیادہ جگہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ انہی اصولوں کی تشریح میں مولانا حالی نے متعدد شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں۔

اب خطباتِ شاعری کی طرف آیئے۔

۱۔ مولانا سیماب نے اپنی تمام تقریر میں مقامی فضا۔ اور ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کی ہیں۔ اس لئے ان میں ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جو کسی خاص وقت یا کسی خاص ماحول میں کہی جا سکتی ہیں۔

۲۔ مولانا سیماب نے آگرہ کی ادبی عظمت کو بالوضاحت واضح کیا ہے۔ اور آگرے کے شعرا کو گمنامی کے پردے سے باہر لانے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ مولانا سیماب نے جو خطبے کالجوں کے شاعروں میں پڑھے ہیں ان میں طلبا اور شاعری سے متعلق اپنے مخصوص انداز میں پیغام دیا ہے۔ اور یہ پیغام ملک کی موجودہ فضا کے اعتبار سے بہت زیادہ قابلِ غور و اہم ہے۔ اور دلچسپ بھی اس لئے کہ "طلبا اور سیاست" کا سوال ملک کے لئے ایک اہم مسئلہ

بنا ہوا ہے۔ طلبا میں شاعری کا مذاق بھی روز افزوں ترقی پذیر ہے اس لئے ان کے لئے ایک شاہراہِ عمل تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ ملک کے لیڈروں نے "طلبا اور سیاست" کے موضوع پر تو بہت کچھ توجہ دی لیکن اُن کے ذوقِ شاعرانہ کے متعلق خاموشی سے کام لیا تھا۔ ان خطبوں نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

۴۔ شاعروں کی اصلاح مولانا سیماب کے خطبوں کا ایک اہم جزو ہے۔
۵۔ شاعروں میں خطبہ خوانی کا رواج مولانا سیماب کی تحریک ہے۔
۶۔ شاعرے کے بعد اس پر محاکمہ کرنا بھی ایک نئی اصلاحی جرأت ہے
۷۔ جمعیۃ الشعرا کے قیام کی طرف بھی بعض خطبوں میں توجہ دلائی گئی ہے
۸۔ شعرائے موجودہ کے کلام پر بعض خطبوں میں تفصیلی تبصرہ ہے۔
۹۔ بعض خطبوں میں اُردو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔
۱۰۔ مناظموں کا رواج خطبات کا موضوعِ مشترک ہے۔

مندرجۂ بالا سطور سے ادب اردو میں مقدمہ شعر و شاعری اور خطبات شعر و شاعری کا درجہ واضح ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری میں جو کمی تھی اسکو خطباتِ شاعری نے کس حد تک پورا کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا یہ کہنا خالی از حقیقت نہیں ہے کہ مولانا حالی نے جس مقصد کی ابتدا کی تھی مولانا سیماب نے اس مقصد کو انتہائے کمال تک پہونچا دیا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری اور خطبات شاعری دو جداگانہ حیثیتیں نہیں رکھتے، بلکہ ایک ہی نے کی دو صدائیں ہیں۔ اور ایک ہی ساز کے دو نغمے۔ جو شمع مولانا حالی نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں جلائی تھی، مولانا سیماب اکبر آبادی نے بیسویں صدی کے ربع اوّل کے بعد اس کی لو بڑھا دی ہے۔ خدا اس کی روشنی کو رہتی دنیا تک محفوظ رکھے۔

اُردو کے لسانی مراکز

سازِ لسانی کی ایسی تشکیل و توضیح جو ضروریاتِ عہدِ جدید کی تکمیل میں معاون ہو سکے، متحد العمل اور ہم آہنگ تربیت گاہوں کی موجودگی پر منحصر ہے اردو کی موجودہ تکمیل، ایک درجن کے قریب علمی مراکز کی گلکارانہ شگفت کی رہینِ منت ہے۔ جو مختلف اوقات میں ہندوستان کے مختلف حصّوں میں قائم ہوئے ہیں۔ نئی ضرورتوں اور نئے نظریوں کی کثرت و تواتر کے ساتھ ساتھ ان لسانی مراکز کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور ان کی کوششوں نے قدامت کو تازگی عطا کی ہے۔

ان کے حیات افروز اور نمو بخش اثرات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اُردو لٹریچر کے تعلیم و احیا کیلئے قابل قدر معاون ہیں۔ ان اداروں میں بہت زیادہ اہم مندرجہ ذیل ادارے ہیں۔

(ا) دار المصنفین (اعظم گڈھ)
(ب) جامعہ ملیہ (دہلی)
(ج) انجمن ترقی اردو (حیدر آباد دکن)
(د) اردو اکیڈیمی (الہ آباد)
(ہ) مسلم یونیورسٹی (علی گڈھ)
(و) زمیندار (لاہور) (بطور ایک ادارے کے)
(ز) نیا زندانِ لاہور (نیرنگ خیال۔ سالک۔ تاثیر۔ بخاری۔ تاج احمد شجاع)
(ح) آگرہ اسکول (سیماب)
(ط) نگار اسکول (لکھنؤ)
(ی) آغا حشر اسکول (برائے ڈرامہ)

ایم حسن لطیفی۔ بی۔ اے۔

کلیم عجم کے مصنّف سے خطاب

از ——— حضرت مولانا محوی جلالپوری

اے کلیمِ ہند اے ملکِ سخن کی تاجدار
مامن و ملجائے اردو کی حقیقی شہریار

اے عجم کی آفتابِ علم و حکمت اے ادیب
ہے مسلّم اس زمیں پر تیری سطوت اور وقار

اے ادب کی جان اے روحِ روانِ بزمِ شعر
اک تری ہستی سے دنیائے سخن میں ہے بہار

تو نے روحِ داغ اور مومن کو زندہ کردیا
اے کہ تو ہے میر و مرزا کی حقیقی یادگار

تیری ہستی مایۂ صد نازشِ فضل و کمال
تیرے ہر ہر لفظ سے پیغامِ نو ہے آشکار

اے شہنشاہِ قلم اے کردگارِ شعریت
غیر ممکن ہے تری اوصافِ عالی کا شمار

پھونک دی اک روح تو نے شاعری کے جسم میں
بادۂ کہنہ کو بخشا مستئ نو کا خمار

اے کہ تو نباضِ فطرت اے کہ تو نباضِ قوم
تیرا اک اک شعر دردِ قوم کا آئینہ دار

اے امامِ شاعری پیغمبرِ شعر و ادب
اے محبت کے پیامی اے وفا کی کردگار

ہر نفس تیرا تپیدہ ہر نظر آتش فروز
فطرتاً پایا ہے تو نے اک دلِ آشفتہ کار

چاہتا ہے پھونک دے تو روح ملک و قوم میں
قوم کی پستی سے تیرا دل بہت ہے بیقرار

اے شہیرِ آگرہ اے عظمتِ ہندوستاں
معترف ہے تیرے علم و فضل کا سارا جہاں

(۲)

ہو حریمِ شامِ مشرق کی دوامی ماہتاب
اے سوادِ صبحِ گیتی کی فروزاں آفتاب

کروٹیں بدلی ہزاروں نے زمین و آسماں
پھر بھی مشکل ہے کہ ہو پیدا کوئی تیرا جواب

تو نے اس انداز سے تجدیدِ ہر میخانہ کی
ہو گئی ہے عام دنیا میں محبت کی شراب

تجھسے ہے تابندہ قسمت سیکڑوں ذرات کی
اک زمانہ ہو رہا ہے آج تجھ سے فیضیاب

تو فصیحِ ملک ہے تو شاہنشاہِ ارضِ ادب
شاعرِ مشرق کروں کس نام سے تجھکو خطاب

غیر ممکن ہے کہ ہو تنقید تیری ذات پہ
اے کہ تیری کارنامے بیشمار و بے حساب

بن گیا استاد جس پر پڑ گئی تیری نگاہ
ہو گیا شاعر کیا جس نے بھی تجھ سے اکتساب

تجھکو صدیوں تک زمانہ اب بھلا سکتا نہیں
فرد ہے لاکھوں میں تو اور سیکڑوں میں انتخاب

تجھ سے درسِ آدمیت لیگی دنیا تیرے بعد
آنے والی نسل پوجے گی تری اک اک کتاب

تیری خوشبو سے معطر ہے جہانِ شاعری
تو گلستانِ ادب کا ہے بہار آرا گلاب

تا ابد یارب رہے سیماب زیبِ انجمن
ہوں تری محوی خستہ کی دعائیں مستجاب

ہے یہ اوج و افتخارِ محفلِ ہندوستاں
اس کے دم سے ہے بہارِ محفلِ ہندوستاں

یوپی کا چاند

از ـــــــ حضرتِ جذب جائسی

لا پلا ہم کو شراب ارغوانی ساقیا — جس کے پینے سے ہو مستی غیر فانی ساقیا
ناتوانی کی نہ کر نا بدگمانی ساقیا — آگ پی لیتے ہیں ہم تو کر کے پانی ساقیا
ہو کرم تیرا ہو تیری مہربانی ساقیا — شاید آ جائے قلم میں کچھ روانی ساقیا

ایک کوزے میں ہمیں بھرنا ہے دریائے ادب
موجزن سی آج نظروں میں ہے دنیائے ادب

قابلِ صد رشک ہے اردو کی یہ خوش قسمتی — میر و سودا کی مبارک گودیوں میں یہ پلی
تربیت پھر درد و سوز و جرأت و انشا سے لی — آتش و ناسخ کے ہاتھوں اسکی آرائش ہوئی
ذوق و غالب اور دبیر و میر انیس لکھنوی — خوشنمائی اور نفاست ان سے اردو کو ملی

شستگی برجستگی پاکیزگی دی داغ نے
کیا سلاست اور رنگینی دلکشی دی داغ نے

فیض پہونچا کر ہوئے سب راہیِ ملکِ بقا — یوں سمجھ لو ابر اٹھا، برسا، برس کر کھل گیا
بزمِ اعظم پہ جہاں سے اک اندھیرا سا ہوا — یعنی یوپی کی نظر آنے لگی دھندلی فضا
داغ کا فیضان ہے یہ، مرحبا صد مرحبا — آج یوپی میں نیا اک چاند روشن ہو گیا

گوشہ گوشہ میں ہے جس کی چاندنی پھیلی ہوئی
ہے ضیا جسکی جہاں میں واقعی پھیلی ہوئی

چاند کیسا؟ جسکی کرنیں ہیں فروغِ روزگار — چاند کیسا؟ چاندنی سے جسکی دل ہو نور بار
چاند کیسا؟ دل زباں سے چھینا جس کا شعار — چاند کیسا؟ ثبت کر دے دل پہ جو نقش و نگار
چاند کیسا؟ کھینچ دے لفظوں میں جو تصویرِ یار — چاند کیسا؟ مانی و بہزاد ہوں جس پہ نثار

روشنی ہے چاند میں بیشک مگر وہ ماند ہے
ارضِ یوپی کا منور اور روشن چاند ہے

کیا کہیں پوشیدہ ہیں کیا خوبیاں سیمابؔ میں — ہے عجب زورِ قلم زورِ بیاں سیمابؔ میں
ہے نہاں نثر و سخن کا آسماں سیمابؔ میں — علم و فن کے فیض کا دریا رواں سیمابؔ میں
عالمِ پیری ہے گو جلوہ فشاں سیمابؔ میں — لیکن استعدادِ شعری ہے جواں سیمابؔ میں

چاند میں یوپی کے نورِ جاوداں مستور ہے
جذب کرے جذبؔ اسے الفاظ میں معذور ہے

زہر دل بہ برادر دہم نہ یعقوبم
کہ پور خویش بود دلستان دلبر من

از

ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

مسند نشین قصر الادب دار الخلافہ اکبرآباد کا تقاضا ہی کہ سالنامۂ شاعر کے لئے میں کچھ ہرزہ سرائی کروں، مسند نشین قصر الادب کون؟ اعتفا دی عاشق حسین بہ ہمایت تخلص بہینِ تلامذہ و یادگارِ جہاں استاد نواب فصیح الملک داغ دہلوی سے ہی۔

سالنامۂ شاعر سے تو بحث وہ لوگ رکھیں جن کو ادعائے مضمون نگاری و شاعری ہو، ہاں جس سے سالنامہ وابستہ ہی اُس کی ذات سے مجھے نہایت استوار علاقہ ہے اُسی کے لئے میں خامہ فرسائی کرنے کو حاضر ہوں کہ وہ میرا قوتِ بازو ہے۔ ہنرمند ہے۔ محاسن ادب میں بے مثل ہے، جدت پسند طبیعت فطرت سے لے کر پیدا ہوا ہے۔ اپنے استاد بھائیوں کے لئے مایۂ نازش و افتخار ہی ہم سب کا اعتبار و اقتدار بڑھانے کے لئے ہمارا ہم سلکِ قدرت نے اُسے کر دیا ہے۔

نواب فصیح الملک مرحوم کی بلند بختی کا دنیائے ادب میں جو شخص معترف نہ ہو وہ مرتکب معصیت عظیم ہونے کے مترادف کہا جا سکتا ہے۔ اُس مرحوم میں وہ ہیبت تو تھی ہی جس کا ہر فرد موزوں طبع عام۔ اس سے کہ مبتدی ہو یا منتہی قائل ہے ساتھ ہی اقبالِ شاعری نے وہ ارتقا حاصل کیا تھا کہ شاہ سے لیکر گدا تک نے اُس سے استفادہ کا لنشاد کیا نیز یہ کیا کم اُس مرحوم کی ہنرمندی تھی کہ اپنی آنکھیں بند ہونے کے بعد اُس نے کچھ اپنے نام لیوا والے ایسے چھوڑ دئے جن کی دست بوسی اہلِ سخن اور قدر دانانِ سخن کرتے ہیں۔ اور عقیدت کا دم بھرتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ ہستی ہے۔ جو مجھے عزیز تر از جان نظر آتی ہے۔ اُسکی جامعیتِ شاعری ایسی انوکھی ہے جس سے بعض اوقات ایک حیرت سی طاری ہو جاتی ہے اور دعائے سلامتی دل سے نکلتی ہے۔ شاعری کے چند اصناف ہیں۔ بڑے بڑے نامور شعرا جنھوں نے اپنے کمالات کے ڈنکے بجائے ہیں۔ وہ بھی بعض خاص اصناف پر قادر ہوئے ہیں۔ مثلاً قصیدہ گو مخصوص قصیدہ کی صنف کے اُستاد مانے گئے ہیں غزل گو غزل کے مثنوی نگار مثنوی کی رباعی گو رباعی کے اس عزیز میں یہ صفت خاص دیکھی کہ جس صنف پر قلم اُٹھایا اُسمیں ثابت کر دیا کہ جادۂ سخن یوں طے کیا کرتے ہیں۔ آگرے کا موقت الشیوع جو ماہانہ عزیز موصوف کی نگرانی میں بہ خود اعجاز حسین کے اہتمام سی شائع ہوتا ہے۔ جس کے اوراق و صفحات اُس کی کاوش سے پُر داغ نظر آئیں گے۔ میری قول کی تصدیق کر سکتا ہی کہ اُس کی بیش از بیش مضامین بعنوانات مختلف اُسی ہستی کی سحر کاری ہوتی ہی۔ اصلاح کی عنوان کے صفحات کہنے کو تو اصلاح کا حصہ ہوتا ہے جس سے تعلیمِ ادب ثابت ہے۔ وہ اصلاح جن کے کلام پر ہوتی ہے۔ وہ اپنا کلام عیوب سے پاک ہوتا ہوا دیکھ کر دل میں ضرور خوش ہوتے ہونگے اگر صحیح ذوق اور عقیدت رکھتے ہوں۔ لیکن وہ اصلاح صرف اُن ہی مبتدی لوگوں کو فائدہ رساں نہیں ہوتی۔ وہ ہر بالغ نظر کے لئے وقتِ مطالعہ سبق دہ ثابت ہوتی ہے۔ نیز مصلح کا رتبہ بتاتی ہے۔ اصلاح کا ہر لفظ، ہر جملہ اپنا معنوی وزن اور محل صرف استعمال بتاتا ہے۔

شاعر کے عنوانِ تنقید کو دیکھ کر مجھے اکثر و بیشتر خوف سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ زمانہ ہنر پسند نہیں رہا۔ اس میں بجائے ممنون

ہونے اور سبق حاصل کرنے کے لوگ ناقد کو فاسد و بدخواہ سمجھ کر خود اُس
کے بد اندیش اور دشمن ہو جاتے ہیں۔ میں اس عزیز کو جانتا ہوں کہ دنیا
عزیز اور دوست رکھے لیکن صورت دگرگوں پیدا ہو جاتی ہے۔ لطف یہ
ہے کہ اس مفید تجربے سے فائدہ معنت حاصل کر لیتے ہیں اور بداندیشی
کو قائم رکھتے ہیں یہ کس قدر ستم ظریفی ہے۔

"شاعر" کا ہر وہ عنوان جو مدیر "شاعر" کی خاص تصنیف و تالیف سے
تعلق رکھتا ہے۔ دیکھنے کی چیز ہوتا ہے۔ میں اُس شاعر کے محاسن کو دیکھ کر بیخود
ہو جاتا ہوں۔ معانی و لطافت و پاکیزگی مفہوم کے اعتبار سے جس میں
نویت و جدّت کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے۔

میں برادر عزیز سیماب صاحب کی زیادہ تعریف یوں جائز نہیں
رکھتا کہ وہ اور میں بروئے یگانگت ذوقِ ادب ایک ہیں۔ اپنے کی تعریف
اپنی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے مدحت نگاری سے قطع نظر کر کے کچھ
اور کہنا چاہتا ہوں۔ اس سے مجھے انکار نہیں کہ زبانِ اردو کی خدمت بتعداد
رسالے کر رہے ہیں۔ جن کا ذخیرہ اک حد تک قابلِ قدر ہوگا۔ لیکن "شاعر"
نے جس خدمت پر کمر باندھی ہے یہ بندھی رہنی چاہئے۔ اُس کا مفید تر ہونا
اُسی جہد و کوشش پر منحصر ہے۔ جو ہنوز ہو رہی ہے۔ کسی نہ کسی وقت یہ
سعی حسب مراد مشکور ہوگی۔ اور ایک وقت خدا وہ لائے گا کہ کسی نکتہ شناس
صاحب قلم کی ادبی خدمت میں "شاعر" ہی آئینہ داری کرے گا۔ نگارشِ ادب
میں فی زمانہ جو امامت کا منصب رکھتا ہے۔

اس رسالہ کے کسی نہ کسی صفحہ پر ایک نظم اہلِ مطالعہ کے نظر میں آئیگی
وہ نظم دہلی کے براڈ کاسٹ اسٹیشن سے داغ ڈے کے موقع پر سامعہ نواز
عالم ہوئی ہے۔ اُسکی مقبولیت کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ
مصنف سے سینکڑوں اصحاب نے اُسکی نقل مانگی ہے۔ اور بیسیوں نے مجھے
اُسکی کاپی طلب کی ہے۔ تمہید و غایت اُس کے مضمون کی جہاں اُستاد
مرحوم کی مدحت ہے جو قصیدہ کی شان میں قصیدہ ہے۔ اور مرثیہ کے
پیرایہ میں مرثیت اُس کو ملاحظہ کرنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ میں نے جو صفات
ادبی اپنے بھائی کے صدر مضمون میں لکھے ہیں وہ مبالغہ سے مقصود نہ ہوں گے۔

اس مضمون کو میں ختم کرنا چاہتا ہوں سیماب بھائی کو معزز خطاب
جانشین داغ دے کر جس کا حق مجھے حاصل ہے۔ کہ میں جہاں تک
فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم کے سلسلۂ تلامذہ میں وہ منصب رکھتا ہوں
جو اُن کے کسی شاگرد کو میسر نہیں ہے۔ خواہ بروئے فن اکثر اُن میں
مجھ سے افضل و اعلےٰ ہی کیوں نہ ہوں۔ **اُستاد مرحوم کے شاگرد
جو سیماب صاحب کو جانشین اُستاد کے خطاب سے
مخاطب نہ کریں گے، اُن سے مجھے شکایت ہوگی۔**
میری شکایت اُنکی حقارت ہوگی۔ میرے عزیز رکھنے والوں کو واجب
و لازم ہے کہ سیماب صاحب کی ہستی کو اتنا ہی عزیز رکھیں جو اُنکی
وقعت میری نظر میں ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ ہستی جس پر فنِ ادب
کے محاسن و اختصاص سے میں فریفتہ ہوں اُس کو خدائے عزوجل عمر
طبعی عطا فرمائے اور مقاصدِ قلبی دینی و دنیوی پر اُس کو کامراں اور فائز
کر دکھائے۔ آمین ثمہ آمین۔

آثم ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائل

۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء

اقبالؔ اور سیمابؔ

ہندوستان کے دو بے مثل نظم نگار

از ـــــ سیّد عنایت علی صاحب بی۔ اے (علیگ)

گزشتہ چوتھائی صدی میں نظم اردو نے جس شان و شوکت کیسا تھ ترقی کی ہے۔ اُس کا نتیجہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے شعرا کا عام طور پر نظم کی طرف میلان اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ گزشتہ پچیس سال کے عرصے میں ایک زمین تیار کی جا رہی تھی جو اپنی پیداوار کے لحاظ سے آج زرد مان خیز ثابت ہو رہی ہے نظم اردو کے معماروں میں اقبالؔ اور سیمابؔ کو جو اہمیت حاصل ہے اُسی کو ہم اپنے اس مضمون میں واضح کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنے اصلی موضوع کی طرف رجوع کریں، اقبالؔ اور سیمابؔ کے ماحول اُن کی دماغی نشو و نما اور عام حالات کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں اسی دوران میں ہم یہ دکھائیں گے کہ ایک ہی موضوع دو اہلِ قلم کے ہاتھوں میں کیا صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہ صورت، حالات ماحول اور دماغی نشو و نما کے کس قدر تابع ہوتی ہے۔

اقبالؔ کی سوانحِ حیات مغربی روش پر ڈھلی ہوئی ہے انہوں نے وہی کچھ کیا جس کی ہند جدید میں ایک صاحبِ کمال انسان کو گنجائش مل سکتی تھی۔ اقبالؔ نے ہندوستان کی انگریزی تعلیم گاہوں سے فائدہ اُٹھایا اور جب وہ ہندوستان میں ذخیرۂ ادب کو خالی کر چکے تو یورپ کا رُخ کیا تعلیم سے فارغ ہوئے تو مغربی طرزِ معاشرت پر بود و باش اختیار کی۔ ہندوستان کے علمی اداروں میں شریک ہوئے۔ ملکی اور قومی جد و جہد میں بھی اپنے رجحانات کے مطابق حصہ لیا۔ اور آخر وہی کچھ بن گئے جو ہندِ جدید کا ایک صاحبِ کمال انسان بن سکتا تھا۔ یعنی حکومت نے اعترافِ کمال کر کے انھیں علامہ سے "سر" بنا دیا۔

لو مدرسۂ علم ہوا قصرِ حکومت ۔۔۔ افسوس کہ علّامہ سے سر ہو گئے اقبالؔ
پہلے تو سرِ ملّتِ بیضا کے تھے سرتاج ۔۔۔ اب اور "سنو تاج" کے سر ہو گئے اقبالؔ
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ ۔۔۔ سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبالؔ

یعنی اب زبانِ اردو کا عظیم المرتبت شاعر "ڈاکٹر محمد اقبالؔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا" تھا۔ اقبالؔ کی شہرت صرف اُن کے کلام کی مرہونِ منت نہیں۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔ حقائق سے ناآشنا ہیں۔ اُنکی شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کا فلسفہ، قومی اور ملکی سیاست میں اُنکی خدمات، اور علومِ مغرب میں اُن کا تبحر تھا۔ غرض ان سب باتوں نے مجموعی حیثیت سے ہمارے سامنے ایک شخصیت پیش کی جس کا نام "اقبال" ہوا۔ اقبالؔ ایک ہی وقت میں شاعر بھی ہے، فلسفی بھی ہے، سیاست داں بھی ہے، اور قانون داں بھی۔ ایک حلقے کی شہرت، دوسرے حلقے کی اعانت کرتی ہے

اور یہی سبب ہے کہ ہم آج اپنی دنیا میں اقبال کا نام سنتے ہیں۔

اب دوسری طرف آیئے۔ سیماب کی پیدائش مشرقی ماحول میں ہوئی، تربیت بھی مشرقی اثرات کے زیر اثر پائی۔ وہ مشرقی سوسائٹی میں پروان چڑھے اور اپنی زندگی کے بیشتر اور اکثر حصوں میں انھیں مشرقیوں ہی سے واسطہ پڑا۔ اس اعتبار سے مشرق کی ضروریات، اور مشرقی خصوصیات کی ترجمانی و نمائندگی جس طور سے سیماب نے کی وہ مشرقی تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ تھا۔

سیماب کی ابتدائی شاعری مشاعروں سے شروع ہوئی۔ انھوں نے وہ تمام مراحل طے کئے جو ایک اردو زبان کے شاعر کو طے کرنے پڑتے ہیں۔ مشاعروں کے اسٹیج پر انھیں اپنے تمام ملکی شعرا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے ان سب چیزوں سے اثر لیا اور پھر روشِ عام سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نصب العین قائم کر لیا۔ جو تمام تر مشرقی ماحول کا پیدا کردہ تھا۔ اور جس کی مشرقی سوسائٹی کو ضرورت تھی۔

اقبال نے مشاعروں میں شرکت کی لیکن بہت کم۔ ان کی شہرت مشاعروں کے اسٹیج سے نہیں ہوئی۔ بلکہ اخبارات و رسائل کے صفحات بیشتر اس شہرت کا ذریعہ بنے۔ انجمن حمایتِ اسلام میں نظمیں پڑھنا بھی اقبال کی شہرت کا باعث ہوا۔ اس اعتبار سے بامِ شہرت تک پہونچنے کے لئے جن دشوار منزلوں سے سیماب کو گزرنا پڑا۔ اقبال اپنی خوش بختی سے ان سے بچ گئے۔ سیماب کو بہت بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ مشاعروں کی شرکت، تمام سوسائٹی اور عام مذاقِ طبیعت کا مطالعہ ارتقائی خیالات کی ترجمانی، یہ سب ایسی شرائط ہیں جو اردو شاعری نے اپنے مستند اور مشاہیر شعرا کے لئے ہمیشہ سے قائم کر رکھی ہیں

اس تمام تر تفصیل سے مقصد یہ تھا کہ سیماب نے اپنے لئے جو روش اختیار کی وہ اقبال کی روش سے جداگانہ تھی۔ اقبال نے اپنے لئے زمانۂ جدید کے مختلف ذرائع استعمال کئے۔ علمی سوسائٹیوں میں شرکت کی، کانفرنسوں میں نغمہ سرائی کی اور اخبارات و رسائل کے ذریعے ملک کو پیام دئے۔ اس کے برعکس سیماب نے مشاعروں کی راہ سے نمود حاصل کی۔ اپنے ہمعصر شعرا سے مقابلہ کیا اور ایک عرصے کے بعد جب یہ سب مراحل طے کر لئے تو اپنا نصب العین اور اپنی زندگی کے پروگرام پر عمل کیا۔

سیماب پر مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ آج تک مشرقی روایات پر عامل ہے۔ اس کے روزانہ معمولات، اس کے عقائد اور اس کا برتاؤ تمام تر مشرقی ہے۔ ملک میں اس کی ایک خاص جماعت ہے۔ اس کا ادارۂ الخیال مخصوص ہے۔ اور وہ اپنے کارواں کی رہنمائی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس کا تمدن، تہذیب اور معاشرت بھی مشرقی ہے۔ وہ اپنے معنوی فرزندوں سے اسی طرح محبت کرتا ہے۔ جس طرح ایک مشرقی بزرگ کے شایانِ شان ہے۔

دوسری طرف اقبال تنِ تنہا پیام دیتا ہے۔ اس کو اپنے افکار و انہماک سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ کسی کارواں کی بنیاد ڈالنے کا خیال قائم کرے۔ اور یہ چیز اس کے مسلک، اسکی تعلیم اور اس کی زندگی کے گزشتہ تجربات کے بھی منافی ہے اس لئے کہ وہ مغربی ماحول کا پیدا کردہ ایک مشرقی انسان ہے۔

یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ دو شعرا کے مسلک اور طرزِ عمل میں مندرجۂ بالا تفاوت کسی تفوق یا ترجیح کے لئے نہیں دکھایا گیا بلکہ دماغی نشو و نما، اور شاعری کے استحکام کے بیان میں یہ چیزیں بہت اہم درجہ رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر ضروری تھا۔

آپ میر، نظیر، غالب، مومن، داغ اور امیر و جلال وغیرہ کی صف میں سیماب کا ذکر کر سکتے ہیں۔ لیکن اقبال کی روشِ کار کو دیکھتے ہوئے انھیں صرف مغربی شعرا کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

اُردو شاعری ایک مسلسل زنجیر سے وابستہ ہے۔ سیماب نے اسی کڑی میں اضافہ کیا ہے۔ مگر ان کے مقابلے میں اقبال مغربی شعرا کی زنجیر میں منسلک نظر آتے ہیں۔ یہ تفاوت بجائے خود اس قدر اہم ہے کہ ادب اردو کا کوئی ناقد و مورخ اسے کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتا موجودہ زمانے میں قدیم طرز عمل کا پابند ہو کر اپنے لئے اور اپنی جماعت کے لئے ایک جدید شاہراہ پیدا کرنا سیماب کا ایک ایسا تاریخی اختراع ہے۔ جسے ہم اس وقت کسی مصلحت سے نظرانداز کر دیں تو کر دیں لیکن ہماری تاریخ شاعری اسے کبھی نہیں بھلا سکتی۔

سیماب کے یہاں چند خصوصیات اور بھی ہیں۔ جن کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ اس کے رجحانات اور اس کی دماغی تعمیر کو ہم پوری طرح سمجھ سکیں۔ ادب اردو میں ایک مستحکم اور نمایاں درجہ حاصل کرنے کے بعد سیماب نے ترقی کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور یہ لازمہ تھا۔ جدید زمانہ اور جدید ضروریات کا۔ ہمارے قدیم شعرا کو مختلف زمانے میں زندگی بسر کرنی پڑی ہے۔ ان کی ضروریات مختلف تھیں اور اسی اعتبار سے ان کی فضائے کار بھی مختلف تھی سیماب نے بھی اپنے زمانے کی ضروریات پر توجہ دی۔ اور اپنے ملکی ادب کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ایک ایسی نئی روش قائم کر دی جو ماضی کا مستقبل سے رشتہ قائم کر سکے اور جو غیر فطری نہ ہو بلکہ ارتقائے خیالات کا تدریجی نتیجہ ہو۔ ہم اپنی ذہنیت میں یک لخت کبھی انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر فوری انقلاب کسی سبب سے پیدا ہو بھی جاتا ہے تو وہ دیرپا اور قوی الاثر نہیں ہوتا۔ اس لئے چند ایسے ذرائع کی ضرورت ہر زمانے اور عہد میں محسوس ہوتی ہے۔ جو ملکی ذہنیت کو تدریج ارتقا اور انقلاب کی طرف مائل کر سکیں۔ سیماب نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام یہ انجام دیا ہے کہ اردو شاعری کو مستقبل کی روشنی میں اس قدر مستحکم بنا دیا ہے کہ وہ آئندہ چل کر ہر

انقلاب اور ہر تبدیلی کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اپنے کارواں کی تربیت میں سیماب کا یہ مسلک بہت نمایاں ہے۔

حالات اور رجحانات کے تفاوت کے بعد اب اقبال اور سیماب کی نظموں کو لیجئے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اقبال کی شاعری مغربی تربیت کی پیداوار ہے۔ اقبال کی نظموں کے مطالعے کے لئے ہمیں مغربی شعرا کی نظمیں اپنے ذہن میں محفوظ رکھنی چاہئیں۔ اقبال کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت ہم اسی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ من حیث المجموع اقبال کی شاعری جن ادوار سے گزری وہ ادوار بھی اقبال کی ذہنی تربیت کے زیر اثر ہیں۔ ابتدائے شاعری میں اقبال ایک فطرت پرست شاعر تھا۔ اور اس کی بعض نظمیں مغربی شعرا کی نظموں کا ترجمہ تھیں "ہمالہ" "گل رنگیں" "عہد طفلی" "ابر کوہسار" "موج دریا" "آفتاب صبح" وغیرہ سے اقبال کی اندرونی کیفیتوں کا پتہ چلتا ہے اسی فطرت پرستی کے ساتھ ساتھ اس میں انسان اور انسانیت کا درد، زندگی و موت پر غور و فکر کے مادے کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی قوم کی نکبت اور زوال کو بھی محسوس کرتا ہے لیکن محض ایک فطرت پرست شاعر کی نظر سے۔ اس احساس میں ڈر اور غور و فکر کو دخل نہیں ہے۔ یہ چیز اقبال میں مرور ایام کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ قوم کے معاملے میں آئندہ چل کر اس کا مسلک شاعرانہ نہیں رہا۔ بلکہ فلسفیانہ ہو گیا۔

اپنی شاعری کے دوسرے دور میں اقبال یورپ میں تھا۔ یورپ کا اثر اس کی نظموں میں بہت نمایاں ہے۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی روح بے چینی محسوس کر رہی ہے۔ وہ تنہائی کا جویا ہے۔ اور فراق کا شکوہ سنج۔ وہ کوشش ناتمام کا ماتم کرتا ہے اور نوائے غم سے تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۱۹۱۰ء کے بعد کا زمانہ اس کی شاعری کا تیسرا دور ہے۔ اسی زمانے میں "شکوہ" جیسی پُرشکوہ نظم اس کے قلم سے نکلی اور اسی زمانے میں اُس نے اسلامیات کی طرف رُخ کیا۔ یہاں تک کہ اُسکی شاعری "یکسر اسلام" بن کر رہ گئی۔ اور اردو کا ایک جلیل القدر شاعر ہندوستانی قوم کی ذہنی تربیت میں معاون ہونے کی بجائے اسلام اور اسلامی فلسفے کی تشریح و توضیح میں مصروف ہوگیا۔

اقبال کی شاعری کے مختلف رُخ دکھانے کے بعد اب ہم سیماب کی شاعری کی طرف آتے ہیں۔

سیماب اپنی شاعری کے ابتدائی دَور میں اسلامی موضوعات اور روحانی جذبات کے اظہار میں طمانیتِ روح محسوس کرتا ہے اس کی ابتدائی شاعری میں عام طور پر تصوّف کی جھلک ہے۔ یہ چیز وہ ہے جو اقبال کی شاعری کے تیسرے دَور میں پیدا ہوئی۔ لیکن سیماب کا ابتدائی دور ہی اسلامی فلسفے اور اسلامی خیالات کے اثر سے مملو تھا۔ اقبال کے نظرئے سے سیماب کا نظریہ مختلف ہے۔ اقبال اسلامی حکومت، اسلامی فلسفہ اور اسلامی معاشرت کو دوسری قوموں کے مذہب اور فلسفے سے مرجح سمجھتا ہے۔ اور بالآخر کار اسلامی ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کے خیال میں منہمک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس سیماب اسلامی تصوّف، اسلامی موضوعات اور اسلامی عنوانات سے اس لئے دلچسپی نہیں لیتا کہ یہ چیزیں دوسری قوموں کے سامانِ حیات کے مقابلے میں افضل و برتر ہیں۔ اس قسم کی رقابت اور اس نوعیت کے رشک سے سیماب بہت دور ہے بلکہ اسلامی فلسفہ کی تشریح و توضیح اس کی روح کی تعمیر میں معاون ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی روح کے اطمینان کے کے لئے اسلامی تصوّف کی عبا پہن لیتا ہے۔ **خورشیدِ رسالت، مکّہ کی ایک صبح، طوافِ کعبہ، بیت اللہ کی تصویر دیکھ کر،** وغیرہ "نیستاں" کی ایسی نظمیں ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ہم سیماب کی شاعری کے ابتدائی دور کی خصوصیات سمجھ سکتے ہیں۔

سیماب کی شاعری کا دوسرا دور **"بلبل اسیر۔ دوشیزۂ بہار نسیمِ برشگال، عرضِ تجلّی، جوشِ انتقام"** جیسی نظموں سے شروع ہوتا ہے۔ ان نظموں کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ سیماب اپنی زندگی کے نصب العین کی تلاش میں مصروف ہے۔ وہ اپنے ماحول کی الجھنوں سے سخت نالاں ہے۔ اس کی شاعری کے ابتدائی دور میں اسلامی فلسفے اور اسلامی تصوف سے اسکی روح مکمل ہو چکی ہے اور اب آگے بڑھنا چاہتی ہے۔

سیماب کی شاعری کے تیسرے دور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا مقصد معلوم کر لیا ہے۔ اس دور کی یادگار "کارِ امروز" ہے۔ جس میں سیماب پورے وقار اور ایک عظیم المرتبت پیامی کی حیثیت سے رونق افروز ہوتا ہے۔ اس کو اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ "نوائے تجدید" کے عنوان سے اپنے مقصد کا اعلان کرتا ہے۔ اور اس کے بعد ایک ایسے انسان کی تعمیر میں معاون نظر آتا ہے۔ جو سیماب کے ارتقائی خیالات کا صحیح طور پر نمائندہ کہا جا سکے۔ وہ انسان مکمل انسان ہے۔ اس انسان کا وطن بھی آزاد ہے اور روح بھی، ملک و وطن کی ضروریات، ابنائے وطن سے ہمدردی، سرمایہ اور سرمایہ داری کے مقابلے میں مزدور اور مزدوری چند ایسی خصوصیات ہیں جو زمانۂ حاضر کی پیداوار ہیں۔ اور جن سے عہدِ حاضر کا انسان ناشناس نہیں رہ سکتا۔

سیماب اور اقبال کی سوانحِ حیات کا اُن کے کلام پر اثر دکھانے کے بعد اب ہم چند مثالیں اپنے بیان کردہ اصول کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔

اقبال:۔

پہلا دور

تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سوئے قمر وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اُس کا سفر

پوچھنا رہ رہ کے اُسکے کوہ و صحرا کی خبر اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر

آنکھ محوِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا

دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

(عہدِ طفلی)

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

طشتِ گردوں سے ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب

چرخ نے بالی چرائی ہے عروسِ شام کی

نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

(ماہِ نو)

سیماب: ———

پہلا دَور

اندریں جلوہ گاہِ گوناگوں میں جو سرگشتۂ تحیر ہوں

کیا بتاؤں کہ ہے یہ حیرت کیوں فرصتِ عرض ہو تو کچھ بولوں

دیکھتا ہوں جسے زمانے میں ہے وہ اسرار و راز کا جیحوں

آب و خاک و ہوا و آتش میں فطرتِ عالیہ ہے بوقلموں

کیا ہیں یہ کوہ و دشت و برگ و شجر خوف ہے میں نہ ہو تو کچھ کہہ دوں

آج جس چیز پہ نظر ڈالو کہہ رہی ہے زبانِ حال سے یوں

ہم آئینۂ جمال کے

نقشِ حسن مظہر کمال کے

(ہمہ اوست)

ہم گنہگار ہیں؟ اچھا تو سزا دو ہم کو ہاں سزاوار ہیں دنیا سے مٹا دو ہم کو

جیسے چاہو صلۂ جرم و خطا دو ہم کو جیتے جی خاک کے پردوں میں دبا دو ہم کو

ہم کبھی اپنی سفارش نہ کریں گے آقا

کام جیسے کئے ویسا ہی بھریں گے آقا

مگر اب درد سے اسلام کے رنجور ہیں ہم فطرتاً جذبۂ اسلام سے معمور ہیں ہم

ہیں گنہگار مگر کیا کریں مجبور ہیں ہم آپ کے روضۂ انور سے بہت دور ہیں ہم

قرب حاصل ہمیں ہوتا تو دکھا دیتے ہم

جالیاں تھام کے دنیا کو ہلا دیتے ہم

(سرکارِ طیبہ کے حضور میں)

اقبالؔ: ———

دوسرا دَور

تنہائیِ شب میں ہے حزیں کیا انجم نہیں تیرے ہمنشیں کیا

یہ رفعتِ آسمانِ خاموش خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش

یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار فطرت ہے تمام نسترن زار

موتی خوشرنگ پیارے پیارے یعنی ترے آنسوؤں کے تارے

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل

قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

(تنہائی)

تلاشِ گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں

شکستہ گیت میں چشموں کی دلبری ہے کمال دعائے طفلکِ گفتار آزما کی مثال

ہے تختِ لعلِ شفق پر جلوسِ اخترِ شام بہشتِ دیدۂ بینا ہے حسنِ منظرِ شام

سکوتِ شام جدائی ہوا بہانہ مجھے

کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

(فراق)

سیماب: ———

دوسرا دَور

اٹھاؤ چنگ و رباب اپنی بزمِ عشرت سے کہ آ رہا ہوں میں صد محشرِ جنوں بردوش

ہے میرے ساتھ پریشانیوں کی اک دنیا بکائے حشر چکان و فغانِ صور فروش

نظامِ بزمِ محبت کو فرصتِ تغیر اک انقلاب ہے میری ورود میں روپوش

مسل کے پھینک دو پھولوں کو آئینے توڑ دو ہٹا دو پردۂ رنگیں دمندِ گل پوش

(جوشِ انتقام)

زیبِ جلوہ ہیں یہ پردہ ہائے شبنم و گل
چمن طرازِ حقیقت مجھے خراب نہ کر

سرود بن کے سما جا نگاہِ حیراں میں
ہلاکِ جلوہ کو ناآشنائے خواب نہ کر

شگفت لالہ میں کر سیرِ خونچکانیٔ دل
کلی میں چھپ کے تماشائے اضطراب نہ کر

(عرضِ تجلی)

سیماب اور اقبال دونوں کا دوسرا دورِ شاعری چند مشترک خصوصیات کا حامل ہے۔ دوسرا دور چونکہ پہلے اور تیسرے دور کے درمیان میں واقع ہوتا ہے۔ اس لئے اس دور میں کسی مستقل نصب العین کا پتہ نہیں ملتا۔ اور یہ بات دونوں شعرا کے یہاں موجود ہے روح کا اضطراب، بے چینی اور بے کلی سیماب کے یہاں بھی موجود ہے اور اقبال کے یہاں بھی۔

اقبال: ———

تیسرا دور

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تونے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

(خطاب بہ جوانانِ اسلام)

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے

کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھکو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

(شکوہ)

سیماب: ———

تیسرا دور

ہوشیار اے اہلِ عالم اب نہیں ہنگامِ خواب
محفلِ ہستی یوں ہی کب تک اسیرِ انقلاب

بربری تہذیب سے ہنگامۂ تخریب سے
تم نے دنیا کے ہزاروں دور کر ڈالے خراب

دور کر سکتی ہے اک انگڑائی اب بھی روح کی
تشنگی جمہوریت کا اضطراب

پھر نظامِ دہر کو پیرایۂ تجدید دو
اپنی دنیا کو بنا دو بزمِ فطرت کا جواب

قومیت، فرقہ پرستی اور نسلی امتیاز
پیکرِ انسانیت پر اک طرح کا ہیں عذاب

قلعۂ پندار کو مسمار کر دو توڑ دو
چاک کرکے پھینک دو یہ مادّیت کا حجاب

صرف تم "انسان" بن کر اپنی دنیا میں رہو
پُرسکوں آزاد، یکسو کامگار و کامیاب

بادۂ کبر و خودی ناپاک ہے ملعون ہے
پی رہے ہو تم جسے انسانیت کا خون ہے

(ایک پیغام اہلِ عالم کے نام)

سیماب کا پیغام کسی خاص قوم اور کسی فرقے تک محدود نہیں۔ وہ روئے زمین پر ایک قوم دیکھنا چاہتا ہے۔ تمام نوعِ انساں کو انسانیت کے رشتے میں منسلک دیکھنے کی آرزو کرتا ہے اور کائنات میں ایسی انسان کی نمود کا خواہش مند ہے جو جارحانہ قومیت، فرقہ پرستی، اور نسلی امتیاز سے مُعرّا ہو۔ وہ جب ہندوستانیوں سے مخاطب ہوتا ہے تو ہندوستان میں اسے صرف مسلمان ہی نظر نہیں آتے وہ ہندوستان کو من حیث المجموع دیکھتا ہے اور

بہار موت کا پیغام ہے خزاں کیلئے
یہ انقلاب مبارک ہو باغباں کیلئے

نہ خاکِ جادہ اگر پیشِ رو کو جذب کرے
تو راہ بند ہو پس ماندہ کارواں کیلئے

نئی نئی روشیں باغ میں ہوئیں پیدا
نویدِ سیر جوانانِ گلستاں کیلئے

نئے اصول مرتب کریں برائے چمن
بنائیں کچھ نئے آداب آشیاں کیلئے

بہار اب کے جو آئے تو پھر نہ جائے کبھی
ہو بند و بستِ قفس عیشِ جاوداں کیلئے

جبینِ ذوق مہیا کرے نئے سجدے
وطن کی خاکِ محبت کے آستاں کیلئے

نئی فضا ہے نئی آرزو نئے جذبات
دعائے خیر تمنائے رفتگاں کیلئے

جواں دلوں میں پھر اک عزم کامیاب ہی آج
وطن بجز وطن پہ نیا شباب ہی آج
(از جوانانِ ہندوستان سے)

ان شواہد سے یہ ماننا پڑے گا کہ اقبالؔ کا پیغام مسلمانوں تک یا اُن لوگوں تک محدود ہے۔ جن کو مسلمانوں سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ لیکن سیمابؔ کا پیغام عالمگیر ہے۔ حقیقتاً ایک مسلمان داعیٔ دیباجی صحیح متبع اُسی وقت ہوسکتا ہے۔ جب کہ وہ آنحضرتؐ کا طریقِ ہمہ گیری اختیار کرے جو رحمۃ اللعلمین تھے۔ جو صحیفہ اُن پر نازل ہوا وہ بھی تمام عالم کے لئے ایک قانون اور پیغام ہے۔ اسی اتباع میں سیمابؔ بحیثیتِ شاعر ایک ایسا ذہن رسا اور دُور رس دماغ دنیا میں لے کر آئے۔ جس کی وسعتیں لامحدود اور لاتناہی ہیں۔ آپ کو مزدور سے محبت ہے۔ اب خواہ وہ مزدور امریکہ کا ہو یا آسٹریلیا کا۔ سیمابؔ نے "عبد و معبود" کے تعلقات بیان کئے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ہر مذہب و ملک والا اُس سے متفق ہوجاتا ہے۔

سیمابؔ نے انسانی روح کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کیا ہے۔ اس لئے اُن کی نظمیں پڑھتے وقت ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا خواب سے آنکھیں کھل رہی ہیں۔ اور منجمد جسم میں نئی روح سرایت کر رہی ہے۔ دل میں اُمنگ اور جوش پیدا ہو رہا ہے۔ سیمابؔ کی نظموں کے پڑھنے سے اولوالعزمی اپنی مستقل جگہ تلاش کرلیتی ہے۔ اور نیک عملی کی طرف انسان رجوع ہوجاتا ہے۔

سیمابؔ کے کلام کی خصوصیات لاشریک ہیں۔ ہر شخص نے اپنے خیال کے مطابق سیمابؔ کے کلام میں یورپین شعرا کی سی لے پائی ہے کسی نے ورڈسورتھ کی۔ کسی نے لانگ فیلو کی۔ کسی نے گولڈ اسمتھ کی کسی نے کارلائل کی۔ مگر میرے خیال میں سیمابؔ کا انداز اور رنگ اُس کا ذاتی انداز اور رنگ ہے۔ جس میں جدّت، اثر اور حلاوت بیک وقت موجود ہیں۔ اور وہ اپنے طرزِ بیان و ادائے مفہوم کا تنہا مالک ہے۔

اقبالؔ اور سیمابؔ کی پیدائش کا صوبوی اختلاف نظموں کی زبان کا ایک فطری اختلاف ہے۔

اقبالؔ۔ پر بانگِ درا کے بعد غزل کا میدان تنگ ہوجاتا ہے اور غزل گو شعرا کی صنف میں دائیں بائیں نیچے اوپر کہیں اُس کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر سیمابؔ اپنی دیرینہ روایاتِ غزل گوئی کو بھی نظم نگاری کے ساتھ ساتھ جاری رکھتا ہے۔ اور تغزل میں ایسے ایسے لؤلؤ در پیش کرتا ہے۔ جن کی مثال تاریخ ادب اردو میں نہیں ملتی۔ مثلاً چند شعر دیکھئے۔

صدائے صور سے میں قبر میں نہ جاگوں گا — کسی سنی ہوئی آواز سے پکار مجھے

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے — وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے؟

رات کی افسردگی پر غور کرنے کے لئے — صبح کے ٹوٹے ہوئے کچھ پھول لاکر رکھتا ہوں میں

"پیام فردا" کے لئے نظموں کی تصنیف کے ساتھ ساتھ سیمابؔ کی یہ غزل آفرینی ابھی بدستور جاری ہے۔ جسے آپ "نوراتِ مشرق" میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ مگر اقبالؔ اپنی تخئیل کی پہنائیوں کو سمیٹ رہا ہے۔ اب اس کی نظمیں فلسفہ کی مختصر دفعات بن کر رہ گئی ہیں۔ "ضربِ کلیم" اس کے ثبوت میں شاہد ناطق ہے۔ لیکن "پیامِ فردا" میں آپ طویل و بسیط نظمیں مختلف عنوانوں سے دیکھیں گے۔ سیمابؔ اور اقبالؔ شاہراہِ ادب میں چلتے چلتے ایک مقام پر ہم سطح ہوجاتے ہیں۔ لیکن سیمابؔ آگے نکل جاتا ہے۔ بہت دُور پہونچ جاتا ہے۔ اور اقبالؔ ایک واماندۂ منزل کی طرح ستانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے۔

یہ وقفہ "جمود" و عمل" وقت آنے پر خود واضح ہو جائے گا بحیثیتِ شاعر اقبال اپنا کام پہلے دور ہی میں ختم کر چکا ہے۔ اور سیماب تیسرے دَور تک اپنے نصب العین اور اپنے پروگرام کی تشریح و توضیح میں مصروف ہے۔ سیماب کا پہلا دور دوسرا دور اس کی روح کی تکمیل" اس کے خیالات کی ہم آہنگی' اور اُس کے قلم کی پختگی میں صرف ہوا۔ لیکن تیسرے دور میں آکر اس نے محسوس کیا کہ یہ دنیا بہت وسیع ہے اور اسی اعتبار سے شاعر کی نظر بھی وسیع ہونی چاہئے

اقبال نے شاعر کی حیثیت سے دنیائے عمل میں قدم رکھا۔ لیکن اسکی دوسری حیثیتیں اس کی شاعری پر غالب آتی چلی گئیں۔

اس کے بعد ہم چاہتے تھے کہ اقبال اور سیماب کی نظموں کو سامنے رکھ کر دونوں کی پختگیٔ خیال اور شاعری میں دونوں کے مقام کی توضیح کریں۔ لیکن چونکہ مضمون بہت طویل ہو گیا ہے اس لئے یہ بات کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس زمانے کو مبارکباد دو جس میں اقبال اور سیماب سے حقیقی شاعر موجود ہیں۔ اور اُنکی موجودگی کو غنیمت سمجھو" پھر کہاں لوگ اس طبیعت کے ملے

علامہ سیماب

ملک کے چند در چند منتخب شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی شاعری بلند خیالات، پاکیزہ جذبات اور دلنشیں تغزل کی سرمایہ دار ہے۔ اُن کی غزلیات شاداب زمینوں، بولتے ہوئے قافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں سے غزل سرا معاصرین میں درجۂ امتیاز رکھتی ہیں۔

اُن کی بعض نظموں اور غزلیات کے متعدد اشعار پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں آگرے کی بجائے لاہور کے باشندے ہوتے تو پیغمبرِ بے کتاب بنا دئے جاتے۔

"کارِ امروز" اور "کلیم عجم" اُن کے ساحرانہ کارنامے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایسا باکمال سحر کار اس عالمِ ضعیفی میں زندگی کی کشاکش سے دوچار ہے۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

یہ افسوس زیادہ دل گداز بن جاتا ہے۔ جب بے مایہ اور فرومایہ تک بندوں کو عام کالعوام کی پذیرائی اور اس سبب سے زندگی کی کامرانیوں سے ہمکنار دیکھا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ ذوقِ سخن فہمی سے اس قدر دور ہے۔ جتنا گروہِ عوام اور تعلیم یافتہ جماعت چونکہ تہذیبِ حاضرہ کی نمائندہ علوم و فنون کی حامل ہے۔ اس لئے اس کی بے فہمی اردو شاعروں کے لئے شاعری سے بیزاری کا سبب بن رہی ہے

حضرت تاجور نجیب آبادی

"شاہکار" لاہور ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء

"تاج" اور "شاعرِ تاج"

از ــــــــ حضرت علامہ ماثر سیالکوٹی

ہے تاجِ مرمریں گہوارۂ انوارِ ضو تابی
کہ اس کے ذرّے ذرّے میں ہے رقصانِ عشقِ کمیابی

اسے صبحِ ازل کا اک نہالِ آرزو کہئے
اسے شامِ ابد کا اک سمجھئے نخلِ شادابی

یہ سوزِ عشق کا ہی ایک نقشِ غیر فانی ہے
کہ سانچے میں سکوں کے ڈھل گئی ہے جانِ بیتابی

زمینِ "تاج" طوفانوں میں یوں محفوظ رہتی ہے
کہ جھولے جھولتی ہے، جس طرح موجوں میں مرغابی

زمینِ "تاج" پر بھارت کے باشی ناز کرتے ہیں
یہ بنگالی، وہ مدراسی، یہ گجراتی وہ پنجابی

یہاں ہیرا و رفیضی مثلِ نغمہ جاگ اٹھے تھے
کہ اس مٹی میں ہے خاصیتِ تقدیرِ مضرابی

زمینِ عشقبازاں بر ملا معمارِ عالم ہے
کبھی شاہِ جہاں اس سے کبھی حسنِ جہاں تابی

زمینِ عشقبازاں میں ضمیرِ سنگ روشن ہے
کہ جیسے تاج نور افشاں ہے، زیرِ نورِ مہتابی

زمینِ عشقبازاں ہی سے کسبِ فیض کرتے ہیں
وہ افرنگی و جاپانی یہ ایرانی و اعرابی

زمینِ عشقبازاں ہر زماں تخلیق کرتی ہے
کبھی دیدہ ورِ غالب اور کبھی امروزِ سیمابی

نگاہِ عشقبازاں بے نیازِ خواب ہے ماثرؔ
یہ خوابِ مرمریں ہے، درسگاہِ درسِ بیخوابی

کمالِ سوز سے ہوتا ہے سامانِ جہاں پیدا
مکیں پیدا، مکاں پیدا، زمیں پیدا، زماں پیدا

کمالِ سوز دنیائے جنوں تعمیر کرتا ہے
نوائے بلبلاں پیدا، فغانِ عاشقاں پیدا

کمالِ سوز سے حق پرور و حق کوش ہوتے ہیں ——— خدا کے ہمزباں گاہی خدا کے ترجماں پیدا
کمالِ سوز خلاقِ جہانگیری جہانداری ——— کبھی آئینِ گراں اس سے کبھی صاحبقراں پیدا
کمالِ سوز مشتِ خاک کو گوہر کی تابانی ——— اور اُس کی تابشِ جوہر سے پیرِ نہرواں پیدا
کمالِ سوز سے پھر روح کو ملتی ہے بیداری ——— اور اُس کی چھیڑ سے ہوتا ہے پھر ہندوستاں پیدا
کمالِ سوز سے دیر و حرم یک جان ہوتے ہیں ——— اور اس اکسیر سے ہوتا ہے تاجِ عارفاں پیدا
اسی اکسیر سے پھر "تاج کا شاعر" چمکتا ہے ——— ہے جس کے نغمۂ رنگیں سے خیلِ شاعراں پیدا
میں یوں سیماب کو پیغمبرِ مشرق سمجھتا ہوں ——— کہ اُس کے نطق سے ہوتا ہے سرِ قدسیاں پیدا

خیالِ خام سے ماہر نئی دنیا نہیں بنتی
خرد کرتی نہیں ہرگز خدا کے رازداں پیدا

زمینِ ہند کے شاعر، جہاں کا رہنما تو ہے ——— محبت کی ادا تو ہے، اخوت کی ضیا تو ہے
تری ہستی نگاہوں کو نشانِ سربلندی ہے ——— دیارِ زیرِ دستاں میں ترفع کی بنا تو ہے
تری ہستی، ہے گوشِ ہوش کو پیغامِ آزادی ——— غلام آباد میں لاریب آوازِ درا تو ہے
تری ہستی، دماغوں کیلئے ہے درسِ خودداری ——— جہانِ خود فراموشی کا وہ معجز نما تو ہے
تری ہستی دلِ آگاہ کو ہے کیفِ سرمستی ——— کہ اک مہکی ہوئی قدوسیت کا ہمنوا تو ہے
تری ہستی زبانِ شعر میں ہے، خالقِ اردو ——— زبانِ بے زبانِ ہند کا حاجت روا تو ہے
تری ہستی دلِ احساس کو تجلی کی ارزانی ——— کہ تخئیلِ ضمیرِ عاشقاں کا دلربا تو ہے
تری ہستی سے ہر ساعت ہزاروں راز کھلتے ہیں ——— جمالِ ہستیٔ کونین کا پردہ کشا تو ہے

شرارِ عشق سے ہستی طپش اندوز ہوتی ہے
وہ ہی سیماب بن کر نغمۂ دل سوز ہوتی ہے

آگرہ اسکول کا ایک قدیم ہیرو

"ابو الفاضل رازؔ چاندپوری"

از ـــــ حضرت خلیق فیض آبادی

شاعری کا مخرجِ اوّل عرب ہے۔ اور وہیں کے شعراء نے غزل کی ابتدا کی۔ ایران و فارس نے عرب سے اور ہندوستان نے موخرالذکر سے اس کو حاصل کیا عربی شعرا غزل میں اپنا مخاطب صرف صنفِ نازک ہی کو بنایا کرتے تھے، ایرانیوں نے مردوں سے بھی اظہارِ تعشق کیا اور تمام لوازمات مردانہ خط و خال وغیرہ نظم کرنے لگے۔ جن کا اتباع شاعرانِ ہند نے کیا اور اس قدر پستی میں اتر آئے کہ فحاشی کا عنصر بھی غزل میں داخل کر دیا۔ میرؔ و سوداؔ کے زمانے سے داغؔ و امیرؔ کے دور تک اس طرزِ سخن کا بڑا زور رہا بلکہ اکثر شعرائے لکھنؤ اب تک اسی مبتذلانہ اندازِ بیان کے شکار رہیں۔ اسکی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ ہند نے صحیح معنی میں فارسی شاعری کا تتبع نہیں کیا۔ فارس کے سحر طراز شاعر جہاں کہیں اکرامِ خسروانہ کی اُمید میں کسی بادشاہِ وقت کی تعریف و مدح میں غلو کرتے تھے۔ وہیں اکثر و بیشتر اصلیت کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مگر ہمارے ہندوستانی شعراء قصیدہ و نظم حتیٰ کہ غزل بھی اسی لالچ میں کہتے تھے۔ کہ والیانِ ملک سے انعامات حاصل کریں نتیجہ یہ ہوا کہ ادب و شعر کی رعنائیاں نذرِ شانہ و گیسو ہو کر رہ گئیں۔ البتہ ہم صرف خواجہ میر دردؔ کا دامن اس بدنما داغ سے پاک دیکھتے ہیں ان کا کلام باوجود متانت و سنجیدگی کے تغزل کا بہترین نمونہ ہے۔ اور جہاں تک تصوّف کا تعلق ہے۔ عصرِ حاضر کے اُردو شعراء، خواجہ صاحب ہی کا اتباع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ایران میں فغانیؔ نے اور ہندوستان میں غالبؔ و مومنؔ نے اپنی دقیقہ سنجی سے کلام کو عوام کی سطحی نظر سے بہت بلند کر دیا۔ اور بیان کے وہ لطیف پہلو نکالے کہ جن پر شاعری جس قدر ناز کرے کم ہے۔

غالبؔ پرستی اور مومنؔ شناسی کے اس دورِ جدید میں دردؔ کا تصوّف، غالبؔ و مومنؔ کا اسلوبِ بیان کامیاب شعراء کے کلام میں موجود ہے۔ لیکن سوقیانہ مضامین اور مبتذل خیالات کی عادی طبیعتیں اُن سے لطف اندوز نہیں ہو سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ سطحی نظریں آگرہ اسکول کے قدیم ہیرو ابو الفاضل رازؔ چاندپوری تلمیذ ارشد حضرت مولانا سیمابؔ اکبرآبادی کے کلام کی گوناگوں خوبیاں دیکھنے سے عاجز ہیں۔

اس مایۂ ناز و یگانۂ روزگار شاعر کا معاصرین میں بہت بلند رتبہ ہے مگر مقابلہ و مجادلہ سے ہیں فضائے ادب کو منغض و مکدر نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ معلوم ہو جاتا کہ بہت سے ناکام شاعر اپنی خوش الحانیوں کے باعث مشہور و معروف ہو گئے ہیں۔ برخلاف اس کے حضرت رازؔ جو بزمِ ازل سے ایک نکتہ رس اور غیر تمند دل لے کر آئے ہیں۔ ابتذال و ترنم کو شاعرانہ شان و شوکت کے منافی سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ۔ ع ما :-

مشکل نہیں کہ گرمیٔ محفل نہ بن سکوں   لیکن میں اپنے رنگِ طبیعت کو کیا کروں

یہ واقعہ بھی ہے۔ تاہم سخن سنج حضرات سے یہ بات مخفی نہیں کہ حضرتِ راز حقیقی اور خلقی شاعر ہیں۔ وہ آگرہ اسکول کے ایک روشن چراغ ہیں۔ جن کی ضیاؤں سے مستقبل جگمگائے گا وہ اپنے استادِ محترم حضرت علامہ مولانا سیماب مدظلہٗ العالی کی حقیقی یادگار (اُن کے صحیح معنوں میں مقلد اور مولانا کے پرستاروں میں بہت نمایاں اور فائق ہیں۔ اور وہ یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ع :—

رازِ ہستیٔ اسرار یہ دارِ رازِ فطرت ہے

غزل کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ شاعر جذبۂ حسن و عشق کے تحت سب کچھ نظم کر سکتا ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی خیال کیفیاتِ روحی سے متعلق نہ ہو تو حکما اُس کو نغمۂ خارج از آہنگ تصور کرتے ہیں۔

جنابِ راز چاندپوری کا بہت مختصر سا کلام میرے پیشِ نظر ہے۔ مگر میں حیران ہوں کہ کس شعر کے اوصاف بیان کروں اور کس کو قلم انداز کروں۔ یعنی ہر شعر، تراکیبِ الفاظ، بلند خیالی، فلسفۂ حسن و عشق، محاکات سلاست اور اسرار و معارف کا بجائے خود ایک جامِ پُر کیف ہے۔

غالب و مومن کا مخصوص اندازِ بیان یہ تھا کہ شعر میں کچھ ایسے محذوفات رکھ دیتے تھے۔ کہ سامع یا قاری کا ذہن خود بخود معانی کی طرف رہبری کرتا تھا اور اس طرح موضوع میں بھی گونہ لطافت پیدا ہو جاتی تھی مثلاً ؎

جیبِ درست لائقِ لطف و کرم نہیں
ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں (مومن)

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

حضرتِ راز کے یہاں اِس طرزِ ادا کے اشعار بکثرت پائے جاتے ہیں ؎

کیوں روکتا ہے واعظِ آشفتہ سر مجھے   ہلکا کروں گا بارِ غمِ روزگار کو
حیف اے کامیابِ بزمِ جہاں   اب زباں پر بھی اُس کا نام نہیں

سنتا ہوں آجکل ہے صہبائے عشق سستی   صہبائے عشق! توبہ! توبہ ہوس پرستی
بے ادب کم ظرف، خود بیں، بد زباں مطلب پرست   یاد رکھ اس میکدے میں دور کا دستور ہے
تیرے صدقے نگاہِ جانانہ   کوئی اپنا ہے اب نہ بیگانہ

جدتِ اسلوب

تراکیبِ الفاظ و جدتِ ادا سے معمولی اور پامال مضامین کو وجد آفریں بنا دینا۔ جدتِ اسلوب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بلند سے بلند تخئیل بھی اُس وقت تک بیکار رہتی ہے۔ جبتک بیان میں نزاکت و جدت نہ ہو اور کچھ اسی سے شاعر کی قادر الکلامی کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ حضرت راز کی یہ حکیمانہ خصوصیت بھی ذیل کی مثالوں سے واضح ہوتی ہے۔

شعرائے حال و ماضی نے حسن کی بے التفاتیوں کا اظہار صدہا طریقوں سے کیا ہے۔ مگر کیا کہیں اس لطافتِ بیان کی بھی نظیر مل سکتی ہے؟ فرماتے ہیں

گناہگارِ وفا کا نصیب کیا کہنا   ہزار حُسنِ عمل پر بھی کامیاب نہیں

جادۂ و راہ کا مضمون عام طور پر شعراء کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ اور بدیں وجہ نہایت فرسودہ ہو چکا ہے۔ مگر حضرتِ راز کے حُسنِ بیان نے اُس کو بھی پُر لطف و رنگیں بنا دیا ہے ؎

مشاہداتِ رہِ دوست کیا کہوں تم سے   قدم قدم پہ کئے سجدہ گر پڑا ہوں میں
لئے جاتا ہے ترکستاں کی جانب   عجب گمراہ میرا راہبر ہے

یعنی وہ مجاز کی طرف لئے جا رہا ہے اور میں راہِ حقیقت پر گامزن رہنا چاہتا ہوں۔

شعرا نے آسمان کے ڈھا دینے کی کیا کیا تدبیریں نہیں کیں۔ کسی نے نالۂ گرم سے آبلے ڈالدئے جو مہ و انجم بن کر چمکے، کوئی اتنا ہی کہہ کر رہ گیا کہ افسوس میری آہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ مگر جناب رازِ حدِ نیاز سے آگے بڑھنا گستاخی سمجھتے ہیں اور یہی سچے عاشق کی شان بھی ہے ؎

کچھ پاسِ ادب ہے ورنہ واللہ   یہ چرخ، یہ فتنہ ساز کیا ہے

دوسری جگہ اسی سے ملتا جلتا خیال نہایت پُر کیف انداز میں ادا کیا ہے

بجا ہے نازِ محبت بجا ہی فخرِ وفا — مگر رہیں یہ حدودِ نیاز تک محدود

ایک خیال کو بار بار نظم کرنا اور اس خوش اسلوبی سے کہ ذوقِ لطیف پر گراں نہ گذرے معمولی شاعر کا کام نہیں۔ آیئے فریب کاریٔ عالم کو متعدد صورتوں میں ملاحظہ کیجئے ؎

دوست دشمن ہیں، یا ہیں دشمن دوست — کیا زمانہ ہے، کیا قیامت ہے

یارانِ باوفا کا حسنِ عمل نہ پوچھو — نامِ وفا جہاں میں بدنام ہو گیا ہے

یہ سچ ہے واقعی سچ ہی کہ خودنما ہوں میں — فریبِ دہر کو اب عام کر رہا ہوں میں

ذکرِ خدا ہے کافرِ خودبیں کی بزم میں — کچھ بھی نہیں ہی شیوۂ اربابِ فن سی دور

یہ حسنِ سخن، یہ خوشش کلامی — اے جانِ خلوص، راز کیا ہے

غرض کہ حضرتِ راز ایک مضمون کو ہزار طریقوں سے ادا کر سکتے ہیں اور لطافت میں بھی کمی نہیں ہوتی

اسرار و معارف

جلوۂ شاہدِ حقیقت کہاں نہیں موجود ہے؟ ع
"آنکھ والا ہو تو دیکھے جلوہ ہائے رنگ رنگ"

ہمارے شعرا ہمیشہ سے اس موضوع پر اپنا اپنا کمال دکھاتے چلے رہے ہیں اس لئے یہ اسقدر پامال ہو گیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی نئی بات مل سکتی ہے مگر کسی مضمون میں کوئی اضافہ و کمی کر دینا یا بیشتر سے لطیف و نادر طرز ادا میں ادا کر دینا بھی محاسنِ شاعری میں لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اشعارِ ذیل جو اسرار و معارف کی نمایاں خصوصیات کے حامل ہیں۔ قابلِ ذکر ہیں ؎

یہ دنیا جو بہ ظاہر اک نمودِ بے حقیقت ہے — بہارستانِ معنی ہے نگارستانِ فطرت ہے

آئے کہاں ہی بے خبر راز بتکدہ؟ — کمبخت کہہ رہا تھا یہ اُس کا مکاں نہیں

آنکھ والا ہو تو دیکھے جلوہ ہائے رنگ رنگ — شاہدِ کل جلوہ فرما ہے حجابِ ناز میں

مشاہداتِ رہِ دوست کیا کہوں تم سے — قدم قدم پہ پئے سجدہ گر پڑا ہوں میں

سر بہ سجدہ ہی بتکدے میں راز — بس یہی حدِ حق پرستی ہے

مطلعِ انوارِ وحدت ہے جبینِ برہمن — سجدۂ بے لوث نے ناقص کو کامل کر دیا

ذرّے ذرّے سی عیاں شانِ خود آرائی ہی — کثرتِ جلوہ گری شاہدِ یکتائی ہے

دیوار ہیں آئینۂ حسنِ معنیٰ — کنجِ خلوت میں عجب انجمن آرائی ہے

مطلعِ مہرِ حقیقت ہے دلِ حق آگاہ — ذرّے ذرّے میں ہوا اشرق کی غمازی ہے

جو نہ جاتی ہو کوئے جاناں تک — کوئی دنیا میں ایسی راہ نہیں

خلوتِ دل عجیب خلوت ہے — سب کو اس پر گماں ہی محفل کا

کیا بتاؤں کہ آدمی کیا ہے — اک نمونہ ہے حسنِ کامل کا

رازدانِ حریمِ جانانہ — مثلِ تصویر محوِ حیرت ہی

کوئی کعبہ ہے کفرستانِ الفت — کہ ہر کافر کو انساں دیکھتا ہوں

اگر ایک بندۂ محبت شاہدِ حقیقت کو جلوہ فرما دیکھکر ہر شے کے سامنے سر بہ سجدہ ہو جائے تو ظاہر بیں نگاہیں۔ یقیناً اُس پر کفر کا فتویٰ لگا دیں گی۔ لیکن یہی محبت و حق کیشی عینِ انسانیت ہے۔ اب آخر شعر کو پڑھئے اور لطف لیجئے ؎۔

کوئی کعبہ ہے کفرستانِ الفت — کہ ہر کافر کو انساں دیکھتا ہوں

ایسے حق کیشانِ محبت کا اجتماع بیت اللہ ہی میں ہو سکتا ہے۔

سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

شاعرانہ مصوری

آرٹسٹ زیادہ سے زیادہ خد و خال کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ جذبات و کیفیاتِ قلبی کی مصوری نہیں کر سکتا۔ تمثیلاً علامہ سیماب اکبرآبادی کا یہ شعر ذہن میں محفوظ رکھئے

ہجومِ غم سے ٹپکتی تھی چشمِ تر کل تک — وفورِ اشک سی آج آشیاں ٹپکتا ہی

اشک، آشیاں اور آنکھ کی تصادیر مصور الگ الگ کھینچ سکتا ہے مگر کیا جس جذبے کا نقشہ شاعر شعر میں کھینچ رہا ہے۔ یہ بھی اُس کے امکان میں ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں وہ اس جگہ پر قلم ٹیک دیتا ہے۔ یہ شاعر اور صرف شاعر کا حصہ ہے کہ محاکات و انتخاباتِ الفاظ سے بعینہٖ اصل چیز کو پیش کر دیتا ہے۔ حضرتِ راز کے کلام میں اسکی بھی کمی نہیں۔ ان اشعار کو پڑھئے اور وجد کیجئے ؎

تجدیدِ ارتباط بعنوانِ نو ہوئی — دیتا ہوں داد میں نگہِ نیم باز کی

نازاں ہی اپنی بحث پہ رعنائیِ خیال — اک شاہکارِ صنعت آذر لئے ہوئے
سر بہ سجدہ کون ہی یہ آستانِ غیر پر — غالباً کوئی مسافر منزلِ تدبیر کا
رازدانِ حریمِ جانا نہ — مثلِ تصویر محوِ حیرت ہے

لفظِ تصویر جس تحیر و استعجاب کو ظاہر کرتا ہے۔ اُسکی تصویر نہیں کھینچی جاسکتی۔ اور شعرِ اوّل میں نگہ نیم باز کی داد جس طرح شاعر نے دی مصور ہرگز نہیں دے سکتا۔ تجدید ارتباط، لعنوانِ نو، نگہ نیم باز اپنی اپنی جگہ پر اٹل ہیں۔

فلسفہ یا رموز و نکات

طبقۂ عوام خدا معلوم کس چیز کو فلسفہ سمجھتا ہے۔ جہاں کسی بڑے شاعر کا کوئی شعر سنا اور سمجھ میں آیا تو اس شعر پر فلسفیت کا حکم لگا دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ شعر کے اصل محاسن کیا ہیں؟ مگر وہ فلسفہ جو شاعری سے متعلق ہوسکتا ہے۔ صرف حسن و عشق کے نکاتِ سربستہ کو دلکش پیرایۂ بیان میں اظہار کر دینا ہے۔ اور جناب راز جوان رموز و نکات سے واقف ہونے کے باوجود قلب میں احساساتِ لطیف بھی رکھتے ہیں۔ اسی کلئے پر عمل پیرا ہیں آپ کو صدہا ایسے اشعار اُن کے کلام میں ملیں گے۔ صوفیائے کرام اصطلاح سلوک میں حسن و عشق کو وحدت الوجود کہتے ہیں ؎

نہ خود پرست، نہ خود بیں، نہ خود نما ہوں میں
کسی کے حسن کا افسانہ کہہ رہا ہوں میں

صفات و ذات میں تفریق کیسی — حقیقت ہی نہیں تو آشنا کیا
حسنِ پنہاں کا ایک مظہر ہوں — کتنی روشن مری حقیقت ہے
مصلحت تھی یہی کہ دنیا میں — میں رہا بندۂ خدا ہو کر
ذرّے ذرّے سے عیاں شانِ خود آرائی ہے — کثرتِ جلوہ گری شاہدِ یکتائی ہے

عشق خود خالقِ حسن ہوتا ہے ؎

پیشِ نگاہ جلوے جمال و جلال کے — نیرنگ تو نہیں مرے حسنِ خیال کے

عاشق کو کسی حالت میں حدودِ دنیا سے باہر قدم نکالنا زیبا نہیں ؎

نوازشات و عنایاتِ چشمِ ناز بجا — مگر تو دل کو رہینِ نیاز رہنے دے
کہدے کہ خطا ہوئی کرم کر — گستاخ یہ قیل و قال کیا ہے

زیادہ تفصیل میں مضمون طویل ہوجائے گا۔ اس لئے صرف چند اشعار ہی پر کفایت کرتا ہوں ؎

خلوتِ دل عجیب خلوت ہے۔ — سب کو اس پر گماں ہے محفل کا
اچھے بُرے کا جس کو کچھ امتیاز ہوگا — دنیائے عشق میں وہ کیا سرفراز ہوگا
میری نظر تو تیرے جلووں کو دیکھتی ہی — محمود کی نظر میں حسنِ ایاز ہوگا
بے غرض سجدے میں کچھ لطفِ جبیں سائی ہی — دادِ سجدہ، طلب سجدہ کی رسوائی ہی
نیازِ عشق حریفِ غرورِ حسن ہوا — فتادگی میں ملا مجھ کو گوہرِ مقصود
بجا ہی نازِ محبت بجا ہے فخرِ وفا — مگر رہیں یہ حدود و نیاز تک محدود

ایجاز

آئے دن غزل گوئی کے خلاف جد و جہد ہوتی رہتی ہے۔ پھر بھی یہ لافانی شے مٹتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ اس کی بقاؤ حیات کا سب سے بڑا راز اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ ایک بڑے سے بڑا تخیل جو مشکل سے کسی بڑی نظم میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ غزل کے دو مصرعوں میں ادا ہوجاتا ہے۔ اور اگر شاعر صنفِ شاعری پر قادر ہے۔ تو وہ غزل کی چھوٹی سے چھوٹی بحر میں بھی صرف ایک شعر میں طویل خیال کو حسین و پُرکیف پیرائے میں نظم کر دیتا ہے کلامِ راز میں ایسے جواہر پارے بکثرت ملتے ہیں ؎

جو نہ جاتی ہو کوئے جاناں تک — ایسی دنیا میں کوئی راہ نہیں
کیا بتاؤں کہ آدمی کیا ہے — اک نمونہ ہے حسنِ کامل کا
رازدانِ حریمِ جانا نہ — مثلِ تصویر محوِ حیرت ہے
اگلے وقتوں کی بات رہنے دے — آجکل بھی ہے کیا کوئی سردار
کیا کہا، ایک بار پھر کہنا — ہائے ظالم شراب مستی ہے
مصلحت تھی یہی کہ دنیا میں — میں رہا بندۂ خدا ہو کر
سر بسجدہ ہی بتکدہ میں راز — بس یہی حدِ حق پرستی ہے

اس حد کی تعریف حدِ امکان سے باہر ہے۔

خمریات شراب کا موضوع پہلے بھی چند مخصوص شعرائے ایران وہند کا طرۂ امتیاز رہ چکا ہے اور اب بھی کچھ لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر اربابِ کم نظر اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اُن کو یہ کون سمجھائے کہ ؎

مطلبِ سعدی ست پنہاں در غزل راز ذکرِ مے برائے نام ہے

"مطلبِ سعدی ست" کو پیشِ نظر رکھ کر مندرجۂ ذیل اشعار کو پڑھئے اور خود ہی انصاف کیجئے کہ خمریات میں اس ماہرِ فن کا مرتبہ کس قدر بلند ہے

کیا کہا' ایک بار پھر کہنا ہائے ظالم شراب سستی ہے

نگاہِ بادہ پرستاں ہے دستِ ساقی پر نگاہِ ساقیِ رعنا کو دیکھتا ہوں میں

کیوں روکتا ہے واعظِ آشفتہ سر مجھے ہلکا کروں گا بارِ غمِ روزگار کو

فکرِ بیش و کم نہ کر اے بیکشِ عالی قمار تیرے ساقی کی نظر میں تو ہر اک پیمانہ ہے

ساقی خدا گواہ کہ عادت نہیں مجھے دیتی ہے داد نزہتِ دورِ بہار کی

صنائع و بدائع لفظی بعض شاعر لفظی صنعتوں میں پھنس کر شعر کی معنوی خوبیاں کھو بیٹھتے ہیں۔ جو کسی طرح مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ کمال تو جب ہے کہ صنائع و بدائع لفظی کے ہوتے ہوئے بھی ذہن معنویت سے دست و گریباں ہو کر رہ جائے۔ البتہ غور کرنے پر یہ معلوم ہو سکے کہ معنی کے علاوہ لفظی محاسن بھی شعر میں موجود ہیں۔ حضرت راز اس شاعرانہ حسن کو ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیتے ؎

(مراۃ النظیر)
یہ فصلِ بہاری' یہ خوش کیف منظر تو کیا آج توبہ پر احسان ہوگا
ایک خواجہ کے سب ہیں' حلقہ بگوش ہم ہم فقیروں میں کوئی شاہ نہیں

بجا ہے نازِ محبت' بجا ہے فخرِ وفا مگر رہیں یہ حدودِ دنیا نہ تنگ محدود

کافرِ الفتِ ساقی کوئی میخوار نہیں حیف یہ بادہ پرست ایک بھی دیندار نہیں

(طباق)

میری نظر تو تیرے جلووں کو دیکھتی ہے محمود کی نظر میں حسنِ ایاز ہوگا

چل تو ہی حوصلہ کر رسم کہن گر تازہ ارنی گو کوئی اے راز سرِ طور نہیں

(تلمیح)

ہمدردِ ہم نوا ہے مخلص ہے با وفا ہے اے خوش بیاں خدا را کیا بات کہہ رہا ہے

اے آبروئے بزمِ محبت خفا نہ ہو کہتا ہے کون تجھ سے کہ تو خود فروش ہے

(ایہام)

وجدانیات شعر کی روح جذبات ہیں۔ لیکن جذبات سے مراد نالہ و شیون یا فریاد و ماتم نہیں۔ جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ کیفیاتِ روحی ہیں۔ جو دل و دماغ پر عالمِ وجد و حال طاری کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ حضرتِ راز چاندپوری جذباتی شاعر ہیں۔ ان کا سارا کلام وجدانیات سے پُر ہے۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ان میں جوش و مستی کے علاوہ بے ساختگی و روانگی بدرجۂ اتم موجود ہے ؎

مجھکو یہیں جمال کی بجلی سے پھونکدے اب کون اٹھ کے جائے تری جلوہ گاہ سے

یہ فصلِ بہاری یہ خوش کیف منظر تو کیا آج توبہ پہ احسان نہ ہوگا

رازدانِ حریمِ جانانہ مثلِ تصویر محوِ حیرت ہے

بے غرض سجدوں میں کچھ لطفِ جبیں سائی نہیں دادِ سجدہ طلب سجدہ کی رسوائی ہے

کرتا ہوں دل سے دور خیالِ بہار کو کب تک دعائیں دوں فلکِ فتنہ کار کو

بہت رنگیں ہے' دلکش ہے جوابِ صبحِ جنت ہے مگر یہ شامِ غربت کیا کہوں میں شامِ غربت ہے

نازاں ہے اپنے بخت پہ رعنائیِ خیال اک شاہکارِ صنعتِ آذر لئے ہوئے

تکلفاتِ قیام و سجود ہیں بے سود جو بن پڑا تو میں توڑوں گا یہ رسوم و قیود

خدا کا شکر ہے بس اور کیا کہوں اے راز وطن سے دور بہت دور ہو گیا ہوں میں

افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی کے باعث سطورِ بالا میں حسب دلخواہ کلامِ راز کے اوصاف نہیں دکھائے جا سکے جسکی تلافی انشاء اللہ تعالیٰ کسی اور موقع پر کر دی جائے گی۔ سردست ایک پُر کیف غزل نقل کر کے مضمون ختم کیا جاتا ہے ؎

غزل

ہر فقرے میں درد ہے۔ ہر جملہ غم کی داستان ...... یہ کلام اک طلسم ہے۔ جس کے دلکش اور دلفریب مناظر لوگوں کو مسحور اور مسحور بنانے کے لئے کچھ کم نہیں۔ "ان من البیان لسحرا و ان من الشعر لحکمۃ" ہر شعر میں باریکی، بات بات میں ظرافت اندازِ سخن سب سے الوکھا سیدھے سادے مضامین، پھر جدت طرازی، سونے پر سہاگہ نیر صاحب کی چلبلی طبیعت نے جب کبھی پامال زمینوں میں قدم رکھا ہے تو ایک نہ ایک نئی بات ضرور نکلی ہے۔ غرضیکہ نیر صاحب کی شاعری قوم کے لئے مفید، شعرا کے لئے نظیر ہے۔ (صفحہ ۲۶ رسالہ تاج حریت)

"کلیمِ عجم" اور "کارِ امروز"

از ——— جناب واجد صدیقی الوارثی سلولنی بوندوی

چہل سالہ مشقِ سخن کا نتیجہ
"کلیمِ عجم" کارِ امروز" گویا

سرور آفریں وجد آور مضامیں
محاکات کا سر بسر ہیں خزینہ

تغزّل کا ہی دیکھنے سے تعلق
کہ ہے بھر دیا گویا کوزے میں دریا

مُجلّہ ادب اور رجانِ فصاحت
صفات اُنکی تحصیلِ حاصل ہے گویا

ہوئے جلوہ گر آسمانِ ادب پر
تھی اک عرصے سے منتظر جنکی دنیا

خدا کی قسم گوہر بے بہا ہیں
"کلیمِ عجم" "کارِ امروز" گویا

نہیں ذاتِ سیماب محتاجِ تعریف
زمانہ کی نظروں میں اُنکا ہے رتبا

سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ

از ــــ جناب محمد اعجاز حسین صاحب ضیا متعلم آگرہ کالج آگرہ

مشاہیر کے نام پر ادبی انجمنوں کا انتساب ہمارے ملک کی ایک قدیم رسم مقدس ہے۔ مولانا سیماب اکبرآبادی کی شہرت و عظمت کا اقتضا تھا کہ اُن کے نام سے بھی ادبی ادارے منسوب کئے جائیں اور اُن کی زندگی ہی میں اُن کی شخصیت و قبولیت کا اعتراف کرلیا جائے۔

چنانچہ "سیماب لٹریری سوسائٹی" کے نام سے اقصائے ہند کے مختلف شہروں میں ادبی سوسائٹیوں کا افتتاح ہوگیا ہے۔ ٹونک بجنور۔ اٹاوہ وغیرہ شہروں میں یہ سوسائٹیاں قائم ہیں۔ اور اپنا کام نہایت تن دہی سے کررہی ہیں۔ بمبئی میں بھی اس کا انعقاد زیر غور ہے۔ آگرہ میں بھی مرکزی حیثیت اور مقامی اعتبار سے سیماب لٹریری سوسائٹی کا افتتاح ضروری تھا۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے۔ آگرہ اسکول کے نوجوان ہیرو مسٹر محمد صادق صبا بی۔ اے کی تحریک اور چند تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تائید سے ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو سوسائٹی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ ایک ادبی جماعت ہے جو "آگرہ اسکول" کے مقاصد کی تشریح و توضیح کے لئے ایک عرصے سے مصروفِ عمل ہے۔ یہ ایک ادارہ ہے جس میں "آگرہ اسکول" کے خیالات عملی طور پر واضح ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سوسائٹی اپنے پروگرام کی اشاعت میں سرگرم کار ہے۔ سیماب لٹریری سوسائٹی کا حلقۂ عمل آگرے تک محدود نہیں۔ بلکہ اس کی شاخیں ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی موجود ہیں اور بحد امکان "آگرہ اسکول" کے مطمحِ نظر کی اشاعت کرتی رہتی ہیں "آگرہ اسکول" ایک ادارۂ خیال ہے اور سیماب لٹریری سوسائٹی اس ادارۂ خیال کا عملی اظہار۔ آگرہ اسکول کے مقاصد کی توضیح کے لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت بھی تھی اور ہمیں مسرت ہے۔ کہ "سیماب لٹریری سوسائٹی" اپنے اس مقصد کو نہایت کامیابی سے پورا کررہی ہے۔

اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ یہ سوسائٹی ملک کے نوجوان اور تعلیم یافتہ حضرات کے ہاتھوں میں ہے جو اپنے ذوق اور شوق کی سرگرمی سے سوسائٹی کے وقار کو بلند کرتے رہتے ہیں۔

سوسائٹی کے ہر جلسے میں مناثرہ، مناظمہ اور مشاعرہ لازمی طور پر صورت پذیر ہوتا ہے۔ مناثرے کے لئے ایک خاص موضوع کا اعلان کیا جاتا ہے۔ جس پر تقریریں ہوتی ہیں۔ مناظمے کے سلسلے میں عنوانِ نظم کا اعلان ہوتا ہے۔ اور مشاعرے کے لئے مصرع طرح کا۔

سوسائٹی کے جلسے ماہانہ ہوتے ہیں۔ اور شعراء و مفکرین کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ہر سال ماہِ محرم میں "یوم حسین" منعقد کرنا سوسائٹی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے

جس میں ہر موضوع شہادت پر مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ نظمیں سنائی جاتی ہیں۔ اور سلام کہے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ سوسائٹی مشاہیر شعرا اور ادبا کی یادگار کے سلسلے میں خاص جلسے بھی منعقد کرتی رہتی ہے۔ جن میں یوم غالب یوم میر۔ یوم اکبر کو خاص خصوصیت حاصل ہے۔ ماہ مئی ۳۷ء میں سوسائٹی کے پیش نظر "یوم نظیر" کا انعقاد ہے۔ جس کی تیاری بہت بڑے پیمانے پر کی جا رہی ہے۔

ہر جلسے کا ایک علیحدہ صدر منتخب کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک سوسائٹی کو حسب ذیل مشاہیر کے خیالات سے مستفیض ہونے کا موقع مل چکا ہے جن کو سوسائٹی نے صدر منتخب کیا تھا۔ اور جنھوں نے ازراہ عنایت صدارت فرما کر سوسائٹی کی عزت افزائی فرمائی

سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ۔ مسٹر طاہر فاروقی ایم۔ اے۔ مولوی مہدی حسین ایم۔ اے۔ مسٹر احمد علی ایم۔ اے پروفیسر آگرہ کالج آگرہ۔ خان بہادر اختر عادل ایم۔ اے۔ شاہ نظام الدین دلگیر مرحوم۔ حضرت مانی جائسی وغیرہ

مندرجہ ذیل عنوانات سے واضح ہوگا۔ کہ سوسائٹی میں کس قدر اہم موضوعات پر مضامین پڑھے جا چکے ہیں۔

(۱) اتحاد قومی و ملکی اتحاد لسانی پر موقوف ہے۔
(۲) معیار تنقید
(۳) واقعات شہادت کی تاریخی غلطیاں
(۴) تعمیر سیرۃ میں ادب کا حصہ
(۵) فلسفۂ شہادت
(۶) ادب اردو کی موجودہ رفتار کا رخ
(۷) ظلم اور ادب اردو
(۸) شہادت اور موت
(۹) غالب اور فلسفۂ غم
(۱۰) ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو ہونی چاہیئے۔ یا ہندی؟
(۱۱) شاہ دلگیر اور ادب اردو
(۱۲) ملکی و قومی ارتقا میں خواتین کا حصہ
(۱۳) ارمن تاج اور ادبی ذوق۔ وغیرہ وغیرہ

نظموں کے عنوانات۔

(۱)	سردی کا چاند	(۱۱)	شکایت
(۲)	خوابگاہ شہید	(۱۲)	صبح بہار
(۳)	آغاز محبت	(۱۳)	پیام شہید
(۴)	جگنو کی سیر	(۱۴)	کیف غم
(۵)	وطن	(۱۵)	تصور
(۶)	عید اور بسنت	(۱۶)	میر
(۷)	دلکی پیاس	(۱۷)	غالب
(۸)	کسان	(۱۸)	کافر گھٹائیں
(۹)	شباب	(۱۹)	شاہی کھنڈر
(۱۰)	شہید	(۲۰)	نوروز وغیرہ

سیماب لٹریری سوسائٹی کا لائحۂ عمل بہت وسیع ہے۔ اکیڈیمی اور ایک وسیع لائبریری کی تجاویز بھی زیر غور ہیں۔ جن کو عالم وجود میں لانے کیلئے سوسائٹی بہترین کوشش کر رہی ہے۔

سوسائٹی کا لائحۂ عمل اس قدر مفید ہے کہ ہندوستان آئندہ اس کے نقوش قدم پر چلنا اپنا فخر سمجھے گا۔ اور سیماب لٹریری سوسائٹی نشر و اشاعت ادب کے لئے ہندوستان میں ہمیشہ قابل تقلید سمجھی جائے گی۔

نذرِ سیماب اکبر آبادی مدظلہ

از ــــــ حضرت ہوش بلیح آبادی

رنگِ غالب کا مقلد، میر پر مائل ہی تو
شاعرِ اعظم ہے تو اور رہبرِ کامل ہے تو

ہر مضموں تیری تخئیلِ بلند آوارہ ہے
تیرے شعروں کا جو ٹکڑا ہے وہ شہ پارہ ہے

جس نے دیکھا ہو تجھے اور جس نے دیکھا ہو "کلیم"[1]
تجھ کو کہہ سکتا ہے بیشک نبضِ اردو کا حکیم

"کارِ امروز"[2] آج کا ہی کام جو تو نے کیا
دشتِ ویرانِ تخئیل میں جلا یا ہے دیا

تیرا ہر ہر لفظ ہے گویا پیامِ زندگی
تیرا ہر ہر شعر ہے لبریز جامِ زندگی

تو سراپا شعر اور الہام تیری شاعری
تیری ادنیٰ بات ہے گویا حدیثِ بیخودی

تو نے دنیائے ادب میں جانِ تازہ ڈالدی
جو مصیبت آئی تجھ پر تو نے ہنس کر ٹال دی

تو ہے قائم اپنے جادہ پر بہ طرزِ مستقل
اختلافاتِ زمانہ سے نہیں تو مضمحل

رفتہ رفتہ گوشہ نشیں منکور ہو کر سب رہیں
بدمذاقی کا زمانے میں نشاں ملتا نہیں

مولدِ غالب کو تجھ پر ناز کرنا چاہئے
عرش سے بھی اس طرف پرواز کرنا چاہئے

اکبر آبادی ہے تو یہ فخر بھی کچھ کم نہیں
لکھنؤ مانے نہ مانے اس کا کوئی غم نہیں

کچھ نہ کہنا ہے مجھے اب اور نہ سننا ہی مجھے
میں تہِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں تجھے

---

[1] کلیم عجم، دیوانِ غزلیات مولانا مدظلہ [2] کارِ امروز، مجموعۂ نظمیات۔

تجزیۂ وابستگانِ کاروانِ سیماب

۱۳۵۶ھ

تلامذۂ حضرت قبلہ علامہ مولانا سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی مدظلہ العالی کی ایک نامکمل یکجائی فہرست

قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کا فیضِ سخن کب سے جاری ہے۔ اور اس فیضِ بے پایاں سے کون کون مستفید ہو چکا ہے۔ اس کا شمار ازبس مشکل ہے سنہ ۱۹۱۹ء تک کی بعض فہرستیں تبدیلیٔ مرکز کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اُن فہرستوں میں سے جو مشہور نام یادداشت میں رہ گئے وہ اس فہرست میں شریک کر لئے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۹ء مندرجۂ ذیل فہرست میں ایک بہت بڑی تعداد مولانا مدظلہ کے فیضانِ سخن سے بہرہ مند ہونے والوں کی ہے۔ کچھ لوگ اس میں ایسے بھی ہیں جو فارغ الاصلاح ہو چکے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جنھوں نے اصلاح لینا کچھ عرصے سے بند کر دیا ہے۔ اور کچھ ایسے ہیں جو اصلاح تو برابر لیتے ہیں۔ لیکن "کاروان" میں اپنا تذکرہ بعض وجوہ کی بنا پر نہ بھیج سکے

جن حضرات کا سنِ تلمذ یاد رہ سکا ہے۔ یا یادداشت میں محفوظ تھا وہ بھی نام کے ساتھ ہی لکھ دیا گیا ہے۔

اعجاز صدیقی

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

نمبر شمار	تخلص	نام	مقام	سنہ
۱	ابر	دیس راج صاحب شرما	جہلمی	•
۲	اثر	محمد صغیر صاحب	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۱۸ء
۳	اثر	علی میاں صاحب	بمبئی	•
۴	اثر	فضل الدین صاحب	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۳۱ء
۵	اثر	مظفر علی صاحب سالیری	بڑودہ	سنہ ۱۹۳۲ء
۶	احمر	غلام صفدر صاحب ہمدانی بی اے	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۲۵ء
۷	اختر	کنول نین صاحب ادیب فاضل	ردجھانی	سنہ ۱۹۳۱ء
۸	اخگر	سید محمد موسیٰ صاحب	سہسرامی	مارچ سنہ ۱۹۳۳ء

نمبر شمار	تخلص	نام	مقام	سنہ
۹	ادیب	فیض محمد خاں صاحب	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۲۲ء
۱۰	ارشاد	ارشاد محمد خاں نظامی مرحوم	اکبرآبادی	•
۱۱	آسی	محبوب حسن صاحب صدیقی	شکوہ آبادی	سنہ ۱۹۳۰ء
۱۲	اسد	کے۔ ای صاحب شیخ	نصیرآبادی	•
۱۳	اصغر	اصغر علی صاحب	شاہجہانپوری	•
۱۴	اعجاز	اعجاز حسین	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۲۸ء
۱۵	آفاق	محمد الیاس صاحب	بجنوری	•
۱۶	اکبر	اکبر اسمٰعیل صاحب اکبہ بنگالی	عدن	سنہ ۱۹۳۲ء

نمبر شمار	تخلص	نام	مقام	سنہ
۱۷	اکبر	سید اکبر حسین صاحب	جودھپوری	سنہ ۱۹۳۰ء
۱۸	اکسیر	سید محمد حسن شاہ صاحب	دھاروی	سنہ ۱۹۱۰ء
۱۹	الفت	لالہ الفت رام کوہلی بی اے	ٹیڈراون غالب	•
۲۰	امیر	محمد امیر خاں صاحب چشتی	چرکھاری	•
۲۱	انجم	مہر آلٰہی صاحب مرحوم	میرٹھی	سنہ ۱۹۳۲ء
۲۲	انور	محمد نور الدین صاحب انصاری	بھوپالی	سنہ ۱۹۳۴ء
۲۳	انور	لطیف انور صاحب جیلانی	گورداسپوری	
۲۴	الم	مولوی محمد اسحاق صاحب ایچ۔ پی	مظفرنگری	سنہ ۱۹۳۰ء

نمبر	تخلص	نام	وطن	سنہ
۲۵	ارمان	ماسٹر لیاقت علی خاں صاحب	اکبرآبادی	۱۹۳۴ء
۲۶	احمر	عبدالصمد صاحب	اکبرآبادی	۲۴؍جون ۱۹۳۳ء
۲۷	اعجاز	مسٹر ڈی ایلیاس صاحب	کانپوری	۹؍جولائی ۱۹۳۴ء
۲۸	الحان	بابو مولا بخش صاحب	اکبرآبادی	۱۰؍جولائی ۱۹۳۶ء
۲۹	آغاز	سید عنایت علی صاحب	سہارنپوری	۱۹۳۳ء
۳۰	اشرف	حکیم محمد اشرف خاں صاحب	دہلوی	۱۹۳۴ء
۳۱	آذر	وزیر محمد خاں صاحب	سرحدی	۱۹۳۶ء
۳۲	انگر	محمد شریف صاحب	"	۱۱؍اپریل ۱۹۳۴ء
۳۳	امجد	امجد حسین صاحب	چھپروی	۱۹۳۵ء
۳۴	اختر	عبدالکریم صاحب سیٹھ	تلیچری	اپریل ۱۹۳۷ء
۳۵	آرزو	سادھو رام صاحب	سہارنپوری	.
۳۶	افضل	شیخ افضال حسین	اکبرآبادی	۱۹۳۶ء
۳۷	اختر	محمد اسحاق صاحب	"	۱۹۲۴ء
۳۸	آزاد	محمد سعید خاں صاحب	بیاوری	جنوری ۱۹۳۶ء
۳۹	ارغوان	جسونت سنگھ صاحب	گورداسپوری	۱۹۳۱ء
۴۰	اختر	خواجہ حسین صاحب	اعظم گڑھی	۱۹۳۷ء
۴۱	آئینہ	بنیادی بیگم صاحبہ	فتح گڑھ	۱۹۳۰ء
۴۲	اختر	محمد سعید الدین صاحب	اکبرآبادی	۱۹۱۲ء
۴۳	امین	خواجہ محمد امین صاحب	بدایونی	
۴۴	احمد	احمد حسین صاحب	بنگلوری	
۴۵	بشیر	نیازی	بمبئی	۱۹۳۷ء
۴۶	بلیغ	شیخ قمر الدین صاحب	اکبرآبادی	یکم اپریل ۱۹۰۴ء
۴۷	باغ	منشی محمد ایوب صاحب	"	۱۹۱۰ء
۴۸	باصر	سیوک رام صاحب	سنبھل	۱۹۲۶ء
۴۹	بحر	سید عبدالعلی صاحب	الہ آبادی	۱۹۲۵ء
۵۰	بشیر	بشیر الدین صاحب مرحوم	اکبرآبادی	۱۹۱۴ء
۵۱	بشر	غلام حسین صاحب بی۔ اے مرحوم	امرتسری	۱۹۲۹ء
۵۲	برق	عبدالحمید صاحب صدیقی	فتح پوری	۱۹۲۶ء

نمبر	تخلص	نام	وطن	سنہ
۵۳	بسمل	سید عیسیٰ میاں صاحب عیسوی	ٹونکی	۱۹۲۹ء
۵۴	بہار	محمد یوسف صاحب	اکبرآبادی	
۵۵	بسمل	حافظ محمد اللہ صاحب	اعظم گڑھی	۱۵؍اگست ۱۹۲۶ء
۵۶	بیتاب	حفیظ الدین صاحب	اکبرآبادی	-
۵۷	بیدل	محمد عبدالباری صاحب	الہ آبادی	
۵۸	برق	محمد انوار حسین برق	اکبرآبادی	یکم اگست ۱۹۳۴ء
۵۹	برگ	شیو پرشاد صاحب	باندہ	لاہور
۶۰	باسط	باسط حسین صاحب	اکبرآبادی	
۶۱	پرمار	کے حقیقت رائے صاحب	لاہور	،
۶۲	پرواز	کے محمد سلیمان صاحب خان بی اے	بنگلوری	۱۹۲۵ء
۶۳	تاب	عبدالرحمن صاحب	گوالیاری	۱۹۳۱ء
۶۴	تبسم	حامد رضا خاں صاحب	علی گڑھی	۱۹۲۵ء
۶۵	تپش	خورشید حسن صاحب	امرتسری	
۶۶	تنویر		نگینوی	
۶۷	تمنا	عبدالواسع صاحب	چکمگلوری	۱۹۳۵ء
۶۸	تائب	احمد بخش صاحب (مرحوم)	نصیرآبادی	۱۰؍مئی ۱۹۰۴ء
۶۹	تاجر	حافظ محمد بشیر صاحب	اکبرآبادی	
۷۰	تائب	مسٹر سیموئل لائٹ	میرٹھی	۱۹۳۳ء
۷۱	تاجور	علی محمد صاحب	پیلانوی	۱۹۳۱ء
۷۲	تصدق	تصدق حسین صاحب	بریلوی	۲؍مارچ ۱۹۳۵ء
۷۳	ثمر	عبدالحفیظ صاحب	چھپروی	۱۹۳۳ء
۷۴	ثمر	غلام جیلانی صاحب مرحوم	اکبرآبادی	
۷۵	ثمر	مرزا فدا حسین خاں صاحب	دتیا	جون ۱۹۳۶ء
۷۶	ثروت	صاحبزادہ سلطان محمد خاں صاحب	جاؤرہ	مارچ ۱۹۲۶ء
۷۷	جگر	علی سکندر صاحب	مرادآبادی	۱۹۱۲ء
۷۸	جانی	جان محمد صاحب	کوچینی	۱۹۲۷ء
۷۹	جذبی	ماسٹر محمد حمزہ خاں صاحب	ناندورہ	
۸۰	جذبی	منشی محمد اسمعیل صاحب نظامی	کوچینی	۱۹۲۸ء

نمبر	تخلص	نام	وطن	سنہ
۸۱	جلیل	محمد جلیل صاحب انصاری	لکھنوی	
۸۲	جمیل	خواجہ نثار الحسن شاہ صاحب	اکبرآبادی	۱۹۲۶ء
۸۳	جمال	عابد رضا خاں صاحب	علی گڑھی	۱۹۲۴ء
۸۴	جوہر	منشی الطاف حسین صاحب مرحوم	اکبرآبادی	۱۹۳۶ء
۸۵	حافظ	حافظ محمد حسین صاحب	علی گڑھ	
۸۶	حسرت	سید احمد صاحب	نگینوی	
۸۷	حشر	سید حمید الدین صاحب	سہسرامی	۱۹۳۲ء
۸۸	حفیظ	محمد حفیظ اللہ صاحب حفیظ		۱۹۳۰ء
،		ایس۔ آر۔ کے	اکبرآبادی	
۸۹	حکیم	عبدالمجید خاں صاحب	ارنڈول	
۹۰	حیرت	آغا احمد سیر صاحب درانی	لدھیانوی	۱۹۳۱ء
۹۱	حسرت	پیرزادہ سید علی صاحب	اجمیری	
۹۲	حیدر	نصیر الدین صاحب	کرتھل	۱۹۳۳ء
۹۳	حسامی	سردار عالم صاحب	ناگپوری	۱۹۳۶ء
۹۴	حسرت	محمد یحییٰ خاں صاحب	سہارنپوری	
۹۵	حیدر	بابو امیر الدین صاحب	اکبرآبادی	۱۹۳۱ء
۹۶	حیا	خورشید اقبال صاحب حیا	میرٹھی	۱۹۲۸ء
۹۷	حور	گوہر اقبال صاحبہ حور	"	
۹۸	حاذق	حکیم محمد بخش صاحب	اکبرآبادی	
۹۹	عسرت	ابو النصرت فتح محمد خاں صاحب	گنگوہی	۱۹۳۶ء
۱۰۰	خالد	نواب زادہ شیخ محمد عبدالخالق صاحب بہادر	منگرول	
۱۰۱	خادم	منشی غلام محی الدین صاحب	بھڑوچی	۱۹۳۱ء
۱۰۲	خمار	حنیف ہاشمی صاحب بی۔ اے (مرحوم)		
۱۰۳	خنداں	رلیم جویا صاحب	جہلمی	

نمبر	تخلص	نام	وطن	سنہ
۱۰۴	خمار	حامد رضا خانصاحب		۱۰ جون ۱۹۲۲ء
۱۰۵	خلیل	عبدالستار خانصاحب	گولاری	۱۹۳۶ء
۱۰۶	درد	عبدالرشید صاحب	اکبرآبادی	۱۹۳۵ء
۱۰۷	دلکش	محمد یسین صاحب (مرحوم)	عدنی	۱۹۳۳ء
۱۰۸	رادی	حافظ مولوی عبدالرؤف صاحب	اجمیری	۱۹۰۰ء ۱۹۱۷ء
۱۰۹	راز	ابوالفاضل محمد صادق صاحب	چاندپوری	۱۵ جولائی
۱۱۰	رسوا	محمد احمد صاحب وارثی	سہارنپوری	۱۹۳۳ء
۱۱۱	رضا	عبدالرضا صاحب قریشی	گوالیاری	۱۹۳۳ء
۱۱۲	رضا	دشوا ناتھ صاحب	لاہور	(لاہوری)
۱۱۳	رواں	سراج الدین صاحب	اکبرآبادی	۱۹۱۳ء
۱۱۴	رعنا	جسونت رائے صاحب	ملسوی	۱۷ مارچ ۱۹۳۵ء
۱۱۵	ریاض	ریاض الدین احمد صاحب	اکبرآبادی	۱۹۱۶ء
۱۱۶	رسوا	حکیم محمد اسحاق صاحب	"	
۱۱۷	ساغر	محمد یار خانصاحب نظامی	علی گڑھی	۱۵ اگست ۱۹۱۸ء
۱۱۸	ساحل	صاحبزادہ حامد سعید خانصاحب	ٹونکی	۱۹۳۲ء
۱۱۹	سائر	محمد خلیل صاحب صدیقی	اکبرآبادی	۱۹۲۸ء
۱۲۰	ساز	حکیم سلطان محمود خانصاحب	دہلوی	
۱۲۱	ساحر	مولوی ضمیر عالم صاحب	اکبرآبادی	۷ نومبر ۱۹۱۸ء
۱۲۲	سرشار	نذیر حسین صاحب	نصیرآبادی	
۱۲۳	سرور	سید عباس علی صاحب مرحوم	اکبرآبادی	۱۹۲۲ء
۱۲۴	سلیم	غلام احمد صاحب قریشی	پنڈدادن خاں	فروری ۱۹۳۵ء
۱۲۵	سیفی	اسلام الحق صاحب صدیقی	بلوچستان	مارچ ۱۹۳۵ء
۱۲۶	سیفی	حافظ عزیز الرحمن صاحب	بجنوری	۱۹۳۰ء
۱۲۷	سیفی	فیاض حسین صاحب	اکبرآبادی	۱۹۲۳ء
۱۲۸	سفیر	حاجی عبدالستار صاحب	"	
۱۲۹	سحر	سید علی صاحب	اجمیری	۳ جون ۱۹۰۸ء
۱۳۰	سرود	غلام سرور صاحب قادری	ساجوالوی	۱۹۳۴ء
۱۳۱	ساغر	صاحبزادہ سلطان منیر صاحب	امرتسری	

نمبر	تخلص	نام	وطن	سنہ
۱۳۲	سیف	سید سیف علی صاحب نقوی	اکبرآبادی	۱۹۳۴ء
۱۳۳	شادلب	عبدالحمید خانصاحب	"	
۱۳۴	شاد	محمد حسین صاحب	کاندھلہ	
۱۳۵	شاعر	حضور اختر صاحب	اکبرآبادی	
۱۳۶	شگفت	ایم۔ اے رشید صاحب	سینائی	۱۹۲۹ء
۱۳۷	شفق	بابو [illegible] صاحب	علی گڑھی	
۱۳۸	شفق	کرتار ناتھ صاحب [illegible]	سیالکوٹی	۱۹۲۷ء
۱۳۹	شفیق	شفیق اللہ خانصاحب	کوٹی	۱۹۳۰ء
۱۴۰	شفق	صاحبزادہ شفیق الرحمن خانصاحب	ٹونکی	۱۹۲۸ء
۱۴۱	شکیل	ننھے خاں صاحب	اکبرآبادی	۱۹۲۲ء
۱۴۲	شفق	محمد خانصاحب	"	
۱۴۳	شفیق	شفیق احمد صاحب	[illegible]	
۱۴۴	شمیم	منشی ولایت علی صاحب	اکبرآبادی	۱۹۱۰ء
۱۴۵	شوق	ماسٹر مشتاق احمد صاحب	چاندپوری	۱۹۳۲ء
۱۴۶	شیدا	ابوالمحققین خیراللہ صاحب	رام نگر	
۱۴۷	شعلہ	بابو شفیع احمد صاحب	اکبرآبادی	
۱۴۸	شہید	محمد عارف صاحب	بجنور	جولائی ۱۹۳۶ء
۱۴۹	شوق	ابوالاحسان محمد محسن صاحب	مٹھیالوی	مارچ ۱۹۳۵ء
۱۵۰	شہاب	نصرت علی خانصاحب	"	یکم فروری ۱۹۰۰ء
۱۵۱	شفا	محمد شفیع صاحب		۲۴ مئی ۱۹۱۹ء
۱۵۲	شجر	منشی ہدایت اللہ خانصاحب	کوٹی	۱۹۳۷ء
۱۵۳	شفق	ولایت حسین خانصاحب اکبرآبادی	بمبئی	
۱۵۴	شہ نور	غلام قادر رضا بی اے	کشمیری	۱۹۳۷ء
۱۵۵	شمس	شمس الدین احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل	جلال آبادی	
۱۵۶	صابر	غلام مہدی صاحب	ٹھیالوی	
۱۵۷	صابر	غلام مرتضیٰ	بازید پوری	۱۹۳۴ء

نمبر	تخلص	نام	وطن	سنہ
۱۵۸	صابر	محمد ایوب خانصاحب	[illegible]	۱۹۳۰ء
۱۵۹	صابر	اے بی خلیس صاحب بی اے	اکبرآبادی	۱۹۳۵ء
۱۶۰	صبا	رفیع احمد صاحب	متھراوی	۱۹۳۵ء
۱۶۱	صحرائی	راجپال صاحب	لاہور	۱۹۳۵ء
۱۶۲	صغیر	صغیر احمد صاحب	جلال آبادی	
۱۶۳	صہبا	اعجاز حسین صاحب	چاندپوری	۱۰ جون ۱۹۲۲ء
۱۶۴	صمیم	محمد فہیم صاحب	امروہی	۱۰ مارچ ۱۹۱۹ء
۱۶۵	صدیقی	محمد بشیر علی صاحب صدیقی	بدایونی	
۱۶۶	ضیا	حاجی ضیاء الاسلام صاحب	کاندھلوی	۱۹۳۰ء
۱۶۷	ضیا	محمد عبداللہ خانصاحب منشی فاضل		
۱۶۸	ضیا	محمد صادق صاحب بی اے	چنیوٹی	۱۹۳۰ء
۱۶۹	ضیا	مہرلال صاحب ایم اے	فتح آبادی	۱۹۳۵ء
۱۷۰	ضیا	حمید اللہ خانصاحب	میانوالی	
۱۷۱	ضمیر	محمد ضمیر الدین صاحب	بوزنگ پیٹ	۱۰ جنوری ۱۹۳۷ء
۱۷۲	طالب	عبدالمجید صاحب احمدی	جہلمی	۱۹۲۴ء
۱۷۳	طالب	پنڈت نندلال صاحب ایم اے	کاشمیری	
۱۷۴	طالب	سبحان خانصاحب	بالاپوری	۱۹۳۶ء
۱۷۵	طاہر	طاہر حسین صاحب	دیوبندی	
۱۷۶	ظفر	سراج الدین صاحب بی اے	جہلمی	۱۹۳۳ء
۱۷۷	ظہیر	محمد ظہیر عالم صاحب اسلمی بی اے	اکبرآبادی	
۱۷۸	ظفر	سید ظفر صاحب ہاشمی	سیالکوٹ	
۱۷۹	ظہور	ظہور الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل	متھراوی	
۱۸۰	ظفر	ظفر محمد صاحب	بہاری	

۱۸۱	عروج	سید احمد صاحب ہاشمی اتعادی	بدایونی	•	۲۰۸	کاتب	منشی محمد حفیظ صاحب	اکبرآبادی	•	۲۳۶	تبر	اکبر احمدی صاحب	اجمیری	سنہ ۱۹۰۸ء
۱۸۲	عیاں	ہاشمی	•	•	۲۰۹	کوثر	ڈاکٹر سید علی صاحب	چاندپوری	•	۲۳۷	مجاز	حافظ عبدالنعیم خانصاحب لودی	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۳۵ء
۱۸۳	عمر	حاجی محمد عمر صاحب مرحوم	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۲۴ء	۲۱۰	کوثر	سید محمد اشفاق حسین صاحب	گڑھی کوٹاہ	سنہ ۱۹۳۳ء	۲۳۸	ممتاز	بابو ممتاز علی صاحب	علی گڑھی	•
۱۸۴	عارف	ڈاکٹر مولوی عبدالحی صاحب	بھاگلپوری	سنہ ۱۹۳۵ء	۲۱۱	کوثر	شیخ منظور الٰہی صاحب	کشمیری	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۳۹	محمود	سید محمود حسن صاحب	الٰہ آبادی	•
۱۸۵	عشق	محمد طٰہ صاحب	لکھنوی	•	۲۱۲	کوثر	عبدالغفور صاحب	اکبرآبادی	۳ مئی سنہ ۱۹۳۴ء	۲۴۰	محفوظ	محفوظ الرحمٰن خانصاحب	گونوہ	سنہ ۱۹۲۵ء
۱۸۶	عطا	حاجی محمد عطاء اللہ صاحب	اکبرآبادی	•	۲۱۳	کلیم	شیخ جمن صاحب	کساروی	سنہ ۱۹۳۲ء	۲۴۱	ماہر	خانصاحب حکیم محمود علی صاحب	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۲۲ء
۱۸۷	علام	غلام احمد خانصاحب	شیرگڈھ ضلع بانس بلی		۲۱۴	کیفی	بابو منور خانصاحب		۱۸ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء	۲۴۲	نثار	عبدالحمید صاحب	مہوبہ	•
۱۸۸	غفار	عبدالغفار صاحب	اکبرآبادی	•	۲۱۵	کیفی	محمد علی صاحب	جام پوری	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۴۳	نایاب	عبدالمجید خانصاحب	اکبرآبادی	•
۱۸۹	فنا	مرزا اسلام اللہ بیگ صاحب	الٰہ آبادی	سنہ ۱۹۳۵ء	۲۱۶	کاشف	محمد شفیع صاحب	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۲۷ء	۲۴۴	نذیر	نذیر احمد صاحب	شیرکوٹی	سنہ ۱۹۲۵ء
۱۹۰	فنا	مولوی محمد اسمٰعیل صاحب	اکبرآبادی	•	۲۱۷	کلیم	عبدالمجید خانصاحب	ازنڈول	•	۲۴۵	نیر	مصطفیٰ حسین صاحب بی اے علیگ	کانپوری	•
۱۹۱	فنا	یعقوب علی خانصاحب	•	۱۴ مئی سنہ ۱۹۰۴ء	۲۱۸	•	گوربخش سنگھ صاحب	ننکانہ صاحب	•	۲۴۶	نثار	ماسٹر نثار حسین صاحب	اٹاوہ	سنہ ۱۹۳۴ء
۱۹۲	فارغ	محمد سعید صاحب	پشاوری	•	۲۱۹	لیاقت	حافظ لیاقت حسین صاحب	اکبرآبادی	•	۲۴۷	نسیم	حبیب احمد صاحب	منھرادی	مارچ سنہ ۱۹۳۵ء
۱۹۳	فدا	ماسٹر سری کرشن صاحب	پٹیالوی	سنہ ۱۹۳۵ء	۲۲۰	مضطر	محمد عبداللہ صاحب	لاہور	سنہ ۱۹۳۴ء	۲۴۸	نظر	منشی امیرالدین صاحب مرحوم	اکبرآبادی	یکم اپریل سنہ [illegible]ء
۱۹۴	فنائی	مولوی حبیب اللہ صاحب	ٹونکی	سنہ ۱۹۲۵ء	۲۲۱		مسٹر ہیم راج	ڈیرہ دون	•	۲۴۹	ناظر	محمد حسین صاحب	״	•
۱۹۵	فہیم	حکیم الدین صاحب انصاری	فیروزآبادی	سنہ ۱۹۲۸ء	۲۲۲	ماہر	مولوی حمید اللہ بیگ صاحب	دہلوی	سنہ ۱۹۳۱ء	۲۵۰	نکہت	نور محمد خانصاحب	•	۴ جون سنہ ۱۹۰۴ء
۱۹۶	فہمی	اسمٰعیل شاہ صاحب	رتناگیری	•	۲۲۳	مانوس	الطاف حسین صاحب	سہسرامی	•	۲۵۱	ناقد	سید حامد علی صاحب بی اے	ٹونکی	•
۱۹۷	فیاض	سید فیاض علی صاحب	بدایونی	•	۲۲۴	محسن	محمد محسن صاحب	اکبرآبادی	•	۲۵۲	نثار	عبدالرزاق الٰہی بخش صاحب	عدنی	•
۱۹۸	فیاض	محمد فیاض حسین صاحب	اکبرآبادی	•	۲۲۵	محشر	عظمت طلب خانصاحب	دہلوی	•	۲۵۳	نازش	رضوی	دہلی	•
۱۹۹	فدا	فضل الدین صاحب	دینانگری	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۲۶	مخمور	گوربخش سنگھ صاحب	جالندھری	سنہ ۱۹۲۵ء	۲۵۴	نشتر	اعجاز محمد صاحب	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۳۶ء
۲۰۰	فکری	عبدالستار خانصاحب	بیاور	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۲۷	مسلم	منشی فضل محمود صاحب	پشاوری	•	۲۵۵	نور	محمد نور صاحب	״	•
۲۰۱	فصیح	محمد فصیح صاحب الفضلی	دیوبندی	•	۲۲۸	مظہر	حافظ محمد مظہر الدین صاحب	مدراس	سنہ ۱۹۳۳ء	۲۵۶	ناظر	محمد ناظر صاحب	״	•
۲۰۲	قاتل	شاہ میر احمد صدیق صاحب	لکھنوی ثم الاجمیری		۲۲۹	مفتون	سید شوکت حسین صاحب	آبادی	•	۲۵۷	نسیمہ	مسرت جہاں صاحبہ	״	سنہ ۱۹۳۵ء
۲۰۳	قدسی	محمد عبیداللہ صاحب قدسی		سنہ ۱۹۲۸ء	۲۳۰	منظر	شمشاد حسین صاحب	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۲۰ء	۲۵۸	نسرین	عابدہ جہاں خانم صاحبہ مرحوم	متھرادی	سنہ ۱۹۲۴ء
		ایچ۔ پی۔	ٹونکی	•	۲۳۱	منتظر	سید منظور احمد صاحب رضوی	بھوپالی	سنہ ۱۹۳۰ء	۲۵۹	وحید	کنور عبدالوحید خانصاحب	اترولوی	•
۲۰۴	قمر	حکیم بدیع الزمان صاحب	سہسرامی	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۳۲	مغفور	عبدالرحیم صاحب صدیقی	جہلم	•	۲۶۰	وفا	محمد عثمان خانصاحب اسلامی	جیلوسی	
۲۰۵	قیصر	غلام احمد صاحب	اکبرآبادی	•	۲۳۳	موزوں	راجہ محمد لطیف خانصاحب	گڑھی کشمیر	سنہ ۱۹۳۳ء	۲۶۱	وفا	شنکرلال صاحب وفا	اکبرآبادی	سنہ ۱۹۳۶ء
۲۰۶	قیس	ڈاکٹر بشیر محمد خانصاحب	جموں	•	۲۳۴	مفتون	شنکر سروپ صاحب	شکوہ آبادی	سنہ ۱۹۳۱ء	۲۶۲	یاور	حسن یاور صاحب نقوی	چاندپوری	سنہ ۱۹۳۵ء
۲۰۷	قومی	فضل اللہ صاحب	ٹونکی	•	۲۳۵	قمر	سورج نرائن صاحب	جے پور	•	۲۶۳	یونس	ماسٹر یونس علی خانصاحب	اجھانوی	سنہ ۱۹۳۷ء

جماعتِ عقیدتمندانِ سیمابؔ
۱۳ ھ ۵۶
سجاد

جہاں منزل پہ میرے کارواں کے بعد پہونچے گا
امیرِ کارواں ہے کارواں میرا حقیقت میں

(کارِامروز) سیمابؔ مدظلہٗ

بااسم الرحمٰن علمہ البیان

میرا پیام ——— اپنے کارواں کے نام

عطیۂ ——— حضرت قبلہ مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی

خدا نے مجھے ایک نئی شاہراہ دی ——— پھر ایک قوی و جواں رفتار کارواں دیا ——— پھر منزل رسی کی بشارت دی ——— یہ اُس کے کتنے احسانات ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ والشکر علیٰ نعمائہ۔

اس شاہراہ جدید یعنی "آگرہ اسکول" کے فرزندانِ ادب کا ایک پیش گاہ (پلیٹ فارم) پر جمع ہونا اجتماعی نقطۂ نگاہ سے گوناگوں حالات اور بوقلموں اثرات کا خالق ہے۔ آج اس کارواں کا ہر فرد اپنی صحیح جگہ اور اپنا حقیقی نصب العین معلوم کر سکے گا اپنے دماغ و قلم سے سینچے ہوئے اس سدا بہار باغ کو گلریز و بہار خیز دیکھ کر میں کہہ نہیں سکتا کہ میری روح کس قدر شگفتہ و بالیدہ ہے۔

میرے باغِ ادب کے نونہالو! اس ایمان و اعتراف کے ساتھ کہ تم "آگرہ اسکول" کے معنوی فرزند ہو، "آگرہ اسکول" کے علم کو بلند رکھنا تمہارا سب سے پہلا اور سب سے اہم فریضۂ حیات ہے۔ تمہاری انفرادی کوششیں اجتماعی جذبات کی حامل ہونی چاہئیں۔ اور تمہیں شاہراہِ حیات میں من حیث الجماعت گامزن رہنا چاہئے۔

تم دنیائے ادب کی ایک ذمہ دار جماعت ہو۔ جماعتوں کے احیاء و قیام کے اصول، انفرادی زندگی کے آئین و قوانین سے مختلف ہوتے ہیں۔ دنیا میں جماعتیں اُسی وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک اُن میں زندہ رہنے کی اہلیت باقی رہے۔ تم بھی ایک زندہ اور بیدار جماعت کی طرح، اپنی زندگی کا ثبوت دو نام و نمود کے لئے نہیں، بلکہ اس لئے کہ تمہیں بھی دوسری جماعتوں کی طرح زندہ رہنے کا حق ہے۔

تمہارے ذمۂ ہمت پر ملک و قوم کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ہندوستان زندگی کی مختلف نوعیتیں اور صورتیں پیدا کر رہا ہے۔ انمیں بعض فطری ہیں، اور بعض سیاسی و عمرانی ایماء و منشا کے ماتحت دخیلِ حیات ہیں۔ تم ان دونوں میں حدِ امتیاز قائم رکھو اور ایسی روش اختیار کرو جو تمہیں فطرت کا ہمراز و ہم آہنگ بنا دے۔

وہ ادبی جماعت کبھی قائم اور زندہ نہیں رہ سکتی جو اپنے ماحول کو نظر انداز کر دے۔ تمہیں "ہندِ جدید" میں زندگی بسر کرنی ہے اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی ذہنی و فکری قوتوں کو جدید ملکی رجحانات کے مطابق ہر لمحہ استوار اور

متحد رکھو اور اپنے افکار میں ان قوتوں کو نمایاں کرتے رہو۔ وطن اور اردو کی محبت تمہارا جزوِ ایمان ہونی چاہیے۔

تمہیں ملکوں اور قوموں کی تاریخ سے درس لینا چاہیے۔ اس لئے کہ تم بھی انہیں اصولی راستوں پر چلنے کیلئے فطرتاً مجبور ہو جو قوموں اور جماعتوں کی فطری گذرگاہیں ہیں۔ تمہیں بھی تاریخ میں جگہ حاصل کرنی ہے۔ اور کوشش کرنی ہے کہ اجتماعی جدوجہد سے ایک نمایاں، دیرپا اور بلند درجہ حاصل ہو جائے۔ تمہارا اُسی وقت تک رہنما ہوں جب تک تم میں موجود ہوں، میرے بعد تمہیں خود مختارانہ زندگی بسر کرنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں دوسروں سے شمعِ راہ مانگنے کی ضرورت نہ ہو، اور تم آگرہ اسکول کی مشعلِ فروزاں کو بلا واسطہ میرے بعد بھی فروزاں رکھو۔

میرے معنوی فرزندو! ادب کا درجہ قومیات میں بہت رفیع ہے۔ تم ادب کے علمبردار ہو۔ تم ایک کاروانِ ادب ہو، وقت تمہیں منزل کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے۔ اگر سلامت روی، استقلال، عزم اور آزادیٔ فکر کیساتھ تم اسی طرح بڑھے چلے گئے، تو ایک دن مینارِ منزل تمہارا خطبۂ منظوم سننے کیلئے سرنگوں ہوگا۔ اور منزل تمہارے قدموں میں سجدہ ریز ہوگی۔ تم میں سے کئی منزل پر پہونچ چکے ہیں۔ کئی قریبِ منزل ہیں، اور اکثر منزل سے دور ہیں۔ مگر یاد رکھو کہ گمراہ کوئی نہیں، سب کا راستہ صحیح اور منزل رس ہے۔

میرے عزیزو اور دوستو! آگرہ اسکول کی جس شاہراہِ جدید کے تم پیرو ہو، اسکی کمین گاہوں میں سینکڑوں خطرناک رہزن پوشیدہ ہیں، انکی ہمت شکن و ہیبت آفریں آوازوں سے مطلق اثر نہ لو۔ انھیں چلانے دو ——— انھیں چیخنے دو ——— اور تم چودھویں رات کے خاموش چاند کی طرح فضائے عالم پر نور افشانی کرتے ہوئے سکون کے ساتھ آگے بڑھ جاؤ۔

وقت آ رہا ہے کہ شاعری کے وہ تمام قدیم ادارے جو "آگرہ اسکول" کے حریفِ ضعیف ہیں اپنی زندگی ختم کر دیں۔ اور "آگرہ اسکول" ادبِ قومی کی ترقی و ترفیع کا واحد ادارہ تسلیم کر لیا جائیگا۔ اسلئے تمہیں "آگرہ اسکول" کی پیروی عقیدت و ارادت کی پوری قوتوں سے کرنی چاہیے۔ ہٰذا صراطٌ مستقیم۔

میرے عزیز شاگردو! تمہارے افکارِ موزوں کی بنیادیں محبت، صداقت اور آزادی پر قائم ہونی چاہئیں۔ انھیں "عناصرِ ثلاثہ" سے آگرہ اسکول عبارت ہے۔

تقریباً نصف صدی گذرنے کے بعد اب میری یہ آرزو حق بجانب ہے کہ علم و عمل اور عزم و عقل کی روشنی میں میرا کارواں اپنی حقیقی منزلِ معراج سے آشنا ہو اور میں اپنے کارواں کے ہر فرد کو "امیرِ کارواں" کے منصبِ جلیل پر فائز دیکھ لوں۔

میں اپنے "کارواں" کو اخوت و خلوصِ باہمی کی حبلِ متین استوار رکھنے کی تلقین کرتا ہوں، اور میری دعا ہے کہ جس رشتے میں یہ کارواں منسلک ہے خدا اسے اور زیادہ مضبوط، مستحکم اور ہمہ گیر فرمائے۔ آؤ، میں تمہاری تابناک پیشانیوں پر بوسہ دوں جنہیں علم و ادب کے آفتاب و ماہتاب تاباں ہیں۔ خدا انھیں ہمیشہ بلند اور درخشاں رکھے۔ اور آگرہ اسکول کے حریمِ ادب میں جھکنے والے سروں کو رفعتِ عرش عطا فرمائے۔

قصر الادب آگرہ

۱۴ / اپریل ۱۹۳۶ء

سیماب اکبرآبادی

سید عنایت علی صاحب آغاز برہانپوری

مولوی بشارت علی خاں صاحب امان آفریدی اکبرآبادی

مولوی محمد نورالدین صاحب نور بھوپالی

فضل الدین صاحب آثر بی۔اے اکبرآبادی

سید محمد موسیٰ صاحب اخگر سہسرامی

محمد صغیر صاحب اثر اکبرآبادی

وزیر محمد خاں صاحب آذر سرحدی

سید احمد حسین صاحب امجد

آغاز — سید عنایت علی صاحب حسنی الحسینی برہانپوری — ۱

آپ کے والد کا نام سید حافظ علی تھا سنہ ۱۳۲۰ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۰۲ء میں بمقام برہانپور پیدا ہوئے۔ آبائی وطن مارہرہ متصل فیض پور مشرقی خاندیش ہے۔ آپ کا نسبی سلسلہ ننہال کی طرف سے چند واسطوں کے بعد سبط رسول زمن سیدنا امام حسن ؑ سے ملتا ہے اور ددھیال کی طرف سے سید الشہدا امام حسین ؑ سے۔ اسی لئے آپ حسنی الحسینی کہلاتے ہیں۔ آپ کو حضرت مولانا شاہ احمد حسین صاحب امروہوی سے نقشبندی سلسلے میں بیعت حاصل ہے۔

آپ کے مورث اعلیٰ سادات بارہہ بہ زمانۂ عالمگیر ثانی مارہرہ آئے جہاں اسوقت قزاقوں کی بود و باش تھی چنانچہ آپ کے مورثوں نے اُن ظالموں سے اس سرزمین کو پاک کیا اور وہیں اقامت گزیں ہوگئے۔ مارہرہ ست پڑہ پہاڑ کی ایک زرخیز وادی کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں کی آبادی زیادہ تر آپ کے ہی اہل خاندان سادات پر مشتمل ہے

آپکے والد بزرگوار کے زمانہ تک کچھ موروثی معافی اراضیات تھیں جو انہیں کے زمانہ میں خاندانی تنازعات کی نذر ہوگئیں اور آپ کے والد وطن مالوف سے برداشتہ ہوکر برہانپور چلے آئے۔ اور وہیں ایک معزز خاندان میں متاہلانہ زندگی کے حامل ہوئے آپ کے دو بھائی صغر سنی ہی میں انتقال کر گئے تھے دو بہنیں باقی ہیں۔

سنہ ۱۳۴۵ھ میں آپ کی شادی مولوی محمد شاہ زماں کے دختر سے ہوئی جن کا پانچ سال کے بعد سنہ ۱۳۵۰ھ میں انتقال ہوگیا چونکہ مرحومہ نے اپنی یادگار ایک دو سال کی بچی چھوڑی تھی اس لئے اُس کی پرورش کے خیال سے آپ نے ایک معزز خاندان میں دوسری شادی کی۔ آپ کے دو لڑکے مشتاق علی اور اور اشتیاق علی ہیں سب سے چھوٹے بچے اشفاق علی کا بعمر ایک سال ۱۰ دسمبر سنہ ۳۶ء کو انتقال ہوگیا۔

والد کی وفات کے بعد اگست سنہ ۱۹۳۳ء میں آپ کی والدہ ماجدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ یہ آپ کیلئے ایک سانحۂ عظیم تھا جس نے آپ کی مشکلات میں اور اضافہ کردیا۔

آپ ابتدا ہی سے آلام و مصائب کے شکار ہیں۔ اور ابھی تک آپ کو سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا ہے۔ آپ برہانپور کے ایک میونسپل اسکول میں مدرس ہیں۔ اور ایک قلیل مشاہرہ پر وہیں پڑے ہوئے ہیں۔

آپ کو پانچ سال کی عمر میں جناب فخر الدین صاحب فخرؔ کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے بٹھایا گیا۔ جہاں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد مولانا غلام محمد صاحب اور مولوی محمد ابراہیم صاحب سے علوم متداولہ حاصل کئے۔

برہانپور صوبہ ممالک متوسط کا ایک تاریخی شہر ہے جہاں شاہان فاروقیہ شاہان مغلیہ اور سلاطین آصفیہ کا دور دورہ رہ چکا ہے۔ اور شاہی دور میں یہ شہر ارباب علم و فن کا مرکز رہا ہے جس وقت آپ نے آنکھ کھولی تو وہاں کے رنگ تغزل پر گل و بلبل کا عنصر غالب تھا چنانچہ آپ بھی اُسی طرف بہنے لگے۔ جوں جوں اردو شاعری میں انقلاب پیدا ہوا یہاں کے رنگ تغزل میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ہمیشہ کے لئے اس رنگ کو چھوڑ دیا۔ اور رنگ جدید اختیار کیا۔ آپ کی شاعری کے محرک سید شاہ برکات احمد جمیلؔ مرحوم تھے۔ جن سے آپ کو حد درجہ محبت تھی جمیل صاحب کا انتقال عالم جوانی ہی میں ہوگیا۔ آپ ہی کی سعی و کوشش سے آغاز صاحب نے سنہ ۱۹۱۴ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ مرحوم ہی نے آپ کو حضرت راغبؔ برہانپوری کے سلسلۂ تلمذ میں داخل کرایا دس بارہ سال تک آپ حضرت راغب سے مشورۂ سخن لیتے رہے وقتاً فوقتاً مولانا اخترؔ رامپوری سے بھی اصلاح لی جو حضرت راغب کے استاد ہیں۔ اس کے بعد بخیال ترقی مزید نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیلؔ مانکپوری سے اصلاح لینی شروع کی اور سنہ ۱۹۳۳ء میں ایک ماہ حیدرآباد رہ کر استاد سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس اثنا میں کبھی کبھی آپ اپنی نظمیں حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ اکبرآبادی مدظلہٗ کو بھی بھیجتے رہتے تھے۔ چونکہ بوجہ پیرانہ سالی حضرت جلیل مانکپوری کے یہاں سے اصلاح شدہ کلام آنے میں بہت کافی وقت صرف ہوجاتا تھا اس لئے اب آپ

مستقلاً حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ ہی کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔ چونکہ آپ کو غزل سے طبعی لگاؤ نہیں اس لئے نظمیں ہی زیادہ کہتے ہیں۔ آپ کو حضرت مولانا سیماب سے انتہائی ارادت ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "میں علامۂ ممدوح کو پرستش کے درجہ تک مانتا ہوں"۔ آپ کا رنگ "آگرہ اسکول" کا صحیح نمونہ ہے۔ شکوہ الفاظ اور معانی و مطالب کی گہرائیاں۔ الفاظ کی بندش وغیرہ بہت خوب ہوتی ہیں۔

آپ کی تصانیف میں سے ایک کتاب "چراغِ حسینی" سلاموں کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ "شاہنامۂ دکن"، سلاطینِ دکن کی منظوم تاریخ۔ عناصر اللغات اردو زبان کے مستند محاورات جس میں مشاہیر شعرائے ہند کے کلام سے سندیں لی ہیں۔ مرقعِ عجم ساڑھے تین سو مشاہیر شعرا کے حالات و تصاویر اور کلام کا مجموعہ۔ محامدِ شمس الضحیٰ نعتیہ دیوان۔ غزلیات۔ جذبۂ مشرق غزلیات کا مجموعہ۔ آرائشِ سخن اساتذۂ عصرِ حاضر کے اصلاحی نمونے۔ آفتابِ مشرق غیر مطبوعہ ہیں۔ چونکہ آپ اتنے فارغ البال نہیں کہ ان کو چھپوا سکیں اس لئے یہ تمام نوادرات یونہی پڑے ہوئے ہیں۔

نمونۂ تغزل

حُسن سو شکلوں سے چمکا پردۂ تاثیر میں
کتنی تصویریں کھچیں اک آپ کی تصویر میں

پھونک دی یہ روح کس نے حسرتِ تقریر میں
میری گویائی کو لرزش ہے لبِ تصویر میں

ہوگئیں تقسیم حُسن و عشق کی رنگینیاں
کچھ مری تصویر میں کچھ آپ کی تصویر میں

میری حیرانی ہے حُسنِ جلوہ گاہِ کائنات
جوہرِ آئینہ ہوں آمنۂ تصویر میں

غیر ممکن ہے مجھے آغازؔ کوئی پا سکے
کھو گیا ہوں وسعتِ جذباتِ عالمگیر میں

میری غزل سرائی آہنگِ عاشقانہ
جذب آفریں ترنم وجد آفریں ترانہ

ہستی کے بام و در سے مستی برس رہی ہے
ہستی بقدرِ مستی ہے اک شراب خانہ

اے خاکِ راہِ الفت دامن دراز ہو جا
آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنے لگا خزانہ

یہ کون آ رہا ہے تاروں کی روشنی میں
قسمت کو میں جگا لوں سوتا رہے زمانہ

تجھ سے سکون چاہوں توہین ہے یہ میری
ٹھکرا چکا ہوں تجھ کو اے گردشِ زمانہ

جب حُسن حجابِ حُسن میں تھا جب عشق خیالِ عشق میں تھا
اکثر یہ تصور کرتا ہوں اُس وقت مرا دل کیسا ہوگا
وہ پہلی نظر جب اٹھی تھی اُس وقت تجھے مٹ جانا تھا
اتنا بھی اگر تجھ سے نہ ہوا تو اور پھر اے دل کیا ہوگا

جب گھٹا چھا گئی میں بیخود و مستانہ ہوا
سایۂ ابر مجھے سایۂ میخانہ ہوا

اللہ اللہ اثرِ میکدۂ ابرِ بہار
خندۂ برق مجھے خندۂ پیمانہ ہوا

دل کی آتش اثری کا تری محفل میں جواب
شعلۂ شمع نہ سوزِ دلِ پروانہ ہوا

ذکرِ رنگینیٔ شباب نہ چھیڑ
ختم افسانۂ شباب ہوا

اک جہاں ہے ادا شناسِ جمال
تو کہاں آج بے نقاب ہوا

عشق بھی فتنہ حُسن بھی فتنہ
جب ملے دونوں انقلاب ہوا

حشر برپا حریمِ ناز میں ہے
شاید آغازؔ باریاب ہوا

یہ حسیں شب، یہ طوافِ کعبۂ حسن و جمال
چادرِ مہتاب مجھ کو جامۂ احرام ہے

سانس بھی ڈوبی ہوئی ہے نبض بھی اکھڑی ہوئی
اب ترے بیمار کو آرام ہی آرام ہے

دل جواں دل کی تمنائیں جواں ہمت جواں
ایک عالم کو جواں پایا جواں ہونے کے بعد

دو جہاں اپنی حدیں مجھ سے ملائیں کیا ضرور
وہ بھی میرے بے نیازِ دو جہاں ہونے کے بعد

یہ عالمگیر استقبال ہے جوشِ جنوں میرا
بگولے اٹھ رہے ہیں جا بجا صحرا کے دامن میں

یہ میرے اشکِ غم یہ جلوۂ مہتاب کا عالم
ستاروں کا خزانہ بھر لیا ہے میں نے دامن میں

فنا ہو کر بھی چمکا جاؤں گا آغازؔ اوروں کو
یہ مانا ہوں مثالِ شبنمِ آوارہ گلشن میں

اک جہاں سوز ہے لب میں ایک جہاں ساز میں ہے
کتنی تاثیر مری شعلۂ آواز میں ہے

بزم عالم کا اب انجام نہ جانے کیا ہو
حُسن اک ناز میں ہے عشق اک انداز میں ہے

اے نگاہِ شرمگیں اُٹھ اور برقِ طور بن
یہ رعایت ہو جہان حسن کی محمل نہیں

نکہتیں ہی گر رہی ہیں بجلیوں پہ بجلیاں
ذکر یہ ہی دل کے لائق اضطرابِ دل نہیں

ذرہ ذرہ فتنہ ساماں ذرہ ذرہ حشر خیز
خاکِ دل ہے خاک لیکن صرف خاکِ دل نہیں

شمعِ کشتہ بھی اُٹھالی جائے پروانوں کے ساتھ
اب کہاں محفل کہ باقی گرمیٔ محفل نہیں

اضطرابِ شوق نے پہونچا دیا تو کیا ہوا
میری منزل کہہ رہی ہے میں تری منزل نہیں

نمونۂ نظم

ناظر سے خطاب

ہر جلوۂ صد رنگ ہے فردوسِ نظر دیکھ
اعجاز نما طلعتِ خورشیدِ سحر دیکھ

ہر تارِ شعاعی ہے کمندِ نگہِ شوق
مشرق نے کیا چاک گریبانِ سحر دیکھ

یہ مست گھٹائیں یہ اُبلتے ہوئے چشمے
سو رنگ چھلکتے ہیں اِدھر اور اُدھر دیکھ

ہر جذبۂ تاثیر میں اک سحر ہمہ گیر
ہے گرمِ تماشا فلکِ شعبدہ گر دیکھ

محدود نظر کھول یہاں دیدۂ تحقیق
اک جادۂ نوخیز ہے ہر راہ گذر دیکھ

یہ دشت و چمن اور یہ کہسار خوش آثار
ہر رنگ ہے اک دعوتِ صد حسنِ نظر دیکھ

ہر ذرے کے سینے میں ہے دہکی ہوئی مستی
ہر گرمیٔ تاثیر ہے اب شعلۂ اثر دیکھ

صد جنتِ نظارہ ہے ہر جلوۂ معصوم
فطرت کے مناظر کو بانداز دگر دیکھ

ہے خاک کی آتش اثری دید کے قابل
ہر ذرہ ہے اک سلسلۂ رقصِ شرر دیکھ

اب کارگہِ دہر کا ہے تجھ سے اشارہ
اس عالمِ ایجاد کو تا حدِّ نظر دیکھ

اُٹھ تو بھی دکھا فطرتِ آزاد کی پرواز
آزاد پرندے بھی ہیں تولے ہوئے پر دیکھ

یہ کعبۂ فطرت یہ دو عالم کی عبادت
سجدے میں نظر آتا ہے کونین کا سر دیکھ

ہر ذرہ میں عرفانِ خدا تیرے لئے ہے
ہر منظرِ اعجاز نما تیرے لئے ہے

تو سیر گہِ عالمِ امکاں سے گزر جا
ہر راہ سے ہر منظرِ حیراں سے گذر جا

اے فطرتِ رنگیں کا سماں دیکھنے والے
تو آ کے گلستاں میں گلستاں سے گذر جا

نظروں میں لئے سادگیٔ حسنِ مناظر
کہسار سے جنگل سے بیاباں سے گذر جا

ہر عالمِ رنگیں کو نگاہوں میں جما لے
ہر منظرِ فردوس بداماں سے گذر جا

ہستی کی فضا درسِ وسیع النظری ہے
کوتاہ نظر تنگیٔ داماں سے گذر جا

ساحل پہ کہیں کھلتی ہے دریا کی حقیقت
اس موج سے گرداب سے طوفاں سے گذر جا

رفتارِ زمانہ پہ اگر تیری نظر ہے
تو سلسلۂ گردشِ دوراں سے گذر جا

یہ گنبدِ بے در یہ طلسمات کا عالم
تو دیکھ چکا اب کسی عنواں سے گذر جا

منظور ہے گر سیرِ نمائش گہِ ہستی
وابستگیٔ خلوت دیواں سے گذر جا

اک تیز نظر بن کے سوئے منزلِ خورشید
مشرق کے حجاباتِ درخشاں سے گذر جا

کھولے ہوئے آغوش ہیں فطرت کی فضائیں
محدود نظر سرحدِ امکاں سے گذر جا

رکھتا ہے اگر ذوقِ تماشائے حقیقت
اس منزلِ ہستی میں دل و جاں سے گذر جا

اے ناظرِ قدرت متلاشیٔ حقیقت
منزل کیلئے جادۂ عرفاں سے گذر جا

آثار چمک اٹھے ہیں انوارِ سحر سے
اب دیکھ مناظر کو حقیقت کی نظر سے

نمونۂ تاریخ گوئی

فیوضِ لطفِ بے پایاں مبارک
۱۳۵۴ھ

یہ اسلوب اے شہِ عثماں مبارک
۱۳۵۴ھ

فلک عزت یہ دورِ جشنِ سیمیں
۱۳۵۴ھ

یہ بزمِ تہنیت ساماں مبارک
۱۳۵۴ھ

تاریخِ جشنِ سیمیں سلطانِ جم جاہ
۱۹۳۶ء

مہرِ عدل ظلِ اللہ
۱۳۵۴ھ

شرفِ اقبال سلطان العلوم آصف جاہ سابع
۱۳۵۴ھ

سید عنایت علی صاحب آغاز حسنی الحسینی کی نظم پر حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہٗ کی اصلاح

"کیفِ دوشیں"

وہ ساقیٔ ازل وہ دورِ بادۂ الست کا
وہ اجتماع [انتشار] لطف و کیف ہر فضائے مست کا

وہ عالمِ طلوعِ صبح میکدہ بدوش تھا [سا]
فضائے جزو کل بھی تو [ہیں پاک] مستیوں کا جوش تھا [سا]

وہ دورِ کیف آفریں شرابِ خانہ ساز کا
وہ جرعے جرعے میں خلوص [کیفِ دل] لطفِ حق نواز کا

وہ ہم رکابِ سیلِ نور کاروانِ موجِ مے
وہ جوشِ نشۂ مدام وہ جہانِ موجِ مے

وہ مستیوں کی بارشیں فضائے کائنات پر
وہ کیف زا ترا وشیں فضائے کائنات پر

وہ روح روح اک جہانِ سرخوشی لئے ہوئے
وہ مستیوں میں جوش [وہ سرخوشی کہ] کیفِ سرمدی لئے ہوئے

وہ نشۂ مدام فرد فرد جھومتا ہوا
وہ فیضِ عامِ ازل کہ میکدہ کا در کھلا ہوا

وہ دورِ آفتاب [ماہتاب] سے نمود کی سبیل میں
شرابِ حسن ڈھل رہی تھی [تیز تیز] ساغرِ جمیل میں

وہ ذوقِ مے سبوکشانِ محفلِ قدیم کا
وہ ظرفِ نظر مستحقِ نوازشِ عظیم کا

وہ شانِ ساقیٔ ازل سرورِ حق پناہ میں
ہزار ہا میکدے چھلک رہے تھے ہر نگاہ میں

تجلیاتِ حسن تھیں محیط کائنات پر
گھٹائیں آکے چھا گئی ہوں جیسے شش جہات پر

وہ ہر طرف اثر خمارِ بادۂ جمال کا
عجیب حال تھا ہر اک جرعہ نوشِ حال کا

امنگ امنگ کیف زا خیالیاں [جوانیاں] لئے ہوئے
وہ رنگ رنگ احمریں گلابیاں لئے ہوئے

وہ بزمِ لطف و کیف جب رہینِ ناؤ نوش تھی
ہزار ہا میکدوں کی روح خود ہی مے فروش تھی

وہ ایک لغزشِ کن میں جذبِ دو جہاں کی مستیاں
وہ کائنات میکدہ وہ عام مے پرستیاں

وہ بزمِ دوش اور شورِ ناؤ نوش کہاں
وہ عالمِ سرور [دعوت] وہ صلائے جوشِ ب کہاں

وہ عالمِ خمار و کیف آہ خواب ہو گیا
وہ لطفِ جاں نواز نذرِ انقلاب ہو گیا

وہ ذوقِ لطف و کیف پھر بقدرِ ہوش چاہیے
ازل کا جرعہ نوش ہوں میں کیفِ [نشاطِ] دوش چاہیے

انور — مولوی محمد نورالدین صاحب انصاری بھوپالی — ۲

آپکے والد کا اسم گرامی حافظ صدرالدین بن حافظ ضیاءالدین بن منشی خیرالدین صاحب ہے سلسلۂ نسب سعد بن معاذ انصاری سے ملتا ہے۔ آپ اندرون احاطہ قاضی زین العابدین صاحب محلہ سبزی منڈی بھوپال ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۱۰ء بوقت ۹ بجے شب پیدا ہوئے۔ آپ کے اجدادمین سے رام پور آکر آباد ہوئے۔ پھر بھوپال میں آپ کے جدِ امجد منشی خیرالدین صاحب سرکارِ عالیہ کی ڈیوڑھی خاص کے کامدار اور ندیم خصوصی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اُن کے بعد آپ کے دادا مرحوم حافظ ضیاءالدین صاحب کا سرکار سے منصب مقرر ہوگیا۔ آپ اُسی پر قانع رہے اور ملازمت نہ کی۔ آپ اکثر فنون میں ماہر تھے۔ ہر شخص آپ کے کمالات کا قائل تھا۔ انتہائی ملنسار اور خلیق تھے۔ دادا صاحب کی وفات کے بعد وہ منصب آپکے والد بزرگوار کو منتقل ہوگیا لیکن انھوں نے اس سے کچھ زیادہ فائدہ حاصل نہیں کیا کیونکہ اپنے والد کی وفات کے ایک سال بعد ہی آپ بھی رحلت فرما گئے۔ آپکے والد صاحب مرحوم نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ آپ کے والد منشی خیرالدین صاحب نے مولوی منظفر میاں صاحب ظفرؔ کو مقرر کردیا تھا جن سے گھر ہی پر عربی فارسی کی تعلیم لی جاتی تھی۔ انورؔ صاحب کے والدِ ماجد شاعر بھی تھے وحیدؔ تخلص فرماتے تھے اور منظفر میاں صاحب ظفرؔ ہی کو اس فن میں اپنا استاد سمجھتے تھے۔ اُن کا ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے۔

کوئی تدبیر نہ سوجھی تو یہ تنگ آئے وحیدؔ　　اب کئے دیتے ہیں قسمت کے حوالے دل کو

آپ کی ننھیال بھی بہت معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ بھونرا سا گوالیار اور ریاست گوالیار کے قاضی و طبیب خصوصی قاضی سیّد منور علی صاحب حسینی کی نواسی آپ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ انورؔ صاحب کے ایک چھوٹے بھائی اور ایک بہن اور ہیں آپ کے والد صاحب کا منصب آپ تینوں بہن بھائیوں کے نام منتقل ہوگیا لیکن بشرطِ تعلیم۔ چونکہ آپ مولوی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے سرکار کے اصرار کے باوجود الگزانڈر ہائی اسکول کے بجائے سلیمانیہ مدرسہ میں داخل ہوگئے۔ آپ نے اپنے خالہ زاد بھائی مولوی عبدالہادی صاحب (حال مفتی ریاست) کی زیرِ نگرانی عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ گھر پر بھائی صاحب سے قرآنِ شریف حفظ کرنا شروع کیا۔ آپ اتنے ذہین تھے کہ دو بار مطالعہ کرنے سے آپ کو سبق یاد ہوجاتا تھا۔ اس لئے تمام اساتذہ آپ سے خوش رہتے تھے۔ اور ہمیشہ آپ اول نمبر پاس ہوکر انعامات حاصل کرتے رہے۔ جس وقت آپ جماعتِ پنجم (فارسی) میں تھے تو والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ نے کلامِ مجید حفظ کرنا ترک کردیا اور اسی سال فیل بھی ہوئے۔ وہ عزیز جو اب تک نرمی کا برتاؤ کرتے تھے اب سخت گیر ہوگئے۔ چنانچہ آپ کے دل میں ایک جوش اٹھا اور آپنے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ایک مستحکم ارادہ کرلیا۔ اور اس ذوق و شوق سے تعلیم حاصل کی کہ تمام اسکول کو آپ پر اور آپ کی کلاس پر فخر تھا۔ جماعتِ ششم فارسی ہی سے آپ نے عربی بھی لے لی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں بعمر ۱۷ سال الہ آباد سے مولوی کا امتحان نمایاں حیثیت سے پاس کیا۔ جس کے تمام مصارف سرکار نے برداشت کئے ۱۹۲۷ء میں عالم اور ۱۹۲۸ء میں فاضلِ ادب (عربی) کا امتحان بھی امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور انعام وغیرہ کے علاوہ امتیازی وظیفہ حاصل کیا۔ مدرسہ سلیمانیہ سے آپ احمدیہ اورنٹیل کالج بھوپال میں منتقل ہوگئے۔ یہاں مولوی فاضل کی تیاریاں کیں ۱۹۳۱ء میں الہ آباد سے فاضلِ دینیات اور پنجاب سے منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔

گو آپ کے والدین منقولہ و غیر منقولہ جائداد اس قدر چھوڑ گئے تھے کہ وہ عمر بھر کیلئے کافی ہوتی لیکن رنگِ دنیا اور علمی لگاؤ سے آپ نے مجبور ہوکر ۱۹۳۲ء میں محمد علی میموریل ہائی اسکول بیاور (راجپوتانہ) میں بحیثیت ہیڈ مولوی ملازمت اختیار کرلی۔

شعر و شاعری کا مذاق بچپن سے ہے۔ آپ نے بہت کم عمر سے شعر کہنا

شروع کردیا تھا۔ لیکن نہ کسی کو سناتے تھے اور نہ دکھاتے تھے۔ اردو فارسی کے علاوہ عربی میں بھی شعر کہہ لیتے ہیں۔ چنانچہ اسکول اور کالج کے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات میں آپ نے تین عربی قصیدے لکھے ایک میں خود اپنی تعریف تھی۔ دوسرے میں نعتیہ اشعار تھے اور تیسرے میں اسکول کے تعلیمی ماحول کی تصویر کھینچی تھی۔

جب ملکۂ سخن گوئی زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے جناب ذکی بھوپالی کو پانچ سات غزلیں دکھائیں لیکن اُن کی غیر معمولی معروفیت کی وجہ سے ایک مدت تک مشورۂ سخن بند رہا۔ آپ کی طبیعت کسی ایسی ہستی کی متلاشی تھی جو آپ کے معیار کی سی اصلاح دے سکے چنانچہ آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہ، کے شاگرد ہوگئے۔ اور شفیق استاد کی توجہ سے بہت جلد ایک خاص امتیاز حاصل کرلیا۔ آپ کی طبیعت بہت بے نیاز واقع ہوئی ہے۔ مشاعرے وغیرہ میں بہت کم شرکت کرتے ہیں۔ کلام بھی یوں ہی بے ترتیب پڑا رہتا ہے۔ آپ کی طبیعت تعلیم کی طرف انتہائی طور پہ مائل ہے۔ چنانچہ مطالعہ اب بھی جاری رہتا ہے۔ کلاسیکل عربی فارسی کے ساتھ جدید عربی فارسی بھی آپ نے اپنے مطالعہ میں رکھی ہے۔ فاضلِ ادب عربی کے امتحان کے سلسلہ میں مڈل تک آپ نے انگریزی پڑھی تھی اس کے بعد اُس کا بھی سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور اب آپ نے انگریزی میں بھی کافی دستگاہ حاصل کرلی ہے۔

نو سال کی عمر میں آپ کو حضرت شاہ محمد احمد صاحب نقشبندی کے حلقۂ ارادت میں داخل کردیا گیا۔ اکثر آپ وہاں بھی حاضر ہوتے رہتے ہیں آپ کی تصانیف میں مجموعۂ ادبی مقالات۔ مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ عالمگیر (ڈرامہ) یوسف زلیخا (ڈرامہ)۔ محاسنِ کلام ابوطیب کندی۔ المعروف بہ متنبی۔ الفصاحۃ والبلاغۃ (مختصر رسالہ) ہیں جو مسودات کی صورت میں ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ انور صاحب کا رنگِ شاعری اس درجہ کیف آفریں اور جذباتی ہوتا ہے کہ پڑھنے والا پھڑک جاتا ہے۔

نمونۂ تغزل

کیف سے جھومی ہوئی بہکی ہوئی مہکی ہوئی ۔۔۔ جیسے موجِ بوئے بادہ میں رواں ہے زندگی
کم سے کم اتنا تو اِک دن آ کے سمجھا دو مجھے ۔۔۔ سرگراں تم ہو کہ مجھ سی سرگراں ہے زندگی

زندگی میں ہو تجھ سے ہم آغوش ۔۔۔ خواب میں دیکھتا ہوں خواب ہنوز
کھیلتا ہے مرے تصور میں ۔۔۔ وہ نکھرتا ہوا شباب ہنوز

نمودِ سینہ سیمیں یہ احمریں موجیں ۔۔۔ حسین باہوں کی مے باریاں معاذ اللہ
وہاں تو کوثر و تسنیم سب کے سب جائز ۔۔۔ یہاں حرام ہیں میخواریاں معاذ اللہ

عشق میں جور بھی ہوں پیرِ منصور بھی ہوں ۔۔۔ یعنی میں طور بھی ہوں برقِ سرِ طور بھی ہوں
تو مرے ٹوٹے ہوئے دل کی نوا دیکھ نہ جا ۔۔۔ ساز ہی ساز نہیں سوز سے معمور بھی ہوں
قابلِ رحم ہوں اے دوست مرا حال نہ پوچھ ۔۔۔ ہوں ہم آغوش بھی اور تجھ سے بہت دور بھی ہوں!
گو ہر اِک بات میں آزاد ہوں مختار ہوں میں ۔۔۔ پھر کوئی چیز ہے ایسی بھی کہ مجبور بھی ہوں

جلد آ کہ جاں ہے تن سے گریزاں ترے بغیر ۔۔۔ سر تا پا ہوں شعلۂ لرزاں ترے بغیر
اک آتشِ تمام ہے دل لے مری خلیل! ۔۔۔ آتشکدہ ہے آہ گلستاں ترے بغیر
یہ نکھری نکھری ستی دوشیزگیٔ صبح! ۔۔۔ یہ بھیگی بھیگی شامِ گلستاں ترے بغیر
یہ بھیگی بھیگی مست ہوا، یہ فضا یہ کیف! ۔۔۔ اُف! یہ گھٹا! یہ موسمِ باراں ترے بغیر
یہ بیخودی و سکر میں ڈوبی ہوئی فضا! ۔۔۔ یہ اضطرابِ جوشِ بہاراں ترے بغیر
مہکی ہوئی فضا میں یہ بہکی ہوئی ہوا ۔۔۔ یہ ستی تمام گلستاں ترے بغیر
سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے مرے لئے ۔۔۔ میں کیا کروں گا یہ سرو ساماں ترے بغیر

تمام عمر وہ کچھ یوں کرشمہ ساز رہے ۔۔۔ نفس نفس میں ہوئے جذب پھر بھی راز رہے
ترے نثار مرا حال پوچھنے والے ۔۔۔ دل اور درد میں کوئی تو امتیاز رہے

جذبِ دل کھینچ کے مجھ تک انھیں لایا ہی نہ تھا ۔۔۔ اس سے پہلے تو یہ عالم نظر آیا ہی نہ تھا

حسن اور سادگی حسن آگہی تو یہ
جیسے ظالم نے کوئی دام بچھایا ہی نہ تھا

اب یہ عالم ہے کہ تفریقِ سرِ سجدہ محال
سر بھی وہ جس کو کسی در پہ جھکایا ہی نہ تھا

ہائے یہ اُس کی تلافی کی نگاہیں انور
جیسے اُس نے مجھے دیوانہ بنایا ہی نہ تھا

بے سکونی سے بھی اب حاصل سکونِ دل نہیں
دل ابھی سرمایہ دارِ جذبۂ کامل نہیں

اب رفیقِ زندگی لیں اک تمہاری یاد ہے
زندگی ہر چند مشکل ہے مگر مشکل نہیں

بھولی بھولی شکل ہے سر تا بپا معصوم ہو
کون کہتا ہے کہ تم قاتل ہو تم قاتل نہیں

وہ زندگی وہ حاصلِ صد زندگی کہ جب
نغمے سنا رہے تھے وہ سازِ شباب سے

وہ عشرتِ فتادگی و بیخودی کہاں
جب زندگی مراد تھی اک اضطراب سے

کرلوں نہ چاک چاک کہیں دامنِ حیات
تنگ آگیا ہوں اس دلِ خانہ خراب سے

انور نہ پوچھیے کہ یہ ہے خاص رازِ عشق
میں نے جو لطف اٹھائے ادائے عتاب سے

نمونۂ نظم

یادِ حیات

ٹھوکریں در در کی کھانا یاد ہے
ان کو کھو کر پھر نہ پانا یاد ہے

یاد ہے سارا فسانہ یاد ہے
زندگی کا ہر زمانا یاد ہے

مے بھی تھی مینا بھی تھا ساغر بھی تھا
ہائے اب تک وہ زمانا یاد ہے

بھیگی بھیگی شام کی سرمستیاں
وہ لبِ جو بیٹھ جانا یاد ہے

ہر طرف ٹھنڈی ہوا کی ساتھ ساتھ
ابر کا اٹھ اٹھ کے آنا یاد ہے

کالی کالی بدلیوں کا کیف سے
جھوم جانا پھیل جانا یاد ہے

آبشاروں کے حسیں نغمات سے
مست ہو کر گنگنانا یاد ہے

آتشیں مے کا بلوریں جام میں
سرخوشی سے جوش کھانا یاد ہے

پیکرِ بلور کی دوشیزگی!
وہ نکھر نا رنگ لانا یاد ہے

وہ فضا وہ آلہانہ سلسبیل
روح کا وہ جھوم جانا یاد ہے

یوں کہ آنکھوں کو نہ ہو کچھ بھی خبر
دل میں آکر بیٹھ جانا یاد ہے

اعتبارِ نظمِ الفت کے لئے
لب پہ شکووں کا نہ لانا یاد ہے

رس بھری آنکھوں کے سازِ مست سے
پیت کے نغمے سنانا یاد ہے

کیف آور دلنشیں آواز سے
نغمہ زار اشک گرانا یاد ہے

پھونکدے پھر آتشِ نغمات سے
مطربہ، کوئی ترانا یاد ہے

آتشِ سیال قربانت شوم
خون کو بادہ بنانا یاد ہے

وصل میں بادِ خمارِ صبح سے
روح کا وہ کانپ جانا یاد ہے

شاخسارِ برق پر تھا آشیاں
زندگی کا وہ زمانہ یاد ہے

اپنے ہاتھوں سے دلِ آسودہ میں
درد کی دنیا بسانا یاد ہے

وہ تصور کارِ چشمِ شوق میں
آنسوؤں کا ڈبڈبانا یاد ہے

اے سحر، اے ابر، اے رنگِ شفق
وہ مجھی کو کھلائے جانا یاد ہے

درد میں ڈوبے ہوئے نغمات سے
دل کو اپنا راگ گانا یاد ہے

بیٹھے بیٹھے درد کی ان میں خلش
رات بھر آنسو بہانا یاد ہے

دورِ مایوسی ہے اور دنیائے دل
اب فقط رونا رلانا یاد ہے

بس دولے آسماں کی گردشو!
ہم کو بس کر رنگ لانا یاد ہے

آنکھ ویراں، دل تپاں، سودا بسر
خاک صحرا کی اڑانا یاد ہے

اب کہاں اگلے سے وہ رازو نیاز
سر جھکا کر بیٹھ جانا یاد ہے

یا ابھی نظریں کبھی تھیں دلنواز
یا نہیں اب دل دکھانا یاد ہے

اہتزازِ نور کا عالم کہاں؟
صبحِ دوشیں کا فسانہ یاد ہے

اب کسی کافر کی صورت دیکھ کر
اُن کی صورت یاد آنا یاد ہے

زندگی پاس کی تنظیم کہاں
بس تڑپنا تلملانا یاد ہے

کیوں نہ روئیں ہم تجھے اے زندگی
اب فقط رونا رلانا یاد ہے

زندگی انور مجسم زندگی
ہائے کیا تھا وہ زمانا یاد ہے

نمونۂ نثر

"اگر یہ صحیح ہے کہ "جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے" تو مجھے کہنے دیجئے کہ "رازِ کشش" تمام تر شعر ہے اور اصنافِ شعر میں سے بھی اس خاص صنفِ سخن سے متعلق ہے جو فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ نازک اور لطیف جذبہ ہے۔ کوئی کچھ بھی کہا کرے میں نے تو ہمیشہ اسے ایک مسلسل غزل ہی سمجھ کر پڑھا اور لطف اندوز ہوا۔ کیونکہ لغوی معنی کے علاوہ اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے بھی تمام وہ چیزیں جو غزل کیلئے ضروری خیال کی جاتی ہیں یہ "رازِ کشش" میں تمام و کمال موجود ہیں۔ بلندیٔ خیالات، پاکیزگیٔ جذبات، حلاوتِ زبان، رنگینیٔ واقعات، نفسیاتی واقعیت، معاملہ بندی، مصوری و محاکات، وارفتگی و ازخود ربودگی، قوتِ مشاہدہ، صداقتِ اظہار، بداعتِ اسلوب، ندرتِ ادا، سادگی و پرکاری، موسیقی، تلاش اور سب سے زیادہ زبردست چیز سوز و گداز، لب و لہجہ کی فتادگی و مسکنت اور زبان و بیان کا لوچ جن کو میں جانِ تغزل کہتا ہوں، الغرض آپ ان تمام ضروری اشیا اور ان کے لوازم و متعلقات کو نہایت لطیف و شیریں امتزاجی کیفیت کے ساتھ "رازِ کشش" میں محسوس فرمائے گا۔"

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نہ تو کلامِ نیازؔ کو اس کی ضرورت ہے اور نہ ناظرین کو، بلکہ میں خود اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ "آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک مصوّر اگر کسی منظر یا واقعہ کی تصویر کھینچے گا تو اس کا موقلم یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ فی نفس الامر کیا ہے۔ اور اس کے تمام یا اکثر جزئیات کو پیشِ نظر کر دے گا۔ لیکن ایک شاعر یا انشا پرداز جب اسی میدان میں اپنے اشہبِ قلم کو جولانیاں دکھائے گا تو صرف اس حیثیت سے کہ اس منظر یا اُس واقعہ کو دیکھ کر اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بظاہر وہ تصویر تو ہوگی اسی منظر کی لیکن باطن وہ ایک خاکہ ہوگا اس کے اپنے ان جذبات و احساسات کا جو اس منظر کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی صاحبِ ذوق کے دل میں ایک منظر سے متاثر و منفعل ہو کر جذبات، تاثرات اور احساسات کا ایک طوفان برپا ہو جانا اتنا حیرتناک نہیں ہے جتنا ان کو سادگی و پرکاری کیساتھ مترنم اور سادہ زبان میں ادا کر دینا۔ (ماخوذ از نیازؔ و رازِ کشش)

مولوی نورالدین صاحب آنوؔ انصاری بھوپالی کی غزل پر حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ کی اصلاح

(جہاں جا ہو وہاں گلشن میں سن لو ہر کہیں)
~~ہے منہ میں زبان میری وہ کوئی~~ گفتگو میری
چمن کی پتّی پتّی ہے زبانِ آرزو میری

سمجھتا ہوں (بس) کہ اُن کے سامنے کہنے سے کیا حاصل؟
مری حالت تو خود ہی ترجمانِ آرزو میری

خلش سی دل میں رہ رہ کر مری ہوتی تو ہے ہمدم!
مگر یہ کچھ نہیں معلوم کیا ہے آرزو میری

(کوئی) (ہر ساعت)
رگ پے میں ~~سنبھلنے کیسی~~ شی دوڑتی پھرتی ہے
مجھی میں کر رہا ہے کوئی شاید جستجو میری

اسیرانِ جنوں بھی اب مزے لے لے کے سنتے ہیں
قفس میں بیٹھے بیٹھے بہکی بہکی گفتگو میری

(تھا میں) (الفت)
مگر وارفتہ رفتار ~~ہوں~~ دشتِ ~~محبت~~ میں
کہ میری جستجو میں کھو گئی خود جستجو میری

رسائی ہر کس و ناکس کی اے آنوؔ غیر ممکن ہے
فلک سے بھی بہت اونچی ہے (بزم) ~~بام~~ آرزو میری
"بام" مذکر ہے

ارمان — مولوی بشارت علیخانصاحب آفریدی اکبرآبادی (۳)

آپ سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے - والد کا نام مولوی امداد حسین خانصاحب آفریدی ہے - آپ قوم کے آفریدی پٹھان ہیں - وطن اوّل تیراہ اور وطنِ ثانی آگرہ ہے - آپ کے آباؤ اجداد عہدِ شاہجہانی میں ہندوستان آئے - اور لاہور، دہلی، لکھنؤ اور آگرہ میں مقیم ہوئے - آبائی پیشہ سپہ گری اور لکڑی کی تجارت تھا - آپکے والد نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔

آپکے دادا صاحب مرحوم ایک عالم متبحر اور فارسی کے ماہر تھے - جن کا مثیل دور دور نہ تھا - اسلاف کی تمام علمی و اخلاقی خصوصیتیں آپ میں بھی پائی جاتی ہیں چونکہ آپ ایک سپاہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں اس لئے وہ ہی شجاعت و ہمت آپ میں بھی موجود ہے - فنونِ سپہ گری کے بھی آپ ماہر ہیں -

بچپن ہی سے آپ میں ذکاوت و ذہانت کے بہترین آثار پائے جاتے تھے چنانچہ اسکول کی زندگی میں آپ تمام طلبا سے ہمیشہ ممتاز رہے - اساتذہ آپ سے انتہائی شفقت و محبت کیساتھ پیش آتے تھے - یہاں تک کہ آپ سے بعض امور میں مشورہ بھی لیا جاتا تھا - آپ نے "شعیب محمدیہ ہائی اسکول" سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا - چونکہ اردو فارسی اور عربی کی قابلیت آپ میں پہلے ہی سے تھی اس لئے اسی اسکول میں آپ ہیڈ مولوی کی جگہ فائز ہوگئے - اور اب تک اپنے فرضِ منصبی کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں - تمام خارجی تفریحات اور بیشتر تقاریب جو آئے دن اسکول میں ہوتی رہتی ہیں - آپ ہی کے حسنِ انتظام سے تکمیل پاتی ہیں آپ اسکاؤٹ ماسٹر بھی ہیں - آپ کے دل میں قوم کا درد ہے اور مقامی طور پر آپ مسلمانوں کی فلاح کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہتے ہیں - آپ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بلا امتیازِ قومی آپ لوگوں کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں -

آپ کو تقریر کرنے میں وہ ملکہ ہے کہ کتنا ہی مشکل سے مشکل موضوع کیوں نہ ہو اور فوراً ہی آپ کو کیوں نہ بتایا گیا ہو جس وقت آپ اُس موضوع پر تقریر کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ معلومات کا ایک سمندر اُبل رہا ہے الفاظ کی تلاش و صحت - اور تقریر کی روانی لوگوں کو بے ساختہ داد دینے پر مجبور کرتی ہے نہ صرف یہ بلکہ آپ کو اداکاری میں بھی خاص ملکہ حاصل ہے چنانچہ آپ نے اپنے چند احباب کی مدد سے ایک ڈرامہ اسٹیج کیا تھا اور خود ہی اُسے ڈائریکٹ بھی کیا تھا جو تین روز تک انتہائی کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا - لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ آپ نے اتنے قلیل عرصہ میں اتنا زبردست ڈرامہ اتنی کامیابی کیساتھ کس طرح اسٹیج کر دیا - یہ آپ ہی کی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ ہر اداکار اس لائن میں ماہرِ فن معلوم ہوتا تھا حالانکہ سب آپ ہی کے اسکول کے طلبا تھے - ڈرامہ نگاری میں بھی آپ کو کمال حاصل ہے اب تک کئی ڈرامے تصنیف فرما چکے ہیں -

شعر و شاعری سے آپ کو بچپن ہی سے لگاؤ ہے تھوڑے ہی عرصہ میں آپکو اس صنف میں کافی مہارت پیدا ہوگئی - ابتدائی دور کا تمام کلام شیخ بزرگ علی صاحب عالی کو دکھایا - روز بروز آپ کا معیار بلند ہوتا گیا - عالی صاحب کی وفات کے بعد آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کی طرف رجوع ہوئے - شاعری کی ہر صنف پر آپ کو قدرت حاصل ہے - بدیہہ گوئی میں خاص ملکہ ہے - آپ کی نظمیں اور غزلیں آگرہ اسکول کا صحیح نمونہ ہیں - الفاظ کی شوکت، خیال کی ندرت اور مضمون آفرینی آپ کا خاص حصہ ہے - جدید طرز کی نظمیں آپ خوب لکھتے ہیں - نہایت سنجیدہ اور خوددار انسان ہیں طبیعت نام و نمود سے بے نیاز ہے - عرصہ تک آپ سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ کے صدر رہ چکے ہیں - چونکہ آپ کا ماحول تعلیمی ہے اس لئے آپ کی بیشتر تصانیف درسی ہیں جو طبع ہو چکی ہیں ان کے علاوہ مسلمان بچہ بچیا، انسو کی قیمت فتح اسپین - تصویرِ وفا - یہودی کی لڑکی

(آغا حشر مرحوم کے ڈرامہ کا دوسرا حصہ) غیر مطبوعہ ہیں۔

نمونۂ تغزل

رہنے دے ذوقِ طلب وقفِ رہِ منزل مجھے   حاصلِ صد سعی ہے اک سعیٔ لاحاصل مجھے
اپنے منھ سے آپ فرمانے لگے سائل مجھے   اب تو کرنی ہی پڑی شرحِ مرادِ دل مجھے
دل دیا اور دل بھی اپنے درد کے قابل مجھے   آپ نے تو دیدیا کونین کا حاصل مجھے
موجِ طوفاں بن گئیں آخر مری خود داریاں   جب نظر آنے لگا امید کا ساحل مجھے

نامکمل سا ہیں افسانہ تھا شوق و درد کا
آپ نے ارماں کہہ کر کردیا کامل مجھے

موت کی ہچکی نہیں صوتِ شکستِ ساز ہے   یہ مرے تارِ نفس کی آخری آواز ہے
کنتُ کنزاً کہہ کے آپ اپنی حقیقت کہہ گئے   میں نے پوچھا میری ہستی؟ بولی میرا راز ہے

کھل گیا تیری حقیقت اور مری ہستی کا راز   یعنی میں جس نور کا پرتو ہوں تو وہ نور ہے
آخری دیدار کرلو کھول کر بندِ کفن   اب نہ شرماؤ کہ چشمِ منتظر بے نور ہے
میں قفس میں چار پھولوں کیلئے ترسا کروں   اے چمن والو چمن کا کیا یہی دستور ہے

جہانِ شوق کی مجبوریاں ارے توبہ   نہیں نظر پہ مجھے دل پہ اختیار نہیں
تری عطاؤں کا حاصل تری کرم کا نچوڑ   یہی تو دل ہے مجھے جس پہ اختیار نہیں
کسی کے شوقِ نمائش کا مرثیہ خواں ہوں   میں اپنے ذوقِ تماشا کا سوگوار نہیں

خطا معاف یہ ارماں گناہگار تو ہے
مگر بقدرِ کرم تو گناہگار نہیں

نشیمن لٹ چکا میں ہوں قفس ہے اور اسیری ہے   چمن والو بتانا کیا چمن میں ہے بہار اب بھی؟
یہ مختاری کہ دل کمبخت ہے بیزار جینے سے   یہ مجبوری کہ مرنے پر نہیں ہے اختیار اب بھی
یہ دستِ ناز یہ چشمِ پُرآب اور فاتحہ خوانی   مجھے رہنے نہ دینگے آپ کیا زیرِ مزار اب بھی
سیہ چادر ہے، تاریکی ہے، شب ہے، ہو کا عالم ہے   لئے بیٹھے ہیں وہ آغوش میں میرا مزار اب بھی

یہ تیرا کرم۔ یہ تیری عطا، اے حسنِ فسوں گر کیا کہنا
یہ لطف کہ خود دل بھی بخشے خود درد کے بھی قابل کردے

یہ الفت کے افسانے بھی کیا خوب افسانے ہوتے ہیں
تم سنتے ہو اور سنتے ہو ہم کہتے ہیں اور روتے ہیں

بیگانۂ ذات و صفات ہوں میں، آزادِ حیات و ممات ہوں میں
میں خود خلاقِ عالم ہوں ہر سانس ہے اک عالم میرا
جب چاندنی چھٹکی ہوتی ہے میں چاند سے کھیلا کرتا ہوں
ہر تارے کا دمساز ہوں میں، ہر تارہ ہے ہمدم میرا

کیوں وہ آخر ہمکو سر سے پاؤں تک دیکھا کریں   کیا یہ مطلب ہے کہ ہم رگ رگ میں دل پیدا کریں
حسن سے بڑھ کر ہے نازک فطرتِ ناموسِ غم   آہ کرکے کیوں مذاقِ درد کو رسوا کریں
مرکزِ مسجودیت سے تم ذرا آگے بڑھو   سرحدِ سجدہ سے آگے بڑھ کے ہم سجدہ کریں

عصمتِ شوق نے تحقیق کی مہلت ہی نہ دی
ہم وہ مجنوں ہیں کہ پوجا کئے محمل خالی

نمونۂ نظم

"فتحپور سیکری کے شاہی کھنڈر سے"

اے کھنڈر اے سرگزشتِ عظمتِ ہندوستاں   اے متاعِ جنسِ گمنامی کی بوڑھی پاسباں
اے مزارِ شانِ مسلم کے پرانے نوحہ خواں   اے سراغِ قومِ رفتہ کے نشانِ بے نشاں

تو اسی دنیا کی اک تعمیر عالیشان تھا
وہ بھی دن تھے، تو محل تھا قصر تھا۔ ایوان تھا

تیری وہ عظمت۔ وہ رفعت اور وہ شوکت کہاں   رہ گئی ہیں بام و در کی کچھ شکستہ سی نشاں
ہائے تیری نعمتیں اب بن رہی ہیں بستیاں   جیسے اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے غبارِ کارواں

نام پر مٹنے والوں کا نشاں بھی مٹ گیا
جس پہ جھکتا تھا فلک وہ آستاں بھی مٹ گیا

اک جھلک اپنی دکھا کر چھپ گئی برق تپاں — بجھ گئے شعلے سلگتی رہ گئیں چنگاریاں
اب فروغ عیش و عشرت کی جھلک تجھ میں کہاں — تو ہے شمع کشتۂ ملت کا ہلکا سا دھواں
کوئی دم میں تو بھی ہمخواب فنا ہو جائے گا
ایک جھونکے سے حوادث کے ہوا ہو جائے گا

سیکڑوں نغمے تری دیوار و در میں جذب ہیں — قہقہے کتنے فضاؤں کی جگر میں جذب ہیں
دلنشیں چالوں کے فتنے رہ گذر میں جذب ہیں — مستیاں لاکھوں تری اک ایک گھر میں جذب ہیں
جھوم اٹھی خود تیری ہستی مے پرستوں کی طرح
لڑکھڑا کر گر پڑا خود تو ہی مستوں کی طرح

تو نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے شاہوں کا حشم — تو نے برتے ہیں بہت تیغ و تبر طبل و علم
تیری خدمت کیلئے موجود تھے خیل خدم — تیرے آگے سر دلیروں کا ہوا کرتا تھا خم
آج تو سرتاپا عبرت کی اک تلقین ہے
تیری پامالی مگر نظارے کی توہین ہے

اب مجسم مرثیہ ہے تیری افسردہ فضا — آندھیاں سیمیں کیا کرتی ہیں ماتم سا بپا
ٹوٹی دیواروں کو آکر چھیڑتی ہے جب ہوا — تیری خشت و سنگ سے آتی ہے آواز بکا
اب ہے مٹی۔ خاک۔ کیچڑ فرش قالیں کی جگہ
ہر طرف کائی جمی ہے نقش رنگیں کی جگہ

چغد اور چمگادڑیں ہیں اب مکانوں میں ترے — کرگس و زاغ و زغن ہیں میہمانوں میں ترے
جھینگروں کا شور ہے نقارخانوں میں ترے — مکڑیاں مچھر ہیں پاسبانوں میں ترے
زندگی کے تجھ میں اب آثار پیدا ہی نہیں
جیسے تو انسان کی آرام گہ تھا ہی نہیں

اُف یہ پامالی، یہ ویرانی، یہ پستی اور تو — تیری باغ و راغ تھم گیا سب ہے رنگ و بو
پی لیا دنیا نے میری طرح تیرا بھی لہو — ایک داغ خشک ہے تو، اک دل بے آرزو
آ چھپا لوں تجھ کو سینے میں، جگر میں، جان میں
آرزوئیں، حسرتوں میں، دردمیں، ارمان میں

نمونہ نثر

ڈرامے کا ایک سین

(سین ۱۵)

{ڈپٹی صاحب کا مکان۔ دو روز بعد رعنا باورچی خانہ میں برقعہ اوڑھے کھانا پکا رہی ہے صرف نقاب اٹھا ہوا ہے۔}

رعنا۔ (خود بخود) رعنا۔ بہت آرام کیا۔ چل اب آرام کے گناہ کا کفارہ ادا کر۔ غریبی ایک مہکتا ہوا پھول ہے جسمیں معصومیت کی خوشی اور مظلومیت کا رنگ ہے اور جو اسی لئے کھِلتا ہے کہ امیری کی ٹھوکروں میں روندا جائے..... ٹھوکروں کی پرواہ نہ کر۔ بلکہ گیند کی طرح ٹھوکر کی چوٹ سے اچھلنا سیکھ اور ہر ٹھوکر کیساتھ تو زندگی کے میدان میں آگے بڑھ جا۔

{مسالہ پیسنے بیٹھتی ہے آنکھ میں چھینٹ پڑ جاتی ہے۔ ہاتھ جل گئے ہیں۔ مرچیں لگتی ہیں۔ دھوتی ہے۔ خون جھلکتا ہے۔}

(خون دیکھ کر) جھلک رہا ہے تازہ تازہ خون تجھے ڈرانے کے لئے جھلک رہا ہے رعنا۔ خبردار ہمت نہ ہارنا۔ ابھی بدن میں بہت خون ہے۔ دو چار بوندیں نکل جائیں تو نکل جانے دو۔ یہ خون نہیں انسانیت کے ماتھے کا پسینہ ہے جو دولتمندی کی سیاہ کاریوں کو دیکھ کر شرم سے نکلنا چاہتا ہے اچھا چلو آگ جلاؤ۔

{آگ جلاتی ہے۔ دیر تک پھونکتی رہتی ہے آگ نہیں جلتی اکتا کر پھونکنی ڈال دیتی ہے .... (مسکرا کر) سنا ہے کہ دیپک راگ گانے سے آگ جل اٹھتی ہے۔ گانا چاہیئے۔ گاتی ہے۔}

گانا

(آگ جل اٹھتی ہے۔ ہانڈی چڑھا کر روٹی پکانے بیٹھتی ہے۔ مگر روٹی پکانے میں ہاتھ جل جاتے ہیں۔ "توری پر بل آتا ہے آبلہ پڑ جاتا ہے۔")

رعنا۔ (خود بخود) (آبلوں کو دیکھ کر) کم ہمت پھر گھبرا گئی؟ آبلوں کو کیا دیکھتی ہے۔ ان میں پانی بھرا ہے پانی جس چیز سے بنا ہوگا امیرانہ نوابوں سے جو غریبوں کا پیٹ کاٹ کر حاصل کئے گئے ہوں گے (بیلن اٹھا کر روٹی بیلتی ہے) آبلہ پھوٹ جاتے ہیں تھم جاتی ہے (آبلوں کا پانی پونچھ کر) ارے زندگی خود ایک آبلہ ہے جس میں "ہائے ہائے" کی ہوا اور آنسوؤں کا پانی بھرا ہے۔

[کھانا پکانے لگتی ہے۔ بیگم صاحبہ کی آواز آتی ہے کہ کھانا دسترخوان پر چنو۔]

مولوی بشارت علی خاں صاحب ارمان آفریدی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہٗ کی اصلاح

آہ کا اسلوب نو ایجاد ہونا چاہیئے
سانس کی بھی ~~قید سے~~ (انجمن سے بھی) آزاد ہونا چاہیئے

پھر ضرورت ہے کہ کروٹ لے نظامِ انقلاب (کب)
یعنی مجھ کو مائلِ فریاد ہونا چاہیئے

~~ہر خلش میں ٹیس ہر رگ میں خلش کی بستیاں~~ (نشتر فروش)
اک جہانِ دل نیا آباد ہونا چاہیئے

~~میری بربادی کہ ہر قصے سے اک دنیا بسے~~ (خاک کے ذروں سے میری اک نئی دنیا بنے)
~~ہاں مجھے~~ (مجھ کو ایسی) اس شان سے برباد ہونا چاہیئے

بن گئے آئینِ نو ایوانِ استبداد میں
فطرتِ مظلومیت کو شاد ہونا چاہیئے

اُف مذاقِ شادکامی اسقدر پست و رکیک
اب تو مجھ کو فطرتاً ناشاد ہونا چاہیئے

گر تمنا ایک رازِ لغزشِ تخلیق ہے
پھر تو مجھ کو بھی تمنا زاد ہونا چاہیئے

آپ اے ارمان ہیں ناموسِ ملت کے امیں
آپ کا ہر شعر اک ارشاد ہونا چاہیئے

آلم ، مولوی محمد اسحاق صاحب مظفرنگری (۴)

ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارنپور میں افغانوں کی ۵۲ باون بستیاں مشہور ہیں اور عام طور پر وہ جماعتیں جو ان تمام بستیوں کی عہد انگلشیہ سے پہلے مالک تھیں آج تک لفظ "باونی" کے نام سے پکاری جاتی ہیں انہیں بستیوں میں سے ایک بستی "پٹرانہ" ہے جو ضلع مظفر نگر میں قصبۂ شاملی سے مغرب کی جانب قصبۂ جھنجانہ کی سڑک پر جانب شمال واقع ہے۔ آلم صاحب کے پردادا "حسین خاں" اسی بستی کے ایک مشہور و معروف افغان زمیندار تھے جن کی دولت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اُن کے والد "کڑے خاں" ہاتھی نشین تھے نیرنگئ فلک کا ایک کرشمہ کہیے یا عالم سلوک و جذب کی ایک ادنیٰ کشش کہ "حسین خاں" ایک خاندانی نزاع کی بنا پر اپنے بڑے بھائی "حسن خاں" سے ناراض ہو کر دفعتہً ترک وطن پر آمادہ ہو گئے اور تمام املاک بڑے بھائی کے سپرد کر کے توکل بخدا صرف بیوی کو ساتھ لیکر جن کا نام "متیا" تھا وطن مالوف کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ کر چل کھڑے ہوئے کچھ روز اِدھر اُدھر پھرتے رہے آخر کار ۱۸۵۰ء میں قصبہ مظفر نگر میں وارد ہوئے اور ایک مشہور "درویش" سیدنا مدار علی شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور زال دنیا کو ہمیشہ کیلئے طلاق دے کر مردانِ خدا کے زمرہ میں داخل ہو گئے۔

آلم صاحب کے والد قبلہ اللہ دیا شاہ صاحب مرحوم نے سید نامدار علی شاہ کے حالات مختصر طور پر اپنے بزرگوں کی کہانی سنکر قلمبند فرمائے تھے افسوس کہ وہ تحریر اُن کے پاس اپنی اصلی حالت میں نہیں ہے البتہ چند غیر مرتب اوراق ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب موصوف رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے کامل درویش تھے اور علاوہ ازیں علوم متداولہ میں کافی دستگاہ رکھتے تھے قصبہ مظفر نگر میں سید موصوف کی بیٹی عوض علیخاں میں کافی جائداد تھی جس میں سے انہوں نے بوقت رحلت کھیوٹ ۶۱ و ۶۲ آلم صاحب کے پردادا "حسین خاں" کے نام کر دی تھیں آلم صاحب کے والد کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب موصوف کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے غالباً اُن کی بقیہ جائداد ان کے خاندان کے دیگر افراد کی طرف منتقل ہو گئی ہو گی۔

چونکہ اب حسین خاں حلقۂ دام ہوس سے آزاد ہو کر دارالامن فقر میں داخل ہو چکے تھے اس لئے لفظ "خاں" کی تمکنت لفظ "شاہ" کی سکون انگیز مسرتوں میں تبدیل ہو گئی اور بجائے حسین خاں کے "حسین شاہ" کہلانے لگے۔ چنانچہ بند و بست اوّلین میں کھیوٹ ۶۱ و ۶۲ پر ان کا نام حسین شاہ درج ہوا اور اُس کے بعد خاندان میں لفظ "شاہ" بطور امتیاز خصوصی ہر نام کے ساتھ بدستور قائم رہا اور ساتھ ہی اس کے پیری مریدی کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا۔

آلم صاحب کا خاندان متذکرہ بالا کھیوٹوں پر ایک عرصہ تک قابض و متصرف رہا لیکن آخر میں نزاعات خاندانی کی بنا پر وقتاً فوقتاً اس جائداد کا تھوڑا تھوڑا حصہ قبضہ سے نکلتا رہا یہاں تک کہ آلم صاحب کے والد کی حیات میں چند معوج الذہن حضرات کی دراندازیوں اور فتنہ سامانیوں کی بدولت یہ تمام جائداد ان کے خاندان کے قبضہ و تصرف سے نکل گئی۔

فی الحال آلم صاحب جائداد مذکورہ کے بہت قلیل حصہ کے مالک ہیں۔

آلم صاحب کے پردادا حسین خاں کے بڑے بھائی "حسن خاں" اس تمام جائداد پر جو موضع پٹرانہ میں تھی بدستور قابض و متصرف رہے چنانچہ آج تک اُن کی اولاد اس قدیم جائداد کے ایک معتدبہ حصے پر قابض و متصرف ہے۔

اور تمام خاندان موضع مذکور میں آباد ہے، حسن خاں کی بیوی کا نام "راحی" تھا اس نسبت سے یہ تمام خاندان

آج تک "ماڑیہ" کہلاتا ہے۔ "عالم خاں" جو آج کل خاندان "ماڑیہ" میں ایک معمر بزرگ ہیں تہذیب قدیم کا مکمل نمونہ ہیں۔

آلم صاحب کے والد خاندانی دستور کے مطابق سید منظر علی شاہ ساکن شہر میرٹھ سے مرید اور ان کے خلیفہ اول تھے۔ سید منظر علی شاہ حضرت شاہ خاموش حیدر آبادی کے اعلیٰ مریدین میں سے تھے یہ خاندان ہندوستان میں سلسلۂ تصوف کیلئے بہت مشہور ہے اور عام طور پر اطراف وجوانب ملک میں اس سلسلہ کے لوگ اکثر پائے جاتے ہیں سید منظر علی شاہ صاحب کا مزار شہر میرٹھ میں ہے اور وہاں آپ کا سالانہ عرس ہوتا ہے۔ آپ نے عربی زبان کی تکمیل اپنے مکان ہی پر کی اور عربی لٹریچر کا خصوصیت سے مطالعہ کیا اس کے علاوہ پنجاب والہ آباد یونیورسٹیوں سے علوم مشرقیہ کے اعلیٰ امتحانات بھی پاس کئے ادبیات سے آپ کو گہرا تعلق ہے اور تفسیر و حدیث سے فطری طور پر دلچسپی یہی وجہ ہے کہ آپ کی نظر بہت وسیع ہے عربی کے علاوہ آپ نے فارسی ادبیات کا مطالعہ بھی بہ امعانِ نظر کیا ہے۔ ہندوستان کے فارسی شعرا میں آپ حضرت امیر خسروؒ اور مرزا غالبؒ کے بہت مداح ہیں۔ فنِ تنقید پر بھی آپ کو کامل دستگاہ ہے

آپ حنفی مسلمان ہیں اور بلحاظِ مشرب صوفی، آپ کے کلام منظوم و منثور میں جا بجا مسائل تصوف پر بحث نظر آتی ہے اور آپ جذب وسلوک کے مقامات کو جب بھی لکھتے ہیں تو نہایت کامیابی کیساتھ واردات وواقعاتِ روحانی کو قلمبند کرتے ہیں آپ گوشہ نشین، خود دار، خلیق اور بڑے بار بزرگ ہیں، ذہنیت قدامت کے ماؤف کن جراثیم سے محفوظ ہیں، نام و نمود سے پرہیز کرتے ہیں۔

مولوی محمد اسحاق جہاں ایک عالم ہیں وہاں آپ کی شاعرانہ شخصیت بھی بلند ہے مظفر نگر میں آپ کی حیثیت ایک ماہر فن کی ہے اور اکثر حضرات آپ سے مشورۂ سخن کرتے ہیں آپ نے دس گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور فن شعر کے ابتدائی زمانے میں چند غزلیں مولانا محمد یعقوب صاحب کلام بی اے سہارنپوری کو دکھائیں جو اس نواح کے باکمال شعرا میں سے سمجھے جاتے ہیں انھیں سے آلم صاحب کو اوّلاً تلمذ کا فخر حاصل ہے اور آپ اس فخر کو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اب مستقل طور پر ۱۹۳۰ء سے آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ سے بذریعہ خط وکتابت مشورہ لیتے ہیں آپ مذاق سلیم سے بہرہ ور ہیں۔ اور ادبیات میں آپ کی رائے صائب رہتی ہے۔ آپ کی شاعری میں متصوفانہ خیالات کا غلبہ ہے۔ اور وہ گہرائیاں موجود جو درج کلام کی جا سکتی ہیں۔ فنِ عروض سے اچھی طرح واقف اور قدماء کے کلام کی خصوصیات کے نباض ہیں جو کچھ کہتے ہیں نہایت خوب کہتے ہیں اور سمجھ کر کہتے ہیں۔ آپ کی شاعری تصوف حقائق اور معارف کا مجموعہ ہے شعرائے اردو میں غالب وانیس اور دورِ جدید میں صرف مولانا سیماب کے مقلد ہیں اور انہی کو اردو شاعری کا مجدد تصور کرتے ہیں۔ اصناف سخن میں قصیدہ غزل نظم سب کچھ کہتے ہیں فنِ تاریخ گوئی میں بھی آپ کو ملکہ ہے۔ آج کل آپ اسلامیہ ہائی اسکول مظفر نگر میں مدرس فارسی ہیں نظم کی طرح نثر نگاری پر بھی آپ قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کی نثر فاضلانہ اور ناقدانہ ہوتی ہے۔ وسعت مطالعہ اور فطری اصابت رائے نے قوتِ نقد ونظر کو مضبوط بنا دیا ہے آپ نے متعدد تنقیدی مضامین کے سلسلے لکھے ہیں "ابو نواس اور عمر خیام" کے عربی اور فارسی کلام پر آپ نے سیر حاصل مقالہ اور غالب پر ایک بسیط تنقیدی مضمون لکھا جو رسالہ پیمانہ میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

نمونۂ تغزل

آخر آخر عشق میں حیرت یہ دامنگیر ہے   میری ہر تصویر گویا آپ کی تصویر ہے

منحصر تقدیر پہ میرا مآلِ غم نہ کر   مجھ کو پہلے ہی سے کچھ اندازۂ تقدیر ہے

چارہ سازوں کی غلط سامانیاں دیکھو کوئی — ہے جنوں آزاد میری پاؤں میں زنجیر ہے

میں مطمئن ہوں اپنی نظم کامیاب سے — تسکین مل سکی نہ مری اضطراب سے
جو حسن رہ گیا تھا تیری علمِ خاص میں — وہ بھی نہ بچ سکا نظرِ انتخاب سے

وحشتِ قیس بھی ہے حسرتِ فرہاد بھی ہے — اک جہاں عشق کا آباد ہے دیوانوں میں
پھر نئے سر سے وہ اقرارِ وفا کرتے ہیں — زندگی جاگ اٹھی پھر مری ارمانوں میں
اللہ اللہ یہ گلکاریٔ خونِ مجنوں — صحنِ فردوس کا منظر ہے بیابانوں میں
میری دل میں ہے جو فردوسِ محبت بکنار — وہ جہنم ہے کہاں شمع کی پروانوں میں
ہے کوئی دعوتِ ساقی پہ جو لبیک کہے — آج میخانہ کا میخانہ ہے پیمانوں میں
ہے ترقیٔ جنوں قابلِ صد رشک الم
تم بھی اب فرد ہوئے عشق کے دیوانوں میں

اُن کا ہر اک تبسّمِ خاموش — جلوۂ برقِ طور ہوتا ہے
حسن اور رازِ عشق سے واقف — یہ بھی دل کا قصور ہوتا ہے
تیرا رہ رہ کے جھومنا ساقی — اک بہشتِ سرور ہوتا ہے
وہ بھی کیا وقت ہے مسافر کا — جب وہ منزل سے دور ہوتا ہے

جورِ خزاں بھی ہے ستمِ باغباں بھی ہے — بایں ہمہ مجھے ہوسِ آشیاں بھی ہے
اے آرزوئے حسرتِ آزار شاد باش! — صیاد کی نظر طرفِ آشیاں بھی ہے
بجلی چمن کو چھوڑ گئی باغباں مگر — محفوظ اس چمن میں مرا آشیاں بھی ہے؟
ہوں بیخودی میں سجدہ گزارِ حریمِ دوست — میری جبینِ جبیں ہے نہیں آستاں بھی ہے
یہ کونسی منزل ہے گردابِ حقیقت میں — ساحل ہے نہ دریا ہے کشتی ہے نہ طوفاں ہے
خاطر میں الم لائے کیا شورِ قیامت کو
وحشتِ محبت ہے صد حشر بہ داماں ہے

مست تھی آزاد تھی بزمِ ازل کی کیف سے — روح جب تک قیدیٔ زندانِ آب و گل نہ تھی
ذرہ ذرہ دے رہا تھا ایک پیغامِ حیات — مہبطِ الہامِ فطرت تھی مری منزل نہ تھی
تم ٹھہر جاتی ہماری ساتھ دم بھر کیلئے — وادیٔ الفت میں کیا ایسی کوئی منزل نہ تھی

سیکھا تھا اضطرابِ موجِ دریا سے سبق — درس آموزِ عمل خاموشیٔ ساحل نہ تھی

بس اک لمحہ ہی باقی اقتدارِ موسمِ گل کا — چمن کی سیر کرلیں یا طوافِ آشیاں کرلیں
نہ دے الزام تنگیٔ نظر گوشہ نشینوں کو — اٹھا دیں دل سے اک پردہ تو سیرِ دو جہاں کرلیں
سزاوارِ قفس کیوں ہوں نہ وہ گلشن کے دیوانے — جو سامانِ تباہی آشیاں در آشیاں کرلیں

یہ فریب جالستانی یہ سراب دلنوازی — کہ نیاز مند ہو کر ہوں اسیرِ بے نیازی
تری آنکھ میکدہ ہو تو خیالِ زہد کیسا — جو شراب تو پلائے تو کہاں کی پاکبازی
یہ فسردگی پیہم یہ فتادگی برہم — تری دل پہ چھا گیا ہے مرا رنگِ عشقبازی
الم آتشِ عقیدت ہو حرم فروز کیوں کر
کہ خرابِ بتکدہ ہے مرا نغمۂ حجازی

بتوں کی خامشی ہے ترجماں اے برہمن تیری — نئی طرزِ پرستش ہے باندازِ کہن تیری
لہو بنکر مری جذبات دل میں پھیل جاتے ہیں — شفق جب یاد آجاتی ہے اے شام وطن تیری
خرامِ سست سے دشواریاں کچھ اور بڑھتی ہیں — مسافر تیز رو ہو جا کہ منزل ہے کٹھن تیری
شہیدِ عشق تجھ پر سایۂ ابرِ محبت ہو — بیاباں میں پڑی ہے لاش بے گور و کفن تیری
الم تیری مذاقِ فکر سے شعلے برستے ہیں — طبیعت آگ ہوتی ہے دمِ فکرِ سخن تیری

بلندی پر ستارہ ہے جنونِ فتنہ ساماں کا — نظر میں چاند بن جاتا ہے ہر ٹکڑا گریباں کا
محبت کیوں نہ ہو جائے اسیرِ فطرتِ انساں — بساطِ قلب میں اک جال پھیلا ہے رگِ جاں کا

نمونۂ نظم

چاند

دنیا کی وسعتوں میں ہے آئینۂ شباب — اک بے مثال نور کی تصویرِ لاجواب
اک شعلۂ خموش بہ عنوانِ آب و تاب — شہزادۂ فلک کہ ہے تابندہ آفتاب
نکلا وہ ماہتاب

آغوش میں سرور کی دنیا لئے ہوئے — جلوؤں میں انبساطِ تمنّا لئے ہوئے
روحانیت فروز اُجالا لئے ہوئے — اپنی جلو میں نور کا دریا لئے ہوئے

نکلا وہ ماہتاب

دکھے ہوئے دلوں کو بہ دامِ لطیف تر — بھٹکے ہوؤں کو قابلِ تعظیم راہبر
اپنے کمالِ نور سے عنوانِ رہ گذر — تصویرِ زندگی کا تبسم ہو سر بسر

نکلا وہ ماہتاب

اے سرگرانِ ہستیٔ پر پیچ و تاب اُٹھ — اے سوز سی گھِرے ہوئے غمگیں شباب اُٹھ
اے انتہائے یاس سی مصروفِ خواب اُٹھ — نظارہ تیرا ہونے کو ہے کامیاب اُٹھ

نکلا وہ ماہتاب

نمونۂ نثر

کسی تصنیف یا تالیف کیمتعلق کسی تنقید نگار کا یہ طے کر دینا کہ وہ قطعی طور سی اخلاق انسانی اور سوسائٹی کی بنیادوں کیلئے سخت تباہ کن ہی اور یہ کہ اس قسم کی تصنیف و تالیف تمدنِ انسانی اور معاشرتِ حیات کیلئے ایک زہریلی چیز ہی۔ ہماری خیال میں ایک شدید غلطی ہی جسے تنقید نگار کی ایک جسارت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ افسوس یہ ہی کہ بہت سی اچھی تصانیف محض اس غلط اصولِ تنقید کی نذر ہو گئیں اور آج اُن کا نشان تک نہیں ملتا تاریخِ عالم میں اس قسم کی تباہی کی بہت سی مثالیں … ہیں چنانچہ آنیوالی نسلیں اسلاف کی ان فروگذاشتوں کو معاف نہیں کر سکیتں۔ کیونکہ اُن کی یہ تنگ نظری کسی نہ کسی مخصوص فن یا علم و ہنر کی معراج کو تباہ کرنیکا باعث بن چکی ہے۔

ایک صحیح ناقد فن کا تو یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ جس قسم کی تصنیف و تالیف پر اپنے قلم کو جنبش دے رہا ہے۔ دنیا کو بتا دے کہ وہ تصنیف یا تالیف اپنے موضوع فن کے لحاظ سے کہاں تک کامیاب یا ناکامیاب ہو سکتی ہے اور یہ کہ وہ کس زمانہ اور کس ماحول میں لکھی گئی ہے۔ اس کے مصنف نے نوعیتِ فن اور زیرِ بحث مسئلہ پر کس قدرت یا عدمِ قدرت کیساتھ قدم اٹھایا ہے وہ صرف اپنے مخصوص موضوع کی حد میں کس درجہ تک کامیاب و ناکامیاب ہے ایک سائنسداں کی کتاب میں شاعری کے نکات تلاش کرنا فعلِ عبث ہے۔ بالکل اسی طرح ایک شاعر کے کلام میں علمِ ہندسہ کے موضوعات کی تفتیش بیکار سی بات ہے۔

مولوی محمد اسحاق صاحب الم مظفر نگری کی غزل پر حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ کی اصلاح

بن کے اک شورشِ آہنگِ رگِ ساز کبھی — ہو مغنیٔ ازل زمزمہ پرداز کبھی
اب تو اک سوز ہوں پہلے تھا لگ ساز کبھی — درد ہوں، درد میں ہوتی نہیں آواز کبھی
تھا تصو تمہارا ہمراز کبھی — حیرتِ آئینہ تھی آئینہ پرداز کبھی
وہ کبھی شمع ہے، پروانہ جانباز کبھی — عشق کا راز کبھی حسن کا اعجاز کبھی
طعن صیاد نہ کر بے پر و بالی پہ مری — لے اُڑے گی مجھے یہ مشتی پرواز کبھی
دوست تو دوست ہے دشمن کو بھی ہے ناامید — ان کی محفل کا بدلتا نہیں انداز کبھی
کس کے جلوہ کی نمائش ہے چراغِ محفل — تو نے سوچا بھی ہے پروانہ جانباز کبھی
مرگیا قیدیٔ زنداں ہوئی تکمیلِ جنوں — اب نہیں آئیگی زنجیر کی آواز کبھی
ہے نہاں دل کی ہر اک پردہ میں آہنگِ تمام — تو نے چھیڑا ہی نہیں تارِ رگِ ساز کبھی
سچ ہے کیونکر قلقِ ہجر کی ہو تم کو خبر — میرے نالوں کی کبھی آئی نہیں آواز کبھی
خونِ وحشی سرِ دیوار ہے تاریخِ جنوں — اہلِ زنداں نے نہ دیکھا تھا یہ اعجاز کبھی
دیکھتا ہوں کہ ازل سی ہیں نگاہیں تیری — طرح انداز کبھی خانہ برانداز کبھی

بے غمِ عشق میسر ہو کسے عیشِ حیات
لطف دیتا نہیں بے سوزِ الم ساز کبھی

اثر — فضل الدین صاحب اکبرآبادی بی۔ اے (۵)

آپ کا نام فضل الدین اور اثر تخلص ہے۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا اسم گرامی شیخ بندے حسن تھا جنہوں نے ۱۹۲۲ء میں وفات پائی۔ مرحوم معززین آگرہ سے تھے۔ آپ پانچ بھائی ہیں۔ وحیدالدین معین الدین۔ ڈاکٹر ولی الدین فضل الدین اثر اور رفیع الدین۔

جب سے اثر صاحب نے ہوش سنبھالا اسی وقت سے آپ کو تعلیم سے لگاؤ تھا لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ لگاؤ بہت جلد آپ کو علم کے ارتقا تک پہونچا دے گا۔ ابتداً شعیب محمدیہ ہائی اسکول کے مکتب میں آپ نے تعلیم پائی ۱۹۲۲ء میں سینٹ جانس ہائی اسکول کے تیسرے درجے میں داخل ہوئے۔ وہاں سے ۱۹۳۲ء میں انٹرینس پاس کیا اور سینٹ جانس کالج آگرہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہوگئے۔ وہاں امتیازی خصوصیتوں کیساتھ بی اے پاس کیا اور ایم اے کلاس میں شریک ہوگئے۔ اس زمانے میں کالج کی طرف سے آپکو اسکولرشپ بھی ملتا تھا ۱۹۳۶ء میں انگریزی ادب اور فلسفہ میں ایم اے پریویس کا امتحان پاس کیا ۱۹۳۷ء میں ایم اے کا فائنل کا امتحان دینے والے تھے لیکن فطرت کا منشا کچھ اور تھا امتحان سے صرف چند ماہ پیشتر بعض ایسے موانعات پیدا ہوگئے کہ آپ کو کچھ عرصے تک آرام کرنا پڑا۔ آج کل صرف آرام اور تفریح میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گو یہ چیز آپ کی طبیعت کے بالکل خلاف ہے لیکن قدرت کو یہی منظور ہے۔ اس لئے مجبور ہیں۔

اسکول کی زندگی عموماً جیسی اکثر طالبعلموں کی گذرتی ہے اسی طرح آپ کی بھی گذری۔ لیکن وہ تمام باتیں جنہیں آج آپ کی ادبی۔ ذہنی اور اخلاقی خصوصیات کہا جاتا ہے، اُن سب کی بنیاد اسکول ہی میں پڑ چکی تھی۔ چنانچہ آپ کو ہر اس شغل سے نفرت تھی جو آپ کی تعلیم اور مقصود نظر کے حصول میں حارج ہو۔ خیالات نظم کر لینے کی استعداد اسکول ہی میں پیدا ہو چکی تھی اس استعداد فطری کی نشو و نما میں مولوی نجم الحسن صاحب کی شفقتیں اور کاوشیں بھی شامل تھیں۔ آپ نے انگریزی مضمون نویسی میں آٹھویں جماعت ہی سے امتیاز حاصل کر لیا تھا اور یہ بات قابلِ فخر تھی کہ آپ کے انگریزی مضامین کلاس میں پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔

جن باتوں کی بنیاد اسکول میں پڑی تھی وہ کالج میں آکر عمارت کی شکل اختیار کرنے لگیں۔ کالج کی زندگی میں آپ کو اردو ادب کے مطالعہ کا بہت زیادہ موقع ملا۔ ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو آپ حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کے سلسلۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ ادھر حضرت مولانا مدظلہ کی خاص توجہ ادھر مولانا حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کی ہمت افزائی غرض آپ بہت جلد نا ثر سے شاعر بن گئے۔ اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نظم نگار۔ اسی طرح انگریزی مضمون نویسی میں پختگی پیدا ہو گئی۔ ان چیزوں میں دن رات بڑی سرعت سے ترقی ہو رہی تھی۔ لیکن بی اے کے بعد آپ کو کامل طور پر اس دنیا میں آنا پڑا اور کاوش و فکر کیساتھ اپنی ذمہ داریاں محسوس کرتے ہوئے آپ اپنی ادبی تعمیر میں مصروف ہوگئے۔ چونکہ فطری رجحان اور ذوق صحیح تھا اور رہنما بھی ایسا ملا تھا جس نے بیشتر نکات شعری بقول شخصے گھول کر پلا دئے تھے، اس لئے آپ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اردو اور انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے کے باعث جولائی ۱۹۳۵ء سے اپریل ۱۹۳۶ء تک سینٹ جانس کالج میں ایف اے کی جماعت کو اردو اور انگریزی تنقید کے علاوہ دونوں زبانوں کی مضمون نگاری کا درس بھی آپ دیتے تھے۔

دوسرے سال جب آپ فائینل میں آئے تو اردو کی جگہ صرف انگریزی درس دینے کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی اور اس مرتبہ بجائے ایف اے کے بی اے کلاس آپ کے سپرد کی گئی۔ کالج میں علاوہ شعر و سخن کی سرگرمی کے آپ بحث و مباحثہ میں بھی امتیازی حیثیت سے حصہ گیر رہے اور اوّل درجے کے انعامات حاصل کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ کے آپ سکریٹری اور وائس پریسیڈنٹ بھی رہے ہیں۔

آپ کو کالج اور اسکول میں جس قدر امتیازات حاصل ہوئے وہ سب آپ کی ذہنی استعداد اور اساتذہ کی توجہ کا نتیجہ تھے۔ آپ سے کالج اور اسکول کے تمام اساتذہ ہمیشہ خوش رہے بعض تو آپ پر انتہائی کرم فرماتے تھے چونکہ اساتذہ کے کردار کی بعض خصوصیتیں آپ میں بھی پائی جاتی ہیں اس لئے آپ اپنے اساتذہ کے صحیح معنوں میں شاگرد ہیں اسکول اور کالج کے علاوہ جناب مولوی سعید احمد صاحب مارہروی منیجر شعیب محمدیہ ہائی اسکول کی بزرگانہ شفقتیں آپ کیلئے انتہائی مفید اور سکون بخش ثابت ہوتی رہی ہیں۔ آپ نفاست پسند اور ہر چیز میں آرٹ کی جھلک دیکھنے کے عادی ہیں۔ متانت آپ کو فطرتاً ودیعت ہوئی ہے۔ آپ آزاد خیال اور خود دار انسان ہیں۔

آپ کی غزلیں اور نظمیں نگار۔ زمانہ۔ نیرنگِ خیال۔ ادبی دنیا اور شاعر وغیرہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کو تصنیف و تالیف سے انتہائی شغف ہے آپکی کئی کتابیں اردو اور انگریزی میں چھپ چکی ہیں۔ "اردو پوئٹری" جو انگریزی زبان میں ہے بہت مقبول ہوئی ہے۔ آپ اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "نائے تمام" کے نام سے جلد شائع کرنیوالے ہیں۔ اثر صاحب صحیح معنوں میں ادیب ہیں مستقبل میں ملک کو آپ کی ذات سے کافی فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔ نظم غزل فسانہ مضمون غرض سب کچھ لکھتے ہیں اور ہر صنف کلام میں "آگرہ اسکول" کا بہترین معیار پیش کرتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

اسلام اور کفر کا کیوں کر ہو فیصلہ — گر اپنا سر اٹھالیں ترے سنگِ در سے ہم
کافی ہے بزمِ دل حرمِ روح کیلئے — گر اک چراغ مانگ لیں داغِ جگر سے ہم

مرے شکیب کو تھا انتظارِ صبح ابھی — چراغ وقت سے پہلے بجھا دیا تم نے
پڑا مجاز و حقیقت کے درمیاں آ کر — وہ اک حجاب جو دل سے اٹھا دیا تم نے
نظر کی ہلکی سی جنبش سے جو شکستہ ہوا — وہ بزمِ دل کیلئے آئینہ دیا تم نے

ظرفِ نظر میں فطرتِ پروانہ چاہیئے — ہم لاکھ بار آئیں گے بزمِ جمال میں
الکل وجود حاصلِ ایجادِ کائنات — وہم و خیال ہو تو وہ آئیں خیال میں

غنیمت ہے کہ تو محدودِ ننگِ نسترن نکلا — وگرنہ میں خزاں میں بھی خرابِ گلستاں ہوتا

جذب کرنے اسے آتی ہی محبت کی کرن — ہنستے ہنستے کوئی آنسو جو گرا جاتا ہوں
آؤ ارمانِ غمِ عشق مکمل کر لیں — تم بنو شمع، میں پروانہ بنا جاتا ہوں

تمہاری ہر نظر تسکیں اثر معلوم ہوتی ہے — جدھر ہوتے ہو تم دنیا ادھر معلوم ہوتی ہے
اثر پتھر کے ٹکڑوں میں وہ چھپ کر بول اٹھتی ہے — جبیں گھسنے پہ قدرِ سنگِ در معلوم ہوتی ہے

انقلاباتِ محبت مستقل تاریخ ہیں — حسن کو میرا فسانہ یاد ہونا چاہیئے
میری بربادی تو اک امرِ مسلّم ہے مگر — بحث یہ ہے کس طرح برباد ہونا چاہیئے

سنا اب داستاں اپنی کہ ہو دلچسپیاں پیدا — یہ دنیا سنتی آئی ہے مرا افسانہ برسوں سے

مجھے حیرت نہیں ہے آئینہ خانے کی حیرت سے　　کہ جلوہ پیدا کرلیتا مری نظروں کی فطرت ہے
نیازِ عشق رسمِ عام ہو کر رہ گیا آخر　　انہیں اک سجدہ کرنے کی بھی اب تک ندامت ہے،
بقیدِ ہوش سازِ بیخودی وہ دن کو کیا سنتے　　ذرا دیوانہ ہو جاؤں تو پھر فرصت ہی فرصت ہے
وہ کوئی ماورائے کفر و ایماں نذر تو مانگیں　　ہماری پاس بھی اک چیز ہے اور وہ محبت ہے،

تشنگیٔ ذوق کا مٹنا حقیقی موت ہے　　سامنے آنے سے بہتر ہے کہ وہ پردا کریں
زندگی ہے نام ان کا، زندگی ہے اضطراب　　دل میں وہ آئیں تو کیوں کر دل کو آسودا کریں
دل کی قیمت پوچھنی ہو تو خدا سے پوچھئے　　دل امانت ہے، امانت کا بھی کیا سودا کریں
دیر و کعبہ برہمن اور شیخ کی جاگیر ہیں　　اے تعین دوست ہم آخر کہاں سجدا کریں
یا ہمیں بیچارگی کے طعن دینا چھوڑ دے　　یا وہ اک آنسو بتا دے ہم جسے دریا کریں
کرہی لیں گے تھام کر دامن کبھی گفت و شنید　　پتھروں سے پھوڑ کر سر کیا تجھے رسوا کریں

حسن کی معصومیت کو چاہیے آسودگی　　پہلے خود مجھ کو مری نظروں سے پنہاں کیجئے
کب سے ہے بے کیف فطرت کا ربابِ عاشقی　　حسن کے نغمات کو جذبِ رگِ جاں کیجئے
اختیارِ نامکمل ننگِ آزادی رہا　　میری جانب سے اسے بھی نذرِ زنداں کیجئے.

یہ فریب ہو کہ ہو مصلحت ہمیں اس سے کیا سروکار ہے
وہ قرار بن کے جب آگئے تو سمجھ لیا کہ قرار ہے

اس لطف و کرم کے کیا کہنے، ساقی نہیں تم کچھ اور بھی ہو
اب بادہ دینے آئے ہو جب ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا.
تاب کہاں کہ دے سکوں عصمتِ حسن کا جواب　　میں نے انہیں کو کر دیا ان کی نظر کے سامنے

مقصد ہے ماسوا سے تیری طرح محبت　　لیکن یہ سوچتا ہوں تجھ سا کہاں سے لاؤں
ان چند آنسوؤں کی تضحیک کر نہ اتنی　　قطرہ نہیں میسر، دریا کہاں سے لاؤں

تصور نے جدائی کو جدائی بھی نہیں رکھا　　کہ ہر تارے کے دامن میں تری تصویر ہوتی ہے

ختم ہو کس طرح مرا سلسلۂ مطالبات　　عشق تو ایک مستقل تشنہ لبی کا نام ہے

وہ بھی تھا اک مسافر ایمن مری طرح　　تجھ نے بیک نظر جسے موسیٰ بنا دیا

نمونۂ نظم

مصوّر

فضائے رنگ و بو میں اپنے شہپر تولنے والا　　قلم کی جنبشوں سے رازِ فطرت کھولنے والا
رسائی روحِ صنعت تک خیالوں ہی خیالوں پر　　کبھی سیراب ہونٹوں میں کبھی سرگشتہ نالوں پر
کبھی بدمست صہبائے آفریں آنکھوں کی مستی سے　　کبھی ہشیار انداز و طرازِ سازِ ہستی سے
حجابِ کنہ فطرت کی پردے کھولنے والا　　لبِ خاموش میں تصویر کے خود بولنے والا
نکالا ہو قلم سے چھیڑ کر تارِ رگِ جاں کو　　ابھارا صفحۂ بے رنگ سے اسرارِ پنہاں کو
جو پھول اب تک نہ پیدا ہو سکا دنیائے ظاہر میں　　شگفتہ ہے ہزاروں رنگ سے ذہنِ مصور میں
جو صورت پردۂ تخلیق پر اب تک نہیں آئی　　بہر صورت وہ اس کی فکر میں لیتی ہے انگڑائی
جو منظر سینۂ ہستی میں اک رازِ نہفتہ ہے　　وہ اسکے دل میں مثلِ آئینہ ہر وقت پیدا ہے
رگیں پھڑکی جو اب تک نہیں ابھریں ابھارے سے　　وہ کاغذ پر ابھر آتی ہیں اسکی اک اشارے سے
ادا جو حسن کو اب تک ودیعت کی نہ فطرت نے　　اسے بھی آشکارا کر دیا اسکی بصیرت نے
جو بچہ نا مکمل ہے ابھی تک بطنِ مادر میں　　وہ ہنستا کھیلتا ہے اسکی تخئیلِ منور میں
شگوفہ جو ارادوں میں ابھی فطرت کی پلتا ہے　　قلم سے اسکے بن کر نکہتِ گل بن کے نکلتا ہے
یہ جب ہلکی سی اپنی فکر کو پرواز دیتا ہے　　تو ہر نقشِ حقیقت دور سے آواز دیتا ہے
نگارستانِ معنی کی ملی ہے اس کو خلاقی　　زمانے میں نقوش اس کے رہیں گے تا ابد باقی

ہے خود تصویر اور صورت گری میں شکلِ آذر ہے
مصورِ صانعِ ہستی کی اک کلکِ مصور ہے

نمونۂ نثر

ظاہر ہے کہ عشق صرف اپنے ہی خط وخال والے کسی حیوانِ لطیف کے گز ڈیڑھ گز لانبے گیسوؤں میں اسیر رہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ کارگہِ حیات میں ہم اپنے ہر فعل کو عشق بنا سکتے ہیں۔ دل کا درد دوست کہلانے والے کسی انسان کی مفارقت ہی پر منحصر نہیں، بلکہ دل کا درد اپنے وطن کے فاقہ کش مزدوروں اور جبر زدہ کسانوں کے تصور پر بھی زندگی کے سانس لے سکتا ہے۔ ہمارے عنادل صرف اسیر رہنے کیلئے نہیں بلکہ آزاد ہونے کے لئے بھی ہیں۔ ہمارے لبوں پر مہرِ خاموشی صرف ہماری لاچاریوں کی آئینہ دار نہیں ہے، بلکہ ہماری قوتِ فریاد پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ ہماری ذہنی قوتوں کا مصرف نامۂ محبوب تک محدود نہیں بلکہ کارگہِ عمل کی تاریخ مرتب کرنا بھی ان کے مصرف میں داخل ہے۔ الغرض ہم دیوانے بن سکتے ہیں لیکن کسی دنیاوی پیراہن کاغذی سے زیادہ زمین و آسمان کے اس حصے کے لئے جو وطن کہلاتا ہے۔ ہمارے دل میں درد ہو سکتا ہے لیکن کسی فریب تصور وجود سے زیادہ اس جماعت کے لئے جو بعنوانِ ملت پکاری جاتی ہے۔ ہماری رگوں میں جوانی کا گرم خون دوڑ سکتا ہے لیکن انتقام رقیب سے زیادہ اس معرکہ آرائی کیلئے جو اجتہاد سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔

جناب فضل الدین صاحب اثر بی اے اکبرآبادی کی غزل پر حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کی اصلاح

میرے نالوں کی شکایت تو بجا ہے لیکن
اپنی رو میں تجھے نغمے بھی سناتا جاتا ہوں

تیری محفل تری آئینے مبارک ہوں تجھے
~~شمعِ فطرت تھا میں~~ میں کہ اک شمع تھا خاموش ہوا جاتا ہوں

بجلیاں کوندکے دیتی ہیں سزائے ~~وحشت~~ جرأت
بیخودی میں کوئی چلمن جو اُٹھا جاتا ہوں

جذب کرنے لُٹے آتی ہی محبت کی کرن
ہنستے ہنستے کوئی آنسو جو گرا جاتا ہوں

آؤ رومانِ غمِ عشق مکمل ~~کردیں~~ کرلیں
تم بنو شمع، میں پروانہ بنا جاتا ہوں

غزل آپ نے بہت اچھی کہی ہے۔ اور چونکہ زمانۂ علالت کے بعد یہ آپ کی پہلی غزل ہے اس لئے قابلِ مبارکباد بھی ہے۔
سیماب اکبرآبادی

خود نوشت

میرا پورا نام اعجاز حسین صدیقی۔ والد صاحب قبلہ کا اسمِ گرامی مولانا عاشق حسین سیماب اکبرآبادی اور جدِ محترم کا نام نامی حضرت مولانا مولوی محمد حسین صدیقی مرحوم و مغفور ہے سنہ ۱۹۱۶ء میں دارالادب اکبرآباد میں پیدا ہوا۔ خدا نے مجھے ایسے خاندان میں پیدا کیا جو علم و تہذیب سے مالا مال تھا۔ دادا صاحب قبلہ مرحوم صاحبِ تصنیف اور ایک اچھے شاعر تھے نیر تخلص فرماتے تھے آپکا بیشتر کلام "نعت" ہوتا تھا اُن کے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا مگر کچھ لاپروائی سے اور کچھ اجمیر شریف سے آگرہ منتقل ہونے میں تلف ہوگیا یوں تو اُن کی کئی تصانیف قبول عام حاصل کر چکی ہیں لیکن "مجموعۂ شہادت" مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ کے اب تک ۹ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کتاب میں جدِ محترم نے بعض نظمیں اور غزلیں واقعات کے اعتبار سے خوب فرمائی ہیں چند شعر یہاں لکھتا ہوں اس سے اُن کے رنگِ شاعری کا اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے۔

وہ جو حوصلہ تھا حسینؓ کا۔ نہ تو دید ہے نہ شنید ہے
کہا دیکھ آئینہ تیغ کا، مجھے حسنِ یار کی دید ہے
جو لہو گلے سے رواں ہوا کہا عاشقوں کی یہ عید ہے
جو نثار سجدے میں سر کرے وہ امام ہی وہ شہید ہے

مرا یادِ حق میں جو کام ہو، تو خدا کے بندوں میں نام ہو
مجھے وصلِ یار مدام ہو، مری آرزو یہ تمام ہو

اس قادرِ مطلق کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے مجھے ایسے باپ کے فرزند ہونے کا فخر دیا جن کے فیضِ تادیب و تعلیم سے آج ہندوستان کا ذرہ ذرہ منور ہو رہا ہے اور اکتسابِ نور کر رہا ہے ہم چار بھائی اور ایک بہن ہیں میں منجھلا ہوں سب سے بڑے بھائی منظور کا سنہ ۱۹۱۹ء میں انتقال ہوگیا اُن سے چھوٹے مشتاق حسین صاحب منظر ہیں یہ کنول ہیں ان سے چھوٹی ایک ہمشیرہ عزیزہ ہیں ان سے چھوٹا میں ہوں مجھ سے چھوٹے میاں سجاد حسین صدیقی سلمہٗ نیر شاعر ہیں اور اُن سے چھوٹے میاں مظہر حسین سلمہٗ ہیں۔ میرے دو چچا تھے جن میں سے حاجی عبدالکریم صاحب کا انتقال ہوچکا ہے اور صادق حسین صاحب الحمدللہ بقیدِ حیات ہیں۔

یہ میرے مختصر خاندانی حالات تھے۔ ان کے علاوہ کوئی خاص بات قابلِ فخر نہیں سمجھتا۔ میرے حالات سے "آگرہ اسکول نمبر" میں کوئی اچھا اضافہ نہیں ہوسکتا اور نہ میں اپنے آپ کو اس چیز کے لئے تیار پاتا ہوں۔ اس نمبر میں مجھ سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہستیوں کے حالات شائع ہو رہے ہیں اور میں اپنے برادرانِ گرامی کے ساتھ شریک ہونے میں ایک ندامت سی محسوس کر رہا ہوں لیکن بعض احباب کے اصرار اور اس احساس سے کہ کہیں میرے عدم ذکر کو کسی اور چیز سے تعبیر نہ کیا جائے اپنی اکیس سالہ زندگی کے خشک اور بے کیف حالات پر جن کو میں خود بھی ابھی نہیں سمجھ سکا ہوں ایک اُچٹتی سی نظر ڈالتا ہوں۔

منزلِ ہوش تک پہونچنے کے بعد میری تعلیم مکتب سے شروع ہوئی۔ بیپٹسٹ مڈل مشن اسکول میں کچھ دنوں تعلیم حاصل کی مدرسہ محمدیہ میں دینیات۔ فارسی اور اردو کی تکمیل کی۔ چونکہ والد صاحب قبلہ کا قیام مستقل طور پر آگرہ میں نہیں رہا اس لئے ۱۹۲۹ء تک تعلیمی سلسلہ مسلسل جاری نہ رہ سکا ۱۹۳۰ء میں مستقل طور پر شعیب محمدیہ ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخل ہوا اور وہاں دسویں درجہ تک تعلیم حاصل کی۔ اسکول کی زندگی میں کیا کچھ کیا یہ ایک داستان ہے جو خواب سے کم نہیں اب وہ کارنامہ ہائے طفلی، وہ جولانیاں اور وہ سب بیتی بیتی رہنا ایک قصۂ پارینہ معلوم ہوتا ہے ۱۹۳۵ء سے بعض اہم ذمہ داریوں کی بنا پر تعلیمی سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رہ سکا میری حیثیت اب بھی طالب علمانہ ہے اور ہمیشہ رہیگی حصولِ علم خواہ وہ کسی صورت سے ہو میری فطرت کا ایک نہ مٹنے والا جذبہ ہے۔ مشرقی اور مغربی علوم کی

امتحانات کی تیاری کبھی کبھی وقت نکال کر کرتا رہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ نہ مجھے اردو آتی ہے نہ فارسی نہ عربی اور نہ انگریزی میں مہارت تام حاصل ہے۔ ہنوز زینے میں ایک دو نہیں سیکڑوں کمیاں پاتا ہوں لیکن اس احساس کے تحت کہ شاید کبھی کسی قابل ہو جاؤں منزل کی تگ و دو میں مصروف ہوں۔ یہ خدا کی دین اور قبلۂ محترم حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کا طفیل ہے جو کچھ الٹا سیدھا لکھ پڑھ لیتا ہوں ورنہ حقیقت معلوم!

میں ذی طفلی کے خواب لطیف سے چونک کر جب آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایک ایسے شعر ساماں ماحول میں پایا جہاں لوگوں کی قسمتیں بنا کرتی ہیں۔ فطری اور موروثی وجدان نے انگڑائی لی نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ سال کی عمر سے ادبی اور شعری جنون کو اپنے اندر جذب کر لیا عرصہ تک اپنے ذوق کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ جناب ساغر صاحب نظامی نے جو ۱۹۲۱ء سے میرے ہی یہاں مسلسل قیام پذیر تھے جوانی پر ۴۶ رباعیاں لکھیں۔ میرے قلم نے بھی الٹی سیدھی ۲۰ رباعیاں لکھ ڈالیں جن میں ایک مصرعہ مجھے اور دیگر حضرات کو ابتک یاد ہے۔ وہ یہ تھا ؎

"ساغر کی جوانی ہے جوانی میری" ساغر صاحب نے قبلہ مولانا سے میری موزونیٔ طبع کا ذکر کیا لیکن تعلیمی سلسلہ کی وجہ سے مولانا نے اس طرف متوجہ ہونے سے منع فرمایا۔ آہستہ آہستہ عمر کے ساتھ ساتھ شعری استعداد خود بخود بڑھتی گئی۔ اپنی عمر شاعری میں تیس میڈل بھی حاصل کئے جن کا ذکر بھی اب طبیعت پر بار گذرتا ہے لیکن ایک وہ زمانہ تھا کہ تمغہ ملنے پر خوشی اور مسرت کا ایک طوفان دل میں موجزن ہو جاتا تھا۔

قصر الادب سے "پیمانہ" جاری ہوا اور انتہائی کامیابی کیساتھ نکلتا رہا اُسے دیکھ کر دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ کاش میں بھی ایڈیٹر ہوتا غرض بچپن کی خواہشات بھی ادبی ہی تھیں ۱۹۲۹ء میں "تاج" جاری ہوا ۱۹۳۱ء میں اس کیلئے کئی مضامین لکھے اُس کی نشر و اشاعت میں اسکول کے وقت کے بعد مدد دینا میرے فرائض میں سے تھا۔ "شاعر" ۱۹۳۰ء سے جاری ہوا۔ عرصہ تک "تاج" و "شاعر" کا ناظم رہا۔ حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ، اور برادرِ محترم حضرت منظر صدیقی کی معیت میں اور ان کی ہدایت سے صحافتی لائن میں ایک خاصہ درک حاصل ہو گیا۔ آخر ۱۹۳۳ء میں حضرت مولانا مدظلہ نے قصر الادب کا انتظام میری کمزور کاندھوں پر ڈال دیا۔ اور پھر ۱۹۳۵ء میں "شاعر" کی ادارت کا اہم فرض بھی میرے ہی سپرد کر دیا۔ اب قصر الادب کے ہر شعبہ کا انتظام و انصرام مطلقاً میرے ذمہ ہے۔ اور میرے چھوٹے بھائی حافظ سجاد حسین صدیقی میرے معاون کار ہیں مجھے ہمیشہ اس چیز کا احساس بے چین رکھتا ہے کہ میں ابھی قصر الادب کے شعبہائے ادب کو اس معیار پر نہیں پہونچا سکا ہوں جو میرا مطمحِ نظر ہے۔ ۱۹۳۵ء میں بمبئی کا سفر کیا۔ گو میں شاعر و ادیب کی حیثیت سے وہاں نہیں گیا تھا لیکن بمبئی کے اخبارات اور وہاں کی انجمنوں نے اپنے شذرات میں میرا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے انھیں میں خود بھی ابتک نہیں سمجھ سکا ہوں۔ میرے لئے کچھ لکھنا بجز حسن ظن کے اور کچھ نہ تھا ورنہ کہاں پندرہ سولہ سال کی عمر اور کہاں شعری ہنگامہ آرائیاں ۱۹۳۶ء میں قصر الادب کی مطبوعات اور "شاعر" کی اشاعت کے سلسلے میں پھر ایک طویل سفر کیا جس کی کامیابی بھی میرے قیاس سے باہر ہے۔ میں اپنے میں وہ چیز نہیں پاتا جس کو لوگ سراہتے ہیں۔

حقیقت الامر اور ایمان کی بات یہ ہے کہ ذوقِ ادب میرا موروثی حصہ ہے۔ شاعری بغیر سیکھے آگئی ہے۔ اُردو ادب کی ہر صنف پر کچھ نہ کچھ لکھ لیتا ہوں ابتک مقامی اور غیر مقامی بیسیوں مشاعروں میں شریک ہو چکا ہوں۔ مشاعروں کی شرکت نہ پہلے میرے لئے کسی خاص کشش کی حامل تھی اور نہ اب ہے۔ بدرجۂ مجبوری شریک ہوتا ہوں گو اپنی ذات خاص کیلئے مہینوں شعر نہیں لکھتا لیکن طبیعت کی جولانی پھر بھی نہیں جاتی میں اپنے خاندانی اور موروثی فیض کی بدولت شعر کہنے کیلئے کسی وقت و مقام کا پابند نہیں طبیعت ہر وقت موزوں رہتی ہے۔ ایک عرصہ سے اصلاحی کام بھی میرے سپرد ہے۔

میرا دائرۂ احباب نہایت محدود بلکہ محدود تر ہے۔ گوشہ نشینی میرے لئے وجہ سکون ہے اور نام و نمود وجہ خلش۔ سادگی اور مشرقی تہذیب میرا مشرب ہے۔ ہادرواسم جاریہ سے بچ کر اسلام کی تمام احکامات پر کاربند رہنا میں ضروری خیال کرتا ہوں۔ اسکے علاوہ میری زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جو صرف میری ہی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے میں کبھی کبھی کچھ سوز حاصل کر لیتا ہوں۔ میرا کلام اس قابل تو نہیں کہ اسے ناظرین کے سامنے پیش کر سکوں لیکن ایسا نہ کرنا بھی طریقہ کار کے خلاف ہے۔ اس لئے چند شعر پیش کرتا ہوں۔

نمونۂ تغزل

نیاز و ناز میں یہ امتیازِ این و آں کبتک　　میرا ذوقِ جبیں کب تک تمہارا آستاں کبتک
نیازِ عشق کو ہو کچھ تو نازِ حسن سے قربت　　جبین و آستاں آخر زمین و آسماں کبتک
تری جلوے تری جلوے مری نظریں مری نظریں　　تری جلوے مری نظروں کا لیں گے امتحاں کبتک

ہے آنسوؤں میں تیرا تصور بسا ہوا　　تاروں میں پھر رہا ہوں تجھے ڈھونڈتا ہوا
جس نے مری نظر کو دیا ذوقِ جستجو　　وہ خود ہی تھا حجابِ نظر میں چھپا ہوا
قانونِ بزمِ حسن یہ ہے مجھ کو اعتراض　　جائز نہ تھا کرم تو ستم کیوں روا ہوا
اے قبر تیری رہے جو نہ ہو تجھ کو ناگوار　　آیا ہے اک غریب مسافر تھکا ہوا
چھینٹے پڑے ہیں خون کے زنداں سے باغ تک　　شاید کوئی بہار کا قیدی رہا ہوا

ازل کیا اور ابد کیا ہر جگہ گذریگی مشکل سے　　نہ جب تسکین تھی دل سے نہ اب تسکین ہے دل سے
میں کیا اٹھا ہوں اٹھی ہے قیامت تیری محفل سے　　کہ اب مشکل سے بیٹھوں گا اگر اٹھا ہوں مشکل سے
طویل افسانۂ اندوہ کی تمہید ہوتا ہے　　وہ اک لمحہ خوشی کا جو کبھی ملتا ہے مشکل سے
محبت کی روش میں کاش کوئی انقلاب آتا　　یہ حسرت ہے کہ اپنا دل بدل لیتا ترے دل سے
اثر ان کا ہے جبر ان کا سب انکے انجمن ان کی　　وہ جب چاہیں جسے چاہیں اٹھا دیں اپنی محفل سے

راہِ طلب کی ٹھوکریں فطرتِ ذوقِ عشق ہیں　　بھٹکے ہوؤں کو خضر بھی تیری گلی بتائے کیوں؟
لے مری نالۂ رسا جاکے یہ ان سے پوچھ آ　　رات گئی سحر ہوئی۔ آنے کو تھے نہ آئے کیوں

صبحِ بہار سے ہے وہ کیف نسترن میں　　دوشیزگی ہو جیسے اک رات کی دلہن میں
داغوں بھرے جگر پر بارش ہے آنسوؤں کی　　موتی برس رہے ہیں گویا مرے چمن میں
بس ہو تو جا کے سے بھی صیاد قید کرلا　　میں ہوں قفس میں لیکن دل ہے مرا چمن میں
اعجاز سیرگاہِ عالم مرا وطن ہے
آتی ہے سیر کرنے دنیا مری وطن میں
وہ میری سجدے جو صرفِ حریمِ ناز ہوئے　　تری جبیں کے اجالوں میں پائے جاتے ہیں

انہیں ہے شوقِ تجلی کوئی کلیم تو ہو　　نگاہ دیکھ کے جلوے دکھائے جاتے ہیں

برائے دفن منت کیا زمینِ کوئے جاناں کی　　کوئی مٹی بھی دیدے گا کہ میت ہو مسلماں کی
چمن میں پھول کلیاں اور بن میں سبزہ رعنا　　یہ سب نقش آفرینی ہے ترے حسنِ فراواں کی
فسانہ میں نئی پورا پڑھ لیا دنیائے فانی کا　　نظر افروز نکلی چاندنی گو غریباں کی
جنوں ساماںیاں محشر میں بھی عریاں اٹھا لائیں　　ذرا وہ دھجیاں لا نامری چاکِ گریباں کی

تمام عمر کٹی عرض و التجا کرتے　　ہمیں تو شرم سے آتی ہے اب دعا کرتے
ہمارے بس میں جو ہوتا ترا غمِ پنہاں　　تو ہم خدا کو بھی اس سے نہ آشنا کرتے
رہی حجاب نشیں یہ تو اختیار میں تھا　　مگر خیال کی وہ روک تھام کیا کرتے

تو کیوں اے طالبِ دیدار اتنا محوِ حیرت ہے　　انہیں جلوہ دکھا کر پردہ کر لینے کی عادت ہے
چمن والو ہمارے آشیاں کی بھی خبر رکھنا　　پھر آئیں گے اگر تقدیر کی گردش سلامت ہے

نمونۂ نظم

"آنسو"

جذباتِ لطیف کا سمندر　　موجیں لیتا تھا دل کے اندر
مستی حد سے بڑھی ہوئی تھی　　رگ رگ میں ندی چڑھی ہوئی تھی
رنگین خیال آرہے تھے　　طوفان نئے اٹھا رہے تھے
نظروں کو تھا انتظار ان کا　　آنکھوں کو تھا اعتبار ان کا
آخر وہ نہ آئے رات گذری　　وہ عمرِ توقعات گذری
سمٹا وہ خیال کا سمندر　　سوزِ غمِ ہجر سے بدل کر
اک آگ لگی دل و جگر میں　　تاریک ہوا جہاں نظر میں
چھانے لگی شمع پر اداسی　　طاری ہوئی دل پہ بدحواسی
دل بن گیا خونِ کامرانی　　پھر خون سے ہوگیا

پانی اُمڈا سحاب بن کر   حسرت ابھری حباب بن کر
ٹپکا آنکھوں سے اک سمندر   مثلِ گوہر مثالِ اخگر

یہ عشق و وفا کی آبرو ہے
آنسو نہیں عطرِ آرزو ہے

نمونۂ نثر

ماخوذ از :- "عید سے پہلے اور عید کے بعد"

چاند ہوگیا۔ ثریا نے بہت بیتابانہ انداز سے کہا اور مہتابہ کیساتھ دوڑتی ہوئی بالاخانہ پر چڑھ گئی۔

یک بیک دونوں کے ہاتھ دعا کیلیئے اٹھ گئے۔ مہتابہ اپنی دعا ختم کر چکی تھی لیکن ثریا کے ہاتھ ہنوز اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی بلوری آنکھیں چاند کی سیمیں اور ہلکی نقوش پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔ اس کی معصوم خد و خال اس وقت انتہائی تابناک اور دلفریب ہو گئے تھے....... ابھی چند لمحے بھی نہ گذرے تھے کہ اس کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہوا چہرے سے حزن و ملال کے آثار نمایاں ہوئے اور دو چمکدار موتی پلکوں سے مس ہوتے ہوئے اس کی ملیح رخساروں پر ڈھلک آئے۔

ابتک تو مہتابہ خاموش کھڑی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ ثریا دعا مانگ رہی ہے لیکن اس وقت اسے کچھ اور ہی نظر آیا۔ اس فوری تبدیلی سے وہ بے چین ہوگئی اور جلدی سے ثریا کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

مہتابہ - ارے لگی یہ کیا۔ خیر تو ہے۔ برس کے برس دن یہ کیا بدشگونی۔

ثریا اس غیر متوقع مداخلت سے کچھ سراسیمہ سی ہوگئی اور جلدی جلدی ساری کے آنچل سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولی۔

"توبہ - توبہ بہن کسی چیز کو غور سے دیکھنے سے بھی آنکھوں پر کتنا زور پڑتا ہے۔ اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی

(باقی صفحہ ... پر)

اعجاز صدیقی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کی اصلاح

جنسِ وفا ہے جنسِ سرِ رہگذر کہیں؟   اس عشق کی نہ پوچھ جو ملتا ہے ہر کہیں
دیوانے کا پتہ نہ چلا عمر بھر کہیں   ص   اک نقشِ پا ملا تھا سرِ رہگذر کہیں
کرتا ہوں ہر مقام پہ سجدے با ایں امید   شاید ~~کہ مل ہی جائے~~ (سر آشنا ہو) ترا سنگِ در کہیں
ہنس تو رہے ہو سُن کے مرا قصۂ ~~الم~~ (حیات)   رونا پڑے ~~پھر اب~~ (گا) نہ تمہیں عمر بھر کہیں
تم دل کو دیکھتے ہو تمہیں دیکھتا ہوں میں   میری نظر کہیں ہے تمہاری نظر کہیں
اے اہلِ ہوش یہ سرِ دیوانِ عشق ہے   وحشی کے دست و پا ہیں کہیں اور سر کہیں
~~تو~~ (ہاں) میری پچھلی رات کی نالوں سے ~~ہمنشیں~~ (احتیاط!)   چھو لے نہ بابِ عرش کو آہِ سحر کہیں
دل اور جگر کا ہو مجھے کس طرح امتیاز   ٹھہرے بھی اک مقام پہ تیری نظر کہیں
اے کاش صبحِ حشر ہو انجامِ زندگی   اے کاش ہو نہ یہ بھی فریبِ نظر کہیں
دیر و حرم ~~فریب ہیں~~ (سے پاس ہیں) اہلِ نگاہ کو   ~~ایسے میں ہو بھی جائیں نقاب~~ (کیا ہو اگر وہ ہونے لگیں) جلوہ گر کہیں
اے محوِ دید ہاتھ نہ پھیلا نظر ملا   ص   پیتے ہیں جلوؤں سے شرابِ نظر کہیں

اعجازؔ ان کی انجمنِ ناز میں کہاں
ہوگا پڑا ہوا وہ سرِ رہگذر کہیں
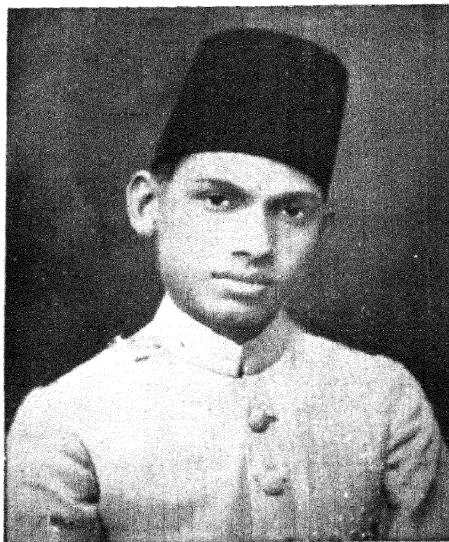
The "SHAIR" Agra.
— MAY, 1937 —

عزیزی میاں مظہر حسین صدیقی سلمہٗ
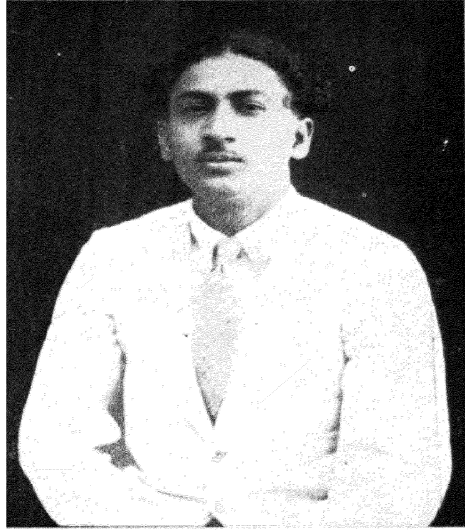
مسٹر اے-بی فلپس صاحب بی اے الہ آبادی

(اثر) محمد صغیر صاحب صدیقی اکبرآبادی (۷)

آپ کا اصلی وطن آگرہ ہے ۱۸۹۲ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد صدیق (مرحوم) تھا جو ریلوے میں ملازم تھے اور آپ کے نانا منشی امیر خاں الہ آباد میں انسپکٹر آبکاری تھے۔ اثر صاحب کی عمر اس وقت تقریباً پینتالیس ۴۵ سال ہے۔ اور آپ ڈی ٹی ایس آفس الہ آباد میں ٹائپسٹ ہیں۔ عربی و فارسی کی تعلیم مکان پر مکمل کی اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ میں داخل ہوئے اور انگریزی تعلیم حاصل کی اس کے بعد ایک مقامی کالج میں بھی کچھ زمانہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانہ میں آپ کو شاعری سے ذوق پیدا ہوا، طبیعت فطرتاً شاعرانہ پائی تھی۔ فارسی و عربی کی تحصیل سے ذہن نکھر چکا تھا اس لئے شعر کہنے میں قدرے کامیابی حاصل ہوئی اور کبھی کبھی کہنے لگے۔

عروس البلاد اکبرآباد کا یہ وہ عہد زریں تھا کہ ہر طرف شعر و ادب کی جلوہ باری تھی ایک طرف مسندِ ادب پر مرزا رئیسؔ متمکن تھے تو ایک طرف سجادۂ شاعری پر مولانا نثار اکبرآبادی رونق افروز تھے اور ایک طرف ماسٹر تصوف حسین صاحب واصف اکبرآبادی اور حضرتِ عالی سے بزمِ سخن گونج رہی تھی۔ خوب خوب دادِ سخن دی جا رہی تھی اور شاعرانہ ماحول کمال و اہلِ کمال کے وجود ہائے منور سے جگمگا رہا تھا۔ اثر صاحب نے اپنی تہذیب و تربیت کیلئے واصف صاحب اکبرآبادی کو تجویز کیا اور انھیں سے اصلاح لینے لگے جس راستے پر واصف صاحب گامزن تھے اسی کی اثر صاحب نے تقلید کی جو ماحول اور زمانہ کے مطابق ایک کامیاب راستہ تھا۔ اثر صاحب نے واصف صاحب کی توجہ سے استفادہ حاصل کیا اور عوام میں آپ کے کلام کی پسندیدگی کی موج دوڑ گئی۔

انقلابِ زمانہ سے آپ کو سنہ ۱۹۱۶ء میں ملازمت کے سلسلے میں آگرہ چھوڑنا پڑا اور نینی تال، کانپور الہ آباد وغیرہ میں زندگی گذارنے کیلئے جانا پڑا مگر ان مقامات سے بھی آپ ذریعۂ خط و کتابت واصف صاحب سے مشورہ لیتے رہے۔ بالآخر جب اثر صاحب ٹونڈلہ ڈی ٹی ایس آفس میں ملازم ہو گئے تو واصف صاحب بیمار ہوئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ مشفق استاد کی جانکاہ موت سے اثر صاحب نے بہت اثر لیا اور عرصہ تک شعر و شاعری کی طرف طبیعت رجوع نہیں ہوئی۔ شعر کہتے تھے مگر دل سے نہیں کہتے تھے۔

عرصہ دراز کے بعد ۱۹۱۸ء میں ٹونڈلہ جیسی بستی میں مولانا سیماب مدظلہ کا کچھ دنوں قیام رہا آپ کی تشریف آوری سے ایک نئی زندگی پھیل گئی ادبی مجالس منعقد ہونے لگیں شمعِ کمال نے پروانے پیدا کر دئے اور انجمن سخن انوار سے جگمگانے لگی یہیں اثر صاحب نے حضرت مولانا سیماب سے مشورہ لینا شروع کیا تھوڑے ہی دنوں کے بعد اثر صاحب کی شاعری میں ایک حیرتناک انقلاب پیدا ہو گیا۔ اکثر مولانا آپ کو ہندوستان کی ادبی مجالس میں اپنے ہمراہ لطفاً لیجاتے تھے۔ اب آپ آگرہ کے پرانے کہنے والوں میں بھی گنے جاتے ہیں۔ آپ کے اشعار میں زبان لطیف تغزل بلند اور شوخی بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔ الہ آباد اور قرب و جوار کی ادبی صحبتوں میں آپ اکثر و بیشتر شرکت فرماتے ہیں اور خوب خوب دادِ سخن حاصل کرتے ہیں مولانا سیماب مدظلہ العالی سے آپ کو خاص قسم کا لگاؤ ہے۔ آپ جب بھی آگرہ تشریف لاتے ہیں اپنے شفیق استاد کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے ہیں۔ مولانا بھی آپ سے محبت فرماتے ہیں۔ آپ غزل کی طرح نظم بھی خوب کہتے ہیں جو آگرہ اسکول کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ انتہائی سنجیدہ باوضع اور بااخلاق انسان ہیں۔

نمونۂ تغزل

کردیا دنیا کو بجلی آپ کی تصویر نے ۔۔۔ طور پر شمعیں جلادیں حُسن کی تنویر نے
دید کے قابل ہیں زنداں میں مری آرائشیں ۔۔۔ مجھ کو اک زیور نیا پہنا دیا زنجیر نے
آپ کے سر کیوں رکھوں دیوانگی کی تہمتیں ۔۔۔ کردیا وحشی مرے ذوقِ گریباں گیر نے
میں رہا ہو کر درِ زنداں پہ بیٹھا رہ گیا ۔۔۔ کہدیا کیا جانے کیا تری ہوئی زنجیر نے

صحنِ گلشن ہو کہ صحرا ہو کہ بزمِ انبساط ۔۔۔ بن تری ہر جا نظر آتی ہے حیرانی مجھے

یہ سُرخ سرخ پھول نہیں لالہ زار میں ۔۔۔ نکلی ہے رنگ بن کے تمنا بہار میں

یہ کس حسیں نے جلوۂ روشن دکھادیا ۔۔۔ دنیا کو بجلیوں کا خزانہ بنا دیا

ان بتوں نے تو خدا یا ہم کو ۔۔۔ بندۂ کفر بنا رکھا ہے
اُن سے ملنے کی اثر فکر کرو ۔۔۔ نالہ و آہ میں کیا رکھا ہے

دشمن کو بھی ہم اپنا بنا لیتے ہیں اکثر ۔۔۔ ہوتے ہیں بڑے کام محبت کی نظر سے
رو کے سے بھی رکتا نہیں پھولوں کا تبسم ۔۔۔ فطرت نے یہ کیا بات کہی بادِ سحر سے
کیا یہ بھی ملاقات میں ہے کوئی ملاقات ۔۔۔ چھپتے بھی ہو ملتے بھی ہو تم اپنے اثر سے

نگاہِ یار بنکر درد دلمیں کوندجاتی ہے ۔۔۔ خدا جانے یہ کس نے قلب میں برقِ تپاں رکھدی

نمونۂ نظم

صبح

اے دوستہ آ کہ سب کو ترا انتظار ہے ۔۔۔ گلشن تمام تیری لئے بیقرار ہے
ہر ذرّہ تیرے نور سے ہے مشرقِ امید ۔۔۔ ہر شے زمیں سے تا بہ فلک نور بار ہے
تارے وہ جارہے ہیں تجھے ڈھونڈتے ہوئے ۔۔۔ تیری جمال پہ مہِ کامل نثار ہے
کھولی کلی نے آنکھ تری اشتیاق میں ۔۔۔ نرگس کو بار بار ترا انتظار ہے
پھولوں میں صرف ہے تری جلووں کی روشنی ۔۔۔ تختہ چمن کا آئینۂ زرنگار ہے
لیتا ہوا وہ نام ترا دیکھ چل دیا ۔۔۔ وہ سامنے جو کوہ پہ اک آبشار ہے
تو آ کہ رسمِ محفلِ نوروز ہو ادا ۔۔۔ اس کا تری ورود پہ دار و مدار ہے
تو آ کہ آفتاب ہے مقدم میں گرم خیز ۔۔۔ تیرے بغیر بزمِ جہاں پر غبار ہے

از مستیٔ نظر درِ میخانہ باز کن
از نورِ خویش صبحِ چمن را طراز کن

جناب ابو محمد صغیر صاحب اثر صدیقی اکبرآبادی کی غزل پر
حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہٗ کی اصلاح

(اصلاح: متحیر ہوئی منہ دیکھ کے)
چھپ کے پردے میں جو چمکا رُخِ روشن ان کا ۔۔۔ ~~بکھتی رہ گئی سن آج تو چلمن~~ ان کا
(اصلاح: ان کی خلوت ہے کہاں ۔۔۔ نہ کچھ دیگا)
~~راز جلووں کا فرو طور سے پوچھو~~ تو سہی ۔۔۔ ~~کچھ بتا دیگی~~ پتہ وادیٔ ایمن ان کا
(اصلاح: حشر میں فریاد کروں ۔۔۔ لب پہ ہو نامِ خدا)
آرزو یہ ہے کہ یوں ~~جلووں میں پیش داور~~ ۔۔۔ ~~لب پہ گلہ ہو مرے~~ ہاتھ میں دامن ان کا
(اصلاح: عالمِ شب)
~~رات کالی~~ ہے کہ ہے زلفِ سیہ کا سایہ ۔۔۔ مہِ انور ہے کہ ہے عارضِ روشن ان کا
گھل گئی پھول بھی کلیوں میں ترا دیتا آئی ۔۔۔ گوندھنے بیٹھی جو گجرا کبھی مالن اُن کا
(اصلاح: نیند آجائے اسے کیوں نہ ہمیشہ کیلئے)
~~حور کا لطف اٹھاتا ہے زانوں سے مجھے~~
(اصلاح: مجھے دیتا ہے ہوا خلد کی)
~~مجھ کو جنت کی ہوا دیتا ہے~~ دامن ان کا

اکمر | پیرزادہ شاہ صفدر عالم اکبرآبادی | ۸

آپ نجیب الطرفین پیرزادے ہیں آپ کے والد بزرگوار کا سلسلۂ نسب مسلمانوں کے خلیفۂ دوم اور اسلام کے جلیل القدر جرنل امیرالمومنین حضرت عمر بن الخطابؓ سے ملتا ہے اور آپ حضرت عمرؓ کی سینتیسویں پشت میں ہیں جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے بیٹے عبداللہ ان کے بیٹے منصور البلخی ان کے بیٹے سلیمان ان کے بیٹے حضرت ادہم ان کے بیٹے خالق العالم بادشاہ بلخ ان کے بیٹے حضرت ابراہیم ان کے بیٹے محمد اسحاق شاہ ان کے بیٹے ابوالفتح شاہ ان کے بیٹے عبداللہ واعظ الاکبر صاحب ان کے بیٹے واعظ الاصغر صاحب ان کے بیٹے مسعود شاہ صاحب ان کے بیٹے سلیمان شاہ صاحب ان کے بیٹے سامان شاہ صاحب ان کے بیٹے محمود المعروف پٹیمان شاہ صاحب ان کے بیٹے نصیرالدین شاہ صاحب ان کے بیٹے شیخ احمد صاحب المشہور فدح شاہ کابل ان کے بیٹے شہاب الدین شاہ صاحب ان کے بیٹے علی نصر شاہ صاحب ان کے بیٹے علی شاہ صاحب ان کے بیٹے محمد شاہ عثمان صاحب ان کے بیٹے شاہ سلیمان صاحب ان کے بیٹے شاہ محمد عمر صاحب ان کے بیٹے محمد شاہ صاحب ان کے بیٹے منصور شاہ صاحب ان کے بیٹے قاضی صباح الدین محمود صاحب ان کے بیٹے شیخ جلال الدین صاحب تھانیسری ان کے بیٹے حافظ عبدالاحد صاحب ان کے بیٹے شاہ عبدالبقا صاحب ان کے بیٹے شاہ محمد منعم صاحب ان کے بیٹے شاہ غریب اللہ صاحب ان کے بیٹے شاہ عبداللہ صاحب ان کے بیٹے مولوی محمد حباب احمد صاحب ان کے بیٹے مولوی ضیا احمد صاحب ان کے بیٹے مولوی غلام محمد صاحب ان کے بیٹے مولوی غلام رسول صاحب اُن کے بیٹے غلام قادر صاحب ان کے بیٹے شاہ صفدر عالم فاروقی۔

اپنی والدہ محترمہ کی جانب سے بھی آپ صاحب نسبت ہیں اور حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی سولہویں پشت میں ہیں شیخ سلیم چشتیؒ اکبر اعظم شہنشاہ ہند کے پیر و مرشد تھے۔ آپ ہی کی دعاؤں سے شاہزادہ جہانگیر پیدا ہوا تھا اور آپ ہی کی بدولت فارسی کا مشہور شاعر عرفی عرفی بنا فتحپور سیکری جہاں ان بزرگ کا مزار شریف ہے۔ اپنی عمارات کی لحاظ سے ہند و بیرونِ ہند میں مشہور ہے۔ اور عہد اکبری میں ۸ سال تک مغل دارالخلافہ رہا ہے۔

حضرت شاہ جلال الدین تھانیسری کے زمانے کے بہت بعد تک شاہ صفدر عالم کے خاندان کی سکونت تھانیسر ہی میں رہی جو ہندوؤں کی مذہبی روایات اور تاریخی لحاظ سے خاص مقام ہے حضرت شاہ جلال الدین بڑے پایہ کے بزرگ تھے آپ کے والد ماجد قاضی صباح الدین محمود بلخ سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا سترہ سال کی عمر میں تحصیل علوم دینی صرف و نحو حدیث و تفسیر و فلسفہ وغیرہ سے فراغت پائی یہ بزرگ علمی قابلیت میں علامہ دہر تھے فریضۃ الاولیا اور بستانِ معرفت وغیرہ کتابوں میں آپ کے اخلاق و سیرت کا حال درج ہے آپ نے ۹۵ سال کی

عمر میں ۲۵ ذی الحجہ ۱۰۸۹ھ کو وفات پائی آپ کا مزار تھانیسر ہی میں ہے انہیں تاریخوں میں آپ کا عرس بھی ہوتا ہے۔

اکبر اعظم نے کمال و علم سے متاثر ہوکر کچھ زمین بطور معافی دی تھی اسی زمین پر آپ درس فرمایا کرتے تھے مگر زمانہ مابعد میں شیخ کی اولاد اور بعض سکھوں سے اس زمین کے متعلق جھگڑا ہوا اور یہ معافی اُن کے ہاتھ سے نکل گئی چنانچہ شیخ کی اولاد میں سے کچھ تھانیسر میں رہ گئے کچھ دوسرے شہروں کو چلے گئے اور اس خاندان کے چند بزرگ مولوی ضیا احمد صاحب المعروف بہ ضیا الحق اور مولوی برکات الحق اور مولوی نور الاسلام صاحب آگرہ تشریف لائے چنانچہ مولوی ضیا الحق صاحب کے ورود آگرہ سے اب شاہ صفدر عالم صاحب احمر کی خاندان کو آگرہ میں قیام کرتے ہوئی پانچویں پشت ہے شاہ صفدر عالم صاحب احمر بمقام غالب پورہ خورد بائی کی منڈی آگرہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مکان پر پائی نویں جماعت تک شعیب محمدیہ اسکول آگرہ میں تعلیم حاصل کی اسکے بعد علیگڈھ انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی کے میٹرکس اور ایف اے پاس کیا علی گڑھ کی آب و ہوا ناموافق ہونے کی وجہ سے آپ اجمیر گورنمنٹ کالج میں داخل ہوگئے اور وہاں بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں آپ اپنی درسگاہوں میں ایک بلند ذہنیت کے طالب علم گنے جاتے تھے آپ نے ہمیشہ ہر درجہ میں فارسی انگریزی اردو اور دینیات وغیرہ میں امتیازی کامیابی حاصل کی بحث و مباحثہ کی انجمنوں میں آپ کے دم سے رونق رہتی تھی آپ ایک بہترین کھلاڑی بھی تھے۔ گورنمنٹ کالج اجمیر کی بزم ادب اردو کے سکریٹری تھے۔ آپ کی مساعی سے کالج میں ہمیشہ ادبی مجالس اور کامیاب مشاعرے منعقد ہوتے رہے۔

آپ خلیق وسیع الخیال خوش فکر اور ملنسار نوجوان ہیں آپ فطری شاعر ہیں۔ حضرت احمر کو تعلیمی مشاغل سے کم فرصت ملی تاہم آپ کی شاعری میں رنگ جدید اور اپنے استاد کے اسکول کی اکثر خصوصیات موجود ہیں آپ کے کلام میں رنگینی درد کیفیت اور جذبات پائے جاتے ہیں آپ ایک خوش فکر نوجوان ہیں اور باوجود عدیم الفرصت ہونے کے آپ نے مشق کلام میں کافی محنت کی ہے۔ آپ ۱۹۲۵ء میں مولانا سیماب مدظلہ سے مشرف بہ تلمذ ہوئے۔

نمونۂ تغزل

غم آفریں ہے نگاہِ خفا کی بے سببی — کہ شرمسارِ وفا ہے مری جفا طلبی
وہاں کہاں ارنی گوئی طور جا پہنچا — جہاں ہے جنبشِ لب انتہائے بے ادبی
خدا کرے رہے سکرِ شباب میناگوں — پلا دو اپنے لبوں سے فشردہ عنبی
جمالِ حور و جلالِ مہ و سہا معلوم — تمہارے حسن کی دیکھی ہے میں نے بوالعجبی
کتابِ عشق میں تھا لفظ العطش موہوم — تری لبوں نے سکھایا مذاقِ تشنہ لبی

غرورِ ناز و نعم سے گریز ہے احمر
ہمیں ہیں ننگِ شرافت شعارِ بولہبی

تیری صباحتوں کا تصور اگر کریں — ہم چاندنیں حیاتِ تخیل بسر کریں
درمانِ دل کریں کہ دوائے جگر کریں — جب آچکا ہو وقت تو کیا چارہ گر کریں
وہ دعوتِ نگاہ گوارا اگر کریں — دل کو خرابِ ناز سرِ رہگذر کریں
سوزِ دروں کی آگ کو آنکھوں سے لاگ ہے — کیا دو گھڑی کو نازشِ دامانِ تر کریں
نالہ کریں بلند کہ دل خون ہو چکا — کب تک خیالِ جنبشِ دیوار و در کریں
طولِ بساطِ عمر فریبِ خیال ہے — کیا اعتبارِ زندگیٔ مختصر کریں

آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سید محمد عبد الرحمٰن صاحب ہے جو ریٹائرڈ سب انسپکٹر ہیں اور سہسرام میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی ولادت مارچ سنہ ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ اخگر صاحب کا سلسلۂ نسب دیوان شیخ فرید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ عرف شاہ بودھن دیوان قدس سرہٗ سے ملتا ہے جو بڑے پایہ کے شیخ اور صاحب سجادہ تھے آپ کا سالانہ عرس نہایت تزک و احتشام سے ہوتا ہے۔ آپ کا مزارِ مبارک بھی سہسرام کے وسط میں ہے۔ اور اب تک صدہا معتقدین آپ کے چشمۂ فیض و برکت سے سیراب و مستفیض ہوتے ہیں اس لئے بہ لحاظ سیادت و امارت اخگر صاحب کا خاندانِ عظمتِ قدیم کا حامل ہے۔

اخگر صاحب کو پہلے تحصیلِ علم کا شوق پیدا ہوا چنانچہ آپ نے بہت دنوں تک مدرسۂ عالیہ خانقاہ سہسرام میں تعلیم پائی اس کے بعد انگریزی کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ اور آپ نے میٹرک کا امتحان دیا۔ علمی استعداد بہت اچھی ہے اسکول میں بھی ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے۔ طبیعت میں ایک خاص قسم کی جودت ہے۔ ذہانت و سنجیدگی انتہائی پائی جاتی ہے

تعلیمی زمانہ ہی میں اخگر صاحب کو شاعری کا ذوق ہوا۔ چونکہ طبیعت میں سوز و گداز فطرت نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا اس لئے شعر بھی سوز میں ڈوبے ہوئے نکلنے لگے۔ آواز انتہائی شیریں پائی ہے اور اس میں اس درجہ موسیقیت ہے کہ سننے والا تڑپ جاتا ہے۔ جب آپ کو شعر کہتے ہوئے کچھ زمانہ ہوگیا تو آپ کو کسی رہبر کی تلاش ہوئی چنانچہ آپ کی نظرِ انتخاب حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی پر پڑی اور آپ مارچ سنہ ۱۹۳۳ء میں مولانا مدظلہ کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ اس وقت سے اب تک سلسلۂ اصلاح جاری ہے آپ اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں آپ کے کلام و طرزِ ادا سے سامعین بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آپ کو نثر و نظم دونوں میں یکساں دستگاہ ہے

نمونۂ تغزل

بیٹھے بیٹھے رلا دیا تم نے — کیا فسانہ سنا دیا تم نے
ڈال کر دل میں عشق کی بنیاد — اس کو کعبہ بنا دیا تم نے
بزمِ گلشن میں ہنس کے اے کلیو — جانے کس کا پتہ دیا تم نے

زہر کو امرت، جفاؤں کو وفا سمجھا تھا میں — اُن کے دل میں کیا بھرا تھا اور کیا سمجھا تھا میں
کیا تعجب سر جو تیرے آستاں پر جھک گیا — تجھ کو دنیائے محبت کا خدا سمجھا تھا میں
بے محابا شوخیاں مجھ سے تری اچھی نہیں — اے خیالِ یار تجھ کو پارسا سمجھا تھا میں

مقدر ہے جو ذرہ پائمالِ ناز ہوتا ہے — زمانے کی نگاہوں میں وہی ممتاز ہوتا ہے
چمن میں اوس پڑ جاتی ہے کلیوں کی تبسم پر — ہماری داستانِ غم کا جب آغاز ہوتا ہے
مری وحشت پہ اہلِ ہوش اگر ہنستے ہیں ہنسنے دو — وہ کیا جانیں جنوں میں دل کا کیا انداز ہوتا ہے
الٹ دیتی ہے پردے ہوش کی جب میری بیہوشی — نظر کے سامنے اُن کا حریمِ ناز ہوتا ہے

کوئی بے پردہ دل میں آ رہا ہے — حجاب اب دور ہوتا جا رہا ہے
بھلاتا جا رہا ہوں دل سے جس کو — وہ رہ رہ کر مجھے یاد آ رہا ہے
دلاسا دے رہا ہوں لاکھ دل کو — مگر کمبخت بیٹھا جا رہا ہے
تصور کی فسوں کاری کے صدقے — دمِ گریہ کوئی سمجھا رہا ہے

فسانہ میری بربادی کا اخگر
چمن کا پتہ پتہ گا رہا ہے

مار ڈالے گا یہ سماں پیارے — ہم یہاں اور تم وہاں پیارے
کششِ دل کا سحر دیکھ لیا — آگئے خود کشاں کشاں پیارے
اب تو پہلو میں میرے دل کی جگہ — سوختہ سا ہے اک نشاں پیارے
دلِ اخگر میں اب بھی باقی ہیں — عشق کی شعلہ کاریاں پیارے

نمونۂ نظم «آجا»

(۱) دریائے موجزن میں کہسارمیں چمن میں — سنبل کے پیچ و خم میں پھولوں کی پیرہن میں
مہتاب کی ضیا میں، خورشید کی کرن میں — میں تجھ کو ڈھونڈتا ہوں تاروں کی انجمن میں
اے جلوۂ حقیقت سوئے مجاز آجا

(۲)

اگلی سی جگنوؤں میں تابندگی کہاں ہے — تاروں میں وہ نظر کش رخشندگی کہاں ہے
بزمِ نشاط میں وہ پایندگی کہاں ہے — رقص و سرود والی اب زندگی کہاں ہے
ہے سرد محفلِ دل لے نغمہ ساز آجا

سید محمد موسیٰ صاحب اخگر سہسرامی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ کی اصلاح

مقدر ہے جو ذرہ

~~جو ذرہ قسمتوں سے~~ پائمالِ ناز ہوتا ہے — زمانے کی نگاہوں میں وہی ممتاز ہوتا ہے

چمن میں اوس پڑ جاتی ہے، کلیوں کے تبسم پر — ہماری داستانِ غم کا جب آغاز ہوتا ہے

پر اہلِ ہوش اگر

مری وحشت ~~طرازی پہ ابھی ہنستے~~ ہیں ہنسنے دو — وہ کیا جانیں جنوں میں دل کا کیا انداز ہوتا ہے

پارہ ہائے

فضائیں ~~کاروانِ~~ برق سے معمور ہوتی ہیں — تبسم ریز جب اُن کا لبِ اعجاز ہوتا ہے

سمٹ آتے ہیں اجزائے تسلی وسعتِ دل میں — تخیل جب ہمارا مائلِ پرواز ہوتا ہے

پر اور پاؤں میں بیڑی

~~گلے میں طوق، کڑیاں ہاتھ میں، پاؤں میں زنجیریں~~ — ترے وحشی کا زنداں میں بڑا اعزاز ہوتا ہے

ترنم پھوٹ پڑتا ہے مری دل سوز آہوں سے

~~مری دلسوز آہیں حاملِ صد کیف ہوتی ہیں~~ — کوئی بیٹھا ہوا جب دل میں نغمہ ساز ہوتا ہے

الٹ دیتی ہے پردے ہوش کے جب میری بیہوشی — نظر کے سامنے اُن کا حریمِ ناز ہوتا ہے

بہت ملتے ہیں ساتھی یوں تو دنیا میں مگر اخگر

کسی کا کوئی کب

مصیبت میں ~~نہیں اپنا کوئی~~ دمساز ہوتا ہے

آپ ۶ رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۰ھ میں مقام سید پور ضلع راولپنڈی پیدا ہوئے۔ آپ نسبتاً حسنی الحسینی القادری سید ہیں۔ سات سال کی عمر میں اپنے والد کیساتھ آبائی وطن ملک کشمیر مقام دھاریاں چلے آئے ۸ سال کی عمر میں والد کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا اس لئے یتیمانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور رہوے اور قوم کے بعض افراد کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے اسی حالت میں قرآن مجید کی تعلیم سے فارغ ہوکر فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ آپ بچپن ہی میں اپنے دوستوں کو منظوم خط لکھا کرتے تھے۔ چند دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ کی طبیعت موزوں ہے آپ اچھے شعر کہیں گے کسی اچھے استاد کو اپنا کلام دکھائے چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرت واصف اکبر آبادی سے سلسلہ خط و کتابت شروع ہوا۔ رسالہ جلوہ یار میرٹھ اور رسالہ نیرنگ رام پور میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا حضرت واصف کی وفات کے بعد چند غزلیں بغرض اصلاح باہر بھیجیں مگر آپ کے ذوق کی تکمیل نہ ہوسکی آخر سنہ ۱۹۱ء میں حضرت سیماب مدظلہٗ کو کلام دکھانا شروع کیا مختلف رسائل میں کلام شائع ہونے لگا مگر افسوس ہے کہ آپ اپنا کلام محفوظ نہ رکھ سکے۔ ورنہ ایک اچھا مجموعۂ کلام تیار ہوسکتا اکسیر صاحب کچھ عرصہ سے گردشِ زمانہ میں مبتلا ہیں۔ اور حوادث زمانہ کا شکار رہیں۔ آپ نظمیں لکھتے ہیں مگر نہ لکھنے کے برابر غزل خوب لکھتے ہیں۔

نمونۂ تغزّل

ہوگئی مجھ کو شفا دیکھا جو اُن نے پیار سے
زخم دل میں لگ گئے ٹانکے نعز کی تار سے

کیوں نہ پھوڑوں سر کو اپنے میں در و دیوار سے
بدنصیبی نے اٹھایا آستانِ یار سے

اُن کی فرقت میں تصور اُن کا آجاتا ہے کام
دلکو بہلاتے ہیں ہم اکثر خیالِ یار سے

اک ستم ڈھاتا ہے یہ کہہ کر وہ شوخِ فتنہ گر
تجھ کو کیا حاصل ہوا اکسیر میرے پیار سے

ہے فقط یادِ دلربا دل میں
اور اس کی سوا ہی کیا دل میں

کیا کروں خاطرِ غم دلدار
خون بھی اب نہیں رہا دل میں

یاد کس کی یہ آتی رہتی ہے؟
ہوتا رہتا ہے درد سا دل میں

کی یہ ترکیب بیخودی کے لئے
بیسے آنکھوں کراسکی پی کیلئے

ہجر مے ہر گھڑی نہ کر زاہد
کیا یہ جائز ہی متقی کے لئے

میری آنکھوں میں دلمیں آپ ہیں
گھر یہ دونوں ہیں آپ ہی کیلئے

زندگی ہو اگر مری منظور
پاس آجاؤ دو گھڑی کیلئے

یاد آئی بہت یہ جنت میں
رو دیا میں تری گلی کیلئے

رونا آتا ہے اپنی قسمت پر
ہم ترستے ہیں اب ہنسی کیلئے

قدر جینے کی اس سے ہوتی ہے
موت ہی لطف زندگی کیلئے

شب غم ان کی یاد ہی مونس
آتی رہتی ہے دلدہی کیلئے

ضبط کتنا ہی اشک پی جاؤ
فرض ہے صبر عاشقی کیلئے

قبر کی بھی وہاں جگہ نہ ملی
ٹھوکریں کھائیں جس گلی کیلئے

نمونۂ نظم

شاعر کا خیر مقدم

"شاعر" ادب کی جان ہے
یہ روح ہے ایمان ہے

نظارگی حیران ہے
حیرت کا یہ سامان ہے

کیا خوب اس کی شان ہے
ذوقِ نظر قربان ہے

اعجاز کا احسان ہے
ہے تذکرہ ضرب المثل

"شاعر" سراپا ناز ہے — کیا عشوہ کیا انداز ہے
اک ساز خوش آواز ہے — اک دلبر طنّاز ہے
تنہائی کا دم ساز ہے — سمجھے کوئی کیا راز ہے

سب ہمّتِ اعجاز ہے
تحفہ ملا ہے بے بدل

کیا تحفۂ خوش رنگ ہے — کیا نقشۂ ارژنگ ہے
آئینۂ نیرنگ ہے — اک سازِ خوش آہنگ ہے
گلدستۂ صد رنگ ہے — حاسد بھی اس سے دنگ ہے

دامانِ گلچیں تنگ ہے
اتنے کھلے ہیں پھول پھل

ہر داستاں گلبار ہے — ہر تذکرہ گلزار ہے
کیا رنگ کیا معیار ہے — اس کی روش گلنار ہے
ہر سطر عنبر بار ہے — پھولوں کا اک انبار ہے

ہر دل کا یہ اصرار ہے
یہ ہو نہ اوجھل ایک پل

اب ہند سے پنجاب تک — "شاعر" کی پھیلی ہے مہک
اور اس پہ سیمابی چمک — جاتی ہے چشم دل جھپک
دیکھو مضامیں کی جھلک — خیرہ ہے نورِ مردمک

زہرہ خوشی سے بر فلک
گاتی ہے "شاعر" کی غزل

آذر — وزیر محمد خاں صاحب حیدری۔ منشی فاضل (۱۱)

آپ سنہ ۱۹۱۱ء میں بمقام جہلم پیدا ہوئے۔ یہاں آپ کے والد بزرگوار جناب رسالدار میجر شاد محمد خاں صاحب اندنوں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ آپ کا اصلی وطن کوہاٹ ہے۔ جو سرحد میں ایک دور افتادہ اور علم و ادب کی روشنی سے بیگانہ ایک مقام ہے آپ کی عمر اس وقت پچیس سال ہے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں آپ کے والد محترم کی پنشن ہو گئی اور آپ مستقل طور پر کوہاٹ ہی میں مقیم ہوگئے۔ آپ سدوزئی دُرّانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کا سلسلۂ نسب شاہ شجاع والئی افغانستان سے ملتا ہے۔ آپ نے کوہاٹ ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انگریزی۔ فارسی اور اُردو زبان کا مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں۔ اقتصادیات منطق۔ فلسفۂ قدیم وجدید کا بھی کافی مطالعہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی معلومات بھی حاصل کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے "منشی فاضل" کا امتحان امتیازِ خصوصی کیساتھ پاس کیا۔ اور امسال بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔

حلقۂ احباب میں آپ اپنے اعلیٰ اخلاق ستودہ صفات۔ رنگین طبعی اور خوش مزاجی و زندہ دلی کی وجہ سے بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ آپ کی ذات پنجاب۔ سرحد اور افغانستان کے لئے باعثِ فخر ومباہات ہوتی لیکن آپ ناقدریٔ ابنائے ملک اور روشِ زمانہ سے متاثر ہو کر اس قدر تنہائی اور عزلت گزینی میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ علمی لیاقت تو درکنار آپ کی ذاتی صفات اور خاندانی حالات سے بھی بہت کم اہل شہر واقف ہیں آپ نام و نمود سے متنفر ہیں۔ آپ انتہائی متین اور خوددار واقع ہوئے ہیں۔ علم و ادب کا ذوق اور شاعری سے لگاؤ آپ کو بچپن ہی سے ہے اور فطرت نے ذوقِ شعری آپ میں بدرجۂ اتم ودیعت کیا ہے۔ لیکن

ان تمام باتوں کے باوجود بھی آپ اپنے کو میدان سخن میں نہیں لانا چاہتے آپ کے احباب نے بارہا یہ کوشش کی کہ آپ کو ادبی حلقے سے روشناس کرائیں لیکن طبیعت کی افتاد ہمیشہ غیر معروف زندگی بسر کرنے پر آپ کو مجبور کرتی رہی۔

اپنے ایک عزیز شاگرد جناب شکور شاکر سرحدی کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہو کر آپ نے اوبکے پلیٹ فارم پر آنے کا ارادہ کر لیا۔ اُن کے کہنے سے اس سلسلہ میں پہلا قدم جو آپ نے اٹھایا وہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں کئی سال تک خاموشی کے ساتھ مشق سخن کرنے کے بعد آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کے سلسلۂ تلامذہ میں منسلک ہوگئے اور اس یقین کے ساتھ کہ استادِ محترم کی رہنمائی سے آپ بہت جلد بامِ عروج پر پہونچ جائیں گے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس سے پہلے کبھی آپ نے ایک مصرع پر بھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔

آپ کی شاعری کے دو دور ہیں۔ پہلا دور سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک کا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب آپ اسلامیہ کالج لیشاور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے پہلے دور کا کلام ایک عزیز دوست کے مشغلۂ شعر وسخن سے منع کرنے پر آپ نے جلا کر ضائع کر دیا۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں چند وجوہ کی بنا پر آپ نے کالج کو خیرباد کہہ دیا اور عرصہ تک شعر وسخن کے شغل سے بھی بیگانہ رہے۔ عرصۂ دراز کے بعد سنہ ۱۹۳۵ء میں چند احباب کے اصرار سے پھر یہ سلسلہ شروع کیا۔ یہیں سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ آپ نے دوسروں کے لئے اپنے دماغ وقلم کو بہت عرصہ تک وقف رکھا اور اپنے لئے بہت کم ذخیرہ جمع کیا۔ بیشتر کلام آپکا

ضائع ہوچکا ہے۔ اب جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ جذبات سے مجبور ہو کر کہتے ہیں۔ اس لئے کلام میں بے ساختگی اور آمد ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے آپ کو نفرت ہے۔ الفاظ کی سادگی۔ سلاست۔ روانی اور بندش کی چستی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ محاورہ اور روزمرہ کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کبھی کبھی فارسی تراکیب بھی استعمال کرتے ہیں چھوٹی بحریں عام طور پر آپ کو مرغوب ہیں۔ فارسی زبان میں آپ اردو سے بھی بہتر فکر کر لیتے ہیں۔ رباعی آپ کا موضوعِ مخصوص ہے۔

نمونۂ تغزّل

کلامِ دورِ اوّل:۔

آیا قتیلِ ناز کا بھولے سے جب خیال   پامال کر گئے وہ نشانِ مزار بھی

طرفہ حیرت ہے محبت نور بھی ہے نار بھی   دل جلا اس آگ سے اور ہو گیا سرشار بھی

محتسب کی شان ہے رندانہ آج   کھول دے ساقی درِ میخانہ آج

یاد ہی تیری، بھولنے والے   آسرا ہے شبِ جدائی کا

مرزا صائب کی غزل پر آپ نے ایک فارسی غزل کہی تھی جس کا ایک شعر ہے۔

وقت سحر نگارِ من چید گل وز باغ رفت
خونِ دلِ ہزار کرد۔ کرد۔ کہ کرد ؟ یار کرد

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں کے کابل چھوڑ کر قندھار چلے جانے پر ایک نظم بخطاب بہ امان اللہ آپ نے لکھی تھی جس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا۔

پامال شدن تا کی برباد شدن تا کے   ویرانیٔ خود بنگر اے شیر زیان خیز

کلامِ دورِ ثانی:۔

وائے قسمت چاک دامانی کی حسرت رہ گئی   فصلِ گل آتے ہی تن پیرہن میں کچھ نہ تھا
حسن کی جادوگری تھی عشق کی افسوں گری   بجز شیر و بے ستون و کوہکن میں کچھ نہ تھا
لذتِ تردامنی سے بڑھ گیا ذوقِ گناہ   جذبۂ عصیاں تھا آذر اہرمن میں کچھ نہ تھا

آسماں سے جب گری برقِ بلا اے ہم صفیر   آشیاں کا ذکر کیا سارا گلستاں جل گیا۔

حسن کی ایک اچٹتی سی نظر تھی موسیٰ   طور پر جس کو جمالِ رخِ جاناں سمجھا
تنگ تھی وسعتِ کونین مری نظروں میں   عرصۂ حشر کو میں گوشۂ زنداں سمجھا
اسقدر زور پہ تھا دشت نوردی کا خیال   بزمِ جاناں کو میں ہم رنگِ بیاباں سمجھا

لبِ خموش پہ مطلب کی بات لا نہ سکا   فسانۂ غمِ الفت انہیں سنا نہ سکا
اٹھا لیا دلِ ناداں نے بارِ الفت دوست   یہ بوجھ وہ ہے جسے آسماں اٹھا نہ سکا
ملی ہیں لذتیں اتنی گناہ میں آذر
کہ عمر بھر انہیں بھولے سے بھی بھلا نہ سکا

شوریدہ سری کیسی اندازِ جنوں کیسا   شاید کہ بہار آئی پھر شورِ سلاسل ہے
ہر ذرۂ صحرا سے پیدا ہے دلِ مجنوں   ہر گام پہ لیلیٰ ہے ہر گام پہ محمل ہے

کس کو پڑی ہے مول لے مفت کی سرگرانیاں   یاد ہیں عشق کو ابھی حسن کی لن ترانیاں

کبھی ناداں کبھی فرزانہ بن جا   کبھی بلبل کبھی پروانہ بن جا
کبھی مسجد میں سجادہ نشیں بن   کبھی زینت دہِ میخانہ بن جا
تڑپ جائے عدو بھی سن کے آذر
کچھ اس ترکیب کا افسانہ بن جا

خوشی کی یہ دلیل احساں جتائے جاتے ہیں   چراغ میری لحد پہ جلائے جاتے ہیں

روٹھ کر کس مزے سے کہتے ہیں
پھر نہ آنا ہمیں منانے کو

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
ہجر کی رات مختصر نہ ہوئی

جل گیا دل نگاہ ملتے ہی
برق ٹھہری تری نظر نہ ہوئی

لو وہ آ ہی گئے سرِ بالیں
بے کلی دل کی بے اثر نہ ہوئی

آہ پھر وہ بھی دل جلوں کی آہ
کون کہتا ہے بارور نہ ہوئی

کس قدر محوِ دید تھا آذر
جان جانے کی بھی خبر نہ ہوئی

کلامِ فارسی:-

راہِ میخانہ رفتنم ہوس است
باز توبہ شکستنم ہوس است

مے چکد خونِ دل زمژگانم
قصۂ غم نوشتنم ہوس است

حسن شد جلوہ فگن بالائے بام
یا ہویدا بر فلک ماہِ تمام

غمزہ و ناز و ادا توبہ شکن
زلفِ پیچاں بہرِ دل گستردہ ام

بیک دلائے دل آویز دین و ایماں رفت
فسوں طرازئ حسنِ بتاں تماشا کن

قطعہ

فلک صد خار در پائے غریبے
کند آہ و فغاں تیرہ نصیبے

دلم مینالد از نامہربئ گل
کہ میخندد بہ سوزِ عندلیبے

(۲)

زحسرت خونِ صد پیمانہ ریزم
بخاک ار جام مے مستانہ ریزم

لبسانِ ابرِ نیساں از دو چشمم
بدامانِ صدف دردانہ ریزم

جناب وزیر محمد خاں صاحب آذر سرحدی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

لا شرابِ تیز اے ساقی پلانے کیلئے
شورشِ کونین سے غافل بنا کے لئے

میری امیدوں کی دنیا میں ہے اک ہیجان سا
کون آمادہ ہے پھر فتنے جگانے کیلئے

ڈھونڈتے ہیں ~~موسمِ~~ (فصلِ) گل ~~میں~~ (کے بعد) اسیری کے مزے
اب ترستے ہیں قفس میں آشیانے کیلئے

(سوزِ غم سے) ~~پھر ہوا روشن~~ چراغِ داغِ دل ~~سینے میں آج~~
(ماسوا کی بے سر و سامانی) ~~یا تڑپ اٹھی کوئی~~ بجلی جلانے کیلئے

حسن پھر انگڑائیاں لینے لگا ہے طور پر
آج ~~پھر جاتے ہیں~~ (ہم بھی جانے کو) قسمت آزمانے کیلئے

آسماں بیتاب ہے اور مضطرب ہیں بجلیاں
~~مجھ سے~~ (ایک) برباد تمنا کو مٹانے کیلئے

زلزلہ برپا ہوا زنداں کی دیواریں ہلیں
~~تیرا~~ (کوئی) دیوانہ اٹھا طوفاں اٹھانے کیلئے

باغباں، صیاد، گلچیں، اور برقِ خانہ سوز
آفتیں کتنی ہیں ~~کس قدر اک~~ (صرف ایک) آشیانے کیلئے

~~بے حجاب آ کنجِ تاریکِ دلِ آذر میں آ~~ (آذرِ بیچارہ مدت سے ہے سراپا منتظر)
~~آ مری~~ (آبھی جا) بگڑی ہوئی قسمت بنانے کیلئے

امجد — سید امجد حسین صاحب چھپروی (۱۲)

آپ ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ امجد صاحب بہار جیسے مردم خیز خطے سے تعلق رکھتے ہیں جو شعرا اور ادبا کا مامن و مسکن رہا ہے اور جہاں اب بھی عظیم شخصیتیں موجود ہیں۔ یہ وہی خطہ ہے جس نے نواب نصیر حسین خیالؔ اور شاد عظیم آبادی مرحوم جیسے باکمال پیدا کئے۔ آپ شہر چھپرہ محلہ دھانوان کے رہنے والے ہیں اور ایک بہت معزز و اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی نسبی اور خاندانی وجاہت اہل چھپرہ سے پوشیدہ نہیں۔ آپ کے جد امجد نواب محمد تقی بہت بڑے رئیس۔ انتہائی خلیق اور پابند شرع بزرگ تھے۔ جن کی مختلف یادگاریں کنوؤں۔ تالابوں اور سڑک کے کنارے لگوائے ہوئے درختوں کی صورت میں اب بھی ان کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ نواب صاحب مرحوم نے اب سے سات سال پیشتر رفاہِ عام کے لئے ضلع اعظم گڑھ۔ بلیا اور رسڑا میں یہ کام کئے تھے۔ آپ کے تایا سید باقر حسین صاحب نے اپنی بچی بچائی جائداد کو تین لاکھ روپیہ میں فروخت کر کے نیل کی ایک کوٹھی کھولی جس میں ناکامیابی ہوئی اور کافی نقصان ہوا۔ رفتہ رفتہ دولت و ثروت کم ہوتی گئی اور خاندان کے ہر شخص کو ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے روزگار کی تلاش میں منہمک ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ کے والد بزرگوار سید سجاد حسین صاحب ۱۸۶۸ء میں پولیس میں ملازم ہوئے اور انتہائی خودداری و اہلیت سے اپنے فرائض کو انجام دیا۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد امجد صاحب کو آپ کی بڑی بہن نے پرورش کیا۔ والد صاحب ڈھائی تین ہزار روپیہ اور دو مکان چھوڑ گئے تھے۔ اسی روپیہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی۔ اردو اور فارسی میں آپ نے کافی لیاقت حاصل کر لی اور عربی بھی باقاعدہ کچھ عرصہ تک پڑھی۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف آپ رجوع ہوئے اور انٹرنس تک تعلیم پائی۔ چونکہ آپ زیادہ فارغ البال نہ تھے اس لئے انگریزی تعلیم کو اور زیادہ عرصہ تک جاری نہ رکھ سکے ۱۹۱۴ء میں آپ محکمہ نمک میں بعہدہ کلرک مقرر ہوئے اور اب ترقی کرتے کرتے الفضلہ بعہدہ اسٹور کیپر انجینیرنگ برانچ Engineering Branch میں کام کر رہے ہیں۔

آپ کو اوائلِ عمر ہی سے شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ ذوقِ شعری کے ساتھ ساتھ خیالات و جذبات میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ چنانچہ چھپرہ مظفرپور اور ساتھبر وغیرہ میں آپ نے متعدد مشاعرے پڑھے۔ اور ہر صورت کامیاب رہے شعر عرصہ دراز سے کہتے ہیں لیکن ۱۹۳۵ء سے پہلے آپ نے اپنا کلام کسی استاد کو نہیں دکھایا۔ ۱۹۳۵ء میں کامل غور و فکر اور تلاش و تحقیق کے بعد حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ کے سلسلۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ ۲۰ مئی ۱۹۳۶ء کو ساتھبر میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس کے سکریٹری امجد صاحب ہی تھے۔ اس مشاعرے کی صدارت قبلۂ محترم مولانا سیمابؔ مدظلہ نے فرمائی اور اس وقت امجد صاحب کو استادِ محترم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ چنانچہ آپ نے اپنے عقیدت کے پھول نچھاور کئے اور مولانا مدظلہ کے انتہائی ارادت مند ہو گئے۔

آپ کو شاعری سے حد درجہ لگاؤ ہے لیکن ملازمت کی پابندیاں کچھ ایسی ہیں کہ فکرِ سخن کے لئے زیادہ وقت نہیں ملتا۔ طبیعت میں شوخی خیالوں میں بلندی ہے۔ سلاست و سادگی آپ کو پسند ہے اور ان باتوں کا آپ بطور خاص خیال رکھتے ہیں۔ آپ کی غزلیں اکثر "شاعر" میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ نظم و غزل دونوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

تیر اُن کا ہے کامیاب ہنوز — ہے مری دل میں اضطراب ہنوز
تیری آنکھوں میں تیری چتون سے — ڈھل رہی ہے شراب ناب ہنوز

مانگنے والا چاہیے امجد
نالہ ہوتا ہی مستجاب ہنوز

عشق کی آگ وہی نجد کا صحرا ہے وہی — اب کوئی گرمیٔ افسانہ بنے یا نہ بنے
فطرتِ عشق سکھا دیگی اسے بیخبری — لیکے دل میرا وہ بیگانہ بنے یا نہ بنے

کوئی سانس ایسی نہیں میری جو فریاد نہیں — مستجاب اب بھی مرا شکوہ بیداد نہیں
ظلم اور مجھ پہ انہیں بانیٔ بیداد نہیں — کیا تجھے پاسِ وفائے دلِ ناشاد نہیں
کمیل لیتے ہیں بنا کر وہ نمونے دل کے — بعد مرنے کے بھی مٹی مری برباد نہیں
احتیاج آپ بتا دیتی ہے تدبیرِ عمل — کوئی بھی راہبر عالمِ ایجاد نہیں
صرفِ افکارِ جہاں شاہ و گدا ہیں دونوں — فکر سے کوئی نفس دہر میں آزاد نہیں

حرکت زیست کا ہے دوسرا نام اے امجد
سرو کی طرح جو آزاد ہو آزاد نہیں

اک زمانہ تراباتِ کا فر — پوچھتا ہے پتہ برہمن سے

موہنی صورت بھی ہے غارتگرِ ایماں بھی ہے — چاہتا ہے دل کہ اُس کافر کو سجدا کیجیے

عنایت ہیں اضافے ہیں جنونِ فتنہ ساماں کی — جو حالت تھی گریباں کی وہی حالت ہے داماں کی
کلیسا میں بھی جلوہ گر کعبہ نشیں بھی ہے — بڑھیں حیرانیاں کیونکر نہ میری چشمِ حیراں کی
قفس کی تیلیوں پر شکر کے سجدے نہیں ہوتے — ذرا سی خاک ہی لا دے کوئی صحنِ گلستاں کی

جناب سید امجد حسین صاحب امجد کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

امجد ہے یاد اب تک وہ حسن کا فسانہ — وہ گیت وہ ترنم وہ ساز وہ ترانہ
ہے مجھ سے تم سے قائم ہنگامۂ دو عالم
~~تم میری یاد میں ہو تنہائی میں سناؤ~~ — تم حسن کی کہانی میں عشق کا فسانہ
ہے اجتنابِ زاہد کیوں اس میرے میکدے سے
~~پرہیز اتنا کیوں ہے دیکھے تو آکے زاہد~~ — اس میکدے کی شے کا ہے رنگ صوفیانہ
یوں بھی ہوں میں — کچھ دن یونہی جو رکھے
ممنون ~~ہیں بھی ہیں~~ صیاد و آسماں کا — ~~رہنے اگر مجھے~~ برباد آشیانہ
کہہ دو کہ ہنسنے والے فرمائیں اب نہ زحمت
~~ہے ہوش اتنا کس کو وہ ہنس پڑیں~~ — دم توڑتا ہے کوئی ہوتا ہے اب روانہ
جب جان تن سے نکلے لب پر ہو نام تیرا — یارب مری جبیں ہو اور تیرا آستانہ
بے لے کے تمام نغمے بے سوز ساز سارے — کاہیدہ سا ترنم خوابیدہ سا ترانہ
ہر ذرہ ذرہ اس کا صدر شکِ آسماں ہے — جھکتے ہیں سر جہاں کے یہ ہے وہ آستانہ
پھر جھوم کر گھٹائیں آئی ہیں میکدے پہ — وہ کر رہی ہیں شاید زلفوں میں اپنی شانہ
غافل شبابِ امجد سرشاریوں سے کیوں ہو — بانگِ جرس بنا ہے پیری کا تازیانہ

آپ ۱۹۱۱ء میں بمقام میٹ پالم پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام نامی حاجی عبداللہ سیٹھ تھا۔ آپ کچھی میمن ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۲ سال ہے۔ چھ سال کی عمر میں آپ نے کلام پاک پڑھنا شروع کیا۔ دینی تعلیم کے اختتام پر برنن کالج ٹلیچری میں انگریزی اور ملیالم زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہوئے۔

آپ کے والد صاحب سیاہ مرچوں کی تجارت کرتے تھے اُن کا شمار چوٹی کے تاجروں میں تھا۔ آپ کے والد کے انتقال بعد آپ کے دو چچاؤں نے آپ کی پرورش کی۔ کچھ دن بعد بڑے چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور آپ کے چھوٹے چچا جناب حاجی عبدالقادر حاجی اسحٰق سیٹھ۔ ایم۔ ایل۔ اے نے بکمال شفقت آپ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ۱۹۲۲ء میں ٹلیچری میں چیچک کی وبا پھیلی جس نے سارے شہر میں ایک ہیجان برپا کردیا۔ اختر صاحب کا گھر بھی اس سے نہ بچ سکا آپ کی ہمشیرہ عزیزہ اور بھانجی اس مہلک مرض کا شکار ہوگئیں۔ ان دنوں بی اماں (والدۂ علی برادران)، اور مسز سروجنی نائیڈو آپ ہی کے دولتکدے پر مہمان تھیں۔ ایک طرف مرنیوالوں کا رنج دوسری طرف معزز مہمانوں کے آرام و آسائش کا خیال غرض آپ انتہائی پریشان تھے۔ بی اماں اور مسز سروجنی نائیڈو کو جب علم ہوا تو انہیں بھی بہت رنج ہوا۔ دونوں محترم مہمانوں کو اختر صاحب سے خاص ہمدردی ہوگئی تھی۔ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد ڈاکٹروں حکیموں اور احباب نے آپ کے عم محترم کو رائے دی کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے شہر چھوڑ دیں تاکہ وبائی زد سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ آپ کے چچا میسور تشریف لے گئے۔ میسور کی خوشگوار آب وہوا اور شہر کی خوبصورتی نے آپ کو کچھ ایسا سکون بخشا کہ آپ کے چچا وغیرہ پانچ سال تک وہیں مقیم رہے۔ اختر صاحب نے وہاں پھر نئے سرے سے تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ اور وہاں کے چند بزرگوں کی صحبت سے آپ اردو سے بھی کچھ کچھ مانوس ہوگئے۔ رفتہ رفتہ طبیعت کا رجحان اُردو کی طرف ایسا ہوا کہ آپ کو اس زبان سے خاص محبت ہوگئی۔ اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں آپ اسی کو حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے۔ آپ کے لگاؤ کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اپنی مادری زبان (کچھی) سے بھی آپ کو رغبت نہ رہی اور اردو زبان کی شیرینی و فصاحت نے آپ کے دل میں گھر کرلیا۔

میسور سے واپسی پر آپکو دمہ کا مرض ہوگیا اور باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ایام بیماری میں آپ نے اُردو کا مطالعہ بہت زیادہ کیا آپ نے ٹلیچری میں لوگوں کو اردو کی طرف متوجہ کیا۔ مرحوم سلیمان سیٹھ جو آپ کے عزیز تھے اور علی گڑھ کے تعلیمیافتہ تھے آپ کو اُردو میں مدد دیتے رہے اور آپ کی قابلیت میں برابر ترقی ہوتی رہی۔ آپ کو کسی اردو رسالہ کے اجرا کا بہت شوق تھا لیکن ماحول کی بدذوقی سے آپ مجبور رہے۔

۱۹۲۹ء میں جناب سیٹھ محمد ایوب حاجی صدیق صاحب صابر سیمابی بمبئی سے بغرض تبدیلی آب وہوا ٹلیچری آئے چنانچہ آپ کی صحبت سے اختر صاحب کو شعر و سخن سے بھی ذوق ہوگیا اور اب اردو ادب کی ترقی کے لئے آپ کا دل بے چین رہنے لگا۔ صابر صاحب ہی نے آپ کا تخلص اختر تجویز کیا۔

۱۹۳۰ء میں آپ کے عم محترم نے ایک مجلس کی بنیاد ڈالی جس کا نام کیرلا مسلم مجلس ہے۔ اور کیرلا (یعنی ملبار) کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس طلب کی گئی جس کے صدر جناب جمال محمد صاحب مدراسی تھے۔ اس کانفرنس میں مولانا ظفر علی خاں صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا نے اُردو کی ترویج کے لئے بھی یہاں کے نوجوانوں کو ابھارا نتیجہ یہ ہوا کہ

۱۹۳۱ء کے اواخر میں ایک انجمن "اصلاح اللسان" قائم ہوگئی جس کا مقصد صرف اردو کی ترویج تھا۔ آپ کے عم محترم اور جناب طاہر محمد سیٹھ صاحب نے (جو آپ کے قریبی رشتہ دار ہیں)، اس انجمن کی سرپرستی قبول کی پہلے سال آپ کے بھائی رحمت اللہ سیٹھ صاحب انجمن کے صدر مقرر ہوئے اور اختر صاحب کو نظامت کا عہدہ دیا گیا جسے آپ نے بحسن وخوبی ایک سال تک انجام دیا۔ ۱۹۳۲ء سے اب تک آپ اس انجمن کے خزانچی ہیں۔

آپ کے مکان ہی پر ایک عربی اور فارسی کے مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی چونکہ آپ میں تعلیم کا ذوق بدرجۂ اتم تھا اس لئے خود بھی دونوں زبانوں کو حاصل کیا۔ اور اراکین انجمن کی دلچسپی کے لئے ایک رسالہ "چمن" جاری کیا۔ اسمیں اردو۔ انگریزی اور وہاں کی مادری زبان میں مضامین ہوتے تھے۔ تینوں زبانوں کے علیحدہ علیحدہ ایڈیٹر تھے۔ حصّۂ اردو کا مدیر اختر صاحب کو بنایا گیا۔ چونکہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی اس لئے آپ بہت ذوق کیساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے کچھ عرصہ کے بعد آپ کی نظمیں اور غزلیں وغیرہ "الجمعیۃ" دہلی "اخبار شریعت" لائل پور۔ اخبار قوم بنگلور اور رسالہ شاعر وغیرہ میں شائع ہونے لگیں۔

۱۹۳۴ء میں آپ کا ایک مضمون "ملبار اور اردو زبان" کے عنوان سے اخبار "الجمعیۃ" دہلی میں شائع ہوا اس میں آپ نے حامیانِ اُردو سے اپیل کی تھی کہ وہ "ملبار" میں اردو کی نشر و اشاعت فرمائیں۔ اور لکھا تھا کہ یہاں ۳۲ لاکھ مسلمانوں میں ۵ فی صدی بھی اردو سے واقف نہیں۔ ... مربع میل میں اردو کا ایک بھی رسالہ یا اخبار نہیں لیکن افسوس کہ آپ کی آواز پر کسی نے توجہ نہ دی اور ملبار میں ہندی کا زور روز بروز بڑھتا گیا۔

۱۹۳۶ء میں آپ نے اپنے عم محترم کے ساتھ شمالی ہندوستان کا سفر کیا۔ تین ماہ تک آپ کا قیام دہلی میں رہا۔ مولانا احمد سعید صاحب جناب ہلال احمد صاحب زبیری ایڈیٹر الجمعیۃ وغیرہ سے آپ وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ دونوں حضرات سے ایک اردو رسالہ کے اجراء کے متعلق آپ نے مشورہ کیا۔ مولانا احمد سعید صاحب اور زبیری صاحب نے آپ کی تائید کی اور ملبار سے اردو کے رسالہ کے اجراء کی ضرورت ظاہر کی۔ واپسی پر آپ کا قیام کچھ دن آگرہ بھی رہا۔ چنانچہ آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کی خدمتِ بابرکت میں بھی تشریف لائے۔ (بقول اختر صاحب کے کہ مجھے استاد محترم کی خوش اخلاقی اور شفقت نے اپنا گرویدہ کرلیا) آپ کو صابر صاحب کے ذریعہ مولانا مدظلہ سے عقیدت اور ارادت پہلے ہی سے تھی۔ یہاں آکر آپ نے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل کیا۔ اب ۱۹۳۶ء سے مولانا مدظلہ آپ کے کلام پر اصلاح فرما رہے ہیں آپ لکھتے ہیں "کہ استادِ محترم نے اجرائے رسالہ پر میری تائید فرمائی اور قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا۔ آپ کے وعدے نے مجھ میں روحِ عمل پھونکدی اب مجھے کامل یقین ہے کہ قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کے تلطف و اعانت سے میری معلومات میں آئندہ گراں قدر اضافہ ہوگا اور شہر ملبار میں زبان اردو کی کماحقہ ترقی بھی ہو گی۔"

اختر صاحب کے ایک خط سے یہ معلوم کرکے ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ وہ تیلیچری سے ایک ماہانہ رسالہ "نارجلستان" کے نام سے جاری کرنیوالے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اُن کی دیرینہ مُرادوں کی کامیابی کا وقت آگیا۔ ہمیں امید ہے کہ رسالہ اختر صاحب کی نگرانی میں ضرور بارآور ہوگا۔

اختر صاحب ایک ہونہار اور خلیق نوجوان ہیں۔ قوتِ عمل آپ کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ شعر بہت سمجھ کر کہتے ہیں چونکہ اہل زبان نہیں ہیں اس لئے سادگی اور سلاست کو ترکیبوں اور بندشوں پہ ترجیح دیتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

حال اب امت بیکس کا ہوا ہے ابتر — لو خبر سید ابرار مدینے والے
ہم ابھی توڑ دیں زنجیرِ غلامی اپنی — ہوں اگر آپ مددگار مدینے والے
ہم کو دھوکے دئے اغیار نے ہیم اتنے — کردیا مفلس و نادار مدینے والے
ہم گنہگار سیہ کار ہیں لیکن پھر بھی — تیری امت میں ہیں سرکار مدینے والے
قافلہ ہند میں بھٹکا ہے مسلمانوں کا — ہے تو ہی قافلہ سالار مدینے والے

ہند میں اخترِ خستہ ہے نہایت مضطر
اب بلا لو اسے سرکارِ مدینے والے

ہند کا ہر فرد باہم برسرِ پیکار ہے — گرم اب ظلم و ستم کا ہر طرف بازار ہے
لطفِ آزادی کا رہ رہ کر ہمیں آتا ہے یاد — اس غلامی میں ہماری زندگی دشوار ہے
چھا گئیں کالی گھٹائیں ہند پر ادبار کی — انقلابِ دہر سے اب ہر کوئی بیزار ہے
اتفاقِ باہمی پر ہے مدارِ زندگی — یاد رکھ اختر اسی سے اپنا بیڑا پار ہے

نمونۂ نظم

التجائے مسلم

تیری درگاہ میں یا رب ہے ہماری فریاد — بیکسوں کی تو کیا کرتا ہے ہر دم امداد
ہے فلسطین میں اسلام پہ بیحد بیداد — ہوئی جاتی ہیں تیری جانے والی برباد
ظلم یہ کرنے لگے لطف و کرم کے بدلے
اب ان سے تو ہی لیگا جور و ستم کے بدلے

حال سن سنکے فلسطین کا ہم ہیں مضطر — چین آتا نہیں اس شورشِ غم سے دم بھر
تو ہی ہو اہلِ فلسطین کا الٰہی یاور — بھیجدے ان کی مدد کیلئے اپنا لشکر
آسرا ان کو کسی کا بھی نہیں تیرے سوا
کوئی دکھ جاننے والا ہی نہیں تیرے سوا

ہم بھی حاکم تھے کبھی آج ہیں محکوم افسوس — ہمسا دنیا میں نہیں ہے کوئی مظلوم افسوس
اپنی حالت پہ نہ کس طرح ہوں مغموم افسوس — انکی غمخواری سے بھی رہ گئے محروم افسوس
ہائے رے جبر کہ ہمدردی سے مجبور ہیں ہم
حیف صد حیف یہاں ہند میں محصور ہیں ہم

موسوی ہم کو سمجھنے لگے اب اپنا غلام — ایک دن انکو دکھا دیں گے ہم اس کا انجام
نہ ملے گا نہ ملے گا انہیں اس جا آرام — ہم کہے دیتے ہیں اچھے نہیں ان کے ایام
سچ بتا تم کو ہے دنیا میں کہیں جائے اماں
تو فلسطین کو کیوں اپنا بناتا ہے مکاں

سیٹھ عبدالکریم صاحب اختر کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کی اصلاح

بنا
اچھے لوگوں کی ہوا کرتی ہے عادت اچھی — کچھ سکھا دیتی ہے انسان کو صحبت اچھی

جو حاصل
قدر ہر ایک کو ہوتی ہے خوشی کی غم میں — رنج کے بعد میسر ہو وہ راحت اچھی

عیش و آرام میں کب یادِ خدا آتی ہے — جس میں یاد آئے خدا ہے وہ مصیبت اچھی

شمع کی طرح میں کہتا نہیں
خامشی — ملجاتی
~~مثلِ شمع نہیں کہتا ہوں میں کچھ~~ حالتِ دل — خاموشی میں ہی مجھے ملتی ہے راحت اچھی

اچھی صورت سے ہوا کرتی ہے الفت سب کو — ہم تو چاہیں گے اسے جسکی ہو صورت اچھی

عیش و راحت میں جو دم گزرے غنیمت ہے وہی — آہ و نالے سے جو ملجائے وہ فرصت اچھی

دوستوں میں بھی بہت آگئی اب خود غرضی — سچ تو یہ ہے کہ کسی کی نہیں نیت اچھی

ہے قسمت
چین سے جس کی بسر ہو وہ مقدر والا — یوں تو کہنے کو ہے ہر ایک کی قسمت اچھی

رنج و راحت میں ہیں ہم صابر و شاکر اختر
خالق
فضلِ حق سے ہے ملی ہم کو طبیعت اچھی

آپ کا نام محمد شریف اور تخلص اخگر ہے۔ والد محترم کا نام شیخ محمد دین ہے آپ شیخ حنفی المذہب ہیں۔ اخگر صاحب ماہ رمضان ۱۹۱۶ء میں بمقام نوشہرہ چھاؤنی (ضلع پشاور) پیدا ہوئے۔ عمر کا ابتدائی حصہ پشاور میں بسر ہوا۔ اور مڈل تک تعلیم بھی وہیں پائی۔ آپ کے آباؤ اجداد تقریباً نصف صدی سے پنجاب سے بغرض تجارت صوبۂ سرحد میں تشریف لائے اور یہیں رہنے لگے۔ اخگر صاحب کافی عرصہ تک پشاور میں رہنے کے بعد بہ سلسلۂ تجارت اپنے والد صاحب کے ساتھ کوہاٹ آگئے اور اپنی والدۂ محترمہ کے انتقال ہوجانے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے یہیں اقامت گزیں ہوگئے۔

آپ کی شاعری کا آغاز کتب بینی اور متواتر اخبارات وغیرہ پڑھنے سے ہوا۔ چونکہ طبیعت میں موزونیت تھی اس لئے بہت جلد صحیح شعر کہنے لگے۔ مقامی شعرا کی ہم مجلسی کے باعث طبیعت پر شعر فہمی کا خاصا اثر پڑا۔ اسی طرح دو سال گذر گئے آخر آپ کو اس منزل کے طے کرنے کے لئے ایک کامل رہبر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ۱۱ر اپریل ۱۹۳۲ء کو علامہ سیماب اکبرآبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اور ایک عرصہ تک مولانا مدظلہ سے مشورۂ سخن لیتے رہے۔ اس اثنا میں صوبۂ سرحد کے سیاسی رجحانات کے باعث شعر و شاعری کی طرف آپ کی توجہ بہت کم ہوگئی۔ حتیٰ کہ آپ کی طبیعت میں بالکل جمود و تعطل پیدا ہوگیا۔ اس سے آپ کی زندگی پر خراب اثر پڑا۔ اور آپ افسردہ خاطر رہنے لگے۔ آج کل کوہاٹ میں "بزم ادب اردو" کے قیام کی وجہ سے احباب پھر آپ کو میدانِ شاعری میں لے آئے ہیں اور آپ کا بجھا ہوا ذوق پھر ابھر آیا ہے۔ کچھ دن کی خاموشی کے بعد اب آپ پھر چند ماہ سے مولانا مدظلہ کو اصلاح کے لئے اپنا کلام بھیج رہے ہیں اور اب مذاقِ سخن میں پہلے سے زیادہ کچھ سرگرمی پائی جاتی ہے۔

اخگر صاحب نوجوان شعرا میں ایک خاص رنگ کے مالک ہیں۔

نمونۂ تغزل

دنیا کی عافیت میں نہاں ہیں اذیتیں ۔۔۔ آرام کی یہاں نہ تمنا کرے کوئی

دولتِ دنیا سمیٹی بھی تو کیا حاصل ہوا! ۔۔۔ ہاتھ خالی تھے سکندر کے کفن میں کچھ نہ تھا

آئینۂ حقیقتِ ہستی ہے روبرو ۔۔۔ عبرت سے دیکھتا ہوں چراغِ سحر کو میں

کچھ نہیں سازِ حیاتِ چند روزہ کچھ نہیں ۔۔۔ نغمہ ہائے انبساط و غم کا فانی جوش ہے

اصولِ فطرتِ دنیا ہی الفت ایک ہونا ہے! ۔۔۔ یہاں یہ امتیازِ ما و تو رہنا نہیں اچھا

گلشنِ دہر سراسر ہی نمودِ بے بود ۔۔۔ رازِ پژمردگیٔ ہر گلِ خنداں سمجھا

او وفا ناآشنا، بے مہر، او نامہرباں ۔۔۔ آ کہ ہے بیمارِ غم بالینِ بستر کا چراغ

اب میں مآلِ فطرتِ غمِ دوست کیا کہوں! ۔۔۔ احساسِ غم بھی کثرتِ غم نے مٹا دیا

برباد ہوا تو کیا ویران ہوا تو کیا ۔۔۔ دل پھر بھی میرا دل ہے دل ہے تو زمانہ ہے

سید مظفر علی صاحب سالیری بی۔اے (۱۵)

آپ کا نام سید مظفر علی سالیری اور تخلص اثرؔ ہے۔ آپ ۱۹۱۱ء میں ضلع گجرات شہر بڑودہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد سید محمد علی سالیری جو فی الحال ریاست بانٹوہ میں میونسپل کمشنر ہیں نواب میر صدرالدین حسین خانصاحب صدؔر مرحوم کے قریبی رشتہ دار ہونے کے علاوہ خود نہایت علم دوست بلند خیال اور صاحبِ اقبال شخص ہیں۔ زمانے کی روش کو دیکھتے ہوئے آپ کے والد بزرگوار نے اثرؔ صاحب کی تعلیم کے متعلق پہلے ہی سے ایک اچھا پروگرام مرتب کر لیا تھا۔

چنانچہ ابتدائی تعلیم کے لئے اثرؔ صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ جہاں آپ نے ۱۹۳۲ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے بڑودہ کالج میں داخل ہو گئے وہاں آپ نے تدریجاً ۱۹۳۶ء میں بی اے کا امتحان آنرس سے پاس کیا۔ آج کل آپ بڑودہ کالج کے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ اسکولر ہیں۔ اور ایم اے کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اثرؔ صاحب کی شاعری کی ابتدا ۱۹۳۱ء سے ہوئی آغازِ شاعری میں آپ اپنا کلام حضرت حافظ حکیم محمود حسن صاحب افسرؔ مودودی بڑودوی کو دکھاتے رہے۔ ۱۹۳۲ء میں بڑودہ میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا۔ اور اسی کانفرنس کے ماتحت ایک مشاعرے کا انعقاد بھی ہوا۔ جس میں خطۂ گجرات اور یوپی کے بہت سے شعرائے کرام کو دعوت دی گئی تھی۔ اس مشاعرے میں حضرت مولانا سیمابؔ اکبرآبادی مدظلہ العالی بھی تشریف لے گئے تھے۔ مشاعرے کے ختم ہونے پر مشاعرہ کمیٹی کی طرف سے چیدہ غزلوں کے لئے تین میڈل مقرر کئے گئے تھے۔ جس میں پہلا سونے کا میڈل حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ کو دوسرا میڈل حضرت افسرؔ صاحب مودودی کو اور تیسرا میڈل جناب اثرؔ صاحب کو ملا تھا۔ آپ کی خداداد طبیعت نُدرتِ کلام تخیل کی بلندی اور حسنِ بیان کا اندازہ صرف اسی واقعہ سے ہو جاتا ہے کہ جس غزل پر آپ کو میڈل ملا وہ آپ کی صرف گیارہویں غزل تھی۔

آپ کی بلند ذوقی اور سیر چشمی کا ابتدا ہی سے تقاضہ تھا کہ آپ اپنے کلام پر ہندوستان کے کسی بہترین استاد سے اصلاح لیکر اپنی شاعری کو ادبی دنیا میں فروغ دیں۔ اسے حسن اتفاق کہئے یا خوش قسمتی کہ اورنٹیل کانفرنس کے موقع پر آپ کو حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ سے نیاز حاصل ہوا۔ چونکہ ایک عرصہ سے آپ مولانا کا شہرہ سن رہے تھے اور اکثر اوقات ان کا کلام بھی ادبی رسالوں میں آپ کی نظر سے گذرتا رہتا تھا لہذا آپ نے دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ آپ اپنا کلام بغرض اصلاح مولانا ہی کی خدمت میں پیش کیا کریں گے۔ آپ نے مولانا مدظلہ سے تحریری درخواست شاگردی کی جو خوش قسمتی سے قبول ہو گئی۔

اردو کے علاوہ آپ گجراتی زبان کے بھی ایک ماہر شاعر ہیں اور ایک اچھے مضمون نگار بھی ہیں۔ اکثر گجراتی رسائل میں آپ کا کلام اور مضامین شائع ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ بڑودہ ساہتیہ سبھا (بزمِ ادب) منعقدہ ۱۹۳۳ء میں آپ کو ایک بہترین گجراتی غزل لکھنے پر پہلا انعام ملا تھا۔

۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۵ء تک آپ بڑودہ کالج میگزین کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ بڑودہ میں اُردو بزمِ ادب کی اساس ڈالنے میں آپ کی کوشش قابلِ داد ہے۔ آپ فی الحال اس بزمِ ادب کے سکریٹری ہیں۔

پ حضرت مولانا سیماب مدظلہ، کے تلامذہ میں داخل ہو گئے تھے سالانہ مشاعرہ میں آپ کو دو نقرئی میڈل ڈاکٹر مہاراج سروپ صاحب اور پنڈت دیا شنکر صاحب نے مرحمت فرمائے - اسی سال آپ مباحثہ کے سلسلے میں اودے پور بھی گئے - ۸ر فروری ۳۷ء کو گورنمنٹ کالج اجمیر کی صدسالہ جوبلی کے موقع پر ایک مشاعرہ ہوا - جس میں آپ کو اور ایک نقرئی میڈل رائے بہادر پنڈت مٹھن لال صاحب بی اے. ایل، ایل بی نے مرحمت فرمایا۔

ہنوز چونکہ آپ طالب علم ہیں اس لئے دل کھولکر بزم سخن میں حصہ گیر نہیں ہو سکتے - مولانا سیماب مدظلہ، سے ذریعۂ خط و کتابت اصلاح لیتے ہیں اور امید ہے کہ مستقبل میں آپ ایک اچھے - نثار، مقرر، ور شاعر ہوں گے. شعر بہت صاف اور سلجھا ہوا کہتے ہیں -

نمونۂ تغزل

ذرا اڈالدو اپنی زلفوں کا سایہ   بہت نارسا ہے مقدر کسی کا
ہوا جب کبھی ذکر ظلم و ستم کا   تو نام آگیا لب پہ اکثر کسی کا
یہ ہی شعلۂ طور یا برقِ لرزاں   جلاتا ہے کیوں حسن کافر کسی کا

تم آزاد آزاد کیوں ہو گئے ہو
نہیں کیوں تمہیں اندنوں ڈر کسی کا

نار اور نور ہوا جاتا ہوں   شعلۂ طور ہوا جاتا ہوں
تجھ سے ہوتا ہوں میں جتنا نزدیک   اتنا ہی دور ہوا جاتا ہوں
اللہ اللہ رے شرابِ جلوہ   بے پیئے چور ہوا جاتا ہوں
موسمِ ابرؔ آلی تو بہ!   مست و مخمور ہوا جاتا ہوں

کیا ہی دل میرا جو مجموعۂ اضداد نہیں   کبھی ناشاد نہیں ہے تو کبھی شاد نہیں
تو نے بخشا ہے جسے دردِ محبت اپنا   دل وہی درد کی دنیا ہے تجھے یاد نہیں

تو نہیں ہے تو ترا درد تو ہے دل میں مکیں   اب کسی حال میں خالی دلِ ناشاد نہیں
یاد ہے یار نے چہرے سے اٹھایا تھا نقاب   کس نے دیکھا کسے دیکھا یہ مجھے یاد نہیں
آجتک ہوں غمِ ہستی میں مقید آزاد   میں یونہی نام کا آزاد ہوں آزاد نہیں

خونِ جگر کا رنگ مری چشم تر میں ہے   وہ یہ سمجھ رہے ہیں تمنا نظر میں ہے
بس اصل زندگی ہے محبت کی زندگی   سب کچھ اس ایک زندگی مختصر میں ہے
اُن کی جمالِ حسن کی یہ جلوہ باریاں!   اک جنت نگاہ ہماری نظر میں ہے
آنے سے اس کے حال ہی کچھ اور ہو گیا   کیا میری زیست دسترسِ نامہ بر میں ہے؟

آزاد کیوں نہ ناز کروں اپنے دل پہ میں
اللہ کا قیام اسی پاک گھر میں ہے

موجیں سی اٹھ رہی ہیں گلابی شراب سے   مستی چھلک رہی ہے کسی کی شباب سے
وہ اٹھ رہے ہیں پھر مری پہلو سے ہمنشیں   بیدار ہو رہا ہوں محبت کی خواب سے

حُسن کی موجیں تبسم ہائے پنہاں ہو گئیں   جیسے رو حیں جد میں آکر رقصاں ہو گئیں
جیسے پھیلادی ہو گلشن پر سنہری سا ریا   بجلیاں یوں خرمنِ ہستی پہ لرزاں ہو گئیں
چاندنی راتیں جو دن معلوم ہوتی تھیں کبھی   اب وہی راتیں مجھے تاریک زنداں ہو گئیں

نمونۂ نثر

نگاہِ اولیں

"مہتاب اپنے پورے شباب پر تھا - میں آنا ساگر کے کنارے کھڑا ہوا پانی کے معصوم نظارے دیکھ رہا تھا - تمام فضا میں خاموشی رقص کر رہی تھی اور مستی چاروں طرف ہوا میں لہرا رہی تھی - ننھے تارے آسمان پر چھٹکے ہوئے تھے اور حسین نظارے جلوہ فروش تھے - تمام وادی اور صحرا کی حسین آبادی کے دلکش مناظر دلربائی کی ساحرانہ قوت کے دلچسپ نمونے تھے - لیکن ابھی تک ساگر کی موجیں خاموش اور مدہوش تھیں - تمام منظر پر سکوت و سکون طاری تھا - اور میری کیف میں ڈوبی ہوئے دل کے ریشہ ریشہ میں شباب کی مستی چھلک رہی تھی"

۱۷ اکبر اسمٰعیل صاحب بنگالی عدنی

آپ سنہ ۱۹۱۱ء میں بمقام عدن (عرب) پیدا ہوئے۔ ابھی آپ نے اپنی عمر کی صرف چار ابتدائی بہاریں دیکھی تھیں کہ قدرت نے والد جیسی ہستی کا سایہ سر سے اٹھا لیا۔ چنانچہ آپ کے ماموں عبدالوہاب حسین بخش المعروف شاہ جی صاحب نے آپ کی پرورش کی۔ آپ کے والد جماعتِ ہندوستانی عدن کے "کلیم" اور معزز رکن ہیں۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ کے بڑے ماموں احمد حسن بخش صاحب معصوم عدنی فرسٹ پولیس حولدار پنشنر نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اکبر صاحب کو مدرسہ اسلامیہ عدن میں ابتدائی تعلیم کیلئے داخل کرادیا آپ نے تین سال کے عرصہ میں قرآنِ پاک اور دوسری اردو کی کتابیں ختم کیں۔ آپ کے مدرسین یوسف میاں جی اور جناب مصطفیٰ خاں عبدالشکور خاں صاحب نے بڑی ہمدردی و توجہ سے آپکو تعلیم دی اس کے بعد آپ انگریزی اسکول میں داخل ہوئے اور ماسٹر جے۔ ایف ڈیوس صاحب کے زیرِ تعلیم آپ نے تھرڈ اسٹینڈرڈ (Third Standard) کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ اب آپ کا کوئی کفیل موجود نہ تھا اور اقتصادی پریشانی بہت زیادہ تھی اس لئے اتنی ہی تعلیم کو غنیمت سمجھکر آپ فکرِ معاش کی طرف متوجہ ہوگئے اور بیشتر انگریز افسروں کے یہاں آپ ملازم رہے۔

مطالعہ کا شوق آپکو بچپن ہی سے ہے۔ چنانچہ مختلف ڈرامے۔ ناول۔ رسائل اور اخبارات وغیرہ آپ برابر پڑھتے رہتے ہیں۔ چونکہ آپ کے ماموں جناب معصوم صاحب بھی ایک اچھے شاعر تھے اور مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی میں بہت مشہور تھے اس لئے اکبر صاحب پر بھی ماحول کا اثر ہوا آپ بھی مرثیہ کہنے لگے اور مجالس مرثیہ خوانی میں شرکت کرنے لگے۔ آپ کے ماموں صاحب مولانا عاشق حسین صاحب عاشق مہتمم مطبع حمیدیہ و مدیر رسالہ تحفۂ احمد آباد کے شاگرد تھے اور تحفۂ احمد آباد میں آپ کا کلام بھی چھپتا رہتا تھا فطرت کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ آپ اپنے ماموں صاحب کے فیضِ سخن اور شفقت سے فائدہ حاصل کریں چنانچہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔

اس جانکاہ حادثہ سے اکبر صاحب نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا لیکن افکارِ دنیاوی کیساتھ فکرِ سخن سے غافل نہ رہے کچھ عرصہ بعد آپ رسالہ شاعر کے خریدار ہوگئے اور سنہ ۱۹۳۳ء میں جناب دلکش عدنی مرحوم کی وساطت سے حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کی خدمتِ اقدس میں درخواست شاگردی بھیجی۔ مولانا مدظلہٗ نے دلکش صاحب کے اصرار سے ازراہِ کرم اکبر صاحب کو اپنے تلامذہ میں شریک کرلیا۔ استادِ محترم کی توجہ سے دو تین سال ہی میں آپ کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔ اصلاح شدہ غزلوں کو آپ بہت غور و فکر سے دیکھتے ہیں اور عدن میں اردو زبان کی ترویج کیلئے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ شعر صاف اور سمجھ کر کہتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

بہارِ دو جہاں بنکر وہ اس گلزار میں آیا
کلی میں کیف بنکر، درد بنکر خار میں آیا

کبھی وادی کبھی صحرا کبھی گلزار میں آیا
غرض ہر رنگ سے وہ عالمِ اظہار میں آیا

کبھی وہ عشق بنکر قلب میں پہنچا زلیخا کے
کبھی وہ حسن بنکر مصر کے بازار میں آیا

کبھی میخانہ کو مہکا دیا ناغر نشیں بنکر
کبھی تسبیح میں آیا کبھی زنار میں آیا

کبھی منصورؒ کے منہ میں زباں بنکر ہوا گویا
کبھی درسِ فنا دینے فضائے دار میں آیا

پھر چھائی گھٹا، پھر شوق بڑھا، میخوار چلے میخانے کو
پھر وجد میں آکر چوم لیا پیمانے نے پیمانے کو

مینوش سب آتے ہیں ساقی، آتے نہیں لیکن شمس و قمر
یہ دونوں پرانے پیمانے کیا بھول گئے میخانے کو

کیوں اپنی زباں سے ہم یہ کہیں، ساقی سے ہمارا رشتہ ہے
ساقی کی نظر پہچانتی ہے ہر اپنے اور بیگانے کو

طوف ہم پر فرض ہو جاتا حریم عیش کا
باندھ لیتے ہم جو سر پر اپنے احرام نشاط

کر دیا بیدار خوابیدہ جہانِ عشق کو
حسنِ لاثانی نے دیکر تیرے پیغام نشاط

گلشنِ عالم میں تیرے دم سے آئی جانِ بہار
آج ہر جانب نظر آتا ہے طوفانِ بہار

اذن گر تعمیر کا دے مجھ کو طوفانِ بہار
گوشۂ دل میں بنالوں میں اک ایوانِ بہار

سیکڑوں موسیٰ چلے وادیٔ ایمن کیطرف
طور پر روشن ہوئی شمعِ شبستانِ بہار

کہدو افسانہ نگاروں سے رہے اتنا خیال
زینتِ افسانۂ رنگیں ہو عنوانِ بہار

نمونہ دیکھنا ہے جس کو دنیا ہی میں جنت کا
وہ جاکر دیکھ لے طیبہ میں روضہ سیدِ حضرت کا

نچھاور ہوتے رہتے ہیں ستارے چاند اور سورج
رخِ پر نور اک مرکز ہے انوارِ رسالت کا

بتاؤ عرش والو تم میں ایسا ہے کوئی جسکی
جبیں پر ہو درخشاں نیرِ تاباں سعادت کا

زلیخا مثلِ پروانہ فدا تھی شمعِ کنعاں پر
خدا خود بن گیا بلبل گلِ باغِ نبوت کا

خیالِ میکشی بھی ہو مذاقِ بت پرستی بھی
مگر غالب ہو ان دونوں پہ ذوق اسکی عبادت کا

"وفا" کے نام سے تعبیر کرتی ہے جسے دنیا
وہ لفظ اک مستقل عنوان ہے مضمونِ محبت کا

تری نادر تخیل نے دکھایا دن یہ اے اکبر
کہ ادنیٰ رکن تو بھی ہو گیا بزمِ فصاحت کا

جناب اکبر اسمٰعیل صاحب اکبر عدنی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

(کیوں نہ دلکش ہو فضائے)
~~کیوں نہ میخواروں کو بھائے~~ میکدہ
کیف آور ہے ہوائے میکدہ

سن کے مفتی نعرہ ہائے میکدہ
ہو گئے دل سے فدائے میکدہ

(چل گئی)
~~کیا چلی~~ ایسی ہوائے میکدہ
(میکدہ خود ہے)
~~جس کو دیکھو ہے~~ فدائے میکدہ

ہے اگر ساقی خدائے میکدہ
مطرب ہے دل ربائے میکدہ

میں وہ میکش ہوں کہوں گر العطش
(جوش میں آ کر زبان سے)
~~اٹھ کے پی جائے~~ آئے میکدہ

(جو ہوں گرم نوا)
مطرب و ساقی ~~جو دیں تحریک تو~~
مست ہو کر جھوم جائے میکدہ

عشق ساقی میں رئیسِ دیر بھی
بن گیا آخر گدائے میکدہ

بھول جائیں خلد کو حوریں، اگر
دیکھ لیں رنگیں فضائے میکدہ

میکشوں کی بھی ہوں آساں مشکلیں
ساقیٔ حاجت روائے میکدہ

(بادہ کش)
حشر میں جائیں گے ~~جب دم میکشاں~~
ساتھ ہو گا اک لوائے میکدہ

(جب اڑی مینائے زرین سے شراب)
~~نور کی جب پھیل گئیں نہریں~~
جگمگا اٹھی فضائے میکدہ

سیر کو آئیں گے شیخ و برہمن
کہدو ساقی سے سجائے میکدہ

عالمِ ہستی میں اکبر ہم نے آج
نظم لکھی ہے برائے میکدہ

ادیب (۱۸) فیض محمد خاں صاحب اکبرآبادی

آپ کا نام فیض محمد خاں۔ اور ادیب تخلص ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۰۱ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ پٹھان ہیں اور وطنِ مالوف آگرہ ہے۔ آپ کے والدِ محترم منشی بندے خاں صاحب مرحوم کلکٹری کچہری میں پیشکار تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دی اور انٹرینس پاس کیا۔ دورانِ تعلیم میں ڈرائنگ اور حساب میں آپ بطورِ خاص دلچسپی لیتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وکٹوریہ ہائی اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں جب بیپٹسٹ مشن اسکول قائم ہوا تو وہاں آپ کے برادرِ بزرگ منشی نور محمد خاں صاحب ہیڈ ماسٹر ہوئے اور آپ کو سیکنڈ ماسٹر کے فرائض انجام دینے پڑے۔ یہ اسکول عرصہ تک قائم رہا اور آپ نے بڑی توجہ سے کام کیا۔ جب مشن نے خود یہ اسکول توڑ دیا تو آپ نے کئی جگہ کی ملازمت کے بعد پرائیویٹ طریقہ پر لڑکوں کو تعلیم دینا شروع کر دیا۔ ایک سال سے آپ شدید بیمار ہیں۔ دعا ہے کہ خدا آپ کو جلد صحتیاب کرے۔

۱۹۲۲ء میں آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ آگرے کے اکثر مشاعروں میں شرکت کی اور یہ ذوق یہاں تک بڑھا کہ آپ باقاعدہ حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کے شاگرد ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء سے اس وقت تک آپ نے ایک بڑا ذخیرہ کلام کا جمع کر لیا ہے۔ مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں آپ اکثر حاضر ہوتے رہتے ہیں اور مولانا مدظلہٗ کے فیضِ سخن سے آگرہ کے اچھے شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کی غزلیں اکثر قوالی وغیرہ میں حال و قال کا سماں پیش کرتی ہیں۔

کشاکشِ زمانہ سے آپ کو چین نصیب نہیں ہوا۔ ورنہ ادیب صاحب بہت جلد چمک جاتے۔ گو بیماری نے آپ کو بہت زیادہ مضمحل کر دیا ہے۔ لیکن آپ کی روح شعریت سے اب بھی پُر ہے۔ اس عالم میں بھی دل بہلانے کے لیے کبھی کبھی شعر کہہ لیتے ہیں اور مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں لغرضِ اصلاح بھیجتے رہتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

ہو کے بیہوش گرا میں قدمِ جاناں پر — ہوشیاری تو یہی تھی کہ مجھے ہوش نہ تھا
ایک تم تھے کہ تمہیں غیر کا ہردم تھا خیال — ایک میں تھا کہ خود اپنا ہی مجھے ہوش نہ تھا
ہوش تھا جسکو اسے موت نے جینے نہ دیا — جسکو جینے کی ضرورت تھی اسی ہوش نہ تھا

عیش میں غم میں اسی یاد میں کرتا تھا ادیب
وہ کسی وقت مرے دل سے فراموش نہ تھا

چھایا ہوا ہے حسنِ صد رنگ گلستاں پر
کیا تم سنور رہے ہو پھولوں کی تازگی میں

آپ کا بے نقاب ہونا تھا — اور دل پر عذاب ہونا تھا
بخش بھی دی خطا ہوئی مجھ سے — ہو چکا جو حساب ہونا تھا

دل کے مٹنے کا غم ادیب نہ کر
دل کو خود ہی خراب ہونا تھا

باغ ۱۹ مولانا محمد ایوب صاحب چشتی قریشی اکبرآبادی

آپ کا وطن آگرہ ہے مگر آپ عرصۂ دراز سے ترکِ وطن کر چکے ہیں۔ آج کل آپ اجمیر میں مقیم ہیں اور ریلوے کے ایک دفتر میں ملازم ہیں۔

دنیا میں بعض ہستیاں اپنی افتادِ طبع۔ انکسارِ روحانی اور ذوق و شوق کے لحاظ سے ممتاز ہوتی ہیں۔ باغ صاحب بھی ان ہی ہستیوں میں سے ایک ہیں۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے جب برادرِ معظم حضرت منظر صدیقی اکبرآبادی نے آپکو حالات بھیجنے کیلئے لکھا تو آپ نے مندرجۂ ذیل مکتوب جواباً روانہ فرمایا۔

برادرم منظر سلمہٗ اللہ تعالیٰ

بعد دعائے مزید حیات و ترقی مدارج واضح ہو کہ محبت نامہ آیا از حد مسرت ہوئی۔ اللہ پاک جلِ علیٰ دارین میں سرخرو و شاد کام فرمائے۔ آمین۔ جس بارہ خاص میں آپ نے خامہ فرسائی فرمائی ہے اس کے مندرجۂ ذیل امور ملاحظہ طلب ہیں:۔

(۱) میں جناب شیخ ابوالفخر حضرت سیماب صاحب مدظلہ العالی کے دائرۂ تلامذہ میں ہونا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں مگر بمصداق "بدنام کنندۂ نکونامے چند" بایں ہیئت کذائی اپنے آپ کو حضرتِ سیماب صاحب کیلئے باعثِ ننگ سمجھتا ہوں۔

(۲) ثنا جوئی و نیک نامی کا ذوق مدت ہوئی دل سے مفقود ہو چکا ہے۔ اور نہ میں اپنے ناچیز کلام کو مستحقِ ثنا سمجھتا ہوں اس لئے پبلک کے سامنے آنے کی جرأت فعلِ عبث معلوم ہوتی ہے۔

(۳) کلامِ سابقہ کا شائع کرنا حضرتِ سیماب صاحب کیلئے باعثِ ننگ ہے اور موجودہ کلام نہ عام پسند ہے نہ ہم رنگِ مذاقِ جدید۔

(۴) میں جادۂ گمنامی میں رہنا اپنا فخر سمجھتا ہوں اور ہرگز اس قابل نہیں کہ اس سے باہر قدم رکھنے کی جرأت کر سکوں۔

(۵) میرے پاس کوئی ذاتی فوٹو موجود نہیں ہے جو ارسال خدمت کر سکوں۔ علاوہ ازیں اب فوٹو کھچوانا اور شائع کرانا اپنے لئے باعثِ "معصیت" سمجھتا ہوں۔

(۶) احوالِ خاندانی کا ذکر حسب فقرہ ۴ بالکل غیر مناسب ہو جاتا ہے۔

پس یقین واثق ہے کہ وجوہاتِ بالا کی بنا پر آپ مجھے معذور سمجھ کر پبلک کے سامنے رونما ہونے سے قطعی معاف فرمائیں گے۔ اور جادۂ گمنامی ہی میں رہنے کو ترجیح دیں گے۔ ورنہ میں تعمیل کیلئے ہمہ تن تیار ہوتا۔

احقر محمد ایوب باغ چشتی اکبرآبادی عفی اللہ عنہٗ

باغ صاحب کے مندرجۂ بالا مکتوب سے آن کا روحانی درجہ معلوم ہوتا ہے۔ اور طبیعت کی بلندی پر بھی روشنی پڑتی ہے میں نے اس مرتبہ بھی کوشش کی کہ میں باغ صاحب کے مفصل حالات حاصل کروں لیکن ناکام رہا۔ مجھے جو کچھ حالات معلوم ہو سکے اُن کا ذکر کئے دیتا ہوں تاکہ یہ تذکرہ کسی حیثیت سے نامکمل نہ رہے اور مستقبل کا مورخ نام و نمود سے بے نیاز ہستیوں کے متعلق بھی کچھ لکھ سکے۔

آپ صاحبِ دل اور روحانیت مآب بزرگ ہیں۔ صوفی منش اور خدا رسیدہ ہیں۔ شب بیدار اور تہجد گذار ہیں۔ دن بندگانِ خدا کی خدمت میں اور راتیں خدا کی محبت میں گذارتے ہیں۔ آپ مجسمِ اخلاق ہیں۔ مولانا مدظلہ العالی کے قدیم ترین شاگردوں میں سے ایک ہیں ۱۹۱۰ء سے مولانا سیماب مدظلہٗ کے پرستار ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اپنا تازہ کلام تک مجلے شاعت

کیلئے نہیں بھیجا۔ کچھ پرانا کلام بطور نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ نظم و غزل دونوں پر آپ کو قدرت حاصل ہے۔ آج کل نعت زیادہ کہتے ہیں۔ کلام میں پختگی اور سلاست ہے۔

نمونۂ تغزل

یادِ شبِ بحر گل جو سر کوہِ طور تھا   یا سید العرب وہ تمہارا ہی نور تھا
گو معصیت نواز وہ ربِ غفور تھا   لیکن قصور جان کے کرنا قصور تھا
میں اُس کا ہر طرف متلاشی رہا مگر   دیکھا تو میرے دل ہی میں اُس کا ظہور تھا
غش کھا کے حشر تک نہ سنبھلتے کبھی کلیم   یہ خیر تھی کہ ہاتھ میں دامانِ طور تھا
محشر میں تیرے سامنے اُن سے گلے ملا   یا رب خطا معاف کہ میں ناصبور تھا

لکھتا کچھ اور شعر مگر باغ کیا کروں
سنگِ الم سے شیشۂ دل چور چور تھا

تقسیم دوسروں کو مئے پرتگال کر   ساقی پلا مجھے مئے توحید ڈھال کر
اے بندۂ خدا نہ کسی سے سوال کر   اُس بے نیاز ہی سے فقط عرضِ حال کر
دریا کی بات اور ہے یہ دشتِ عشق ہے   رستہ بتائیں خضر ذرا دیکھ بھال کر

ہے دعا یا رب کہ جب تک میرے دم میں دم رہے   دل نبی کی یاد میں، دل میں نبی کا غم رہے
یہ خبر ہے تم نے بلوایا شبِ اسریٰ نہیں   یہ نہیں معلوم کیا کیا مشورے باہم رہے
حشر کے دن یا الٰہی ہاتھ میں دو جام ہوں   ایک میں کوثر رہے اور ایک میں زمزم رہے

نمونۂ نظم

چاند کنارِ آمنہؓ میں

نور فگن ضیا فگن کون یہ مہ لقا ہے   کس کی شعاعِ صبح تا شمعِ جلوہ گاہ ہے
منبرِ بری بنا ہوا سبز چمن گیا ہے   دشت میں حسن آفریں کون یہ کج کلاہ ہے
صلِ علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

جلوۂ مختصر ہے کس کی یہ وسعتِ جمال   کس کی نگاہِ ناز ہے جوہرِ مرآتِ جمال
باعثِ تازگیٔ جاں، مہِ صباحت [illegible] رُخ کمال   غازۂ صورتِ جمال
صلِ علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

کس کے قدوم ناز سے بڑھ گیا پایۂ زمیں   ظلِ فلک کو رشک ہے دیکھ کے سایۂ زمیں
فخرِ متاعِ آسماں، دولتِ مایۂ زمیں   گنجِ امانتِ ازل، حصۂ مایۂ زمیں
صلِ علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

عمر ابھی ذرا سی ہے قد ہے ابھی نہالِ نو   ہاتھ ابھی ذرا سے ہیں رُخ ہے ابھی ہلالِ نو
خیر سے اب قریب ہے آمدِ جشنِ سالِ نو   اتنی سی جان اور پھر منظرِ صد کمال کو
صلِ علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

ہونٹ ابھی کھلے نہیں نطق ہے معجزہ طلب   رنگ ابھی کھلا نہیں، عکس ہے آئینہ طلب
پردے میں ہے رُخِ صبیح حسن ہے صاعقہ طلب   دیکھی نہیں ہے تیغ ابھی ہاتھ ہیں حوصلہ طلب
صلِ علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

چشمِ حسیں کو دیکھئے نازِ نما ابھی سے ہے   نورِ جبیں کو دیکھئے رشکِ سما ابھی سے ہے
کوئی گلہ گلہ نہیں فکرِ جزا ابھی سے ہے   کام ہیں گو زباں نہیں ذکرِ خدا ابھی سے ہے
صلِ علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

دشت میں اس کے دم سے ہے عالمِ نزہتِ چمن   اس کے پسینے کی مہک غیرتِ نکہتِ چمن
عارضِ گل فشاں کی ضو جلوۂ صبحِ چمن   درج تار تنگ میں وسعتِ جلوتِ چمن
صلِ علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

مطلعِ ہاشمی ہے فلکِ علا کا چاند   شمعِ مجالسِ ولا دیدۂ اولیا کا چاند
کوکبِ چرخِ معرفت طالعِ باصفا ہوا   ماہِ نیازِ لِ وفا حضرتِ آمنہ کا چاند
صلِ علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

اس کی ضیا ہے نور بار جب سے نکلا ہے چاند یہ   اس کی چمک سے ماند چاند لگ گئی آسمان میں
ماہِ فلک کو دیکھئے چاند ہے تو ایک ہے   عرش سے سورۂ قمر اتری ہے اس کی شان میں
صلی علیٰ محمد صلِ علیٰ محمد

نورِ نگاہِ قدسیاں سب سے یہ ایک چاند ہے   جلوۂ جہاں میں ضوفشاں صرف یہ ایک چاند ہے
فخرِ زمین و آسماں صرف یہ ایک چاند ہے   جلوہ نما یہاں وہاں صرف یہ ایک چاند ہے

برقؔ — عبدالحمید صاحب صدیقی فتحپوری

خلف جناب محمد عبدالعزیز صاحب ابن محمد عبدالشکور ابن منشی آلٰہی بخش منصف مین پوری۔ اسی طرح سلسلۂ نسب حضرت شیخ سلیم چشتی رح سے ہوتا ہوا حضرت ابوبکر صدیق رض تک پہونچتا ہے۔ آپ کا وطن موضع چتورا (پرگنہ و ضلع فتحپور ہسوہ) ہے۔ بہ روایاتِ غیر مصدقہ سال پیدائش ۲۲ ر دسمبر ۱۸۹۶ء بروز جمعرات ہے۔ آبائی پیشہ زمینداری ہے۔

آپ دس سال کی عمر میں ریاست ریواں (سینٹرل انڈیا) آئے ابتدائی تعلیم مکان ہی پر ہوئی۔ مارچ ۱۹۱۶ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے آپنے انٹرنس کا امتحان پاس کیا جون ۱۹۱۶ء میں وطن میں شادی ہوئی۔ ۱۹۱۹ء سے اب تک آپ ریواں ہی میں مقیم ہیں۔ یہاں بھی کبھی آپ بے کار رہتے ہیں اور کبھی برسر کار کیونکہ زمینداری کی قلیل آمدنی آپکے والد صاحب اور دیگر اہلِ خانہ کے لئے کافی نہیں ہوتی، پھر اس پر احباب و اعزا کی بے مہریاں، غرض آپ ان حالات سے بہت متاثر ہیں چنانچہ آپ کا ایک شعر ہے۔

کہوں کیا عالمِ بے مہریِٔ اہلِ وطن اے برقؔ ٭ مری صبحِ وطن میں منظرِ شامِ غریباں تھا

آپ کے جدِ امجد منشی آلٰہی بخش صاحب مرحوم منصف مین پوری نے اپنی قوتِ بازو سے متعدد مواضعات خرید کئے تھے بہ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء دشمنوں کی سازش سے انہیں باغی قرار دیا گیا اور پھانسی میں عجلت کی گئی۔ چونکہ اپیل پر رہا ہو جانے کا یقین تھا اس لئے بہت کوشش کی گئی اور ایسا ہی ہوا لیکن چند گھنٹے بعد۔ اُن کے پانچوں صاحبزادوں کو جائداد حصہ رسدی ملی جو رفتہ رفتہ سوائے موجودہ قلیل حصے کے کل کی کل فروخت ہو گئی۔ محمد عبداللہ صاحب نے اپنا حصہ فروخت کر کے انڈین امپریل تھیٹریکل کمپنی قائم کی جو انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں بہترین کمپنی مانی جاتی تھی ڈرامے وہ خود لکھتے تھے جو کتابی صورت میں شائع ہوتے تھے اور ان کا حقوقِ اشاعت آگرہ چھوٹا لال کے پریس کو حاصل تھا۔ پانچ بھائیوں میں سے صرف محمد عبدالغفور صاحب عاشق تلمیذ حضرت داغ دہلوی بفضلہ تعالیٰ ہنوز بقیدِ حیات ہیں اور ان کے دو صاحبزادوں میں سے محمد عبدالوحید صاحب قیسؔ تلمیذ حضرت مضطر خیرآبادی جو ریاست ٹونک میں سررشتہ دار ہیں باقی ہیں۔ برقؔ صاحب کے ایک بھائی اور ایک بہن اور ہیں۔

آپ کی شاعری کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ۱۹۱۶ء میں آپ کو گلزارِ داغ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے مطالعہ سے آپ میں ذوقِ شعر گوئی پیدا ہوا۔ روزانہ آپ کافی شعر کہتے تھے اور انہیں محفوظ رکھتے جاتے تھے۔ گاہے گاہے نظرِ ثانی بھی کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ چونکہ آپ کو کسی شاعرانہ صحبت میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا تھا اس لئے آپ کا ذوق ابھی محدود تھا۔ آپ نے کچھ عرصہ بعد دو ایک مقامی صحبتوں میں شرکت کی اور اپنی غزلیں رسالہ "جلوۂ یار" میرٹھ میں بھیجتے رہے جس واقعہ نے آپ کو شاعری کی طرف حقیقتاً متوجہ کیا اس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ رسالہ "جلوۂ یار" میرٹھ میں ایک انعامی مصرع "کیوں برگِ حنا سبز ہے کیوں رنگِ حنا سرخ" تضمین کے لئے شائع ہوا۔ برقؔ صاحب نے دو مصرع اس مصرع پر لگا کر بھیجے۔ ۵۴ مصرعوں کے مقابلہ میں آپ کا ایک مصرع "نیرنگیٔ قدرت کے کرشمے ہیں نہ پوچھو" کثرتِ آرا سے بہترین قرار دیا گیا حضرت آزاد میرٹھی اور حضرت مہر گوالیاری کی دو قابلِ قدر رائیں اس مصرع کی موافقت میں تھیں۔ حضرت مہر گوالیاری نے "جلوۂ یار" کے صفحات پر ایسے الفاظ میں آپکی تعریف کی کہ جس نے آپکے سوئے ہوئے ذوقِ شعری کو بیدار کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری عطیۂ فطرت ہے اور شاعر پیدا ہوتا ہے

The "SHAIR" Agra.
MAY 1937.

عبدالحمید صاحب برقؔ صدیقی فتحپوری

محمد اللہ صاحب بسملؔ

محمد سلیمان صاحب پروازؔ بنگلوری

مسٹر سیموئل لائڈ ثاقبؔ میرٹھی

عبدالحفیظ صاحب ثمر چھپروی بی۔ اے

صاحبزادہ سلطان حامد خاں صاحب ثروت

محمد حفیظ اللہ صاحب حفیظ اکبرآبادی

شہزادہ آغا احمد بیر صاحب حیرت لدھیانوی

بنتا نہیں ہے لیکن جہاں تک اکتساب کا تعلق ہے فن اور اصولِ فن بغیر اکتساب حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپکو بھی ایک کامل الفن شخصیت کی تلاش ہوئی اور آپکی نگاہِ انتخاب حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ پر پڑی ۱۹۲۶ء میں آپ مولانا مدظلہٗ کے دامنِ ادب سے وابستہ ہوگئے جس کے بعد آپکی شاعری میں جان پڑ گئی اب آپ کا کلام ملک کے موقر اور معیاری رسائل میں اہمیت کیساتھ شائع ہوتا ہے۔ اور آپ کی ہستی ادبی دنیا میں وقیع ہستی سمجھی جاتی ہے۔ مولانا سیماب مدظلہٗ کے فیضِ سخن سے آپ نے بہت جلد اپنے معیار کو بلند کر لیا اور آپ کی شاعری میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ آپ کے اشعار سے کہنہ مشقی اور شگفتگی برستی ہے۔ آپ نظم و غزل پر یکساں قادر ہیں لیکن نظم سے غزل بہتر فرماتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

قدرتاً دل شکلِ آئینہ ہی اُس کے ہاتھ میں　　فطرتاً وہ عکس کی صورت ہمارے دل میں ہے

پردہ ہائے غنچہ و گل سے نہ لے چلمن کا کام　　مجھ کو دیوانہ بنانے کا یہ کیا انداز ہے؟

نکلے ہیں جستجو میں ریاضِ جناں سے ہم　　آئے ہیں دیکھ جلوۂ پنہاں کہاں سے ہم
ساقی نے دیکر آتشِ تر آبِ خشک میں　　وہ بات کی ہے کہ نہیں سکتے زباں سے ہم

حشر تک رسوا نہ ہو اپنا مذاقِ انتخاب　　اُن سے بہتر اب نہ دنیا میں خدا پیدا کرے

مقتدی ہے نماز میں عالم　　ایک کافر امام ارے توبہ
برق گلشن میں آشیاں رکھ کر　　توبہ توبہ یہ نام، ارے توبہ

اِن سے آگے بڑھ کہ یہ دیر و کلیسا و حرم　　سنگِ راہِ منزلِ مقصود ہیں منزل نہیں

میری شبِ فراق کی طولانیاں نہ پوچھ　　اب اور سو برس کیلئے حشر ٹل گیا

کہاں تک بارِ غم کی تاب لائے قلبِ انسانی　　مجھے محسوس ہی کرنی پڑی اپنی گرانجانی
مجھے کہنے کو دیوانہ کہو لیکن جو سچ پوچھو　　مرے ارماں ہیں دیوانے، مری حسرت ہے دیوانی

یہ حورِ نظر ساقی! تسنیم اثر بادہ!!　　جنت نہ اگر کہئے میخانے کو کیا کہئے

اُن کی نظریں بسکہ ہیں بالیدگی بخشِ حیات　　غنچۂ دل پر نظر ڈالی گلستاں ہوگیا

وہ بے طلب اُٹھا نہیں سکتی نقابِ رُخ　　کیوں کر بنے کہ ہم نہیں خوگر سوال کے

سکوتِ شب میں کل پچھلے پہر کوئی غزلخواں تھا　　وہ نغمہ! ہائے وہ نغمہ جو مضرابِ رگِ جاں تھا
یہی دل اب جو سینے میں ہے مصروفِ سکوں گویا　　کبھی منت گذارِ شورشِ جذبات و ارماں تھا

ہماری نظر میں ہے وہ فتنہ قامت　　بہ اندازۂ قدِ آدم قیامت

وہ آکے خواب میں کل کہہ گئے "سحر آئیں گے"　　اب انتظار میں ہم خاک خواب دیکھیں گے

زخم سلواتا مگر اس بدگماں کو کیا کہوں　　ہائے وہ لذت جو پنہاں کاوشِ سوزن میں ہے!

ہم نہیں کم ظرف مثلِ زاہدِ تسبیح خواں　　ہاتھ میں پیمانہ رکھدی ساقیا ساغر اُٹھا

حُسن اک پردۂ حائل نظر آتا ہے مجھے　　اُن کا دیدار تو مشکل نظر آتا ہے مجھے
ہم سفر اگلی کدورت کا ذرہ ذرہ　　سنگِ راہ سرِ منزل نظر آتا ہے مجھے
اکبرآباد کا مشہور جہاں "تاج" اے برقؔ　　لیلیٔ حُسن کا محمل نظر آتا ہے مجھے

کثرتِ جلوہ سے گم ہے راہِ محفل کے قریب
کاروانِ شوق آوارہ ہے منزل کے قریب

آ کہ جاں بازی و جانسوزی کا انداز کہاں
کتنے پروانے پڑے ہیں شمعِ محفل کے قریب

رفتہ رفتہ یوں ہی منزل تک پہونچ جائیں گے ہم
گرتے پڑتے جس طرح آئے ہیں منزل کے قریب

بجلیاں گرنے کو رہ رہ کر تڑپتی ہیں مگر
صرف برقِ سوختہ ساماں کے حاصل کے قریب

اُٹھ دلِ بے حس! کسی کے حسن کا دیوانہ ہو
شمع زیبِ بزم ہے، پروانہ بن، پروانہ ہو

دل مرا دنیا سے بیگانہ ہوا تیرے لئے
اب تو اس سے آشنا اے جلوہ بیگانہ ہو

جھوم جائے اے دلِ بے خود فضائے دو جہاں
ہاں سکوتِ شب میں پیدا اک نعرۂ مستانہ ہو

نمونۂ نظم

سحر گشت

میں روز سویرے بستی سے جنگل میں ٹہلنے جاتا ہوں
اور کیف و سرور و صحت کے گل دامن میں بھر لاتا ہوں
اسوقت وہاں میں ہوتا ہوں جب تارے جھلمل کرتے ہیں
انوارِ سحر کے خوف سے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں
جب عکسِ نور سے دنیا میں دھندلا سا اجالا ہوتا ہے
معکوس شعاعیں پڑتی ہیں منہ رات کا کالا ہوتا ہے
جب جامِ صبوحی بھر کے شرابِ ہوش سے دیتے ہوتے ہیں
اور مست مناظرِ فطرت کے انگڑائی لیتے ہوتے ہیں

اب بھیگے بھیگے نور کی بارش پیہم بڑھتی جاتی ہے
سمنسار چمکتا جاتا ہے اور صبح نکھرتی آتی ہے
اب سبزے پر نورانی دنیا دید کے قابل ہوتی ہے
ہر چھوٹی چھوٹی پتی کے دامن پر اوس کا موتی ہے
جنگل کی خوابیدہ بستی اب ہوش میں لائی جاتی ہے
پیڑوں پہ عروسِ صبح کی آمد آمد گائی جاتی ہے
صبائے سحر نے مست نسیم اب دھیمی دھیمی چلتی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی بھینی بھینی خوشبو برساتی چلتی ہے
اب اوس کا اک اک قطرہ ہے آئینۂ لرزاں پتی پر
یا اخترِ سیال درخشاں یا گوہرِ غلطاں پتی پر
شبنم کے قطرے پھولوں کے پتے سے ڈھلکتے ہوتے ہیں
آبِ سرد و تازہ سے پودے ہاتھ منہ اپنا دھوتے ہیں
اب چاند کی روشن کشتی بحرِ نور میں بہتی جاتی ہے
اور اپنی جوانی کے جانے کا قصہ کہتی جاتی ہے

رنگین و دلکش نظارے ہر سمت ہزار اور آنکھیں دو
ان دو آنکھوں سے دیکھوں تو آخر دیکھوں میں کس کس کو
ایسے رنگیں طوفان میں اک لمحہ کیلئے کھو جاتا ہوں
پھر ہوش مجھے جب آتا ہے میں روح کو سرخوش پاتا ہوں
احساسِ کثرتِ نعمت سے دل لذتِ راحت پاتا ہے
تحدیثِ نعمت میں اپنا سر سجدے میں جھک جاتا ہے
محکومِ زباں کو تاثیرِ احساس سے حرکت ہوتی ہے
پھر چپکے چپکے یوں حمدِ خلاقِ خلقت ہوتی ہے

اے خالقِ برتر! سب تعریفیں صرف تجھی کو شایاں ہیں
اے مالکِ محشر! ذات میں تیری رحم و کرم بے پایاں ہیں
تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیری ہی مدد کے جویا ہیں
تو ہم کو راہِ راست دکھا، محتاج ترے اے مولا ہیں

جناب عبدالحمید صاحب برقؔ صدیقی فتحپوری کی غزل پر
حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ کی اصلاح

جلوۂ بے معنی
~~فائدہ ہی کیا جب~~ ارماں دید کا پورا نہ ہو
نہاں
ای تجلی ٹھنڈی رہنے دی بے پردا نہ ہو

ہی کا کیا لطف اے
بادیہ پیما ~~ہو تو کیا خاک~~ ہو پائی جنوں
جب بحدِ شوقِ وحشت وسعتِ صحرا نہ ہو

دی وہ مئی اور اتنی دی ساقی کہ جسکے کیف سے ۲
عشرتِ امروز میں فکرِ غمِ فردا نہ ہو

آنسوؤں کی آبرو ریزی نہ کر ای چشم تر ۴
روک جب تک ان میں ہر بوند اک دریا نہ ہو

وصل کر کی جامِ مئی لبہائی تشنہ سی نہ کھینچ
محبت کے
دل کو پیمانِ وفا دی کر تو بے پروا نہ ہو

اور بھی نظروں کو اپنی وسعتِ نظارہ دے ۴۴
تو جسے ذرّہ سمجھتا ہے کہیں دنیا نہ ہو

خاکِ سرِ دل رنگی لے چلیں ہم بہرِ نذر
احتیاطاً ~~نذر کو کچھ لیکے چلنا چاہیئے~~
دیکھیں کیا آپ سمجھ ہمکو
~~پوچھ بیٹھیں وہ کہ کیا لائی~~ کہیں ایسا نہ ہو

سنتے ہیں رندو کوئی پتھر ہی کعبے میں پڑا
دیکھنا وہ گم شدہ خشتِ خُمِ صہبا نہ ہو

برقؔ تجھ پر ایک دنیا کی نظر پڑتی ہی دیکھ!
اضطرابِ شوقِ بیحد سی کہیں رسوا نہ ہو

(۳۱) مولوی حافظ محمد اللہ صاحب صدیقی اعظم گڈھی (بسمل)

آپ کے والدِ محترم کا نام خواجہ عنایت اللہ خلف خواجہ حمایت اللہ صاحب ہے۔ بسمل صاحب صدیقی ہیں اور آپ کا خاندان نہ صرف شہر اعظم گڑھ میں ذی عزت سمجھا جاتا ہے بلکہ قرب وجوار نیز حکام کی نظروں میں بھی وقیع خیال کیا جاتا ہے۔ بسمل صاحب کے خاندان کے اکثر افراد گورنمنٹ کے ذی عزت عہدوں پر مامور رہے اور اب بھی ہیں۔ آپ کے جدِ امجد خواجہ حمایت اللہ صاحب ابتداً تحصیلدار تھے پھر آنریری مجسٹریٹ رہے اس کے علاوہ کئی مواضع زمینداری میں تھے یہ خاندان انتہائی ذی ثروت خاندان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آپس کی کشاکش اور نااتفاقی نے حالات بد سے بدتر کردئے۔ آپ کے والد خواجہ عنایت اللہ صاحب نے پولیس میں ملازمت کی اور ابھی سب انسپکٹری کے عہدے ہی تک ترقی کی تھی کہ اُن کے والد خواجہ حمایت اللہ کا انتقال ہوگیا خلفِ اکبر ہونے کی وجہ سے زمینداری کی نگہداشت کیلئے وطن جانا پڑا اور ملازمت کو ۱۹۱۶ء میں خیرباد کہہ دیا۔ اس وقت آپ کی عمر اکیاسی سال ہے اور اب تک وطن ہی میں زمینداری کرتے ہیں۔ چونکہ آپ بہت ضعیف ہو چکے ہیں اس لئے اپنے منجھلے صاحبزادے خواجہ عبداللہ عرف خواجہ حسین اختر صاحب کے ذریعہ انتظامِ زمینداری فرماتے ہیں۔ بسمل صاحب کے چھوٹے چچا نے پولیس انسپکٹری سے اور منجھلے چچا نے نائب تحصیلداری سے پنشن لی ہردو اصحاب کا ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوگیا۔

چونکہ یہ خاندان ذی علم اور ذی وقار تھا اس لئے ایک بہت بڑا اور کارآمد کتب خانہ جو نایاب اور نادرالوجود قلمی کتابوں پر مشتمل تھا اس خاندان کیلئے مایۂ صد نازش تھا لیکن افسوس کہ کافی نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے اور آپس کی چپقلشوں سے دیمک کی نذر ہوگیا۔ اس بیش بہا دولت کے ضائع ہونے کا اس خاندان کو آج تک افسوس ہے۔

بسمل صاحب ۱۰ر فروری ۱۹۱۲ء کو اپنے آبائی مکان واقع محلہ آصف گنج شہر اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی ابتداً کلام پاک حفظ کیا اور ۱۹۱۸ء میں پہلی محراب سنائی۔ اس کے بعد عربی تعلیم کے لئے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڈھ میں داخل ہوئے۔ اور ۱۹۲۵ء میں مولوی کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے سکینڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ بعد ازاں تشنگیٔ علم نے آپ کو کشاں کشاں فرنگی محل جیسی باعظمت درسگاہ میں پہونچا دیا جہاں آپ شمس العلما مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محلی و حضرت مولانا عظمت اللہ صاحب جیسے بزرگوں کی خدمت میں رہے اور کسبِ علم کیا ۱۹۲۸ء میں آپنے درس نظامیہ کی تکمیل کی۔

بسمل صاحب نے جس سرعت کیساتھ مسافتِ علم طے کی وہ اسی سے ظاہر ہے کہ ۱۰ سال کی عمر میں حفظِ قرآن اور علوم عربیہ کی تکمیل سے فارغ ہوگئے۔ آپ اس کے بعد یقیناً علومِ جدید کی تحصیل بھی فرماتے لیکن مالی حالت نے اجازت نہ دی اور فکرِ معاش کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اوائلِ ۱۹۲۹ء میں آپ بھوپال آئے اور محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کی اور مختلف عہدوں کی خدمات انجام دیتے رہے۔ آج کل بحیثیت گرداور قانون گو ذمہ دارانہ کام کر رہے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں اپنے عزیز ترین چچاؤں کے انتقال سے متاثر ہو کر چند مصرعے موزوں کیے لیکن اُن کی صحت کا اطمینان نہ ہوتے ہوئے چاک کر ڈالا۔ اس وقت سے ہمیشہ یہی سلسلہ رہا کہ آپ شعر کہتے اور چاک کر دیتے عرصہ تک آپ نے کسی پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں بھی شعر کہتا ہوں چنانچہ سیہور میں آپ کے ایک عزیز ترین دوست محمد عبدالرحمن صاحب قیصر صدیقی ڈپٹی بیوی کو بھی عرصہ تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آپ شعر کہتے ہیں

ؔ یہ بھی اخیر اپریل ۱۹۳۲ء میں مولانا مدظلہٗ کے شاگرد ہو گئے ہیں

جب قیصر صاحب کو اس کا علم ہوا تو حیرت ہوئی۔ اس پر طرہ یہ کہ بغیر کسی خضرِ راہ کے بسمل صاحب اس وادی میں گامزن رہے۔ قیصر صاحب نے جب سبب دریافت کیا تو آپ نے اکثر اساتذہ کا شکوہ کیا اور فرمایا کہ میری درخواستوں کو ٹھکرا کر میرے جذبات کو مجروح کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اب میں اپنی شاعری کو بکواس سے زیادہ نہیں سمجھتا اور کسی سے مخاطب ہونے کی جرأت نہیں ہوتی

قیصر صاحب کو ان واقعات سے افسوس ہوا اور بسمل صاحب کی خوش مذاقی اور ذوقِ شعری کو برباد ہونے سے بچانے کے لئے انہوں نے بسمل صاحب کو مشورۂ سخن کیلئے پھر آمادہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف جہاد کرنیکی کوشش کروں گا لیکن اس شرط پر کہ مجھے جواب خشک نہ دیدیا جائے۔ اور میری درخواست کو ردی کی ٹوکری میں نہ ڈالدیا جائے۔ یہ سوال قیصر صاحب کے لئے بہت اہم تھا انہوں نے خیال کیا کہ اگر اس مرتبہ بھی میری وجہ سے بسمل صاحب کو کوئی تکلیف پہونچی تو میرے لئے باعثِ شرمندگی ہوگا۔ اس کے باوجود بھی آپ نے اپنی عقیدت و واقفیت کی بنا پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کا اسمِ گرامی پیش کیا اور کہا کہ میرے خیال میں فی زمانہ قبلہ مولانا مدظلہ سے بہتر کوئی استاد ملنا مشکل ہے۔ اور یہ اُن کے اخلاق سے بعید ہے کہ وہ باوجود کثرتِ تلامذہ آپ کی درخواست کو رد فرمادیں۔ قیصر صاحب چونکہ مولانا مدظلہ سے ڈبائی میں مولوی حفیظ الرحمان صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی وساطت سے شرفِ نیاز حاصل کر چکے تھے اس لئے آپ نے بسمل صاحب کی درخواست اپنے توسط سے روانہ کر دی۔ مولانا مدظلہ نے اُسے منظور فرمالیا اور ۵ راگست ۱۹۳۶ء کو بسمل صاحب سلسلۂ سیمابیہ میں داخل ہوگئے۔ قیصر صاحب بسمل صاحب کے حالات لکھتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔

بسمل صاحب کو جولائی ۱۹۳۶ء سے پہلے کسی سے اصلاح لینے یا مشورۂ سخن کرنیکا موقع نہیں ملا۔ وہ اپنی عادتِ قدیم کے مطابق اب تک اشعار کہتے تھے اور چاک کر ڈالتے تھے۔ اس لئے کوئی ایسا سرمایہ جمع نہ ہو سکا جو کتابی صورت میں پیش کیا جا سکے۔ میری رائے میں اس کی تمام تر ذمہ داری اُن اساتذہ کے سر ہے جنہوں نے اپنی بے توجہی سے نہ صرف ایک ہونہار فرد کو پستی میں گرانے کی کوشش کی بلکہ ادبِ اردو کو ایک اچھے خاصے ذخیرے سے محروم رکھا۔

میں ممنون ہوں مدیر "شاعر" کا کہ انہوں نے بہت جلد مجھے اپنے مخلص دوست بسمل صاحب کے حالات لکھنے کا موقع دیا۔ حقیقتاً میاں اعجاز سلمہٗ اللہ تعالیٰ کا دنیائے ادب پر یہ ایک احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے آگرہ اسکول نمبر نکال کر سیمابی بحرِ ذخار کے بکھرے ہوئے موتی ایک لڑی میں پرو کر نہ صرف تلامذۂ سیماب مدظلہٗ پر احسان کیا ہے بلکہ مستقبل کے مورخین کے لئے انتہائی آسانی پیدا کر دی ہے۔ اور یہ ان کی نرالی شان کی ادبی خدمت رہتی دنیا تک یادگار رہے گی۔

مجھے آخر میں بسمل صاحب کے متعلق اپنا یہ خیال بھی ظاہر کرنا ہے کہ انہوں نے اپنی علمی قابلیت اور ادبی ذوق کے پیشِ نظر ملازمت کی کچھ موزوں لائن اختیار نہیں کی۔ کاش وہ آج بجائے گرداور قانون گو کے دار المصنفین کے ایک رکن کی حیثیت سے متعارف کرائے گئے ہوتے،

بسمل صاحب کے کلام میں سنجیدگی، سلاست اور بلند خیالی پائی جاتی ہے۔ آپ نظم و نثر دونوں میں مشاق ہیں۔

نمونۂ تغزل

ساقیٔ فطرت جو بادہ بار ہے — ایک دنیا بیخود و سرشار ہے
لٹ رہی ہے اپنے دل کی کائنات — دیدۂ خونابہ گوہر بار ہے
اللہ اللہ حاصلِ ذوقِ سجود — میرا سر ہے آستانِ یار ہے
جس سے ہوجاتا جگر بھی پاش پاش — اب تو وہ تیرِ نظر درکار ہے

چشم ساقی کی کرامت دیکھئے   بے نیازِ جام ہر میخوار ہے
مرحبا تیرِ نگاہِ نازِ دوست   تیرا ہر ناوک جگر کے پار ہے
کیجئے شکوہ نہ بسمل روزِ حشر   اب وہ خود شرمندہ کردار ہے

نگاہِ ناز کا صدقہ متاعِ درد حاصل ہے   سکوں دشمن جسے کہتی ہے دنیا وہ مرا دل ہے
بہاروں کی حقیقت کیا جو دنیا کو رنگیں   یہاں تو کارفرما صرف اک رنگینیٔ دل ہے
تصور کا بھلا ہو بیقراری کے سوا کیا تھا   مگر اب حسن کی رنگینیوں سے رونقِ دل ہے
مری ہی خون سے رنگیں سہی دامن مگر بسمل   بھرے محشر میں کس دل سے کہوں یہ میرا قاتل ہے

نظر نواز تبسم، جگر نواز نظر،   تصرفاتِ لب و چشمِ یار کیا کہنا
امید و بیم کی ہیم کشاکشوں سے ہیں دل   کرشمۂ نگہِ سحر کار کیا کہنا

تری شباب کی رنگینیاں خدا کی قسم   برس رہی ہے چمن پر بہار کیا کہنا
وہ صبحِ شورش و ہنگامہ آفریں تو بہ   یہ پُر سکون شبِ تاریک و تار کیا کہنا
شبابِ حسن کی حسن آفرینیاں بسمل   ہے پتہ پتہ چمن در کنار کیا کہنا

نظم

تخمیس بر نظم علامہ شبلی نعمانی اعظمی

"عدل جہانگیری"

وہ محل جس پہ کسی کی ٹھہرتی تھی نظر   بادِ صرصر کا پہنچنا بھی تھا دشوار ادھر
مار سکتا تھا جہاں کوئی پرندہ بھی نہ پر   قصرِ شاہی ہیں کہ ممکن نہ تھا غیروں کا گذر
ایک دن نورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

عام لوگوں کا جہاں منع تھا آنا جانا   آنہ سکتا تھا کوئی غیر نہ جا سکتا تھا
یہ سمجھ کر کہ گذرگاہ ہے نادانستا   کوئی شامت زدہ رہگیر ادھر آنکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر جا یہ طرف سے قدغن

اپنے برگشتہ مقدر سے وہ ناواقف تھا   اس کو معلوم نہ تھا آہ کہ اب کیا ہوگا
جاتے جاتے وہ جوں ہی سامنے کو گزرا   غیرتِ حسن سے بیگم نے طمنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

کُشتنی تھا، کوئی کہتا ہو انکلا باہر   کوئی کہتا تھا کہ لائی تھی اسے موت اندر
مختصر یہ کہ تھا اس قتل کا چرچا گھر گھر   ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے پڑ گئے ابروئے عدالت پہ شکن

ہوگئی واقعۂ قتل سے جب آگاہی   رُخ سے ظاہر تھا شہنشاہ کا حالِ قلبی
عدل لیکن یہ تھا گویا کبھی لغت ہی تھی   حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

یوں ہوئیں نورجہاں سے وہ کنیزیں گویا   شاہِ عادل نے حضوری میں ہمیں ہے بھیجا
واقعۂ قتل کا جو کچھ ہے غلط ہے کہ بجا   نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بآئینِ حسن

اے شہنشاہِ زمانہ میں خطاوار نہیں   سچ اگر پوچھتے ہیں تو میں گنہگار نہیں
یہ وہ صورت ہے کہ میں مستحقِ دار نہیں   ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن

یہ بجا فرشِ زمیں پر ہے وہ اک تودۂ خاک   یہ بھی سچ میری طمنچہ سے ہوا سینہ چاک
خون سے پھر بھی تو یہ ہاتھ نہیں ہیں ناپاک   اُسکی گستاخ نگاہی نے کیا اسکو ہلاک
کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن

واپس آکر جو کنیزوں نے اشارہ پایا   باادب ہو کے جو بیگم سے سن آئی تھیں کہا
شرع کیا کہتی ہے اس عذر کو بیجا کہ بجا   مفتیٔ دین سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسیکو نہیں کچھ جائے سخن

عدل تحسین کی قابل ہے جہانگیر ترا   عشق میں بھی تو نہ دامانِ شریعت چھوڑا
ان کو کیا علم کہ گذری تری دل پر کیا   مفتیٔ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

فتویٰ شرع کی چرچے سرِ دربار ہوئے   یہ زمیں تو ہے زمیں ہفت فلک کانپ گئے
سطوتِ نورجہاں کی تھے دلوں پہ سکّے   لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے

پر جہانگیر کی پیشانی پہ بل تھا نہ شکن

اف یہی نور جہاں تھی کبھی منظورِ نظر　　آج ہے قصر میں با حالتِ زار و مضطر
ہو کے انصاف سے مجبور شہنشہ نے ادھر　　ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

ہم نے جو حکم دیا ہے وہ بجا لائیں　　ہے تعمیل اسی وقت محل میں جائیں
طوق و زنجیر وہاں جا کے ابھی پہنائیں　　پھر اسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن

بات دیکھی ہوئی ہوتی ہے کہیں ان دیکھی　　عدل کی کوئی نظیر ایسی نہ دیکھی نہ سنی
حالتِ نور جہاں دیکھ کے بھر آیا جی　　یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن

ہے جہاں گیر سے بیگم کو شکایت نہ گلہ　　ہے اگر شکوہ تو تقدیر سے ہی کچھ شکوہ
ہے یہ برگشتہ مقدر کا کرشمہ ورنہ　　اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

اب نہ وہ مست نگاہیں ہیں نہ وہ دل ہے نہ جگر　　اب نہیں ہر قدمِ ناز میں وہ شانِ غیور
اب نہ وہ حسن، نہ وہ دلکشیٔ جلوۂ نور　　اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن

اب کہاں باغ میں وہ بہرِ خرام آتے ہیں　　اب تو مقتل میں بھی آتی ہوئی شرماتی ہیں
اب نہ آتے ہیں کہیں اور نہ کہیں جاتے ہیں　　اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن

ایک ہستی تھی جو دنیا کی نگاہوں میں وقیع　　آج ہی شومیٔ قسمت سے غلاموں کی مطیع
اس کا ہر فعلِ حسن بھی تو ہے اب فعلِ شنیع　　ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

آہ ہر سعی جو ممکن تھی ہوئی جب ناکام　　سامنے آنکھوں کی پھرنے لگا اپنا انجام
با صد اندوہ و بعد ہدیۂ آداب و سلام　　خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن

رنجِ تاراجیٔ کاشانۂ عشرت تھا بجا　　تیرہ و تار نظر آتی تھی ساری دنیا
میرِ دربار جو بیگم کا یہ پیغام ملا　　مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولا جائز ہے رضامند ہوں گر بچۂ و زن

پہلے نمدیدہ تھے سب قصر میں رہنے والے　　یہ خبر سنتے ہی دل شاد نظر آنے لگے
آن کی آن میں جس طرح ہوا بلوا کے　　وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم میں سے کوئی بھی کرتا نہیں منظورِ قصاص　　ہو گیا قتل قضاءً نہیں منظورِ قصاص
مختصر یہ ہے کہ شاہا نہیں منظورِ قصاص　　ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظورِ قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

کوئی پا جائے اگر دفعتاً اورنگ و نگیں　　کر لے اندازہ مسرت کا یہ ممکن ہی نہیں
جھک گئی فرطِ مسرت سے پئے سجدہ جبیں　　ہو چکا جبکہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن

دفع جب ہو گئے یکبارگی یہ رنج و الم　　سو حزنِ نور جہاں کی ہوئی زلفِ پرخم
شاہ کے دل میں کچھ ایسی ہوئی الجھن پیہم　　اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکفِ بیت حزن

جب شہنشاہِ زمن قصر میں دلگیر آیا　　دل پہ بسمل نہ اثر ہوتا یہ ممکن تھا بھلا
رخ پہ زلفوں نے بکھر کر وہ سماں باندھا تھا　　دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من؟

اف یہ جمالِ محفلِ عالم اس کی قدرت کیا کہیے　　کھل گئی آنکھیں دیکھ کے حسنِ منظرِ فطرت کیا کہیے
کالی گھٹائیں، سرد ہوائیں، رنگِ طبیعت کیا کہیے　　ساقی، بوتل، شیشہ، ساغر، گرمیٔ عشرت کیا کہیے
سازِ غم کی تارِ نفس مضراب بنا پھر آہ نہ پوچھو　　نغموں نے کر دیا افشا رازِ محبت کیا کہیے
آنکھ لگی ہیں فرطِ الم سے خون کے آنسو روتا ہوں　　پوچھتے ہیں وہ حالتِ دل اب لکی حالت کیا کہیے
موجِ تبسم ایک طرف طوفانِ تمنا اک جانب　　کشتیٔ دل گرداب میں ہے سیلابِ محبت کیا کہیے
پھر وہی ہم ہیں پھر وہی غم ہے پھر وہی نا شیری آہ　　ہو گئی ان کی چشمِ محبت خوابِ راحت کیا کہیے
آنکھوں میں دیدار کی حسرت جلوۂ رنگیں لے پردہ　　تابِ نظر ہو جس کو نہ بسمل اس کی قسمت کیا کہیے

پرواز — کے محمد سلیمان صاحب بنگلوری آنریری مجسٹریٹ بنگلور (۲۲)

آپ شہر کولار کے رہنے والے ہیں جو میسور کا ایک مشہور مقام ہے والدِ بزرگوار کا نام نامی عبدالکریم ہے۔ کولار میں آپ کے والد ایک ذی عزت زمیندار تھے چونکہ آپ کے ماموں صاحب شہر بنگلور میں مقیم تھے اور آپ کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ۱۹۰۲ء میں پرواز صاحب کو آپ کے ماموں نے متبنیٰ کر لیا۔

آپ نے ابتدائی اردو اور فارسی کی تعلیم مدرسہ "ریاض التعلیم" میں پائی۔ اسکے بعد سرکاری مدرسے سے اُردو مڈل بہت کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ چونکہ آپ کے ماموں صاحب زمیندار اور تجارت پیشہ بزرگ تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ آپ کنڈری اور ٹامل زبانوں میں مہارت حاصل کر کے کاروبار کی طرف متوجہ ہوں۔ لیکن پرواز صاحب کی اعلیٰ ذہنیت اور ذوقِ تعلیم نے ان دو زبانوں کو باقاعدہ حاصل کئے بغیر ہی تجارت میں کافی مہارت پیدا کر لی۔ ان زبانوں تک ہی آپ نے اپنی تعلیم کو محدود رکھنا مناسب نہ سمجھا اور پرائیوٹ طور پر انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے رہے ۱۹۱۱ء میں انگریزی مڈل میں کامیابی حاصل کی اور میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کر دیں۔ اسی اثنا میں آپ کی شادی ہوگئی۔ تجارتی مشاغل کے باوجود بھی آپ تعلیم کی طرف انتہائی توجہ دیتے رہے اور جلد ہی انٹرنس کا امتحان بھی پاس کر لیا اور مہاراجہ کالج میسور کے شعبۂ فلاسفی میں زبانِ فارسی لیکر پروفیسر علامہ شوستری ایرانی سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی اثنا میں اچانک وبائے ہیضہ پھیلی اور آپ کے ماموں صاحب کا انتقال ہوگیا۔ امورِ خانہ داری اور تجارت کی نگہداشت نے آپ کو تعلیم چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لیکن تعلیم سے فطری لگاؤ بار بار ابھارتا رہا اور چند در چند مصروفیتوں کے باوجود بھی ایک سال کے بعد آپ نے جامعۂ میسور سے اجازتِ خاص حاصل کر کے مقامی سینٹرل کالج سے شعبۂ سائنس میں داخلہ کرا لیا۔ تین سال تک سینٹرل کالج میں اعلیٰ تعلیم جاری رہی لیکن افسوس کہ بی اے کا امتحان دینے سے قبل ہی بوجہ آپ کو کالج چھوڑنا پڑا اور ہمیشہ کے لئے اس سلسلہ کو خیرباد کہنا پڑا۔

سرکاری ملازمت سے دلی نفرت تھی اس لئے شغلِ تجارت جاری رہا آجکل بھی آپ بنگلور کے ایک ذی وقار تاجر مانے جاتے ہیں ۱۹۳۵ء میں سرکارِ میسور نے شہر بنگلور میں آنریری مجسٹریٹ کے عہدہ پر آپ کو فائز کیا۔ آپ کو قومی کاموں سے دلچسپی ہے اور دن رات آپ قوم کی فلاح میں مصروف رہتے ہیں۔

جب آپ کی طبیعت میں ذوقِ شعر و شاعری پیدا ہوا تو ابتدا میں آپ نے مولوی قلندر رضا خاں صاحب عطا مرحوم سے اصلاح لی جو صوبہ میسور کے مایۂ ناز استاد گذرے ہیں۔ زمانۂ تعلیم میں مولانا منشی محمود صاحب کی سے سلسلۂ اصلاح جاری رہا۔ لیکن آپ کا ذوقِ شعری ابھی تشنۂ تکمیل تھا۔ ۱۹۲۵ء میں آپ کی نگاہِ انتخاب حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی پڑی اور اس وقت سے آپ مولانا مدظلہٗ کے دامن سے وابستہ ہوگئے ۱۹۲۶ء میں ایک پندرہ روزہ جریدہ "ستارۂ میسور" نکالا جو بہت کامیابی کیساتھ چلتا رہا لیکن تجارتی مشاغل نے اُسے حیاتِ جاوداں نہ بخشی۔ مختلف اور متعدد قومی اداروں کے علاوہ بزمِ ادب اردو بنگلور کے شعبۂ شعر و سخن کے معتمدِ اعزازی بھی آپ رہ چکے ہیں۔ آپنے عرصہ تک مقامی روزنامہ "الکلام" میں رکن اعزازی کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے اخبار "خاتون" بمبئی اور دیگر رسائل و اخبارات میں آپکے فسانے اور غزلیں وغیرہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ "اسرارِ اسلام"

(۲۲۳) تائب — ماسٹر سیموئیل لائڈ صاحب رئیس میرٹھ

آپ ۱۹۰۵ء میں بمقام شہر میرٹھ محلہ شوراب دروازہ پیدا ہوئے۔

آپ پادری صندل لعل صاحب مرحوم لکھنوی کے متبنیٰ بیٹے ہیں۔ پادری صندل لعل صاحب مرحوم کے والد مولچند صاحب نواب واجد علی شاہ کے باڈی گارڈ تھے۔

تائبؔ صاحب کے والد بزرگوار کا نام چارلی لائڈ صاحب ہے جو انتہائی خلیق باوضع اور متمول بزرگ ہیں جن کی مسیحی دنیا میں کافی عزت وقعت ہے۔

تائب صاحب کی تعلیم چھ سال کی عمر سے شروع ہوئی آپ نے مختلف مکتبوں اور اسکولوں میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی ۱۹۱۸ء میں آپ ایک جنگ میں شریک ہوئے اور وہاں سے واپسی پر ۱۹۲۰ء میں مشن ٹریننگ اسکول میرٹھ میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ آپ کو ہندی۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں سے کافی واقفیت ہے۔ جدید اور قدیم فلسفہ پر پورا پورا عبور حاصل ہے۔

آپ تھیولاجیکل کالج بریلی کے گریجویٹ ہیں۔ آج کل پرسبیٹرین کلیسا کاسگنج کے مہتمم ہیں۔ آپ کو ملکی اور دینی خدمات کا بہت شوق ہے ۱۹۲۸ء میں ملک کی ترقی اور بہبودی کو مدِ نظر رکھ کر آپ نے مختلف اضلاع میں دورہ کیا اور وہاں لیکچر وغیرہ دئے۔ ایک میمورنڈم ریمزے میکڈانلڈ اور سائمن کمیشن کو اچھوت اقوام کی طرف سے آپ نے بھیجا جو کتاب کی شکل میں (A cry for Recognition) کے نام سے چھپ چکا ہے۔ آپ نے بہت سے ٹریکٹ بھی لکھے ہیں۔ تائبؔ صاحب مسیحی دنیا میں ایک بلند مرتبت لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی تقریر میں بھی اثر ہوتا ہے۔ آپ اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے دن رات کوشاں رہتے ہیں اور عیسائی مذہب کے علمبردار خصوصی ہیں۔

تائبؔ صاحب فطری شاعر ہیں۔ شاعری آپ کو ورثہ میں ملی ہے۔ شعر بہت عرصہ سے کہتے ہیں ۱۹۱۸ء میں جناب صوفی میرٹھی کے شاگرد ہوئے۔ عرصہ تک ان سے اصلاح لیتے رہے اس کے بعد آپ حضرت نوحؔ ناروی کی طرف رجوع ہوئے اور اپنے کلام کا زیادہ حصہ انہیں دکھایا۔

۱۹۳۳ء میں جب آپ آگرہ میں تھے تو ایک دن آپ حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہ العالی کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے مولانا مدظلہٗ نے اپنی عادت کے مطابق نہایت خندہ پیشانی اور شفقتِ بزرگانہ سے سلوک کیا۔ تائبؔ صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور ایک مصرع میں تبدیلی کے لئے فرمایا۔ چنانچہ تائب صاحب کو اصلاح (جو زبانی تھی) بہت پسند آئی۔ شعر یہ تھا۔

دیکھ لو اے ساکنانِ صورت آبادِ جہاں دفترِ اسرارِ معنیٰ ہے کتابِ زندگی
اسمیں سب کچھ ہے جو باطن کی نگاہیں پڑھ سکیں " " " " "

اسی دن سے تائبؔ صاحب مولانا مدظلہٗ کے پرستاروں میں شریک ہوگئے چونکہ حضرت نوحؔ ناروی مدظلہٗ کی اصلاح بھی آپ کو پسند ہے۔ اس لئے آپ مولانا سیمابؔ مدظلہٗ اور حضرت نوحؔ ناروی مدظلہٗ دونوں حضرات کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔ آپ کا کلام — کوکبِ ہند، المائدہ۔ جلوۂ یار۔ چمنستان۔ سینٹ جانس کالج میگزین۔ روہیلکھنڈ گزٹ اور سعی وغیرہ میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے کلام میں متانت اور سلاست بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں تصوف اور فلسفہ کی بھی جھلک نمایاں ہے جو آپ کی روحانی قابلیت کی بیّن دلیل ہے۔

نمونۂ تغزل

گرا گرا دلِ مضطر پہ بجلیاں صیاد　　سنا سنا چمن و گل کی داستاں صیاد

نہ کر نہ کر جگر و دل کے زخم کو تازہ　　نہ ہو نہ ہو کبھی اب ذکرِ گلستاں صیاد

اٹھا اٹھا کوئی فتنہ کہ بیقرار ہوں میں　　سنا سنا مجھے پھر اگلی داستاں صیاد

بدل بدل کی نگاہیں بھی قتل کرتی ہیں　　سنبھل سنبھل کے جو لیتا ہے امتحاں صیاد

جہاں جہاں بھی فغاں کی تڑپ گئی تائب
وہیں وہیں گریں گلشن میں بجلیاں صیاد

معتبر کب ہے جہاں رنگ و آبِ زندگی　　ہے ہوا میں قصرِ ذراتِ سرابِ زندگی

حشر میں جب سامنے ہوگی کتابِ زندگی　　دفترِ عصیاں کو شرمائیگا بابِ زندگی

اسمیں سب کچھ ہے جو باطن کی نگاہیں پڑھ سکیں　　دفترِ اسرارِ معنی ہے کتابِ زندگی

ہوش کی معراج کیا ہے غفلت بے انتہا　　غفلتِ بے انتہا کیا ہے شبابِ زندگی

آدم و حوا سے بھی جنت میں لغزش ہو گئی　　کس بلا کی نشہ آور تھی شرابِ زندگی

قلزمِ ہستی میں راحت روح کی ممکن نہ تھی　　ایک طوفانِ بلا تھا اضطرابِ زندگی

یہ دلِ درد آشنا اس وقت کتنا شاد تھا　　جلوہ گر ہونے کو تھا جب آفتابِ زندگی

خلوتِ اسرارِ موجودات کہتے ہیں موت　　موت کیا ہے نغمۂ چنگ و ربابِ زندگی

درسگاہِ عشق میں پڑھنا ہے جو کچھ پڑھ بھی لو
ختم اب ہونے کو ہے تائب کتابِ زندگی

جلوۂ یار نگاہوں سے اگر دور نہ ہو　　آدمی حسنِ طلب کیلئے مجبور نہ ہو

کیوں کہوں بات وہ میں جو نہ کرو تم پوری　　کیوں سنو بات وہ تم جو تمہیں منظور نہ ہو

ہے یقیں مجھ کو کہ پھر فرقِ من و تو نہ رہے　　آدمی اپنی حقیقت سے اگر دور نہ ہو

دیکھ ساقی نگہِ مست سے رندوں کیطرف　　یہی ساغر ملے جب بادۂ انگور نہ ہو

جلوۂ عارضِ جاناں کا چھپانا ہے محال　　کہیں بدنامِ نقابِ رخ پر نور نہ ہو

قہر ہے عشق و محبت کی حرارت تائب
کس لئے جانِ حزیں جسم سے کافور نہ ہو

چلے جانا ذرا کاشانۂ دل دیکھتے جاؤ　　رہے ہو مدتوں جسمیں وہ منزل دیکھتے جاؤ

مٹا ہوں جس کی ہاتھوں تم بھی وہ دل دیکھتے جاؤ　　مری پہلو میں بھی ہے ایک قاتل دیکھتے جاؤ

ہے شوقِ بزم آرائی بھی ہنگامہ سے نفرت بھی　　ابھی کیا ہے ابھی تو رنگِ محفل دیکھتے جاؤ

ادھر آئے ہو تو پڑھنا نہ پڑھنا فاتحہ لیکن
مزارِ تائبِ فردوس منزل دیکھتے جاؤ

ہم اسیروں کی ہے کیا صیاد شانِ زندگی　　جا کسی آزاد سے سن داستانِ زندگی

اور ہی کچھ ہیں زمین و آسمانِ زندگی　　تو ہے جانِ زندگی تو ہے جہانِ زندگی

ہے کوئی آفاق میں جو دل کی غم کی داد دے　　ہے کوئی دنیا میں جو سمجھے زبانِ زندگی

ملگئی اسکو عدم کی ایک راہِ مستقیم　　اب نہ ٹھہریگا کہیں بھی کاروانِ زندگی

خاک کے ذرے سے چمک اٹھی جو نکلا آفتاب　　رات کی تاروں میں تھی پوشیدہ جانِ زندگی

دے رہے ہیں جان لاکھوں مر رہے ہیں سینکڑوں　　کس قدر آباد ہے یارب جہانِ زندگی

ختم ہوتی ہی نہیں دل سیر ہوتا ہی نہیں　　عمر بھر سے سن رہا ہوں داستانِ زندگی

داغِ الفت کو نہ کہیں اہلِ الفت کیوں عزیز　　ہے یہ چنگاری فروغِ جاودانِ زندگی

آسمانِ ہند نے تائب جفائیں کیں بہت
بے نشانی میں ملا مجھ کو نشانِ زندگی

پھر نئے انداز سے دل کو درخشاں کر دیا　　پھر ازل نے آفتابِ نو کا ساماں کر دیا

پھر فنا کر کے نرالی زندگی بخشی مجھے　　پھر بجھا کر شمعِ محفل کو فروزاں کر دیا

پھر مری عمرِ خزاں کو ایک بہارِ نو ملی　　پھر بہارِ نو میں رنگ اپنا نمایاں کر دیا

پھر نگاہِ تشنہ میں بھر دی شرابِ زندگی　　پھر کسی کی بادہ گوں جلووں نے حیراں کر دیا

پھر ہوئے بیہوش موسیٰ طور پر بھڑکی بھڑک　　پھر کسی نے جلوۂ پنہاں کو عریاں کر دیا

پھر دلِ مایوس کو بخشی حیاتِ دائمی　　پھر دلِ پر داغ کو رشکِ گلستاں کر دیا

پھر کسی نے مسکرا کر موت سے دیدی نجات　　پھر کسی نے مورد لطف و احساں کر دیا

پھر ملے دل پھر ملیں باہم نگاہیں بار بار
پھر سے تائب زندگی نے مجھکو شاداں کر دیا

ثمر — عبدالحفیظ صاحب صدیقی چھپروی بی اے (۲۴)

آپ کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی مولوی عبدالماجد صاحب ہے۔ جو ایڈوکیٹ ہیں۔ ثمر صاحب یکم فروری ۱۹۱۲ء کو صوبۂ بہار کے مشہور شہر چھپرا محلہ دہیانواں میں پیدا ہوئے۔ آپ سات بھائی ہیں اور ایک بہن ہے دو بھائی آپ سے بڑے ہیں اور باقی چھوٹے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ چونکہ آپ کے والد صاحب کو عربی سے خاص شغف ہے اس لئے آپ نے ثمر صاحب کو ۱۹۲۰ء میں عربی تعلیم کے حصول کے لئے ندوۃ العلما لکھنؤ بھیج دیا۔ آپ کیساتھ آپ کے بڑے بھائی بھی تھے۔ دو برس تک آپ وہاں تعلیم پاتے رہے اور دن رات کی محنت نے آپ کو اس ناکافی زمانہ میں کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ چند وجوہ کی بناء پر اور خصوصیت کے ساتھ ہنگامۂ خلافت سے متاثر ہوکر آپ کو انگریزی تعلیم کی طرف رجوع کیا گیا۔ چونکہ ثمر صاحب میں ذاتی استعداد اور ذوقِ تعلیم بدرجۂ اتم تھا۔ اس لئے ۱۹۳۴ء میں آپ نے انتہائی کامیابی کیساتھ پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور آج کل ایل ایل بی کی تیاری کر رہے ہیں۔

ذوقِ شعری فطرت نے دراثتہً آپکو ودلیعت کیا تھا۔ آپ کے جدِ امجد حضرت مولانا مولوی بخشش علی صاحب مرحوم و مغفور عربی اور فارسی کے عالمِ متبحر تھے اور اپنے حلقۂ عزیزاں و وابستگاں میں بہت زیادہ مشہور و معروف تھے۔ چنانچہ بہت سے تشنہ کامانِ ادب تکمیلِ ذوق کے لئے حاضر ہوکر درس لینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ فارسی زبان میں شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ ایک فارسی دیوان (غیر مطبوعہ) خود اُن ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا یادگار ہے۔ ثمر صاحب کے والد صاحب قبلہ کا بھی ایک دیوان جس میں اردو و فارسی دونوں زبانوں میں کلام ہے غیر مطبوعہ موجود ہے جس کا تاریخی نام "بیان الغرائب" ہے۔ آپ کے والد صاحب کو بھی تاریخ گوئی میں خاص ملکہ ہے۔ لیکن وکالت شروع کر دینے کے بعد آپ نے شغلِ سخن ترک کر دیا ہے۔ نصرت تخلص فرماتے ہیں۔

ثمر صاحب جس زمانہ میں ندوۃ العلما لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے اسی زمانہ میں آپ کی شاعری کا آغاز ہوا۔ وہاں ایک بزمِ سخن بھی قائم تھی چنانچہ آپ اپنے بزرگ احباب اور کرم فرما حضرات سے غزل لکھواتے اور خود پڑھ دیتے۔ یہ سب کچھ تفننِ طبع کے لئے تھا کیونکہ دارالعلوم میں سب سے صغر سن ہونے کی وجہ سے آپ کی شرکتِ مشاعرہ ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اسکول کی تعلیم میں آپ کے ذوقِ شعری نے اور ترقی کی، اب آپ ٹوٹے پھوٹے شعر خود کہنے لگے اور یہ سلسلہ اختتامِ تعلیمِ اسکول تک جاری رہا۔ جب آپ کالج میں داخل ہوئے تو تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ آپ کی شاعری کا معیار بھی بلند ہوتا گیا۔ جب آپکو اپنی رفتارِ فکر سے کچھ اطمینان ہوا تو دو غزلیں اپنے رفیقِ ندوۃ العلما، مولانا سید محمد ابراہیم صاحب نجم ندوی چھپروی بی اے کو برلئے اصلاح بھیجیں۔ نجم صاحب بوجہ تکمیل تعلیمِ عربی اور حسان الہند حضرت مولانا محی الدین صاحب تمنا عماد پوری کے فیضِ سخن سے ادبی دنیا میں روشناس ہو چکے تھے۔ ثمر صاحب نجم صاحب سے کچھ عرصہ تک اصلاح لیتے رہے جس کا اعتراف انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

شاعری آتی نہ تھی در اصل مجھکو اے ثمر　　صحبتِ نجم سخنور نے سخنداں کر دیا

جوں جوں آپ کا معیار بلند ہوتا گیا۔ آپ کی نگاہیں کسی ایسی ہستی کی تلاش میں سرگرداں رہیں جو آپ کے ذوق کی تکمیل بحدِ کافی کر سکے۔ آپ زمانۂ آغازِ تعلیم ہی سے حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ العالی کے

کلام کو بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ادھر مولانا مدظلہ کی تصانیف خصوصاً "سیرۃ الحسین" سے آپ بہت اثر گیر ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں "شاعر" کے خریدار ہوئے اور ایک درخواستِ شاگردی بھی مولانا مدظلہ کی خدمت میں روانہ کر دی۔ مولانا مدظلہ نے جب دیکھا کہ آپ میں وہ جوہر موجود ہے جو ایک حقیقی شاعر میں ہونا چاہیئے تو آپ کی درخواست منظور کر لی۔ ۱۹۳۳ء سے اس وقت تک ذریعۂ خط و کتابت آپ مولانا سے اصلاح لیتے ہیں۔ ثمر صاحب قبلہ مولانا کے انتہائی پرستاروں میں ہیں۔ شفیق استاد کی توجہ نے ثمر صاحب کو تھوڑے ہی عرصہ میں کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ آپ کے کلام میں فلسفہ کی جھلک نمایاں ہے۔ شعر صاف اور بلند کہتے ہیں۔ قدیم اساتذہ میں غالب مرحوم کے کلام کو بہت زیادہ پسند فرماتے ہیں۔ کتابی صورت میں آپ کی کوئی تصنیف نہیں آئی ہے۔ ایک مترجمہ ناول "بدنصیب" مصنفہ وکٹر ہیگو غیر مطبوعہ ہے۔ آپ کے مضامینِ نثر اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں فلسفہ چونکہ آپکے نصاب تعلیم میں تھا اور بی اے تک اس کا بطورِ خاص مطالعہ کیا ہے اس لئے فلسفیانہ اور نفسیاتی مضامین سے آپ کو خاص شغف ہے۔ اس کے علاوہ تنقید۔ ترجمہ۔ افسانے وغیرہ بھی آپ خوب لکھتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

زباں روداد دلکی ترجماں معلوم ہوتی ہے — بہت ہی پُر اثر طرزِ فغاں معلوم ہوتی ہے
مری ہر بات یوں سب پر عیاں معلوم ہوتی ہے — کہ خاموشی بھی گویا داستاں معلوم ہوتی ہے
خدائی کا کرشمہ دیکھتے ہیں دیکھنے والے — حقیقت گو ہر اک شی کی نہاں معلوم ہوتی ہے
پیامِ فطرتِ حق دے رہی ہے ہر زمانے میں — نقیبِ زندگی عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے
نہ ہوتا درد پیدا کاروانِ دلمیں منزل کا — فغاں میری شریکِ کارواں معلوم ہوتی ہے
سبب کیا جو سفر میں ہر قدم پر ساتھ ہے میرے — یہ گردِ راہ میری رازداں معلوم ہوتی ہے
سراسر ای ثمر ہر شعر ہے الہام کا حامل — سخن سنجی بظاہر رائیگاں معلوم ہوتی ہے

اب یہ عالم ہے کہ اک عالمِ جاں سازیں ہے — جانے کیا کیا مری ڈوبی ہوئی آوازیں ہے
لاکھ صیاد کرے بند قفس میں لیکن — ابھی احساس تو باقی پر پروازیں ہے
کر سکا دہر میں اُس کا نہ مداوا کوئی — وہ جو سودائے جنوں وحشئ جانبازیں ہے

سونی پڑی ہے عیش کی محفل تری بغیر — پیمانہ بن کے ٹوٹ گیا دل تری بغیر
مقصد ہوا نہ سعی کا حاصل تری بغیر — منزل پہ بھی ہے حسرتِ منزل تری بغیر

تبسم نگۂ فتنہ کار، کیا کہنا" — بدل دیا ہے رُخِ روزگار، کیا کہنا
مآلِ یک نگہ حسنِ یار، کیا کہنا — بنا ہے خرمنِ دل پُر شرار، کیا کہنا
فریبِ وعدہ وہ حسنِ یار، کیا کہنا — پھر اُس پہ بھی ہے ترا اعتبار، کیا کہنا
جمالِ یار نے تجدیدِ عشق کا پیماں — بیک نگاہ کیا اُستوار، کیا کہنا
مثالِ مہرِ درخشاں نگاہِ باطن میں — چمک رہا ہے دلِ داغدار، کیا کہنا
جنونِ عشق لگائے گا آگ گلشن میں — پھر اب کے آئی ہے فصلِ بہار، کیا کہنا
رہے خیال تقاضائے عمر بھی ناصح — بنوں شباب میں پرہیزگار، کیا کہنا

غمِ دل زندگی میں ابتدا سے انتہا تک ہے — مصیبت سی بری کب کوئی ہنگامِ فنا تک ہے
ثمر ممکن نہیں دل سے تمنا کا نکل جانا — مخالف ہر طرف سے جب زمانہ کی ہوا تک ہے

بحرِ الفت ہے مسلسل موجزن دلکے قریب — وہ سفینہ بھی نہ ڈوبے جو ہے ساحل کے قریب
فطرتِ آزاد کو آزادیاں درکار ہیں — قید میں بھی دل نہیں ہے تا سلاسل کے قریب
خامشی میں بھی کوئی کرتا ہے کیا سرگوشیاں؟ — سُن رہا ہوں آپ اپنی داستاں دل کے قریب
ہر عمل اپنا تقاضائے طبیعت ہے ثمر — میں نہیں جاتا نزاعِ حق و باطل کے قریب

رُباعیات

نیرنگئ شاعر کا زمانہ دیکھا — ہر ایک کا انداز ترانہ دیکھا
کہنے کو بکثرت ہیں سخنور لیکن! — سیماب کو اُستادِ یگانہ دیکھا

راضی بہ رضا ہو وہ جبلت اچھی - فطرت نہ بنا اپنی وہ عادت اچھی
اک دوست سویہ بھی ہمراک عقدہ کھلا ہے دور کی صاحب سلامت اچھی

نمونۂ نثر

"خواب بھی دراصل انسان کی تخیل کا نتیجہ ہے، خواب کی حالت میں دماغ کی حرکت معمولی سطح ہوش پر ہوتی ہے، یہاں تک کہ عمیق نوم میں بالکل مسدود ہو جاتی ہے، بہت سے خواب ایسے ہوتے ہیں کہ بعد بیداری بخوبی یاد رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فوراً آرام گاہ پر جانے کے بعد نمودار ہوتے ہیں، یا فوراً بیدار ہونے کے وقت یا ایسے وقت میں جب کہ غلبۂ نوم کم ہوتا ہے، ایسی حالت میں معمولی اور روزمرہ کے اشغال مثلاً شبیہ و تصویر کی یاد قائم رہ سکتی ہے، لیکن قوتِ تنقید، فراست، و عقل قائم نہیں رہتی، دن کے معیار ممکنات، نفرت، محبت، مزاج اور اسی قسم کی چیزیں گویا قعرِ میں پڑی ہوتی ہیں مطابقت کا کہیں پتہ بھی نہیں ہوتا۔ خواب بھی مانند تخیل و اختراع کے ہے جس میں اسباب مختلف ذرائع سے یکجا کئے جاتے ہیں اور اس طرح اُن کی ترتیب ہوتی ہے۔ کہ جس کا پہلے تجربہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی لئے ایسی چیزوں کا اجتماع بحالتِ خواب اکثر ناموزوں و ناموافق ہوتا ہے۔ (گنجینۂ پٹنہ)

"فی زمانا عموماً وہ اشخاص جو ذوقِ شاعری سے نا آشنا، عقلِ سلیم سے محروم، تہذیب و اخلاق سے بعید، رشک و حسد کے مجسمہ اور "چار پائے بر و کتابے چند" کے مصداق ہوئے انہیں کی زبانِ بے عناں سے آپ اکثر استدلال میں تذکرہ بالا جملہ سنیں گے، فلسفۂ شاعری کوئی ایسی معمولی شے نہیں جس کو گلی، کوچوں میں گانیوالے اور باشش اور فونوگراف کے ریکارڈوں سے یا اُن چند یا وہ گو شعراء کے کلام سے جو املا تک درست نہیں لکھ سکتے اور جن کا مقصد محض زنانِ بازاری کی خوشنودی ہوتا ہے سمجھ لیا جائے، اگر اسی کا نام

جناب عبدالحفیظ صاحب ثمر صدیقی چھپروی بی اے کی غزل بر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

نشاط انگیز جب ~~جز دور آور کبھی~~ انسان کی تقدیر ہوتی ہے
تو خود ~~سحاب~~ بیٹھے بٹھائے غیب سے تدبیر ہوتی ہے

حصولِ مدعا میں رائیگاں تدبیر ہوتی ہے
یہ دنیا ہی یہاں تو ~~امور دنیوی~~ کی کارکن تقدیر ہوتی ہے

کسی سے دل لگانا بھی گنہ میں ہو گیا داخل
وہیں جہاں کچھ بات ہوتی ہے معاً تشہیر ہوتی ہے

مصیبت میں ہر انساں کو ہے لازم صبر ایوبی
ہمیشہ بارشِ رحمت میں کچھ تاخیر ہوتی ہے

مری روداد غم کو کہتے ہیں وہ اب یہ ہنس ہنس کر
کہیں خوابِ جوانی کی کوئی تعبیر ہوتی ہے

کے بے انتہا بھی رہتا ہے اس کا سلسلہ باقی ~~سوا صبر و تحمل کے کوئی چارہ نہیں ممکن~~
عجب دنیا میں قیدِ غم کی بھی زنجیر ہوتی ہے

ذرا رکھنا حفاظت سے مری نامے کو اے قاصد
دلِ صد چاک کا ٹکڑا ~~کے ٹکڑے~~ مری تحریر ہوتی ہے

جہاں کو سوزِ ~~فرقت سے~~ اپنے جلا کر خاک کر دیتا
مگر اک مصلحت ~~محبت ہی~~ کہ رہ رہ کے دامن گیر ہوتی ہے

جہاں کے ذرہ ذرہ ~~کو جو دیکھو جسم بیاسے~~ میں عکس ہے ذات الٰہی کا
بہر صورت ہر اک ~~یہاں ہر شکل و صورت~~ میں کوئی تصویر ہوتی ہے

ثمر تیری غزل بھی ~~شاہد لطفِ معانی~~ میں بر بنائے جذبۂ پنہاں
کتابِ دل کی گویا مختصر تفسیر ہوتی ہے

ثروت — صاحبزادہ سلطان حامد خاں صاحب آف جاؤرہ (۲۵)

ثروت صاحب جاؤرہ کے مشہور حکمراں خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ نواب عبدالغفور خاں صاحب ریاست جاؤرہ کے نواب تھے اور اُن کے والد نواب عبدالحمید خاں صاحب سوات کے قبیلۂ تاجکتری سے تھے جو اکبر ثانی کے زمانہ میں ہندوستان وارد ہوئے۔ اور شاہ اکبر ثانی ہی کے یہاں ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے نواب عبدالحمید خاں کے بڑے لڑکے نواب عبدالغفور خانصاحب کو اپنی اعلیٰ اور بے لوث خدمات کے صلہ میں ریاست جاؤرہ ملی۔ اپنے والد صاحب کی ننہال کی طرف سے آپ کا رشتہ تیسری پشت میں نواب شمس الدین احمد خاں صاحب والیٔ فیروز پور سے ملتا ہے۔ آپ کی ننہال ٹونک میں ہے اور آپ کی والدہ مکرمہ قریبی رشتہ سے اعلیٰ حضرت نواب صاحب خلد آشیاں آف ٹونک کی بھتیجی ہیں۔ آپ ۵ ۲ر مارچ ۱۹۱۶ء کو ریاست جاؤرہ میں پیدا ہوئے۔ دس برس کی عمر تک گھر پر قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ کو ہائی اسکول میں داخل کیا گیا اور آپ نے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ آپ کو فارسی ادب اور ادبِ اردو سے خاص لگاؤ ہے۔ چنانچہ پرائیویٹ طور پر آپ نے ان دونوں زبانوں میں کافی دستگاہ حاصل کر لی ہے۔ مطالعہ اور غور و فکر نے آپ کو منزلِ ترقی سے بہت قریب کر دیا ہے اور بہ لحاظ عمر آپ میں وہ جوہر پائے جاتے ہیں جو اس عمر کے لوگوں میں کم ملیں گے۔ آپ نے صحت کی خرابی کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم فی الحال ترک کر دی ہے۔

شاعری آپ کا موروثی ذوق ہے۔ فطرت نے شعریت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ آپ کی شاعری کی ابتدا زمانۂ طالب علمی سے ہوئی اور یہ ذوق بڑھتے بڑھتے آپ کی طبیعت پر اتنا غالب آیا کہ آپ بے تکان مشقِ سخن فرمانے لگے۔ ذوقِ سخن کی تدریجی ترقی کے بعد آپ کو اس شاہراہ کے لئے کسی رہنما کی ضرورت تھی چنانچہ مارچ ۱۹۳۲ء میں جب وقت مولانا سیماب مدظلہ العالی ریاست ٹونک میں تشریف فرما تھے آپ اُن کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ شفیق استاد کے فیضِ سخن نے آپ کو مطمئن کر دیا اب آپ کا معیارِ سخن برابر ترقی کر رہا ہے۔ اکثر مقامی و غیر مقامی مشاعروں میں آپ شرکت فرماتے ہیں۔ سلور جوبلی کے مشاعرۂ خصوصی میں آپ کو انعام بھی مل چکا ہے۔ آپ کی طبیعت جدت پسند ہے۔ شعر سمجھ کر کہتے ہیں۔ آپ صرف غزل کہتے ہیں۔ ابھی تک دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی نہیں فرمائی۔

نمونۂ تغزل

وفا یا فریبِ وفا چاہتا ہوں — محبت میں اک آسرا چاہتا ہوں
فقط ایک جلوہ فقط اک تبسم — گناہِ وفا کی سزا چاہتا ہوں

مست مے الفت ہیں ہم آپے میں نہیں ہیں
ڈھونڈو تو کہیں بھی نہیں دیکھو تو یہیں ہیں

مقامِ غور ہے اے دل وہ کیا ٹھہرے تھے کیا ٹھہرے
نہ ترشے تھے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھہرے

آپ میں اب دو نہیں یہ کہہ رہا ہے آئینہ — میری صورت میں ہے عالم آپ کی تصویر کا

الفت ہے مجھ کو آپ کی تیرِ نظر کے ساتھ — رکھتا ہوں سکو جان کو دل اور جگر کے ساتھ
اللہ رے فتنہ گریہ ریاکاریاں تیری — تو بھی شریکِ غم ہے مری نوحہ گر کے ساتھ

ہوں بے نشان اپنے نشاں کی تلاش میں　　کھویا گیا ہوں آپ ہی اپنی خبر کیساتھ
جس جس پہ بزم میں ہو نظر مجھ سے پوچھئے　　میری نگاہ بھی ہے تمہاری نظر کیساتھ
آثار کہہ رہے ہیں حریم بہار کے　　وحشی لپٹ کے رو دئے ہیں دیوار و در کیساتھ

ثروت بشر ہے خیر بشر کا غلام ہے
ہوگا ضرور حشر میں بھی خیر البشر کے ساتھ

اشک ہیم کہہ رہے ہیں داستانِ آرزو　　کسقدر دلکش ہے اندازِ بیانِ آرزو
حسرتوں کا خون ہوتا ہے تو دل ہوتا ہے شاد　　سود ہے تیری محبت میں زیانِ آرزو
زندگی میں جس کے ہنگاموں سے دنیا تنگ تھی　　اب ہے اک شہرِ خموشاں وہ جہانِ آرزو
پردہ رکھ لے آرزو کا اے جہاں کی پردہ دار　　آرزو تیری ہے تو ہی پاسبانِ آرزو
خلد ہے کنجِ لحد حرماں نصیبوں کیلئے　　چین دے زیرِ زمیں گر آسمانِ آرزو

یہ بھی اے ثروت وقارِ خسروی سے کم نہیں
ملگئی فرمانروائی جہانِ آرزو

قدم ٹکنے نہیں دیتی کہیں یہ دل کی بیتابی　　پھرا کرتا ہوں میں عالم میں دورِ آسماں ہو کر
کیا دستِ جنوں نے ٹکڑے ٹکڑے جیب و داماں کو　　گریباں بھی تو اڑ جائیگا یہ بھی دھجیاں ہو کر

گردش تری نگاہ کی تقدیر ہے مری　　شوخی میں تیری لطف مرے اضطراب کا
رکھتا ہوں بیخودی میں بھی عالم کی میں خبر　　جامِ جہاں نما ہے پیالہ شراب کا
پرتو ہے داغِ عشق کا سارے جہان میں　　ذرہ ہے ماہتاب اسی آفتاب کا
چکر میں رات دن مجھے رکھتا ہے یہ فلک　　گردش میں جس طرح ہو پیالہ شراب کا

عدم سے کس لئے لایا گیا ہوں　　یہاں کیوں لا کے شرمایا گیا ہوں
یہ ذلت ہے مجھے عزت سے بہتر　　تری ٹھوکر سے ٹھکرایا گیا ہوں
نہ سمجھا آج تک اپنی حقیقت　　معموں ہی میں الجھایا گیا ہوں

محبت میں ہر چند دشواریاں ہیں　　مگر کچھ اسی میں مزیداریاں ہیں
ادھر ہے مسلسل نیازِ محبت　　اُدھر مستقل عربدہ کاریاں ہیں
بسر کر رہے ہیں مصیبت کی راتیں　　شبِ غم ہے اور ہم ہیں بیداریاں ہیں

وہ پھر جلوہ فرما ہیں بے پردہ ثروت
پھر اب جان لینے کی تیاریاں ہیں

قیس کے دل میں بس گئی لیلیٰ　　اب وہ پردہ رہا نہ محمل کا

تری نقشِ قدم سے ساری دنیا مجھ کو کعبہ ہے　　کہ میں نے اپنی پیشانی یہاں رکھدی وہاں رکھدی
نہ ہو کیوں افتخار ان کو جہاں آرائی پہ اپنی　　کہ انکی شکل میں خالق نے تصویرِ جہاں رکھدی

اے خضر رہتے حشر تک ہم آشنائے عشق　　تم چھوڑ آئے آبِ بقا کو غضب کیا
مانا کہ ان کی جور کی عادت نہ جائیگی　　چھوڑا اگر امیدِ وفا کو غضب کیا
کیا کچھ ہوائیں باندھیگا وہ شوخ پر جفا　　پیغامبر بنایا صبا کو غضب کیا

خلقت میں ان بتوں کی سوائے ستم نہیں　　پتھر کا دل ہے نام کو رحم و کرم نہیں
بتخانہ ہو کہ کعبہ۔ کلیسا کہ میکدہ　　وہ سر ہی کیا جو تیری محبت میں خم نہیں
اے شیخ اس میں سیر ہے دونوں جہان کی　　رندوں کا ہے پیالہ یہ کچھ جامِ جم نہیں

تھے وہ دل میں اور ہم سارا جہاں دیکھا کئے　　وہ کہاں تھے اور ہم انکو کہاں دیکھا کئے
بے لبسی و بیکسی میں دل پہ جو گذری نہ پوچھ　　آشیاں اجڑا کیا ہم نیم جاں دیکھا کئے

عجب تماشہ ہے رونے پہ میری ہنستے ہو　　جھڑی ہے اشکوں کی کچھ سیرِ آبشار نہیں
جنوں نے جیب و گریباں کے کردئے پرزے　　یہ طرفہ تر کہ ابھی موسمِ بہار نہیں

رُباعی

ہر طرح سے مشکل میں گرفتار ہے دل　　نادان ہے دوست اور دشمن عاقل
ہے تابِ نہفتن نہ مجالِ گفتن　　گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

جمالؔ — خان عابد رضا خاں صاحب صابری آف علیگڑھ (۲۶)

آپ افغانستان کے مشہور قبیلۂ یوسف زئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے
مورثِ اعلیٰ نے احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان کے زمانے میں ترکِ وطن کیا۔ آپکے
جدِ امجد محمد افضل خاں صاحب یوسف زئی محلہ بنی اسرائیل (علی گڈھ) کے رفیع رُوسا
میں سے تھے۔ جمالؔ صاحب ۱۹۱۰ء میں محلہ بنی اسرائیل علی گڈھ میں پیدا ہوئے۔
آپکے والد خان حسن رضا خاں صاحب مرحوم انسپکٹر نزول علی گڈھ ایک باوقار
اور مشہور بزرگ تھے۔ جمالؔ صاحب خاندان چشتیہ اور صابریہ کے سلسلہ کے ایک
بزرگ حضرت مولانا سید مزار حسن شاہ صاحب سے بیعت ہیں اس لئے اپنے نام کے
ساتھ صابری لکھتے ہیں اور جمالؔ صابری ہی کے نام سے دنیائے ادب میں مشہور ہیں۔
جمالؔ صاحب نے آٹھ سال کی عمر میں کلام پاک ختم کیا اور اردو فارسی کی تکمیل کی
طرف متوجہ ہوئے۔ فارسی اور انگریزی تعلیم کی تکمیل کے بعد فکرِ معاش نے آپکو عدالتِ
ججی علیگڈھ میں کھینچ لیا اور آپ وہاں عرصہ تک ملازم رہے لیکن فطرت آپ سے
کچھ اور کام لینا چاہتی تھی اس لئے ملازمت کا سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ ترکِ ملازمت
کے بعد آپ ادبی دنیا میں روشناس ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آپ کے بھانجے
حضرت ساغرؔ نظامی آگرہ میں مدیر پیمانہ تھے۔ چونکہ جمالؔ صاحب ساغرؔ صاحب
کے حقیقی ماموں ہیں اس لئے اُن کی وساطت سے آپ ۱۹۲۴ء میں حضرت مولانا
سیمابؔ مدظلہ، کے تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ اور ساتھ ہی حامد رضا خاں صاحب
تبسمؔ نظامی جو آپ کے چھوٹے بھائی ہیں حضرت مولانا کے دامن سے وابستہ ہوگئے
گویا صحیح معنوں میں حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ سے وابستہ ہونے کے بعد اس خاندان
میں حقیقی شاعری اور خدمتِ ادب کا جذبہ پیدا ہوا۔ مولانا کے فیضِ سخن اور نیک
مشوروں نے جمالؔ صاحب۔ ساغرؔ صاحب اور تبسمؔ صاحب کو ادبی اسٹیج پر لاکر
کھڑا کر دیا۔ میں یہاں یہ بھی ظاہر کرنا باعثِ مسرت سمجھتا ہوں کہ مولانا مدظلہ،
کو جمالؔ صاحب سے انتہائی محبت ہے اور آپ اُن شاگردوں میں ہیں جن کے
کلام اور علمی خدمات سے مولانا ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔

ادبی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد سب سے پہلے آپ نے پنجاب کے رسائل
اور اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کئے جو بہت زیادہ مقبول ہوئے۔
اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کو کافی شہرت حاصل ہوگئی۔ فیروزپور (پنجاب)
کے مشہور اخبار "نصرت" کے پروپرائٹر نے اس اخبار کے لئے جمالؔ صاحب
کی اعزازی خدمات حاصل کیں اور آپ اُس کے مدیر اعزازی ہوگئے۔ ابھی آپ
یہ فرائض انجام دے ہی رہے تھے کہ ہفتہ وار اخبار "شعلہ" فیروزپور نے آپ کو
بحیثیت مدیر اپنے یہاں بلالیا۔ ان اخبارات کی خدمات آپ بحد کافی فرما چکے
تو اپنے وطن تشریف لائے۔ اس زمانہ میں حضرت ساغرؔ نظامی علیگڈھ سے
"علیگڈھ پنچ" شائع کرتے تھے چنانچہ اس کا تمام بار جمالؔ صاحب نے
برداشت کیا اور ساغرؔ صاحب کے وہاں سے تشریف لے جانے کے بعد اپنی
اڈیٹری اور ملکیت میں اُسے عرصہ تک چلاتے رہے "علی گڈھ پنچ" مرحوم نے
ہندوستان کی مذاحیہ دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور ایسے ایسے فکاہی
مضامین پیش کئے کہ بڑے بڑے مزاح نگار مان گئے۔ علی گڈھ پنچ کی ادارت
نے جمالؔ صاحب کو ظرافت کا باوا آدم بنا کر پیش کیا اور اس دنیا میں بھی آپ کافی
مقبول ہوگئے۔ شاعری کی شہرت کے ساتھ ساتھ آپ کی ادبی خدمات بھی
بڑھتی گئیں یہ وہ زمانہ تھا جس وقت نوجوانوں میں فلمی دنیا کی پذیرائی کیلئے
جذبات لاتناہی پائے جاتے تھے اور ہندوستان کا ہر حصہ اس سے اثر گیر
تھا۔ چنانچہ جمالؔ صاحب کو بھی اس دنیا سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس زمانہ میں
کلکتہ سے ایک اردو کا فلمی رسالہ "فلم ریویو" شائع ہوا۔ یہ اپنی شان کا
پہلا اور ہندوستان کا دوسرا فلمی پرچہ تھا۔ جمال صاحب کو اس کی ادارت
کے لئے بلایا گیا۔ چنانچہ آپ کلکتہ تشریف لے گئے۔ اس رسالہ کے ذریعہ

جمال صاحب نے فلمی دنیا اور اُردو کی بہت خدمت کی۔ فلم میں بوسہ بازی کے خلاف آپ نے شدید احتجاج کیا۔ اور مسلسل کاوشوں اور کوششوں کے بعد یہ ناپاک حرکت فلم کمپنیوں نے کم کرنا شروع کردی۔ آپ پہلے شخص تھے جن کی آواز نے یہ کارِ عظیم انجام دیا جس کے لئے واقعی جمال صاحب قابلِ مبارکباد ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں دہلی سے دو فلمی پرچے شائع ہوئے جن کے مالکان خود علی گڈھ تشریف لائے اور جمال صاحب کو مجبور کیا کہ وہ بحیثیت نگراں اپنا نام رسالوں پر شائع کرنے کی اجازت دیدیں۔ جمال صاحب چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ صنعت ترقی کرے اور رسائل وغیرہ اس باب میں کچھ خدمات کرسکیں اس لئے اپنی مصروفیت کے باوجود اُن حضرات کی درخواست منظور کرلی۔ حال یہ تھا کہ آپ علی گڈھ پنچ بھی ایڈٹ کرتے تھے اور ہندوستان کے دیگر رسائل و اخبارات کو بھی مختلف طریقوں سے مدد پہونچاتے تھے۔ فلمی دنیا کے خلاف آپ کے دل میں شعلے بھڑک رہے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ لغو اور بیہودہ فلم بننا بند ہوجائیں اور وہی فلم بنیں جو ملک کی بہبودی کے ساتھ ساتھ اردو اور شاعری کا خون نہ کریں۔

۱۹۴۲ء میں آپ "بزم خیال" بمبئی کے آل انڈیا مشاعرہ کی شرکت کے لئے ۳۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو بمبئی تشریف لے گئے۔ گویا بمبئی کی ادبی فضا نے آپ کو خود دعوت دی اور اس مشاعرے کے بعد آپ بمبئی کے مشہور اخبار "ترجمان" (جو اسوقت مسٹر محمد حسن سابق ایڈیٹر خلافت بمبئی و مدینہ بجنور کی ادارت میں نکل رہا ہے) کے مدیر معاون ہوگئے۔ ۶ ماہ وہاں کام کرنے کے بعد آپ ہفتہ وار پنچ بہادر اور "روشنی" بمبئی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ آپ کی خدمات کا شہرہ بمبئی میں عام ہوگیا اسی زمانہ میں روزنامہ "طوفان" بمبئی کی ادارت بھی بڑی سرگرمی کے ساتھ کی۔ ان اخبارات اور رسائل کی ایڈیٹری کے علاوہ جمال صاحب "سنگیت فلم کمپنی" میں پبلسٹی منیجر مقرر ہوئے اور اس کمپنی کے پہلے شاہکار "تلاشِ حق" کے گانے لکھے۔ جو بہت مقبول ہوئے یہاں فلم سے پہلے بمبئی کی کسی کمپنی نے اتنے اچھے گانے پیش نہیں کئے تھے۔

ہفتہ وار دھواں دھار بمبئی اور مشہور فلمی اخبار "مصور" میں جمال صاحب نے مدیر اعلیٰ کے فرائض انجام دئے اور "مصور" میں ایک نیا انقلاب پیدا کردیا۔ بمبئی میں دو سال ادبی خدمت کرنے کے بعد آپ کو "خلافت" نے اپنے ادارہ میں شریک کرلیا۔ روزنامہ خلافت کے سنڈے ایڈیشن کا سہرا جمال صاحب ہی کے سر رہا۔ اسی زمانہ میں بمبئی سے ایک فلمی پرچہ "تصویر" شائع ہوا جس کی ادارت جمال صاحب کے سپرد کی گئی۔ جس وقت آپ "تصویر" میں کام کررہے تھے۔ اس وقت آپ کے ایک مخلص دوست مسٹر خورشید (علیگ) نے (جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں بی اے کے طالب علم ہیں) ایک رسالہ "نشاط" کے نام سے علی گڈھ سے نکالا۔ اور جمال صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اس کی ڈائرکٹری منظور فرمائیں چنانچہ باوجود چند در چند مصروفیتوں کے آپ کو اپنے عزیز دوست کی آرزو پوری کرنی پڑی۔ حال ہی میں مشہور و معروف اخبار "چوپنچ" کلکتہ میں آپ بطور مدیر معاون چند ماہ کام کرچکے ہیں۔

جمال صاحب کی دس سالہ ادبی خدمات پر اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو ایک بہت بڑا مضمون مرتب ہوسکتا ہے۔ آپ بحیثیت مجموعی اب تک مندرجۂ ذیل اخبارات و رسائل کی مدیر و نگراں رہے ہیں۔

۱۔ "نصرت" فیروزپور (پنجاب) ۲ "شعلہ" فیروزپور (پنجاب) ۳۔ علی گڈھ پنچ ۔۴۔ "فلم ریویو" کلکتہ ۔۵۔ "فلم آرٹ" دہلی ۔۶ "تصویر" دہلی ، ۷ "ترجمان" بمبئی ۔۸ "دھواں دھار" بمبئی ۹۔ "پنچ بہادر" بمبئی ۱۰۔ "روشنی" بمبئی ۔۱۱۔ "مصور" بمبئی ۔۱۲۔ روزنامہ "طوفان" بمبئی ۔۱۳۔ ہفتہ وار خلافت بمبئی ۱۴۔ "تصویر" بمبئی ۔ "نشاط" علی گڈھ "چوپنچ" کلکتہ وغیرہ وغیرہ۔

آپ نے فلمی خدمات بھی بہت زیادہ کی ہیں۔ آپ کی تین مکمل اسٹوریاں بمبئی میں فروخت ہوچکی ہیں جو عنقریب اسکرین پر آنیوالی ہیں دو فلموں کے مکالمے اور کئی فلموں کے گانے بھی لکھ چکے ہیں۔ فلم کے ٹیکنک سے بھی خوب واقف ہیں اور فلم ڈائرکٹری بہت اچھی طرح کرسکتے ہیں۔ فلمی مضامین لکھنے اور فلموں پر تنقید کرنے کا آپ کو خاص ملکہ ہے اور فلموں کے عروج میں آپ کا

زبردست ہاتھ ہے۔ آپ کی پیہم تنقیدوں نے فلمی ذہنیت کو یکسر بدل دیا ہے آپ سیاسی اور قومی تحریکوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ جمالؔ صاحب کو فنِ موسیقی سے فطری لگاؤ ہے بچپن سے آپ کو اس کا شوق ہے۔ آپ کی آواز میں ایک خاص قسم کا لوچ اور درد ہے اس فن سے خوب واقف ہیں اور بہت اچھا گاتے ہیں اس کے علاوہ کئی ساز بھی بجا سکتے ہیں۔ گویا آپ ہمہ صفت موصوف ہیں۔

آپ کی شادی متھرا کے مشہور وکیل محمد وکار اللہ صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ عزیزہ عابدہ نسرین جمال سے ۱۹۲۲ء میں ہوئی تھی۔ نسرین صاحبہ بیحد قابل اور نیک خاتون تھیں ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ افسوس کہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۳ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے جمالؔ صاحب نے شادی نہیں کی۔ مرحومہ نے ایک لڑکا یادگار میں چھوڑا ہے جس کا نام شاہد جمال ہے۔ اور اب اسکی عمر ۸ سال ہے۔

جمالؔ صاحب کی تصانیف کئی ہیں لیکن سب غیر مطبوعہ ہیں۔ آپ کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ عنقریب شائع ہونیوالا ہے افسانوں کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے ان کے علاوہ تیغ اللغات۔ فلم اللغات اور پنچ کہانیاں وغیرہ وغیرہ بھی چھپنے والی ہیں۔ آپ ایک خوش وضع اور خوش پوش انسان ہیں۔ اردو کے شیدائی اور ایک ہونہار نوجوان ادیب ہیں۔

نمونۂ تغزل

تصور میں رہے جو ہم اُسے زندا سمجھتے ہیں
جدا رہنا تری جلووں سے مرجانا سمجھتے ہیں

بھلا دیتی ہیں حسن سنگر اڑا دیتی ہیں باتوں میں
وہ رودادِ دلِ وحشی کو افسانہ سمجھتے ہیں

فریب اتنے دئے ہیں حسنِ نیرنگِ تماشا نے
تجھے بھی ہم نگاہِ شوق کا دھوکا سمجھتے ہیں

جنہیں تاریخ پایانِ محبت یاد ہے اب تک
وہ ہر ذرہ کو اک اجڑی ہوئی دنیا سمجھتے ہیں

نگاہِ شوق اپنا کام پورا کر چکی۔ یعنی
جمالؔ اب تک مجھے وہ اپنا دیوانہ سمجھتے ہیں

آئینہ بنکر تری پیکر کو دل میں رکھ لیا
تیری آنکھوں سے تری رعنائیاں دیکھا کئے

جو تری نقشِ قدم سی بنگئیں عرشِ سجود
اُن زمینوں کو بہ حسرت آسماں دیکھا کئے

پینے والوں نے بہ مقدارِ طلب پی لی مگر
ہم تو ساقی کی نگاہِ مے چکاں دیکھا کئے

میں بہ حسرت دل میں اُن کی تیر کو دیکھا کیا
وہ بہ حیرت اپنی ہاتھوں میں کماں دیکھا کئے

جاذبِ نظارہ تھا حسنِ لبِ زیریں جمالؔ
نیچی نظروں سی ہلالِ مے چکاں دیکھا کئے

چھوڑا نہ عشق نے انہیں رسوا کئے بغیر
مانے نہ اہلِ حشر بھی چرچا کئے بغیر

ممکن نہیں جبیں کو عروجِ سکون ملے
اُس آستانِ ناز پہ سجدہ کئے بغیر

خوش ہو کے پی گئی کہ نہ تھا لطفِ زندگی
زہرِ غمِ فراق گوارا کئے بغیر

لے آئی خود نمائی انہیں بزمِ عام میں
آیا نہ چین انجمن آرا کئے بغیر

چُھٹ کے کہاں یہ خوش نظرانِ مذاقِ عشق
مانے نہ حشر میں بھی اشارہ کئے بغیر

طاری رہی نمود کی جلوہ اسے جمالؔ
آنکھیں رہیں نہ باز تماشا کئے بغیر

مطرب فضول چھیڑ دیا میرا شعرِ غم
نغمے تڑپ کر رہ گئی تیری رباب میں

وحشت کا کاروبار رہی حدِ نگاہ تک
دیوانہ ساز ہیں یہ بہاریں شباب میں

کس کس نظر پہ کیجئے تنقید اے جمالؔ
حوریں بھی تکتی ہیں انہیں کو شباب میں

کاش ہو مدِ نظر کوئی خوشی میری لئے
وہ بنائیں گی نظامِ زندگی میری لئے

اپنے اندر جذب کر لی جو تیری رعنائیاں
ڈھونڈنے نکلا ہوں ایسا آئینہ تیری لئے

اجالی بزمِ دشمن کو کبھی آئی میری راتوں میں
مری قسمت کو یہ جلسے کبھی میری بھی گھر آئے

نہ بیمار ہیں ہم نہ بیماریاں ہیں
کسی کی بلاؤں کی عیاریاں ہیں

جمالؔ اُن کی رحمت کریں گی تلافی
بڑی کام کی یہ سیہ کاریاں ہیں

نمونۂ نظم

"ہندوستان"

اے میرے دلدار وطن آ
کرلوں تجھ کو پیار وطن آ

تیری نہریں پیاری پیاری — امرت کے سو چشمے جاری
پھول اور کلیاں اکھیت کیاری — اور یہ پربت بھاری بھاری
جنت کی تصویریں ساری — تجھ سے ہے دل کو سرشاری
ہے تجھ میں کیا افسوں کاری — روح میں تجھ سے ہے بیداری

اے میرے دلدار وطن آ
کرلوں تجھ کو پیار وطن آ

چھائی بدریا کالی کالی — کھیتوں میں آئی ہریالی
آئیں ہوائیں مستی والی — رنگ پہ آئی ڈالی ڈالی
تو ہی میرے دل کا مالی — میری راحت کا رکھوالی
تجھ سے دنیا میں خوشحالی — اُف رے تیری شانِ جمالی

اے میرے دلدار وطن آ
کرلوں تجھ کو پیار وطن آ

آ میں تجھ کو گیت سناؤں — گیت سناؤں اور رُلاؤں
اپنے دل کے داغ دکھاؤں — داغ دکھاؤں باغ دکھاؤں
ٹوٹے من کی بات بتاؤں — پریم کی تجھ کو ریت سکھاؤں
موقع ہو تو حشر اٹھاؤں — تیری بگڑی بات بناؤں

اے میرے دلدار وطن آ
کرلوں تجھ کو پیار وطن آ

نمونۂ نثر

"اگست کے آخری مہینے میں قیصر باغ کا شاداب میدان، فخر آزادی کے جشن دن کی خوشیوں میں گونج اٹھا اس کے مورثِ اعلیٰ اس ہونہار بچے کو اپنی گود میں لیکر ہزاروں ہندوستانیوں کے سامنے کھڑے ہوئے اور اُسکی ولادتِ باسعادت کی خبر دی سب نے بچے کی پیشانی پر چٹاچٹ بوسے دئے پھر مسرتوں کی اچھوائی تقسیم ہوئی کسی نے آنکھ بند کرکے پی لی۔ کسی کو اچھو ہو گیا۔ کسی نے پینے سے انکار کر دیا اور جب گھٹی کا نسخہ تجویز ہوا تو ہندوستان کے بعض شناسوں میں بربنائے تجربہ اختلافات ہونے لگے جن میں سے بہت سے نیم حکیم خطرۂ جاں" بھی تھے پنڈت موتی لال نے اس ہونہار بچے کا نام "نوآبادی" رکھنا چاہا مگر اُن کے صاحبزادۂ بلند اقبال نے کہا کہ میں اس کا نام مکمل آزادی تجویز کرتا ہوں میری نواسی آ منگرنے بھی یہی نام پسند کیا مولانا حسرت موہانی نے فال کھولی اور وہ بھی دوسرے ہی نام سے متفق ہو گئے مگر بوڑھے موتی لال جی کا تجویز کردہ نام "تازہ بہ تازہ نو بہ نو" مصلحت اور دور اندیشی کو سامنے رکھتے ہوئے "نوآبادی" ہی رہا اور اسی پر تمام کنبے داروں نے گردنیں ہلادیں۔"

نمونۂ مزاح نگاری

"خدا بخشے مولانا سرسید علیہ الرحمۃ نے آب وہوا دانہ گھاس زمین اور ہر چیز کو دیکھ بھال کر علی گڈھ شریف میں علمی کاشت کا انتظام کیا تھا یہ زمین کچھ ایسی پھولی پھلی کہ ہر سال دھڑیوں پیداوار ہونے لگی اور پیداوار کی قیمت بازار کے بھاؤ سے کچھ اچھی ہی ملتی رہی انگریزی ڈائریوں میں کمبت کم ہو تو یہ دوسری بات ہے کہ خدا کا اور حکومت انگریزیہ بہادر کی تھی اس سئے پیداوار کے لئے زمین کی لین دین میں جھگڑا پڑا اگر اسٹریچی نے جو اس وقت یو پی کے لفٹیننٹ گورنر تھے سرکار سے کہہ سن کر ایک لمبی چوڑی زمین دلوادی چنانچہ اُن کے نام پر کالج میں "اسٹریچی ہال" بن گیا اور خدا کے نام پر یہ زمین جوتنے اور بونے کے لئے ہموار کی جانے لگی۔

جذبی — منشی محمد اسمٰعیل صاحب الغوی کوچین

آپ ۱۲۹۴ھ میں بمقام شہر النی ٹراونکور پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام نامی غلام حسین تھا جو ایک کامیاب ترین وکیل تھے آپ نے سات آٹھ سال کی عمر میں کلام اللہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد مختلف مدارس میں اُردو فارسی و عربی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ آپ کو السنۂ مشرق سے خاص رغبت تھی اس لئے ان زبانوں میں بحدِ کافی مشق ہونے کے بعد تلاشِ معاش میں مصروف ہوگئے۔

۱۳۱۵ھ میں مطبع عامر الاسلام واقع النی میں کچھ عرصہ تک کتابت کی۔ اس مطبع کا انتظام بھی آپ ہی کے سپرد تھا۔ مالک مطبع جناب مولانا مولوی مفتی سلیمان ابن آدم صاحب مرحوم ایک مشہور و معروف عالم اور دہلی کے تعلیم یافتہ قوم میمن کے ایک فرد تھے جذبی صاحب نے آپ سے علمی استفادہ بھی کیا اور چونکہ آپ تعلیم کے جویا تھے اس لئے مولوی صاحب مرحوم نے بھی بڑی شفقت و مہربانی سے آپ کی رہنمائی کی۔ ۱۹۱۹ء میں انجمن حمایت الاسلام (کوچین) کے سکریٹری اور دیگر اراکین کا ایک خط مولوی صاحب کے پاس پہونچا جس میں درسِ اُردو کے لئے جذبی صاحب کو طلب کیا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم نے آپ کو کوچین بھیجدیا اور آپ انجمن کے مدرسہ میں اُردو کی درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اسی اثنا میں میمن جماعت کی جامع مسجد میں پیش امام کی ضرورت ہوئی اور تمام حضرات نے باالتفاق جذبی صاحب کو یہ عہدۂ جلیل عطا کیا اب تک آپ اس اہم فرض کو بحُسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ مدرسہ بند ہو جانے کی وجہ سے درس و تدریس کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔

۱۹۰۸ء میں سیٹھ حاجی عبدالرحیم بن حاجی احمد مرحوم المتخلص عامر شہر النی میں مقیم تھے۔ اس زمانہ میں میلاد شریف کا چرچا وہاں بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ جذبی صاحب کو ہر مجلس میں مدعو کیا جاتا تھا اور آپ کی میلاد خوانی کی وہاں بڑی دھوم ہو گئی تھی آپ کا ذوقِ شعری اسی زمانہ سے چمکا اور آپ وقتاً فوقتاً غزلوں پر عامر صاحب سے اصلاح لینے لگے۔ جب عامر صاحب وہاں سے چلے گئے تو آپ نے حضرت منعم ترچناپلوی مرحوم سے اصلاح لینی شروع کی۔ اُن ہی کی وساطت سے آپ کا کلام گلزارِ خلد۔ مداح النبیؐ۔ منورِ شفاعت۔ اور آبِ حیات وغیرہ میں چھپنے لگا۔ اس کے علاوہ آپ کو قومی جلسوں میں بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ تلاوتِ قرآن اور آپ کی قومی نظموں سے لوگ بہت محظوظ ہوتے تھے۔

کچھ عرصہ تک آپ نے اپنی پریشانیوں اور معاشی فکروں سے تنگ آکر شاعری کا سلسلہ بند کر دیا تھا لیکن بھلا فطری ذوق کہیں دب سکتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں یہ دبی ہوئی آگ بھڑکی اور اس مرتبہ ایسی شعلہ باریاں کیں کہ آپ بے اختیار ہو گئے اور پہلے سے زیادہ فکرِ سخن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ اب مذاقِ سخن کی تکمیل ہو جائے اور یہ بغیر استاد کامل ناممکن تھا۔ آپ نے اپنی رہبری کیلئے "شاعر" جاری کرایا جس کے مطالعے سے آپ کو بہت فائدہ ہوا۔ کوچین میں حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کے ایک شاگرد حضرت جانیؔ مرحوم نے جب آپ کے ذوق کو اس درجہ بڑھا ہوا پایا تو مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں عرضداشت بھیجنے کے لئے کہا۔ آپ خود بھی یہی چاہتے تھے کیونکہ مولانا مدظلہٗ کے بے انتہا مداح تھے۔ جانیؔ صاحب کے کہنے سے گویا آپ کی دلی مُراد بر آگئی چنانچہ آپ نے اپنی غزل مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں بھیجی۔ جانیؔ مرحوم نے بھی سفارش کی اور اس طرح آپ مولانا کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اس وقت سے اب تک سلسلۂ اصلاح جاری ہے اور آپ کا رنگِ شاعری دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ آپ کو مولانا سے بطورِ خاص ارادت ہے۔ اور مولانا کیلئے ہر وقت صحت و عافیت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ آپ کا کلام سادہ لیکن قابلِ مطالعہ ہوتا ہے۔

نمونۂ تغزل

مجھے وصفِ آقا کا کیا حوصلہ ہے
میں ناچیز کیا میری مدحت ہی کیا ہے

بلالو مدینہ مجھے یا محمدؐ
کہ جی ہند میں میرا گھبرا رہا ہے

پریشانیوں میں بسر ہو رہی ہے
مرے دل کی حالت خدا جانتا ہے

بصد شوق لکھا کروں نعت احمدؐ
یہی آرزو ہے یہ ہی مدعا ہے

اگرچہ ہے جذبیؔ گنہگار و عاصی
مگر مدح گو یہ غلام آپ کا ہے

ہر وقت نہیں اچھا قسمت کا گلہ کرنا
بیکاروں کی باتیں ہیں بیکار رہا کرنا

بس اب تو یہی جذبیؔ اک مشغلہ ہے اپنا
اشعار کے لکھنے میں مشغول رہا کرنا

نام اللہ کا ہم لے کے جیا کرتے ہیں
حبذا نعت محمدؐ کی لکھا کرتے ہیں

یاد فرمائیں گے کب ہم کو شہنشاہ عرب
مدعا دل میں ہمیشہ یہ رکھا کرتے ہیں

اللہ اللہ نہ دیکھی کبھی طیبہ کی بہار
اشک آنکھوں سے اسی دھن میں بہا کرتے ہیں

موت آئے تو مدینے ہی میں آئے ہم کو
اپنے اللہ سے ہر دم یہ دعا کرتے ہیں

فیض سے حضرتِ سیمابؔ کے جذبیؔ صاحب
خوب تر نعتیہ اشعار لکھا کرتے ہیں

دلِ شوریدہ کو کب آئے قرار
دیکھے جب تک نہ مدینہ کی بہار

طاقتِ ضبط نہیں یا اللہ
ہند میں ہے مرا جینا دشوار

جی میں آتا ہے مدینے جاؤں
اپنے محبوب کا دیکھوں دربار

چمکے کب نجمِ مقدر میرا
دیکھوں کب گلشنِ یثرب کی بہار

دے گا مولا مجھے مدحت کے طفیل
گلشنِ خلد میں گھر بے تکرار

رخِ روشن کا تصور ہر دم
جلوہ گر ہے مرے دل میں سرکار

لطف اس پر ہو مدینہ والے
تیرا مداح ہے جذبیؔ ناچار

اپنی قسمت سے مجھے ہے ابھی شکوا باقی
ہند سے ملکِ عرب ہے مرا جانا باقی

ہو عطا دولتِ دیدار [illegible]
آنکھ میں شوق ہے اور دل میں تمنا باقی

کشورِ ہند سے کب جاؤں گا طیبہ یا رب
حسرتیں دل میں ابھی ہیں مری صدہا باقی

مجھ کو لے چل تو صبا بہرِ خدا نزدِ حضور
رہ نہ جائے کہیں دل میں یہ تمنا باقی

یاد فرمائے اب جذبیؔ مسکیں کو حضور
نام لیوا ہے اک ادنیٰ یہ تمہارا باقی

پیشوا حشر میں ہو جائے گا مولا میرا
مجھ گنہگار کا حامی ہے وہ آقا میرا

نارِ دوزخ سے رہائی کی ہے امید قوی
باغِ فردوس میں لیجائیگا مولا میرا

حشر میں پیشِ خدا بخششِ امت کیلئے
ہاتھ پھیلائے ہوئے آئیگا آقا میرا

جز فنا کچھ بھی نہیں ہے اعتبارِ زندگی
ہے فریبِ مستقل میں کارگاہِ زندگی

کیوں نہ مرغوبِ نظر ہو اپنا یہ وقتِ شباب
حالتِ پیری میں کیا ہوگی بہارِ زندگی

مسکرا کر دل لبھاتے ہو مرا
پھر گراتے ہو مجھی پر بجلیاں

زندگی کے بعد پھر اک زندگی
زندگانی ہے وبالِ جاوداں

نمونۂ نظم

"کھیل کھلاڑی دنیا"

مجذوب کبھی ہے مجنوں
مفتوں ہے کبھی ہے مشحوں

اے مستِ شرابِ فطرت
ہے کھیل کھلاڑی دنیا

تصویرِ خیالِ رعنا
یا نقش و نگارِ زیبا

سو طرح کی بدلے رنگت
ہے کھیل کھلاڑی دنیا

ہوتی ہے کبھی ہم مذہب
بنتی ہے کبھی ہم مشرب

اللہ رے اس کی فطرت
ہے کھیل کھلاڑی دنیا

اس بحر میں جذبیؔ اچھا
مضمون جو تو نے لکھا

سامع کو ہوئی کیفیت
ہے کھیل کھلاڑی دنیا

حیرت شہزادہ آغا احمد سیر صاحب درانی (۲۰)

آپ افغانستان کے "سدوزئی" قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جب شاہ عباس کبیر نے شہر قندھار پر قبضہ کیا تو غلجئی (یا خلجی) قبیلہ کے محمود نے ایک جنگی مقام پر قبضہ کرکے لوٹ مار کی تھی اور جس کی ایک بڑی سلطنت دہلی میں بھی قائم تھی محمود مع قبیلہ عبدل کے مطیع ہو گیا کچھ دنوں کے بعد بادشاہ کے کارکنوں کی ظلم پرستی کے خلاف قبیلۂ عبدل کے ایک شخص کو شاہ عباس کے پاس شکایت کی غرض سے روانہ کیا اس شخص کا نام تھا "سدو شاہ" جو ایک فصیح البیان مقرر تھا۔

شاہ عباس اس کی قابلیت سے بہت متاثر ہوا اور اس کی خواہش کے مطابق اس نے حکام کو معزول کر دیا چنانچہ سدو عبدالی کی نسل سے ایک عظیم الشان قبیلہ پیدا ہوا۔ جو آج تک "سدوزئی" کے نام سے مشہور ہے احمد شاہ عبدالی اسی قبیلہ کا ایک فرد کبیر ہے۔ سنہ ۱۱۰۶ھ میں سلطان حسین صفوی کے زمانے میں جو سلاطین صفوی کا آخری فرمانروا تھا اس قبیلہ نے بغاوت کی جس کا محرک آزاد خاں عبدالی تھا جس نے ہرات میں ایرانیوں کے خلاف حکومت قائم کی عبدالیوں نے خراساں پر بھی سنہ ۱۱۳۵ھ میں حملہ کیا اور محمود کی قوت نے سلطنت ایران حاصل کی یہی لفظ "عبدالی" اب کثرت استعمال سے "ابدالی" ہوگیا۔

شاہ اشرف کی وفات سے جو محمود کے قتل کے بعد ایران کا بادشاہ ہوا نادر شاہ کی وفات تک افغانی ایرانیوں کے ماتحت رہے لیکن نادر شاہ کے بعد احمد خاں عبدالی سدوزئی جو نادر شاہ کی فوج میں تھا افغانیوں اور ازبکوں کی فوج لے کر آٹھا اور ایرانیوں پر حملہ آور ہوا۔ ایرانیوں سے افغانیوں کا سخت مقابلہ ہوا جلد ہی احمد شاہ نے قندھار پر قبضہ کر لیا اور اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور خود شاہِ افغان کا لقب اختیار کیا نیز عبدالی قبیلے کو درانی کا خطاب دیا یہ وہی احمد شاہ ہے جس نے ہندوستان پر چھ مرتبہ فوج کشی کی اور ہر مرتبہ کامیاب و کامراں رہا۔

یہ عظیم المرتبت بادشاہ قبیلۂ سدوزئی سے تھا، جو افغانوں میں نہایت عظمت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت احمد شاہ درانی رخلد آشیاں، صاحب عزم مدبر، صاحب عقل و فراست، عالم، حکیم، وسیع الاخلاق، نیک طبیعت، شریف فطرت اور منصف مزاج تھے۔

شہزادہ احمد سیر صاحب حیرت کا سلسلۂ نسب اسی رفیع المنزلت ذات سے ملتا ہے سلسلۂ نسب کی تاریخی ترتیب اس طرح ہوتی ہے:-

(۱) اعلیٰحضرت احمد شاہ درانی

(۲) تیمور

(۳) شاہ زماں

(۴) شاہ شجاع الملک والئ افغانستان

(۵) شہزادہ فرخ سیر

شاہ شجاع الملک کے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہی عہدِ ملوکیت کی سیاسیات عجیب و غریب ہوتی تھیں۔ شاہ شجاع کا انتہائی زوال عطا محمد خاں والئ کشمیر کے قریب سے ہوتا ہے جو سلطنتِ افغان کا مطیع و وفادار تھا پہلے اس نے شاہ شجاع الملک سے "دریائے نور" جو بیش قیمت ہیرہ تھا شاہ شجاع الملک کی مجبوری کے عالم میں حاصل کیا، شاہ نے اخلاقی مدد چاہی تھی مگر اس نے ہیرہ کے عوض پندرہ لاکھ روپیہ دیا تھا اس کے بعد ایک سیاسی مراسلے کے جواب میں جو شجاع الملک کی طرف سے عطا محمد خاں کو پہونچا تھا پانچ ہزار فوج لیکر پشاور کی طرف چل دیا

اور پہنچتے ہی حملہ کر دیا شاہ شجاع اس کی آمد کو اپنی مدد تصور کر رہا تھا مگر وہ شاہ کو قید کر کے اپنے ہمراہ کشمیر لے گیا لیکن ایک سیاسی کشمکش کے بعد شاہ شجاع پھر آزاد ہو گئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ لاہور آ گئے۔

بالآخر مہاراجہ رنجیت سنگھ سے بھی الگ ہو کر وہ انگریزوں کے مہمان ہو گئے اس کے بعد انگریزوں کی مدد سے قندھار پر حملہ آور ہوئے اور کہندل خاں سے مقابلہ ہوا شاہ کو شکست ہوئی اور ہرات و بلوچستان ہوتے ہوئے پھر ہندوستان واپس ہو گئے۔ بعدۂ پھر افغانستان پر حملہ کیا اور تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اس کے بعد کابل میں شجاع الدولہ خاں نے آپ کو قتل کر دیا۔

کامراں کی وفات سے خاندان سدوزئی کے حاکمانہ تسلط کا خاتمہ ہو گیا، احمد شاہ عبدالی نے اپنی شجاعت اور تدابیر سے جو ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی اس کے اخلاف نے اپنی خواہشوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اس دردناک انقلاب کے بعد حکومتِ برطانیہ کی معیت میں شہزادہ فرخ سیرؒ یعنی احمد سیر صاحب حیرتؔ کے جدِ امجد اپنے بھائیوں کیساتھ لدھیانہ (صوبہ پنجاب) میں وارد ہوئے اور حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ان کو دوسو روپیہ ماہوار سیاسی پنشن ملتی رہی۔

شہزادہ فرخ سیر کے صاحبزادے شہزادہ محمد ظفر الدین (احمد سیر صاحب کے والد ہیں) سب انسپکٹر پولیس کے عہدہ پر مامور تھے لیکن خرابیٔ قسمت کی وجہ سے ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ آپ کو دولتِ برطانیہ کی طرف سے پنشن ملتی تھی۔

حیرتؔ صاحب اپنے خاندان میں روشن خیال، حساس، صاحبِ فہم و فراست شخص ہیں آپ کی عمر اس وقت تقریباً ۴۰ سال ہے ہر چند آپ اپنی نسلی اور وطنی خصوصیات کے لحاظ سے بھاری بھرکم انسان نہیں ہیں، لیکن آپ کے خدوخال میں افغانیت اور درانیت کا پورا جلال موجود ہے۔ آپ کی تعلیم لدھیانہ ہی میں ہوئی علوم مشرقیہ مولانا عبدالغفور صاحب بلوچستانی سے اور انگریزی تعلیم مشن ہائی اسکول لدھیانہ میں حاصل کی۔ چند مجبوریوں کی وجہ سے آپ کی تعلیم اس پایہ تک نہ پہونچ سکی جو آپ کا مطمحِ نظر تھا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد بعدۂ پر وبیشنل سب انسپکٹر) بلوچستان پولیس میں ملازمت اختیار کی اور چار پانچ سال تک اس عہدے پر آپ فائز رہے پھر قومی تحریک سے متاثر ہو کر ملازمت چھوڑ دی۔ اور اس وقت سے اب تک تجارت میں مشغول ہیں شہزادہ صاحب خلیق۔ باظرف اور وضعدار انسان ہیں اور کیوں نہ ہوں جب کہ ایسے عظیم المرتبت شاہی خاندان کے فرد ہیں لیکن آپ نے اس نسبت کو جو شاہی خاندان سے آپ کو ہے کبھی باعثِ عزت نہیں سمجھا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ "پدرم سلطان بود" کے ہم قائل نہیں۔ آپ کا لباس قطعی سادہ ہوتا ہے انتہائی منکسر المزاج انسان ہیں۔ جو شخص بھی آپ سے ملتا ہے وہ انتہائی خوش ہوتا ہے۔

آپ حضرت علامہ مولانا سیمابؔ مدظلہ العالی کے زمرۂ تلامذہ میں ۱۹۳۱ء میں داخل ہوئے۔ جب اوائلِ اگست ۱۹۳۱ء میں مولانا مدظلہٗ لدھیانہ تشریف لے گئے تو آپ ہی کے یہاں مقیم ہوئے اور وہیں حیرتؔ صاحب شاگرد ہوئے۔ آج تک ذریعۂ خط و کتابت آپ اصلاح لیتے ہیں۔ مولانا مدظلہٗ کے شاگردوں میں آپ بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور مولانا سے اس درجہ محبت فرماتے ہیں کہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مولانا مدظلہٗ کے سلسلۂ ارادت میں ہونا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مولانا کا کوئی شاگرد اپنے نام کے ساتھ "سیمابی" لکھے یا نہ لکھے لیکن آپ ضرور لکھتے ہیں آپ کو بچپن ہی سے شعر گوئی اور مطالعۂ سخن کا شوق ہے۔ لیکن اس دنیا میں آپ نے ۲۲ سال کی عمر سے قدم رکھا ہے۔ ابتداً منشی عبدالقیوم خاں صاحب خاکیؔ لدھیانوی سے اردو و فارسی کلام پر اصلاح لی لیکن ذوقِ بلند نے آخر اپنا صحیح مرکز تلاش کر لیا۔ مولانا مدظلہٗ کے مشورہ سے آپ کے کلام میں چار چاند لگ گئے۔ لکھنؤ۔ کلکتہ۔ حیدرآباد۔ ناگپور۔ کامپٹی۔ کوئٹہ۔ لدھیانہ وغیرہ وغیرہ مشہور شہروں میں آپ نے اکثر مشاعرے پڑھے ہیں اور انتہائی کامیابی کیساتھ۔ آپ کی نظمیں اور غزلیں رسائل و اخبارات وغیرہ

میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ نے دوسرے لوگوں کے لئے بہت کچھ کلام کہا اور بہت سے شاعر بنا دئے۔

حیرت صاحب کی شاعری میں قومی آمیزش نے ایک ارتقائی رنگ پیدا کر دیا ہے آپ غزل و نظم دونوں کہتے ہیں۔ پڑھنے کا ڈھنگ بھی خوب ہے۔

نمونۂ تغزل

جنبشِ لب کی قسم خندۂ عشرت کی قسم　　تیری ہر بات محبت ہے محبت کی قسم
شوقِ کثرت کی قسم جلوۂ وحدت کی قسم　　مرکزِ حسن ہے تو حسنِ حقیقت کی قسم
ہر تڑپ باعثِ تسکینِ دلِ مضطر ہے　　خلشِ غم کی قسم دردِ محبت کی قسم
خوش و ناخوش تیری تصویر کے دو رخ ہیں　　شامِ غربت کی قسم صبحِ مسرت کی قسم
دل مرا ایک مرقع تیری تصویر کا ہے　　حسنِ کافر تیری رنگینیٔ الفت کی قسم
دل کی ہر پردے سے آواز تری آتی ہے　　سوزِ الفت کی قسم سازِ محبت کی قسم

تو ہی تو ہے میرے ایوانِ تصور کا مکیں
قسم اور دیدۂ مشتاق کی حیرت کی قسم

آشیانہ بنا رہا ہوں میں　　بجلیوں کو بلا رہا ہوں میں
اپنی ہستی مٹا رہا ہوں میں　　اُن کو اپنا بنا رہا ہوں میں
ایک دنیائے کیف و ہوئے کر　　اُن کی محفل سے آ رہا ہوں میں
ہر قدم پر ہوں سجدہ ریزِ نیاز　　نئی دنیا بسا رہا ہوں میں
ہے تصور میں آپ کی تصویر　　لطفِ خلوت اٹھا رہا ہوں میں
ہر نفس پر گمان ہوتا ہے　　کوئی کہتا ہے آ رہا ہوں میں

حیرت اُن کو غزل کے پردے میں
آپ بیتی سنا رہا ہوں میں

شکوہ سنجی کا سبب ہے مگر احساسِ فراق　　دلِ ناکام تصور ہے ترا خام ابھی
یک بیک ہاتھ نہ سینے سے اٹھاؤ دیکھو　　تپش آمادہ بہت ہے دلِ ناکام ابھی
ٹوٹ جائے نہ کہیں کشمکشِ بیم سے　　رشتۂ تارِ محبت ہے بہت خام ابھی

مانعِ دید ہے خود تیرا تحیر حیرت
ورنہ وہ شوخ خود آرا ہے لبِ بام ابھی

ہر قدم پر لغزشِ ناکام ہے　　زندگی شاید اسی کا نام ہے
عشق کہتے ہیں جسے پروردگار　　کیا مری مجبوریوں کا نام ہے؟
موت کیا ہے اک سکون اور تسکینِ دوام　　زندگی ہی اصل میں ہے اضطرابِ زندگی

تعمیر ہی سے ہوتی ہے تخریبِ کائنات　　جب آشیاں بنایا تو بجلی بھی گر گئی

دل کی حالت سن نہیں سکتے　　واہ کیا شانِ بے نیازی ہے
درد نے تیری زندگی بخشی　　اب جفا بھی وفا نوازی ہے
خون آلود دل کو رہنے دو　　یہ میرا رنگِ امتیازی ہے

آخر یہ رازِ الفت افشا ہوا کہاں سے　　یا تیرے رازداں سے یا میرے رازداں سے
مقدور ہو تو پوچھوں اک روز آسماں سے　　کچھ فائدہ بھی آخر بربادیٔ جہاں سے
اے اعتبارِ منزل اتنا مجھے بتا دے　　نزدیکِ آستاں ہوں یا دور آستاں سے
بیٹھے تو دو گھڑی کے بیٹھے دل ان کی انجمن میں　　اٹھے تو لیکے اٹھے دردِ اُن کے آستاں سے
بربادیوں پہ خوش ہوں پہلو نکل تو آیا　　تعمیرِ آشیاں کا تخریبِ آشیاں سے

ہے جستجو وفا کی جہانِ خراب میں　　آبِ حیات ڈھونڈ رہا ہوں سراب میں
کیا اہتمامِ پردہ ہے قربان جائیے　　جلوے ہیں بے نقاب وہ خود ہیں حجاب میں
ہے دشت آبلوں کی تراوش سے پر بہار　　دریائے نور بند ہے گویا حباب میں

حیرت جہانِ عشق میں آوارہ ہو تو کیا
گنجائشیں تو ہیں نگہِ انتخاب میں

ہر منظرِ لطیف ہے اک جنتِ نظر　　ہر پردۂ مجاز حقیقت حجاب ہے
رگ رگ میں مری نور کی موجیں ہیں شعلہ ریز　　ہر ذرۂ حیات مرا آفتاب ہے

امیر الدین صاحب حیدر صدیقی اکبرآبادی

مولوی نصیر الدین صاحب حیدر

سید غلام محی الدین صاحب خادم بھڑوچی

بابو رام جوایا صاحب خنداں جہلمی

نمونۂ نظم

"زندگی"

ہے امیدِ کامرانی سے وقارِ زندگی — ناامیدی سے نہ کھو اِن بہارِ زندگی

غیرتِ ہستی میں بھردے بادۂ کیفِ ازل — گلشنِ جنت بنادے جلوہ زارِ زندگی

سینۂ صد داغ داغ و اشکِ گرم و آہِ سرد — ہیں یہی تو خندۂ صبحِ بہارِ زندگی

نذرِ شمعِ حریت کر اپنا سامانِ وجود — ڈھونڈ خاکستر میں اپنی رہگذارِ زندگی

خارِ غم سے ہے جو تیرا دامنِ دل تار تار — کر انہیں تاروں سے پیدا نغمہ زارِ زندگی

سرمہ درکش بچشمِ خویش از خاکِ مجاز

بندۂ خواجہ نشو تا خود شوی بندہ نواز

عظمتِ نفس

ہو نہ سکے گی عشق میں مرگ تمامِ زندگی — زندگیٔ دوام کا خود ہے پیامِ زندگی

دشت میں کوہسار میں دامنِ کشتۂ ازیر — خونِ رگِ بہار میں محوِ خرامِ زندگی

چشمِ خمار آشنا سرخوش رنگ و نور ہیں — دے گئی تیری مست کو کیفِ دوامِ زندگی

گم شدہ رہِ حیات جادۂ کربلا میں آ — چھوڑ گئی تیرے لئے نقشِ دوامِ زندگی

رنگِ حقیقت و مجاز خونِ حسینؑ سے کھلا — موت ہے طلعتِ سحر ظلمتِ شامِ زندگی

تیغ کی گھاٹ قطع کر سلسلۂ روحیات — عشق کی راہگذر میں ہے موت کا نامِ زندگی

خارِ الم سے دامنِ دل جو نہ تار تار ہو — مفت ملے بھی تو نہ لو ایسی حرامِ زندگی

تیرا جمود دائمی تیرا پیامِ موت ہے — کر نہ سکے گی یہ خلش کوئی بھی کامِ زندگی

عظمتِ نفس کیلئے جان کو اپنی وار دے

نفعِ دوام کیلئے عمرِ دو روزہ ہار دے

جناب شہزادہ آغا احمد سیر صاحب حیدر درانی کی غزل پر
حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

اللہ رے یہ جوششِ فراوانِ آرزو — اب ہر نفس ہے شعلۂ عریانِ آرزو

پھر دل ہے اور شورشِ طوفان

~~پھر دل ہے سلسلہ جنبانِ آرزو~~ — پروردگار تو ہے نگہبانِ آرزو

کیا آرزو ہے کیا سر و سامانِ آرزو — دل ہے فریب خوردۂ امکانِ آرزو

تنہا آرزو کا ترک ہی

اب ہم ہیں اور سکون کی کیفیت راحتیں — ~~کیا ترک آرزو ہی تھا درمانِ آرزو~~

تیری نگاہِ ناز تری درد کی خلش — اک جانِ آرزو ہے اک ایمانِ آرزو

رگ رگ میں اضطراب کی ~~موجیں ہیں بیقرار~~ — کس کا خدنگِ ناز ہے مہمانِ آرزو

پروردگار کیا ہے یہی ظرفِ اضطراب

~~اسکو بھی درد دیتے ہیں پروردگار کیا~~ — دل ایک قطرہ جسمیں یہ طوفانِ آرزو

میں شکوہ مند تو

تخفیف ہو رہی ہے جفاؤں میں کس لئے — ~~تجھ سے تو کچھ گلہ~~ نہیں اے جانِ آرزو

لذتِ

~~منتِ~~ کشِ بہار ہیں دیوانگانِ شوق — کرتے ہیں چاک چاک گریبانِ آرزو

یوسف یہ تیری یاد میں نخچیر ہے کہ ہے — تعبیر خوابہائے پریشانِ آرزو

کی ہوئے شبِ فراق

مشقِ تصوراتِ ~~جمالِ لطیف سے~~ — روشن ہوئی ~~ہے میری~~ شمع شبستانِ آرزو

ہلکی سی ایک جنبشِ لب میں سنا گئی — اُن کی ہنسی فسانۂ پنہانِ آرزو

پھر ہو رہی ہے بارشِ

پھر دل میں لے رہا ہے میرے چٹکیاں کوئی — ~~اٹھنے کو ہے مگر کوئی~~ طوفانِ آرزو

حیرتؔ کسی کے داغِ تمنا کے فیض سے

روشن ہے دل میں شمعِ شبستانِ آرزو

عبدالرشید صاحب درد صدیقی اکبرآبادی

عبدالستار خاں صاحب خلیل کولاری

جسونت رائے صاحب رعنا بلسوی

عبدالرضا صاحب رضا قریشی

مولوی نصیر الدین صاحب کامل (الٰہ آباد)

آپ کا اسمِ گرامی نصیر الدین اور حیدر تخلص ہے۔ والدِ محترم کا نام نبی رحیم ہے۔
آپ سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ وطن موضع چھیپا چھوتہ تحصیل خلیل آباد ضلع بستی
ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب شیخ حاجی عنایت اللہ صاحب عربیؒ سے ملتا ہے
جو قبیلۂ قریش کے ایک مقتدر فرد تھے۔ اور آپ کا خاندان صحیح معنوں میں
شیخ قریشی ہے چونکہ فی زمانہ ہر کس و ناکس اپنے نام کے آگے قریشی لکھنے
لگا ہے اور خاندانی امتیاز اٹھ چکا ہے اس لئے آپ خود کو قریشی نہیں لکھتے
آبائی پیشہ زمینداری ہے لیکن آپ نے ہمیشہ ملازمت کی۔

ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں پائی۔ پندرہ سال کی عمر میں ورناکیولر فائنل
امتحان پاس کیا۔ آپ زمانۂ تعلیم میں نہ صرف اپنے درجہ میں بلکہ تمام اسکول
میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے اور اپنی ذہانت و ذکاوت کی بدولت ہمیشہ
سرکاری وظیفہ پاتے تھے۔ فارسی میں حضرت مولانا محمد ابوبکر شیث فاروقی
ناظم دینیات علی گڈھ کالج اور حضرت مولانا نصیر احمد صاحبؒ (مدرس اول
انجمن اسلامیہ گورکھپور) سے استفادہ کیا اور اس زبان میں مہارتِ تامہ
حاصل کی عربی صرف و نحو مفتیٔ دیوبند کے خلف الرشید جناب مولوی اصغر
حسین صاحب سے سیکھی ہے۔

آپ سنہ ۱۹۲۵ء کے درمیانی زمانہ میں انتہائی پریشان رہے اور بقول آپ کے
کہ "یہ زمانہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس زمانہ کا ہر واقعہ بجائے خود ایک عبرتناک
داستان ہے"۔ آپ نے اسی زمانہ میں کلکتہ۔ پٹنہ۔ بنارس۔ جونپور۔ الٰہ آباد
کانپور۔ دہلی۔ میرٹھ وغیرہ میں اپنی گردش کے دن پورے کئے۔ بقول سعدیؒ
سے "بسر کردم ایام با ہر کسے"۔ آپ کو ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔

عام خیال یہ ہے کہ ملازمت فی زمانہ عنقا ہے لیکن حیدر صاحب
اس کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں ہر جفاکش اور قابل آدمی کے لئے
دنیا میں معیشت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن اپنی استعداد ذاتی
کا صرف شرط ہے۔ آپ نے جب سے ملازمت کے لئے قدم اٹھایا ہے
اس وقت سے آج تک سوائے ایک سال بیماری اور ایک سال امتحان
کی تیاری کے کبھی بیکار نہیں رہے سنہ ۱۹۲۸ء میں آپ نے منشی کا امتحان
الٰہ آباد سے پاس کیا پھر یکے بعد دیگرے پانچ جگہ ملازمت کی اور اپنی
ہی خوشی سے ترک بھی کر دی۔ چار سال مسلم جاٹ اسکول اسارا میں ہیڈ
مولوی رہے اور اب ایک سال سے حفاظت الاسلام اسکول اسارا
ضلع میرٹھ میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ملازمت کے مشاغل کے باوجود آپ نے
امتحان درجہ کامل (الٰہ آباد) اور اعلیٰ قابلیت کے امتحانات بھی
پاس کر لئے ہیں۔

آپ اپنی شاعری کے متعلق خود لکھتے ہیں "میری طبیعت فطرتاً بذلہ سنج
اور مذاق پسند واقع ہوئی ہے۔ حسن پرستی اور محبت جوہرِ انسانی ہیں۔
بچپن سے جہانیانِ جہاں گشت ہوں۔ مصائب و آلام کی دشوار گذار
گھاٹیاں میری بازی گاہ رہی ہیں۔ پس جب یہ عناصرِ شاعری جذبات
بھرے دل میں موجود ہوں تو شاعری کا ابھار اور زبان سے نظم کی
صورت میں کچھ نکل جانا جو صرف وارداتِ قلبی اور حسیاتِ ذہنی کی
ایک تصویر ہوتی ہے، لازمی امر تھا۔ ابتدائً نصیر۔ ضاحک اور انیس
وغیرہ تخلص رہے مگر بالآخر حیدر (جو بچپن میں بطور خطاب مل چکا تھا)
تخلص قرار پایا۔ کئی سال بے استاد رہا پھر ایک غزل لسان العصر
حضرت ریاض خیرآبادی کو دکھائی۔ آخر معیارِ طبیعت سے مجبور ہو کر
نگاہیں جہاں استاد علامہ حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ پر پڑیں اور
سنہ ۱۹۳۳ء میں ان کے دامنِ شعر پرور سے وابستہ ہو گیا اور اس طرح یہ

فخر حاصل کیا"

آپ کی تصانیف میں ایک رسالہ "ناصر الواعظین" ایک ناول "مآل الفت" عرف "جوان موت" غیر مطبوعہ موجود ہیں آپ نے ایک مجموعہ اپنے خطوط کا بھی تیار کیا ہے جسے "انشائے حیدر" کے نام سے جلد شائع کرنیوالے ہیں۔ آپکی ایک واسوخت "عروس فکر" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اپنی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "سرور جاوداں" آپ آجکل مرتب فرما رہے ہیں۔ آپنے طبیعت انتہائی لطیف اور صلح کل پائی ہے۔ مطالعہ اور تعلیمی ترقی آپکا لائحہ عمل ہے۔

نمونۂ تغزل

کسی سے ناز کسی سے فریب ناز کرے — جو چاہے آپ کا اندازِ فتنہ ساز کرے
کمالِ عشق نہیں اگر ایاز ناز کرے — کمال یہ ہے کہ محمود کو ایاز کرے
رفیع اتنی تو ہو رفعتِ خیال مری — کہ سر بلند فلک کو بھی سرفراز کرے
فریبِ ذہن ہی مسجد کی حاضری واعظ — نماز جب ہے کہ سجدہ جبیں پہ ناز کرے

وثوقِ عفو نہیں اپنے کارناموں سے
جو چاہے حضرتِ حیدر خطا نواز کرے

غمِ سکوں طلبی سے فگار ہونا تھا — نشانۂ ستمِ روزگار ہونا تھا
ہماری عمر اسیری کا بدترین مذاق — درِ قفس کا سوئے رہگذار ہونا تھا
خوشا نصیب تصور میں ہیں وہ ہم آغوش — کسی طرح تو مجھے ہمکنار ہونا تھا
کرم کیا جو زمانے نے صرف قید کیا — سزائے بیخبری سنگسار ہونا تھا
گناہ میں نے کئے جان بوجھ کر یعنی — رہینِ منتِ آمرزگار ہونا تھا
مری نظام تمنا کا راز چھپ نہ سکا — ذرا سی بات کا یوں اشتہار ہونا تھا
قریبِ منزلِ مقصود تھک کے بیٹھ گیا — کچھ اور پائے طلب استوار ہونا تھا

اب اسکی فکر میں مرنا فضول ہے حیدر
جو کچھ ہوا ہے وہ پایانِ کار ہونا تھا

مرغزار دلکشا اجڑے ہوئے محلات ہیں — اے خوشا خانہ خرابی کیا تری توقیر ہے

یہ نشانِ قبر جس کو تم مٹانے آئے ہو — یہ مری بگڑی ہوئی تقدیر کی تصویر ہے
جب بُرے اعمال کی ملتی ہے دنیا میں سزا — ناسمجھ انسان کہتا ہے مری تقدیر ہے

شکوۂ جور و جفائے دہر ہے بالکل فضول
آپ کی تدبیر حیدر دشمنِ تقدیر ہے

نظر میں جب تو سمایا اس ابتدا کی قسم — نظر بھی کھو ہی گئی تجھ میں انتہا کی قسم
تری تغافلِ احساس آزما کی قسم — ترس رہی ہیں جفا کو بھی ہم وفا کی قسم
نہ انقلاب ہو جسمیں وہ زندگی کیسی — بھلی ہے موت ہمیں ہیشہ بقا کی قسم
رہِ طلب میں بڑھے جسقدر قدم آگے — ہم اور ہوتے گئے دور رہنما کی قسم

نہ فکر چارہ گری چارہ گر کریں حیدر
مرا علاج نہیں دردِ لادوا کی قسم

پابستۂ قفس ہوں، کہاں سیر آشیاں — شاید مرے خیال نے دھوکا دیا مجھے

فقط اک کہکشاں پر شادماں ہیں آسماں والے
زمیں پر سینکڑوں پھرتے ہیں ایسے کہکشاں والے

شومئ قسمت سے اپنی ہے یہی پوری امید — بجلیاں تڑپیں اگر ہم خواہشِ باراں کریں
اللہ رے یہ انکی نمائش یہ تصور، — آتے ہیں نظر صرف وہی حدِ نظر تک

چراغِ زندگی جب بجھ رہا تھا کشتۂ غم کا — سرہانے بیٹھ کر کوئی ہوا دیتا تھا دامن سے

اک سانس پر بھی اپنے بھروسہ نہیں مجھے — گویا سبق پڑھا ہی نہیں اعتبار کا
ہے آہِ آتشیں کا نتیجہ، نمودِ صبح، — دیکھو تو حوصلہ نفسِ شعلہ بار کا

رباعیات

تسلیم اسے کرتی ہے خلقت تیری، — محدود نہیں وسعتِ رحمت تیری
حالانکہ میں آلودۂ عصیاں ہوں مگر — مشتاق ہے میرے لئے جنت تیری

(۴۰) حشرؔ — مولوی سید وجیہ الدین صاحب سہسرامی

آپ کا نام وجیہ الدین اور حشرؔ تخلص ہے۔ مولد و مسکن سہسرام ضلع شاہ آباد (آرہ) ہے آپ کا نسبی سلسلہ حضرت سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ خاندانی وقار کے اعتبار سے بھی آپ بہت ممتاز ہیں۔ آپ حضرت مولانا حاجی سید محمد اشرف صاحب مرحوم استاد فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ کے صاحبزادے حضرت مولانا سید محمد اظہر حسین مرحوم وظیفہ یاب حضور نظامِ دکن کے نواسے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۶ سال ہے آپ نہایت منکسر المزاج سلیم الطبع، پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں۔ بالفاظِ مختصر ایک جوانِ صالح ہیں۔ بسلسلۂ زمینداری آپ کا قیام زیادہ سہسرام ہی میں رہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے ملازمت کی طرف آجتک توجہ نہیں کی۔ آپ نے عربی کی تکمیل مدرسۂ عالیہ کے نصاب کے مطابق کی۔ اسی طرح فارسی کی تکمیل بھی ان ہی لائینوں پر کی۔ اردو کا تو کہنا ہی کیا آپ کی مادری زبان ہے پھر آپ سہسرام جیسے مردم خیز اور شعر آفریں مقام پر رہتے ہیں، رہتے ہی نہیں ہیں بلکہ اس کی خاک سے پرورش پائی ہے۔ ان تینوں زبانوں پر آپ کو کافی عبور ہے اور غائر مطالعہ نے آپ کی علمی معلومات کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ آج کل انگریزی تعلیم کے حصول میں ہمہ تن محو ہیں۔

ذکاوت و ذہانت آپ کو قدرتی طور پر ودلیت ہوئی ہے۔ اور شعر گوئی تو گویا ورثہ میں ملی ہے۔ بچپن ہی سے آپ کی نکتہ رس سخن فہم اور حساس طبیعت نے شعر گوئی سے کافی مناسبت پیدا کر لی ہے۔ آپ کی شعر گوئی کا یہ حال ہے کہ دورانِ گفتگو میں بھی آپ غزل کہہ لیتے ہیں۔ آپ کے کلام میں سلاست اور اثر ہوتا ہے۔

سہسرام کے نوجوان شعرا میں آپ کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ نظم، نثر، قطعات، رباعیاں غرض آپ سب کچھ کہتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں بھی مہارت ہے۔ ایک مجلس میں حضرت شفق عمادپوری نے فرطِ کیف سے متکیف ہو کر فرمایا کہ "حشرؔ صاحب آپ کے اشعار تو مجھ جیسے ضعیف کو بھی نوجوان بنا دیں گے"۔ حشرؔ صاحب کی ندرتِ تخئیل کے اعتراف میں یہ ایک واقعہ بہت کافی ہے۔ غرض آپ ایک مخصوص رنگ کے مالک ہیں۔ آپ ۲۰ راگست ۱۹۳۲ء کو حضرت قبلہ علامہ مولانا سیمابؔ مدظلہ، کے شاگرد ہوئے سلسلۂ اصلاح ذریعۂ خط و کتابت قائم ہے۔ اس سے پہلے آپ نواب فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ مانکپوری سے اصلاح لیتے تھے لیکن وہ سلسلہ، ناموافقِ مذاق تھا۔ مولانا سیمابؔ مدظلہ، کے فیض اصلاح سے آپ کے باطنی جوہر بہت جلد نمایاں ہو گئے اور اب آپ کا کلام حقیقت میں کلام ہو گیا ہے۔ شفیق استاد کی اصلاحوں کو آپ بطورِ خاص دیکھتے ہیں اور یہی چیز بلندیٔ فکر میں معاون ہوئی ہے۔

نمونۂ تغزل

جگر کا داغ اشکِ یاس سے دھویا نہیں جاتا
جسے مشکل سے پایا ہے وہ یوں کھویا نہیں جاتا

دلِ مضطر نہ ہوتا دفن ساتھ اپنے تو اچھا تھا
تہِ مدفن بھی یارب چین سے سویا نہیں جاتا

محبت نے کچھ ایسی پھوٹ ڈالی دیدہ و دل میں
کہ دل روتا ہے لیکن آنکھ سے رویا نہیں جاتا

نہیں ٹپکا تھا جب تک آنکھ سے برہم زنِ جاں تھا
یہ اک قطرہ تھا آنسو کا مرے دل میں کہ پیکاں تھا

تری الفت مجھے اک حال پر رہنے نہیں دیتی
کہ اب میں دل سے نالاں ہوں کبھی دل مجھ سے نالاں تھا
شبِ وعدہ نہ وہ آئے نہ دل کو حشرؔ چین آیا
ذرا سی آس پر میں رات بھر کیا کیا پریشاں تھا

جاری ہے آنسوؤں میں ندرتِ خونِ حشرؔ — دریائے عشق کے ہیں دو آبشار آنکھیں
مدہوش کر رہی ہیں بیخود بنا رہی ہیں — ساقی کی مست باتیں، بادہ گسار آنکھیں
دل کی یہ آرزو ہے جب روبرو وہ آئیں — پروردگار دیدے مجھ کو ہزار آنکھیں
ہے دفن آرزوئے دیدارِ دوست ان میں — اس اعتبار سے ہیں گویا مزار آنکھیں

حجاباتِ دلِ بینا ہیں کیا کہیں، کیا کیا نہاں دیکھا — جمالِ یار دیکھا جلوہ کون و مکاں دیکھا
پرستارِ تجلی نے وہیں اپنی جبیں رکھدی — جہاں دھندلا سا اس نے پائے جاناں کا نشاں دیکھا
تری جلووں سے ہے معمور کعبہ بھی کلیسا بھی — مگر اہلِ بصیرت نے جہاں چاہا وہاں دیکھا
مکاں میں جلوہ ہائے لامکاں مجھ کو نظر آئے — اسی دل میں تمہیں دیکھا تمہارا آستاں دیکھا

حرم اب کون جائے چھوڑ کر اے حشرؔ بتخانہ
یہی کیا کم ہے عبرت کیلئے جو کچھ یہاں دیکھا

نمونۂ نظم
قشقۂ احمر

نہ پوچھو گرمیٔ حسن و جوانی کی فسوں کاری — کسی دن خرمنِ ہستی کو پھونکیگی یہ چنگاری
قیامت کا نمونہ ہے یہ عنوانِ طرحداری — اداؤں میں اسی نے جذب کی ہے روحِ بیداری
مری حسرت کا مشہد بن گیا ہے نقطۂ کافر
ذرا میری نظر سے دیکھنا یہ قشقۂ احمر

نگاہِ شوق خوں ہوکر جبینِ یار تک پہنچی — بڑی چالاک تھی مرمٹ کی اس خونخوار تک پہنچی
نظر کیا میری اس کے عارضِ گلنار تک پہنچی — کہ اک دل سوز چنگاری دلِ بیمار تک پہنچی
سمٹ آئی ہے سرخیٔ شفق اک بوند خوں بنکر
ذرا میری نظر سے دیکھنا یہ قشقۂ احمر

جبینِ ناز پر یہ سرخ نقطہ، نقطۂ رعنا — ہو جیسے مرمریں اک طشت پر یاقوت کا ٹکڑا
حسینوں کا بھی کیا اعجاز ہے موہوم سا نقطہ — جبیں کو چوم کر لعلِ بدخشاں کی طرح چمکا
لئے ہے دامنِ رنگیں میں لاکھوں حسن کے جوہر
ذرا میری نظر سے دیکھنا یہ قشقۂ احمر

یہ اک چھوٹا سا نقطہ کسقدر جذبات پرور ہے — کہ اک زخار دریا موجزن کوزے کے اندر ہے
جبینِ بدرِ کامل پر فروزاں سرخ اختر ہے — بچاری کی نگاہوں میں یہی اعجاز کا فر ہے
سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا ہے حسن کا مندر
ذرا میری نظر سے دیکھنا یہ قشقۂ احمر

نظر آتا ہے یوں گھونگھٹ سے اُن کا جانفزا قشقہ — کہ جیسے چادرِ مہتاب میں ہو پھول لالے کا
کوئی نکلا ہے ماتھے پر لگا کر سرخ سا ٹیکا — شہیدانِ محبت کا لہو اے حشرؔ کام آیا
اسی نقطے میں اک دنیا کی بربادی کا ہے منظر
ذرا میری نظر سے دیکھنا یہ قشقۂ احمر

سید وجیہہ الدین صاحب حشرؔ سہسرامی کی غزل پر
حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ العالی کی اصلاح

جو کسی کی یاد میں دیوانہ ہے — بے نیازِ کعبہ و بتخانہ ہے
میں خدا معلوم کس عالم میں ہوں — جب سے دل میں جلوۂ جانانہ ہے
تیری مست آنکھوں کی مستی دیکھ کر — کوئی بیخود ہے کوئی دیوانہ ہے
لطفِ آزادی کچھ اس سے پوچھئے — جو اسیرِ گیسوئے جانانہ ہے
صحبتِ دوشیں کی ہر اک بات اب (شکایت اب تو) — خواب ہے بھولا ہوا افسانہ ہے
موجۂ گل کی بھی زنجیریں ہیں بار — کتنی نازک خاطرِ دیوانہ ہے
اٹھتے اٹھتے اٹھ گئے پردے تمام — ~~اب یہی~~ (ہم ہیں اب اور جلوۂ جانانہ ہے)
منتشر رہنے دے زلفوں کو ابھی — محوِ نظارہ ترا دیوانہ ہے
حشرؔ اپنا (میرا) یہ دلِ حرماں نصیب — گھر کا گھر ویرانے کا ویرانہ ہے

محمد حفیظ اللہ صاحب اکبرآبادی (۳۱)

آپ کا نام محمد حفیظ اللہ اور حفیظ تخلص ہے آپ کے والد صاحب کا نام منشی کریم اللہ صاحب قریشی تھا۔ بمقام آگرہ ہینگ منڈی ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق ۹ ؍ اگست ۱۸۸۸ء بدھ کے دن پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا صاحب مولوی امیر اللہ صاحب کے والد مولوی وزیر اللہ صاحب کی اصلی سکونت نجیب آباد میں تھی۔ وہ دربار اودھ میں خاص شاہ لکھنؤ کے مصاحب اعلیٰ تھے۔ دادا صاحب کی شادی اجمیر شریف میں ہوئی تھی اس کے بعد وہ آگرہ میں سکونت پزیر ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کے بڑے بھائی عظیم اللہ صاحب نابینا ہوگئے تھے اس لئے شادی نہیں کی۔ آپ کے دو چھوٹے بھائی محمد احمد اللہ صاحب اور محمد حبیب اللہ صاحب اور موجود ہیں آپ کی دو بہنوں اور ایک بھائی محمد حمید اللہ کا انتقال ہوگیا۔

ننہال کے تعلق سے آپ کے نانا ڈاکٹر محمد حسن صاحب کلکتہ کی سکونت رکھتے تھے بسلسلۂ تبادلہ یو پی اور راجپوتانہ میں تعینات ہوئے۔ ادھر وزیر علی صاحب بھی شاہ اودھ کے یہاں معزز ملازمان میں سے تھے سکونت لہرپور ضلع سیتاپور تھی موصوف کے چار صاحبزادے مولوی ظہور احمد صاحب، ظہور حسن صاحب، ڈاکٹر محمد حسن صاحب، ڈاکٹر عنایت حسن صاحب ہوئے ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے حفیظ صاحب کی پھوپی بیاہی گئیں اور وہ آگرہ اور چھاؤنی میں غالباً ۱۹۰۲ء تک خدمات متعلقہ انجام دیتے رہے پھوپا صاحب موصوف کے داؤد حسن ادریس حسن یونس حسن و یوسف حسن صاحب فرزند ہوئے علاوہ بابو کفایت اللہ صاحب ساکن محلہ بابو گنج کی صاحبزادیوں سے منسوب کئے گئے بقیہ دوسری جگہ صاحبزادیوں میں سے بڑی رشید احمد صاحب بارایٹ لا لہرپور دوسری ڈپٹی کلکٹر صاحب آگرہ کے فرزند سے تیسری حکیم شوکت علی صاحب خلف الطاف حسین صاحب شہر قاضی سے بیاہی گئیں یہی الطاف حسن صاحب آپ کے پھوپا صاحب کی دوسری ہمشیرہ سے منسوب تھے۔ پہلی لہرپور میں تیسری خیرآباد ظہور احمد صاحب انسپکٹر پولیس سے۔ آپ کے نانا جب چھاؤنی کوٹرہ میواڑ میں تبدیل ہوئے تو آپ کے ماموں منشی محمد علاؤالدین صاحب (عبد رضا صاحب دیوان) کی ملازمت بھی اسی جگہ ہوگئی اسی سلسلہ سے آپ کے نانا صاحب کی وفات کے بعد آپ کے والد ماجد بھی چھاؤنی کوٹرہ آکر جہاں دربار میواڑ کا سفیر رہتا ہے تعینات ہوئے یہ واقعہ ۱۸۹۵ء کا ہے۔ پھر ۱۹۰۲ء کے آخر میں چھوٹی سادری میواڑ کی عدالت میں ملازم ہوگئے۔

چنانچہ ۱۹۰۴ء میں آپ کو بھی یہیں آنا پڑا۔ عربی فارسی کی تعلیم کے علاوہ ہندی اور انگریزی کی تعلیم یہیں حاصل کی آپ ۱۴ ؍ مارچ ۱۹۰۸ء کو ریاست اندور کی پولیس میں ملازم ہوگئے۔ اور یہی سنہ وسال آپکی شاعری کے آغاز کا ہے۔ زمانۂ قیام اندور و اضلاع اندور میں حفیظ صاحب کو سوسائٹی اچھی ملی۔ مگر چونکہ آپ کے والد صاحب کو آپ کی جدائی شاق تھی اس لئے ۱۹۱۰ء کے آخر میں چھوٹی سادری آنا پڑا ادھر اندور پولیس کے اعلیٰ عہدہ کو چھوڑ کر یہاں کی عدالت میں اہلمد دیوانی اور اہلمد فوجداری کی خدمات انجام دیں ستمبر ۱۹۱۴ء میں آپ ضلع مانڈل گڑھ میواڑ تبدیل ہوگئے اور وہاں بھی سب انسپکٹر پولیس کی خدمات انجام دیں یہاں کی ملازمت کچھ ایسی تھی کہ فرصت کا نام لینا گناہِ عظیم کے مرادف سمجھا جاتا تھا ادھر کوئی ادبی سوسائٹی بھی نہ تھی جو ذوقِ شعری کو ابھارتی۔ چنانچہ شاعری میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہوئیں تاہم یہ مشغلہ جاری رہا ۱۹۲۱ء میں والد صاحب کی وفات کے بعد کچھ عرصہ کیلئے آپ نے شعر کہنا چھوڑ دیا جولائی ۱۹۲۴ء سے آپ نے وکالت شروع کی اسے بھی چھوڑا ایکم مارچ ۱۹۲۸ء میں بیگوں میواڑ میں ضلع انسپکٹر پولیس مقرر ہوئے۔

اور اسی سال سپرنٹنڈنٹ پولیس بعدازاں مجسٹریٹ باختیار سیشن جج ہو گئے۔
یہ پیہم اور قابلِ رشک ترقیاں آپ کی خداداد ذہانت اور حسنِ انتظام کا بہترین ثبوت ہیں جب آپ کا قیام بیگون میں تھا تو نومبر ۱۹۳۰ء میں آپ حضرت قبلہ مولانا سیماب صاحب مدظلہٗ کی طرف متوجہ ہوئے مولانا موصوف نے بڑی محبت سے ۱۳ر نومبر ۱۹۳۰ء کو اپنے شاگردوں میں داخل فرمالیا اس وقت سے ذریعہ خط و کتابت اصلاح کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں جو مطبوعہ و غیر مطبوعہ ہیں جن میں۔ ماجرا و دمشق شکوک پولیس ۱۹۱۳ء میں۔ فقیری حال۔ نمونۂ عبرت۔ فانوسِ خیال۔ نزہدا کا سفر۔ نافرمان بیٹا ۱۹۲۴ء میں دیوان ۲۲۵ غزل نظمیات کا مجموعہ ۱۹۲۷ء میں آفتابِ رسالت نظم و نثر حالات حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۱۹۲۵ء میں طبع ہوا۔ دوسرا آفتاب لطافت نثر علمی ادبی اخلاقی مضمون کا مجموعہ۔ کلیات تقریباً ۴۰۰ نظموں کا مجموعہ۔ آفتاب رسالت کا دوسرا اڈیشن ۴۰۰ صفحہ کا غیر مطبوعہ ہے۔ نظم و نثر کے مضامین ۱۹۱۲ء سے اب تک اخبار و رسالہ جات میں چھپتے ہیں ۱۹۳۵ء سے شاعر آگرہ میں آپ کی نظمیں اکثر درج ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کے بہت سے عزیز و اقارب شاعر و ادیب ہیں اور بقیے حفیظ صاحب کی مشقِ سخن کافی ہے۔ آپ نظم و نثر دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

حفیظ اس رازِ ہستی نے بہت حیراں بنا رکھا ہے
خبر اتنی نہیں لیجائیگی قسمت۔ کہاں مجھ کو

محفل میں تری داعظ کچھ اور مزہ تھی
اب کون نبھاتا ہے وہ عہد وفا تو بہ

حرم و دیر پہ موقوف نہیں ہے کچھ بھی
تجھ کو ہر ذرہ میں پایا تیرے سودائی نے

جگر کا خون ساقی بھر کے پیمانے میں رکھ دینا
وہ آئیں تو یہی پیمانہ نذرانے میں رکھ دینا

اڑے اور راہ کی ہو قربان شمع روئے جاناں پر
الٰہی اتنی قدرت دل کے پروانے میں رکھ دینا

پرستش کی ہے ہم نے آپ ہی کی ہر زمانے میں
جوانی پہ فدا ہیں اور مرتے تھے لڑکپن پہ

وہ معروفِ ستم ہیں اور ہم مصروفِ رنج و غم
نہ وہ بیکار بیٹھے ہیں نہ ہم بیکار بیٹھے ہیں

شکوہ نہیں ہے کوئی شکایت نہیں مجھے
سوزِ فراقِ یار میں جلنا تھا جل گیا

فلک بھی سیکھ لے بجلی گرانا اسکو کہتے ہیں
قسم کھالی ہے شاید آپ نے اب مسکرانے کی

لطف کچھ محفل میں تھا کچھ تیرے دیوانے میں تھا
شمع کی تو بجھی رو دیا وہ درد افسانے میں تھا

دردِ دل دردِ جگر اور تمنائے وصال
کیسی مل جل کے میرے سر پہ بلائیں آئی ہیں

گلشن میں ہے اک تازہ بہار آئی ہوئی سی
یوں بادِ صبا پھرتی ہے اترائی ہوئی سی

کچھ ہو نہ ہو غیروں نے کیا ہے انہیں برہم
یہ آگ رقیبوں کی ہے بھڑکائی ہوئی سی

شاید تجھے احساس جفاؤں کا ہوا ہے
قاتل تری آواز ہے تھرائی ہوئی سی

کیا اس نے شب ماہ نقاب اپنا اٹھایا
آتی ہے نظر چاند کی شرمائی ہوئی سی

دھوکا مجھے ہوتا ہے کہ شاید یہ گھٹا ہے
جب زلف نظر آتی ہے لہرائی ہوئی سی

وہ باغ سے نکلا تو چمن ہو گیا ویراں
ہے شکل ہر اک پھول کی مرجھائی ہوئی سی

وہ عرضِ تمنا پہ یہ فرماتی ہیں جل کر
یہ وہ ہی کہانی تو ہے دہرائی ہوئی سی

نمونۂ نثر

"شاہی نگہداشت"

اگر کوئی یہ کہے کہ نیکی جملہ اچھے کاموں کا اور عمدہ عادات و اطوار کا ایک جوہر ہے تو ہم اسے صحیح باور کریں گے۔ اسی کیساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑیگا کہ ہر اونچا درجہ رکھنے والے انسان کے عمدہ کارنامے جو تاریخ کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں خواہ وہ دورِ حاضرہ سے متعلق ہوں خواہ دورِ ماضی سے تعلق رکھتے ہوں ضرور قابلِ یادگار ہوتے ہیں مگر ہم اسے تسلیم نہیں کرسکتے کہ اول الذکر کے بعد دوسرا شخص جو ہفت کشور کا مالک ہے اگر کوئی خراب سے خراب کام کرے اور ہر کام میں اسکے فتنہ و فساد و ظلم و ستم ہوں اور اسکی یادگار قائم نہ رہے۔ کبھی ممکن نہیں۔

آج دنیا کی تاریخ بتائیگی کہ اسمیں نیک بد دونوں کے کارنامے۔ برائی بھلائی دونوں موجود ہیں اگر ایک کو نیکی میں فوقیت ہے تو دوسرے کو بدی ظلم و ستم وغیرہ میں وہ وہ شہرت ملی ہے کہ جو شیطان کو بھی نصیب نہیں ہوسکتی چنانچہ وہ برائیوں کا مخزن کہا جاسکتا ہے اور اسکی بدی اسکی یادگار قائم کرتی ہے۔ اور ہر خراب موقع پر وہ یاد کیا جاسکتا ہے اسی موقع پر اگر ہم تفصیل کیساتھ کچھ لکھیں تو ہمارا اصلی مطلب جس کے اظہار کیلئے ہم نے قلم اٹھایا ہے وہ فوت ہوتا ہے پس ہمیں بہت سی نیک ہستیوں میں سے صرف ایک کا ذکر کرنا ہے جس کا نام التمش ہے

خنداں — پنڈت رام جوایا جہلمی — ۳۲

آپ ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء میں منگھوٹ ضلع راولپنڈی (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک معزز برہمن خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آبائی پیشہ زمینداری ہے۔ آپ کے والد گرامی پنڈت لبھن داس صاحب بڑے خلیق اور ہر دلعزیز بزرگ ہیں۔

خنداں صاحب کو علم و ادب سے فطری لگاؤ ہے۔ آپ بچپن ہی سے فردوسی کی طرح گھر کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں پر شعر کہا کرتے تھے۔ گو تعلیم انٹرنس تک پائی ہے۔ لیکن وسعتِ مطالعہ اس قدر ہے کہ انگریزی گفتگو سن کر کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آپ صرف میٹرک ہی پاس ہیں بلکہ علوم مغربی کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ اردو فارسی سے خاص لگاؤ ہے۔ خاندانی رعایت سے سنسکرت اور برج بھاشا سے بھی بے بہرہ نہیں۔ پنجابی زبان تو آپ کی مادری زبان ہے۔ آپ اردو کے علاوہ پنجابی اور برج بھاشا میں بھی شعر کہتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں جب آپ نویں جماعت کے طالب علم تھے اس وقت بھی راولپنڈی میں ایک کامیاب شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُسی زمانہ کا آپ کا ایک شعر ہے ؂

ہوئی میرے سودا سے شہرت کسی کی + بڑھی میری خفت سے عزت کسی کی

حدودِ شعور میں قدم رکھتے ہی آپ کو بھی شیخ علی حزیں کی طرح دنیا کی سیاحت کا شوق ہوا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں آپ ہانگ کانگ تشریف لے گئے چند دن بعد شنگھائی اور ساحل جاپان کی سیر کرتے ہوئے وینکور پہونچے شعر و شاعری کے مشغلے سے وہاں بھی آپ غافل نہ رہے چنانچہ جاپان کے شہر "کوبی" میں ایک جاپانی شاعر کی ملاقات کے لئے گئے اور ایک مترجم کے ذریعہ دیر تک اس کے خیالات معلوم کرتے رہے اس کے بعد اپنے خیالات کا اثر اس پر ڈال کر اردو شاعری کا ایک مدّاح شہر "کوبی" جاپان میں پیدا کر آئے۔ چند وجوہ کی بنا پر آپ کو وینکور سے واپس آنا پڑا۔ ہانگ کانگ سے آپ کو اپنے ایک عزیز دوست جناب قیس کی بیماری کی اطلاع ملی۔ جن کی عیادت کے لئے آپ واپس ہانگ کانگ تشریف لے آئے۔ تین ماہ اُن کے پاس قیام کیا۔ لیکن اُن کی علالت طول پکڑ گئی اور آپ کو اُن کی معیت میں وطن واپس آنا پڑا۔ وطن پہونچتے ہی رفیق دوست کا انتقال ہوگیا جس کا اثر آپ کے دل پر برسوں رہا۔ اور اب بھی ہے۔

اس سیر و سیاحت کا ذکر آپ نے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

چمن چمن کی مہک ہی ہوائیں بن بن کی ۔۔۔ کہاں کہاں کی لطافت مری غبار میں ہے

مارچ ۱۹۲۰ء میں آپ ایک ایسے محکمے میں جسے علم و ادب سے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ یعنی محکمۂ فوج میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوگئے لیکن فطری ذوق کو بھلا یہ باتیں کہاں دبا سکتی تھیں۔ اتفاق سے اسی ملازمت پر آپ کی تبدیلی آگرہ جیسے مردم خیز شہر میں ہوگئی اور پورے آٹھ سال آگرہ قیام رہا۔ آگرہ میں رہ کر آپ نے شعر و شاعری میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی جس کا سبب شوقِ شکار کی فراوانی تھی اس فن میں ماشا اللہ آپ نے یہاں تک مہارت بہم پہنچائی ہے کہ بارہ بور گولی (Bullet) سے اڑتے ہوئے جانور کا نشانہ باآسانی کر لیتے ہیں۔ لیکن باوجود اس شغل کے اکبرآباد میں آپ ذوقِ علم و ادب سے بالکل بے نیاز نہ تھے۔ علمی رسائل اور کتب اکثر زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ مگر خود جتنا چاہیئے تھا اتنا نہیں کہہ سکتے تھے۔ عرصہ تک یوپی میں رہنے سے آپ کی زبان بہت کچھ منجھ گئی لب و لہجہ بالکل زباں داں حضرات کا سا ہوگیا۔ چنانچہ اب آپ کو اردو محاورات اور روزمرہ پر کافی عبور ہے سات سال سے جہلم میں قیام پذیر ہیں۔ یہاں بھی ایک بزمِ ادب قائم ہے جس کے آپ سکریٹری ہیں۔ اوائل مشق میں ہندوستان کے مشہور اساتذہ کو آپ نے وقتاً فوقتاً اپنا کلام دکھایا عرصۂ دراز سے آپ کو

حضرت علامہ مولانا سیماب مدظلہٗ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں فاضل استاد کی رہنمائی میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آپ نے جو اندازِ کلام اختیار کیا ہے وہ بہت شگفتہ اور بلند معیار ہے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔

جناب خنداں کثیر التلامذہ بھی ہیں۔ پنجاب کے کئی نوجوان شعرا آپ سے استفادہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض کہنہ مشق شعرا بھی آپ سے مشورۂ سخن کرتے ہیں تنقید نگاری کا خاص شوق ہے۔ آپ کے تلامذہ میں بعض حضرات رنگِ جدید میں خوب لکھتے ہیں۔ مثلاً جناب مشتاق ملوٹی۔ جناب ہربنس لال صاحب نسیم جناب شیخ عبدالرحیم صاحب منصور۔ جناب شانتی سروپ صاحب کیف۔ جناب سید ظفر احسن صاحب آصف۔ سید امانت حسین بخاری۔ جناب برکت رام صاحب رام جناب سید نذیر حسن صاحب سبزواری صاحب نذیر۔ جناب لکشمی نراین صاحب شرما جناب مہرداری لال صاحب تمنا۔ وغیرہ

خنداں صاحب کی نظم نگاری کے متعلق علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہٗ یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"عزیزی خنداں۔ دعا۔

میں آپ کی نظم نگاری سے بیحد مسرور و مطمئن ہوں خصوصاً اس لئے کہ آپکے کلام میں اپنا رنگ جستہ جستہ پاتا ہوں۔ اور آپ کی ہر نظم "آگرہ اسکول" کی معیاری نظموں کا ایک شگفتہ اور اچھا نمونہ ہوتی ہے۔ چند سال کے عرصہ میں آپ نے میری اصلاح و تعلیم پر غور کرکے جو اندازِ کلام اختیار کیا ہے وہ میرے اطمینان کے لئے کافی ہے۔ خدا کرے آپ یونہی ترقی کرتے رہیں۔ اور آپکے ذہن و دماغ میں قوت مزید پیدا ہو"

دعاگو سیماب اکبرآبادی
۲۹ / جون ۱۹۳۴ء

نمونۂ تغزل

جگر کے داغ کی شمعیں جلا رہا ہوں میں — شبِ فراق چراغاں منا رہا ہوں میں
مجھے زمانہ نگاہوں سے کیوں گرائے گا — ہنوز ناز کسی کے اٹھا رہا ہوں میں
یہ میری آہ کے شعلے یہ سیلِ اشکِ رواں — دیے جلا کے ندی میں بہا رہا ہوں میں
امید و بیم کی بستی اجاڑ کر دل میں — ترے خیال کی دنیا بسا رہا ہوں میں
کچل رہا ہوں گناہوں کو اپنے سجدوں سے — غرور و کبر کی ہستی مٹا رہا ہوں میں
نگاہِ قہر سے ہے وہمِ التفات مجھے — تباہیوں میں ٹھکانا بنا رہا ہوں میں

نہیں ہے کوئی تو خنداں مثالِ شمعِ مزار
خود اپنی موت پہ آنسو بہا رہا ہوں میں

اب پسند آئیں ادائیں نہیں دیوانوں کی — دھجیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں گریبانوں کی
سجدے کرتا ہوں میں چوکھٹ پہ صنم خانوں کی — کونسی بات ہے اب مجھ میں مسلمانوں کی
اسقدر جوشِ جنوں ہے کہ حرم والوں سے — پوچھتا پھرتا ہوں میں راہ صنم خانوں کی
خم گردر دیکھی ہوں شوق سے جلتا بھی ہوں — شمع کی بھیس میں تقدیر ہے پروانوں کی
جھلملاتے ہوئے تاروں کو یہ کیا سوجھی ہے — دیکھنے آئے ہیں دنیا مرے ارمانوں کی
شمع لائے ہیں تری بزم میں مطلب یہ ہے — یاد آئے تجھے بھولے ہوئے پروانوں کی
پھر کہاں سے لے کے چلی حسرتِ دیدار مجھے — پاؤں پر گرد ابھی باقی ہے صنم خانوں کی

تنگ ہے پھر بھی یہ دنیائے محبت خنداں
دل کے ہر ذرے میں وسعت ہے بیابانوں کی

دو دن کا ہے جوشِ جوانی — حسن بھی فانی، عشق بھی فانی
اب نہیں کوئی رات سہانی — وائے محبت، ہائے جوانی
رنگیں شام سنہری صبحیں — ہائے وہ میرا خوابِ جوانی
یادِ جوانی آئے تو آئے — لوٹ کر آئے گی نہ جوانی
ہجر میں اُن کی ساون آیا — خونِ جگر ہے پانی پانی
گریۂ پیہم سوزِ محبت — ایک جگہ ہیں آگ اور پانی
باعثِ گریہ پوچھ نہ مجھ سے — ہر آنسو ہے ایک کہانی

خنداں کیوں محفوظ نہ رکھوں
داغِ جگر ہے اُن کی نشانی

نہ پوچھ کتنا ہے تاریک گوشۂ تربت — یہیں ہیں جمع مری سب گناہ کی راتیں

کبھی صورت ہو اُن کی سامنے جلوہ نما کر دے — الٰہی! قسمت آئینہ آنکھوں کو عطا کر دے
چراغاں کرنیوالے منعموں کی بزمِ عشرت میں — کبھی مفلس کی غم خانے میں بھی روشن دیا کر دے
مذاقِ رہبری دی کاروانِ ہوش کو اپنے — وفورِ شوق سے ہر راہرو کو رہنما کر دے

ہمارے جام میں وہ بادۂ سرجوش ہے خنداں
جو رندانِ خرابِ ہوش کو بھی پارسا کر دے

کھٹکتے ہیں مری ہر زخم میں احساس کے نشتر — مناتا ہوں میں ہولی، زخمِ دل کی لالہ کاری سے

آخری ہچکی جسے سمجھے ہوئے ہیں چارہ ساز — آخری ٹکڑا ہے میری آخری پیغام کا

ہر بگولہ دشت سے سوئے مزار آ ہی گیا — سوگواروں کی کشش سے سوگوار آ ہی گیا

ہر دم کی ٹھوکروں سے میں برباد ہو گیا — یارب نہ رہگذر میں کسی کا مزار ہو

ہیں ایک وہ جنہیں ہے تمنا شباب کی — اک ہم کہ موت مانگ رہے ہیں شباب میں
خنداں نقاب ڈال کے آئیں وہ شوق سے — لیکن یہ چاند چھپ نہ سکیگا سحاب میں

خستہ حالِ لفت ہیں ہم ہی برباد ہو تیں — تباہی ڈھونڈتی پھرتی ہے دنیا میں تباہی کو

نمونۂ نظم

"جہانِ عشق کی دیوالی"

جہانِ عشق میں غم لیکے آئی دیوالی — چراغِ داغ جلا کر منائی دیوالی
ہزار بار تماشا کیا چراغاں کا — سماں کچھ اور ہی ہے داغہائے خنداں کا
چراغ جس کے نہ ہوں تیل سے کبھی خالی — جہانِ عشق میں کہتے ہیں اسکو دیوالی

یہ داغِ دل ہیں یہ آنکھوں پہ جو چمکتے ہیں — یہ وہ شرارہ ہیں جو رات بھر دہکتے ہیں
جگر کے خون کا روغن بنائے جاتے ہیں — چراغِ سوزِ محبت جلائے جاتے ہیں
مجال کیا کہ دلِ بیقرار سو جائے — وہ دل ہی کیا جو شبِ انتظار سو جائے
جو پھول بن کے اڑے داغِ دل بہار ہیں — تڑپ رہے ہیں وہ جگنو سے سبزہ زاروں میں
تحیرات میں ہے حیرتِ نظارہ گم — تجلیات میں ہے غرق محفلِ انجم
کسی کی یاد میں مجبوریوں سے رو نہ سکے — یہ داغ وہ ہیں جنہیں آنسوؤں سے دھو نہ سکے
مٹیں جو آہ سے وہ داغ دل کے داغ نہیں — ہوائیں جن کو بجھا دیں یہ وہ چراغ نہیں

فروغِ حسنِ ازل دیکھ دل کے داغوں میں
چراغِ طور کا پرتو ہے ان چراغوں میں

"شاعر اور ابرِ بہار"

یاد ہے اس شب کا نظارہ تجھے ابرِ بہار — دیکھ کر کالی گھٹا ہوتا کسی کا بیقرار
مجھکو جانا تھا تماشائے لقا کے واسطے — تجھ سے کہتا تھا ذرا تم جا خدا کے واسطے
تو گرجتا، گھورتا اور برق چمکاتا ہوا — سر چڑھا آتا تھا میرے تیر برساتا ہوا
تو نے میری راستے میں ایک جل تھل کر دیا — تشنۂ دیدار امیدوں پہ پانی پھر گیا
آج تو نے اپنی صورت پھر دکھائی ہے مجھے — آج پھر اُس واقعے کی یاد آئی ہے مجھے
آہ تو یہ چاہتا ہے میں تری منت کروں — تیری قدموں پر نچھاور جذبۂ غیرت کروں
اب کہاں وہ، اب نہیں مجھ کو کسی کا انتظار — اب نہ جانا ہے کہیں مجھ کو نہ میں ہوں بیقرار

سرخوش و سرمست از کہسارہا برخیز و بار
فرصتے دارم بخلوت تند بار و تیز بار

ایک قومی نظم کے دو بند

قید تھا انسان جب تاریکیٔ ظلمات میں — ساری دنیا غرق تھی جب جہل و مکر و ہا میں
سرزمینِ ہند روشن تھی الٰہیات سے — علم و عرفانِ الٰہی کی تجلیات سے
تشنۂ تسکیں تھا جب آبِ حقیقت سے جہاں — ہند میں تھے بادۂ توحید کے دریا رواں
سرزمینِ ہند تھی اک کائناتِ رنگ و آب — جس پہ تھی جلوہ فگن روحِ تعلیم کا آفتاب
ہند کہتے ہیں جسے اک پریم کا مندر تھا یہ — نظم اور اصلاح کے پیغمبروں کا گھر تھا یہ

اس کا ہر ذرہ تھا اک طورِ جمالِ معرفت — اس کا ہر جلوہ تھا تنویرِ جمالِ معرفت
علم کی اور فن کی تھی تخلیق اس کی خاک سے
آسماں لیتا تھا غازہ اس کی گردِ پاک سے
کون ہیں ہم، اس کا کچھ احساس ہونا چاہئے — سطوتِ اسلاف کا کچھ پاس ہونا چاہئے
اب بھی ہیں خاکسترِ دل میں وہی چنگاریاں — اب بھی آتش در بغل ہیں سوختہ سامانیاں

آج گو ہم پائمالِ گردشِ افلاک ہیں — پھر بھی اک جلوہ شانِ سوختہ کی خاک ہیں
خاک کے ذرّوں میں سیلابِ تجلیّات ہے — انقلاب آگیں ابھی ہنگامۂ ذرّات ہے
ولولوں میں جوش اور خوں میں حرارت ہے ہنوز
نظمِ عالم کو بدل دینے کی قوت ہے ہنوز

جناب پنڈت رام جوایا صاحب خنداں جہلمی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

خلوص و مہرِ احباب پہ آہ کرنے دے — مجھے فریب کی دنیا تباہ کرنے دے

بس اختتامِ محبت ہی آہ کرنے دے — مجھے امید کی دنیا تباہ کرنے دے (امید و بیم)

نظامِ بزمِ محبت کا جائزہ لے لوں — کسے خبر ہے کوئی پھر نگاہ کرنے دے (نہیں یقین)

یہ تلخ زہر ہے نعمت کی پاک بوندوں میں (پردے) — مجھے نشاطِ ہوس کو تباہ کرنے دے

نظر ہے رحمتِ حق کی گناہ گاروں پر — میں بدنصیب رہوں کیوں گناہ کرنے دے

نگاہِ ناز کو رکھ طور تک نہ تو محدود — کہ برقِ حسن کو دنیا تباہ کرنے دے (یہ برق ہے اسے)

ہوائے دید کو کچھ جرأت نظر دے دے — نثار جان کو سرِ جلوہ گاہ کرنے دے

کمالِ حسن آئینہ ہیبت گر نہ کسی (جوہرِ آئینہ سے یہ کہتا ہوں اس) — کبھی ادھر بھی کسی کو نگاہ کرنے دے

میں جانتا ہوں کہ کس شے کی داد ملتی ہے — مشاعروں میں نہیں واہ واہ کرنے دے

ابھی نہ چھیڑ قیامت کے تذکرے خنداں
ابھی ہے عہدِ جوانی گناہ کرنے دے

خلیل منشی عبدالستار خاں صاحب کولاری (۴۳)

آپ کا نام عبدالستار خاں اور تخلص خلیل ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں آپ بمقام کولار پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حیدر خاں تھا جو ایک زبردست تاجر اور قابل شخص تھے۔ خلیل صاحب کی کمسنی ہی میں والد صاحب کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا اور آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کی۔ آپ ایک اعلیٰ خاندان اور بزرگ وار فیع نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

سلسلۂ تعلیم شروع ہونے کے بعد آپ نے بتدریج اپنی ذہنی فراست و ذکاوت سے ترقی حاصل کی۔ سب سے پہلے اردو لوئر سیکنڈری کا امتحان پاس کیا اس کے بعد انگریزی میں میٹرک کا امتحان عربی اور اردو (اختیاری) مضامین کیساتھ پاس کیا۔ چونکہ سرکاری ملازمت کے لئے موجودہ زمانے کے چند دیگر علوم مثلاً سائنس یا ٹائپ کرنا۔ یا شارٹ ہینڈ وغیرہ وغیرہ بھی ضروری ہیں اس لئے آپ نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ اور فارسٹری کے کورس کی تکمیل کی اور بہت جلد اُس کا امتحان پاس کر لیا۔ آپ کی انگریزی بہت اچھی ہے اس کے علاوہ ٹائپ میں بھی آپ کو کمال حاصل ہے۔ آپ کی تحریر انگریزی اور اردو بہت خوشخط ہوتی ہے۔ حالانکہ جو لوگ ٹائپ کرتے ہیں وہ انتہائی خراب لکھتے ہیں۔ آپ گورنمنٹ میسور کے محکمۂ جنگلات میں کلرک اور ٹائپسٹ ہیں۔ تمام افسرانِ بالا آپ کے اخلاق اور کام سے بہت زیادہ خوش ہیں اور آپ کے پاس افسروں کے عطا کردہ بہترین سرٹیفکٹ موجود ہیں۔

آپ بہت چھوٹی عمر سے شعر کہتے ہیں جب آپ پندرہ سولہ سال کے تھے اس وقت اس کی ابتدا ہوئی عرصے تک آپ حضرتِ واصل کولاری سے مشورۂ سخن لیتے رہے۔ لیکن جب حضرتِ واصل بہت بوڑھے ہو گئے تو آپ نے یہ سلسلہ بند کر دیا اور اپنی ذاتی استعداد سے خود ہی اپنا کلام بعدِ انتخاب ہندوستان کے مشہور رسائل و اخبارات کو بھیجتے رہے۔

آپ کو مدتِ مدید سے ایک استادِ کامل اور خضرِ راہ کی تلاش تھی۔ انتہائے تجسس اور غور و فکر کے بعد آپ نے حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کو اس رہبری کے لئے منتخب فرمایا۔ اور اپنا کلام برلئے اصلاح بھیجنا شروع کر دیا۔ اصلاح کا سلسلہ ذریعۂ خط و کتابت جاری ہے اور آپ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ آپ کے دل میں اپنے استادوں کی محبت اور قدر و منزلت انتہا سے زیادہ ہے۔

آپ کے پاس اردو۔ فارسی۔ عربی اور انگریزی زبان کی کتابوں کا ایک زبردست ذخیرہ ہے۔ جس میں ادب۔ آرٹ اور تنقید کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ جتنی کتابیں آپ کے یہاں ہیں وہ شہر میں اور کسی کے یہاں نہیں ہیں۔ آپ کو ادب سے فطری لگاؤ ہے۔ جب آپ دفتر سے واپس آتے ہیں تو بجز مطالعہ کے اور کچھ نہیں کرتے۔ ان کتابوں کے علاوہ ہندوستان کے مشہور اخبار و رسائل بھی آپ کے یہاں آتے ہیں۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ انتہائی غور و فکر کیساتھ۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کو کسی کی دلشکنی منظور نہیں۔ آپ اس شعر کے پیرو ہیں۔ ؎

کعبہ کے ڈھانے والے وہ اور لوگ ہونگے

ہم کفر جانتے ہیں دل توڑنا کسی کا

پرانی شاعری سے آپ کو نفرت ہے۔ جدید رنگِ تغزل کے حامی اور عامل ہیں۔ آپ نے اپنی غزلوں کا مجموعہ "گلبانگِ خلیل" کے نام سے مرتب کیا ہے جو عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔ آپ نے شہنشاہِ جارج پنجم کی جوبلی پر ایک بے مثل قصیدہ لکھا تھا جو انتہا سے زیادہ پسند کیا گیا اور آپ کو ایک بہت پر زور سارٹیفکٹ بھی اس سلسلہ میں ملا۔

شہر میں آپ عزت و وقار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - کولاریں آپ کا دم غنیمت ہے. علمی اور ادبی مجالس میں آپ کو لوگ بہ اصرار بلاتے ہیں اور آپ علم دوست و ادب شناس طبقہ میں ایک خاص پوزیشن کے حامل ہیں - آپ غزل زیادہ کہتے ہیں.

نمونۂ تغزل

دل مرا حسن کا پروانہ بنے یا نہ بنے　　آپ کیا کہتے ہیں دیوانہ بنے یا نہ بنے
بجلیاں تاک میں رہتی ہیں جلانے کیلئے　　باغباں - باغ میں کاشانہ بنے یا نہ بنے
دورِ ساغر نہیں معلوم کب آئے مجھ تک　　لبِ تشنہ خطِ پیمانہ بنے یا نہ بنے
یاد بھی کوئی پسِ مرگ کرے یا نہ کرے　　میری روداد کا افسانہ بنے یا نہ بنے
ایک سی ایک فضیلت میں سوا ہی زاہد　　روبرو کعبہ کے بتخانہ بنے یا نہ بنے
لطفِ مے نوشی یہاں کیوں نہ اٹھا لو واعظ　　باغِ فردوس میں میخانہ بنے یا نہ بنے
لطف تو جب ہی کہ ہو سوزِ حقیقی دلمیں　　ورنہ بیکار ہی پروانہ بنے یا نہ بنے
دل ہی روشن مرا اس شمعِ رسالت سے خلیل　　گھر مرا نور کا - کاشانہ بنے یا نہ بنے

خدا کی خدائی میں کیا دیکھتا ہوں　　تجھی کو میں جلوہ نما دیکھتا ہوں
زمانے کی بدلی ہوا دیکھتا ہوں　　عجب انقلاب فضا دیکھتا ہوں
جبیں پھر نہیں میری اٹھتی وہاں سے　　جہاں میں ترا نقشِ پا دیکھتا ہوں
نمایاں ہی ہر چیز سی حسنِ قدرت　　بتوں میں بھی شانِ خدا دیکھتا ہوں
شرابِ حقیقت پلاتا ہی ساقی　　عیاں رازِ ارض و سما دیکھتا ہوں
خلیل اب یہ پردہ اٹھا کر خودی کا
جدھر دیکھتا ہوں خدا دیکھتا ہوں

لب پہ جب ذکرِ یار آتا ہے　　میرے دل کو قرار آتا ہے
چشمِ ساقی کو یاد کرتا ہوں　　مجکو جس دم خمار آتا ہے
آ گیا ہے تو اب نہ جانے دو　　دل کہیں بار بار آتا ہے

آج مسجد سے میکدے کو خلیل
اک پرہیزگار آتا ہے

ہر ایک گام پر اس میں خونباریاں ہیں　　عجب باغِ الفت کی گلکاریاں ہیں
خبر دلکو ہے بیخودی میں بھی ان کی　　یہ بیہوشیاں ہیں کہ ہشیاریاں ہیں
علاج ان مریضانِ الفت کا کیا ہو　　یہ بیماریاں دل کی بیماریاں ہیں
وہاں ان کو آنے کی فرصت نہیں ہے　　یہاں جان جانے کی تیاریاں ہیں
جلے گا نہ کیوں لے خلیل آپ کا دل
دبی اس میں الفت کی چنگاریاں ہیں

تو جو مشتاق ہے نشانے کا　　دلکو ہے شوق تیر کھانے کا
کام فرقت میں رہ گیا ہم کو　　خونِ دل آنکھ سی بہانے کا
دل ہی بیزار میرا دنیا سے　　منتظر ہوں قضا کی آنے کا
آج کل عیب ہو گیا ہی ہنر　　آہ کیا دور ہے زمانے کا
حسنِ معنی کسے دکھائیں خلیل
رنگ ہی اور ہے زمانے کا

دلِ درد آشنا ہے اور میں ہوں　　تڑپنا لوٹنا ہے اور میں ہوں
مرے سازِ تخیل کی صدا میں　　نیا کیفِ بقا ہے اور میں ہوں
قیامت میں قیامت کا ہی ساماں　　مرا محشر جدا ہے اور میں ہوں
ستاتی ہے بہت بربادیٔ دل　　غضب کا سامنا ہے اور میں ہوں
نہ دستِ شوق نے پائی طلب ہے　　دلِ بے مدعا ہے اور میں ہوں
کھلا لطفِ ستم کا راز مجھ پر　　مرا شوقِ جفا ہے اور میں ہوں

داغِ فراقِ دوست ہوئے اس قدر نصیب　　سینہ ہمارا غیرتِ گلزار ہو گیا
اک بے وفا کی یاد میں دم بھر نہیں ہے چین　　یارب میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا
برقِ جمالِ یار کے پرتو سے اے خلیل
میرا ہر ایک شعر شرربار ہو گیا

درد — عبدالرشید صاحب اکبرآبادی (۴۵)

جناب درد کا وطنِ خاص اکبرآباد ہے۔ آپ ایک معزز خاندان کے ہونہار اور قابل فرد ہیں۔ آپ کے دادا صاحب کا اسمِ گرامی مولوی عبدالغفور صاحب تھا اور والدِ محترم کا نامِ نامی مولوی عبدالشکور صاحب اکبرآبادی ایم اے۔ بی ٹی ہے۔ چونکہ آپ کو ایک تعلیمیافتہ اور مہذب خاندان سے لگاؤ ہے جو علم و ادب کا مخزن رہا ہے اس لئے آپ کی تعلیم بھی اُن ہی اعلیٰ لائینوں پر ہوئی جس کی ضرورت تھی۔ اوائلِ عمر میں اُردو فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوتی رہی۔ چونکہ آپ کے دادا صاحب کا قیام ریاست اورچھہ بندیلکھنڈ میں تھا اس لئے ان ہی کے زیرِ سایہ اردو اور فارسی کی تعلیم باقاعدہ حاصل کی اور استعدادِ کلی کے بعد آپ کو انگریزی تعلیم کی طرف رجوع کیا گیا ۱۹۳۴ء میں آپ نے انٹرینس کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ تعلیم حاصل کرنا آپ اپنا فرضِ منصبی اور اقتضائے فطرت سمجھتے ہیں اس لئے ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے اور عنقریب آپ انگریزی کا اعلیٰ امتحان دینے والے ہیں۔

خاندانی اثر اور فطری ذوق کی بنا پر آپ کو شعر و سخن سے ہمیشہ شغفِ خاص رہا ہے اوائل عمر ہی سے اس دنیا میں قدم رکھ چکے ہیں۔ تکمیلِ شوق کیلئے ریاست اورچھہ کے مشہور شاعر جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب منظر سے شرفِ تلمذ حاصل کیا لیکن اورچھہ چھوڑنے کے بعد جب آپ کا مستقل قیام آگرہ میں ہو گیا تو اصلاح کا سلسلہ بند ہو گیا اور آپ کو تشنگیٔ شوق بجھانے کے لئے کسی نئے رہبر کی ضرورت ہوئی۔

آپ اکثر مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کا کلام بہت دلچسپی اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ آگرہ آنے کے بعد مولانا سے نیاز حاصل کرنے کا موقع تلاش کر رہے تھے ایک دن دورانِ گفتگو میں آپ کے کرم فرما جناب اے۔ بی فلپس صاحب صابرؔ بی اے نے بھی آپ کی رائے سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ اگر واقعی آپ کو شاعری سے ذوق ہے اور اس ذوق کو حدِّ کمال تک پہونچانا چاہتے ہیں تو مولانا سیمابؔ سے بہتر آپ کو کوئی دوسرا رہنما نہیں ملے گا۔ چنانچہ ایک دن صابرؔ صاحب خود دردؔ صاحب کو مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں لائے اور چونکہ صابرؔ صاحب بھی مولانا کے عقیدت کیش ہیں اس لئے ان کی سفارش سے دردؔ صاحب مولانا مدظلہٗ کے تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ ابھی آپ کو اصلاح لیتے ہوئے صرف ایک سال ہوا ہے جس کے متعلق آپ خود تحریر فرماتے ہیں۔

"تقریباً ایک سال سے میں مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کے خوشہ چینوں میں ہوں۔ مولانا کے قیمتی مشوروں نے مجھ کو اپنے گزشتہ دورِ شاعری سے علیحدہ کر کے ایک نئی اور دلفریب دنیائے شاعری میں پہونچا دیا ہے جہاں میں اپنی ماضی و حال کی شاعری میں بے انتہا تفاوت پاتا ہوں۔ اس ترقی کا مدار میری ذاتی استعداد نہیں بلکہ مولانا مدظلہٗ کے فیض اور ان کے زرین مشوروں پر ہے۔"

مندرجہ بالا جملوں میں دردؔ صاحب نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ مولانا مدظلہٗ کا فیضِ سخن پتھر میں بھی شعریت پیدا کر دیتا ہے۔ حقیقتاً دردؔ صاحب کا ذاتی رجحان اور غور و فکر قابلِ صد مبارکباد ہے۔ آج دردؔ صاحب اس مقام پر ہیں جہاں لوگ برسوں کی مشق کے بعد بھی نہیں پہونچتے۔ ایک سال میں یہ انقلاب فاضل استاد اور قابل شاگرد کی ایک زندہ مثال ہے۔ اور مستقبل دردؔ صاحب کی ترقیوں سے ہمکنار نظر آتا ہے۔

دردؔ صاحب کی شاعری پر مندرجۂ بالا چند سطریں روشنی ڈالنے کیلئے کافی ہیں اس لئے کسی مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔ آپ نظم و غزل دونوں اصناف پر طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ آپ بہت زیادہ خوددار اور ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ کے نائب سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔

نمونۂ تغزل

طور کا جلوہ اگر جلوۂ ارزاں ہوتا — پھر بھی مجھ کو تری دید کا ارماں ہوتا

ہوش میں ڈھونڈ نا تیرا گر آساں ہوتا — تو مری ہوش میں رہنے کا بھی امکاں ہوتا
یاد رہتا جو مجھے ماتمِ عہدِ ماضی — عشرتِ حال کی دھن میں نہ پریشاں ہوتا
ہوش ہوتے ہوئے منزل پہ پہنچنا معلوم — مرکزِ ہوش سے آگے کوئی امکاں ہوتا
بحرِ ہستی کے تلاطم سے بچانے کیلئے — ناخدا بھی کوئی پروردۂ طوفاں ہوتا

کچھ دیر کیلئے پھر دنیا کو بھول جائیں — جب تک وہ سامنے ہیں ہم ہوش میں نہ آئیں

کچھ یاد تو آتا ہے اک خواب دیکھا تھا — جب اپنے ہی جلوے تھے اپنا ہی تماشا تھا
آغوش میں پھولوں کی جو رات کو سویا تھا — دن ہوتے ہی وہ قطرہ بھولا ہوا قصہ تھا
حسن اور محبت اک تصویر کے دو رخ تھے — یا حسن تماشا تھا یا عشق تماشا تھا
اسے دردِ نظر میری معمورۂ وحشت تھی
سب کو مری تیور سے اندازۂ صحرا تھا
پھولوں میں لگاوٹ کی خوشبو ہی نہیں آتی — ہم خار سے سیکھیں گے آدابِ شناسائی

اگر کلیاں چٹکتی ہیں سمجھتا ہوں کہ تو آیا — تری پیکر میں آئیگا نظر یہ گلستاں کب تک

چھلکنے ہی نہیں دیتا مرا پیمانہ برسوں سے — یہ کس کے ہاتھ میں ہے قسمتِ میخانہ برسوں سے
مری وہم و گماں کی وسعتیں بڑھتی ہی جاتی ہیں — مکمل ہی نہیں ہوتا مرا افسانہ برسوں سے
نشاطِ وصل و رنجِ ہجر سے اب اسکو مطلب کیا — ہوس کی حد سے آگے ہے ترا دیوانہ برسوں سے

جہاں ہے تو وہیں کیوں میری سجدہ گاہ نہیں — نظامِ حشر میں اصلاح چاہتا ہوں میں
الٹ رہی ہے ہر اک سانس اک نیا پردہ — شدہ شدہ تری نزدیک آرہا ہوں میں

نمونۂ نظم
"کسی سے"

یاد ہیں وہ دن جب ارمانِ تماشا تھا مجھے — شکوۂ بیداد کرنا بھی نہ آتا تھا مجھے
جب تری نظروں سے ملتا تھا پیامِ زندگی — جب میں تھا ناواقفِ غمہائے شامِ زندگی
جب تری آواز کی نغموں سے دل معمور تھا — جب میں اپنی ہستی پہ کیف پہ مغرور تھا
جب تری معصوم آنکھوں میں جھلکتا تھا شباب — جب تری خاموشیاں تھیں آرزوؤں کا جواب
جب تری ہلکے تبسم کی تھی مجھ کو آرزو — جب میں تیری بادۂ الفت سے کرتا تھا وضو
جب تصور میں مری بیخوف آجاتا تھا تو — جب نگاہیں چار ہونے سے شرماتا تھا تو
جب تری معصومیت تھی آشکارا ہر طرح — جب تجھے میری محبت تھی گوارا ہر طرح
جب تری فطرت تھی نامانوسِ عشقِ ماسوا — جب نہ ہوتا تھا ذرا سی بات پر مجھ سے خفا
جب کہ تو اور صرف تو ہی انتخابِ درد تھا — جب تری ہلکے تبسم میں شبابِ درد تھا
جانے کس سے سیکھ آیا طرزِ بیدادِ ستم
دفعتاً مجھ کو کیا کیوں آشنائے درد و غم
تو یہ کہتا تھا نزاکت تجھ سے زائد دل میں ہے — کعبہ دل میں دیر دل میں اور مسجد دل میں ہے
تو یہ کہتا تھا کہ دل اس ظلم کا عادی نہیں — تو یہ کہتا تھا کہ اس نے کچھ خطا کی ہی نہیں
تو یہ کہتا تھا کہ یہ جام سے مقصود ہے — تو یہ کہتا تھا کہ اس میں تو ہی تو موجود ہے
جامِ جم تھا پھر بھی تو نے قدر اسکی کچھ نہ کی
"قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"
تیرے اس انداز کا شکوہ کیا تو کیا کیا — جس کی فطرت ہی ہمیشہ سے رہی ہو بے وفا
میں سمجھتا تھا کہ تو ہے دل کا میرے ناخدا
فی الحقیقت بحرِ غم کا ناخدا کوئی نہ تھا

رباعیات

باطن کا ہے شیشہ دار رہنا اچھا — ہر نقش کا آشکار رہنا اچھا
اک قسم کا دھوکا ہے ریائی نیکی — اس سے تو گنہگار رہنا اچھا

مرنے کو حیاتِ جاودانی سمجھے — ہر عیش و مسرت کو کہانی سمجھے
جس وقت کسی کے غم میں موت آجائے — اس ساعتِ نیک کو جوانی سمجھے

راز — ابوالفاضل محمد صادق صاحب چاندپوری (۳۶)

آپ کا اسمِ گرامی محمد صادق اور راز تخلص ہے۔ والدِ محترم کا نام منشی حافظ محمد جعفر تھا جو ایک بزرگ ہستی تھے۔ آپ کے دادا شیخ نذر محمد صاحب بہت باوقعت اور صاحبِ حیثیت آدمی تھے پردادا شیخ فتح محمد صاحب صوبیدار تھے۔ آپ ۲۵ شعبان سنہ ۱۳۱۰ھ کو قصبہ چاندپور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابوالفاضل آپ کی کنیت ہے جو سب سے بڑے صاحبزادے محمد فاضل کی ولادت کے بعد بطورِ یادگار آپ نے اختیار کی اور اب یہی جزوِ نام ہوگئی ہے۔

راز صاحب بچپن ہی سے کچھ اس درجہ ذہین و طبّاع واقع ہوئے تھے کہ سب کو حیرت ہوتی تھی آپ نے بہت کم عمر میں اردو و فارسی کی متعدد کتابیں ختم کرلیں۔ گو آپ کی تعلیم کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہیں دی گئی جتنی کہ ضرورت تھی لیکن آپ چونکہ ایک غیر معمولی دل و دماغ لیکر آئے تھے اس لئے فطرت نے خود تعلیم کے بہترین اسباب پیدا کردئے۔ انگریزی اردو اور فارسی کی تعلیم ارتقائی لائینوں پر آپ نے باقاعدہ حاصل کی۔ اور اختتامِ تعلیم کے بعد معاشی فکروں کیساتھ ساتھ مطالعہ کو بھی جزوِ زندگی بنائے رکھا۔ اردو فارسی۔ اور انگریزی کے علاوہ ہندی و عربی میں بھی کافی مہارت پیدا کرلی۔ اس کے بعد آپ ایک عرصہ تک ریلوے میں ملازم رہے اور آپ کا قیام کانپور جیسے ادبی ماحول میں رہا۔ ریلوے کی ملازمت چھوڑنے کے بعد اب عرصۂ دراز سے جبلپور میں سرکاری ملازم ہیں۔

جس مقام سے راز صاحب کو وطنی نسبت ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں بجنور کے خطے نے کیسے کیسے اعلیٰ دماغ پیدا کئے تاریخ اسکی شاہد ہے اگر اُس سرزمین نے راز جیسا مشہور و معروف ادیب بھی ملک کے سامنے پیش کیا تو کوئی تعجب ناک بات نہیں لطف تو یہ ہے کہ راز صاحب اپنی انتہائی معروفیتوں اور زمانے کی گردشوں کے باوجود بھی خدمتِ ادب کے لئے کمربستہ رہے۔ آپ کی چالیس سالہ زندگی نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں اور گو تمام عمر آپ اُس طرف کافی توجہ نہ دے سکے جس کے لئے فطرت نے آپ کو پیدا کیا تھا لیکن پھر بھی دنیا کے سامنے اپنے اصلی روپ میں پیش ہوئے۔

آپ شاعر بنائے نہیں گئے بلکہ فطرت نے آپ کو شاعر پیدا ہی کیا تھا۔ زمانۂ عہدِ طفلی ہی سے آپ کے ذوقِ شعری میں ابھار پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن حقیقی شعر گوئی ۲۵ جولائی سنہ ۱۹۱۶ء سے شروع ہوئی جب کہ آپ اپنے استاد علامۂ عصر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے۔ استادی شاگردی کے درمیان ایک چیز ذاتی استعداد بھی ہوتی ہے جس پر استاد کی نظر جلا کرتی ہے اور وہ جلا پھر ایسی ہوتی ہے کہ تاقیامت رہتی ہے۔

جس اچھی طبیعت کو سیماب (مدظلہ) جیسا استادِ بے مثل ملے وہ بھلا کہیں دنیا میں بغیر آگ لگائے رہ سکتی ہے؟ برادرِ محترم حضرت راز چاندپوری نے شفیق استاد کی رہنمائی میں بہت جلد ابتدائی مراحل طے کرلئے اور ایک اتنے کم عرصہ میں جس میں کہ صرف شعر گوئی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ آپ تمام اصنافِ سخن سے اچھی طرح واقف ہوکر معراجِ ترقی پر پہونچ گئے۔ آپ اپنی ایک غزل میں اس طرح فرماتے ہیں۔

سیکھی ہے راز میں نے سیماب نکتہ داں سے
یہ رمزِ شعر گوئی یہ طرزِ خوشنوائی

موجودہ دور میں راز صاحب کا کیا درجہ ہے یہ ہر اُس شخص پر ظاہر ہے جسے ادب اردو سے ذرا بھی تعلق ہے۔ ہندوستان کا کوئی اچھا اخبار یا رسالہ ایسا نہیں جس میں آپکا کلام نظم و نثر نہ چھپ چکا ہو۔ اخبار و رسائل

آپ کا کلام بعد اصرار منگاتے ہیں اور اس باب میں آپ جس درجہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ دوسروں کی نگاہ میں کچھ بھی ہو لیکن اس سے رازؔ صاحب کی شہرت سے بے نیازی اور انکسار کا انتہائی درجہ معلوم ہوتا ہے مشاعروں کی شرکت سے بھی آپ بھاگتے ہیں غرض یہ نہیں چاہتے کہ کسی طرح دنیا کے سامنے متعارف ہوں لیکن گلاب کی مہک پسِ پردہ بھی نہیں چھپتی۔ اسی طرح رازؔ کے کلام کی خوشبو آج ہندوستان میں مہک رہی ہے جسے وہ چھپانے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں۔

رازؔ صاحب صرف ایک بلند پایہ غزل گو ہی نہیں ہیں بلکہ آپ کی نظمیں اور افسانے بھی ملک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ کلام کے متعلق میں کچھ زیادہ عرض نہیں کروں گا۔ رازؔ صاحب پر علیحدہ ایک مضمون اس اشاعت میں دیا جا رہا ہے۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ "آگرہ اسکول" کے صحیح ترجمان اور زندہ یادگار ہیں۔ اُن کے کلام سے "آگرہ اسکول" کا نام صدیوں تک زندہ رہے گا اور جس وقت مؤرخ آگرہ اسکول کی تاریخ مرتب کریگا اس وقت ان کا نام بہت نمایاں ہوگا۔

آپ کی دو تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ "دنیائے رازؔ" آپ کی قدیم و جدید چیدہ منتخب نظموں کا مجموعہ ہے جسے ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جو ۱۹۳۰ء میں طبع ہوا تھا۔ "زرین افسانے" آپ کے افسانوں کا مجموعہ ہے جسمیں چودہ مختصر افسانے دئے گئے ہیں جس کا ہر افسانہ اپنی جگہ بہت خوب ہے۔ "نوائے رازؔ" غزلوں اور رباعیوں کا منتخب مجموعہ اور "روداد محبت" ٹالسٹائی کے ایک مبسوط اور دلکش ناول کا ترجمہ عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔ آپ کو ترجمہ کرنے میں خاص ملکہ ہے اور آپکے بیشتر تراجم رسالوں وغیرہ میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

آپ سے جن لوگوں کو ذاتی تعارف حاصل ہے وہ آپ کی خاندانی شرافت اور ذاتی خصوصیات کے معترف ہیں آپ کے اخلاق و عادات میں مکمل انسانیت پائی جاتی ہے۔ انکسار۔ سادگی۔ ملنساری اور صلح جوئی آپ کا شعار فطری ہے۔

نمونۂ غزل

وہ اک لمحہ جو گذرا ہے بظاہر مُے پرستی میں　　وہی ہے حاصلِ عمرِ دو روزہ بزمِ ہستی میں
میں کافر ہوں بہت اچھا، مگر اے زاہدِ حق بیں　　کسی کی دیکھتی ہے مجھے تو خود پرستی میں
تجھی سے پوچھتا ہوں، اے خدا آگاہ سچ کہنا　　کوئی حق کیش بھی ہے کیا کہیں دنیا کی بستی میں
یہ شیخ و برہمن، یہ رہبرانِ کوئے خود بینی　　کہاں سے آگئے آخر یہ کافر بزمِ ہستی میں
خدا کا نام لیتا ہے زمانہ رسمِ دنیا ہے　　مگر یادِ خدا آتی ہے اکثر تنگدستی میں

جوازِ میکشی اچھا ملا اے رازؔ میں خوش ہوں
کہ خود پیرِ شریعت بھی ہے شامل مے پرستی میں

دید ہو یا آرزوئے دید ہونی چاہیئے　　زندگی کی کوئی تو امید ہونی چاہیئے
شکوۂ تقدیر کی تائید ہونی چاہیئے　　ذکرِ حق کی کچھ نہ کچھ تمہید ہونی چاہیئے
تلب کے سر گشتۂ کیف و خمارِ این و آں　　تیرے ساغر میں مئے توحید ہونی چاہیئے
ہیچ ہے یہ مشربِ شیخ و برہمن ہیچ ہے　　اب مذاقِ عشق کی تائید ہونی چاہیئے
فکرِ فردا ہے نہ رنجِ دوش یہ کیا حال ہے　　دورِ سوز و ساز کی تجدید ہونی چاہیئے
سختیٔ راہِ طلب کی تو مجھے پروا نہیں　　کامیابی کی مگر امید ہونی چاہیئے
میرے ساقی ایک ساغر، ایک جرعہ اک نظر　　گفتۂ واعظ پہ کچھ تنقید ہونی چاہیئے

کیا کہا، کیا بے اثر ہے بادۂ شعرِ جدید
رازؔ اس الزام کی تردید ہونی چاہیئے

خود نمائی ہے خود پرستی ہے　　واہ کیا رنگِ بزمِ ہستی ہے
مے پرستی سے ہو چکی توبہ　　مے پرستی تو حق پرستی ہے
ایک امید وہ بھی ہے موہوم　　کتنی پختہ بنائے ہستی ہے

سر بسجدہ ہے میکدے میں رازؔ
بس یہی مدعیٔ حق پرستی ہے

کون کہتا ہے کہ دنیا راز ہے　　یہ تو تیری جلوہ گاہِ ناز ہے

کیا بتاؤں تجھ کو وجہ میکشی   بات کہنے کی نہیں اک راز ہے
جان دینا بھی نہیں مشکل مجھے   کتنا دلکش عشق کا آغاز ہے
خود غرض ہے برہمن بھی شیخ بھی   ایک دنیا، ایک عجبی ساز ہے

ختم کر دے راز اب فکرِ سخن
طبعِ موزوں آج کچھ ناساز ہے

ازل سے مدِّ نظر ہے وداعِ ہوش مجھے   گر مِلے بھی کوئی چشمِ مے فروش مجھے
یہ بیخودی ہے مری باعثِ خود آرائی   قیامت آئیگی آ جائے گا جو ہوش مجھے

دنیا کہ بظاہر اک چمن ہے   واللہ عجیب سحر فن ہے
ہر لب پہ ہے نغمۂ من و تو   اہلِ دل کی یہ انجمن ہے
واعظ پہ ہے ختم خوش کلامی   کتنا کمبخت سحر فن ہے
اس حُسنِ سخن کی داد دینا   جو بات ہے اسکی دل شکن ہے
دیکھیے کوئی شیخِ سادہ دل کو   کتنا گل کا رپیرہن ہے
اے رہروِ منزلِ محبت   ہشیار کہ خضر راہزن ہے
کیوں پوچھتے ہیں اہلِ غربت   میں کون ہوں اور کہاں وطن ہے
ذرہ ذرہ ہے مہرِ در بر   حیرت زدہ چشمِ سحر فن ہے
ایک عالمِ بیخودی ہے طاری   اللہ یہ کس کی انجمن ہے
خاموش امینِ رازِ فطرت!   دنیا خوش فہم و خوش سخن ہے

نمونۂ نظم

خواجہ حالی

محفلِ ہندوستاں بے نور تھی   پردۂ ظلمت میں شمعِ طور تھی
بے اثر تھا نغمۂ سازِ سخن   بے خبر تھا محرمِ رازِ سخن
بادۂ مہر و وفا بے کیف تھا   رنگِ محفل لائقِ صد حیف تھا
شاعر و صوفی و رندِ پاکباز   حق پرستی سے تھے یکسر بے نیاز
دورِ جامِ خود پرستی عام تھا   جذبۂ حبِّ وطن بدنام تھا
خود نمائی خود فروشی خودسری   بس انہیں پر تھا مدارِ زندگی
ناگہاں فطرت کو آیا کچھ خیال   صبحِ عشرت بن گئی شامِ ملال

حالیؔ شیوہ بیاں پیدا ہوا
شاعرِ ہندوستاں پیدا ہوا

مرحبا اے عندلیبِ خوشنوا   کس قدر دل دوز ہے نغمہ ترا
سوز خوانی کا عجب انداز ہے   سوز کے پردے میں پنہاں ساز ہے
انقلاب آور ہوئی تیری فغاں   چونک اٹھا خوابِ غفلت سے جہاں
اک صدائے درد میں اتنا اثر   رہ گئی دنیا کلیجہ تھام کر
یادِ ماضی ہمت افزا ہو گئی   فکرِ حال و فکرِ فردا ہو گئی
بڑھ گیا جوشِ بہارِ زندگی   مٹ گیا کسل و خمارِ بے حسی

کھل گیا رازِ حیاتِ جاوداں
مرحبا اے شاعرِ ہندوستاں

نمونۂ نثر

درحقیقت کسی چیز کی قدر و قیمت انسان کو اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ عام آدمی اکثر اس حقیقت سے ناآشنا رہتے ہیں اور کسی شے کے وجود و عدم کی اُن کو خبر بھی نہیں ہوتی، لیکن اگر کسی شخص کو ادراکِ حقیقت ہو جاتا ہے تو وہ اگرچہ عمرِ رفتہ کو یاد کر کے اکثر افسردہ و غمگین ہوتا ہے، مگر اس طرح اس کو یہ موقع ضرور مل جاتا ہے کہ وہ باقی زندگی کو مفید بنانے اور مقصدِ زیست حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ گویا لطفِ زندگی و مقصدِ حیات حاصل کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ انسان ایک مدت تک خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہے جب بیدار ہو تو گزشتہ نقصان کا اندازہ کر کے حال و مستقبل سے پورے طور پر متمتع ہونے کی جد و جہد کرے۔

رضا — شیخ عبدالرضا صاحب قریشی — ۳۷

رضا صاحب کے والدِ محترم کا نام شیخ احمد رضا صاحب تھا۔ آپ ۱۹۱۵ء میں بمقام کانپور محلہ بوچڑ خانہ خورد پیدا ہوئے۔ ابھی آپ عالم طفولیت کی ابتدائی منزلوں ہی سے گذر رہے تھے کہ آپ کے والدین ہمیشہ کے لئے آپ سے جدا ہو گئے۔ والدین کی وفات کے بعد آپ کی تربیت و پرورش آپ کے ضعیف العمر دادا جناب محمد رضا صاحب نے کی۔ چونکہ آپ کے دادا صاحب پر مذہبی رنگ بہت زیادہ غالب تھا اس لئے قرآن شریف کے حفظ کرانے سے پہلے دیگر علوم کا درس دلانا بمنزلہ کفر سمجھتے تھے۔ لہذا آپ کو احسن المدارس کانپور میں داخل کرا دیا گیا۔ تاہم آپ کے ایک دوسرے بزرگ جناب منشی عبدالباسط خاں صاحب نے (جو آپ کے دادا کے ہم زلف تھے) اپنے اثر و کوشش سے مدرسہ کے وقت کے علاوہ مکان پر اردو کی چند کتابیں پڑھا کر محلہ کے ایک عطار صاحب کی دوکان پر فارسی کی ابتدائی کتب کا درس دلانے کے لئے بٹھا دیا۔ چونکہ عبدالباسط صاحب نولکشور پریس میں منشی تھے اس لئے وہ بڑی مفید مفید کتابیں وہاں سے لاتے تھے۔ اس کے علاوہ محلہ کے بہت سے لوگ شب کو باسط صاحب کے پاس داستان سننے آیا کرتے تھے جسے وہ بڑے تکلف کیساتھ سنایا کرتے تھے۔ کچھ دن بعد یہ فرض رضا صاحب کے سپرد کیا گیا اور اس سلسلے میں آپ نے "داستانِ امیر حمزہ"۔ "بوستانِ خیال" "طلسم ہوش ربا" وغیرہ جیسی مشہور کتب کے علاوہ معتدبہ تعداد میں ایسی کتابیں مطالعہ کیں جو آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتی تھیں گو بظاہر یہ چیز وقت ضائع کرنے کے مرادف تھی لیکن دراصل اس مسلسل کتب بینی نے آپ کی معلومات میں ایک زبردست اضافہ کر دیا۔ آپ نے عہد طفلی تعلیمی مشاغل اور مذہبی فرائض کی انجام دہی میں گذارا اور ساتھ ہی ساتھ خانگی پریشانیاں بھی شاملِ حال رہیں۔ آپ کے والد صاحب کی وفات کے بعد آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ آپ کے دادا صاحب بہت ضعیف العمر تھے۔ آپ کے چچا صاحب اپنے رنگ میں مست تھے اور بہت کم امداد پہونچاتے تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کے دادا صاحب کو آپ کو اور چھوٹی ہمشیرہ کو اکثر مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن چونکہ آپ اس چیز کے عادی ہو چکے تھے اس لئے کبھی اس کے احساس سے جبین پر شکن نہیں آتی تھی۔

آپ کے دادا صاحب کے دیگر اعزا ریاست گوالیار کی فوج میں ملازم تھے اور بوجہ ملازمت ریاست ہی میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی چنانچہ آپکے جد بزرگوار میجر امداد حسین صاحب گوالیار کی سیکنڈ لانسر میں کمانڈرنگ آفیسر تھے اور سابق مہاراجہ بہادر کے اے۔ ڈی۔ سی بھی تھے۔ میجر صاحب موصوف اپنے جواں سال صاحبزادے کی جواں مرگی سے متاثر ہو کر غم غلط کرنے کی غرض سے کانپور تشریف لے گئے اور واپسی میں رضا صاحب وغیرہ کو اپنے ہمراہ گوالیار لے آئے۔ گوالیار آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد رضا صاحب کے جد بزرگوار جناب محمد رضا صاحب نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور ان کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد آپ کی چھوٹی ہمشیرہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور آپ ایک روحانی خلش میں مبتلا ہو گئے۔

جناب میجر امداد حسین صاحب کے فوج میں اچھے اثرات تھے اس لئے انہوں نے چاہا کہ رضا صاحب کو ملٹری کے ابتدائی عہدے کی ملازمت دلا دیں لیکن رضا صاحب کو اس لائن سے فطرتاً کچھ نفرت سی تھی اس لئے آپنے انکار کر دیا۔ ملٹری کے علاوہ دیگر صیغوں میں آپ کو ملازمت ملنا ذرا دشوار تھا۔ جب رضا صاحب کو اس چیز کا احساس بہت زیادہ ہوا کہ ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے کسی سلسلۂ معاش کا ہونا ضروری ہے تو آپ کی

طبیعت پر بہت گہرا اثر پڑا اور آپ نے پوری مستعدی و قوت کیساتھ اپنے حالات کو یکسر تبدیل کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک آپ زبانِ ہندی کا مطالعہ کرتے رہے اس میں کافی مہارت ہو جانے کے بعد ریاست کے امتحان "کلریکل" میں شریک ہوئے اور پہلے ہی سال کامیابی حاصل کی۔ یہ امتحان اُس زمانہ میں اتنا سخت تھا کہ آپ کے ساتھیوں میں سے بعض حضرات نویں اور دسویں سال پاس ہوئے تھے یہ امتحان پاس کرنے کے بعد آپ کو پرگنہ کورٹ گوالیار میں کلرک کی جگہ مل گئی اور اب آپ ملازمت کی مدارج طے کرتے ہوئے یہاں تک پہونچے ہیں کہ گوالیار کورٹ میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں۔

جس زمانہ میں آپ پرگنہ کوٹ میں ملازم ہوئے تھے اُسی زمانہ میں خان بہادر اعتبار الملک افتخار الشعراء حضرتِ مضطر خیرآبادی مرحوم عدالتِ گوالیار میں ڈسٹرکٹ جج تھے اور لشکر میں شعر و شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ جب حضرتِ مضطر مرحوم عدالت کے کمرہ سے گھر جانے کے لئے نکلتے تھے تو دیگر ملازمین اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیتے جن میں زیادہ تر اُن کے تلامذہ ہوتے تھے۔ راستہ میں اور بھی حضرات ساتھ ہو لیتے تھے اور سب اُن کے دولت کدے تک پہونچ جاتے تھے جہاں ایک اچھا خاصہ مشاعرہ روز ہو جاتا تھا۔ رضا صاحب بھی اکثر شرکت فرماتے رہتے تھے۔ اسی زمانہ سے آپ کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۳ء تک آپ بغیر کسی سے کہے سنے خاموش مشق کرتے رہے اور ایک سال کی کامل مشق کے بعد پہلی غزل آپ نے حضرت مضطر خیرآبادی کی خدمت میں پیش کی جس کا مطلع یہ تھا۔

اُن شوخ نگاہوں میں قیامت کا اثر ہے
دنیائے محبت ہی مری زیر و زبر ہے

موصوف نے نہایت محبت اور شغف سے اصلاح فرمائی۔ اور اس طرح سلسلۂ اصلاح جاری ہو گیا۔ ایک روز مختصر سے مجمع میں مضطر صاحب نے ایک مصرع دے کر ایک گھنٹہ میں کم از کم پانچ شعر فی البدیہہ کہنے کا حکم دیا۔ مصرعہ یہ تھا۔

"خود پلاتا ہے وہ قاتل آب خنجر ہاتھ سے"

قافیہ "سمندر" لازمی قرار دیا گیا تعمیلِ ارشاد میں رضا صاحب بھی پنسل کاغذ لیکر بیٹھ گئے اور وقتِ مقررہ کے اندر نو شعر کی غزل لکھ کر پیش کر دی۔ مخصوص قافیہ کا شعر مندرجۂ ذیل تھا۔

کیا مسلسل دے رہا ہے میکشوں کو جام مے بن کے ساقی ذی بہا یا ہے سمندر ہاتھ سے

اس کے بعد مضطر صاحب بغیر کسی امتحان کے برابر مشورۂ سخن دیتے رہے اور رضا صاحب کی مشقِ سخن میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ اس زمانہ میں آپ اپنی غزلیں رسالوں وغیرہ میں تو بھیجدیتے تھے لیکن مشاعروں میں نہ پڑھتے تھے۔ ابھی آپ پورے طور پر استاد کے فیضِ اصلاح سے بہرہ مند نہ ہوئے تھے کہ ۱۳۴۵ھ میں حضرت مضطر اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ چونکہ آپ کی مشقِ سخن تشنۂ تکمیل تھی اس لئے پھر ایک رہبرِ کامل کی تلاش ہوئی۔ ایک عرصہ کی تلاش و تجسس کے بعد آپ کی نگاہ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ پر پڑی لیکن چونکہ آپ کو اس صنعت میں کافی دستگاہ حاصل نہ ہوئی تھی اس لئے جرأت نہ ہوئی کہ اپنے کو مولانا مدظلہ کے سامنے پیش کریں۔ آپ نے قابلیت اور استعدادِ شعری بڑھانے کے لئے ۱۹۳۱ء میں "منشی فاضل" پنجاب کے امتحان کی تیاری کی جب آپ نے امتحان کی اجازت چاہی تو چند وجوہ کی بنا پر اجازت نہ مل سکی۔ چونکہ ایک سال کی محنت رائیگاں جا رہی تھی اس لئے آپ نے فوراً ہی الہ آباد یونیورسٹی سے "کامل" کی اجازت چاہی۔ وہاں سے جواب ملا کہ بغیر "منشی" یا "منشی فاضل" پاس کئے ہوئے "کامل" کا امتحان نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے آپ نے اسے غنیمت سمجھ کر "منشی" کا امتحان الہ آباد سے دے دیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ "منشی" کے امتحان کے بعد ہی آپ نے "کامل" کا امتحان دیا اور اب میٹرک کی تیاری میں مصروف ہیں۔

امتحانات کے بعد آپ کو کافی سکون ملا اور آپ کی استعداد بہیم مطالعہ سے کہیں سے کہیں پہونچ گئی اب آپ کا ذوقِ شعری پھر اُبھرا اور پہلے سے زیادہ زور شور کیسا تھ۔ چنانچہ فکرِ سخن میں آپ اب دن رات محو رہنے لگے اسی سلسلہ میں آپ کی نگاہ سے ایک رسالہ گذرا جس میں مولانا سیماب مدظلہٗ کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا مطلع یہ تھا۔ ؎

مثلِ شبنم رائیگانِ عالمِ بربادہوں ٭ میں چمن کے پتّے پتّے کو ابھی تک یاد ہوں

مولانا کی اس غزل سے آپ بیحد متاثر ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں آپ نے مولانا مدظلہٗ کی اسی غزل پر مصرع لگا کر برائے اصلاح بھیجے اور ساتھ ہی درخواستِ شاگردی بھی، جس کے جواب میں برادرِ معظم حضرت منظر صدیقی نے آپکو مندرجۂ ذیل خط لکھا۔

"کیفِ شعریت کے تاثرات سے اثر گیر ہونے کے بعد آپنے جو خط لکھا ہے وہ اپنی جگہ بہت لطیف ہے میرے خیال میں کسی مبتدی شاعر کے احساس کی اتنی ہی بیداری مستقبل کی درخشانی کی ضامن کہی جاسکتی ہے میں اس حیثیت سے آپ کو قابلِ داد سمجھتا ہوں کہ آپ کا دل و دماغ جذبہ شعریت سے لبریز ہے اور اس حیثیت سے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کا فخر حاصل کرلیا ہے"

اُس وقت سے ابتک مشق اور اصلاح کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ غزل کے علاوہ نظم بھی کہتے ہیں۔ حال ہی میں آپ نے ایک تضمین مولانا مدظلہٗ کی غزل پر لکھی ہے جو ماہنامہ "کنول" آگرہ میں شائع ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب میں وہ بالکل نئی چیز ہے۔ یہ طریقۂ تضمین حال ہی میں مصر اور عرب میں ایجاد ہوا ہے، یہاں ہم اس تضمین کا ایک بند لکھتے ہیں

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پہ ٭ گذرتا ہے اک ایسا سانحہ قلبِ پریشاں پہ
کہ غنچوں کی چٹک سے تیر سا لگتا ہے اماں پر " ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پہ

آپ بزمِ ادب گوالیار کے ممبر بھی ہیں ۱۹۳۲ء کے میجر امداد حسین صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے متعلقین کی نگہداشت اور جائداد کا انتظام اور ہر بات کی ذمہ داری اب آپ ہی کے کاندھوں پر ہے۔ آپ نظم و غزل خوب کہتے ہیں۔ اور بہترین طبیعت پائی ہے۔

نمونۂ تغزل

چمن میں دور سے نظارۂ برقِ تپاں کرلیں   بہار آئی ہے پھر تجدیدِ یادِ آشیاں کرلیں
ہم اپنی زندگی ہی وقفِ مرگِ ناگہاں کرلیں   فنا سے قبل تدبیرِ حیاتِ جاوداں کرلیں
الٰہی اسقدر تاخیر تو ہو دم نکلنے میں   وہ آثارِ پریشاں اپنے چہرہ پر عیاں کرلیں
اثرِ فریاد کا تاثیرِ نالہ کی دکھائیں گے   نگاہِ یاس میں پیدا محبت کی زباں کرلیں

ادا کوئی دکھانے آگیا ہے بام پر اپنی   مگر اب تھام اپنی، حوصلہ اپنا نظر اپنی
نتیجہ طولِ الفت کا یہ عجلت دیکھنے والے   بس اب دو ہچکیوں میں داستاں ہے مختصر اپنی
یہ ہوسکتا ہے وہ ہوں ماورائے چشمِ نظارہ   یہ ممکن ہے حقیقت تک نہ پہونچی ہو نظر اپنی
بنا ڈالیں وہ اک عالم کو دیوانہ بنا ڈالیں   شباب اپنا ہے، حسن اپنا، ادا اپنی نظر اپنی

کوئی بسمل نہ کوئی قاتل ہے   کارفرما حقیقتِ دل ہے
اے دلِ ناشناسِ راہِ طلب   نقشِ منزل سرابِ منزل ہے
میری ناکامیوں کی وجہ نہ پوچھ   خضر کو بھی تلاشِ منزل ہے

مانا کہ فکرِ برق وغمِ باغباں نہیں   پھر بھی قفس، قفس ہی تو ہے آشیاں نہیں

معلوم ہے حقیقتِ عمرِ ابد ہمیں   ہم جی لئے بہت ستمِ روزگار تک
ہوتے ہیں تازہ زخمِ جگر آہِ سرد سے   کتنے چمن بنائے ہیں صبحِ بہار تک
اللہ رے کشمکش مری یاس و امید کی   چھٹ چھٹ گیا ہے دامنِ صبر و قرار تک

زخمِ پیکانِ نگاہِ نازِ قاتل کے قریب — آگئی ہے روح ساری جسم کی دل کے قریب

نشاط و عیش سے معمور ہو مگر کیا ہے — تصورات کی دنیا کہ پائیدار نہیں

دنیا کہ ہے جلوۂ رنگیں سے عبارت — ہے صرف اک حقیقتِ باطل ترے بغیر

نمونۂ نظم

"شگفتِ گل"

بادِ صبا ہے — ہر سو رقصاں
ننھی شاخیں — ہوتی ہیں لرزاں
بھونرے جب — کرتے ہیں پریشاں
ہو جاتے ہیں — غنچے خنداں
ہے یہ فصلِ بہار کا فیضاں — شاخِ خشک ہے شاخِ مرجاں
بزمِ عنادل میں یہ غل ہے
"لطفِ بہارِ شگفتِ گل ہے"

موجِ ہوا میں — تتریاں رقصاں
یا ہے گلوں سے — رنگ گریزاں
نکہتِ رنگیں — ہے یہ نمایاں
یا ہیں فضائیں — آئینہ ساماں
سکتے میں ہیں سب سنبل و ریحاں — دیدۂ نرگس آج ہے حیراں
غنچہ و گل میں بادہ و دل میں
"ہر اک سمت شگفتِ گل ہے"

خوشبو سے — آسودہ کلیاں
صبحِ لطافت — ہر گل خنداں
سیلِ ملاحت — سنبل و ریحاں
بحرِ صباحت — ہے سمنستاں
گل در دامن جز و کل ہے
رنگ افروز شگفتِ گل ہے

نمونۂ نثر

(ایک غیر مطبوعہ افسانے "نقوشِ راہ" کا ابتدائی حصہ)

دنیا اور دنیا کی جلوہ سامانیاں بجائے خود اتنی دل آویز اور حسین نہیں جتنا ان کو انسان کی اُن موہوم امیدوں اور خوش آئند آرزوؤں نے رنگین بنا دیا ہے جن پر وہ مستقبل کے خیالی قصرِ عظیم کی اساس قائم کرتا ہے۔ منظر خود اپنی جگہ بے کیف و بے رنگ ہے اتنی دلکشی نہیں رکھتا ہے کہ انسان کو اپنا گرویدہ بنا کر ایک لمحہ کیلئے بھی خود فراموش کر دے۔ البتہ خود انسان کا ذوقِ نظر اور لطف اندوزی کی تشنہ لبی اسے کھینچکر منظر کی طرف لے جاتی ہے۔ حصولِ مقصد کی بیخودی اسکو اس نتیجہ پر پہونچنے کی مہلت نہیں دیتی کہ وہ جس چشمے کی طرف سیراب ہونے کی ہوس میں بیتابی کیساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے وہ ایک سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

تقریباً دس سال کے عرصہ میں اسی امیدوں کی دنیا میں سبزپوشانِ چمن کی سیر کیلئے کتنی بہاریں آئی ہوں گی، آفاقِ عالم پر کتنی ہی شفقیں نمودار ہوئی ہونگی آفتاب کے طلوع و غروب نے کتنے ہی دل آویز مناظر پیدا کئے ہوں گے آبشاروں نے کتنی ہی نغمہ ریزیاں اور چاندنی راتوں کی سحر اور سکون بخش فضا نے کتنے ہی مرتبہ دلوں کو تسخیر کیا ہوگا۔ شبِ تاریک کی کتنی ہی راتوں نے کہکشاں کی فضائے بسیط میں گم ہونیکی دعوت دی ہوگی، موسمِ بہار کی نغمہ سنج طیور اور خوشرنگ تیتریوں نے منظرِ سادہ کو کتنی ہی مرتبہ فضائے رنگ و نور میں تبدیل کر دیا ہوگا! لیکن میں ہوں کہ جسکے لئے دنیا کی ہر شئے بے کیف اور سوگوار اور بے لطف ہو کر رہ گئی، جسمیں نہ بہار کی رنگینیاں انقلاب پیدا کر سکتی ہیں نہ شب ماہ کی سحرکاریاں۔ ہاں! اگر کوئی شے، کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے تو وہ میری عہدِ ماضی کی ایک یاد! ایک نہ مٹنے والا نقش ہے!!

(۳۸) رسوا — محمد احمد صاحب وارثی سہانپوری

آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی مولوی عبداللطیف صاحب صدیقی تھا جو نجیب الطرفین خاندان شیوخ کے ایک ممتاز فرد تھے۔ شاہجہاں بادشاہ کے عہدِ حکومت میں آپ کے جدِ امجد محمد محسن صاحب ایک بڑے جاگیردار کی حیثیت سے سہارنپور آکر آباد ہوئے۔ شہنشاہ عالمگیر کے عہد میں اسی خاندان میں قضاۃ آئی اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ جہاں آپ رہتے ہیں وہ جگہ قاضی محلہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کا شجرۂ نسب حضرتِ ابو بکر صدیق رضؓ سے ملتا ہے۔ رسوا صاحب کے خاندان میں منشی نور احمد صاحب مرحوم سی۔ آئی۔ ڈی پولیس میں انسپکٹر تھے جو آپ کے چچا ہوتے تھے۔ آپ کے ماموں مولوی محمد مقصود صاحب مرحوم ڈپٹی کمشنر کسٹم ریاست بھوپال تھے۔ رسوا صاحب کے ننھالی اور ددھیالی اعزا گورنمنٹ کے عہدے دار اور کچھ آزاد پیشہ وکالت کرنیوالے لوگ ہیں اور تھے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم قرآن خوانی سے شروع ہوئی کلام پاک کی تکمیل کے بعد خلیفہ علی احمد صاحب مضطر سہارنپوری سے کتب فارسی کی تکمیل کی اور ساتھ ہی ساتھ عربی بھی دیکھتے رہے۔ چونکہ آپ بہت ذہین واقع ہوئے ہیں اس لئے بہت جلد آپ نے تعلیمی مراحل کو طے کر لیا۔ رسوا صاحب کے والدِ محترم حیدر آباد دکن میں ملازم تھے اس لئے بعدِ ختم تعلیم آپ کو حیدر آباد کا سفر کرنا پڑا۔ اور وہاں پہونچکر انگریزی تعلیم حاصل کی مڈل تک پڑھنے کے بعد وکالت کا امتحان دیا لیکن ناکام رہے۔ اسی سال آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا آپ حیدر آباد سے پھر وطن واپس آگئے اور یہاں آکر انگریزی تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ انٹرنس تک تعلیم پانے کے بعد زمانہ کی ناساعدت نے ملازمت پر مجبور کر دیا۔ متعدد محکموں میں کوشش کرنے کے بعد ریلوے میں گارڈ کی جگہ آپ کو مل گئی۔ ملازمت کے ایک سال بعد ہی رسوا صاحب کے چچا منشی نور احمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ رسوا صاحب کے دل میں پولیس کی ملازمت کا شوق پیدا ہوا۔ مسٹر اسٹریٹ انسپکٹر جنرل پولیس نے آپ کے مرحوم چچا کی خدمات سے خوش ہو کر۔ رسوا صاحب کو ٹریننگ کے لئے نامزد کر دیا لیکن سپرنٹنڈینٹ پولیس نے آپ کو ہندی کے امتحان میں فیل کر دیا۔ اب نہ تو آپ کی ریلوے کی ملازمت ہی قائم رہی اور نہ پولیس ہی میں کامیابی ہوئی۔ عرصہ تک آپ بیکار رہے۔ بالآخر آپ کو ڈسٹرکٹ بورڈ سہارنپور میں امانت کا عہدہ حاصل ہوگیا۔ آج کل آپ ایک سینئر "امین" کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

آپ کو ۱۹۱۱ء میں شاعری کا شوق ہوا گو آپ نے مشاعروں میں شرکت تو نہیں کی البتہ دو چار غزلیں غیر طرح کہہ کر حضرت تسنیم سہارنپوری کو دکھائیں جس کا نمونہ یہ ہے۔

تری زلفِ پریشاں اور سنبل	یہ نقشے ہیں کسی آشفتہ مو کے
اُٹھ اے دستِ جنوں پھر ہاتھ پھیلا	وہ بخیہ تھا یہ ٹانکے ہیں رفو کے

زیادہ جان سے کیوں کر نہ رکھوں داغِ دل اپنا
یہ اک وعدہ فراموشِ محبت کی نشانی ہے

آپ کا یہ شوق ایک عارضی شوق ثابت ہوا۔ حضرت تسنیم کی وفات کے بعد آپ نے غزل کہنا ترک کر دیا اور ۱۹۲۹ء تک یہ ذوق دبا رہا ۱۹۲۹ء کے وسط میں قاضی محلہ میں مشاعروں کا زور شور ہوا وہاں کا بچہ بچہ غزل کہنے لگا۔ چنانچہ آپ کو بھی پھر یہ ذوق پیدا ہوا۔ آخر غزل کہہ کر اپنے پھوپی زاد بھائی مولوی محمد الیاس صاحب محتشم سہارنپوری سے اصلاح و مشورہ کیا اور دوبارہ یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ نمونہ یہ ہے۔

فرقت کی تیرگی میں تھا گم عالمِ نشاط
اک دل تھا پاس وہ بھی چراغِ خموش تھا

تعالیٰ اللہ کیا کم ہو شرف آبا و اجداد میں
ہمارے نقشِ ہستی سے وہ تزئین جہاں کر لیں

چند ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن ایک خاص سانحہ کے باعث مشاورات ترک کر دی۔ ان ہی دنوں میں جناب عطاء الحق صاحب عطا سہارنپوری جو علی گڈھ کے محکمۂ کلکٹری میں ملازم تھے پنشن لیکر سہارنپور تشریف لائے۔ آپ انتہائی خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔ رسوا صاحب نے اُن سے اصلاح لینی شروع کی اور اب مشاعروں میں بہت زور شور کے ساتھ آپ غزلیں پڑھنے لگے۔ اس زمانہ کا کلام اس رنگ کا تھا۔

ہزار بار تجھے برق کیا بتا نہ دیا
کلیم دل ہے جگر طور ہے جلا نہ دیا

نماز ہی نہ ہوئی کعبۂ تمنا میں
کسی کے پاؤں پہ سر کو اگر جھکا نہ دیا

خود بخود ٹوٹتی ہیں شیشۂ و خم کی مہریں
پھر گیا توبہ شکن کیا کوئی مینا کے قریب

یہ سلسلۂ اصلاح نہایت خوشگواری اور محبت کیساتھ جاری رہا لیکن فلکِ کج رفتار ایک حالت پر کب قائم رہتا ہے۔ حضرتِ عطا اس دارِ فانی سے راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ عطا صاحب کی وفات نے رسوا صاحب پر بہت اثر کیا اور آپ اس اچانک حملہ کی تاب نہ لا سکے۔ کچھ دن تک یہ اثر باقی رہا لیکن اس مرتبہ چونکہ آپ کا ذوقِ شعری اپنی ابتدائی منزلوں سے گذر کر ترقی کی راہیں تلاش کر رہا تھا اس لئے تجدید ناگزیر تھی اور آپ کو کسی مصلح کی فکر دامنگیر تھی۔ شدہ شدہ حضرت مولانا احسن مارہروی کے نامِ نامی سے آپ متعارف ہوئے اور ذریعۂ خط و کتابت اصلاح کا سلسلہ ان سے شروع ہو گیا۔ دو تین ہی غزلوں پر اصلاح کی نوبت آئی تھی کہ مولانا ممدوح کی اہلیہ محترمہ کی وفات ہو گئی جس کے بعد ممدوح نے اصلاح سے گریز فرمایا اس لئے کہ آپ کی پریشانیاں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ حضرت مولانا احسن مارہروی نے جن غزلوں پر اصلاح دی تھی اُن کا نمونہ یہ ہے۔

ہے یہ دشوار کہ دل غم سے اثر یاب نہ ہو
آپ تڑپائیں تو کیوں کر کوئی بیتاب نہ ہو

صحبتِ ساقی و میخانہ میں کیا کیف ملے
جب چھلکتی ہوئی ساغر سے مئے ناب نہ ہو

ہے جلوۂ وحدت سے وہ کثرتِ محویت
میں اپنی نظر میں خود بیگانہ ہوں بیگانہ

مرکز ہو دو عالم کا جو در اُسے کیا کہئے
رسوا وہ کلیسا ہے کعبہ ہے کہ بتخانہ

ابھی آپ کا ذوق تشنہ تھا آخر اس تشنگی کے بجھانے کے لئے آپ مولانا سیماب مدظلہٗ کی طرف رجوع ہوئے جس کو وہ اس طرح لکھتے ہیں "اس انقطاعِ سلسلہ کے بعد حضرت علامہ سیماب صاحب مدظلہٗ العالی سے رجوع ہو کر شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ شانِ ایزدی دیکھئے کہ حضرت طریقت کے پیر بھائی نکلے۔ گویا چشمِ وارثی نے اپنے خادمِ وارثی کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ بحمد اللہ یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے اور فیضِ اصلاح سے سرشاریاں ہی سرشاریاں حاصل ہیں۔ اب تخئیل کا معیار ہی کچھ اور ہے۔"

نمونۂ تغزل

اے شمعِ سوزِ عشق نہ بن زحمتِ جمال
جل ہٹ کر انجمن سے سرِ رہگذر کہیں

تارا سا ٹوٹ کر یہ فلک پر کدھر گیا
ٹوٹا کسی کا دل نہ ہو وقتِ سحر کہیں

شمع کے ظرفِ منور میں اُلجھ کر رہ گئی
تھے ارادے اور بھی کچھ فطرتِ تنویر کے

ہر نوائے ساز سے ہیں تیری لے کی سازشیں
چھیڑ کر تو دیکھ پردے خاطرِ دلگیر کے

یا نہ دو زحمتِ اندوہِ محبت مجھ کو
یا سکھا دو مجھے راضی برضا ہو جانا

منت پذیرِ عیش تھی لذتِ وصال میں
اب اسکو ڈھونڈتا ہوں ہجومِ ملال میں

حجابِ گل بہارِ بوستاں ہے | کلی کا مسکرا دینا خزاں ہے
نظر کو وسعتِ کونین دیکر | انہیں منظور میرا امتحاں ہے

سکوں گورِ غریباں کا خبر دیتا ہے منزل کی | اسی جانب سے آتی ہے ہوا آغوشِ ساحل کی
ابھی تو روتے روتے چپ ہوئی تھی شمعِ محفل کی | پتنگوں نے ابھی پھر تو بڑھا دی شعلۂ دلکی
کچھ ایسی سو گئی ہے میرے احساسات کی دنیا | مسافر جیسے ہو جاتی ہے خبر یاتی ہی منزل کی
صدا ناقوس کی آئی تو میں بانگِ اذاں سمجھا | حدیں چشمِ بصیرت نے مٹا دیں حق و باطل کی
اسیرانِ محبت کی بڑھا دیں بیڑیاں شاید | کہ آہٹ تک نہیں راتوں کو آوازِ سلاسل کی
حدیثِ نو بہن لیتا ہوں سازِ دل کے پردوں سے | بجھا لیتا ہوں گرمیٔ نفس سے تشنگی دل کی
وہ افشا راز کرتی ہیں یہ دانہ نور کہتی ہے | زبانِ شمع کا ٹو او منقاریں عنادل کی
وہ اک میں ہوں کہ بیگانہ ہوں رازِ عشق و الفت سے | وہ اک تو ہے کہ ہے تجھ کو خبر کیفیتِ دلکی

خدا حافظ ہے دیوار و درِ زنداں کا اے رسوا
سلگ اٹھی ہیں دلکی آگ سے کڑیاں سلاسل کی

آبلے ٹوٹے، بہا پانی بجھی وحشت کی آگ | وجہِ تسکینِ جنوں یوں آبلہ پائی ہوئی
ہو چکی ہے ضبطِ غم کی حد نہیں اب تابِ ضبط | پھر نہ کہنا کس ذکی اور کس کی رسوائی ہوئی

پھر بادۂ وحدت مجھے مستانہ بنا دے | پھر دلکو مری کیف کا پیمانہ بنا دے
دلکو طلبِ جلوۂ دیدار کی خو ہے | وادیٔ محبت اسے موسیٰ نہ بنا دے

کس بلا کا کیف ساقی جلوۂ ساغر میں ہے | بے پئے ہی میکدے کا میکدہ چکر میں ہے
کیا کہیں کس نے لعت کا سودا ہمارے سر میں ہے | ابتدا جس کی ازل تھی انتہا محشر میں ہے
ہے غلافِ کعبہ اس کا ہی تقدس اک حجاب | اور بت بنکر وہی حجرہ نشیں مندر میں ہے
ننگِ محفل صورتِ پروانہ از جانی کو ہے | آج پھر کچھ برہمی سی شمع کے تیور میں ہے
مجھ کو وحشت ڈھونڈتی ہے وہ بیاباں گرد ہوں | پاؤں میں چکر خلش دل میں ہے سودا سر میں ہے
ذوق نے سجدوں کی باہم رابطہ پیدا کر دیا | ورنہ کیا ہے جبیں میں اور کیا پتھر میں ہے؟

اک قفس کیا ہے بہت مشکل چمن کا بھی قیام | قوتِ پرواز اگر بلبل کے بال و پر میں ہے
جھک پڑی تعظیمِ جلوہ اے جبیں سجدہ کام | تابشِ نقشِ حقیقت ان کے سنگِ در میں ہے
اے تعالیٰ اللہ تیری رحمتوں کی وسعتیں | اے جزاک اللہ میری یاد بھی محشر میں ہے

نمونۂ نثر

برادرم تسلیم

آپ کا اعلان حضرت قبلہ سیماب صاحب مدظلہ کے سرفراز نامہ کے ہمراہ وصول ہوا۔ بھائی مشکل تو یہ ہے کہ گو مجھے شرفِ تلمذ جناب قبلہ سے حاصل ہے لیکن دراصل میں شاعر نہیں ہوں محض اپنے احساسات کی دنیا جگانے، تخیل میں شوقِ ربانی پیدا کرنے اور ذوقِ الفتِ مصطفائی سے حظ حاصل کرنے کیلئے کچھ کہہ لیتا ہوں۔ یہ جنابِ استاد مدظلہ العالی کا فیضان ہے کہ میں کسی قدر اپنے تخیلات کی دنیا کو مجتمع کرنے اور بساطِ بحر پر موزونیت کیساتھ بٹھانے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہوتے کہ میں شاعر ہوں۔ جب یہ مسلہ ہو چکا تو آپ ہی فرمایئے میرا تذکرۂ شعرا میں شمولیت کرنا برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق نہیں تو اور کیا ہے بہرحال آپ استاد زادے ہیں آپ کے حکم کی بجا آوری بھی مجھ پر فرض ہے اس لئے حالاتِ زندگی من وعن سپردِ قلم کرکے پیش کرتا ہوں۔ اب رہا معاملۂ تصویر تو حضرت آج تک مجھے تصویر کھچوانیکا بھی اتفاق نہیں ہوا بہتر تو یہی تھا کہ میرے تذکرے کے سرورق کو بجائے بلاک سے مزین بنانے کے بلینک ہی چھوڑ دیا جاتا لیکن اگر آپکی اس میں دلشکنی متصور ہوتی ہو تو مجھے کچھ وقت دیجیے اس لئے کہ آج کل کونسل کا الیکشن درپیش ہے اور مجھے اس الیکشن کی سرکاری مصروفیتوں سے دن کو قطعی فرصت نہیں ہوتی اور رات کو فوٹو نہیں کھنچتا الیکشن ۸ فروری ۱۹۳۷ء کو ختم ہو جائیگا تو انشاءاللہ حکم کی تعمیل کر سکوں گا۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام

محمد احمد رسوا اسہارنپوری
3/1/37

جناب محمد احمد صاحب رسوا وارثی سہارنپوری کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

ٹوٹا ۔ حافظ ہے اب خدا

بکھرا ہے تار عالمِ ہستی کے ساز کا ۔ اللہ حفیظ ہے نفسِ جانگداز کا

اٹھا حجاب کیوں نہ نگہ

اٹھا ہی تھا حجاب نگہ امتیاز کا ۔ رسوا جمال ہو گیا نظارہ ساز کا

اُف اہتزاز اک نگہ

بجلی کی کروٹوں میں تبسم تھا ناز کا ۔ شاداب گیا شعلۂ حسن تبسم نیم باز کا

ہی

دھوکہ تھا زندگی پہ حیاتِ دراز کا ۔ پردہ اٹھا بھی کب میری ہستی کے راز کا

مارا

بھولا ہوا ہوں ہمنفس ایمن کی وادیاں ۔ کھویا ہوا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

لیکن میں راز ہوں کسی مجبور

جز یک نفس نہیں میری ہستی کا گو وجود ۔ ہر چند جانتا ہوں میں حقیقت کے راز کا

اک انجمن پہ ہے

عنوانِ صبحِ وصل ہے، تمہیدِ شامِ غم ۔ پردہ جلالِ حسن پہ زلفِ دراز کا

پہلی

ایک ہی نظر میں کر دیا ہستی سے بے نیاز ۔ احسانمند ہوں نظرِ بے نیاز کا

وہ مجھ میں ہے میں اس میں ہوں سرگرم اختلاط ۔ پردہ حقیقتوں نے اٹھایا مجاز کا

ہے ۔ ہمیشہ

اللہ ری بیخودی لب کو شہد ادب میں ۔ منہ تک رہا ہوں ساقیٔ بادہ نواز کا

دیکھا جو حدِ عقل سے آگے وہ کیا کہوں ۔ اک جلوہ چار سو ہے کسی جلوہ ساز کا

حسن ۔ میں ۔ کیا ناز ہی

ہاں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ ہے شانِ بے نیاز ۔ یہ بھی کوئی جواب ہے میری نیاز کا

کسی ۔ دلنواز

نشتر چلے جفا کا اداؤں کا ناز کا ۔ مطلع ۔ ارمان رہ نہ جائے نگہِ دلگداز کا

ساز ۔ پردہ اٹھ گیا

منہ دیکھتا ہے آئینہ، آئینہ باز کا ۔ ” ۔ لو اٹھ گیا حجاب نگہِ امتیاز کا

رسوا نہ کر دے حشر میں رسوا کہیں مجھے

ابھرا سا یہ نشان جبیں پر نماز کا

رعنا — جسونت رائے صاحب سکسینہ بلسوی (۳۹)

آپ کا نام جسونت رائے اور تخلص رعنا ہے۔ وطن قصبۂ بلسی ضلع بدایوں ہے۔ رعنا صاحب سکسینہ کایستہ ہیں ۱۹ اگست ۱۹۱۸ء کو بمقام سیتا پور پیدا ہوئے۔ آپ کے جدِ امجد منشی کلیان رائے صاحب سیتا پور میں کوتوالِ شہر تھے آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی بابو بسنت رائے صاحب مخمور ہے جو ملازم پولیس ہیں اور صاحبِ جائداد بھی ہیں۔

رعنا صاحب ایک شاعر گھرانے کے فرد ہیں اور آپ کی پرورش اسی ماحول میں ہوئی ہے جہاں شعر و شاعری کا ہمہ وقت چرچا رہتا ہے۔ جب آپ چھ سات سال کے تھے اس وقت آپ کو مکتب میں اردو کی تعلیم کے لئے بٹھایا گیا اس لئے اردو سے آپ کو ایک خاص رغبت ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ فارسی بھی پڑھتے رہے جو آپ کا آبائی ذوق تھا ادھر آپ کے والد صاحب خود گھر پر تعلیم دیتے تھے۔ چونکہ آپ کے والد صاحب ایک اچھے شاعر بھی ہیں اس لئے آپ کی طبیعت پر اس چیز کا بہت اثر پڑا دورانِ تعلیم ہی میں آپ کے دادا منشی ترلوکی سہائے صاحب تمر آپ کو اکثر نظمیں اور غزلیں پڑھایا کرتے تھے۔ گویا درس بھی ملا تو شاعری ہی کا۔ بدیں وجہ آپ کو شاعری کا ذوق پیدا ہوگیا۔ یہ ذوق یہاں تک بڑھا کہ اب آپ تھوڑا بہت کہنے بھی لگے۔

جب آپ کے والد صاحب کا تبادلہ امروہہ ہوا تو وہاں اُن کے ساتھ آپ کو اکثر مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مشاعروں کی شرکت سے آپ کی طبیعت میں کچھ اور ہی جوش پیدا ہوگیا اور آپ مشاعروں میں غزل پڑھنے کے لئے مجبور ہوگئے چنانچہ کبھی آپ ٹوٹا پھوٹا خود کہتے اور کبھی والد صاحب سے کہوا لیتے غرض اسی طرح یہ سلسلہ ایک سال تک جاری رہا۔ اس درمیان میں آپ شعر کہنے سے غافل نہیں رہے اور جلد ہی خود پوری غزل لکھ کر مشاعروں میں پڑھنے لگے۔ اور اپنے والد صاحب کے دوست حضرت تاج صدیقی امروہوی تلمیذ حضرت رسا رامپوری مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اُن کی توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ رنگِ قدیم میں اچھا خاصہ کہنے لگے۔ جب آپ کے والد صاحب کا تبادلہ مرادآباد ہوا تو چند وجوہ کی بنا پر مشورۂ سخن منقطع ہوگیا۔

جب آپ انٹرنس میں داخل ہوئے تو آپ کی ملاقات حضرتِ شہید بدایونی سے ہوئی جو آپ کے ہم جماعت تھے ان سے آپ کا ربط و ضبط بہت زیادہ بڑھ گیا اور اکثر شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہنے لگیں۔ چونکہ وہ ایک خوش فکر شاعر ہیں اور رنگِ جدید کے دلدادہ اس لئے گل و بلبل تیر و تفنگ اور زلف و خال کے ذکر سے بہت بچتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی سوسائٹی کا آپ پر بہت زیادہ اثر پڑا۔ اور آپ کا پُرانا رنگِ تغزل تبدیل ہونے لگا۔ آپ کو شہید صاحب نے اس سلسلہ میں بہت کارآمد مشورے دیے جن کے آپ شاکر ہیں۔ چار پانچ ماہ میں آپ کی شاعری نے اپنا چولا تبدیل کر دیا اور آپ اچھی غزل کہنے لگے۔ رنگِ طبیعت کا بدلنا تھا کہ آپ کو کسی صاحبِ فن اور باکمال اُستاد کی ضرورت محسوس ہونے لگی ایک دن مولانا سیماب مدظلہٗ کا یہ شعر آپ کی نظر سے گذرا۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

یہ شعر سنتے ہی آپ بیقرار ہوگئے۔ آپ کی رگِ جان پر ایک چوٹ لگی۔ اور مولانا مدظلہٗ کی عقیدت دل میں موجزن ہوگئی بکمال غور و خوض کے بعد ۷ مارچ ۱۹۳۵ء کو مولانا کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوگئے اور اب برابر آپ ترقی کر رہے ہیں چونکہ آپ ذہین اور طباع ہیں اس لئے اُمید ہے کہ بہت جلد دنیائے ادب میں آپ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت اختیار کر لیں گے

نظم غزل اور رباعی سے آپکو خاص لگاؤ ہے۔ آپ ایک خوش فکر اور پر گو نوجوان ہیں۔ اکثر آگرہ آکر مہینوں اپنے استادِ محترم کی خدمت میں استفادہ کرتے ہیں۔ شاعری کا مذاق طبیعت پر اس درجہ غالب ہے کہ دن رات اسی شغلِ لطیف میں معروف رہتے ہیں مگر طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

نمونۂ تغزل

مری حُسنِ طلب کی نو سلامانی نہیں جاتی   وہی کہتا ہوں اُن سے بات جو مانی نہیں جاتی
ہوئی تاراجیٔ بزمِ محبت کو بڑی مدت   نہ جانے دل سے کیوں غم کی فراوانی نہیں جاتی
بہت کچھ منع کرتا ہوں دلِ پُر شوز کو لیکن   ابھی راتوں کو اس کی نالہ ارزانی نہیں جاتی
گذر کر ہوش سے اپنے نہ جانے میں کہاں پہونچا   مگر مست انکھڑیوں کی بادہ افشانی نہیں جاتی
جنوں سامانیاں چھوڑے ہوئے مدت ہوئی پھر بھی   دلِ وحشت زدہ کی خاک افشانی نہیں جاتی
لحد بھی بعدِ مردن بار سا محسوس ہوتی ہے   گرانجانِ محبت کی گرانجانی نہیں جاتی
خزاں بھی جا چکی ساون بھی گذرا موسمِ گل بھی   مگر میرے دلِ ویراں کی ویرانی نہیں جاتی
بہائے تھے مری رودادِ غم پر ایک دن آنسو   چمن کی آج تک وہ شبنم افشانی نہیں جاتی
اُلجھ بیٹھی تھی اک دن بیخودی میں اُن کے دامن سے   نگاہِ شوق کی اب تک پشیمانی نہیں جاتی

کہا کرتے ہیں وہ اکثر کہ ننگِ شاعری ہے تو
مگر رعنا ابھی تیری غزلخوانی نہیں جاتی

شکستہ دل ہوں مجھے زحمتِ بہار نہ دے   جنوں کو میرے گریباں پہ اختیار نہ دے
خزاں نصیب ہوں دل ٹوٹ جائے گا صیاد   قفس میں فرصتِ نظارۂ بہار نہ دے
رہینِ غیر اگر ہو تو زندگی ہے فضول   کسی کو اپنے دل و جاں پہ اختیار نہ دے
کمالِ ہوش ہے خود پر ترا گماں ہونا   خودی کی داد مجھے دے، سزائے دار نہ دے
وہ دیکھ جام و سبو سے لہو ٹپکنے لگا   پیامِ بادہ کشی ابرِ نوبہار نہ دے
نشاطِ خیز ہو آغازِ عشق کا انجام   شراب دی ہے تو ہے کیفیٔ خمار نہ دے

ہزار خار کھٹکتے ہیں روح میں رعنا
خدا قفس میں کبھی حسرتِ بہار نہ دے

مری آبر گشتگی محسوس خود مجھکو نہیں ہوتی   مری فطرت میں گردش ہے کہ میں تقدیرِ منزل ہوں
ہے قائم ابتدا و انتہائے کارواں مجھ سے   جو پیچھے ہوں تو رہرو ہوں جو آگے ہوں تو رہبر ہوں
نیازِ عشق میرا عظمتِ ناموسِ الفت ہے   یہی معراج ہے میری کہ وقفِ سجدۂ در ہوں
کوئی اس وقت آکر کھینچ لے تصویر خودداری   تری محفل میں ہوں اور بے نیازِ جام و ساغر ہوں

کچھ اشک انکھڑیوں میں چھپائے ہوئے سے ہو   تم تو حریمِ عشق سے آئے ہوئے سے ہو
پردے میں بھی نقاب اٹھائے ہوئے سے ہو   تم آج میرے سامنے آئے ہوئے سے ہو
اب بھی چمک رہی ہیں محبت کی بجلیاں   اب بھی چراغِ طور جلائے ہوئے سے ہو
شاید قریب آمدِ فصلِ بہار ہے   تم آج مستیوں میں نہائے ہوئے سے ہو
نظریں بتا رہی ہیں کہ سینے میں درد ہے   کہنے کو رازِ عشق چھپائے ہوئے سے ہو
آؤ گلے لگا لوں غزالانِ کوئے دوست   تم بھی جنونِ غم کے ستائے ہوئے سے ہو
ہر شے نظر میں پیکرِ حسن و شباب ہے   تم تو مری نگاہ پہ چھائے ہوئے سے ہو

بہکے ہوئے قدم ہیں نظر میں ہیں لغزشیں
رعنا پیے ہوئے سے پلائے ہوئے سے ہو

دل ہی سے پوچھے کوئی تخلیق کا راز بھی   ساز میں کھوئی ہوئی ہے ساز کی آواز بھی
کیا غضب ہوتا ہے روحِ تشنہ کا انداز بھی   ساز کے پردوں سے باہر آگئی آواز بھی
رحم اے یادِ نشیمن، رحم لے فکرِ چمن   اب قفس میں گر چکے میرے پر پرواز بھی
کچھ تو سازِ عشق سے سنتا ہوں میں اپنی صدا   اور کچھ محسوس ہوتی ہے تری آواز بھی
اب ستم ہو یا کرم ہر حال میں سرمست ہوں   عشق کی ہستی سراپا سوز بھی ہے ساز بھی
خود ہی جلوہ خود ہی صورت اور خود تصویر گر   حسن خود آئینہ ہے اور آئینہ پرداز بھی
وہ مرا دل توڑ کر پھر دل کے ٹکڑے چھو گئے   کسقدر دلکش تھی آوازِ شکستِ ساز بھی

میری نظروں سے رعنا حسنِ فطرت جلوہ گر
لاکھ پردوں میں تھا لیکن کھل گیا یہ راز بھی

نمونۂ نظم

"فغانِ چمن"

آ مری اجڑی ہوئی بزمِ کہن کی سیر کر — جس میں تو چہکیں لیا ہے اُس چمن کی سیر کر
جو کبھی تھے باعثِ آرائشِ صحنِ چمن — اب انھیں اجڑے ہوئے برگِ سمن کی سیر کر
تو رہا ہے مدتوں محفل میں سرگرمِ نشاط — اب ذرا دل تھام کر بزمِ محن کی سیر کر

وہ کہاں صحنِ چمن میں دلکشی اور تازگی
ہر طرف طاری نظر آتی ہے اک افسردگی

تو نے سوچا ہے کبھی کیوں ہو گیا یہ انقلاب — پھول کی ساغر میں کیوں باقی نہیں رنگیں شراب
وسعتِ عالم میں اک گوشہ نہیں ملتا اُسے — جو کبھی رنگِ چمن تھا اب ہے کیوں سلگا خواب
اب وہ بیکس بینوا، تاریکیٔ غم میں ہے کیوں — ہر سحر نظّارگی کو آتا تھا جیسے آفتاب

آہ یہ بربادگی و ویرانگی اک راز ہے
جس کی تو مضراب ہے یہ وہ شکستہ ساز ہے

شعلہ ہائے ناز سے پھر دل میں بھر دے سوز و ساز — پھر ذرا ہنس کر سجا دے محفلِ راز و نیاز
غور کر ساغر پہ اپنے اسکی کم ظرفی نہ دیکھ — تشنہ لب کو پھر عطا کر دے شرابِ خانہ ساز
قسمتِ شوریدہ پہ ہو بارشِ ابرِ کرم — تجھ کو فطرت سے ملی ہے فطرتِ بندہ نواز

تو اگر چاہے تو پھر حاصل ہو پہلا سا وقار
گلشنِ تاراج کو مل جائے پھر اذنِ بہار

محفلِ برباد کا ہنگامہ آرا تو ہی ہے — اس چمن کی زندگانی کا سہارا تو ہی ہے
یوں تو گل بھی خار بھی برگِ سمن بھی ہیں عزیز — اصلیت گر پوچھتا ہے سب سے پیارا تو ہی ہے
ہاں چمن زارِ محبت نے تجھے تکلیف دی — کرنے والا اس کی زحمت کو گوارا تو ہی ہے

کہہ چکا تجھ سے حدیثِ باغ اسکو یاد رکھ
یہ تری مرضی، اسے ویران یا آباد رکھ

"حسین پیغام"

اے پرستارِ وفا، اے پیکرِ حسنِ تمام — محفلِ صد رنگ میں تو ہو ہمیشہ شاد کام
یاد ہے ایثار تیرا نقش ہیں قربانیاں — وہ تری دلداریاں، وہ اپنی بدعنوانیاں
آج تک بے چین کرتا ہے سلوکِ دلنواز — وہ تری رنگیں ادائیں میرے حق میں کارساز

تو اگر ہو جائے اس رازِ درون سے باخبر
پھر نہ یوں مجھ سے کہے گا ننگِ احساں عمر بھر

رات کے بیدار تاروں سے تو اب بھی پوچھ لے — ساری ساری رات میں جاگا کیا تیرے لئے
چاند کی کرنیں ہیں شاہد یاد میں رویا تری — صبح کی ٹھنڈی ہوا سے پوچھ میری بیکلی

میں محبت میں تری خاطر پریشاں ہو لیا ہنوز
ننگِ احساں ہو گیا شہیدِ رنگِ احساں ہو لیا ہنوز

نمونۂ رباعیات

میں رنج و مسرت میں جئے جاتا ہوں — اپنی سی بہر حال کئے جاتا ہوں
مشرب ہی مرا ہے ہمہ رنگیٔ رعنا — جس رنگ کی ملتی ہے پئے جاتا ہوں

آنے دو اگر بہارِ باغ آتی ہے — لانے دو، جو پیغامِ طرب لاتی ہے
ساقی کی لبوں میں بھی ہے اک بادہ کدہ — ہونٹوں سے شراب کھنچ کر آ جاتی ہے

جب شاہد و شعر و بادہ آشامی ہو — افسوس جو اندیشۂ بدنامی ہو
کر بے پس و پیش شغلِ بادہ رعنا — شاید یہی دور، دورِ خوش کامی ہو

ہونٹوں سے شرابِ زندگانی دے دی — رنگینِ حیات کامرانی دے دی
جذبات جواں ہو گئے رعنا میرے — ساقی نے جوانی ہی جوانی دے دی

غنچوں سے شراب تو نکالی میں نے — ہر پھول کی رگ نچوڑ ڈالی میں نے
سانچے میں ڈھلا نظامِ فطرت رعنا — جب رات گئے شراب ڈھالی میں نے

ساغر — صمد یار خاں صاحب نظامی علیگڑھی — ۱۴۰

آپ ۱۲ ربیع الاول ۱۹۰۸ء کو بمقام علی گڈھ پیدا ہوئے۔ نسلاً آپ یوسف زئی اور ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں آپکے والد بزرگوار جناب ڈاکٹر احمد یار خاں صاحب وارثیؔ اپنے خاندان کے ایک معزز رکن ہیں۔ آپ کے جدِ امجد جناب ڈاکٹر محمد یار خاں صاحب علی گڈھ کے ایک مشہور و معروف بزرگ تھے۔ "آگرہ میڈیکل اسکول" سے سب سے پہلے جس طالب علم نے امتحان سرجری میں کامیابی حاصل کی وہ آپ ہی تھے آپ کا نام بطورِ یادگارِ تقدیم اب تک اسکول کی دیوار پر بصورتِ کتبہ کندہ ہے۔ ساغرؔ صاحب کے دیگر اعزا و اقارب بھی اطرافِ ملک میں معزز سرکاری عہدوں پر مامور ہیں۔

ساغرؔ صاحب چونکہ ایک ممتاز پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے خاندانی اصول کے تحت آپ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی جس میں کلام پاک اور اُردو فارسی کو زیادہ دخل تھا۔ جب آپکے والد صاحب کو اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ آپ کی ذہنی نشو و نما بحدِ کافی ہو چکی ہے تو آپ کو مدرسہ میں داخل کرا دیا اور کچھ ہی عرصہ بعد علی گڈھ کالج سے متعلق اسکول میں۔ آپ کا ذہن ایک غیر معمولی ذہن تھا جس نے تعلیمی مشکلات کی کوئی حقیقت نہ سمجھی اور اُس میں برابر کوشاں رہا۔ بعض لوگ وطنی جذبات کا احساس بچپن ہی سے کرتے ہیں اور تمام عمر اُن کا وہ احساس آزادی قائم رہتا ہے۔ ساغرؔ صاحب "خلافت" کی آواز پر کئی مرتبہ بیچین ہو چکے تھے۔ ادھر کانگریس کا زور و شور تھا غرض آپ نے اپنے مستقبل کی طرف سے بے خبر ہوتے ہوئے اس تحریک میں آزادی کے ساتھ شریک ہونے کی غرض سے اسکول کو خیرباد کہہ دیا وطنی محبت ساغرؔ صاحب میں کتنی تھی اور ہے اس کا ثبوت اُن کی شاعری سے ملتا ہے۔

کچھ عرصہ تک آپ مختلف مشاغل میں مصروف رہے لیکن دراصل فطرت کا منشا کچھ اور تھا۔ اس نے آزادی کے پرستاروں میں ساغرؔ صاحب کو ضرور پیدا کیا تھا لیکن وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ ساغرؔ نثر میں ملک کو کوئی پیام نہ دے۔ بلکہ یہ آزاد منش نوجوان اپنے وطنی ترانوں سے ملک کی فضا میں ایک ہیجان پیدا کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا (میں ساغرؔ صاحب کی سوانحعمری کے تمام ضروری امور پر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈال رہا ہوں تفصیل سے اس لئے نہیں لکھتا کہ اب تک بیشتر رسالوں میں آپ کی زندگی کے حالات شائع ہو چکے ہیں) آپ کو زمانۂ طالب علمی ہی سے ملکی تحریکات کی محبت کیساتھ ساتھ ذوقِ شعری سے بھی بلگونہ لگاؤ پیدا ہو گیا۔ جو آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ اپنے ذوق کی پذیرائی کے لئے آپ ۱۹۱۸ء میں حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کے تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ چونکہ آپ کے والد صاحب کو مولانا مدظلہٗ سے بحیثیت وارثی ہونے کے ایک خاص نسبت ہے اس لئے آپ نے ساغرؔ صاحب کے مستقبل کے لئے مولانا ہی کو ذمہ دار قرار دیا۔ مولانا مدظلہٗ نے بطورِ خاص ساغرؔ صاحب کے دماغی اور ذہنی نشو و نما کی طرف توجہ کی۔ عرصہ تک ساغرؔ صاحب مشقِ سخن کرتے رہے۔ چونکہ اب آپ شاعری کی دنیا میں آ چکے تھے اس لئے بجز شعر کہنے کے آپ کو کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اور تین چار سال کی مشقِ سخن نے اس دماغ کو جو پہلے شعریت کی لطافتوں سے خالی تھا اب الہامات کے کیف سے لبریز کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ ملک میں آپ کی شہرت کا آوازہ گونجنے لگا۔

جب ۱۹۲۳ء میں حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہٗ نے آگرہ میں مستقل

قیام فرمایا اور رسالہ "پیمانہ" کے نکالنے کی تحریک اپنے احباب اور عزیز شاگردوں میں پیش کی تو ساغر صاحب بھی اس میں شریک تھے چنانچہ قرعۂ فال آپ ہی کے نام آیا۔ "پیمانہ" کے لئے جیسے فلکار۔ جدت پسند۔ رنگین مزاج شخص کی ضرورت تھی وہ فطرت نے بہم پہونچا دیا۔ ۱۹۳۳ء تک اس شان و معیار سے رسالہ کو شائع کیا جس کا جواب نہ اب پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہوگا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ قبلۂ عالم حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے زریں مشورے پیمانہ کے عروج و ترقی میں معاون تھے لیکن ساغر صاحب نے بھی جس تندہی اور انہماک سے اس فرض کو انجام دیا وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ ساغر صاحب ایک دو سال نہیں پورے آٹھ نو سال قصر ادب کی چار دیواری میں رہ کر تربیت پا چکے ہیں۔ ادبی ماحول۔ دن رات کے ادبی مشاغل اور مولانا مدظلہ کی توجہات نے انہیں آج اس اسٹیج پر پہونچا دیا ہے جہاں انسان اپنی تمام عمر کھو کر بھی نہیں پہونچ سکتا۔ آج ہندوستان کا بچہ بچہ ساغر اور اُن کے کلام سے واقف ہے ہندوستان کے ایک دو نہیں ہزاروں مشاعرے اُن کے سریلے نغموں سے گونج چکے ہیں۔ ہندوستان کی عام رائے ہے کہ اس وقت ساغر صاحب سے بہتر پڑھنے والا ہندوستان میں موجود نہیں۔ اور حقیقتاً ساغر کے مدھر بھرے نغموں نے لوگوں کو مسحور بنا دیا ہے۔

ساغر صاحب ادبی دنیا میں جس شہرت و قبولیت کے مالک ہیں وہ تو خیر اپنی جگہ بہت وزنی ہے اس کے علاوہ آپ ادارتی فرائض بھی اس درجہ انجام دے چکے ہیں کہ اس باب میں بھی ایک خاص مہارت پیدا ہو گئی ہے۔ "پیمانہ" کے علاوہ آپ نے ۱۹۲۹ء میں علی گڈھ سے "پنچ" نکالا اور ۱۹۲۷ء میں ماہنامہ "مستقبل" شائع کیا جو ایک بہترین رسالہ تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ایک معلق سیاسی اخبار "استقلال" اپنی ہی ادارت میں نکالا جو آرڈیننس کے سلسلے میں بند ہو گیا۔ آج کل آپ میرٹھ سے ماہنامہ "ایشیا" نکال رہے ہیں جس نے ادبی دنیا میں اپنے خاص اسلوب سے ایک ممتاز درجہ حاصل کر لیا ہے۔

۱۹۳۱ء سے آپ نے ذمہ دارانہ حیثیت سے مظفر نگر اور علی گڈھ میں اپنا ذاتی کام شروع کیا اور اب میرٹھ میں ایک بڑے ذاتی پریس کے مالک ہیں۔ جہاں کتابت اور طباعت کے علاوہ ایک زبردست کتب خانہ بھی قائم کیا ہے۔ چونکہ آپ کے والد صاحب کا قیام مستقل طور پر میرٹھ ہی میں ہے اس لئے آپ کے گھر کے تمام افراد وہیں ہیں۔ یہ "ساغر پریس" انتہائی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

ساغر صاحب کی شاعری اور نثر نگاری کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے جس شخص نے ہندوستان کے سامنے "بادۂ مشرق" جیسی بے نظیر کتاب پیش کی ہو اس کے لئے اچھے سے اچھے الفاظ میں بھی اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا۔

ساغر صاحب کی شاعری "آگرہ اسکول" کا وہ ممتاز معیار ہے جس سے دوسرے لوگ سبق لے سکتے ہیں۔ ساغر صاحب کا شمار "آگرہ اسکول" کے چوٹی کے افراد میں ہے۔ اور "آگرہ اسکول" کو ناز ہے کہ اس نے ملک میں ایک ایسا اچھا شاعر پیدا کر دیا جس نے اپنے آزادی بھرے نغموں سے (جس کا احساس اُسے عہد طفلی سے تھا) ہندوستان میں زندگی کی نئی روح پھونکدی ساغر کو اگر "شوالۂ شباب کا دیوتا" اور "رومانی شاعری کا ناخدا" کہا جائے تو کم ہے۔ اُن کے یہاں وہ سب کچھ ہے جس سے ملک کی تقدیریں بن سکتی ہیں۔

ساغر صاحب ایک اچھے انشاپرداز اور فسانہ نگار بھی ہیں۔ آپ کی نثر گو تفصیلی ہوتی ہے لیکن بہت زیادہ پُر از معلومات۔ ساغر صاحب کے متعلق ابھی کچھ اور لکھنا قبل از وقت ہے۔ آپ کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ "بادۂ مشرق" نظموں۔ غزلوں اور رباعیوں کا ایک ضخیم دیوان۔ "کہکشاں" آپ کے افسانوں کا مجموعہ۔ "شبابیات"، "صبوحی"، "مجموعۂ برکات"، "ذروں کا مستقبل"، وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ آپ کی کئی تصانیف غیر مطبوعہ ہیں جو جلد شائع ہونے والی ہیں۔

نمونۂ تغزل

یہ جمالِ جبیں یہ قشقۂ شرخ روح و دل تھرتھرائے جاتے ہیں

عشق محدود حسن لامحدود   ہم سے آگے وہ پائے جاتے ہیں
میں مجسم رسیدگی ہوں مگر   وہ مسلسل بلائے جاتے ہیں

پیکر کفر بن کے وہ ساغر
دین و دنیا پہ چھائے جاتے ہیں

کیا کسی پہ میرے غم کی کارفرمائی ہوئی   آج اک صورت تصوّر میں ہی گھبرائی ہوئی
آشیاں سوزی بجا میری اسیری بھی بجا   کیا چمن سے ہوٹ جائیگی بہار آئی ہوئی
عالم تاریک میں سو چاند پیدا ہو گئے   شام غم زخم جگر کی خوب رسوائی ہوئی

دور سے نظر دل کو آستانِ ناز آیا   لب پہ جو نفس آیا وہ بصد نیاز آیا
بزمِ ناز میں مجھ کو شمع سے ندامت ہے   کیوں نہ میری حصّے میں سوزِ دلگداز آیا

دینے مجھے پیغام تری جلوہ گری کا   جھونکا ابھی آیا ہے نسیم سحری کا
آوارگیٔ عشق کی حسرت کا بھلا ہو   مقصد ہی نہیں کچھ مری دریوزہ گری کا
ہر ذرّۂ بیقدر تری راہ گذر میں   ہے نقطۂ آخر مری عالی نظری کا

ضبط اور تحمل کی چارہ سازیاں معلوم   اب کہیں سنبھلتا ہے قلبِ ناصبور اپنا
دعوتِ طلب دینگے عرضِ حال کی خاطر   ہم بھی اب بنائیں گے ایک اور طور اپنا
نازشیں ابد کو ہیں ندرتِ قیامت پر   جوشِ دل ہے کیوں خاموش تو بھی پھونک صور اپنا

جنونِ ہنگامہ میری آہیں فسادِ عریاں تری نگاہیں   تباہیٔ کائنات ٹھہری مری جوانی شباب تیرا
کچھ اس متانت سے جھوم کر چل کہ ٹوٹ جائے نظام گلشن   شگفتگی بن کے پھوٹ نکلے کلی کلی سے شباب تیرا

نتیجۂ خلشِ برق وہ آشیانہ ملا   بیاضِ صبحِ چمن کو نیا فسانہ ملا
ہر ایک سانس پہ کرنی پڑے مجھے سجدے   قدم قدم پہ تمہارا ہی آستانہ ملا
ہزار میکدے جھومے مری نگاہوں میں   تمہاری آنکھ ملی یا شراب خانہ ملا

قفس کے بعد ہم آزادِ ہست بود رہے   نہ آشیانے کو ڈھونڈا نہ آشیانہ ملا
جو ساری رات مرتب کیا ستاروں نے   دمِ سحر ورقِ گل پہ وہ فسانہ ملا

راتوں کو تصور ہے اُن کا اور چپکے چپکے رونا ہے   اے صبح کے تارے تو ہی بتا انجام مرا کیا ہونا ہے
ان نور بھری آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے کیا رونا ہے   برسے ہوئے سچے موتی ہیں بیتا ہوا خالص سونا ہے
تمیزِ کمال و نقص اٹھا یہ تو روشن ہے دنیا پہ   میں چندن ہوں تو کندن ہے میں مٹی ہوں تو سونا ہے

مجھے قابو کہاں ہے اپنے جذباتِ پریشاں پر   ہزاروں ہاتھ گھبراہٹ میں پڑتے ہیں گریباں پر

توڑ دیں گر عین بدمستی میں اک پیمانہ ہم   از سر نو ڈالدیں بنیادِ صد میخانہ ہم
شمع بھی سنتی رہی پروانے بھی سنتے رہے   اور وہ سوتے رہے کہتے رہے افسانہ ہم
کب تک آخر جرعہ جرعہ، قطرہ قطرہ ساقیا   لاؤ الٹا لیں آج پیمانہ میں کل میخانہ ہم
عینِ سرمستی میں اے ساقی اگر انگڑائی لیں   عرش پر رکھدیں اٹھا کر ساغر و پیمانہ ہم

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ   یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں
ہمارا حال تو دیکھا ہمارا ظرف بھی دیکھ   نگاہ اٹھتی نہیں غم اٹھائے جاتے ہیں

کافر گیسو والوں کی رات بسر کیوں ہوتی ہے   حُسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے
ساون آئی، پھول کھلا اک دیوانہ بول اٹھا   جس میں دل کھل جاتے ہیں وہ رُت کب ہوتی ہے
دل کی تو تشخیص ہوئی چارہ گروں سے پوچھو گا   دل جب دھک دھک کرتا ہے وہ حالت کیا ہوتی ہے

تبسم مستقل بجلی، ترنم شعلۂ یکسر   کہاں اے غارتِ کونین لب اٹھتے ہیں محفل سے

اگر گنجائشیں ہوتیں نہ میری رازِ خلقت میں   کہاں انگڑائیاں لیتی تمہاری عالم ایجادی

نمونۂ نظم

"غداری"

جب اقوام و ملل پر بارشِ افلاس ہوتی ہے — جب انساں کی طبیعت غم سے بد احساس ہوتی ہے
رذالت جب اثر اپنا جماتی ہے شرافت پہ — ہوس جب غالب آجاتی ہے احساسِ محبت پہ
غلامی ملک کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے — تباہی سوئے آبادی رُخ اپنا پھیر لیتی ہے
علوم و جہل میں جب فرق نازک بھی نہیں رہتا — دماغ و دل پہ کھینچ جاتا ہے جب باریک پردہ سا
محاسن قوم کے افراد سے جب اُٹھ جاتے ہیں — مفاسد جب کسی ملعونہ بدبو بن کے چھا جاتے ہیں
جب اخلاقِ حمیدہ کی تجارت ہونے لگتی ہے — جب اوصافِ شریفہ میں بغاوت ہونے لگتی ہے
جب انسانوں کے دل شیطان کے مسکن ہو جاتے ہیں — زمانے میں جہنم کے دریچے باز ہوتے ہیں
دلِ مخلوق جب بدمستیوں میں ڈوب جاتا ہے — جب اُس کی روح میں نفسانیت کا رنگ آتا ہے
نکلتے ہیں حجابِ ملک سے مکّار و مکاری — ہویدا معصیت کے بطن سے ہوتی ہے غداری

یہی سانپین پھر اپنے بطن سے غدار جنتی ہے
وطن اور قوم میں افرادِ ناہنجار جنتی ہے

"الہام"

جب سکوں کا دور ہوتا ہے اندھیری رات میں — اور سو جاتی ہیں تارے رات کی لمعات میں
روحِ بیداری تڑپ اٹھتی ہے حیات میں — شاعری لیتی ہے انگڑائی مرے جذبات میں

عرش سے آتا ہے سامانِ نوا میرے لیے
درِ فلک کے کھول دیتا ہے خدا میرے لیے

میں فرشتوں کی صدا سنتا ہوں گوشِ ہوش سے — دل لرز جاتا ہے میرا انتہائے جوش سے
خود اچھل پڑتا ہے کوثر قلب کی آغوش سے — آبشارِ نطق بہتا ہے لبِ خاموش سے

زور دیتی ہے طبیعت پردۂ احساس پر
غیب سے گرتی ہیں بوندیں صفحۂ قرطاس پر

بے حجاب آتا ہے کوئی منظرِ افلاک پر — حیرتیں ہوتی ہیں طاری خانۂ ادراک پر
گونجتا ہے ذہن میرا سرحدِ ادراک پر — ٹوٹ کر تارے سے گرتے ہیں فرشِ خاک پر

کانپتا ہے ہر نفس کیفیتِ آواز سے
باہر آجاتی ہیں کچھ نغمے حجابِ ساز سے

نمونۂ نثر

"اور نوشابہ کی متبسم اداؤں میں پریاں کھیلا کرتی تھیں۔ اس کے شعاعی اور دراز گیسو، صندلی رخسار صدفی آنکھیں، مرمریں رنگ، ماہتابی پیشانی، یاسمیں ہونٹ، مینائی گردن، بلوریں سینہ اور ہمہ گداز جسم اس دعویٰ کی دلیل تھا کہ وہ انسانی ترکیب کا نسوانی پیکر نہیں ہے بلکہ قدرت نے پوری چاند کی ضیا بار کرنوں، اور سمندر کی لطیف موجوں کے اتصال سے اس کی تخلیق کی ہے، اور وہ ایک ایسی جاندار سیپی ہے جس کے شفاف پیکر میں تجلیوں کے موتی جگمگا رہے ہیں"

"نوشابہ کی جمیل سہیلیاں، حسن کی کافر جوانیاں، جمال و شباب کی معصوم دیویاں ..... مدرسکی دلربا کنواریاں۔ چاند راتوں کو ان کی دھیمی تجلیوں سے کسب ضیا ضیا کرتا تھا۔ فضا ان کی موسیقی سے معمور تھی، اور سوادِ ولنکا کی افق تابی غماز بنی ہوئی تھی کہ شرابِ حسن کی بیتاب مستیاں ابھی نہیں کیف افروز ہیں"

"جبکہ یہ سمندری پریاں موجوں سے کھیل رہی تھیں ان کے سایہ گوں کپڑے ہولئے ساحل سے نم آلود تھے۔ اور موجیں بار بار ان کے پاؤں چوم جاتی تھیں۔

"نوشین و نوشابہ کی بے باکانہ ہمنشینی، آزادانہ گفتگو، نازمندانہ چھیڑ چھاڑ، تمام محفل کے دلوں پر پھول برسا رہی تھی ......"

(سمندر کی خداوندہ)

(ساحر) مولوی ضمیر عالم صاحب اکبرآبادی (۴۱)

آپ کا اسم گرامی ضمیر عالم اور ساحر تخلص ہے۔ آپ ۱۹۰۷ء میں تاج البلاد اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ ساحر صاحب ایک زبردست اور مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے پردادا امیر دولت محمد خاں والیٔ افغانستان کے عہد حکومت میں وارد ہندوستان ہوئے۔ ہندوستان آنیکی غرض و غایت سیر و تفریح اور تجارت تھی لیکن ہندوستان کی کشش اور اکبرآباد کی خوش قسمتی سے آپ یہیں اقامت گزیں ہو گئے۔ اور آپ کے جدامجد مولوی وزیر محمد خاں صاحب کی شادی اکبرآباد ہی کے ایک معزز اور باوقعت خاندان میں ہو گئی۔ اتفاق سے جس جگہ آپ کے دادا صاحب کی شادی ہوئی تھی وہ گھرانہ بھی علم و فضل میں مشہور تھا۔ آپ کے دادا صاحب ایک متبحر عالم اور السنۂ مشرقیہ کے ماہر تھے۔ آپ نے مطبع محمدی آگرہ میں قائم کیا اور فارسی زبان کا ایک اخبار "الانوار" کے نام سے نکالا جو ہند اور بیرون ہند میں کافی مقبول ہوا۔ آپ کے دادا صاحب کا قیام تاحیات محلہ دھنکوٹ میں رہا وہاں اُن کا اب بھی ایک ذاتی مکان موجود ہے۔ آپ کے دادا صاحب کی زندگی تک افغانستان کے اعزا سے سلسلۂ رسل و رسائل قائم رہا لیکن ان کے مرنے کے بعد آج تک نہ ادھر سے کوئی سلسلہ جنبانی ہوئی اور نہ ادھر سے گویا پیوند ہی جدا ہو گیا۔ آپ کے دادا صاحب کے چار اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔

ساحر صاحب کے والد محترم مولوی نذیرالدین صاحب بی اے اکبرآبادی نے بھی علم و فضل ہی کی فضاؤں میں پرورش پائی۔ آپ نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے اس وقت بی اے کا امتحان پاس کیا جس وقت لوگ مڈل اور انٹرینس کا امتحان پاس کرنا اعجاز اور منتہائے کمال سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ عربی۔ فارسی سنسکرت۔ عبرانی اور ترکی وغیرہ زبانوں میں اتنی دستگاہ حاصل کی کہ بغیر تکان تقریر و تحریر کر سکتے ہیں۔ آپ ایک زبردست فقیہہ ہیں اور علم فقہ میں باقاعدہ دستارِ فضیلت حاصل کر چکے ہیں۔ علم کے ساتھ ساتھ آپکو شعر و سخن سے بھی بہت دلچسپی ہے۔ آپ خود بھی شعر کہتے ہیں دانش تخلص ہے مگر اپنا کلام شائع کرنا پسند نہیں کرتے۔ آپ تیس سال تک محکمۂ نہر کے دفتر میں ہیڈ کلرک کی جگہ فائز رہے۔ اب اُس سے سبکدوش ہو گئے ہیں ۱۹۳۱ء میں آپ نے حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کیا۔ اب صبح سے شام تک عربی کتب عربی و فارسی اخبارات اور سیاسیاتِ عالم کے مطالعہ میں منہمک رہتے ہیں۔

ساحر صاحب کا نام محمد ضمیر خاں رکھا گیا تھا لیکن ایک بزرگ نے ضمیر عالم تجویز کیا اور اُس وقت سے یہی نام قرار پایا۔ آپ کے بڑے بھائی محمد ظہیر عالم صاحب واسطی بی اے (علیگ)، ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس ہیں ظہیر صاحب کو بھی شاعری سے فطری لگاؤ اور رغبت ہے۔ واسطی تخلص فرماتے ہیں حضرت مولانا سیماب مدظلہ سے ہی شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ کچھ عرصے سے شعر کہنا بند کر دیا ہے۔

چونکہ ساحر صاحب کا پورا خاندان علوم مغربی کے علاوہ علوم مشرقیہ کا بھی دلدادہ تھا اور ہے اس لئے آپ کے والد صاحب نے پہلے آپ کو گھر ہی پر ابتدائی تعلیم دی اس کے بعد اردو فارسی کی تحصیل کے لئے مکتب میں داخل کرا دیا۔ ۱۴ سال کی عمر میں آپ نے گلستاں۔ بوستاں۔ رقعاتِ عالمگیری قصائد قاآنی۔ ابوالفضل۔ مینا بازار سہ نثر ظہوری وغیرہ وغیرہ کتابیں پڑھیں انگریزی تعلیم کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا اور انٹرینس تک اس زبان میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ آخر آپ نے اپنے والد صاحب کی ایما سے انگریزی کو خیرباد کہہ دیا اور ہمہ تن عربی زبان کی تحصیل میں منہمک ہو گئے عربی میں خاصی استعداد پیدا کر کے حکمت کی طرف رجوع ہوئے اور دو سال تک حکمت پڑھتے رہے۔ بعض وجوہ کی بنا پر حکمت کو بھی نظر انداز کر دیا اور

عربی فارسی کے امتحانات کی تیاری شروع کردی۔ ساحر صاحب نے جن علما اور ادبائے عربی و فارسی زبانوں کی تکمیل کی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ مولوی عیسیٰ صاحب۔ مفتی اعظم شاہ صاحب۔ مولوی سعادت اللہ صاحب بنی اسرائیلی پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی۔ آپ نے الہ آباد اور پنجاب یونیورسٹی سے عربی۔ فارسی اور اردو کے اعلیٰ امتحان مثلاً فاضل فاضل ادب۔ کامل۔ اردو اعلیٰ قابلیت۔ مولوی۔ عالم۔ اور منشی وغیرہ وغیرہ نہایت ممتاز حیثیت سے پاس کئے۔ امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد ہی آپ کو گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی میں جگہ مل گئی اور وہاں سے باندہ تبادلہ ہوا۔ آج کل آپ متھرا کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی ہیں۔

حضرت ساحر نے جس فضا اور جس ماحول میں آنکھ کھولی اس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ اس لئے اگر آپ کو ابتدائی سن شعور ہی میں شعر و سخن سے ذوق ہو گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ شاعری اور ذوقِ شعری انہیں ورثہ میں ملا تھا اس لئے آپ نے ابتدا ہی میں اردو اور فارسی میں شعر کہنا شروع کر دیا جس کے بعد تسکینِ خاطر اور اصلاحِ شعر کے لئے آپ کو ایک مصلح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں علی گڈھ کی مجلسِ ادب میں آپ کو علامہ مولانا سیماب اکبر آبادی مدظلہ کے ارشادات سے مستفیض ہونے کا موقع ملا اور اس کیف سے متاثر ہو کر جو مولانا مدظلہ کے کلام سے آپ پڑا تھا آپ مولانا کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ بقول آپ کے مولانائے محترم کی اصلاح اور عالمانہ مشوروں نے آپ کی زبردست رہنمائی کی اور آپ کے خیالات کو جوہر سے بھر دیا۔ آپ تقریباً ۲۰ سال سے شعر کہتے ہیں۔ ہندوستان کے اساتذۂ فن اور نامور شعرا کی معیت میں آپ نے بکثرت مشاعرے پڑھے ہیں فکر معاش اور پرورشِ عیال نے بالکل نہیں تو بہت کم اب بے تعلق سا کر دیا ہے۔ اب آپ کبھی کبھی شعر کہتے ہیں اور بدرجۂ مجبوری مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں۔ آپ کے کلام میں لطیف جذبات۔ پاکیزہ خیالات اور بلند ارادے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ تحت اللفظ پڑھتے ہیں مگر ایسا مشاعرے کو ہلا دیتے ہیں۔

آپ ایک اعلیٰ پائے کے نثار بھی ہیں اور آپ کی متعدد تصانیف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہیں "نظم کے تارے"، "ضمیر القواعد" اور "گور غریباں" یہ تین کتابیں چھپ چکی ہیں "کتبِ احادیث پر ایک نظر"، "شعرا کا تاریخِ عالم پر اثر"۔ "یار غار کے کام کی باتیں"، "روحِ فلسفہ"، "عربی کا سینٹ" اور "فردوسِ نسواں" ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

آپ کی شادی اکبر آباد کے مشہور رئیس اور تاجر وزیر خاں صاحب کی لڑکی زبیدہ خاتون صاحبہ نرگس سے ہوئی ہے جو مدیرہ "ہمجولی" آگرہ ہیں آپ کے ایک صاحبزادے بھی ہیں جن کا نام قدیر عالم ہے۔

نمونۂ تغزل

حشر میں اپنی شکایت کو پریشان دیکھا — جب تری نیم نگاہی کو پشیمان دیکھا
آ گیا جوش میں دریائے کرم حشر کے دن — جب نم آلود مرا گوشۂ داماں دیکھا
دل کو پہلو میں کیا سوزِ نہاں نے روشن — یوں تماشائے چراغِ تہِ داماں دیکھا

پھر شرر ریز ہوا سینۂ سوزاں میرا — پھر کہیں نالہ چلا شعلہ بداماں میرا
خیر اس شرط پہ لے لیجئے کاشانۂ دل — جب تک آباد رہے آپ کا ویراں میرا

یوں حباب آسا نہ تو بحرِ جہاں میں سر اٹھا — دیکھ تجھ سے بھی ہے کچھ اونچا نظر اوپر اٹھا
رنگ پھر لانے لگی بے کیفیِ دردِ فراق — بند کر مینا نہ ساقی شیشہ و ساغر اٹھا

پھر انجمن میں آج طلب آئینہ ہوا — اے دیدۂ جمالِ نگہ تجھ کو کیا ہوا

میری خیال ہی میں ہم آغوشِ شوق ہو — آ تیرے ساتھ آج شبِ غم بسر کریں

جھلکیگا ایک دارِ فنا مجھ سی حشر میں   تصویر ہوں خرابیٔ دنیائے حال کی

یاس کی تصویر ہی برگشتہ سامانی مری   آپ سے دیکھی نہ جائیگی پریشانی میری
حُسن کی دیوی کو دینے جا رہا ہوں جانِ دل   پریم کے مندر میں ہی درکار قربانی میری

موجود بات بات پہ ہی مرگِ ناگہاں   اک زندگیٔ عشق ہی اور یوں خراب ہی
لو لذّتِ نظر بھی گئی حشر ہو چکا   سنتا ہوں اب کہ خاتمۂ انقلاب ہی

انجامِ آرزو ہے وہی مرگِ آرزو   کیوں ابتدائے عشق ہے فکرِ مآل میں
اللہ ری ایک لفظِ تمنا کی وسعتیں   عمرِ دراز ختم ہوئی عرضِ حال میں
آخر حجاب سے نہ رکی شوق کی نگاہ   جلووں کی لوٹ ہو گئی بزمِ جمال میں

سُن کر وفا کا نام وہ حیران رہ گئے   پھر پوچھنے لگے کہ یہ بولی کہاں کی ہے
معلوم ہو مجھے کہ نہ ہو راہِ کوئے دوست   پہونچوں گا میں وہیں مری مٹی جہاں کی ہے

میں ڈوبکے دریا میں آسودۂ منزل ہوں   کوسوں مجھے ساحل ہی ساحل نظر آتا ہے
جب خون کی کچھ قطرے قاتل نظر آتے تھے   اب خون کی قطروں میں قاتل نظر آتا ہے

اٹھائی تیغ اُس نے اور پھر رکھدی خفا ہوکر   مری تقدیر کا پھر رہ گیا کچھ فیصلہ ہوکر
ملے تھے باوفا ہوکر، چلے ہیں بیوفا ہوکر   وہ جب آئے تھے کیا ہوکر وہ اب جاتے ہیں کیا ہوکر

ہماری پاس خالی ہو گیا اہلِ بزمِ دشمن سے   رہیگی یاد زخمِ دل کو یہ چٹکی نمکداں کی

ہے روزِ حشر دھوپ کڑی آفتاب کی   ساقی یہاں سبیل لگادی شراب کی

ہجومِ حشر میں یہ بھی مزے کی دل لگی ہوگی   وہ ہوں گے ایک اور ساری خدائی مدعی ہوگی

قیامت میں دوبالا مرکے جینے کی خوشی ہوگی   تمہاری دید بھی ہوگی ہماری عید بھی ہوگی
تو کیا وہ قتل کرنے آج بھی مجھکو نہ آئیں گے   قضا کی پاؤں میں کیا آج بھی مہندی لگی ہوگی
مجھے بے بال و پر گلشن میں ہی تقدیر رہنے دے   کہ ہونگے بال و پر تو فکر بے بال و پری ہوگی
جہانتک جائیگی کرنیں چمک کر روئے حسرت کی   بیاباں میں وہاں تک چاندنی ہی چاندنی ہوگی

منادی ہر طرف کردی ہی نازِ لن ترانی نے   کہ اب جو طور پر چڑھ جائے موسیٰ ہو نہیں سکتا
بجھادو شمع لیکن آئینگے محفل میں پروانے   مٹیائے شمع کا کیا تم پہ دھوکا ہو نہیں سکتا

وہ غم مجھے قسمت سے ملا جس سے ہو تم خوش   وہ درد خدا دے مجھے تم جس کی دوا ہو

یہ بھی دنیائے وفا میں سببِ عبرت ہو   سوگ شیریں کا منے ماتمِ فرہاد نہ ہو
جیسے منظور ہو ہم بزمیٔ گل اے ساحر   اُس سے کہدو کہ قفس سے کبھی آزاد نہ ہو

ہے ہر گھڑی فراق کی اک محشرِ حیات   کس طرح انتظار ترا رات بھر کریں

قیامت میں غرور و شرم کا پھر فیصلہ ہوگا   زلیخا کو قسم دی جائیگی یوسفؑ کی داماں کی

نمونۂ نثر :-

(طالبعلموں کو تعلیم کی اہمیت بتاتی ہوئی)

آج کل ہندوستان میں جبکہ مذہب زندگی کے ہر مسئلہ کا پیش خیمہ بنا ہوا ہے یہ دستور کہ ایک جگہ مختلف قوم و ملت کے بچے جمع کئے جائیں۔ انہیں بغیر امتیاز قومیت برادر نوازی کا درس دیا جائے۔ صداقت کے اصول سمجھائے جائیں۔ زندگی کا مفہوم واضح کیا جائے۔ باہمی مراسم و فرائض کی صحیح اہمیت روشن کی جائے اور خدا اور انسان کے تعلقات کو مستحکم بنانے کیلئے اعلان کیا جائے کہ خدا محبت ہی، کس قدر مفید اور پاکیزہ خدمت ہے

ساحل (۴۲) صاحبزادہ حامد سعید خاں صاحب ٹونکی

ساحل صاحب بمقام ریاست ٹونک بتاریخ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب تھا مرحوم ایک مشہور آدمی تھے اور شاعر بھی تھے۔ حافظ تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب آپ کے والد صاحب کی طرف سے اعلیٰ حضرت نواب محمد امیر خاں صاحب بہادر رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ ریاست ٹونک تک پہونچتا ہے۔ اور والدۂ مرحومہ کی طرف سے جنرل محمود خاں صاحب بہادر افغانی سے وابستہ ہے نجابت و شرافتِ خاندان و نسب کی وجہ سے آپ میں وہ تمام خصوصیات اور صفات پائی جاتی ہیں جن سے آپ کی صاحبزادگی ممیّز ہے۔ آپ کی عمر اس وقت اکتیس ۳۱ سال ہے۔ آپ کسقدر مرنجان و مرنج۔ آزاد اور غیور واقع ہوئے ہیں اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سوسائٹی میں یا کسی اور نہج سے آپ کی قابلِ تقلید زندگی کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔

آپ نے جب ہوش سنبھالا تو ابتدائی تعلیم کے لئے ایک اتالیق اور ایک حافظ صاحب کو مقرر کر لیا گیا۔ قرآن مجید، اردو نوشت و خواند اور ابتدائی کتب دینیات سے فارغ ہو کر دسبار ہائی اسکول ٹونک میں داخل ہوگئے دماغی قوتیں۔ ذہن۔ حافظہ اور سمجھ بوجھ آپ میں فطرت نے بدرجۂ اتم دی تھی اور یہی چیزیں آپ کی تعلیم میں معاون ہوئیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بجائے اس کے کہ اپنی دماغی قوتوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتے آپ نے یہ مناسب سمجھا کہ تجارت اختیار کی جائے چنانچہ اس وقت آپ ٹونک میں ایک کامیاب تاجر کی حیثیت رکھتے ہیں جس وقت آپ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے اس وقت آپ کے والد صاحب کا سایۂ شفقت آپ کے سر سے اٹھ گیا اور آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی پرورش کی۔ چونکہ آپ ماں باپ کے لاڈلے اور اکلوتے بھی تھے اس لئے والدۂ محترمہ آپ سے انتہائی محبت کرتی تھیں۔ چھوٹی ہی سی عمر میں آپ کی شادی جناب صاحبزادہ عبد الصبور خاں صاحب بہادر رچیف مجسٹریٹ ٹونک کی اکلوتی صاحبزادی سے ہوئی۔ آپ کے کئی اولادیں ہوئیں لیکن افسوس کہ بچے اور آپ کی رفیقۂ حیات اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے دونوں کا نعم البدل عطا فرما دیا ہے۔ جس وقت آپ میٹرک ہی میں تھے تو آپکی والدۂ مکرمہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور اب آپ نے ذمہ دارانہ حیثیت سے دنیا میں قدم رکھا لیکن چونکہ معاش اور ضروریاتِ زندگی کی فکر سے نہ اس وقت کوئی سروکار تھا اور نہ اب جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں۔ کہ تجارت اور مختلف چیزوں کی ایجنسیاں وقت گذاری اور لوگوں کی فرمائشیں پوری کرنے کے سوا آپ کے لئے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں بہرکیف آپ کا سلسلۂ معاش محض تفریحی ہے۔

آپ کی شاعری کا آغاز کیسے اور کیوں کر ہوا یہ خود صاحبزادے صاحب کو بھی نہیں معلوم۔ جوانی کا عالم۔ امنگوں سے بھرا ہوا دل۔ زندگی میں انقلاب پر انقلاب ہو رہے تھے۔ اِدھر حضرتِ اختر شیرانی سے آپ کا چولی دامن کا ساتھ تھا چنانچہ شاعری کی وہ چنگاریاں جو عرصہ سے آپ کے پہلو میں دبی ہوئی تھیں اب بھڑک اٹھیں۔ اور اختر صاحب کی پیہم صحبتوں نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ اس کے علاوہ مولانا حبیب اللہ خاں صاحب فغانی ٹونکی کی خصوصی توجہات اور فنی مشوروں نے ابتدائی مراحل کو بہ آسانی طے کرا دیا۔ ساحل صاحب نے لاہور جا کر فارسی کے متعدد امتحانات بھی دیئے۔ طبیعت میں جوہرِ فطری امانت تھا اس لئے بہت جلد کلام میں پختگی پیدا ہوگئی اور مشق و مطالعہ نے خیالات کو بلند

کردیا - آپ کی شاعری کا رنگ وہی قدیم رنگ تھا جو اس وقت ٹونک اور دیگر مقاموں میں تھا - لیکن جدید تعلیم اور جدید رنگ شاعری کے اثر سے آپ کو پرانی شاعری میں کچھ لطف نہ آتا تھا - آپ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کا کلام اخبارات اور رسائل میں پڑھا کرتے تھے - اس کے علاوہ رسالہ "پیمانہ" کے خریدار بھی تھے جس نے اس زمانہ میں وہ لٹریچر پیش کیا تھا جس سے دنیائے ادب کی دیواریں لرز گئی تھیں اور رنگِ قدیم کی شمع بجھنے کے قریب ہو گئی تھی - مولانا مدظلہٗ کو سنہ ۱۹۲۶ء میں ٹونک جانیکا اتفاق ہوا - ساحل صاحب کیلئے یہ موقع غنیمت تھا چنانچہ آپ نے مولانا مدظلہٗ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا - اور نظرِ استاد نے مسِ خام کو کندن بنادیا - آج ساحل صاحب کا کلام حقیقی معنی میں علوئے تخیل اور بلند جذبات کا حامل ہے۔

ساحل صاحب ایک مکمل انسان کی حیثیت سے کامیاب زندگی گذار رہے ہیں - اُن کے دل میں محبت کا ایک ایسا سرور اور ایک ایسا پاکیزہ جذبہ موجیں مار رہا ہے جس سے اُن کی شاعری بھی متکیف ہے - شہر میں وہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں - اُن کا کلام لوگ توجہ سے سنتے ہیں اور مشاعرے اُن کے وارداتِ قلبی سے گونجتے رہتے ہیں - آپ صرف ایک پرگو شاعر ہی نہیں بلکہ اچھے افسانہ نویس - نثر نگار اور ڈرامہ نسٹ بھی ہیں - اگرچہ ماحول اس کا موید و معاون نہ رہا لیکن ٹونک اب وہ ٹونک بھی نہ رہا - اب ٹونک زیرِ سایۂ "ہمائے سعادت" ہے اور اب ٹونک کی ہر صبح اس کی ہر گذری ہوئی صبح سے روشن تر اور بیش از بیش یمن و سعادت لئے ہوئے ہے -

ساحل صاحب نے اپنی انتہائی کوششوں سے بمنظوری اعلیٰ حضرت نواب صاحب بہادر دام اقبالہم ایک ادبی انجمن "سعادت لٹریری سوسائٹی" کے نام سے قائم کی ہے جس کے آپ سکریٹری ہیں - اور جس میں ماہانہ مشاعرہ و مناظمے کے علاوہ مناظرے بھی ہوتے ہیں - سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک عظیم الشان مشاعرہ اعلیٰ حضرت کی سالگرہ مبارک کے موقع پر اس سوسائٹی نے منعقد کیا تھا جس میں مشاہیرِ ملک نے شرکت فرمائی تھی اور اعلیٰ حضرت نے مسلسل دو دو روز کئی کئی گھنٹے اس بزم کو اپنے قدوم سے رونق بخشی تھی یہ سب ساحل صاحب ہی کی سعی کا نتیجہ تھا -

آپ نے ٹونک سے اپنی ادارت میں ایک ماہانہ رسالہ "شمیم" کے نام سے جاری کرنیکا ارادہ کیا تھا لیکن چند وجوہ کی بنا پر کچھ عرصہ کے لئے اُسے ملتوی کردیا ہے -

نمونۂ تغزل

وہ کن نظروں سے دیکھے چاند کو پھر جسے تو یاد آئے چاندنی میں

نہیں مجھ سے شکایت ہو رہی ہے محبت اب محبت ہو رہی ہے
تعلق بھی کسی دن ہو رہے گا ابھی صاحب سلامت ہو رہی ہے
معاذ اللہ یہ کبرِ جوانی زمانہ بھر سے نفرت ہو رہی ہے

یادش بخیر درد بڑھا، نیند اڑ گئی رات آ گئی خیال پریشان ہو گیا

کٹی اک عمر الفت میں مگر ابتک نہیں سمجھا محبت کیا ہے، دل کیا ہے، نظر کیا ہے ہوا کیا ہے؟

بزمِ حیرت میں تماشہ تھا ہر اک آنسو مرا میں بہت رویا حسینوں کو ہنسانے کیلئے
باوجودِ ضبط ٹپ ٹپ گر پڑے آنسو مرے جب کہا مجھ سے مرا قصہ سنانے کیلئے

جو وہ ملا تھا تو اے کاش یوں ملا ہوتا کہ عمر بھر نہ کبھی مل کے پھر جدا ہوتا

محبت ایک مجموعہ ہے وہ بھی چار حرفوں کا جو چاہوں مختصر کرلوں جو چاہوں داستاں کرلوں
نہ ہو خاموش اے شمعِ حیات اتنی تو مہلت دے کہ باقی قصۂ غمِ محبت بھی بیاں کرلوں

خطا کاریاں اس لئے ہیں زیادہ
کہ رحمت بقدرِ خطا چاہتا ہوں

نہ دے پیامِ محبت کا مسکرا کے مجھے
ترے فریبِ تبسم کو جانتا ہوں میں

اُن سے لڑنی تھی آنکھ اے ساحل
زندگی کو خراب ہونا تھا

محبت کیا ہے یہ لفظوں میں سمجھائی نہیں جاتی
کبھی تفسیر اس کی اک دلِ برباد ہوتا ہے

بُرا ہو جذبۂ آزادی و شوقِ رہائی کا
تڑپتا ہوں قفس سے جب کوئی آزاد ہوتا ہے

تھے نگاہِ باغباں کیسا تھا کل تک منحرف
اہلِ گلشن آج مجھ پر مہرباں کیوں ہو گئے

کل میرا لفظ لفظ مرے دل کا حال تھا
اب میری داستاں بھی مری داستاں نہیں

کیوں بار بار کوند رہی ہے فضا میں تو
اے برق یہ قفس ہے مرا آشیاں نہیں

تاریک کائنات ہے میری نگاہ میں
ہے زندگی خراب جو تم مہرباں نہیں

عقل پہ ڈالدے حسن نہ تیری پردے
میں نے کب ہوش میں رہ کر ترا جلوہ دیکھا

ہم نے جب محو کیا لفظِ تمنا دل سے
کامیابی کو قدم بوسِ تمنا دیکھا

آخر گری گی بجلی، میں ہی نہ کیوں جلا دوں
احسان لی کسی کا کیوں میرا آشیانہ

لے ذوقِ عشق مجھ میں کیسی تماسیاں ہیں
اُن کا نظر ملانا اور دل کا کانپ جانا

دنیا کا رنگ یہ بھی دنیا کا رنگ وہ بھی
میرا خموش رونا اور اُن کا مسکرانا

وہ عرضِ تمنا میری آہی مسترد کر دیں
سوالِ شوق پر اک بار پھر انکار ہو جائے

جنوں اک ترجمانِ واردات جوشِ الفت ہے
مری دیوانگی سے کیوں کوئی بیزار ہو جائے

باعثِ تسکیں نہ تھی کافر ادائی التفات
اور کچھ چنگاریاں دل میں فروزاں ہو گئیں

شرحِ انجامِ تماشہ دیکھنے والی کریں
میری آنکھیں تو تری جلوہ سے حیراں ہو گئیں

حسن شعلہ ریز تھا یا تو بساطِ طور پر
یا مری حیرانیاں آتش بداماں ہو گئیں

پھول بن بن کر ذرا سی دیر میں مرجھا گئیں
ظرف کی تنگی سے وہ کلیاں جو خنداں ہو گئیں

یہ ثباتِ نقشِ ہستی یہ مآلِ زندگی
گرم تھیں جو محفلیں کل آج ویراں ہو گئیں

اپنے اپنے وقت پر سب مرحلے طے ہو گئے
مشکلیں ہی وہ نہ تھیں ساحل جو آساں ہو گئیں

جسے تسکیں زمانہ کہہ رہا ہے
غمِ الفت کی شاید انتہا ہو

اسے پھر دیکھ لو تم اک نظر سے
شکستہ دل ہی شاید کام کا ہو

یہ میخانہ یہ دنیا بے خودی کی
ترے کوچے کا شاید راستہ ہو

جوانی کی یہ ساری مستیاں ہیں
ابھی نشہ اتر جائے تو کیا ہو

مقدس ہیں وہ لمحے زندگی کے
کہ جب دل عشق سے گرما رہا ہو

اُسے تم کیوں ہنسانا چاہتے ہو
مقدر کو جو اپنے رو رہا ہو

مری وارفتگی پہ کیوں ہے اک حیرت زمانہ کو
تری ہاتھوں میں بھی اکثر تری تصویر ہوتی ہے

مرا ذوقِ جنوں مجبورِ قیدِ باغباں کیوں ہو
جب اک ٹھوکر میں ٹکڑے پاؤں کی زنجیر ہوتی ہے

کچھ ایسا چھا گیا ہے تو فضاؤں پہ تصور کی
جدھر نظریں اٹھاتا ہوں تری تصویر ہوتی ہے

یہ دیوانوں کا تیرے اک نشانِ امتیازی ہے
میسر ہر کس و ناکس کو کب زنجیر ہوتی ہے

میں آشیانے میں اپنے اگر سما نہ سکا
قفس بھی بارِ اسیری مرا اُٹھا نہ سکا

نظر نہ دیکھ سکی اور خیال پا نہ سکا
غرض سمجھ میں تمہارا جمال آ نہ سکا

جو یادگار زمانہ میں بن کے رہ جاتا
جہاں میں ایسا کوئی انقلاب آ نہ سکا

وہ میری عرضِ محبت وہ اُن کی نیچی نظر
وہ ایک وقت ہے جسے عمر بھر بھلا نہ سکا

کلی کلی ہے شگفتہ ترے تبسم سے — بس ایک غنچۂ دل تو مرا کھلا نہ سکا
میں کس طرح اُسے الزام بیوفائی دوں — جو میرے دل سے کسی حال میں بھی جا نہ سکا
پس گناہ وہ لذت ملی ندامت کی — کہ عمر بھر میں گناہوں سے باز آ نہ سکا
یہ تیرے جلوے کی تابانی و کشش تو بہ — نظر بھی جھپک نہ سکی آنکھ بھی ملا نہ سکا
وہ پہلی شام قفس کی وہ چاندنی وہ بہار — مزہ اسیری میں پھر عمر بھر وہ آ نہ سکا
یہ تھا فریب نظر یا وہ سامنے تھے مرے — مشاہدے پہ بھی مجھ کو یقین آ نہ سکا
ڈھکوسلے تھے ہوسکاریوں کے سب اے دل — چراغ سوز محبت کوئی جلا نہ سکا

قفس میں خوش ہوں کہ اب خوف انقلاب نہیں — یہاں بہار و خزاں کوئی باریاب نہیں
گری تھی برق بہر طور مدتیں گذریں — دل حزیں مرا اب تک قرار یاب نہیں
بس اپنے آپ کبھی دل دھڑکنے لگتا ہے — بظاہر اور کوئی وجہ اضطراب نہیں
ہزار بار خزاں آئی ہے گلستاں میں — یہ انقلاب نیا کوئی انقلاب نہیں
سوائے میرے سبھی کچھ ہے تیری محفل میں — یہ کیا کہ پھر بھی تیری بزم کامیاب نہیں
نظر کے سامنے بکھری پڑی ہے اک دنیا — جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں وہ دستیاب نہیں

عشق کس درجہ ضروری تھا مرے دل کیلئے — ورنہ پھر کچھ بھی نہ تھا گرمی محفل کیلئے
تازگی بخشش ہوا کرتے تھے ساون پہلے — یہ بھی سامان تسلی نہیں اب دل کیلئے
بوالہوس دیکھ تو دنیا سے کنارہ کر کے — موج خود آتی ہے پابوسی ساحل کیلئے
چمن حسن سے اک پھول چاہا ہے میں نے — زیب آرائش ظلمت کدۂ دل کیلئے
ہنسکے اکبار مرے عشق کا کر لو اقرار — میری خاطر مرے ارمان بھرے دل کیلئے
بیخودی جانے کہاں لیکے نکل جاتی ہے — قصد جب کرتا ہوں میں آپکی محفل کیلئے
غرق ہو کر جو ابھر آتی ہے کشتی ساحل — یہ بھی اک موت ہے آزردۂ ساحل کیلئے

نمونۂ نظم

"حسن"

اس عالم امکاں کے مواج سمندر میں — معمورۂ دنیا کے تاریک مقدر میں
ہنگامۂ ہستی کی بگڑی ہوئی منظر میں — بدبختی و حسرت تھی بے کیفی و نکبت تھی
ظلمت میں فضائیں تھیں مغموم ہوائیں تھیں — افسردہ ادائیں تھیں خوابیدہ فضائیں تھیں
معدوم جفائیں تھیں روپوش وفائیں تھیں — ظلمت کا دورہ تھا وحشت کی حکومت تھی
مہتاب کی جلووں میں سورج کی ضیائیں تھیں — تاروں کی پھبن میں اور مستور خلاؤں میں
دامان فلک پر اور خوش رنگ گھٹاؤں میں — بے کیفی و ظلمت تھی، بے نوری و ہیبت تھی
شورش کدۂ عالم تھا شانِ بے لطفی — ہستی کی رباہوں میں معدوم تھی دلچسپی
سازوں کی نواؤں میں مخلوط تھی دلریلی — بے رنگی نظارہ محتاج شرارت تھی
فردوس مرتب تھا اور پھول نہ تھا کوئی — منظر کی تماشوں میں مشغول نہ تھا کوئی
احساس کی نظروں میں مقبول نہ تھا کوئی — دنیا کی بہاروں سے مفقود لطافت تھی
تفسیر مبارک سی، تحریر نکوتر سی — تحریک مقبر سی، تجویز مطہر سی
تنویر منور سی، تصویر معطر سی — فطرت کے ارادوں میں آسودہ رعونت تھی
ناگاہ اندھیری میں لی برق نے انگڑائی — دامان افق پر اک آتش سی نظر آئی
اب حسن کے جلوے تھے صرف چمن آرائی — آغوش سحر میں اک ہنستی ہوئی عورت تھی
عورت جسے کہتے ہیں وہ حسن درخشاں ہے — عورت کے تبسم سے گلبار گلستاں ہے
گلخانۂ ہستی کی عورت گل خنداں ہے — عورت کا رخ تاباں آئینۂ حیرت ہے
اب حسن کے جلووں سے مخمور فضائیں ہیں — پر کیف مناظر ہیں مسرور ہوائیں ہیں
بیتاب کرشمے ہیں، بیدار ادائیں ہیں — ہر چیز حسیں ہے اب ہر شے میں طراوت ہے
بلبل کے ترنم میں، سازوں کی نواؤں میں — غنچوں کے تبسم میں پھولوں کی اداؤں میں
قمری کے ترانوں میں کوئل کی صداؤں میں — مستی ہے مسرت ہے، کیفیت و ندرت ہے
مہتاب کی ضو ریزی، تاروں کی ضیا باری — گلشن کی گل افشانی نغموں کی طرب کاری
یہ حسن ستم پیشہ، یہ عشق کی لاچاری — دلچسپ مصیبت ہے، پر لطف قیامت ہے

پر حسن کے جلووں سے آغوش محبت ہے
معمورۂ ہستی اب فردوس مسرت ہے

رباعی

تاروں میں بھی ہے یہ نزہت احساس کہاں — بکھری ہوئی ذروں میں ملاحت کہاں
فردوس میں کوثر بھی ہے تسنیم بھی ہے — لیکن یہ چھلکتی ہوئی بو باس کہاں

ساغر محمد خلیل صاحب صدیقی اکبرآبادی (۴۳)

آپ کا نام شیخ محمد خلیل صدیقی اور تخلص ساغر ہے۔ وطنِ خاص اکبرآباد ہے۔ آپ کے والدِ بزرگوار کا اسمِ گرامی مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نفنا ہے۔ آپ ایک معزز اور باوقار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور شیخ صدیقی ہیں۔ آپ کے خاندان کے تمام افراد عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز ہیں۔ آپ کے والد ماجد انڈین پرسنل اٹینڈینٹ ٹو ہز مجسٹی ملکہ وکٹوریہ ہوکر لندن تشریف لے گئے تھے اور عرصہ تک وہاں قیام فرمایا۔ وہاں سے واپسی پر ہندوستان میں سب رجسٹراری کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں پنشن پائی۔ ساغر صاحب ۱۹۰۷ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے اور اسی مردم خیز سرزمین میں پرورش پائی۔

ابتدائی تعلیم مختلف مدرسوں میں حاصل کی اردو فارسی کی کماحقہٗ تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دی خداداد ذہانت سے اس میدان کو بھی سر کیا اور انٹرینس کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ دورانِ تعلیم میں آپ کے اور برادرِ محترم حضرت منظر صدیقی مدیر ماہنامہ "کنول" کے تعلقاتِ مخلصانہ اتنی حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ بظاہر ساغر و منظر دو معلوم ہوتے تھے لیکن دراصل ایک ہی تھے۔ ساغر صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ تعلیم و تہذیب کے زیور سے آراستہ تھا۔ آپ کے والد صاحب انگریزی اردو، اور فارسی کے ماہر ہیں، بدیہی امر تھا کہ آپ کے دماغ کی نشو و نما بھی اُسی انداز پر ہوتی۔ ادھر آپ کے والد صاحب کو بھی شعر و شاعری سے حقیقی انس تھا اور گو اس وقت وہ شاعری چھوڑ چکے ہیں لیکن اُس زمانہ میں بیسیوں مشاعرے پڑھے۔ نفنا تخلص فرماتے تھے اور مولانا سیماب مدظلہٗ سے اصلاح لیتے تھے۔ ادھر تو والد صاحب کا فیض اُدھر برادرم منظر صاحب کی صحبتِ شعر پرور کا اثر غرض ساغر صاحب کے دماغ نے شعر کی تخلیق شروع کردی اور آپ ایک وجدانی ذوق اپنی طبیعت میں محسوس کرنے لگے۔ عرصہ تک آپ جو کچھ کہتے رہے وہ سوائے منظر صاحب کے اور کسی کو نہ سنایا۔ پھر ایک خاموش مشقِ مسلسل کے بعد آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوئے۔ مولانا کے سامنے آپ کوئی نئے نہیں تھے یا آپ کا شاعر ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہ تھی اس لئے مولانا مدظلہٗ نے بڑی محبت کیساتھ اصلاح دی اور یہ سلسلہ آپکی کامرانی کی منزل تک لے پہونچا۔ اب تو یہ حال تھا کہ کوئی مشاعرہ ساغر صاحب سے خالی نہ جاتا تھا۔ سید عباس علی صاحب سرور مرحوم۔ برادرم منظر صاحب اور برادرم ساغر صاحب کا بیک وقت اجتماع۔ اس جوان سال پارٹی کا باہم تبادلۂ خیال۔ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا۔ ساتھ ساتھ مشاعروں میں جانا۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا۔ مجھے جب اس دورِ خوشگوار کا خیال آتا ہے تو آنکھوں میں ایک عجیب سماں پھر جاتا ہے۔ اس زمانہ میں قصرالادب سے "تاج" اور "پیمانہ" بالتزام شائع ہوتے تھے چنانچہ ساغر صاحب نے بہت جلد ترجمہ میں اس درجہ اہلیت پیدا کرلی کہ سب کو حیرت ہوتی تھی۔ آپ اکثر دفتر میں بیٹھ کر ایک ہی نشست میں مشکل سے مشکل مضمون کا ترجمہ بہترین اُردو میں کردیتے تھے۔ آپ کا کم از کم نصف دن قصرالادب میں ضرور گذرتا تھا۔ آپ کی بذلہ سنجی اور خوش مزاجی بلازمین وغیرہ

کو بھی ایسا گرویدہ کئے ہوئے تھی۔ آپ نے شاعری میں کچھ ایسی خداداد ملکہ اور قوت حاصل کی کہ جلد باہر کے مشاعروں میں بھی آپ کو بلایا جانے لگا اور آپ نے مولانا مدظلہ کی معیت میں بیرونِ آگرہ بہت سے مشاعرے کامیابی کیساتھ پڑھے۔

انقلاب ہر شئے میں رونما ہوتا ہے۔ فطرت کا منشا اٹل اور لازمی ہوتا ہے۔ دن، رات، صبح، شام، چاند، سورج غرض دنیا کی ہر وہ چیز جس میں کچھ تسکین کے پہلو پائے جاتے ہیں کبھی اپنی جگہ مدت العمر تک قائم نہیں رہتی۔ ملکی اور ملّی انقلابات کیساتھ ساتھ ذہنی اور طبعی انقلاب بھی لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ فطرت نے ساغر صاحب کی زندگی میں بھی ایک انقلاب پیدا کیا اور وہ ملازمت کی دشوار گذار راہیں تھیں جنہوں نے ساغر صاحب کی شعری زندگی کو یکسر تحلیل کر رکھ دیا۔ اسی سلسلہ میں آپکو باہر جانا پڑا۔ ادبی ماحول سے علٰحدگی، صحبت شعری سے دوری اور ملازمت کی ذمہ داریوں نے اتنی مہلت نہ دی کہ آپ اپنے اُن جذبات کو جو دل کی گہرائیوں میں گھٹ رہے تھے صفحۂ قرطاس پر لا سکتے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ مشقِ سخن بالکل تو نہیں ہاں قریب قریب ختم سی ہو گئی۔
تھوڑے عرصہ بعد آپ کا تبادلہ پھر آگرہ ہو گیا لیکن اب بھی آپ کو غلامی کی زنجیروں میں رہ کر آزادی کے نغمے گانا پسند نہ آیا۔ البتہ منظر صاحب کی کبھی کبھی کی ملاقات نے جذبات میں ہیجان ضرور پیدا کر دیا۔
آپ کو ملازمت سے کس درجہ نفرت تھی؟ اس کا اندازہ کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ ایک عرصہ اسی سرد بازاری میں گذر گیا۔ فطرت کو تو ایک اور انقلاب دکھانا منظور تھا چنانچہ آپ نے ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور اپنا ذاتی اور اپنا ذاتی پریس جو زیادہ اعلیٰ پیمانہ پر نہ تھا آگرہ میں قائم کر لیا۔ اسی زمانہ میں آپ کی شادی ہو گئی اور ذمہ داریوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ چونکہ طبیعت میں فطرت نے ایک جوہرِ حقیقی ودیعت کیا تھا اس لئے بہت جلد اپنے کاروبار کو بڑھایا اور جناب عبدالحمید صاحب صدیقی اکبرآبادی کے ساتھ رفاہِ عام پریس قائم کر کے آگرہ میں طباعت و کتابت کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ اس وقت آپ کا پریس آگرہ میں سب سے ممتاز اور فائق ہے جس میں جدید اصولوں پر کام ہوتا ہے۔ اتفاق اسے کہتے ہیں کہ ذوقِ شعری کے ابھار کے لئے قدرت نے مکمل طور پر ایک ایسا انتظام فرما دیا جو آپ کے دبے ہوئے ذوق کو بروئے کار لا سکے۔ یعنی برادرم حضرت منظر صدیقی بھی آپ کیساتھ شریک کار ہو گئے اور اسی پریس سے ماہنامہ کنول جیسا نظر فریب اور معیاری پرچہ شائع ہونے لگا۔ اب پھر دو بچھڑے ہوئے دل و دماغ ایک مقام پر اکٹھے ہو گئے۔
گو پریس کی مصروفیتیں بہت زیادہ ہیں لیکن آپ کا ذوقِ شاعری ہنوز تازہ ہے۔ مشاعروں میں شرکت ترک کر دی ہے مگر مشقِ سخن جاری ہے۔ فرق اتنا ہے کہ آپ کی بذلہ سنجی اب انتہائی سنجیدگی میں بدل گئی ہے۔ آپ کے کلام میں درد و کیف، بلندی اور اصلیت بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ چونکہ مشق قدیم ہے اس لئے پختگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ نظم و غزل رباعی غرض سب کچھ کہتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

آتش افروزِ گلستاں ہیں ترا اُڑی جھلکے — برق کو ضد ہے کہ جل جائے نشیمن اُن کا
مضطرب ہوں کہ ذرا جلد تجلی چمکے — حسن ضو دینے لگا ہی پسِ چلمن اُن کا
جن کی ہمراہ ہو گلگشت میں اک مستِ شباب — پھول اُن کے ہیں بہار اُنکی ہے گلشن اُن کا

مٹ گئے نامِ وفا پر جو جہاں میں ساغر
آج ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں مدفن اُن کا

مری ہستی کچھ ایسی بار تھی دنیائے امکاں پر — کہ پھینکا بھی تو اک ویرانۂ امکانِ بیاباں پر
خدا جانے ملیگا اجر کب صحرا نوردی کا — جنوں نے لا بٹھایا ہی ہمیں حدِ بیاباں پر
ہوا محسوس پھر تخلیق ہوگی غنچہ و گل کی — خزاں کے بعد جب کچھ تازگی آئی بیاباں پر

شورشِ طوفاں ہی سا ہنگامۂ آلام ہے   میں بہا جاتا ہوں اور لب پر کسی کا نام ہے
ہچکیاں آنے لگیں ہیں موت کا ہنگام ہے   مجھ سے وہ اس وقت ملجائیں ضروری کام ہے
نامرادی میں بہت دشوار ہے یہ امتیاز   آرزو ناکام ہے یا زندگی ناکام ہے
تیری رنگیں تر لبوں سے کیف باری کیوں نہ ہو   جو تبسم ہے ترا موجِ مئے گلفام ہے
بدلیاں قلبِ فسردہ پہ ہیں طاری ہجر کی   ساری دنیا میں سحر ہے میرے گھر میں شام ہے
آزمائے کون اے دلبر ترا بیخ کھائے کون   ہر قدم پر عشق کہتا ہے صلائے عام ہے

خلوتِ دلِ چراغ میں اُنکا خیال آئے کیوں   عالمِ تیرہ و تار میں قسمتِ دل جگائے کیوں
حاصلِ زندگی فقط درد ہے سوز ساز ہے   جسکو نہ خوئے ضبط ہو دلپہ وہ چوٹ کھائے کیوں
عشق میں ضبط چاہیے ضبط ہے حاصلِ امید   حسن کی شان ہے یہی رُخ سے نقاب اٹھائے کیوں
راہِ طلب کی سختیاں جب ہوں فزوں تو قدم قدم   تیری طلب میں راہ رو تھک کے نہ بیٹھ جائے کیوں
میری تباہ حالیاں قابلِ رحم کب نہ تھیں   اپنی نظر سے پوچھ لے کوئی تجھے بتائے کیوں

ساغرِ خوش نصیب پہ اُس کا کرم ہے آج کل
غیر سے اُسکو کیا غرض غیر کے گھر وہ جائے کیوں

آہ کرنے کا طریقہ بھی مجھے یاد نہیں   میں اسی سوچ میں آمادۂ فریاد نہیں
میری آغوشِ محبت میں تو آباد نہیں   یعنی پہلو میں ہے جنگل دلِ ناشاد نہیں
نقش ہے دلپہ مری عہدِ وفائی وعدہ   کیا اسی میں بھی بھلا دوں جو تمہیں یاد نہیں
حسن کی بات بڑھی میں یہ سمجھ کر چپ ہوں   تم سمجھ لو کہ مجھے جرأتِ فریاد نہیں

فطرتِ حسن میں کچھ بھول ہے اتنی ساغر
میں بہ اندازِ تغافل بھی انہیں یاد نہیں

جس کی ہستی سر بسر آلودۂ تقصیر تھی   واہ رے تقدیر رحمت اسکی دامنگیر تھی
شکوۂ بیداد کرتا تو مگر یوں چپ رہا   تیری رسوائی تھی میری وضع دامنگیر تھی
جرأتِ نظارہ کرنا تو نہیں کوئی گناہ   ہاں جو وہ تقصیر سمجھیں تو بڑی تقصیر تھی

قید و بندِ حیات کچھ بھی نہیں   نفس کو محوِ خواب ہونا تھا
موت آئی فراق میں ان کی   دور یہ اضطراب ہونا تھا
فطرتِ حسن کا قصور نہیں   عشق ہی کو خراب ہونا تھا
حاصلِ عشق ہے یہی شاید   دل کو ناکامیاب ہونا تھا

دل کے جانے کا غم ہی کیا ساغر
اسے نذرِ شباب ہونا تھا

سمجھ سکے نہ مآلِ تصادمِ جلوہ   وہ لٹتے محو رہے بجلیاں گرانے میں
یہ کون دے گیا پیغامِ انبساطِ بہار   یہ کس نے پھول بکھیرے مرے آشیانے میں
معیتِ رخِ روشن بہارِ عشرت ہے   شباب لوٹ رہا ہوں جمال خانے میں
الٰہی رنگ کچھ ایسا ہو موسمِ گل کا   چمن سمٹ کے چلا آئے آشیانے میں

علاج کیا ہو غمِ آرزو کا اے ساغر
کہ دل نواز نہیں ہے کوئی زمانے میں

نمونۂ نظم

"جذبۂ قومی"

مجلسِ اقوام میں اس قوم کو ہے امتیاز   آگیا جس کی سمجھ میں حسنِ قومیت کا راز
قوم کا وہ فرد بھی ہرگز نہیں ہے فردِ قوم   محشرِ اقوام میں جسکو نہیں ہے امتیاز
اپنی تیغِ فکر سے رنگِ غلامی دور کر   بندگانِ قوم کی خدمت سے بن بندہ نواز
قوم کی محفل میں سب تجھ کو بنائیں شمعِ بزم   اپنے عزم و سعی میں پیدا کر اتنا سوز و گداز
خونِ آزادی سے کر جلدی وضو وقت آگیا   قوم استادہ ہے حریت کی پڑھ چلکر نماز
عمر بھر رکھا اس اصولِ کار کو پیشِ نظر   دے تجھے اک نکتہ سمجھاتا ہوں میں عمرت دراز

آبرو اُس کی ہے جو معروفِ جنگِ قوم ہے
جذبۂ قومی نہیں جس میں وہ ننگِ قوم ہے۔

سیف — ابوالاعجاز سید سیف علی صاحب رضوی اکبرآبادی — ۴۴

آپ کا نام سید سیف علی رضوی اور تخلص سیف ہے۔ عمر تقریباً ۲۸ سال ہے۔ جائے مولود ریاست بھرتپور اور وطن مالوف آگرہ ہے۔ سیف صاحب آگرہ کے ایک مشہور اور معزز خاندان کے رکن ہیں۔ شاہ گنج آگرہ میں آپ کے تمام عزیز و اقارب رہتے ہیں آپکی خاندانی وقار اور موروثی شان کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جو آپ سے واقف ہیں لیکن آپ "پدرم سلطان بود" کے قائل نہیں اور اس چیز کو واقعی اہمیت نہ دیتے ہوئے آپ نے دنیا کے سامنے اپنی جد و جہد سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خود کچھ کرنا چاہیئے اور خود کچھ ہونا چاہیئے۔ آپ کے والدِ محترم کا نام سید آلِ نبی رضوی مرحوم تھا جو شاہ گنج کے مشہور رئیسوں میں تھے۔

سیف صاحب کی ابتدائی زندگی سے لیکر اس وقت تک کے واقعات کچھ اس درجہ روح فرسا اور عبرتناک ہیں کہ ان کو دہرانے سے ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم عربی۔ اردو اور فارسی میں حاصل کی اس کے بعد بقدرِ ضرورت انگریزی بھی پڑھی والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے انگریزی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکے۔ اور فکرِ معاش میں مصروف ہو گئے شروع شروع میں مختلف کام کئے آخر کار اجمیر اور آگرہ میں سائیکلوں کا کارخانہ کھولا۔ چونکہ فطرت نے آپ کو تجارت کیلئے نہیں پیدا کیا تھا اس لئے یہ سلسلہ بہت جلد ختم ہو گیا۔

آپ کو شاعری سے دلبستگی زمانۂ طفلی ہی سے ہے۔ نو دس برس کی عمر سے شعر کہتے ہیں۔ چھوٹی سی عمر ہی میں "کلامِ سیف" کے نام سے آپنے مختصر غزلوں کا مجموعہ شائع کیا تھا۔ گویا قبولیت اور شہرت کی جد و جہد جو آپ کے اپنے بچپن سے شروع کی اب ۲۸ سال کی عمر میں آکر بارور ہوئی ہے۔ ابتدا میں آپ حضرتِ تاباں بدایونی کو اپنا کلام بغرضِ اصلاح بھیجتے تھے سنہ ۱۹۲۶ء میں جب آپ نے اجمیر کو اپنا مستقر بنایا تو مقامی طور پر حضرت مولانا عبدالباری صاحب معنی اجمیری سے اصلاح لینے لگے یہ سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا کیونکہ مولانا معنی کو آپ کا شیعہ ہونا پسند نہ تھا۔ ادھر آپ کو بھی ایک ندامتِ حقیقی تھی کہ اکبرآباد کے کسی گوہرِ شب چراغ کو چھوڑ کر راجپوتانہ کے پہاڑی علاقہ میں ذوقِ شعری کی تشنگی بجھانے کے لئے راہبر کی تلاش کر رہے تھے۔ اور سنہ ۱۹۳۲ء میں آپ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ کی طرف رجوع ہوئے۔ مولانا نے اپنی مصروفیت کا عذر کیا لیکن آپ نے یہ کہہ کر کہ "میں اکبرآبادی ہوں" مولانا کو درخواستِ شاگردی منظور کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت سے اب تک سیف صاحب مولانا مدظلہ سے اصلاح لیتے ہیں۔ اب آپ کا معیارِ شاعری بہت بلند ہو گیا ہے۔ سیف صاحب نے ہندوستان میں بڑی کثرت سے مشاعرے پڑھے ہیں اور اس وقت تک پچاس سے زیادہ میڈلس اور کپ مل چکے ہیں۔ آپ کے بہت سے شاگرد بھی ہیں۔ سیف صاحب کو حضرت عزیز مرحوم کی صحبت میں رہنے کا بھی اکثر اتفاق ہوا ہے۔ مرحوم نے "ابوالاعجاز" لقب عطا کیا تھا اور مدت سے "ابوالاعجاز سیف اکبرآبادی" کے نام سے دنیائے ادب میں مشہور ہیں۔ آپ نے ملک کے بیشتر رسائل اور اخبارات میں کام کیا ہے سنہ ۱۹۳۶ء سے روزنامہ "پرتاپ" لاہور کے حصۂ نظم کو ترتیب دے رہے ہیں اسکے علاوہ بھی آپ پنجاب کے مختلف اخبارات اور رسائل میں کام کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں لاہور سے اپنی ادارت میں ماہنامہ "المشیر"

کبھی آپ نے شائع کیا۔

سیفؔ صاحب ملک کے ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں جن پر مستقبل میں چمکنے کا پورا یقین ہے۔ آپ کبھی کسی سے جھجکتے نہیں اور خصوصاً شاعری میں تو اس میدان کے "پہلوان" کہلاتے ہیں۔ اور اس قسم کے سینکڑوں دنگل آپ نے جیتے ہیں۔ طبیعت اچھی پائی ہے۔ شعر سنجیدہ اور سمجھ کر کہتے ہیں۔ آپ نظم غزل مضمون وغیرہ وغیرہ سب کچھ لکھتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

کیسا شکیب، یاس نے افسردہ کر دیا — دنیا بدل گئی ہے دلِ ناصبور کی

یاد آیا جو رنجِ تنہائی — اپنے سایہ سے رو دیئے مل کر

کہتا ہے یہ دل مجھ سے گلگشتِ چمن کیسی — خاروں کی زمیں ہوتی میں آبلہ پا ہوتا

صد شکر غزل سنکر اتنا تو کہا اس نے — یہ سیفؔ کوئی شاید تقدیر کا مارا ہے

وہ دل کہ جو ازل سے بنائے حیات تھا — گھبرا رہا ہے زیست کے آثار دیکھ کر
اب حشر تک بہار تماشا ہے اور میں — آنکھیں ہوئیں ہیں بند رخِ یار دیکھ کر
آئینہ رکھ کے سامنے سجدے کو جھک گیا — اب کیا کہیں گے کافر و دیندار دیکھ کر

راہگراں یہ نہ ہوگا درِ زندانِ قفس — گھٹ کے مر جائیں گے صیاد!! اسیرانِ قفس
عمر کبتک یہ غلامی میں کٹیگی یارب! — تابکے سمجھیگا صیاد ہمیں حیوانِ قفس
فطرتاً موت ہے اس قید میں زندہ رہنا — آبرو بیچ کے کیوں مول لیں احسانِ قفس
آنکھوں دیکھی ہوئی روداد قفس لکھی ہے — کوئی دیکھ جائے مجھے خونِ شہیدانِ قفس
جذبۂ قوم سلامت ہے تو انشاء اللہ — توڑ پھینکیں گے قفس کو بھی اسیرانِ قفس

حدِ امید سے کچھ دور نہیں ہے منزل — ساتھ دے جائے اگر قسمتِ یارانِ قفس

ہو آشنا نہیں جذبۂ نیازِ وطن — شہیدِ تیغِ محبت۔ اسیرِ نازِ وطن
در نیاز کہاں اور کہاں جبینِ شوق — ترا حضور کہاں اور کہاں نمازِ وطن

رازِ افشا ہو سرِ بزم یہ منظور نہیں — ورنہ میرے لئے پابندی منظور نہیں

ذکر اپنا نہیں فکرِ دلِ ناشاد نہیں — خود فراموش ہوں کچھ تیرے سوا یاد نہیں
رخصتِ ہوش کی تمہید تھا اُن کا آنا — کب وہ پہلو سے گئے اٹھ کے مجھے یاد نہیں
آج آتی نہیں پہلو سے صدا نالے کی — دل کہاں بھول گئے سیفؔ کہیں یاد نہیں

نمونۂ نظم

مہارانا پرتاپ

اپنی خودداری پہ گھر بار لٹایا تو نے — غیر کے آگے مگر سر نہ جھکایا تو نے
حشر تک ہوں گے فراموش نہ تیرے احسان — طوق و زنجیرِ غلامی سے بچایا تو نے
بحرِ ظلمات میں جب ڈوب رہی تھی کشتی — آکے گرداب سے اس وقت بچایا تو نے
شیوۂ اہلِ وفا سختیاں سہنا ٹھہرا — اپنے ہر فعل سے دنیا کو بتایا تو نے
لی کبھی دادِ تحمل، کبھی دادِ شمشیر! — نام ہر طرح سے اس دہر میں پایا تو نے
شیر بکری میں کوئی فرق نہ تو نے رکھا — پانی اک گھاٹ پہ دونوں کو پلایا تو نے
اپنے اعمال سے اخلاق کا کرکے اظہار — بندوں کو بندۂ بے دام بنایا تو نے
دلانے والے کیلئے ہو گیا محتاج مگر — طاعتِ غیر میں سر کو نہ جھکایا تو نے
ملک و ملت پہ ہے احسان ترا حد سے سوا — سچ ہے کہ انسان کو پستی سے اٹھایا تو نے

کارناموں پہ ترے رشک کریں گی نسلیں
رازِ خودداری انسان بتایا تو نے

سیفی فیاض حسین صاحب اکبرآبادی (۴۵)

آپ کا نام فیاض حسین اور سیفی تخلص ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی ذاکر حسین تھا جو ناسک میں وکیل تھے۔ اور آگرہ کے قدیم باشندے تھے سیفی صاحب چھوٹی سی عمر ہی میں اپنے والد صاحب کے ساتھ ترکِ وطن کر گئے تھے۔ اس لئے آگرہ میں بہت کم لوگ آپکو جانتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب نے وکالت چھوڑنے کے بعد ۱۴ سال تک ملازمت کی اور نہایت اطمینان سے اپنی زندگی بسر کی۔

سیفی صاحب کی ابتدائی تعلیم آگرہ ہی میں ہوئی۔ اس کے بعد جب آپ ناسک سے بمبئی تشریف لائے تو انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔ فکرِ معاش نے تعلیم میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کیں۔ عرصہ تک آپ بیکار رہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ نے ناسک اردو اسکول میں ملازمت اختیار کرلی اور پانچ سال کے بعد سنہ ۱۹۲۵ء میں چھوڑ دی۔ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لئے آپ نے موٹر میکنک کا کام اعلیٰ طریقہ پر حاصل کیا اور بمبئی میں ایک زبردست موٹر کمپنی میں اچھے معاوضہ پر کام شروع کردیا۔ اب آپ یہاں بہت خوش ہیں اور برابر ترقی کر رہے ہیں۔

چونکہ سیفی کا زیادہ زمانہ بمبئی ہی کے علاقوں میں گذرا ہے اس لئے بہترین ادبی و علمی صحبتیں جن کی آپ کو ضرورت تھی نہ مل سکیں۔ صرف مطالعہ نے آپ کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے۔ یہ مطالعہ اور غور و فکر کا ہی نتیجہ ہے کہ آپ ایک اچھے شاعر ہیں۔ بمبئی کے بہت سے مشاعروں میں آپ شرکت کر چکے ہیں۔ شاعری سے آپ کو عشق ہے۔ کئی رسالے اور اخبار بھی آپ کے پاس آتے ہیں۔ اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے سنہ ۱۹۳۳ء سے آپ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہٗ سے اصلاح لیتے ہیں۔ اس سے پہلے کسی کو اپنی غزل نہیں دکھائی۔ آپ کی بہت سی غزلیں ریکارڈ میں آچکی ہیں اور ریڈیو پر بھی گائی جاتی ہیں۔ آپ انتہائی خلیق، ملنسار اور باوضع آدمی ہیں۔ آپ کے احباب کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ ملک و قوم کی بہبودی آپ کا مسلک ہے۔ دوست دشمن سب سے یکساں طور پر ملتے ہیں۔ بہت مسکین طبعت اور سادہ مزاج آدمی ہیں۔

نمونۂ تغزل

یہ گلِ نرگس نہیں خوش رنگ اک پیمانہ ہے ۔۔۔ صبح کے ساقی کا ہر اک پھول میں میخانہ ہے
جلوۂ اللہ سے سیفی نہ تھا موسیٰ کو ہوش
ذرہ ذرہ کی زباں پر طور کا افسانہ ہے

تڑپ رہی ہیں جو ای برق اختیار نہیں ۔۔۔ تجھے قرار نہیں ہے میں قرار نہیں
بتو نہ صاف تمہارا ہو دل تو بات ہے اور ۔۔۔ قسم خدا کی مرے دل میں کچھ غبار نہیں

کبھی جو دیکھی تھیں ساقی کی میگسار آنکھیں ۔۔۔ ہنوز پاتا ہوں اُن کا خمار آنکھوں میں
نہ رک سکا شبِ غم تیری یاد کا طوفان ۔۔۔ یہ آخر آگیا بے اختیار آنکھوں میں

یہ میری اضطرابِ شوق کا عالم ہے مقتل میں ۔۔۔ کبھی خنجر تہِ گردن کبھی خنجر ہی گردن پر

منحصر مرضیِ حق پر ہیں امورِ عالم ۔۔۔ ہے بھروسہ مجھے اپنے کا نہ بیگانے کا

ہے وہی جامہ دری اور وہی آشفتہ سری
قیس کا حال جو تھا ہی تری دیوانی کا

اللہ ری شوقِ دید کہ مرنے کے بعد بھی
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ترا انتظار ہے
واقف ہو رازِ زیست سے پھر کوئی کس طرح
جب زندگی کا سانس پہ دار و مدار ہے

دلکو ہر پہلو سے شایانِ تماشا کیجئے
خونِ حسرت کیجئے، خونِ تمنا کیجئے

گئے حواس، اڑی نبض، آنکھ بند ہوئی
سکوں کا وقت ہی بیمارِ ناتواں کیلئے

گرد راہِ کارواں میں کچھ پتہ چلتا نہیں
دور ہیں منزل سے اپنی یا ہیں منزل کے قریب
اب قفس میں دل بہلنے کیلئے صیاد نے
ڈھیر پھولوں کے لگائے ہیں عنادل کے قریب

ہو گئی میری رسائی آستانِ ناز تک
راہِ الفت میں جو رہبر تیرا نقشِ پا ہوا

یاد مجھ کو آ گئی پھر اس بتِ بے درد کی
پھر دلِ مضطر میں میرے درد سا پیدا ہوا

تری الفت میں جا دیدوں [illegible] مٹ جاؤں
یہی راہِ حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

نگاہِ یاس کچھ اسباب ایسے بھی فراہم کر
گراں ہر آئینہ حالِ دلِ رنجور ہو جائے
مرا پیا شیفتہ پھول لیکے انکے پاس جاتا ہو
کہیں بے التفاتی سے نہ انکی چور ہو جائے
جسے ٹھکرا دیا ہو تم نے ہو مردود دنیا ہو
وہ اپنی جان دینے پر نہ کیوں مجبور ہو جائے
کرے وہ کس طرح تو ہی بتا دیدار کی جرأت
تجھے جو دیکھ کر بیہوش برقِ طور ہو جائے

---

(۴۶) حکیم غلام احمد صاحب قریشی

آپ ۱۰ جولائی ۱۹۲۰ء کو بمقام پنڈدادنخاں پیدا ہوئے۔ آپکے والدصاحب کا اسم گرامی حکیم مولوی سلطان حبیب صاحب ہے حکیم صاحب کی پیدائش سے چند دن قبل آپکے والدصاحب کو سلطان العارفین بادشاہ سلطان باہو قدس سرہ العزیز قادری نے بشارت دی تھی کہ تمہارے یہاں ایک لڑکا ہوگا اور اُس کا نام "گل احمد" رکھنا۔ چنانچہ سن تمیز تک آپ کا یہی نام رہا۔ اور آپ کے والدصاحب قبلہ اب بھی اسی نام سے آپ کو پکارتے ہیں۔ لیکن دورانِ تعلیم میں اسکول کے اساتذہ نے نام کو "گلام احمد" لکھنا شروع کردیا۔ اور انگریزی سے اردو میں وہ غلام احمد ہوگیا۔ چنانچہ دفاتر، سندات اور سرکاری کاغذات میں یہی نام لکھا ہوا ہے۔

آپ کے آباؤ اجداد میں سے ایک بزرگ جو دینی اور دنیوی نعمتوں کے ساتھ فقر کی دولت سے بھی مالامال تھے گیارھویں صدی ہجری میں دہلی سے ہاتھی کی عماری پر اس علاقہ میں تشریف لائے اور بھیرہ سے جنوبی و مغربی ایک میدان میں قیام کیا۔ کچھ عرصہ تک وہاں رہنے کی وجہ سے وہی مقام پسند آگیا اور وہیں مکانات وغیرہ تعمیر کرالئے۔ قرب وجوار کے لوگ جوق درجوق حاضر خدمت ہونے لگے اور آپ کے فیض سے مستفید ہوئے۔ ان ہی لوگوں نے سیکڑوں بیگھے زمین نذرانہ میں پیش کی جو اس وقت بھی موجود ہے۔ آپ کا اسم گرامی مولوی محمد نافع الدین تھا۔ آپکے بسائے ہوئے گاؤں کا نام "ہاتھی ونڈ" مشہور ہوگیا۔ جس کا اس وقت "ہاتھی ونڈ" نام ہے۔ اور اب تک وہاں آپ کے خاندان کے افراد آباد ہیں۔ آپکے والد محترم کے دادا صاحب مولوی غلام فرید صاحب لوگوں کی درخواست پر "پتھر ندی" جو دریائے جہلم کے کنارے بھیرہ سے تین میل شمال مشرق کی طرف واقع ہے تشریف لائے اور وہیں قیام پذیر ہوئے۔ چنانچہ آپ کا اصلی وطن گویا "پتھر ندی" ہے۔ آپ کے دادا مولوی محکم الدین صاحب مرحوم ومغفور اور باقی افراد خاندان وہیں ہیں۔ صرف آپ کے والد صاحب پنڈدادنخاں تشریف لے آئے۔ آپکے جدِامجد سے لیکر آپ کے والد صاحب تک فقیرانہ اور درویشانہ سلسلہ قائم رہا۔ آپ کے خاندان کے تمام بزرگ عربی۔ فارسی۔ قرآنِ پاک۔ خوشنویسی اور علم طب میں یکتائے روزگار گذرے ہیں جو عرفان الٰہی میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے۔ آپ کے والد صاحب قبلہ عربی، فارسی جفر، طب۔ تفسیر۔ فقہ اور حدیث کے عالم ہیں۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ اس درجہ خوش الحان ہیں کہ جس وقت آپ کلام پاک تلاوت فرماتے ہیں تو غیر قوم کے لوگ بھی راستہ چلتے چلتے رک جاتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپکو لحنِ داؤدی عطا فرمائی ہے۔

چونکہ آپ کے والد صاحب کو جذب اور محویتِ خاص کی وجہ سے آپ کی تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور آپ اس طریقہ تعلیم سے محروم رہے جو فاضل علماء کی اولاد کو ملتی ہے اس لئے ۱۴ سال کی عمر تک آپ سوائے کلام پاک کی تعلیم کے اور کچھ حاصل نہ کرسکے اسکے بعد اسکول کی جماعتِ دوم میں داخل ہوگئے۔ چونکہ فطری ذہانت اور ذکاوت آپ میں بحدِ کافی موجود تھی۔ اس لئے بہت جلد آپ ترقی کرتے گئے۔ اور ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈدادنخاں سے انٹرینس کا امتحان پاس کیا۔ مزید انگریزی تعلیم کا شوق بہت زیادہ تھا چنانچہ لاہور شن کالج میں داخل ہوئے لیکن حالات کے ناموافق ہونے

کی وجہ سے جلد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ وقتاً فوقتاً اپنے والد صاحب ہی سے عربی صرف ونحو اور فارسی ادب کی تعلیم حاصل کرتے رہے اور جلد ہی ملازمت مل گئی۔ دورانِ ملازمت میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ محکمۂ تعلیم کے امتحانات جے وی اور سپیشل ایس وی کے امتحانات بھی پاس کیے۔

انٹرینس پاس کرنے کے بعد آپ تلاشِ ملازمت میں سرگرداں رہے۔ کچھ عرصے تک کھیوڑہ نمک کے دفتر میں ملازم رہے۔ اس کے بعد کوئٹہ (بلوچستان) ۱۲۹ بلوچی رجمنٹ میں نائک اور کلرک ہو گئے۔ وہاں سے ملازمت ترک کرنیکے بعد ضلع فیروزپور میں محکمۂ نہر میں ملازمت کے لئے اپنے خالو جناب فضل الرسول صاحب کے پاس (جو اسسٹنٹ اوورسیر تھے) گئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر آپ پرائمری اسکول میں گوندر پور نامی گاؤں میں ۲۵ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ جولائی ۲۶ء تک وہاں کام کیا۔ چونکہ آپ کے خالو صاحب بیمار تھے اس لئے ان کی تیمار داری میں آپ ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ لیکن وہ جانبر نہ ہوسکے۔ ادھر آپ کو چھ کوس گرمی میں پیدل چلکر اسکول جانا پڑتا تھا۔ اس لئے آپ کی صحت خراب ہوگئی۔ خالو صاحب کے خاندان کی کفالت بھی آپ ہی کے سر تھی لہذا وہاں کے ڈاکخانہ میں اپنے ایک دوست کے ایما سے ملازم ہو گئے اور جلد ہی پوسٹل کلرکی کا امتحان دوسرے نمبر پر پاس کرلیا۔ سپرنٹنڈینٹ صاحب محکمۂ ڈاک نے آپ کی تقرری کے لئے وعدہ کیا اور آپ نے ضمانت وغیرہ بھی دیدی لیکن لیکایک ان کا تبادلہ ہو گیا۔ اور دوسرے سپرنٹنڈینٹ نے دو دیگر امیدواروں کو وہ جگہ دیدی چونکہ آپ کی شادی آپ کے خالو صاحب مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ اس لئے خالو صاحب کے ایک دوست نے آپ کو محکمۂ نہر میں ٹائم کیپری اور اسسٹنٹ کلرک کی جگہ دلادی۔ گیارہ ماہ وہاں کام کیا لیکن آب وہوا ناموافق آنے کی وجہ سے وہ ملازمت بھی ترک کردی۔ اور کھیوڑہ ورکشاپ میں اپرنٹیسٹ فٹر کی جگہ متعین ہوگئے۔ اور جلد پاور ہاؤس میں سوئچ اٹینڈینٹ ہو گئے مگر انجنیر صاحب سے موافقت نہ ہونیکی وجہ سے یہ ملازمت بھی ترک کردی۔ اس کے بعد ملازمت کی تلاش میں پشاور۔ [illegible] اور کوہاٹ وغیرہ کا چکر لگایا مگر بے سود ثابت ہوا۔ آخر کار پھر کر محکمۂ تعلیم ہی میں جگہ ملی اور ابتک اسی پر فائز ہیں۔

آپ سے چھوٹے تین بھائی اور ایک ہمشیرہ ہیں۔ ایک بھائی کا نام حکیم حبیب الرحمن ہیں جو بہت ذہین اور قابل طبیب ہیں باقی دو بھائی سلطان احمد اور خلیل احمد اسکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ آپ کا ایک لڑکا منظور سلطان دو سال کا ہوکر فوت ہوگیا۔ آپ کی شاعری کی ابتدا ۱۹۲۳ء سے ہوئی جب کہ آپ گورنمنٹ نارمل اسکول لالہ موسیٰ میں جے۔ وی کلاس کے طالب علم تھے۔ جناب مولوی غلام جیلانی صاحب برق ایم۔ اے۔ ایم او۔ ایل کے فیضِ صحبت سے آپ میں ذوقِ شعری پیدا ہوا۔ جب تک لالہ موسیٰ میں سلیم صاحب کا قیام رہا۔ مولوی صاحب موصوف نے آپ کی تربیت اور اصلاح فرمائی اور ابتدائی مدارج بہت کچھ طے کرادیے لیکن وہاں سے آنے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اور آپ کو استادِ کامل کی تلاش ہوئی حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے پاس اپنی درخواست بھیجی اور مولانا مدظلہ نے آپ کو اپنے دامنِ فیض رساں میں لے لیا یہ بات انتہائی حیرتناک ہے کہ جب سے آپ کا شہر آباد ہوا ہے اُس وقت سے ابتک وہاں کوئی اردو کا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ حالانکہ شہر بہت آباد اور معروف ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے وہاں ایک بزمِ مشاعرہ قائم کی جو ایک سال تک چلتی رہی اور وہاں نوجوان طبقہ میں ذوقِ شعری پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ چند حضرات آپ ہی سے اصلاح لیتے ہیں مثلاً مسٹر سجان لال اثیم سکنہ ڈھوڈی پھپھرو۔ چودھری عبدالسلام فقیر

وعبدالرزاق صاحب فانی وغیرہ. غیرہ اچھا لکھنے والوں میں ہیں تسلیم صاحب کے کلام میں پختگی اور آمد پائی جاتی ہے۔

آپ کی تصانیف کافی ہیں لیکن کم مائیگی اور ماحول کی سرد آگینی کی وجہ سے کچھ طبع نہیں ہو سکا ہے۔ آپ کے نظم و نثر مضامین کی کتابیں اور مختصر رسالے ہیں (۱) تدریس سے مطالب، جس کا کچھ حصہ رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں شائع ہو چکا ہے (۲) دہقاں اور زمین (۳) قندِ حیات کسان کا موجودہ افلاس اور تباہ کاریوں کا صحیح مرقع (۴) مسلمانِ امروز۔ (۵) بچھڑا ہوا پھول۔ (۶) پروانہ (۷) زراعت (۸) مجموعۂ دیہات سدھار (۹) دیہات سدھار کی رباعیاں (۱۰) باغِ رسول مجموعۂ نعت وغیرہ

نمونۂ تغزل

ہم جانتے تھے ضبطِ الم میں سرور ہے دیکھا تو اپنا شیشۂ دل چور چور ہے
یہ اور بات ہے کہ نہ دیکھے جمالِ یار ورنہ نگاہِ نرگسِ شہلا میں نور ہے
جادۂ وہ بے وفا ہیں تو مجھ کو نصیب ہوں جو کچھ بھی ہیں، عطیۂ ربِ غفور ہے
تقدیر سے غلام بنایا ہے عشق نے اُن کا قصور ہے نہ ہمارا قصور ہے

جذبۂ الفت کہیں وہ وقت بھی قسمت سے آئے روٹھنے والے منائیں اور میں روٹھا کروں

تصور میں بیٹھا ہوا ہوں کسی کے دبائے ہوئے دل، جگر کو سنبھالے

وہ کہہ گئے ہیں قیامت میں اب ملینگے ہم ستا رہا ہے قیامت کا انتظار مجھے

لوگ کہتے ہیں مجھ کو دیوانہ اس میں بھی کچھ مری بھلائی ہے

چمنِ دہر میں یاں نہیں خنداں کوئی ہے پریشان کوئی چاک گریباں کوئی

ایک آنسو کے ٹپکنے سے بجھی آتشِ دل قطرۂ اشک میں محفوظ تھا طوفاں کوئی
شورشِ دہر سے گھبرا کے نکل جائیں سلیم
دونوں عالم سے پرے اگر ہو بیاباں کوئی

مجبورِ طبیعت ہیں یا ہر روز بگڑتے ہیں مجبورِ محبت ہوں ہر روز مناتا ہوں

بتوں کے ہاتھ میں یا رب ہے میری موت و حیات تو فائدہ ہی بھلا کیا تری خدائی سے

خلد میں بھی وہ ہی ہے عالمِ غم دل کی یہ سوگواریاں نہ گئیں
لن ترانی پہ کہہ دیا ارنی شوق کی استواریاں نہ گئیں

بسایا بجلیوں سے آشیاں کو دعا دیتا ہوں جورِ آسماں کو

جہنم سے بلا بھیجا خدا نے ذرا رندوں کی شانِ کافری دیکھ
سلیم اک دردِ دل کی برکتوں سے بشر کو مل گئی پیغمبری دیکھ

میں گنہگار ہوں ہیں مغفرت ڈھونڈوں اور زاہد کو ہے نماز کی دُھن
وہ تو ہو دِمجاز کا پابند اور مجھے بے ریا گداز کی دُھن

گناہ حد سے فزوں کر کے میں نے چھوڑ دیئے ترے کرم سے توازن کیا تو تھوڑے تھے

جب بھی فرصت مجھے ملتی ہے جگر سوزی سے بھولنے والے تجھے یاد کیا کرتا ہوں

قطعہ

ہنسنا نہیں قسمت میں تو رونا ہی سکھا دے داغوں کو اس اشکِ آب سے دھونا ہی سکھا دے
ہو کر بھی وہی ہیں جو نہ ہو کر تھے کبھی ہم ہونے سے رہے اب تو نہ ہونا ہی سکھا دے

نمونۂ نظم

اعتمادِ علی اللہ

کسی کو تو علم و ہنر پر بھروسہ — کسی کو ہے مال اور زر پر بھروسا
کسی کو بھروسا ہے زہد و ورع پر — کسی کو دعا و اثر پر بھروسا
کوئی قائلِ قوتِ دستِ بازو — کسی نے کیا بال و پر پر بھروسا
کسی کو ہے جادو کلامی پہ غرّہ — کسی کو فسونِ نظر پر بھروسا
کسی کو خوش الحان ہونیکا دعویٰ — کسی کو دلِ نغمہ گر پر بھروسا
کسی کو اراضی و جاگیر پر ہے — کسی کو ہے کنبہ و گھر پر بھروسا
کسی کے عزیز و اقارب معاون — کسی کو متاعِ پدر پر بھروسا
کسی کو ہے بھائی کی امداد کافی — کسی کو نمودِ پسر پر بھروسا
میرے پاس لے دے کے اک دردِ دل ہے — اور اسکے سوا چشمِ تر پر بھروسا

خداوند عالم! کدھر جائے گا وہ
جسے ہے فقط تیرے در پر بھروسا

غلام احمد صاحب سلیم قریشی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کی اصلاح

(تیرا شیدا ہے)
مبتلا آپ کا محرومِ وصال اچھا ہے — اُس کو تم (تجھ) سے بھی ترا حزن و ملال اچھا ہے

چھوڑ دے عشق کا بیمار، نڈھال اچھا ہے — خیر سے آپ نہ پوچھیں میرا حال اچھا ہے

زخمِ دل خوب ہرے ہونگے خزاں آنے دو — میرے گلشن کی بہاروں کا مآل اچھا ہے

(دُکھ) (کر آجائیں)
رحم آجائے انہیں بھی کہیں شاید آئیں — یہ نہ ہو علم (پھر جا ہو) کہ بیمار کا حال اچھا ہے

(میرے سے)
رات دن دل کے کلیجے سی لگا رہتا ہے — وصلِ محبوب سے ارمانِ وصال اچھا ہے

(کی الجھن سے نکلا سے)
گوشۂ یاس میں پرواز کی مضمون چھوٹے — مرغِ امید میرا بے پر و بال اچھا ہے

(تو) (تجھ)
بل میری خوب نکالے ہیں مرے تجھاں تم نے — تم کو انسان بنانے میں کمال اچھا ہے

وہ خفا شہر برافروختہ، اندوہِ فراق — برہمن خاک ہمارے لئے سال اچھا ہے

کرسکے اُن کو نہ مائل ترے اشعار سلیم
(کیا یقیں ہو)
خاک جانیں کہ ترا طرزِ مقال اچھا ہے

شفیق — صاحبزادہ شفیق الرحمٰن خانصاحب ٹونکی (۳۷)

آپ کا نام محمد شفیق الرحمٰن خاں اور تخلص شفیق ہے۔ والد محترم کا نام نامی صاحبزادہ محمد عزیز الرحمٰن خانصاحب۔ ابن جناب صاحبزادہ حافظ قاری محمد عبد الرحمٰن خاں صاحب مرحوم مغفور ابن صاحبزادہ محمد بخت بلند خانصاحب بہادر مرحوم مغفور ابن جناب نواب امیر الدولہ بہادر شمشیر جنگ بانی ریاست ٹونک۔ آپ پٹھان ہیں۔ ۱۵ محرم الحرام ۱۳۲۶ہجری بوقت صبح چار بجے دار السلام ٹونک میں پیدا ہوئے۔

آپ حنفی مسلمان ہیں۔ بزرگان دین اور اولیائے کرام سے انتہائی عقیدت رکھتے ہیں مذہبی خیالات نہایت مضبوط اور مستحکم ہیں اسلامی کتب بینی کا بیحد ذوق و شوق ہے علماء اور فضلاء کی خدمت کرنا اپنا فرض عین تصور کرتے ہیں مذہبی معلومات بھی کافی ہے صاحب اخلاق و ایثار ہیں۔

جب آپ نے ہوش سنبھالا تو اپنے ماحول کو مذہبی رنگ میں رنگا ہوا پایا چنانچہ اسی فضا میں پرورش پائی۔ مذہبی تعلیم باقاعدہ گھر پر ہوئی بعد ختم کلام مجید و دیگر کتب ہائے مذہبی دس سال کی عمر میں ایک مقامی برانچ اسکول میں داخل ہو گئے اور ابتدائی مدارج تعلیم طے کر کے دربار ہائی اسکول ٹونک میں انٹرنس تک تعلیم پائی ریڈکراس سوسائٹی کے بعض امتحانات بھی اسی زمانے میں پاس کئے جس کے تمغے اور سارٹیفکٹ آپ کے پاس موجود ہیں زمانۂ تعلیم میں ورزش اور کھیلوں کی طرف بھی خاص توجہ کی اور بہت جلد اپنی ذہنی اور جسمانی نشو و نما کی بنا پر اسکول کے کھلاڑیوں میں ناموری حاصل کر لی۔ متعدد بار باہر جا کر بھی میچ کھیلے۔ آج کل آپ کا مرغوب طبع کھیل ٹینس ہے اس کھیل میں کامیابی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج آپ کی پوزیشن ریاست بھر میں Champion کی ہے۔ بہت سے کپ اور تمغہ جات آپ کو انعامات میں مل چکے ہیں۔

آپ کا ذوق شعری اوائل ۱۳۴۲ھ میں پیدا ہوا۔ اولاً آپ کو تلمذ صاحبزادہ احمد سعید خانصاحب عاشق ٹونکی یادگار مولانا حالیؒ و داغ مرحوم سے ہوا اس فخر کو آپ اب بھی محسوس کرتے ہیں چند غزلیں منشی عظمت اللہ خانصاحب ناز کو اور ایک غزل جناب جام صاحب شاعر دربار ٹونک کو بھی دکھائی ہے آپ کی باضابطہ شاعری کا آغاز اوائل ۱۳۴۲ھ سے ہوا جب آپ اپنے ماموں اور استاد اوّل حضرت عاشق ٹونکی کی رہبری میں حضرت علامہ مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہٗ کی خدمت میں جو حسن اتفاق سے اسوقت علامہ مولانا برکات احمد صاحب مرحوم کے مکان پر قیام پذیر تھے حاضر ہو کر باقاعدہ زانوئے ادب تہہ کیا اور حلقۂ شاگردی میں داخل ہو گئے جب سے آج تک ذریعۂ خط و کتابت اصلاح سخن کا سلسلہ جاری ہے۔

آپ کو اپنے محترم استاد سے انتہائی عقیدت ہے ہر وقت زبان پر مدح و ستائش کے نغمے ترشتے رہتے ہیں مثلاً ایک غزل میں آپ فرماتے ہیں:

> ہے صرف یہ تصرف سیماب نکتہ داں کا
> حاصل ہوا ہے جو کچھ مجھ کو شفیق سخن میں

ایک جگہ اور مدح سرائی کرتے ہوئے اپنی ایک نظم "سیماب" میں اپنی نسبت تلمذ پر فخر کیا ہے لکھتے ہیں:

> اسی قلزم معرفت آفریں کی ہوں اک میں بھی موج ترنم پیدا لہل
> مجھے ناز ہے اپنی خوش قسمتی پر بنایا مقدر نے مجھ کو سخندان
> ہو کیوں نکتہ چیں کوئی حیرت پہ میری وہ آئینہ ہے مری نظر میں نمایاں
> کہ مستقبل زندگی جس میں اپنا نظر صاف آتا ہے مجھ کو درخشاں

آپ مولانا موصوف کو عصر جدید کا مجدد اعظم اور مصلح شعر و ادب تصور کرتے ہیں۔ میر اور غالب کے بھی مداح اور ثنا خواں ہیں۔

آپکے متعلق قبلہ مولانا مدظلہٗ کا ارشاد ہے کہ میرے اسکول میں میرے رنگ کی جتنی صحیح تقلید شفق صاحب نے کی ہے وہ بہت کم لوگ کرسکے ہیں مجھ کو اُن کا مستقبل نہایت روشن اور درخشاں نظر آرہا ہے "

اسی طرح مولانا مدظلہٗ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۵ مئی ۱۹۳۶ء میں تحریر فرماتے ہیں "جس رنگ میں آپ غزل کہتے ہیں اس کے سمجھنے والے...... تو کیا ہندوستان میں بھی بہت کم ہیں یہ رنگِ تغزل کی حدود سے گذر کر حقیقت و فلسفہ کی حد تک پہونچتا ہے۔ آپ کی طبیعت اس میں پختہ کار ہوتی جاتی ہے تغزل محض میرے اسکول کا معیار نہیں کیا آپ میری غزلیں نہیں دیکھتے؟ آپ جذبات محبت اور احساساتِ انسانی کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں یہ غزلیں جب تعلیم یافتہ ادب نواز اور اعلیٰ سوسائیٹوں کے سامنے رکھی جائیں گی تو اُس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کا کیا درجہ ہے "

آپ آگرہ اسکول کے پرجوش پیرو اور صحیح معنوں میں تقلید کرنیوالے ہیں۔ آپکے یہاں معاملہ بندی کا میدان بہت تنگ ہے۔ حقیقت، فلسفہ، تصوف اور فطری مضامین ہر جگہ بکثرت ہیں اور یہی وہ امتیاز ہے جس نے آگرہ اسکول کو ملک کے دوسرے اسکولوں پر ممتاز کردیا ہے۔

آپ کا کلام رنگِ جدید کا اعلیٰ نمونہ ہے اور رنگِ قدیم سے بالکل بیگانہ طبیعت میں جدت اور خیالات میں ندرت و شگفتگی ہے اکثر نئے مضامین کی فکر میں مستغرق رہتے ہیں آپکے کلام میں خوبصورت تشبیہات اور استعارے، اچھوتے مضامین عبارت میں روانی اور چستی ہر جگہ موجود ہے کلام گہرا اور پرمعنی ہے۔ علم ادب سے فطری لگاؤ ہے اور زیادہ وقت درس و مطالعہ میں صرف ہوتا ہے آپ آجکل علوم مشرقیہ کی تحصیل میں مصروف ہیں اور اس کی جلد تکمیل کرنیوالے ہیں۔

آپ صرف شاعر یا ناظم ہی نہیں بلکہ نثر نگار بھی ہیں آپ نہایت آسانی سے بیساختہ اور مشکل سے مشکل مضامین پر قلم کو جنبش دے سکتے ہیں۔ نثر نگاری کا شوق آپکو زمانۂ تعلیم ہی سے ہے اس وقت بھی آپ کے مضامین اپنے ہم جماعتوں سے ہمیشہ ممتاز اور فائق رہتے تھے اور اس وقت کے کل مضامین کی یادگار بصورتِ کتاب موجود ہے۔ آپ حسب ذیل کتابوں کے مصنف ہیں۔

سبز پوشش (ناول)، گل پوشش (ناول)، ثریا (ناول) مجموعۂ مضامین مجموعۂ غزلیات۔ مجموعۂ نظمیات۔

نمونۂ تغزل

شامِ صحرا بن گئیں صبحِ گلستاں ہوگئیں — میری آہیں کتنی افسانوں کا عنواں ہوگئیں
تھی کبھی پرواز جنکی آشیاں در آشیاں — اب وہی آزادیاں پیغامِ زنداں ہوگئیں
تھیں جو کل تک کشتیِ امید کو تھامے ہوئے — رُخ بدلکر آج وہ موجیں بھی طوفاں ہوگئیں
عشق تو کرہی چکا تھا چاک پردہ ضبط کا — اُنکی نظریں بخیۂ جیبِ گریباں ہوگئیں
حسن برہم کا یہ عالم کس سے دیکھا جائیگا — آئینہ منگوا کے جو زلفیں پریشاں ہوگئیں

عشق کی میں جن فسانوں پر تھا کل تک خندہ زن
آج وہ میری ہی یارب داستاں کیوں ہوگئے
کیا مشیت ہے کسی تکمیل پر مصروفِ غور
لٹ لٹا کر پھر مرتب آشیاں کیوں ہوگئے
مٹنے والے کیوں نہ اُبھرے پھر نئے عنوان سے
پردہ ہائے آب و گِل میں رائیگاں کیوں ہوگئے
کرلیا شبنم سے فانی جان کر تونے گریز
پھول وجہ اعتبارِ گلستاں کیوں ہوگئے
یا نشاطِ روح بنتے یا سرورِ زندگی
تم مرے ذوقِ تمنا پر گراں کیوں ہوگئے

ہشیار ہو کے بیٹھے اب باغباں چمن میں — بجلی تڑپ رہی ہے پھولوں کے پیرہن میں
برقِ نگاہ بن کر آ میری انجمن میں — او جگمگانے والے جگنو کے پیرہن میں
خوفِ خزاں کبھی ہے ہر دم صیاد کا کبھی کھٹکا — آزاد ہو کے بیٹھے کیا کوئی اس چمن میں
بیدار ہی عمل کی جذبے ہیں پھر فسردہ — پھر گرمیاں بڑھا دی ہستی کی انجمن میں
جذبات کا وہ عالم اب بھی ہے یاد مجھ کو — جب جذب ہو رہے تھے دونوں کی انجمن میں
دیکھو آ کے پیارے پیاری تقدیس گوں نظارہ — جب صبح مسکرائے کاشانۂ چمن میں
اختلافِ رنگیں ہو گئی ہیں سب نظر کو — جو رنگ ہے چمن میں وہ بو ہے نسترن میں

منتیں کر کے خدا سے میں نے مانگا تھا سکوں — اب کوئی سبب بھی نہیں تسکین حاصل کیا کروں

نظامِ عاشقی کا جز دُکل ہی ان کی ہاتھوں میں — وہ جب چاہیں علاجِ خاطرِ بیمار ہو جائے
تصور کی مری باریکیوں پر نظر فرما — کہ میں تجھ کو نہ دیکھوں اور پھر دیدار ہو جائے
سکونِ دل کا آئینہ کبھی یوں دیکھ لیتا ہوں — شفق جیسے طرح کوئی خواب میں بیدار ہو جائے

اب بھی مری نگاہ میں ہے اعتبارِ حسن — میں لاکھ بدگماں سہی دل بدگماں نہیں

ازل بھی تھا مرے اک اضطراب کا پہلو — تجھے بھی یاد ہے کچھ کب سے بیقرار ہوں میں

ابھی افسانہ خواں تھا اور ابھی ہوں خود اک افسانہ
مرا عالم بھی گویا عالمِ خوابِ پریشاں تھا

قیودِ ہستی کی کشمکش سے فضائے آزاد میں نکل آ
یہیں سے تجھ کو نشاں ملیں گے حدودِ دنیا جاوداں کے

تمہارے غم میں جو ملتی ہیں لذتیں دل کو — وہ زندگی کے مزے عمر جاوداں میں نہیں

خود ہی تو سب رنگ بھر دیا تصویر میں — خود ہی پھر اپنی اداؤں پر فدا کیوں ہو گئے

تری جلوے ہی سے معمورِ عالم — ہمارا دیدۂ دل بھی تو وا ہو
وہی تاریخِ آغازِ طرب ہے — دورِ یاس جب حد سے سوا ہو
معاذ اللہ وہ اک لمحۂ یاس — چراغِ آرزو جب بجھ رہا ہو
مری امید ہو یا تیرا وعدہ — کوئی کیوں پھر دل کا آسرا ہو

اٹھا لائے اسیری میں یہی بھی خانہ ویرانی — قفس سے دور گلشن میں ہمارا آشیاں کیوں ہے
چمن ویراں، فضا برباد، نظمِ آشیاں برہم — خزاں آئی تو آئی انقلابِ گلستاں کیوں ہے
بہار آنے سے پہلی خود ہی کر لیں چاک پیراہن — جنوں کے ہاتھ سے دامن ہمارا دھجیاں کیوں ہے

مذاقِ دید کی بے تابیاں چھپا نہ سکا — ملا کے آنکھ میں ان سے نظر چرا نہ سکا
نگاہ میں تھی حقیقت نشاطِ عالم کی — ہنسی بھی آئی تو میں کھل کے مسکرا نہ سکا
جو ہم نہ تھے تو ہوس مند اور تھے لاکھوں — چراغِ بزمِ وفا کیوں کوئی جلا نہ سکا
تھے اعتبار کی دنیا میں اور بھی مرکز — تری سوا میں کسی پر یقین لا نہ سکا
میں اپنے ذوقِ طلب کو نہ کر سکا محدود — وہ میری حدِ تصور سے دور جا نہ سکا
ہے اعتراف مجھے اپنی کم نگاہی کا — مری نگاہ میں جلوہ ترا سما نہ سکا

زندگی اک واہمہ، دنیا فریبِ ناتمام — کیا یقینِ عالمِ خوابِ پریشاں کیجیے
یہ طریقہ بے کہ سب کچھ سنا دینے کا ہے — خامشی کو داستانِ دل کا عنواں کیجیے

مصیبت بھی فانی ہے راحت بھی فانی — نہ یہ جاودانی، نہ وہ جاودانی
سرور آنکھ میں قلب میں شادمانی — جوانی کی راتیں ہیں کتنی سہانی
ہیں ہم بلبلِ بوستانِ محبت — ہو تم غنچۂ نو بہارِ جوانی
جو دیکھا تو نکلے تمہارے ہی جلوے — چمن کا شباب آرزو کی جوانی

نظر بہکی بہکی ادا بہکی بہکی — بہاروں پہ ہے بوستانِ جوانی
نہ جینے کی فرصت نہ مرنے کی مہلت — یہ ہے زندگی بھی کوئی زندگانی
کہیں روح بنکر نہ اڑ جائے عالم — شبِ ماہ میں ہے غزل خواں جوانی
کہیں گل بداماں کہیں خار در بر — عجب شے ہے اے حسن تیری جوانی
محیطِ جہاں تھا کبھی حسن میرا — فلک نے تو دیکھی ہے میری جوانی

نمونۂ نظم

"جگنو"

پردۂ ظلمت سے نکلا جگنوؤں کا کارواں — بہرِ گلگشتِ فضائے تیرہ و تارِ گلستاں
دامنِ صحرا پہ برسا سبزہ زاروں سے اٹھا — ساحلِ دریا پہ پہونچا آبشاروں سے اٹھا
کاروانِ ضو فشاں، آوارۂ شامِ چمن — ایک موجِ برق رقصاں، اک پریدہ انجمن
کائناتِ آتشیں، معمورۂ حسن و ظہور — ایک سیلابِ ضیا، اک کاروانِ رنگ و بو
پھر رہا ہے ہر طرف انوار برساتا ہوا — روشنی سے دامنِ ظلمت کو چمکاتا ہوا
مشعلِ شب تاب بنکر مسکراتا ہے کہیں — رنگ و بو کی انجمن میں جگمگاتا ہے کہیں
تابشوں سے یوں منور ہو رہے ہیں باغ و راغ — ہو فضا میں منتشر جس طرح لعلِ شب چراغ
اڑ گیا سوئے چمن کوئی نئی تابش لئے — قمقمے سے لالہ و گل میں فروزاں کر دئے
کیاریوں سے کوئی برساتا ہوا نکلا شرار — کوئی چمکاتا ہوا آیا کنارِ رہگذار
کوئی معروفِ خرام دامنِ ساحل ہوا — کوئی رخشندہ چراغِ جادۂ منزل ہوا
دی نگاہوں کو کسی نے دعوتِ نور و ضیا — لعل آسا وادیوں میں کوئی جا کر بجھ گیا

آسماں تاروں سے دنیا جگنوؤں سے نور بار

اے بصیرت دینے والے تیری قدرت پہ نثار

نمونۂ نثر

شاعر اور سیرِ شبِ ماہ دریائے باناس میں

موسم کی لطافتوں نے دعوتِ کیف دی اور شاعر ہمہ شوق و آرزو بن کر اپنے کاشانے سے دریا کی سر دریتی کا چاندنی میں لطف اٹھانے کیلئے روانہ ہو گیا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ تاریکیوں کا وحشت ناک سیلاب شفق کے گلریز و گلبار جلووں کو اپنی آغوش میں پناہ دیتا ہوا سوادِ مغرب سے نمودار ہو گیا۔ شاعر اپنے والہانہ انداز میں عشق و محبت کے نغمے گاتا ہوا ساحلِ دریا پہ پہونچا ہو لئے ساحل نے استقبال کیا اور اپنی جنت آثری میں جذب کر لیا۔

کائنات پہ تاریکی کے موٹے غلاف پڑے ہوئے تھے لیکن شاعر اپنی عرفانِ نفسی سے تاریکیوں کو روشنی میں تبدیل کر دینا چاہتا تھا، یکایک سطحِ مشرق پہ ایک نور کا سمندر لہرایا اور مہتاب اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کھیلتا ہوا طلوع ہو گیا۔ دریا کی وسیع اور بسیط پہنائیاں بقعۂ نور بن گئیں اور ہر ذرہ اپنی جگہ ایک آفتاب نظر آنے لگا۔ دریا کی وسعتوں پر کشمیر اور شملہ کی خوشگوار ہوائیں خنکی برسانے لگیں۔ یہ وہ وقت ہے جس کو دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ فطرت کا حسن اپنے مکمل شباب اور پوری تابانیوں کے ساتھ روح کی انتہائی گہرائیوں میں جذب ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عروسِ فطرت نے اپنی تمام بہاروں کی روح کھینچ کر مہتاب کے نور آفریں پیکر میں محض اس لئے بے حجاب کر دی ہے کہ اس سے دریائے باناس کے شاداب اور خنک راتیں تجلی و منور کی جائیں۔ مہتاب کی کرنیں براہِ راست ذروں کے سینے چیرتی ہوئی مائل پرواز نظر آتی ہیں اور بعض وقت ایسا دھوکا ہو جاتا ہے کہ زمیں سے آسماں تک بے شمار نورانی جھولے پڑے ہیں۔ یا دوشیزگانِ حسن و شباب اپنے جمال و نور میں نہا رہی ہیں۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے

موجِ کر خدمت ہے لہرا کر دنیا سمیٹ جاتی ہے کہ ماحول اپنی دلکشائیوں سمیت روحانی لطافتوں میں تحلیل ہو جائے گا۔
ہوا کے لطیف ارتعاش سے موجوں کا مرمریں تموّج کرنوں کا مترنم وجد و وجد بتر ترنم سے مسکراتی ہوئی کائنات کا نغمہ بار ہونا۔ تاروں بھرے آسمان کا ہر موج کے سینہ پہ کنول بن کر تھرتھرانا شاعرِ فطرت کا کنارِ آب بیٹھ کر
"رود باناس میں سیرِ شبِ ماہ"

ہر ایک رنگ و نور اور لا فانی نظر کتنا ایک ایسا ڈبھونے والا نظارہ ہے۔ جس کی تڑپ روح میں ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔

(۴۸) شمیم — سید محمد ولایت علی صاحب قادری اکبرآبادی

شمیم صاحب کے مورثِ اعلیٰ سہارنپور کے ایک سادات خاندان کے فرد تھے جس میں اکثر مجذوب و سالک ہستیاں گذری ہیں شمیم صاحب کے دادا صاحب اپنے والدین کے سامنے انتقال فرما گئے۔ اسی لئے شمیم صاحب کے والد محروم الارث قرار دے گئے۔ دراصل وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے اور دنیا میں ان کے لئے کوئی سامانِ جاذبیت نہ تھا جس وقت والد صاحب کا انتقال ہوا شمیم صاحب کمسن تھے۔ نانا صاحب کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی۔ آپ کے دادا کا اسم مبارک میر مراد علی اور جدِ امجد کا اسم گرامی میر لطف علی شاہ تھا جو لوہا منڈی آگرہ میں رہتے تھے جہاں اب بھی ایک مندر کے قریب ان کے مزارات موجود ہیں۔ لطف علی شاہ صاحب کی تعمیر کردہ ایک مسجد بھی لوہا منڈی آگرہ میں ابتک موجود ہے۔

شمیم صاحب نے نازو نعم میں پرورش پائی فارسی و عربی کی تعلیم اعزا کی نگرانی میں ہوئی۔ ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہی نانا اور ماموں کا بھی انتقال ہو گیا یہاں تک کہ آپ کی والدہ صاحبہ بھی دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔ شمیم صاحب کی اولاد کی تعداد ۴ ہے جن میں سے کئی کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے محمد شجاعت علی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں کلرک ہیں۔ عرصہ دراز سے شمیم صاحب گورنمنٹ انڈیا پریس دہلی میں ملازم ہیں۔

آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہ، کے قدیم ترین تلامذہ میں سے ہیں سنہ ۱۹۱۸ء میں آپ نے زانوئے ادب تہ کیا آج سے ۱۵ سال قبل آپ شعر کہتے تھے۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ لیکن اب وہ ذوق نہیں رہا۔ شمیم صاحب ایک قدیم طرز کے بزرگ ہیں نہایت مخلص اور شریف طینت، خاندان قادریہ میں بیعت ہیں۔

آپ کی شاعری کو ہمیں اسی دورِ قدیم میں لے جا کر دیکھنا چاہئے جس میں معاملہ بندی اور اسلوبِ بیان کی شوخی پائی جاتی تھی۔ آپ کے اشعار میں سادگی، اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اشعار سے کہنہ مشقی ٹپکتی ہے۔ گوشہ نشین اور باوضع ہستیوں میں سے ہیں۔

نمونۂ تغزل

کیوں نہ بھجواؤں خطِ شوق اسی کی خاطر　　کہ صبا سے یہ مرا پیکِ خیال اچھا ہے
جس پہ شیدا ہو زلیخا وہ تجلی اچھی　　یا جو پیارا ہو خدا کو وہ جمال اچھا ہے

کس طرح مدعا ہو ہم آغوش اے شمیم　　رہتا ہے دردو دور اثر میری آہ سی

مری خزاں میں بھی اک عالمِ بہار رہا　　ہر ایک داغِ جگر رشکِ لالہ زار رہا
ہماری جرم سے بڑھ بڑھ گیا کرم تیرا　　وہ بے حساب رہی اور یہ بیشمار رہا
نہ کام دین کا اس سے ہوا نہ دنیا کا
تمام عمر بتوں میں شمیم خوار رہا

رازِ دل کس کو سناؤں رازداں کوئی نہیں
ہجر کی شب واقفِ دردِ نہاں کوئی نہیں
جوہرِ ذہنِ رسا کس کو دکھائیں اے شمیم
آہ فنِ شاعری کا قدرداں کوئی نہیں

صبحِ امید کہوں یا سحرِ عید کہوں　　آپ کے روئے منور پہ گماں کیا کیا ہے

شوق — مولوی محمد مشتاق صاحب چاندپوری (۳۹)

آپ کا نام محمد مشتاق اور شوق تخلص ہے۔ آپ کا وطن چاندپور ضلع بجنور اور مولد محلہ مولویان ریاست ٹونک ہے۔ آپ ۱۵ر دسمبر ۱۸۶۲ء شب دوشنبہ کو پیدا ہوئے آبا و اجداد کابل سے وارد ہندوستان ہوئے اور خاندانِ مغلیہ میں شاہی فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے جد امجد مولوی محمد عبدالرحیم صاحب رسالدار تھے ۱۸۵۷ء کے غدر میں جہاں دوسرے خاندان بے سروسامان ہوئے وہاں آپ کا خاندان بھی اس دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ آپ کا خاندان، علم و فضل اور ذاتی وجاہت و شان کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ چنانچہ آپ کے دادا جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب مرحوم یوپی کے مشہور عالم گذرے ہیں۔ اُن کے کتب خانہ میں پانچ ہزار کتب عربی و فارسی موجود تھیں جو غدر میں برباد ہو گئیں پھر بھی تھوڑا بہت ذخیرہ اب تک باقی ہے۔ اُس میں سے زیادہ حصّہ دیمک کی نذر ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نہ صرف ایک اعلیٰ جنگی افسر ہی تھے بلکہ ایک صاحبِ کمال عالم اور شاعر بھی تھے۔ حضرت ذوق اور حضرت غالب کے دوش بدوش سیکڑوں مشاعرے پڑھے تھے۔ افسوس کہ آپ کا مکمل کلام اس وقت موجود نہیں۔ آپ کی غزلیں نغمۂ بہار۔ گلدستۂ ناز ابرِ سخن۔ خنجرِ عشق وغیرہ رسائل میں شائع ہوتی رہتی تھیں جو ۱۸۸۵-۸۶ عیسوی میں لکھنؤ بمبئی اور امرتسر وغیرہ سے نکلتے تھے۔ میں چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں۔ مولوی صاحب موصوف کی زبان ٹکسالی ہے۔ آپ فصیح تخلص فرماتے تھے۔

نہ بر آئی تمنائے دلی کی جستجو برسوں دلِ مایوس سے روئی لپٹ کر آرزو برسوں

جب دل سے نامِ پاکِ محمدؐ نکل گیا انسان گرتے گرتے زمیں پر سنبھل گیا

کیا بادہ کشی کا ہو مزا بزم میں ساقی شیشہ ہو کسی غیر کا پیمانہ کسی کا

آپ نے حضرت جلال۔ حضرت امیر احمد مینائی حضرت امیر استاد حضرت امیر مینائی کے ساتھ ایک مشاعرہ میں جو غزل پڑھی تھی اُس کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔

آتا نظر ہے رنگِ فلک کا جو نیلگوں سایہ پڑا ہے یہ مری بختِ سیاہ کا

حضرت فصیح کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے صاحبزادے کا نام محمد عبدالرزاق صاحب تھا اور چھوٹے صاحبزادے کا نام محمد عبدالعزیز ہے جو بقید حیات ہیں۔ شوق صاحب جناب عبدالرزاق صاحب مرحوم و مغفور کی ساتویں اولاد ہیں عبدالرزاق صاحب کا وصال ۱۵ر رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ کو یوم یکشنبہ بوقت بارہ بجے دن ہوا تھا۔ وصال سے چند سال پہلے زہد و تقدس کا یہ حال تھا کہ مرحوم ۲۰ گھنٹے عبادت فرماتے تھے۔ ایک گھنٹہ دن میں اور شب کو ۱۱ بجے سے ایک بجے تک آرام فرماتے تھے اور صرف ایک گھنٹہ ضروریات زندگی کے لئے رکھا تھا۔ آپ کا خط نہایت پاکیزہ تھا حسنِ سیرت کے ساتھ ساتھ حُسنِ صورت بھی بے مثال تھا مرحوم ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے سخن تخلص فرماتے تھے۔ آپ کی تحریر عالمانہ اور تقریر دلکش ہوتی تھی۔ آپ کی معلومات اور وسعت نظری کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ژہنگ ضلع پنجاب میں عرصہ تک سرکاری ملازم رہے۔ تحصیلداری نہ ملنے کے ملال سے ریاست ٹونک پہونچے منصرم ترتیب ہوئے پیشکار رہے۔ منیجر کورٹ آف وارڈس مقرر کئے گئے آخر ناظم پرگنہ علی گڈھ در ریاست ٹونک، کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ تمام عمر موصوف نے رشوت کی ایک پائی نہ لی۔ لاکھوں روپئے سے گریز فرمایا۔ آپ ٹونک میں بہت زیادہ مشہور تھے۔ اعلیٰ حضرت نواب سر محمد ابراہیم علی خاں مرحوم و مغفور خلد آشیاں کا آپ پر خاص کرم تھا تیس سال تک اسی ریاست میں بسر کئے۔ ریاست آپکو بہترین منشی اور ایک اعلیٰ پایہ کا صاحب علم و کمال سمجھتی تھی۔ ذوقِ شعری فطری تھا۔ بہت سے مشاعرے پڑھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے

وہ جو یاد آیا گیسو کا تو آلودہ ہے طوفاں　　دلِ وحشی کو سدا کوں یا غبروں چشمِ تر تیری

از بے خبری خبر نہ داری　　رازے کہ درونِ سینہ دارم
در معصیت از ہمہ بزرگم　　نازاست کہ مثلِ خود نہ دارم
مقبول اگر کنی سخن را　　در مجمعِ حشر سر بر آرم

بعد ایک عمر کل ہوئے راضی، مگر پھر آج　　روٹھے ہیں اس پہ وہ کہ ہمیں کیوں منالیا

ایک عالم ہے کہ بن دیکھے ہی شیدا تیرا　　ورنہ بتلائے کوئی کس نے تجھے دیکھ لیا

غمِ فرقت کا ہے یہ سارا ہجوم　　وصل ہے اور اشک باری ہے

شوق صاحب نے پہلے گھر پر قرآن شریف ختم کیا۔ اور اردو فارسی کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ آپ نے بہت جلد ابتدائی مراحل طے کر لئے اور انگریزی اسکول میں داخل ہو گئے ۱۹۱۸ء میں انٹرینس کا امتحان پاس کیا ۱۹۲۰ء میں سی۔ ٹی (C. T.) کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں منشی کا امتحان پاس کیا ۱۹۳۳ء میں کامل اور اسی سال اردو اعلیٰ قابلیت کے امتحانات بھی خصوصی امتیازات کیساتھ پاس کئے۔ ۱۹۳۴ء میں آپ نے فزیکل ٹریننگ کے امتحان کی تیاری کی اور وہاں سے بہت ہی اچھے سارٹیفکٹ حاصل کئے غرض چند ہی سال کے عرصہ میں آپ علمی۔ ادبی اور جسمانی نشو و نما سے فائز ہو گئے۔ آپ کی صحت ماشا اللہ نہایت اچھی ہے۔ دراز قد۔ خدو خال سے وجاہت اور تدبر برستا ہے۔ آپ ہر موسم میں صبح چار اور پانچ بجے کے درمیان غسل فرماتے ہیں۔ آپ مذہب کے شیدائی اور صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند ہیں۔ آپ کا قول ہے کہ وہ شخص بدبخت ہے جو اپنے مذہب کا پابند نہیں آپ خدائے واحد کے ساتھ ہر حال میں رضامند رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

آپ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو دارین کی کامیابی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آپ کا ایمان ہے کہ کوئی کسی کو نقصان نہیں پہونچا سکتا ہر شخص اپنے عمل کا شکار ہوتا ہے۔ آپ فرائض کی پابندی اور افسر کی اطاعت کو حسب ایمائے حدیث نصف سلوک خیال فرماتے ہیں۔

آپ ۱۶ ستمبر ۱۹۲۶ء کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں بعہدۂ اسسٹنٹ ماسٹر فائز ہوئے۔ جولائی ۱۹۲۸ء سے جناب خانصاحب امین الدین حیدر صاحب رئیس شیخوپور کی نگاہِ کرم نے آپ کو نوازا اور آپ ہیڈ اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں میں چلے گئے اور جون ۱۹۲۹ء تک کا زمانہ وہیں گذارا۔ ۲ جولائی ۱۹۲۹ء سے جناب مولوی سعید احمد صاحب مارہروی کی نگاہِ بزرگانہ نے التفات فرمایا اور آپ شعیب محمدیہ ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ماسٹر اور گیمس سکرٹیری مقرر ہوئے ماسٹر صاحب نے مولوی سعید احمد صاحب منیجر اسکول ہذ کی رہنمائی اور سرپرستی میں زندگی کی بہت سی نعمتیں مثلاً اخلاق و عادات وغیرہ حاصل کیں۔ آپ ہمیشہ مولوی صاحب موصوف کی ترقی اقبال اور صحت و عافیت کیلئے داعی رہتے ہیں۔

ماسٹر صاحب وراثتاً اور فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں ۱۹۲۲ء میں آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے شاگرد ہوئے۔ آپ کو بچپن میں چار امرا نے گود لینا چاہا۔ جن میں سے دو صاحبِ حیثیت اور رئیس تھے۔ ایک جید عالم اور صاحبِ کمال بزرگ تھے۔ ان کی علاوہ مولانا محمد علی شاہ صاحب کمبل پوش مرحوم و مغفور نے بھی آپ کو مرید کرنا چاہا لیکن آپ رضامند نہ ہوئے آپ سچے عقیدت مند حضرت مولانا عباد اللہ صاحب مرحوم کے ہیں جو ٹونک میں مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔

شوق صاحب انتہائی زود گو ہیں ایک گھنٹہ میں تین تسلسل شعر کی نہایت اچھی غزل کہہ لیتے ہیں۔ دماغ بہت اچھا پایا ہے۔ غزل میں درد کا تصوف میر کی سادگی اور غالب کا فلسفہ ہوتا ہے۔ آپ نہ صرف ناظم ہی ہیں بلکہ ایک بہترین ناثر بھی ہیں۔ تقریر میں خاص ملکہ ہے خیالات اور الفاظ

کا تسلسل آپ کے یہاں بطورِ خاص پایا جاتا ہے۔

۱۹۳۱ء سے آپ سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ کے صدر ہیں۔ آپ پہلے مشتاق تخلص فرماتے تھے۔ حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کے فرمانے سے ۔ فروری ۱۹۳۵ء کو سینٹ جانس کالج آگرہ کے ایک مشاعرہ میں یہ رباعی پڑھ کر آپ نے اپنا تخلص بدل دیا۔

فطرت سے ہوا جو کام مافوق ہوا — باطل کسی صورت نہ مرا ذوق ہوا
حاصل ہوا ارتقائے ذہنی آخر — مشتاق تھا پہلے اور اب شوقؔ ہوا

جو اضافے حسن میں اُن کے ہوئے — وہ مرے جذبات بن کر رہ گئے

میں زمانے بھر کو سمجھا اور نہ سمجھا آپ کو — ایک اپنا ہی سمجھنا تھا بہت مشکل مجھے
دل کا مصرف اور تو اسکے سوا کچھ بھی نہیں — اُس نے اپنے ہی لئے شاید دیا تھا دل مجھے

میں کہاں سے لاؤں اتنے دل کہ ہر ذرہ کو دوں — وہ اگر چاہیں تو ہر ذرہ سے دل پیدا کریں

جس رنگ میں ہو حسن محبت کیلئے ہے — کافر ہے جو سمجھے کہ عداوت کیلئے ہے
ناکامِ محبت ہو کہ بدنامِ محبت — جو کچھ بھی ہو انسان محبت کیلئے ہے

کیا پوچھتے ہو نسبت میری کہاں کہاں ہے — کچھ واسطہ یہاں ہے کچھ واسطہ وہاں ہے
مرنا ہے میرا جینا جینا ہی میرا مرنا — یہ بھی مرا مکاں ہے وہ بھی مرا مکاں ہے

پھر تمہاری یاد میں برباد ہونا ہے مجھے — پھر تمہاری یاد میں برباد ہونا چاہیے
ہیں جہاں میں باعثِ تخلیق تو بربادیاں — مجھ کو بننے کے لئے برباد ہونا چاہیے

ابھی کیا ہے ابھی تو رازِ الفت دل میں پنہاں ہے — ابھی تو آرزو اپنے ہی گھر معلوم ہوتی ہے
مرا ہی دل ہو شاید کائناتِ حسن کی قیمت — مرے دل پر حسینوں کی نظر معلوم ہوتی ہے

دلِ خراب کو اک آپ ہی پسند آئے — اگرچہ آپ کے قابل دلِ خراب نہیں

سکونِ دردِ دلِ اہلِ محبت کو مصیبت ہے — یہاں مرنے سے پہلے موت کی آئینگی دعوت ہے
مریضِ غم کے مرنے اور جینے کی یہ صورت ہے — وہ آجائیں تو زندہ ہے چلے جائیں تو رخصت ہے

قطعہ

جو کچھ نظر آتا ہے، افسانہ ہے افسانہ — یکسر یہ تری دنیا بیگانہ ہے بیگانہ
تو اہلِ زمانہ سے ہے طالبِ ہمدردی — سودائی ہے سودائی دیوانہ ہے دیوانہ

نمونۂ نظم

"حسنِ مغموم"

خاک آلودہ کوئی تصویر جب آئی نظر — یا خفا مجھ سے مری تقدیر جب آئی نظر
خوابِ غفلت کی بری تعبیر جب آئی نظر — یا گناہِ عشق میں تقصیر جب آئی نظر
حسن کے مغموم ہونیکا گماں مجھ کو ہوا
امتحانِ خاطرِ ناشادماں مجھ کو ہوا

نالہ پھر چھیڑا کسی نے کیا کوئی اندوہگیں — پھر مقابل آسماں کے کیا ہوئی کوئی زمیں
پھر کسی نے کھینچ لی کیا اسکی نازک آستیں — یا نظر آیا اسے پھیکا کوئی ذوقِ جبیں
رنگِ نورانی مری نظروں میں کیوں افسردہ ہے
حسن پژمردہ نہیں میری نظر پژمردہ ہے

کیا کسی مرغِ چمن نے اسکو چھیڑا ہے کہیں — کیا کسی بے صبر کا شکوہ ہوا اسکے دلنشیں
آہ پیرا ہو گیا ہے کیا کوئی قلبِ حزیں — کیا کسی کی کہہ گئی ہے کچھ نگاہِ واپسیں
کس سے آخر پوچھیئے یہ حسن کیوں مغموم ہے
راحتِ قلبِ حزیں ہو یہ تو اور معلوم ہے

نمونۂ نثر

زندگی کے دو پہلو

غرض یہ ہے کہ ترتیب ہستی جو کچھ بھی ہو اور کائنات کی کائنات جو چاہے سمجھے مگر زندگی جو نفس کی آمد و شد پر منحصر ہے۔ زندگی جو موت کا شکار ہے۔ زندگی جو حوادث ارضی و سماوی کا تختۂ مشق۔ زندگی جو درد سر کا اضطراب زندگی جو اختلاج قلب کی تڑپ۔ زندگی جو نوک خار کا نشتر۔ زندگی جو سرد جھونکے کی غلام۔ زندگی جو دنیاوی عداوت بغض کینہ کی نمایاں صورت۔ زندگی جو عیش کا اضطراب اور اضطراب کا عیش۔ زندگی جو صدمول کا شکار۔ اعزا کی مفارقت کا نمونہ۔ احباب اور مخالفین کی تسکین۔ کشمکش کی گرم بازاری۔ دشمنی کا انجام۔ پیکر خاکی کی مٹ جانیوالی مورت۔ زندگی جو کسی بے وفا کی جفا، وفا کی لہر۔ اسلامی قبرستان۔ گنگا کے پھول۔ سیاہی شہر خموشاں۔ موت کے فرشتہ کی غذا۔ دوزخ کا ایندھن۔ دشمن کی نگاہ کا کانٹا۔ مصائب کا گھر۔ لڑکپن کی طفلانہ حرکتیں۔ جوانی کی امنگیں۔ بڑھاپے کی سسکیاں۔ جسم کی چاردیواری کی قیدی۔ بہروپیے کا سوانگ۔ الزاموں کا روزنامچہ۔ سینہ زوری کی کوفت مایوسیوں کا ماتم کدہ۔ پردۂ روح۔ روح لطیف کا زندان۔ مقدمۂ قیامت۔ میدان حشر کی روئداد۔ ...... ایک جادو بھری نگاہ کی غلامی۔ مزدوروں پر ستم۔ بزرگوں کی دل آزاری۔ دوسروں کے حقوق کی پائمالی۔ متعلقین کی خاطر شکنی۔ دل کی دعا۔ روح کا آزار۔ جسم پر جور۔ محبت کا بیجا مصرف۔ عشق کے نام پر بھینٹ۔ حسن کے معنی فہمی کی غلطی .... ہے۔

دوسرا پہلو

زندگی جس کے باب میں میں نے اسقدر دشمنانہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مالک حقیقی کا جداگانہ پرتو۔ کاریگر اعلیٰ کی صنعت کی جان۔ حاکم کامل کی خبر۔ بندگان خدا کی ہمدردی کا باب۔ قندیل عرش کی روشنی۔ خاکدان تیرہ کا چراغ۔ گل کا تبسم بلبل کا ترانہ۔ روح کی جولانیوں کا میدان۔ جنت میں عمارت بنانیکا آلہ۔ یار کے وصل کی تدبیر۔ مشیت ایزدی کی جھلک۔ عبادت کا باغ۔ مراد دل کا چراغ۔ مراتب کی تفریق۔ نبیوں کی رفتار کا نمونہ۔ دوست کو حبیب اور دشمن کو دوست بنانیکا تقاضہ۔ خاکدان خاکی سے آزادی حاصل کرنیکا موقع۔ پروردگار حقیقی کے کن فیکون کی شان۔ مظہر کائنات۔ موجودات عالم۔ کائنات زمین و آسمان کا سبب۔ بڑوں کی اطاعت۔ برابر والوں کا مقابلہ چھوٹے سے پیار کرنیکا تقاضہ۔ اور اپنا سا بنانیکا فرض منصبی۔ عکس لطیف کائنات۔ معراج کی رات۔ طور کا جلوہ۔ انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ کی آیت مکہ کی تقدیس۔ بیت المقدس کی عظمت۔ شام کا رنگ۔ صبح کا نور۔ پریاگ کی روح۔ کاشی کی جان۔ ہردوار کی پرستش۔ بغداد کی روشنی۔ اجمیر کی ضیاء حسن یوسفؑ۔ شکوہ سلیمانؑ۔ صبر ایوبؑ۔ گریۂ یعقوبؑ۔ اقبال نادر۔ سلطنت سکندر۔ کرشن کی بانسری۔ زور رستم۔ ارجن کی تیراندازی۔ حضرت عمرؓ کا انصاف حضرت ابوبکرؓ کا صدق۔ حضرت عثمانؓ کی عفت۔ حضرت علیؓ کی شجاعت۔ حضرت خالدؓ کی ہیبت، حضرت عیسیٰؑ کا کفارہ، حضرت موسیٰؑ کا جلال۔ نبی معظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت .... ہے۔

ماسٹر مشتاق احمد صاحب شوق چاندپوری کی غزل پر

حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

وہی الفت کبھی ~~جو دل بنکے دلمیں آن بیٹھی~~ (درد دیگر معلوم ہوکر آ بیٹھی) ۔ وہی اب دردِ دل کی چارہ گر معلوم ہوتی ہے

~~نہیں ہیں ہے ...~~ (سراپا درد بنکر رہ گیا ہوں میں محبت میں) ۔ کہوں کیا میں سی دلمیں کدھر معلوم ہوتی ہے

جہاں دیکھو وہاں رونا ہی رونا آبرو کھونا ۔ مری دشمن مری خود چشم تر معلوم ہوتی ہے

جگر میں دلمیں سینہ میں رگ و پے میں رگ جاں میں ۔ محبت ہی ~~کے اپنا~~ (خالق کیف و) اثر معلوم ہوتی ہے

مرا ہی دل ہی شاید کائناتِ حسن کی قیمت ۔ مری دل پر حسینوں کی نظر معلوم ہوتی ہے

ابھی کیا ہے ابھی تو رازِ الفت دلمیں پنہاں ہے ۔ ابھی تو آرزو اپنے ہی گھر معلوم ہوتی ہے

گگی پر شوق ~~کے بھر شوق سے خنجر چلا دیجے~~ (آخر چھری کیوں رکھ نہیں دیتے) ۔ اگر مرنے ہی پر قدرِ بشر معلوم ہوتی ہے

شفق — مسٹر کرتار ناتھ صحرائی سیالکوٹی — ۵۰

آپ کا نام کرتار ناتھ اور تخلص شفق صحرائی ہے۔ آپکے والد گرامی کا نام لالہ نند لال ہے اور آپ ایک معزز و متوسط الحال خاندان سے وابستہ ہیں۔ وطن شہر سیالکوٹ (پنجاب) ہے عمر تقریباً تیس ۳۰ سال ہے۔ اردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ متعدد غیر ملکی زبانوں میں کافی دسترس رکھتے ہیں۔ آپ پنجاب یونیورسٹی کے انڈر گریجویٹ ہیں۔ علاوہ آجکل آپ اسپورٹس کی ایک مشہور عالم فرم میں بطور اسسٹنٹ منیجر ملازم ہیں۔

آپ کو شاعری کا ذوق اپنے والدِ محترم سے ورثہ میں ملا ہے جو ہندی زبان کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ کالج کے زمانہ میں آپ کے دل میں ذوقِ شعریت بیدار ہوا۔ اور مضمون نگاری کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ ذہن رسا نے ساتھ دیا اور آپ آسانی کیساتھ شعر کہنے لگے۔ ابتدا میں متعدد حضرات نے آپ کی حوصلہ افزائی کی جو مشقِ سخن کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی اور اس اثنا میں آپ نے اپنے ذوق کی ابتدائی منزلوں کو نہایت آسانی کیساتھ طے کر لیا۔ ۱۹۲۷ء میں آپ باقاعدہ افصح الملک علامہ مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے اور علامۂ موصوف کی اصلاح اور مفید مشوروں سے آپ کا کلام تھوڑے ہی عرصہ میں چمک اٹھا، اب آپ بے تکان شعر کہہ لیتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

غزل کیساتھ ساتھ نظم کی طرف بھی آپ کی طبیعت مائل ہے موجودہ دور کی جدید شاعری کے اصولوں پر آپ نے اکثر صوفیانہ اور سیاسی نظمیں لکھی ہیں۔ آج کل ہندوستان کے موجودہ مصائب کو دیکھتے ہوئے آپ کا رجحان طبع سیاسی نظموں کی طرف زیادہ ہے۔ آپ متعدد جرائد اور ہفتہ وار اخبارات کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں آپ روزنامۂ "طاقت" کے ایڈیٹوریل سٹاف میں بطور مدیر معاون شامل تھے۔ آپ کے رفقا نے جن شاندار الفاظ میں آپ کا خیر مقدم کیا تھا وہ حسب ذیل ہیں۔

"ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے محترم دوست مسٹر کرتار ناتھ صاحب شفق صحرائی نے ہماری قلمی معاونت کا وعدہ فرمایا ہے شفق صاحب ادب اردو سے جو دلچسپی رکھتے ہیں، اہالیانِ سیالکوٹ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ شہر کے علم دوست حلقوں میں آپ ایک خاص شہرت کے مالک ہیں، آپ بہترین ادیب ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں، امید ہے کہ آپ کا تعاون ہماری کامیابی کا باعث ہوگا۔" اس سلسلہ میں آپ تقریباً دو سال تک مدیر معاون کے فرائض بجا لاتے رہے۔

آپ اردو اور انگریزی لٹریچر میں شیلے، کیٹس اور بائرن کے علاوہ ڈاکٹر ٹیگور اور قاضی نذر اسلام آف بنگال کے زیادہ مداح ہیں اور اپنے تئیں "باغی شاعر" کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اردو کے علاوہ انگریزی میں متعدد نظمیں کہی ہیں انگریزی زبان میں آپ پروفیسر (Wayland J. Berry) ویلنڈ جے بیری آف برمنگھم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، آپ کی نظمیں ماڈرن ریویو اور "Peace" میں نہایت دلچسپی سے مطالعہ کی جاتی ہیں۔

مس ایلن سینٹ کلیر نووالڈ المعروف مس سوشیلہ دیوی ایک امریکن نژاد خاتون اُن کے ایک خط کے جواب میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

Dear Brother "Shafaq"
Greetings of love & peace. Please forgive my long delay in answering your kind letter & take the first opportunity to thank you for it

with all my heart & also for the lovely little poem. We shall try to publish it soon, so you may be watching it in the "Peace". May God bless you with further beautiful thoughts to give out to others — as the lovely thoughts are the flowers of spirit to perfume this world.

Swamijee also sends his love & blessings.

Your sister in the Lord's who ever wishes your bliss.

(Sd.) Sushila Devi

سناتن دھرمی علاقوں میں آپ "فدائے کنیا" شفق گیتائی کے نام سے پکارے جاتے ہیں، مذہباً آپ سوامی رام تیرتھ انجہانی کے ویدانت فلسفہ کے پیرو ہیں، آپ ایک نہایت شریف الطبع، صلح کل مرنجان مرنج طبیعت کے انسان واقع ہوئے ہیں۔ آپ سنجیدہ مزاج، شگفتہ فطرت، اور آتش نوا شاعر ہیں۔ شفق صاحب کے کلام میں آگرہ اسکول کی شان نمایاں ہے۔ قبلۂ عالم حضرت مولانا مدظلہ کے انتہائی عقیدت کیشوں میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں

مشہور ہم جو ہند میں اہل قلم ہوئے
سب فیض ہے یہ حضرت سیماب کا شفق

شفق صاحب کی شاعری وہی شاعری ہے جس کی ملک کو آج کل ضرورت ہے۔ وہ حضرت مولانا سیماب اور ڈاکٹر سر اقبال کے صحیح پیرو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی شاعری سے ملک کی تقدیریں بدلی جا سکتی ہیں اور ایک ایسا ہیجان پیدا کیا جا سکتا ہے جو ابدی ہو۔

نمونۂ تغزل

بتوں کو پوجنے والے بھی کیا کیا دیکھ لیتے ہیں
انہیں میں جلوۂ حسنِ کنہیا دیکھ لیتے ہیں

نگاہوں میں تڑپ جاتی ہیں جلوے طور سینا کے
تصور میں تجھے جب جلوہ آرا دیکھ لیتے ہیں

بہت بے چین ہو جاتا ہے جب دل تیری فرقت میں
فلک کو ہم بہ اندازِ تمنا دیکھ لیتے ہیں

تصور میں پہنچ جاتے ہیں اکثر حدِ منزل تک
ہم اپنا قافلہ صحرا بصحرا دیکھ لیتے ہیں

شرابِ ناب کی جن سے کبھی ملتی تھی پیمانے
انہیں ہاتھوں سے اب خونِ تمنا دیکھ لیتے ہیں

نہ پہلی سی کشش اس میں نہ اگلے سے شفق منظر
مگر پھر بھی تماشہ گاہِ دنیا دیکھ لیتے ہیں

وہ پیکرِ جمال رہے کیا حجاب میں
جوبن دیکا ہے شعلۂ طور اضطراب میں

حسرت سے ڈھونڈتا ہوں وہ گوکل کی محفلیں
تھا نغمہ زن جہاں وہ کنہیا شباب میں

لے حسن نو بہار وہ جلوے کہاں ہیں اب
جن سے فروغ تھا دلِ خانہ خراب میں

یوں تو شکن لاکھوں ہیں لیکن آہ وہ آذر کہاں
دل کے بت خانے میں جو تو رنگ پیدا کرے

جس کے دل میں ہو براہِ راست ذوقِ کوئے دوست
کیوں وہ راہِ عشق میں راہ و نشاں پیدا کرے

ہم سے ہی سازِ وفا، حسن کا ساماں ہم سے
بزمِ امکاں میں ہوئی زینتِ امکاں ہم سے

حائل تھی حسن و عشق میں میری خودی شفق
یہ شانِ بیخودی ہے کہ وہ ہمکنار ہے

"انا" کے پردے میں تھی آپ ہوگیا معلوم
وگرنہ شورِ انا الحق کا مدعا معلوم

یہ ڈر تھا رازِ محبت نہ فاش ہو جائے وگرنہ دار و رسن کی تھی انتہا معلوم
پلا دے ساقی وحدت وہی شرابِ کہن ہو جس کے کیف سے معدوم ماسوا معلوم

پابندِ ہر یں نہ علائق کے ہم رہے آزاد رہ کے فارغِ دیر و حرم رہے
یکساں نظر میں جس کے ہو ہستی و نیستی وہ کیوں فریب خوردۂ ہستِ عدم رہے

اگر بختِ بیدار کی آرزو ہے حیاتِ ثمر بار کی آرزو ہے
صدف بن کے دریا کی تہ کو ٹٹولو اگر دُرِّ شہوار کی آرزو ہے
وطن کو ضرورت ہے ان اہلِ ہمت کی جنہیں تختۂ دار کی آرزو ہے
ادا کر دو حقِ وفا جان دے کر اگر وصلِ دلدار کی آرزو ہے

کبھی ہم بھی دیکھ آئیں سوراج مندر
شفقؔ، شوقِ بسیار کی آرزو ہے

وطن پر دی کر اپنا سر کوئی گرمِ فغاں کیوں ہو نوا سنجِ فغاں احرار کے منہ میں زباں کیوں ہو
ستم پیشہ، جفا جو، خود غرض، نامہرباں کیوں ہو جو پامالِ ستم کر دے وہ میرا کارواں کیوں ہو
مناسب ہے وہ اک دن جان لیکر فیصلہ کر دیں ہماری ضبطِ غم کا یوں مسلسل امتحاں کیوں ہو
قفس پر تو ہوا قانع تو یہ تیری ہی غفلت ہے وگرنہ جس کا گلشن ہو وہ یوں بے خانماں کیوں ہو

اٹھو، سنبھلو، کمر باندھو، وہ آزادی کی منزل ہے
شناسا ہو کے منزل کی شفقؔ تم خستہ جاں کیوں ہو

نمونۂ نظم

"تسنیم نظم"

علامہ ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں ؎

عاشقی آموز و محبوبے طلب چشمِ نوحے، قلبِ ایوبے طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے بوسہ زن بر آستانِ کاملے
شمعِ خود را ہم چو رومی برفروز روم را در آتشِ تبریز سوز

ہستِ معشوقے نہاں اندر دلت چشم اگر داری، بیا بنمائمت

جس منزل کا اشارہ مذکورہ بالا اشعار میں ہے اسی کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہوئے شفقؔ صاحب یوں فرماتے ہیں۔

بات حق کی ہے گو ذرا سی ہے خود شناسی ہی حق شناسی ہے
ڈھونڈی دیر و حرم میں جو تجھ کو دیدنی اس کی بدحواسی ہے
دل کے پردے میں دیکھ اے ناداں کس کی تصویر خود لباسی ہے
پریم کے راگ گا رہا ہے کون؟ میٹھی میٹھی یہ کیا صدا سی ہے
روح پھرتی ہے مضطرب میری کس کے درشن کی یہ پیاسی ہے
ہو کے وارفتہ دیکھ لے غافل بے حواسی ہی با حواسی ہے
میرا محبوب، بانسری والا سانولا کرشن، برج باسی ہے

مزدور کا مستقبل

یہ مزدور جس روز بیدار ہوگا تو پھر روکنا اس کا دشوار ہوگا
جو سرمائے کی لعنتوں سے بنا ہے یہ قصرِ گرانمایہ مسمار ہوگا
پرانے قوانین منسوخ ہوں گے جدید ایک آئین تیار ہوگا
تن آسانیاں منعموں کو نہ ہوں گی نہ مزدور بیچارہ، بیکار ہوگا
نہ ہوگی کہیں بھی یہ جنگ اور شورش پھر اخلاص کا گرم، بازار ہوگا

کرے گی مساوات پھر حکمرانی
یہاں کوئی مفلس، نہ زردار ہوگا

نمونۂ نثر

نذر و نیاز

میرے محبوب، میرے دل کے مالک شہنشاہوں کے شہنشاہ میرے پاس کیا ہے جو آپ کی بھینٹ چڑھا سکوں!

چمنستانِ حیات کے مالی، یہ سب پھول آپ ہی کے باغ کے ہیں، ان

سب کچھ مالک آپ ہی ہیں — آپ کے خزانہ، انواع و اقسام کے قیمتی موتیوں اور جواہرات سے بھرے ہوئے [illegible] پریتم! آپ کے بھنڈار میں کس چیز کی کمی ہے؟'

پیارے! میں تو صرف ایک بھکاری ہوں — ایک ادنیٰ بھکاری — جو ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک بھٹکتا پھرتا ہو!

مہاپربھو! پھر آپ خود ہی فرمائیے کہ ایک ناچیز بھکاری آپ کے چرنوں میں کیا ارپن کر سکتا ہے؟'

شام کو جب میں دن بھر کے کام سے فارغ ہو جاؤں گا تو خالی ہاتھ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اور دھڑکتے ہوئے دل کو ساتھ لیکر آپ کے درِ دولت پر حاضر ہو جاؤں گا!

میری روح خود کو نشۂ حضوری سے سرشار ہو کر آپ کے چرنوں میں جھک جائیگی لرزتے ہوئے ہونٹ، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بے مائیگی کی داستان بے کم و کاست کہہ دیں گے "سوامی! میرے پاس آپ کے لائق کوئی تحفہ نہیں۔ کوئی چیز نہیں جو میں پیش کر سکوں" — غمِ محبت اور دردِ دل حاضر ہے انہیں سویکار کیجئے اور اپنے لازوال کیف و محبت سے مسرور و سرخوش کیجئے۔

اپنی کچھ فکر نہیں ہم کو مگر فکر یہ ہے
ہم رہیں یا نہ رہیں دل میں غم آباد رہے

برج والے کی یاد میں

(انشائے لطیف)

کہاں چھپا ہے تو اے محو جلوہ آرائی بیا کہ باز ببینم چو پردہ کشائی

زمیں پہ فرشِ رہِ انتظار ہیں آنکھیں کہ دیکھنے کو تجھے بیقرار ہیں آنکھیں

کنول نین میرے! پیارے پیا، نہ جانے تم کہاں ہو، صبح اپنی نورانی تجلیوں سے تمام کائنات کو منور کر رہی ہے بید مُشک خوش نوائیوں سے صحنِ چمن میں ترنم ریز ہیں موسیقی سے لبریز ہوا پھولوں سے اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ فطرت کا ذرہ ذرہ ایک کیف شیریں میں گم ہو کر دعوت مسرت دے رہا ہے مگر آہ میرے دل کی کلی ہنوز پژمردہ ہے میرا ہجراں نصیب دل غم کے بے پایاں سمندر میں بدستور غوطے کھا رہا ہے۔

نغمہ سنجانِ بہار نے صحنِ چمن میں بسیرا کر لیا، اودے اودے بادل مست ہاتھی کی طرح رمتے جھومتے چلے آ رہے ہیں، ہلکا ہلکا ترشح ہو رہا ہے۔ کوئل کی کوک نے کاشانۂ فطرت میں فراق کے دیئے جلا دیئے ہیں۔ پپیہا "پی کہاں، پی کہاں" کے دردناک نغمے الاپ رہا ہے، اس سہانے وقت میں، مشاطۂ فطرت بھی حتی المقدور بوندوں کی اوٹ میں شاخہائے گلستاں سے زبردستی مسرت کے پھول توڑ رہی ہے۔ مگر آہ میرا دل ابھی تک مغموم ہے شاید قسمت نے مجھے آنسوؤں میں ڈوبے رہنے کیلئے ہی پیدا کیا ہے۔

پیارے شیام سندر میں تمہیں آئینۂ تصور میں بغور دیکھ رہا ہوں، ہاں! ہاں! تمہیں تو ہو جو مے حقیقت سے مخمور ہو کر کنول جیسی خوبصورت آنکھیں اور کلیوں جیسے تبسم کو ہونٹوں میں لیے ہوئے بانسری بجا رہے ہو، پیارے منموہن! میں اپنی روح کی پوری قوتوں کیساتھ تمہارا تعاقب کر رہا ہوں، مگر یوں جوں میں تم سے نزدیک ہوتا ہوں تم مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہو تمہیں مسکراتے ہوئے دیکھ کر میں بھی ہنسنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا نکلتی ہے، اور نہ معلوم دل کیوں خون کے آنسو رونے لگتا ہے؟

شفیق — بابو شفیق اللہ خاں صاحب کوٹی (۵۱)

آپ کا نام شفیق اللہ خاں اور تخلص شفیق ہے۔ ۱۹۰۱ء میں بمقام کوٹ پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد کابل کے رہنے والے تھے۔ محمد غوری کیساتھ کابل سے وارد ہندوستان ہوئے۔ اور "کوٹ" ضلع فتحپور ہسوہ میں سکونت اختیار کی۔ آپ کا خاندان ممتاز عہدوں پر فائز تھا۔ بیشتر افرادِ خاندان فوج میں ملازم تھے۔ آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی منشی علی شیر خاں صاحب تھا جو کوٹ میں زمیندار تھے۔ مرحوم ایک معزز اور صاحب حیثیت بزرگ تھے۔ شفیق صاحب کے نانا خان بہادر احمد بخش صاحب ہائی کورٹ آگرہ میں وکیل تھے۔ اُن کو گورنمنٹ نے اس وقت خطاب دیا تھا جب ہندوستان میں بہت کم لوگ اس امتیاز کے حامل تھے۔ آپ نے غدر کے زمانہ میں انگریزوں کے معصوم بچوں اور عورتوں کی بہت امداد کی تھی آگرہ میں پیشۂ وکالت سے آپ نے اس قدر روپیہ پیدا کیا کہ آگرہ ہی میں ذاتی مکان وغیرہ تعمیر کرایا اور جب وطن کے لئے مراجعت فرمائی تو اپنے ایک دوست کو بغیر کسی قیمت کے وہ مکان دے دیا۔ اور خود "کوٹ" پہونچکر عبادت الٰہی میں مشغول ہوگئے۔

شفیق صاحب کے حقیقی ماموں جناب منشی فضل علی صاحب ڈپٹی کلکٹر نے آپکی پرورش کی۔ چونکہ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے شفیق صاحب ہی کو اپنی اولاد سمجھا۔ آپ ہی نے شفیق صاحب کو تعلیم وغیرہ دلائی۔ چونکہ شفیق صاحب کا زیادہ زمانہ لاڈ پیار میں گذرا اس لئے ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی اور انٹرینس تک تعلیم حاصل کی۔ گو طبیعت تعلیم کی طرف مائل تھی لیکن کچھ حالات سے اور کچھ زمانہ کی رنجش سے متاثر ہو کر آپ ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ ٹیکنیکل اسکول کی انجینیرنگ کلاس میں داخل ہوگئے۔ اور اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت سے ۱۹۲۶ء میں میکانیکل اور الیکٹریکل انجینیرنگ کا امتحان پاس کرلیا۔ امتحان میں کامیابی کے بعد آپ محکمۂ نداعت کانپور میں ایر ٹیسٹ مقرر ہوئے۔ اور وہیں سے ترقی کر کے مدارج طے کر کے انجینیر جابات مقرر ہوئے۔ اب پانچ سال سے محکمۂ نمک میں بمقام سانبھر بعہدۂ الیکٹرک فورمین فائز ہیں۔

شفیق صاحب کو اکتساب علم کا شوق آغاز عمر سے، اور طبعی میلان شعر و ادب کی طرف بچپن ہی سے تھا مختلف رسائل اور اخبارات کے مطالعہ نے ان میں اور زیادتی کردی لیکن ملازمت کی مصروفیتیں اور ماحول کی خشک سامانیاں حائل رہیں۔ آخر تا کے ۱۹۳۲ء میں آپ ماہنامہ "شاعر" کے خریدار ہوئے اور "شاعر" کے مطالعہ نے آپکو مکمل شاعر بنادیا اسی سنہ میں آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے شاگرد ہوگئے۔ مولانا مدظلہ کے فیضِ سخن نے شفیق صاحب کی سلجھی ہوئی طبیعت پر جلا کا کام کیا۔ اور بہت جلد آپ نے نمایاں حیثیت اختیار کرلی۔ نواحِ سانبھر کے علاقوں مثلاً اجمیر، جے پور وغیرہ کے مشاعروں میں آپ کی غزلیں انتہائی کامیاب ہونے لگیں۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ شفیق صاحب اتنی کم مدت مشق میں کہیں سے کہیں پہونچ گئے ہیں اور ہر وقت شعر و سخن کے نغمے جاری رہتے ہیں۔ دماغ شعر پسند اب حقیقی نشو و نما پاچکا ہے اس لئے بے تکلف شعر کہتے ہیں۔ سانبھر کے مشاعروں میں بھی آپ کو کامیابی ہوتی ہے۔ اور وہاں قابل وقعت لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ نظم و غزل دونوں کہتے ہیں۔ عقیدتمندانِ مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ میں آپکے درجہ امتیازی ہے۔ اور آپ اپنے استاد کی خدمت کرنا اپنا فرض سعادت سمجھتے ہیں۔ مولانا جن شاگردوں کی سعادتمندی کا اکثر اعتراف فرمایا کرتے ہیں اُن میں سے ایک آپ بھی ہیں۔

مشاعرے میں غزل خاص انداز سے پڑھتے ہیں۔ اور اپنے اشعار سے خود بھی متکیف ہوجاتے ہیں۔ غزل پڑھنے کا انداز بہت آزاد اور اثر آفریں

ہوتا ہے۔

انگریزی میں مجدد کافی آپ کو مہارت ہے۔ اردو میں نثر مضامین بھی خوب لکھتے ہیں مگر کم۔ آپ کا ایک مضمون "شاعر" میں شائع ہوا تھا جس کی نقل اکثر اخباروں اور رسالوں میں ہوئی۔

نمونۂ تغزل

اللہ عجب عالم حسرت شبِ غم ہے
ویران نگاہوں میں نہ ہستی نہ عدم ہے

ہے ختم کہانی مگر آنکھوں میں تو نم ہے
صورت وہ اگر اب بھی دکھا جائیں کرم ہے

دنیا کا بھی غم ہے مجھے عشق کا بھی غم ہے
سب کچھ ہے مگر پھر بھی تری یاد سے کم ہے

پروانہ بھٹک جائے جواب بھی تو ستم ہے
جو شمعِ کلیسا ہے وہی شمعِ حرم ہے

آثار ہیں پیدا سحرِ وصل کے شاید
نکہت کی طرح روح مری مائلِ رم ہے

یہ ہوشِ وفا اور یہ احساسِ محبت
اے تکملۂ شوق محبت ابھی کم ہے

دشواریٔ منزل تھی فقط ہوشِ طلب تک
بیخود جو ہوا ہوں تو نہ جادہ نہ قدم ہے

ہر لفظ ہے رومان مرے عہدِ وفا کا
جو بات میں کہہ دوں وہی افسانۂ غم ہے

ن جائے جاں تو وہی گھر گھر ہے ہمارا
ہستی ہے تو ہستی ہے عدم ہی تو عدم ہے

شاید ہے پرستش کی یہی آخری منزل
اب دیر مرے پیشِ نظر ہے نہ حرم ہے

سینے میں مری سیکڑوں نشتر سے چبھے ہیں
گو تیری نگاہوں کی خلش پھانس سی کم ہے

مجھ کو ہو کس امید پر احساسِ محبت
قربانِ تغافل نہ ستم ہے نہ کرم ہے

تدبیر کے سلجھاؤ پہ ہے میری نظر بھی
لیکن ابھی سرکار کی زلفوں میں تو خم ہے

ساقی ترے الطاف کا ممنون ہوں لیکن
پیمانے میں جو کچھ ہے مری ظرف سے کم ہے

ذوقِ شفیقؔ اور یہ طبیعت کی قناعت
مٹی کا پیالہ بھی مجھے ساغرِ جم ہے

ان ہے وہی جو رہے ایک حال میں
مغموم ہجر میں ہو نہ خوش ہو وصال میں

ہے خوشی میں اور خوشی ہی ملال میں
مشکل ہے امتیاز فراق و وصال میں

ے کہاں تصور جاناں کی قید سے
ہیں بیڑیاں پڑی ہوئی پائے خیال میں

ادراک و فہم کی بھی رسائی نہیں جہاں
آئے وہ کس طرح مرے وہم و خیال میں

رحمت نے اس کی وقت پر آکر بچا لیا
جب ڈوبنے لگا عرقِ انفعال میں

مجھ کو نہیں مجاز و حقیقت میں امتیاز
ہیں دونوں عالم ایک تمہارے خیال میں

دے گا مری نظر کو فریبِ جمال کیا
خود حسن مبتلا ہے فریبِ جمال میں

کیوں کر کریں خیال کہ بیدرد ہو گئے
تم تو انہیں حال رہے ہو ملال میں

سرمایۂ نشاط رہے وہ تمام عمر
گذری تھے چند لمحے جو اس کے خیال میں

وہ بھی تری نگاہ نے آخر چرا لیا
اک تیر رہ گیا تھا کمانِ ہلال میں

پہونچا دے مجھ کو منزلِ مقصود تک شفیقؔ
اتنی سکت کہاں مری پائے خیال میں

شفیقؔ کر مطمئن کیوں ہی نشانِ جیب و گریباں کا
ابھی باقی ہے اے دستِ جنوں دامن بیاباں کا

یہ آوارۂ وطن کو آرزو ہر لحظہ رہتی ہے
مسافر کوئی مل جائے ہمارے بھی گلستاں کا

بسا مردن ہمارے داغِ دل کچھ کام ہی آئے
ہر اک گوشہ چراغاں ہو گیا گورِ غریباں کا

حقیقت کی نظر سے دیکھ میری دلکوائے اہل
تری جنت ہی اک ٹکڑا اسی اجڑے گلستاں کا

کھنچتے ہی کھنچتے اور بھی یہ تو بدل گئی
تصویرِ یار میرے تصور میں ڈھل گئی

آنا کسی کا یاد ہے اتنا فقط ہمیں
اک موجِ برق تھی کہ چمک کر نکل گئی

تیرا کبھی جو نام کسی نے بھی لے لیا
اک آہِ سرد منہ سے ہمارے نکل گئی

اچھا ہوا جو بھول گئے جا کے تم مجھے
اچھا ہوا تمہاری طبیعت بہل گئی

تم آ گئے بہار مرے گھر میں آ گئی
تم کیا گئے بہار خزاں سے بدل گئی

سودا ہی اب نہ سر میں ہوائے جنونِ عشق
دم توڑتے ہی کیا مری دنیا بدل گئی

اچھا ہوا جو موت مجھے آ گئی شفیقؔ
یہ بھی تو ایک حسرتِ دل تھی، نکل گئی

ٹوٹ کر رہ نہ جائے تارِ نفس
برہمی ہو نہ سازِ محفل میں

میری دل کی طرح طلب میں تری
بیقراری ہے موجِ ساحل میں

وہ ہی ہوتا ہے منزل آسودہ
کہ جو کھو جائے شوقِ منزل میں

لالۂ و گل میں پھوٹ نکلے شفیقؔ
داغ جو تھے کبھی مرے دل میں

اسی سے لذتیں قائم ہیں زمانہ میں محبت کی — خدا آباد رکھے تیر سے اُن کی مرے دل کو
قیامت خیز تھا احباب سے ملکر جدا ہونا — بہت حسرت سے میں دیکھا کیا مڑ مڑ کے ساحل کو
کوئی تازہ ستم ایجاد کرنا ہے انہیں شاید — تسلی آج وہ کیوں دے رہے ہیں اپنے بسمل کو
ٹھہرے موجِ گردابِ بلا اتنی بھی جلدی کیا — سلامِ شوق پہونچا دوں ذرا یارانِ ساحل کو
بہار آئی تو دے ای اعتیاطِ ضبطِ غم اب کے — الٹنا ہے مجھے ان بن کھلی کلیوں کے محمل کو
رہِ محبوب گو دشوار ہے ہمت نہ ہارے دل — قدم پیچھے ہٹا لینا بڑھا لینا ہے منزل کو
خلش ہی سے ہیں ارمانِ خلش کا کام لیتا ہوں — مری مشکل پسندی سہل کر دیتی ہے مشکل کو

شفیقؔ اب دل کے ٹکڑے جوڑنے سے بھی نہیں جڑتے
وہ شاید کھیل سمجھے تھے شکستِ شیشۂ دل کو

نمونۂ نظم
”صبحِ بہار“

یہ نظارے، ترے یہ شان تری صبحِ بہار
وادیٔ ہمیں میں رقصاں ہیں گھٹائیں ہر سو
مل کے نکہت سے ہیں آوارہ ہوائیں ہر سو

وہ نئی شان وہ صحنِ چمنستاں کا سماں
وہ حسیں دیز میں تفریحِ گلستاں کا سماں

وجد میں موجِ ہوا کی وہ ادائیں دلکش
رنگ افروز وہ ماحول فضائیں دلکش

مطرب و ساز کی دلکش وہ صدائیں نایاب
محفلِ رقص میں پُر کیف ادائیں نایاب
جاوداں کاش رہے آن تری صبحِ بہار

یہ بہاریں ہیں کہ جنت کا ہے نقشہ کوئی
ہیں حسینوں کی لطافت سے نگاہیں شاداب
صبح افروز اداؤں سے ہیں روحیں شاداب
ایسے دلکش ہیں مناظر کہ کہے کیا کوئی
لبِ تشنہ پہ ہے پھر العطش صبحِ بہار — ڈھال ساقی کہ بنوں بادہ کشِ صبحِ بہار

جناب ابو شفیق اللہ خاں صاحب شفیق کوٹی کی غزل پر
حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کی اصلاح

آئینہ دارِ تجلی ہے رخِ یار مجھے — طور سے واسطہ ہی نہیں سروکار مجھے
قتل کرنے کو دکھاتی ہیں وہ تلوار مجھے — ان اداؤں پہ نہ آ جائے کہیں پیار مجھے
وہ ~~اٹھا ہی کے~~ دکھا دیں ~~خنجر~~ کبھی کر ہی تلوار مجھے — دھمکیاں قتل کی دیتے ہیں جو ہر بار مجھے
اپنی ہستی کا نہ احساس ہو ~~اک بار~~ زنہار مجھے — آج تو ایسی پلا دے نگہِ یار مجھے
بے خودی اتنی تو ہو، رازِ خودی کہہ جاؤں
~~ہوش میں آ کے نہ کہنا پڑے اسرار خودی~~ — ساقیا دے مئے سرجوش لگاتار مجھے
ہوش آتا ہی نہیں تمہاری آنکھوں کی قسم — کر دیا کم نگہی نے تری ہشیار مجھے!
دیت ناوک سے کہیں قتل ہوا کرتے ہیں — جائے ~~بس اعطائے~~ دے دیجئے تلوار مجھے
لوگ کہتے ہیں کہ تکرار بری ہوتی ہے — اور پیاری ہے ترے نام کی تکرار مجھے
اُن کے ~~تیرے~~ بیمارِ محبت سے یہ کہتا ہے طبیب — نظر آتے ہیں برے کچھ آثار مجھے
مجھے ~~ان کو~~ شوخی ملی انداز ملا ناز ملا — جوششِ گریہ ملے دیدۂ خونبار مجھے

اُن کی رسوائی کا ہے پاس فقط مجھے ورنہ شفیقؔ
جان دیدینے میں واللہ نہیں عار مجھے

شفقؔ ۵۲

محمد عبدالرشید صاحب سینائی

آپ کا نام محمد عبدالرشید اور تخلص شفقؔ ہے۔ سینائی نسبتِ اضافی ہے آپ ۲۲ جولائی ۱۹۱۶ء کو بروز جمعہ ریاست ڈمرانؤں ضلع آرہ صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ بزرگوار حاجی محمد عالم صاحب ابن شیخ شہاب الدین صاحب ایک خوش فکر شاعر اور فاضل بزرگ تھے۔ مرحوم حاجیؔ تخلص فرماتے تھے۔ شفقؔ صاحب نے رانی گنج ضلع بردوان میں نشو و نما پائی۔

ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد آپ نے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور ۱۹۳۲ء میں بنگال ایگزامینیشن بورڈ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ملازمت کا جواز آپکی طبیعت کے خلاف تھا یعنی آپ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن والدین کے انتقال نے تعلیمی سلسلے میں کچھ رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ اور اسکول کی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اس باقاعدہ سلسلۂ تعلیم ختم ہوجانے کے باوجود بھی آپ غافل نہ رہے اور مولانا منظر الاسلام صاحب عرف مولانا نظر اللہ صاحب سہسرامی سے عربی فارسی وغیرہ علوم متداولہ کی تکمیل بطورِ خود کرتے رہے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی کچھ عرصے کے بعد ختم ہوگیا۔ کتب بینی اور کثرت مطالعہ کا آپ کو اوائل عمر ہی سے شوق ہے۔ اس شوق نے جہاں آپکی تشنگی بجھانے کے سامان کئے اور جہاں معلومات میں ایک گرانقدر اضافہ کیا وہاں آپ کی صحت پر بھی ایک ناگوار اثر ڈالا اور یہی شغل بعیت اب بھی مشغلۂ حیات ہے۔ انگریزی میں آپ کو اچھا خاصہ ورک ہے اور بقدر ضرورت آپ اس کی تحصیل کر چکے ہیں چونکہ اردو، فارسی اور عربی سے ایک فطری لگاؤ ہے اس لئے ان زبانوں پر آپ کو کافی عبور ہے۔ ملازمت کی ناگوار الجھنوں نے آپکو عرصے تک الجھائے رکھا اور آپ کی ادبی زندگی پر پردا سا پڑ گیا۔

آپ چونکہ شاعر ہیں اور ایک اچھے شاعر اس لئے اس حقیقت کے بیان سے کہ آپ کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے دلچسپی تھی کسی کو حیرت نہ ہوگی۔ جسے فطرت شاعر پیدا کرتی ہے وہ ہوش کی منزلوں میں پہونچنے سے بہت پہلے ہی اپنے دل میں ایک شاعرانہ کسک محسوس کرتا ہے۔ پھر آپ تو شاعر ابنِ شاعر ہیں۔ آپ کے والد جناب حاجی صاحب ایک صوفی منش آدمی تھے اس لئے حمد، نعت اور منقبت کے سوا کسی دوسری صنف شاعری کو ہاتھ نہیں لگایا۔ شفقؔ صاحب کا تربیتی ماحول شاعرانہ تھا اس لئے بغیر کسی خارجی اثر کے آپ شعر کہنے لگے۔ مسلسل مشق کے بعد ایک شاعر کو کسی مصلح کی ضرورت یقینی ہوتی ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ کوئی ان نکات کو جن تک اس کی نظر نہیں پہونچی ہے اس پر منکشف کر دے۔ اسی نظریے کے تحت ڈیڑھ سال تک شفقؔ صاحب شعر کہتے رہے۔ اور کسی اچھے استاد کی تلاش میں رہے ان اطراف میں کوئی ایسا شاعر نہ تھا جو آپ کی تسکین کر سکتا۔ عرصے تک آپ نے مشہور اساتذہ کے دواوین کو منزل رسی کا ذریعہ بنایا لیکن آخر کب تک ۱۹۳۲ء کے بعد آپ کی نگاہیں حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ پر پڑیں اور آپ مولانا کے فیض جاریہ میں حصہ گیر ہوگئے۔ مولانا مدظلہ کی اصلاح اور مشوروں سے بہت جلد رنگ تغزل چمک گیا اور اب آپ علاوہ غزل کے نظم بھی کہنے لگے۔ شفیق استاد کے متعلق آپ اس طرح فرماتے ہیں۔

کیوں نہ اک اک لفظِ دیواں حاملِ صد رنگ ہو۔
یہ نظر کردہ شفقؔ سیمابؔ سے کامل کا ہے

ماہنامہ شاعرؔ کے یکم مئی اور یکم ستمبر ۱۹۴۱ء کے دو انعامی مقابلوں میں بھی آپ کامیاب ہو چکے ہیں۔ "مدینہ" "عصر جدید" "تاج" "شاعر" وغیرہ اخبار و رسائل میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کا کلام بہت صاف اور شستہ ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی سکونت کلٹی ضلع بردوان میں ہے اور آپ آجکل نسدا اسکول میں بحیثیت مدرس ملازم ہیں۔ ایک ایسے مقام پر رہنے کے بعد

۱؎ بیان کوئے کی کانیں ہیں۔

جہاں اردو سے لوگ اچھی طرح واقف نہ ہوں خیال میں اس درجہ بلندی متانت اور سنجیدگی پیدا کرلینا آپ ہی کا کام ہے۔ آپ مصنف بھی ہیں۔ "اذانِ سحر" کے نام سے سحری کی نظموں کا مجموعہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوچکا ہے۔ مسائل و معلوماتِ تعلیم دینیات دو حصوں میں یہ کتاب ستارۂ ہند پریس کلکتہ میں زیرِ طبع ہے اور جلد شائع ہونیوالی ہے۔ ان کے علاوہ واقعاتِ کربلا منظوم۔ نغمۂ روح۔ معلوماتِ مبتدیان۔ الہ پیغام شفق بھی تصنیف شدہ موجود ہیں۔ جو جلد طبع ہوں گے۔

نمونۂ تغزل

آئینہ تری تجلی کا ہمارا دل ہے — گلشنِ لاہوت کا اک شاخِ گل ہے

چمک اٹھی بشر کی سعی سے تقدیر بشر کی — خدا کی شان ہے بدلی گئی تصویر بشر کی

نالہ کہاں وہ آہ کہاں وہ فغاں کہاں — لے قصہ خوانِ عشق وہ سوزِ بیاں کہاں
انجام کارِ عشق کی دنیا بدل گئی — میں ہوں جواں مگر مری ہمت جواں کہاں

طور پر پھر کوئی سائل نظر آتا ہے مجھے — عشق پھر حسن پہ مائل نظر آتا ہے مجھے
جب کبھی چشمِ حقیقت سے نظر کرتا ہوں — وہ مری روح میں شامل نظر آتا ہے مجھے
یہ تخیل کا کرشمہ یہ تصور کا کمال — جامِ جم آئینۂ دل نظر آتا ہے مجھے

جلوۂ گل سے لذتِ ذوقِ بلبل ہے مگر — مدعا اس سے سوا اپنے مذاقِ دل کا ہے
الفراق اے جوشِ وحشت السلام اے ذوقِ عشق — اب نہ دہ میں ہوں نہ وہ اندازِ دردِ دل کا ہے

فصلِ گل وقتِ شام ارے توبہ — حسن تنہا خرام ارے توبہ
بامرادوں کی صبح کیا کہنا — نامرادوں کی شام ارے توبہ

عہدِ رفتہ کا اک پیام حسیں — دورِ پیری کے نام ارے توبہ
شاخِ گلبن کی دست رنگیں پر — پھول کا سرخ جام ارے توبہ
زیست عبرت کی صبح دھندلی سی — موت عبرت کی شام ارے توبہ

کیفیت نغمے میں کچھ ہے نہ کسی ساز میں ہے — فقط اک کششِ حسن کی آواز میں ہے
جزو سے کل کی حقیقت یہ ہوا امکانِ عبور — سارے عالم کی صدا اک مری آواز میں ہے
کون بلبل کو پڑھاتا ہے محبت کا سبق — کس کی تحریک یہ پروانۂ جانباز میں ہے
ذرہ ذرہ پہ سکوتِ ازلی ہے طاری — نغمۂ نو کوئی پوشیدہ ابھی ساز میں ہے
شرک کیونکر نہ جلے صورتِ ایماں سے شفق — برق و خرمن کا اثر دونوں کی انداز میں ہے

حاصلِ عمرِ دو روزہ اک فغاں ہے زندگی — قبر تک کچھ ہے نشاں پھر بے نشاں ہے زندگی
اپنی ہستی پہ نہ کیوں اے بے خبر مجھ کو ناز ہو — تیری قسمت کی طرح تا تنگ جاں ہے زندگی
رہروِ صبحِ ازل توشے سے اپنے ہوشیار — منزلِ شامِ ابد کی درمیاں ہے زندگی
اک طرف حسنِ ازل ہے اک طرف عشقِ ابد — ان ہی دو عشرتکدوں کی درمیاں ہے زندگی
زندگی کو دیکھ جو کچھ ہے شفق شاعر میں ہے — مادی دنیا میں باقی اب کہاں ہے زندگی

تشنگیٔ روح سے پھر آج ہوا تشنہ تر — لگ رہی ہے آج پھر اک آگ سی دل کی قریب
روح پر الہام کی ہو ذرا نگی ہے نرم شیں — گائے جا نغمے مسلسل مطرب دل کی قریب
مہروش کی ہر کرن ہے بامِ عرفاں کی کمند — پائے ابراہیم سے جا حسنِ منزل کی قریب

ضبط کی جب کشمکش سے منتشر نالے ہوئے — دل سے تا حدِ جگر برقِ آفریں چھائی ہوئے
جب شفق کو دیکھئے ہے وقفِ سیرِ گلکدہ — ہاتھ گردن میں کسی بدمست کی ڈالے ہوئے

سنا سنا کوئی گلشن کی داستاں صیاد — دکھا دکھا مجھے تصویرِ گلستاں صیاد

نمونۂ نظم

برسات کی ایک رنگین شام

روح افزا کس قدر ہے جلوۂ رنگین شام — از زمیں تا آسماں نیرنگیٔ قدرت ہے عام

بادلوں کا اژدہام — بارشوں کا انتظام

ابر برسا اور برس کر کھل گیا یکبارگی

جانبِ مشرق ہوا اسکو اڑا کے لے گئی

پھر تو مطلع صاف تھا — آسماں شفاف تھا

آفتاب آیا نظر — مغرب کی جانب مگر

ہر طرف ہے اک مسلسل خامشی چھائی ہوئی

ہے فضا میں ساحریت سی چھائی ہوئی

ذرہ ذرہ قطرہ قطرہ بارشِ رحمت سے سبز — پتہ پتہ بوٹا بوٹا اپنی حیثیت سے سبز

فرشِ صنعت زار سبز — عرشِ جنت بار سبز

دستِ قدرت کی سراسر ہیں مرصع کاریاں

روح کو بیدار کرنیکی ہیں یہ تیاریاں

تازگی و انبساط — کیف افزائے نشاط

سبزہ و آبِ رواں — کیفیت افروزِ جاں

قطرے پانی کے نہیں ہیں یہ گیاہِ سبز پر

چاند تارے ہیں زمرد کے کلاہِ سبز پر

سبز پتوں میں کھڑی یا نخلِ نخل استادہ ہیں — کوہ بھی بن کر پری اڑنے کو آمادہ ہیں

پھول روشن ہو گئے — شمعِ گلشن ہو گئے

سبزہ زاروں پر شعاعِ زرد ہے چھائی ہوئی

ہر طرف موجِ ہوا پھرتی ہے اترائی ہوئی

جیسے پریاں سیکڑوں — مست و مینا نوش ہوں

رقص میں ہیں گھومتی — وجد میں ہیں جھومتی

دیکھ کر یہ شعر زا منظر شغف دل نے کہا

مرحبا! برسات کی اے شامِ رنگیں مرحبا!!

جناب عبدالرشید صاحب شغف سینائی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

ہر کوششِ خیال ہے باطل ترے بغیر — آسانیٔ حیات ہے مشکل ترے بغیر

طے کس طرح ہو عشق کی منزل ترے بغیر — ہے اور کون رہبرِ کامل ترے بغیر

گلکدہ

آتشکدہ ہے اب چمنِ دل ترے بغیر — ضائع شدہ ہے عمر کا حاصل ترے بغیر

آ، اور اپنے حسن کو پھر کر دے بے نقاب — تاریک ہے نظر مہِ کامل ترے بغیر

آ، اور پھر لگا دے اسی شاہراہ پر — گمراہ ہو نہ جائے کہیں دل ترے بغیر

آ، اور اپنے رنگ میں خود مجھ کو رنگ دے — کیونکر ہو عشق حسن میں شامل ترے بغیر

وہ کون ہے جو ہو خلشِ اضطراب میں — تسکین بخش خاطرِ بسمل ترے بغیر

آئینۂ غم لئے ہوئے — رہتا ہے میری روح میں

وہ کون ہے، جو ~~حسن کا دکھلا کے آئینہ~~ — ~~حالانکہ روح ہی میں ہے~~ شامل ترے بغیر

بھی ہو

آ جا کہ ہمکنار سلامت رہے شغف

فتنۂ نو

ہر موج بھی ہے سرکشِ ساحل ترے بغیر

شکیل — ننّے خاں صاحب اکبرآبادی — ۵۲

آپ کا صحیح نام شفاعت حسین ہے لیکن چونکہ آپ اپنے بہن اور بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور عزیز تھے اس لئے خاندان کے تمام افراد اور گھر والے "ننّے" کے نام سے پکارتے تھے۔ کثرتِ استعمال سے آپ کا نام ننّے خاں ہوگیا اور اب شفاعت حسین کو لوگ بھول چکے ہیں۔ آپ شکیل تخلص فرماتے ہیں۔ آپ کا وطن اکبرآباد ہے۔ آپ کے آباو اجداد محلہ نئی بستی گلی عاشور بیگ میں رہتے ہیں۔ آپ کے والدِ محترم کی وفات کے بعد آپ کی تربیت آپ کے بڑے بھائی ولایت حسین صاحب شفق سیمابی اکبرآبادی کے زیر سایہ ہوئی ابتدائی تعلیم گھر پر لینے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور شب کو مسلم لائبریری میں جو کہ "پنی گلی کے ناکے" پر واقع تھی۔ اردو اخبارات و رسائل کے مطالعہ کیلئے جاتے تھے جناب صوفی صاحب مرحوم جو اس لائبریری کے ایک رکن تھے۔ بڑے تپاک سے آپ سے ملتے تھے۔ یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔

شکیل صاحب کے خالہ زاد بھائی جناب اعجاز حسین اور سرفراز حسین صاحب اچھے شاعر ہیں اور بہت زود گو شاعر ہیں۔ آپ ان دونوں حضرات کے پاس اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ ادھر لائبریری کی کتابوں اور رسالوں کے مسلسل مطالعہ اور صوفی صاحب مرحوم کی صحبت سے آپ میں احساس شعر گوئی موجزن ہوگیا جب لائبریری میں صوفی صاحب کے ملنے والے آتے اور وہ انہیں اپنا کلام سناتے تو شکیل صاحب بڑے غور سے سنتے گو اچھے برے کی اس وقت تمیز نہ تھی لیکن بعض بعض شعروں پر آپ دل ہی دل میں داد دیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ آپ میں شعر موزوں کرنے کی اہلیت پیدا ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں آپ کو فنِ موسیقی کی تکمیل کیلئے جے پور جانا پڑا۔ آپ کی تعلیم اور مطالعہ آگرہ ہی تک محدود نہ رہا بلکہ یہاں بھی فنِ موسیقی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ آپ کی فطرتِ علم دوست علم کی جویا رہی تعلیمی اور فنِ موسیقی کی مصروفیات کے باوجود آپ شعر وادب سے غافل نہ رہے۔ یہاں آنے کے بعد بے دھڑک شعر کہنے لگے اور جے پور کے مشاعروں میں بھی شرکت شروع کردی۔ اس کے بعد جب کبھی آگرہ آتے تو یہاں کے مشاعروں میں بھی ضرور شریک ہوتے تھے۔ آپ کے خاندان میں ایک دو نہیں بلکہ کئی شاعر تھے اور وہ سب حضرتِ شیخ بزرگ علی صاحب عالیؔ اکبرآبادی مرحوم و مغفور سے اصلاح لیا کرتے تھے اس لئے آپ بھی اُن ہی کی طرف رجوع ہوئے۔ عالیؔ صاحب کے انتقال کے بعد آپ نے دو غزلیں جناب مظہرؔ اکبرآبادی مرحوم کو دکھائیں لیکن اُن کی اصلاح سے اطمینان نہ ہوا۔ عرصہ تک آپ کسی صاحبِ فن اور کامل استاد کی تلاش میں رہے۔ ہندوستان کے تمام اساتذہ پر اپنی نگاہ تجسس ڈالی۔ اسی خیال کو لئے ہوئے۔ بمبئی۔ کلکتہ۔ میسور۔ حیدرآباد بلگام۔ لاہور۔ دہلی۔ علی گڑھ۔ مرادآباد۔ رام پور۔ جے پور۔ بڑودہ۔ الٰہ آباد گوالیار۔ اٹاوہ اور دیگر شہروں میں پھرے بعض جگہ مشہور و معروف حضرات سے ملے بھی۔ بڑے بڑے مشاعرے پڑھے لیکن آپ کا ذوقِ طلب تشنہ ہی رہا۔ آپ لکھتے ہیں "ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ آخر کار میری نگاہوں نے وہ یگانۂ روزگار اور کامل فن استاد ڈھونڈ ہی لیا جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں سیمابؔ (مدظلہ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور میں مولانا مدظلہ کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوگیا۔ خوشا نصیب کہ اب شکیل سیمابی اکبرآبادی مشہور ہوں"

آپ بہترین موسیقی نواز ہیں آپ کے خاندان کے افراد نہایت معزز عہدوں پر فائز ہیں۔ فیاض خاں صاحب آف بڑودہ آپ کے قریبی عزیز

جو علم موسیقی میں آج اپنا جواب نہیں رکھتے شکیل صاحب عرصۂ دراز سے بمبئی میں برسرِ روزگار ہیں اور ہر سال وطن ضرور تشریف لاتے ہیں شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے آپ کے کلام میں سوز و گداز اور ندرتِ تخیل ہونا لازمی ہے۔ آپ پڑھتے بھی خوب ہیں اور کہتے بھی خوب ہیں۔ بمبئی کے بیشتر مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں۔ آپ کا دیوان بہت جلد شائع ہونیوالا ہے۔

نمونۂ تغزل

آؤ دیکھو نہ دلِ زار کا ویراں ہونا!
تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کا بیاباں ہونا؟

چپکے چپکے وہ مجھ کو بس رہے ہیں شاید
بے سبب کب ہے لبِ دوست کا جنباں ہونا؟

اُن سے ملنے کی تمنا ہے خدا خیر کرے
یہ وہ مشکل ہے کہ دشوار ہے آساں ہونا

صفائے قلب سے تصویرِ رازِ زندگی ہو جا
نہ بن آئینہ ہاں آئینہ سازِ زندگی ہو جا

کبھی ہو مائلِ پرواز تو بھی رنگ و بو بنکر
برنگِ نکہتِ گل بے نیازِ زندگی ہو جا

سکونِ درد ہے تمہید میری بیقراری کی
دلِ مضطر خدارا جاں نوازِ زندگی ہو جا

اگر تو امتیازِ حسن و الفت سے پریشاں ہے،
تو پھر ناآشنائے امتیازِ زندگی ہو جا

نیازِ زندگی ہی زندگی کا لطف کھوتا ہے
شکیلِ زار اب تو بے نیازِ زندگی ہو جا

تباہی میری ویرانی کی دنیا یاں تباہی تھی
کہ دل معمور ہو کر بھی اک اجڑا سا بیاباں تھا

رہا جب نام تک باقی نہ میری جیب و دامن کا
مرادستِ جنوں پھر عزت افزائے گریباں تھا

خیالِ یار شاہد ہے مری آشفتہ حالی کا
شبِ غم مضطرب تھا، شعلہ برپا تھا، پریشاں تھا

اٹھائے وہ مزے محویتِ وحشت کے زنداں میں
نکلکر خانۂ زنداں سے دل میں کیفِ زنداں تھا

وہ لاکھوں مستیاں، وہ کشمکش، وہ شور، وہ الجھن
شکیل اک دیدنی ہنگامۂ دست و گریباں تھا

امید تھی کہ کسی دن قرار آجاتا
خدا کا شکر دلِ بیقرار بھی نہ رہا

اور بھی ہو ستم جدید ایجاد
بانیٔ ظلم و جور و استبداد!

آہ و نالے سے آشنا ہوں میں
اور مجھ سے ہے آشنا فریاد

اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن
صبر کر صبر اے دلِ ناشاد

نمونۂ نظم

"غالب سے"

تیری رنگیں نوائی کا ہر اک دل پہ سکہ ہے
ترا اوجِ تخیل کا جہاں میں اب بھی چرچا ہے

تیری طرزِ سخن گوئی کی دل تقلید کرتا ہے
کہ تیرا رنگِ لامحدود شعریت میں یکتا ہے

حقیقت میں تو دنیائے سخن کا مردِ افضل تھا
تو فنِ شعر کی رفعت طرازی میں مکمل تھا

متاعِ ارتفاعِ شاعری ہے شاعری تیری
کہ نکتہ سنج کرتے ہیں جہاں کی پیروی تیری

وہ شانِ فکر افزا اور وہ نکتہ وری تیری
سبق آموز اربابِ سخن ہے رہبری تیری

حقیقت ہے کہیں گر طوطیٔ ہندوستاں تجھکو
بجا ہے گر کہیں شاعر امیرِ شاعراں تجھ کو

طلسمِ رازِ ہستی فلسفہ میں تیرے پنہاں ہے
ترا ہر شعر معنی خیز و رشکِ صد گلستاں ہے،

تخیل ہیں نئے جذبات ہیں حسنِ فروزاں ہے،
تیری رنگینیٔ اشعار سے رفعت نمایاں ہے

عجب دلکش تھا شیرازہ تیرے خوابِ پریشاں کا
کہ تیرے بعد جادہ بن گیا فکرِ سخنداں کا

سخنور ہو گئی دنیا تیری تقلیدِ پیہم سے
فروغِ شاعری اردو میں گویا ہے تیرے دم سے

جو تو ہوتا تو دھو کر پاؤں پیتا آبِ زمزم سے
دلِ شاعر نہیں ہے اب بھی خالی تیرے ماتم سے

انوکھے رنگ میں جذباتِ دل کی ترجمانی کی
تیری فطرت نے اردو شاعری پر مہربانی کی

زمینِ تاج میں پیدا ہوا نشو و نما پائی
جواں ہو کر جہانِ شعر میں کی تو نے دارائی

تیری تشکیلِ فنِ شعر میں گویا اتر آئی
گیا جب تو تب دلّی شاہ نے کی عزت افزائی

زمینِ تاج ایسی ہستیوں کا ایک مخزن ہے
بہاریں جس کی ہیں سیماب و غالب یہ وہ گلشن ہے

شہزور — غلام قادر صاحب بی۔ اے کاشمیری (۵۴)

آپ کا نام غلام قادر اور شہزور تخلص ہے۔ آپ ۲۷ فروری ۱۹۱۵ء کو کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ایک مشہور اور متمول خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ابتدائی اور رسمی تعلیم کے بعد آپ کو مشن ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ چونکہ آپ میں ایک غیر معمولی ذکاوت و ذہانت پائی جاتی تھی اس لئے بہت جلد میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج کی زندگی میں قدم رکھا اور یہاں سے بھی انتہائی عزو وقار کے ساتھ بی اے پاس کیا۔

آپ شاعر ہیں اور فطری شاعر۔ بچپن سے میلانِ طبیعت گلستانِ شاعری سے خوشہ چینی کیا کرتا تھا۔ آپ کے والد صاحب آپ کو ہمیشہ "شعر پروردہ" کہہ کر پکارتے ہیں۔ آپ کے بچپن کا ایک واقعہ عجیب و غریب ہے جس سے موسیقی اور شعریت کی ودیعت کا نمایاں ثبوت ملتا ہے۔ جب آپ کی عمر پانچ سال کی تھی تو آپ شدید طور پر بیمار پڑے والدین نے علاج معالجہ میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔ لیکن باوجود ناامیدی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ ایک دن جب کہ آپ کی حالت بہت خراب تھی ایک برہنہ فقیر دروازہ پر آیا اور انتہائی بلند آواز سے گانے لگا۔ آپ کے والد صاحب نے اسے منع کیا منتیں کیں اور جب وہ اپنے راگ الاپنے سے باز نہ آیا تو ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لیا۔ لیکن وہ دیوانہ اپنی دھن کا پکا تھا متواتر گاتا رہا۔ اس کے جانے کے چند سیکنڈ بعد ہی شہزور صاحب کے حال میں ایک تغیر پیدا ہوا اور آپ نے آنکھیں کھولدیں اور تملاتے ہوئے پانی مانگا۔ فقیر کی تلاش میں کئی آدمی بھیجے گئے لیکن وہ نہ ملا۔ آپ کے والد صاحب نے یہ واقعہ حکیم غلام شاہ صاحب مرحوم کو سنایا تو آپ نے فرمایا کہ "ایک سازندے اور ایک نوازندے کی سرپرستی کرنی ہی پڑے گی" اس کے بعد آپ جب کبھی صاحب فراش ہوئے تو موسیقی ہی کے زیر و بم سے صحت پائی۔

بہت کم عمر سے آپ نے شاعری شروع کی لیکن اپنے اشعار کسی کو سناتے نہ تھے جب آپ دسویں جماعت میں تھے تو مشن ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے آپ کی ایک غزل سنی اور انتہائی تعریف کی ادھر وہ تعریف کر رہے تھے ادھر شہزور صاحب اس احساس سے کہ ان میں ابھی بہت سی کمیاں ہیں آنسو بہا رہے تھے۔ اسی احساس نے آپ کو ترقی کی منزل کا راستہ بتایا۔ زمانۂ تعلیم میں کالج کے پروفیسروں دوستوں اور ہم جماعت کے طلباء کے اصرار سے آپ نے اپنی نظمیں اور غزلیں اخبار "پرتاپ" میں بھیجیں جس نے ان کو بڑے افتخار کے ساتھ چھاپا۔ کشمیر کے بعض روزانہ اخبار بھی باوجود آپ کی سختی اور احتیاط کے کسی نہ کسی ذریعہ سے آپ کا کلام لے ہی لیتے ہیں۔

بی اے کا امتحان پاس کر لینے کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایک دن کشمیر کے بہترین ادیب مولانا مولوی محمد سعید صاحب مدیر "ہمدرد" کشمیر سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ سعید صاحب نے شہزور صاحب کی ایک غزل سنی اور بہت زیادہ محظوظ ہوئے۔ فرمانے لگے کہ مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ کی پرستاری کا شرف حاصل کرو گے تو یقیناً ایک انمول موتیوں کی مالا میں منسلک ہو جاؤ گے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ "یہ ایک حکم تھا جس کی تعمیل میں نے فوراً کی اور جب حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کے دستِ مبارک کی اصلاح شدہ غزل دیکھی تو میرے تن بدن میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑ گئی اور یک بیک کسی نامعلوم طریقہ سے میری وہ نامعلوم کمی پوری ہو گئی۔ جسے میں مدت سے محسوس کر رہا تھا"

فورتھ ایر (Fourth year) کے ٹیسٹ امتحان میں آپ کے جوابِ مضمون سے متاثر ہوکر ایک پروفیسر صاحب نے کلاس میں آپ کی بہت تعریف کی۔ آپ کے ہم جماعتوں نے بھی تالیاں بجائیں۔ پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ تمہاری زبان "ڈرامٹک" ہے حصولِ تعلیم کے بعد ڈراما نویسی ہی کو اپنا شغل بنانا۔ آپ نے دوسرے ہی دن سے اس چیز پر عمل شروع کر دیا۔ اس وقت آپ کے پاس کئی ڈرامے مکمل موجود ہیں مثلاً تقدیر و تدبیر۔ پاکدامن۔ پریم بھگتی۔ بی اے پاس۔ لاش وغیرہ وغیرہ۔

اب آپ کا بیشتر وقت ڈراما نویسی میں صرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ غزل پر نظم کو ترجیح دیتے ہیں۔ غزل وقت ضرورت کہتے ہیں آپ کی نظمیں جدید رنگ کی حامل ہوتی ہیں۔ طبیعت میں رنگینی اور جدت ہے۔ آپ کا مستقبل نہایت درخشاں نظر آتا ہے۔

نمونۂ تغزل

آغوشِ محبت

اے صبا گہوارۂ گلشن اٹھا آغوش میں　　وہ گلِ رعنا گلوں کی سو گیا آغوش میں
کس کی آمد ہے مری بزمِ تصور میں کہ آج　　برگِ گل تارِ نگہ بھی بن گیا آغوش میں!
چاک داماں آہ لب پر دلمیں شعلے سر بسر　　سخت مشکل عشق کا ہے پالنا آغوش میں!
قسمتِ برگشتہ کی شہ زور اب حد ہو گئی　　ہے خیالی دوست بھی روٹھا ہوا آغوش میں!

غم کدہ

اسیرِ ماتم ہوں میری آنکھوں سے خوں کے آنسو ٹپک رہے ہیں
گذارشِ غم کے ہیں یہ قاصد کہ دِ سہارے بھٹک رہے ہیں
سحر قریبِ طلوع ہے، آؤ اور مرے آنسوؤں کو دیکھو
تمام تارے تو چھپ گئے ہیں یہ دو ستارے چمک رہے ہیں

سبو ہمارا ہے قلبِ غمگیں شراب تیرا خیالِ رنگیں
نشاطِ امروز و کیفِ آگیں ہے بام و در بھی بہک رہے ہیں
نہاں میں کیوں کر رکھوں یہ نالے الٰہی سوز و گداز والے
دل و جگر میں پڑے ہیں چھالے بدن میں شعلے بھڑک رہے ہیں
بہار آئی گھٹا ہے گھنگھور آج ہر سو ہے جلوۂ طور
صدائے بلبل کی موج نغمہ میں ساغرِ گل چھلک رہے ہیں
مگر ہے شہ زور پھر بھی پُر غم، خراب و خوار و زبونِ پیہم
ہمیشہ نالاں ہے رخ پہ ہر دم جگر کے ٹکڑے ڈھلک رہے ہیں

ساغر کا ساقی سے گلہ کیا ہے میکشو دیکھو　　وہ مستِ ناز آنکھوں میں لئے میخانہ آتا ہے

شورشِ دنیا سے مجھکو کیا غرض ہے جام لے　　خام ہے نالہ ترا زاہد، مئی گلفام لے
داد اُن کی چارہ سازی کی ہیں کیا شہ زور دِل　　دوست کہتے ہیں مجھی کچھ عقل سے بھی کام لے

نمونۂ نظم

"مسلم"

مسلم تو اس زمیں میں در ماندہ کیوں ہوا ہے　　مقبول کارواں تھا پسماندہ کیوں ہوا ہے
جو تجھ سے کوسوں آگے جادے میں بڑھ گئے ہیں　　رہبر تو ہو کے انکا واماندہ کیوں ہوا ہے
پیدا تجھے خدا نے کس شرط پر کیا تھا　　سینے میں تیرے اس نے کیا بھید بھر دیا تھا
سب سے بڑی ضرورت آنے کی تیری کیا تھی　　بزمِ جہاں میں تیرا اظہار کیا تھا
منشائے خلق کیا تھا تو نے کبھی یہ سوچا　　مرجع ترا ہوا کیا تو نے کبھی یہ سوچا
یارانِ رفتہ نے کیا آ کر کیا جہاں میں؟　　اور کیا ہے تیرا شیوہ، تو نے کبھی یہ سوچا
شمشیر آزما کر رشیا کو سر کیا تھا　　ہند و حلب کو کس نے پیغامِ حق دیا تھا
اسلام کے علم کو استادہ کر کے کس نے　　ہر ذرۂ جہاں کو تسخیر کر لیا تھا؟

جاپان و مصر تیری آرام گہ بنی تھی   ہسپانیہ میں تیری سکّے جمے ہوئے تھے

مغلوں کی دبدبی تو کیا دل سی بھول بیٹھا   تغلق نے جو ممالک زیرِ نگیں کئے تھے

یہ کیا ہوا ہی تجھ کو ای عبرتِ زمانہ   ہر اک سی کہہ رہا ہی اسلاف کا فسانہ

ہمت بھی چھوڑ بیٹھا غفلت کی وادیوں میں   کیا ہو گیا وہ تیرا عشرت بھرا ترانہ

پھر خوں رگوں میں بھر لے پھر ہمت آزما ہو   غفلت سی باز آ کر پھر جرأت آزما ہو

پھر اپنی کوششوں سے دنیا کو زیر کرلے

وسعت میں اس جہاں کی پھر قسمت آزما ہو

نمونۂ نثر

پاک دامن ڈرامہ کا ایک مختصر حصہ

صادق۔ آقا! — آقا!! — (حاجی کا داخلہ) — دیکھئے میری...

حاجی۔ (ہنسکر) لے شیطان کے بیٹے! تو حج کو جاتا ہے یا کسی عورت کو صدمۂ فرقت سنانے؟ تو اپنا دل منور بنانے جا رہا ہے یا اس میں ابلیس کا کاشانہ بنانے؟ ارے پاجی! کیا تو اس واحد القہار کے قہر سے نہیں ڈرتا ہے؟ کیا تو نور کی جنت میں نار کی دنیا کا ذکر کرتا ہے! ڈر۔ ڈر تیری دنیا کے شش جہات سکڑ کر تجھے اسپنج کی طرح نچوڑ ڈالیں گے۔ خدا کا غضب اور قہر تیرے جسم کے ڈھانچے کو پاش پاش کر دے گا۔ او بے ایمان! کیا تو حج کا بہانہ بنا کر یہاں آکر فسق و فجور کا جال مضبوط تر بنا رہا ہے! دیکھ۔ دیکھ! تو خود اپنے سر پر اس مولا کے قہر و غضب کی بجلی گرا رہا ہے! او ملعون! — یہاں سے جاکر اب اپنے کو ڈنکے کی چوٹ حاجی مشہور کرنا..........

صادق۔ ہرگز نہیں صاحب ہرگز نہیں۔ آپ کو واقعات کا بالکل علم نہیں اس لئے..........

حاجی۔ علم نہیں؟ ارے گناہوں کے مجموعو! تمہارے گناہوں کی بدبو ان (دیواروں) میں سے نکل کر دور دور سونگھی جاتی ہے۔ لعینو! نجاست کی عفونت کپڑا ڈھانکنے سے کہیں چھپ سکتی ہے۔

صادق۔ ہرگز نہیں صاحب! یقیناً آپ کو معلوم نہیں کہ یہ (اشرف) زندگی کے رباب کا کون سا تار بجا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ ہر وقت مدھم سننے کے عادی ہیں۔ اسی وجہ سے پنچم کے سروں کو بے محل قرار دے رہے ہیں۔

شب کی تاریکی سی خوگر ہو گیا ہی شپّرہ   اس لئے شاکی ہی اب وہ مہرِ عالمتاب کا

واعظِ نادان تیرا وعظ کیا ہی جنگ ہے   معرکہ ہے اب وہ گویا رستم و سہراب کا

ای کہ تو ہے خود ہی اپنی معصیت کی ایک پوٹ   کیا پتہ تجھ کو ہماری زندگی کی باب کا

حاجی۔ میں گنہگار؟ میں معصیت کی پوٹ؟ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے تیسری بار حج کو جانے والا انسان گنہگار؟ ملعونو! خدا سے ڈرو تمہاری آنکھوں کی روشنی بجلی بن کر تم کو راکھ کا ڈھیر نہ بنا دے اور تمہاری سانس خون کا دریا بن کر نہ بہہ جائے۔

صادق۔ بیٹا حاجی! چلا جا — چلا جا۔

حاجی۔ جہنمی کتو! راہِ مستقیم پر لانے والے محسن کو جھڑکتے ہو! قہرِ خدا کا آئینہ دکھا کر گناہوں سے بچانے والے ناصح کو دھمکاتے ہو! نصیحت کی خیرات دینے والے حاجی کو بھکاری سمجھ کر ٹھکراتے ہو!

صادق۔ چلتا بن بیٹا حاجی۔ چلتا بن بیٹا ناصح! نصیحت کرنے آیا ہے ایسا نہ ہو ڈاڑھی دبے کر جائے۔ سنبھلے قبلۂ عالی مقام

حاجی۔ ہاں۔ کیوں نہیں ایسا نہ کہو گے تو اپنے جرم کو کیسے چھپا دو گے مگر تم میرے کانوں کو — میری آنکھوں کو ہرگز دھوکا نہیں دے سکتے میں نے خود سنا کہ وہ (اشرف) ناحق کسی ناپاک عورت کے......

صابر منشی محمد ایوب صاحب (۵۶)

آپ کا نام محمد ایوب۔ صابر تخلص اور والد ماجد کا اسم گرامی حاجی صدیق صاحب اخلاص ہے۔ آپ کچھی میمن ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں بمقام بمبئی پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب ایک اچھے شاعر ہیں۔ دو دیوان مکمل ایک نعتیہ اور ایک عشقیہ تیار ہیں ان کے علاوہ ایک دیوان اور ہے جس میں ہر غزل کی ردیف شعرا کے تخلص ہیں۔

صابر صاحب نے مدرسۂ ہاشمیہ میں اردو فارسی کی تکمیل کی عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ گجراتی زبان میں آپ کو کافی دستگاہ ہے چونکہ آپ کے والد صاحب بھی شاعر ہیں اس لئے شاعری آپ کو ورثے میں ملی ہے۔ آپ شعر کہتے تھے لیکن کسی کو دکھاتے نہیں تھے۔ ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ آپ کے والد صاحب کے استاد سید فقیر محمد صاحب فدا چشتی نے پیش گوئی کی تھی کہ محمد ایوب شاعر ہوں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔

۱۹۱۴ء میں انجمن ترقیٔ سخن بمبئی کے ایک نعتیہ مشاعرہ میں آپ نے شرکت کی۔ جناب بلاغت صاحب امروہوی اکثر آپ کی دوکان پر آتے رہتے تھے۔ دوستانہ تعلقات کے بعد آپ نے اپنا کلام بلاغت صاحب کو دکھانا شروع کر دیا۔ لیکن صابر صاحب کے والد صاحب کو جناب عبدالرؤف صاحب راوی اجمیری تلمیذ حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ کا کلام بہت پسند تھا اس لئے والد صاحب کے ایما سے آپ راوی صاحب کو اپنا کلام دکھلانے لگے۔ ۱۹۱۵ء تک آپ انجمن ترقیٔ سخن کے مہتمم رہے اور بزم کے کئی مشاعرے آپ ہی کے مکان پر ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں بمبئی سے ایک ماہانہ رسالہ تصویر کے نام سے نکالا جو ڈیڑھ سال تک شائع ہوتا رہا اور چند وجوہ کی بنا پر بند ہو گیا۔

چونکہ جناب راوی اجمیری بمبئی چھوڑ چکے تھے اس لئے انجمن ترقیٔ سخن بھی ٹوٹ گئی اور ممبروں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعرے بند ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ مرحومہ نے ایک بچی یادگار چھوڑی جس کا نام رقیہ بائی رکھا گیا اور آپ کی والدہ صاحبہ نے لڑکی کی پرورش کی۔ ۱۹۲۹ء میں ملازمت کے سلسلے میں والدہ اور بچی کی علالت کی وجہ سے آپ نے بمبئی کو خیرباد کہدیا اور مالابار کے مشہور شہر تلیچری میں اقامت گزیں ہوئے۔ اب تک یہیں متمکن ہیں

۱۹۳۱ء میں جب آپ کو کچھ سکون حاصل ہوا تو شاعری کے مردہ ذوق میں پھر جان پیدا ہوئی اس مرتبہ شدت کیساتھ آپ کو کسی مصلح کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کے شاگرد ہو گئے مولانا کے لطف و کرم اور فیض رسانی سے آپ بہت جلد ترقی کر گئے۔

تلیچری میں اردو کا مذاق بالکل نہیں ہے۔ چند حضرات نے وہاں انجمن "اصلاح اللسان" قائم کی جس کا افتتاحی جلسہ آپ ہی کی صدارت میں ہوا۔ آپ نے بمبئی میں مولانا تجمل جلالپوری مرحوم جناب ناطق گلاؤٹھوی۔ جناب ناظم انصاری۔ جناب قضا۔ جناب سحر شاہجہانپوری جناب ندرت میرٹھی۔ جناب تمنا لکھنوی وغیرہم حضرات کے ساتھ بہت سے مشاعرے پڑھے ہیں۔ جلوۂ یار میرٹھ۔ مرصع آگرہ۔ آفتاب ادب معراج خیال۔ سلطان الاخبار۔ مفید روزگار احسن الکلام اور ترقیٔ سخن وغیرہ میں آپ کا کلام چھپا رہتا تھا۔ آج تک آپ تقریباً دس ہزار اشعار لکھ چکے ہیں۔

آپ کو قدرت نے پانچ اولادیں دیں جن میں صرف ایک لڑکی رقیہ بائی بقیدِ حیات ہے جس کی عمر دس سال ہے۔ جسے اردو اور انگریزی میں بلحاظِ عمر کافی دستگاہ ہے۔

آپ کا کلام قدیم رنگِ تغزل لئے ہوئے ہے۔ لیکن حضرت مولانا مدظلہ کی اصلاح سے اب وہ دور ہوتا جا رہا ہے۔ نظم اور غزل آپ خوب کہتے ہیں۔ مشقِ سخن کافی اور اچھی ہے۔

نمونۂ تغزل

نہیں ممکن خطا کوئی نظر کا تیر ہو جائے ۔۔۔ جسے تو دیکھ لے وہ بے خطا نخچیر ہو جائے
کچھ اس انداز سے لکھا ہے خط قاتل نے بسمل کو ۔۔۔ کہ پڑھتے ہی شہیدِ شوخیٔ تحریر ہو جائے
عجب نقشہ ہے اس کافر کے حسنِ حیرت افزا کا ۔۔۔ مصور سامنے آئے تو خود تصویر ہو جائے
معاذ اللہ اک تلوار ہے ترچھی نظر اسکی ۔۔۔ کبھی سیدھی بھی ہو جائے تو ظالم تیر ہو جائے
درِ میخانۂ رحمت سے یہ آواز آتی ہے ۔۔۔ جو ہے تقصیر وار آئے جو بے تقصیر ہو جائے

کرو تم صبر اے صابر کہ دیر آید درست آید
ملے گا گوہرِ مقصود گو تاخیر ہو جائے

قاتل کے دستِ ناز میں شمشیر دیکھ لی ۔۔۔ بسمل نے اپنی موت کی تصویر دیکھ لی
ہر شاخِ گل خزاں سے بغلگیر دیکھ لی ۔۔۔ بگڑی ہوئی بہار کی تصویر دیکھ لی
پروانے کو جلا کے جلی شمع رات بھر ۔۔۔ ظالم نے اپنے ظلم کی تعزیر دیکھ لی
کچھ اپنی آہ کی تو کچھ ان کی نگاہ کی ۔۔۔ القصہ ہم نے دونوں کی تاثیر دیکھ لی
آنکھوں سے کب وہ جلوۂ مستور چھپ سکا ۔۔۔ زیرِ نقابِ حسن کی تنویر دیکھ لی
امید کی فضا ہی میں منڈلا کے رہ گیا ۔۔۔ پرواز تیری طائرِ تدبیر دیکھ لی
عاجز ہوئے نہ عشق کی بارِ گراں سے ہم ۔۔۔ ہمت ہماری اے فلکِ پیر دیکھ لی
اس زندگی نے ہم کو فنا کا سبق دیا ۔۔۔ اس آئینے میں موت کی تصویر دیکھ لی
دیکھا نہ اسکو تھا جسے منظور دیکھنا ۔۔۔ یوں دیکھنے کو کعبے کی تعمیر دیکھ لی
ملنے نہ پائی تھی کہ نظر اس کی پھر گئی ۔۔۔ صابر نے اپنی گردشِ تقدیر دیکھ لی

غم بھی نشاط ہے دلِ ناشاد کیلئے ۔۔۔ کیا کیا مزے فراق میں فریاد کیلئے
وہ اور ہیں جو نغمہ بلب آئیں بزم میں ۔۔۔ ہم تو بنے ہیں نالہ و فریاد کیلئے

سناتا ہوں میں قصہ ہجر کا لیکن ہے شرط اتنی
کہ میرے پاس بیٹھے سننے والا اور سنے دل سے

مدِ نظر اگر ہے حقیقت کا اعتراف ۔۔۔ میری نگاہ سے اُسے دیکھا کرے کوئی

عشق نے اس کو کیا دونوں جہاں سے بے نیاز
آنکھ میں اس کا تصور یاد اس کی دل میں ہے
نامہ بر، نامہ بر! ارے قسمت! ۔۔۔ جس کا مجھ کو تھا انتظار نہ آیا

الجھنوں سے جسکو دنیا میں نہ ہو فکرِ نجات ۔۔۔ اس سے کہہ دو اک دلِ بے مدعا پیدا کرے
حضرتِ سیماب کا لطف و کرم صابر پہ ہے ۔۔۔ کیوں نہ رنگ اپنی غزل میں یہ نیا پیدا کرے

موت سے پہلے ہی کر لیتے ہیں ماتم اپنا ۔۔۔ اے غریب الوطنی دیکھ، تو عالم اپنا

خفتگانِ گور اب کروٹ بھی لینے کے نہیں ۔۔۔ زیست کا جھگڑا چکا کر سو گئے آرام سے

اللہ رے کرشمہ تصور کا ہجر میں ۔۔۔ آنکھوں سے دور ہے وہ مگر دل کے پاس ہے

مری سادہ دلی تو کوئی دیکھے ۔۔۔ دعائیں مانگتا ہوں آسماں سے

نہ کر تلاش مسرت جہانِ فانی میں ۔۔۔ اس انجمن میں کوئی شادماں نہیں ملتا
یہ فیضِ حضرتِ سیماب کا ہے اے صابر ۔۔۔ کسی سے اب مرا طرزِ بیاں نہیں ملتا

نمونۂ نظم

"پروانہ"

تیرے بغیر رہتا ہے پروانہ بیقرار
اے شمع تجھ پہ ہوتا ہے سو جان سے نثار

کرتا ہے یہ طواف ترا آکے ہر گھڑی
سمجھا ہے تیری شعلوں میں یہ رازِ زندگی

سیکھے ہوا ہے خوب یہ اسرارِ عشق کو
تیرے بغیر زندگی دشوار ہے اسے

پڑھتا ہے تیرے روبرو آکر نمازِ عشق
افشا یہ سب پہ کرتا ہے محفل میں رازِ عشق

سجدے جو کر رہا ہے جبینِ نیاز سے
معمور دل ہے لذتِ سوز و گداز سے

کیا جانے تیری کونسی آئی پسند ادا
یہ دیکھتے ہی تجھ کو جو دل سے فدا ہوا

تیرے بغیر چین نہیں اسکو زینہار
فرقت میں تیری رہتا ہے بیتاب و بیقرار

پروانے کو جلا کے جلی تو بھی رات بھر
بیتاب و بیقرار رہی تو بھی تا سحر

انساں کو سوزِ عشق سے کیوں احتراز ہے
ننھی سی جان میں بھی یہ سوز و گداز ہے

جناب محمد ایوب صاحب صابر کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

تیرے جانے سے ہماری وہ مسرت نہ رہی
اب تو [ساری] دنیا میں کسی سے ہمیں الفت نہ رہی

دل جگر جس سے جلیں سوز وہ الفت میں نہیں
آتشِ عشق میں وہ اگلی [سی] حرارت نہ رہی

داستانِ گُل و بُلبُل ہی فقط باقی ہے
سچ اگر پوچھئے ان میں بھی محبت نہ رہی

عیش و عشرت میں بسر ہوتی تھی اپنی پہلے
آج وہ دن نہ رہے اور وہ حالت نہ رہی

زندگی اپنی بسر کرتے ہیں سب سے ملکر
اپنے دشمن سے کبھی [کبھی اب] ہم کو عداوت نہ رہی

بوالہوس عشق کا دم بھرتے ہیں اللہ اللہ
اس لئے ہوسِ عشق میں پہلی سی لذت نہ رہی

وہ چمن مٹ گیا جس میں کہ بہار آئی تھی
دل کو بہلائیں کہاں اب کوئی صورت نہ رہی

میری قسمت میں جو لکھا ہے وہ پورا ہوگا
دوست دشمن سے مجھے کوئی شکایت نہ رہی

تو نے صابر کو بچایا ہے ہر اک آفت سے
حضرت [یہ بھی] تیرا ہی کرم ہے کہ مصیبت نہ رہی

صابر — محمد غلام مرتضیٰ صاحب بازیدپوری (۵۷)

آپ کا نام محمد غلام مرتضیٰ اور صابرؔ تخلص ہے۔ ۸ / اکتوبر ۱۹۰۴ء کو بمقام بازید پور ضلع دربھنگہ پیدا ہوئے۔ آپ ایک معزز مگر غریب خاندان کے فرد ہیں جو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہے۔ آپ کے والد صاحب کی زندگی بھی کس مپرسی میں بسر ہوئی۔

آپ نے اپنی تعلیم کی تکمیل زیادہ تر مولوی حکیم وزیرالدین صاحب سے بازید پور ہی میں کی۔ اور بھی کئی اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ اردو فارسی کیساتھ ساتھ آپ انگریزی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ درسی کتابیں آپ نے اپنے بڑے بھائی مولوی غلام مصطفےٰ صاحب انسپکٹنگ مولوی، ہومنی سے پڑھیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ مونگیر ٹریننگ اکیڈمی اسکول میں داخل ہوے آپ کی بیماری اور والد صاحب کی بیکاری حارج تعلیم ہوئی۔ اسی زمانہ میں آپ کے بھائی صاحب ٹریننگ اسکول میں سکنڈ ماسٹر تھے ۱۹۲۵ء میں مولوی محمد عثمان خانصاحب (ابراہیم پوری عرف بارد) کی وساطت سے ٹریننگ اسکول شیخو پورہ میں معلم ہو گئے لیکن سررشتۂ تعلیم کی سخت گیریوں نے اس سلسلہ میں بھی آگے نہ بڑھنے دیا عرصۂ دس سال سے آپ دربھنگہ ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل انگلش اسکول میں بحیثیت مدرس اردو ملازم ہیں۔

شاعری کا شوق آپ کو ۱۹۲۰ء سے ہے۔ ابتدائی زمانہ میں تو یہ حالت تھی کہ سوائے شعر کہنے کے کوئی دوسرا کام ہی نہ تھا۔ یہاں تک کہ اسکول میں طبیعت نہ لگتی تھی اور وہاں بھی یہی شغل جاری رہتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ بغیر کسی استاد کے ہو رہا تھا۔ آپ نے اپنے معیار کو بلند کرنے کے لئے اور فن حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کے دوادین۔ نیز "فنِ شاعری"، "رازِ عروض"، "ایضاح القوافی"، "جام فہم عروض" اور شاعر کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ ۱۹۳۳ء میں جب اپنے اوپر کافی اعتماد ہو گیا تو مشاعروں میں بھی شرکت کی لیکن ابھی آپ اصلاح کی کمی محسوس کر رہے تھے اور کسی صاحبِ فن کی تلاش میں تھے چنانچہ ۶ / جون ۱۹۳۴ء کو بغیر کسی وساطت کے آپ قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہٗ العالی کے ارشد تلامذہ میں داخل ہو گئے اور اس طرح آپ کے ذوق کی پذیرائی ہو گئی۔ "ندیم" گیا اور "شاعر" آگرہ میں آپ کا کلام اکثر چھپتا ہے۔ آپ ایسے مقام پر ہیں جہاں کا ماحول بالکل غیر شعری ہے۔ آپ کی آرزو ہے کہ کسی ایسے مقام پر رہیں جہاں شعر و شاعری اور زبان کا چرچا عام ہو لیکن ملازمت کی سخت گیریوں سے مجبور ہیں۔

آپ کی تصانیف سے ایک رسالہ "حفظِ صحت" اور ایک ناول "گلگشتِ سعیدہ" غیر مطبوعہ موجود ہیں۔

نمونۂ تغزل

جس پہ قرباں ہے زمانہ وہ ادا کسکی ہے — وہ نہیں ہے تری صورت تو بتا کس کی ہے
اللہ اللہ غضب ہے تری ناوک فگنی — کون زخمی ہو نگاہوں سے قضا کس کی ہے
منزلِ یاس میں یہ کس کی ضیا صبحِ امید — شامِ غربت میں چمک جلوہ نما کس کی ہے
دیر و کعبہ میں اگر نور ترا روشن ہے — سچ بتا شمعِ کلیسا میں ضیا کس کی ہے
خندۂ گل ہی میں کیا غنچۂ نورس میں بھی — یہ مہک اور یہ کھٹک صبح و مسا کسکی ہے
شورِ ناقوس و اذاں بانگِ جرس اور ذیں میں — یہ تری آواز نہیں ہے "تو بتا" کسکی ہے
کون جانے مری اندازِ جنوں کو صابرؔ — کس پہ مرتا ہے زمانہ یہ ادا کس کی ہے

کشمکش میں ہے لے جانِ جانِ زندگی — ہے شب و روز نالہ کناں زندگی
سوز دل میں زباں پر فغاں زندگی — ہے غمِ حال کی ترجماں زندگی
دیکھ کر زندگی کے نشیب و فراز — کہتی ہے الاماں الاماں زندگی

بحرِ الفت میں جو ڈوب کر ہو فنا ہے اُسی کی یہاں جاوداں زندگی
کیوں کہوں اس کو پیمانۂ مختصر رکھتی ہے آرزوئے جہاں زندگی
یہ مہ و سال لمحے گزرتے نہیں ہو چلے پاؤں گویا رواں زندگی

وہ ابھرنا مرا شورشِ موج سے
اب وہ پر شور صابرؔ کہاں زندگی

ٹھہرو ناقۂ لیلیٰ ترا دیوانہ آتا ہے اڑا ئے جائے گا ٹھوکر سے گردِ کارواں کب تک
جو ہم ناکامِ الفت ہیں ہمیں ناکام رہنے دو کئے جائیگا تو اے شوق سعیٔ رائیگاں کب تک
یہاں ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھلی ہیں نئی راہیں درِ دلدار تک پہنچوں نہ جانے کامراں کب تک
ہوا ہے دردِ غم روزِ ازل سے رازداں میرا خبر کیا ہے رہیگا یہ بھی میرا رازداں کب تک
نہیں معلوم کب ہو ختم گردش اپنی قسمت کی چھٹے ہیں کارواں سے پائیں منزل کا نشاں کب تک
جوابِ نامہ کیا خود ہی چلا آئے وہ گھر میرے مرا جذبِ محبت یونہی جاتا رائیگاں کب تک
نجانے شعلۂ احساس کب پیدا ہو مسلم میں جلیگی شمعِ محفل بنکے یہ نوکِ زباں کب تک
بدل دی ہمتِ مسلم اسی پھر دورِ ماضی سے نظر میں منظرِ تاراجیٔ ہندوستاں کب تک

یقینی حشر میں دیدار اس کا ہوگا اے صابرؔ
رہیگا مجھ سے وہ بیدرد یوں دامن کشاں کب تک

ہو جیسے چاند کے پہلو میں مجمع چند تاروں کا سماں آنکی گلی میں دیکھا پھولوں کے ہاروں کا
نجانے دیکھ کر کیوں اسکو صابرؔ اشک بھر لایا وہ ہی فہرست جسمیں نام تھا امیدواروں کا

جب چاہوں گا لگاؤں گا بزمِ جہاں میں آگ یہ میری دل کی آہ بھی شعلے سے کم نہیں
صابرؔ اس آستاں پہ ہے سجدے سے ہمکو کام ٹھکرائے وہ جبینِ طلب کو تو غم نہیں

بیداد کروگے ستم ایجاد کروگے یونہی دلِ ناشاد کو تم شاد کروگے
آباد کر دیا اُسے برباد کر دو تم لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے

کہتا ہے یہی شام و سحر ہجر میں صابرؔ
کب تک دلِ وحشی کو تم آزاد کروگے

تھی عندلیب کیلئے مخصوص بوئے گل موجِ صبا سے ہوگئی تشہیر پھول کی
مشاطۂ بہار سے کہدو کہ ہوشیار بکھری ہوئی ہے زلف گرہ گیر پھول کی

صابرؔ ہے شیفتہ لبِ رنگین یار کا
کچھ اسکے دل سے پوچھئے توقیر پھول کی

ہے نظّارہ اک بار سجلیوں کا حسینوں کی ترچھی نظر دیکھ لینا
وہ اس شوخ کا میری خلوت میں آکر ادھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا
نہیں تیغ کا باندھنا عیب لیکن ذرا پہلے اپنی کمر دیکھ لینا

وہم کی یورش ہے اور رہ رہ کر آتا ہے خیال
نامہ بر بالخیر پہنچا یا وہاں مارا گیا
قدر دانِ فکرِ عالی کون ہے صابرؔ یہاں
خاک ہو فکرِ سخن جب قدرداں مارا گیا

عملی جوش کارفرما ہے رگِ مسلم پہ ہے شباب ہنوز
پھونکدوں میں چمن کو جب چاہوں ہوں قفس میں پُر التہاب ہنوز

صبا — رفیع احمد صاحب متھراوی (۵۸)

آپ کا پورا نام رفیع احمد عرف اقبال احمد ہے لیکن آپ مشہور رفیع احمد ہی ہیں۔ آپ جناب نسیم متھراوی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو بمقام متھرا محلہ ملاّ گھاٹی پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام مولوی رضی الدین صاحب خطیب ہے۔ آپ کے والد اگرچہ شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں لیکن موزوں طبع ضرور ہیں۔ بسا اوقات اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ کہ اکثر شعر اور مصرعے بیساختہ آپ کی زبان سے موزوں نکل جاتے ہیں۔ آپ خاندانی مولوی ہیں۔ آپ کا خاندان متھرا میں شریف النسل اور معزز سمجھا جاتا ہے۔ صبا صاحب کو خاندانی قاعدے کے مطابق شروع میں مذہبی تعلیم دلائی گئی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد آپ نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے منشی کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ قابلیت اردو اور کامل کے امتحانات میں شرکت کی۔ اور کامیاب ہوئے۔ امسال الہ آباد یونیورسٹی کے عربی کے امتحان مولوی اور پنجاب کے امتحان منشی فاضل میں شرکت فرما رہے ہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانہ سے آپ ذہین الطبع اور ذکی ہیں۔ آپ ہمیشہ اپنی کلاس میں سب سے ممتاز رہے۔ اساتذہ کلاس میں آپ پر سب سے زیادہ مہربان رہتے تھے۔ مضمون نگاری اور تصنیف کا شوق آپ کو بچپن ہی سے ہے۔ آپ شاعری اگرچہ طالبعلمی کے زمانہ میں بھی کرتے تھے لیکن گاہے گاہے۔ مستقل شوق آپ کو تین سال سے پیدا ہوا اس قلیل عرصہ میں آپ نے جو نمایاں ترقی کی ہے وہ نہ صرف آپ کے ذکی الفہم ہونے کا ثبوت ہے بلکہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ آپ فطری شاعر ہیں۔ قدیم رنگ تغزل سے آپ کو شروع ہی سے نفرت ہے۔ خاص کر مولانا سیماب اکبرآبادی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد آپ نے اس رنگ کو نہ صرف خود ترک کیا بلکہ حتی الوسع اس بات کی کوشش کی کہ آپ کے ملنے جلنے والے شعرا بھی اس سے اجتناب کریں۔ چنانچہ آپ کے بیشتر قطعات اور رباعیات اس کے شاہد ہیں۔ ؎

دلکو گرما دینے والے تیر و نشتر چاہئیں
پُر اثر الفاظ جس میں ہوں وہ دفتر چاہئیں
کنگھی چوٹی کی ضرورت اب نہیں ہے ہند کو
جو سجا دیں روح کو کچھ ایسے زیور چاہئیں

آپ نے مارچ ۱۹۳۶ء میں مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

یہ آپ کا شاعری سے فطری لگاؤ کہئے یا مولانا سیماب مدظلہ کا فیضِ سخن کہ اس قلیل عرصہ میں آپ کے کئی شاگرد بھی ہوگئے ہیں چنانچہ ضیا۔ فضا۔ عطا۔ نور۔ عزیز۔ معین۔ شمیم متھراوی صرصر متھراوی وغیرہ آپ ہی سے اصلاح لیتے ہیں بعض غزلیں آپ کے پاس باہر سے بھی اصلاح کے لئے آتی ہیں۔ چنانچہ کراؤلی ضلع مین پوری میں بھی آپ کے دو شاگرد ہیں۔

یوں تو ہر شاگرد کو اپنے استاد سے اُنس ہوتا ہے لیکن صبا صاحب کو مولانا سیماب مدظلہ سے وہ دلی ارادت ہے کہ کوئی دن اور کوئی وقت ایسا نہیں جاتا جس میں آپ اپنے استاذی المکرم کا ذکرِ خیر کرتے ہوں۔ چنانچہ آپ نے اپنے اکثر اشعار میں اس نسبت کو سراہا ہے ؎

سیماب سے ادیب کا شاگرد ہوں صبا
رکھتے نہیں جواب جو اپنا ہزار میں

ہے کرم حضرتِ سیماب کا مجھ پر جب سے
اے صبا میری غزل سوز کی ہر ساز میں ہے

ہی کرم علامۂ سیماب کا مجھ پر صبا باتوں باتوں میں جو اکثر شعر کہہ لیتا ہوں میں

اس میں شک نہیں کہ اس عقیدت و ارادت ہی کا اثر ہے کہ صبا صاحب کو رفیع و بلند اشعار کہنے کی ایسی مہارت ہوگئی ہے جو بعض دیرینہ مشق شعرا میں بھی نہیں پائی جاتی آپ مدت تک متھرا کے ہفتہ وار اخبار اتفاق کے معاون خصوصی بھی رہے ہیں اس اخبار کی ترتیب اور تدوین آپ ہی کے سپرد تھی مضامین کا بیشتر حصہ آپ کا ہوتا تھا اور جب تک یہ جاری رہا آپ در پردہ اس میں کام کرتے رہے۔

اسوقت آپ جمعیت القریش اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور اردو پبلیٹی انسٹیٹوٹ کے منیجر ہیں۔ آپ فارسی میں بھی اشعار کہتے ہیں نیز تاریخ نکالنے میں بھی کافی مشق ہے۔

اس زمانہ کی تصنیف نغمۂ سحری دو حصص در رمضان المبارک کی نظموں کا مجموعہ، چیٹری اور دو دو ایک مبسوط ناول۔ ماں کا پیار۔ کفایت شعاری فسانۂ ماضی وغیرہ ہیں چیٹری اور دو دو کا افسانہ اخبار اتفاق متھرا میں باقساط شائع ہوچکا ہے۔ نغمۂ سحری کے دو حصص عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔ بقیہ کتب زیر ترتیب ہیں۔

نمونۂ تغزل

وہ اثر ہم اضطراب شوق میں پیدا کریں حسن کی نیرنگیاں بھی کروٹیں لا کریں
حسن تو آغوشِ فطرت میں بہت معصوم ہے گرمئ عشق و تمنا کو مگر ہم کیا کریں
آج کل اس بزمِ عالم کی فضا کچھ اور ہے آپ نغمۂ وقت کی آواز میں گایا کریں
حسن خود دیکھ کر ہم آغوشِ نظر ہو جائیگا آرزو والے مذاقِ دید تو پیدا کریں

کائناتِ دہر میں پنہاں تری آواز ہے کائناتِ دہر بھی تیرا ہی شاید ساز ہے
بے خبر انجام سے سرگشتۂ آغاز ہے اُسکی ہستی بھی جہاں میں کیا سراپا راز ہے
ہے اچھوتا راز کوئی ذہنِ عالم ساز میں رنگِ عالم فطرتاً جو مائلِ پرواز ہے

سجدہ کیسا۔ امتحانِ عجز ہوگی۔ سر نذر کر بے خبر بہوش میں آ۔ یہ حریم ناز ہے
ذہنِ فطرت میں کوئی محفوظ ہے انجام بھی عشق کی منزل کا یا آغاز ہی آغاز ہے
میری یہ مجبوریاں ہیں حاصلِ صد مشکلات مجھکو ان مجبوریوں پر ناز تھا اور ناز ہے
چھیڑ کر تو دیکھئے مضراب الفت سے اسے میری سازِ زندگی میں آپ کی آواز ہے
مجھکو ان ناکامیوں سے انسیت ہے فطرتاً میری ان ناکامیوں میں ایک گہرا راز ہے
فی الحقیقت اے صبا سارے زمانے کے لئے
میری ہستی راز تھی اور میری ہستی راز ہے

تم نے مذاقِ دید جب حد سے سوا مجھے دیا عالمِ ممکنات کو پردہ سرا بنا دیا
عالمِ ہست و نیست کا کچھ تو سبب بتائیے اسکو بنا کے آپ نے آپ ہی کیوں مٹا دیا
پردۂ التفات میں مجھ سے نگاہ پھیر کر غایتِ رازِ زندگی تم نے مجھے بتا دیا

حُسن کی فطرت کبھی ایسی ضیا پیدا کرے ذرّہ ذرّہ جس کی خاطر دل نیا پیدا کرے
سازِ دل پہ ہو رہی ہے بارشِ مضرابِ غم ہر نفس اک نغمۂ درد آشنا پیدا کرے

اب تو دعائے نیم شبی بھی ہے بے اثر باتوں میں تھا اثر وہ زمانہ گذر گیا
جب تم نہ تھے تو لب پہ دعائیں تھیں سیکڑوں تم آ گئے تو لطفِ دعائے سحر گیا

اے بے نیازِ دل تجھے احساس چاہیئے ہر ذرّہ ایک دل ہے تری رہگذار میں
آثارِ حُسن و عشق میں ہو ربط کس طرح تم اختیار میں ہو نہ میں اختیار میں

کہیں ذراتِ مدفن میں مری جنبش نہ پیدا ہو نہ ہم مسکرا کر دیکھئے گورِ غریباں کو
فلک والے نہ اس کا راز سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے امانت عشق کی کیوں دی گئی مشتِ غبارِ انساں کو
خدا ہی جب مدد کرتا نہیں آشوبِ طوفاں میں تو پھر یہ ناخدا کیا کم کرے گا زورِ طوفاں کو

رنگ اور لے کا تصنع تو مغنی جانیں فطرتاً سوز مرے درد بھرے ساز میں ہے

اب کسی اور طریقے سے پکارو مجھ کو تمہیں
یہ تو آواز تمہاری مری آواز میں ہے

نظر والے جہاں بھی حسن کی تنویر دیکھیں گے
تو واں میری محبت کو بھی دامنگیر دیکھیں گے
نہیں معلوم کیا سمجھیں تماشہ دیکھنے والے
تری تصویر دیکھیں گے مری تصویر دیکھیں گے

دفورِ تجلی سے مجبور ہو کر
صدا دل سے نکلی انا الطور ہو کر
نگاہِ تمنا سے مجبور ہو کر
مرے دل پہ چھایا کوئی نور ہو کر

تجلی حسن کی ہر سو عیاں معلوم ہوتی ہے
جوانی میں نظر بھی نوجواں معلوم ہوتی ہے
ضرورت ہی اٹھائیں خضر اور الیاس کی قیدیں
ہمیں ہر شے نشانِ کارواں معلوم ہوتی ہے
ارادہ تیرے دل کا ہم بتا دیتے ہیں پہلے سے
ہمارے منہ میں تیری ہی زباں معلوم ہوتی ہے

از شاخِ گل جدا نہ شود آشیانِ ما
کوشش ہزار بار کند باغبانِ ما
در بر زبانِ خلق شدہ داستانِ ما
در ظرفِ تنگ دہر نہ گنجد فغانِ ما
منزل تلاش می کند اکنوں نشانِ ما
ای شوق دل رسید کجا کاروانِ ما
از راہ در در آمدہ ناکام و نامراد
منزل شناس نیست ازیں کاروانِ ما
بادِ بہار موجۂ بادِ خزانِ ماست
بادِ خزاں چہ سبز کند گلستانِ ما
از خاکِ ما شگفتہ شود نسترن و سمن
از سوزِ عشق سبز شود گلستانِ ما
رازیکہ در حجاب نہادہ تو در ازل
آں راز را بیاں کند اکنوں زبانِ ما
ما از زمین و چرخ نداریم نسبتے
دنیائے ما جداوِ دگر آسمانِ ما
تعمیر ما ز خاک ستم شد سلے صبا
گر باد و برق خاک کند آشیانِ ما

نمونۂ نثر صبا متھراوی

محبت

محبت نورانی محبت ...... تو فریب آرزو نہیں ...... تجھ میں چاند کو شرما دینے والی تجلیاں ہیں .... تو رنگینوں کا مجمہ ہے .... تو تشاط روح ہے .... تو وہ چمکتا ہوا سورج ہے جس کی ہر کرن میں لاکھوں خورشید پوشیدہ ہیں .... تو کیوپڈ ہے .... اور وہ کیوپڈ جس کا تیر کبھی خالی نہیں جاتا .... تیری تیر سے سائیکی کا قلب مجروح ہے ...... تو آزادی کا دیوتا ہے .... تیرا پجاری خود پرستش کے قابل ہے .... تیرے ہی حسن آفریں جلوے طور کی پہاڑی پر ..... فاران کی چوٹی پر ظاہر ہوئے .... دنیا کا ذرہ ذرہ تیرا رازدار ہے ...... کعبہ کا سیاہ غلاف تیرے ماتم میں سوگ نشیں ہے .... تو نور ہے ...... تو نار ہے ...... تو حسن ہے ...... تیرے حسن میں کشش ہے ...... اور وہ کشش جو ناز والوں کے ناز میں نہیں ...... جو نیاز والوں کے نیاز میں نہیں ۔ آ ... جلد آ ...... اور میرے کاشانۂ دل میں اپنا مسکن بنا ۔

جناب فیع احمد صاحب صبا متھراوی کی نظم پر حضرت مولانا سیماب ظلہ العالی کی اصلاح

انسانی حیات کا تاریک پہلو

چھا رہی ہیں منظرِ عالم پہ یہ تاریکیاں
یا گناہوں کی سیاہی ہے محیطِ آسماں
منعموں کی یہ شر انگیز سازش ہے کوئی
اڑ رہا ہے یا غریبوں کی یہ آہوں کا دھواں
ہیں مسلط کبر و نخوت یہ فضائے دہر پر
چل رہی ہیں یا ہوائے تندگی یہ آندھیاں
ذہن پر انساں کے ہے معکوس فطرت کا عتاب
سلب ہیں یا عالمِ ہستی کی کل آزادیاں
یہ ضمیر و روح کی تخریب کا سامان ہے
یا تمدن میں ہماری آ گئیں ہیں خامیاں
یا ہیں شورش گاہِ ہستی کی اساسیں ہی خراب
ہے ہماری بربادی بھی اس تعمیر عالم میں نہاں

یہ حسد یہ دشمنی یہ بیر یہ بغض و نفاق
ہے تباہی پر جہاں کی آ گیا بالا تفاق

ان حوادث میں رواں ہے کشتیٔ عمر رواں
سانس لینے کی بھی گنجائش نہیں ملتی جہاں
بیخودی کی موج سے انساں ہے مصروف نشاط
خواب کے عالم میں گویا ہو رہا ہے نغمہ خواں
ذہن ہے کھویا ہوا سا عقل ہے ماؤف سی
جیسے دیوانہ ہو کوئی دشت کی جانب رواں
عارضی سی اک نظر ہے ساحلِ مقصود پر
سامنے ہو طائرِ بے پر کے جیسے آشیاں
بے خبر ماحول سے نا آشنائے رنگ و بو
ہر ادا ہر طرز سے تاریک پہلو ہیں عیاں

فکر ہے یا آغاز کی یا فکر انجام ہے
یہ تلاطم اب بہا لیجائیگا جانے کہاں

حاجی ضیاء الاسلام صاحب کاندھلوی

آپ کا نام ضیاء الاسلام اور ضیاؔ تخلص ہے۔ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں اپریل ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ضیا صاحب کے آباؤ اجداد کا شمار مظفر نگر کے صاحبِ حیثیت اکابر اور معززین میں ہوتا ہے۔ زمینداری اور باغات وغیرہ اس زمانہ میں بھی اس خاندان کے قبضہ میں تھے اور اب بھی ہیں۔ ضیا صاحب کاندھلہ کے مشہور رئیسوں میں ہیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کاندھلہ ہی کے مکتبوں اور مدرسوں میں ہوئی۔ مدرسہ کی تعلیم کے اختتام پر آپ علی گڑھ چلے گئے سنہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک علی گڈھ کالج اور اسکول میں متعلم رہے اور وہیں۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ کالج کی تعلیم کے بعد آپ پھر کاندھلہ چلے آئے سنہ ۱۹۳۱ء تک آپ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ اسی اثنا میں حج بیت اللہ شریف کیلئے روانہ ہو گئے۔

آپ عرصہ تک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ بھی رہ چکے ہیں۔ چونکہ آپکی طبیعت اس قسم کے اعزازوں سے بے نیاز ہے اس لئے آپ نے کبھی سرکاری ملازمت کی پروا نہ کی۔ نام و نمود سے آپ کو اس درجہ گریز ہے کہ باید و شاید۔ اس کا اندازہ اس چیز سے ہو سکتا ہے کہ باوجود متعدد بار لکھنے کے آپ نے اپنا تذکرہ روانہ نہ فرمایا۔ اور ہر مرتبہ کسر نفسی فرمائی۔ اصرار پیہم سے مجبور ہو کر تذکرہ بھیجا بھی تو قطعاً نامکمل صرف چند اشارے لکھدیئے۔

سنہ ۱۹۳۱ء سے آپ اپنی زمینداری اور جائداد و باغات وغیرہ کی نگہداشت میں معروف ہیں۔ گوشہ نشین۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور باوضع بزرگ ہیں۔

آپ کی شاعری کا آغاز کب ہوا اور کیوں کر ہوا۔ یہ خود آپ کو بھی معلوم نہیں۔ آپ فطری شاعر ہیں اور فطرت شناس۔ نبضِ فطرت آپکی انگلیوں میں ہے قلم کی جنبش سے صفحۂ قرطاس پر وہ گلکاریاں کرتے ہیں کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ عرصۂ دراز سے شعر کہتے ہیں سنہ ۱۹۲۳ء میں آپ حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہ کے تلامذہ میں شریک ہوئے۔ اپنے استاد محترم کی ضیا صاحب کتنی قدر کرتے ہیں۔ اسے یا تو وہ خود جانتے ہیں یا قبلہ مولانا۔ یہ مولانا مدظلہ کا ہی فیضِ سخن ہے کہ آپ بہت مختصر عرصہ میں کہیں سے کہیں پہونچ گئے ہیں۔ نظم و غزل دونوں لکھتے ہیں۔ مشاعروں کی شرکت سے آپ ہمیشہ گریز فرماتے ہیں۔ آپ کے کلام سے کہنہ مشقی ٹپکتی ہے۔

نمونۂ تغزل

دل کا وحدت کدہ بتخانۂ آذر نکلا — بت شکن جسکو سمجھتی تھی وہ بت گر نکلا

بزمِ گیتی سے میں اسدرجہ مکدر نکلا — سیرِ ظلمات سے جس طرح سکندر نکلا

کرگئی کام مرا اک غلط اندازِ نظر — پرتوِ مہر سے ذرہ مہِ انور نکلا

چلکشِ اشک ذرحمت کا اٹھا یا طوفاں — ٹوٹ کر کاسۂ دل چشمۂ کوثر نکلا

رہی دائم اسی نفرت مجھے الفت کی خلش — دل میں جو بیٹھ گیا خار وہ نشتر نکلا

ای ضیا جس کو میسر ہوا فیضِ سیمابؔ
وہ سخن فہم سخن سنج سخنور نکلا

رہبر بنا کسی کو نہ ہمداستاں بنا — ہر کارواں سے اپنا جدا کارواں بنا

ظلمت سرائے قلب کو جنت نشاں بنا — پھر میہماں بنا اوسے یا میزباں بنا

کر چشم انتظار کو محوِ جمالِ دوست — گلزار عشق کو چمنِ جاوداں بنا

مضمر فنائے عشق میں ہے اک حیاتِ نو — ہستی کو اپنی زندگیِ جاوداں بنا

احساس کا ہی نام بیاں شادی و الم　　احساس کی فضا سی بلند آشیاں بنا
بلبل شباب گل کا نہیں ایک شب سے بیش　　چن تنکے پھول دیکھ لی یا آشیاں بنا
ناموس و ننگ و نام و نشاں عار ہیں ضیا
ہستی کو جس قدر بھی بنے بے نشاں بنا

اب قید محبت سی شاید جز مرگ رہائی مشکل ہے
اک درد ہی جو بیدرماں ہو اک سعی ہی جو لاحاصل ہی
دیکھ آبلہ پائی کوشش کا انجام یہ ہی یہ حاصل ہی
پیغام اجل کا سر پہ ہے آنکھوں میں چراغ منزل ہی
احباب دبا کر مٹی میں یہ کہہ کر رخصت ہوتے ہیں
واماندہ مسافر چین سے سو اب تجھ کو سکون کامل ہی
افتاد ہماری قسمت کی آسودۂ ساحل کیا جانیں
منظر ہے فنا کا پیش نظر کانوں میں صدای ساحل ہی
جب عشق غرض سے آلودہ ہوتا ہی ہوس بن جاتا ہی
عشق اور ہوس کی وادی میں نازک سی یہ حد فاصل ہی
ای راہرو نابردہ محن رکھ سوچ کے اس منزل میں قدم
ہر خشت ہی سنگ راہ طلب ہر ذرہ حجاب منزل ہی
اللہ ری ذوق راہ طلب لبریز ہی دل امیدوں سے
ہر سنگ پہ سنگ در کا گماں ہر بانگ نوای منزل ہی

فانوس دلکو نور سے پھر جگمگا دیا　　ویرانے میں چراغ محبت جلا دیا
میں کس زباں سی شکر کروں مجھ کو کیا دیا　　جو کچھ دیا وہ ظرف سے میری سوا دیا

جستن ز در غیر زیاں بود خطا بود　　پنہاں بہ نگاہ کرم یار شفا بود
ہر موج صبا حلقۂ زنجیر بلا بود　　بلبل بہ قفس گل ہدف خار جفا بود
صوفی نہ ز خود بندۂ تسلیم و رضا بود　　واماندۂ صد مرحلۂ بیم و رجا بود
چوں راہرو سرکوئی رہ ہستی فانی　　در سلسلۂ روز و شب و صبح و مسا بود
صد دفتر نیرنگیٔ عالم ورق گل　　پروردۂ خون شہدا رنگ حنا بود
نے طاقت گفتار نہ یارائی رمیدن　　طوفان فنا پیشم و ناری بہ قضا بود
رفتم بہ در شیخ و تسلی طلبیدم　　او نیز پی شرمندگی جرم و خطا بود
دردیکہ نہ شد بارکش منت درماں　　از دیدۂ تحقیق جو دیدیم دوا بود
زد شعلہ چو در خشت خودی برق تجلی
ہر سمت ضیا بود۔ ضیا بود۔ ضیا بود

دل بیچتا ہوں رونق بازار کیلئے　　یہ جنس بے بہا ہے خریدار کیلئے
لذت شناس تیغ ستم ہی تو بڑھ کی چل　　منصور وار رقص کناں دار کیلئے
غربت میں میری پائے طلب کا ہر آبلہ　　اک چشم منتظر ہے ہر اک خار کیلئے
رسم فغاں حرام ہی ملت میں عشق کی　　واجب ہی سجدہ ہر خلش خار کیلئے
سن یاوری بخت کہ شب میں نے خواب میں　　بوسے لپٹ لپٹ کی دریار کیلئے

نمونۂ نظم

"برخیز"

آسماں دُر بار ہی کشت زمیں زرخیز ہی　　خاطر دہقاں نشاط کار سے لبریز ہی
شاخ گل گلپوش ہی گل ریز ہی گل خیز ہی　　نکہت افشاں گل ہی شبنم گل پہ گوہر ریز ہی
بادۂ توحید ہی اور ساقی پُر ریز ہی　　وہ تہیدستان قسمت ہیں جنہیں پرہیز ہی
ظلمت شب میں سحر کی نور کا آمیز ہے　　منظر ارض و سما کتنا نشاط انگیز ہی
مضطرب دلکو سکون آموز ہی شب کا سکوت　　ہو کا عالم ہی جہاں نظارہ وجد انگیز ہی
تاری پژمردہ ہیں خواب آلودہ آنکھوں کیطرح　　میٹھے جھونکوں میں نسیم صبح عنبر ریز ہی
پھول کی معصوم فطرت اور غنچوں کا ابھار　　شاخ گل ہی جلوہ گر یا اک بت نوخیز ہی
اک حیات تازہ کی حامل ہی ہر موج صبا　　توسن فکر رسا کو ہر نفس مہمیز ہے
خود بخود روشن ہوئی آثار فطرت کی کتاب　　جوہر ادراک ارباب معانی تیز ہے
محو ہیں درس حقیقت میں گل و برگ و ثمر　　طائران خوش نوا کا نغمہ دل آویز ہی

دے رہی ہے جھوم کر ہر شاخ پیغامِ عمل ‎ بزمِ گیتی کا تماشہ ولولہ انگیز ہے
اٹھ گئے پردے فضائے عالمِ اسرار سے ‎ ہر اشارہ شاہدِ فطرت کا معنی خیز ہے
ہو رہا ہے چشمِ بینا پر تجلّی کا ظہور ‎ گوشِ شنوا نغمہائے راز سے لبریز ہے
ہے دلِ بیدار تازہ بارشِ الہام سے ‎ بہرہ اندوزِ سعادت زاہدِ شب خیز ہے
جل بجھی شمعِ شبستاں طل کے پروانوں میں آ لبِ کٹ
جاگنے والوں پہ ارزاں ہے جمالِ برق طور ‎ سونیوالے تیری غفلت کیا قیامت خیز ہے
نرگسِ بیدار کہتی ہے نہیں سونے کا وقت ‎ لب پہ ہر سنگ و شجر کے نعرۂ برخیز ہے
ہوشیار اے خفتگانِ خوابِ غفلت ہوشیار ‎ مہرِ عالمتاب کی تم پر نگاہِ تیز ہے
کام جو کرنا ہے کل وہ آج ہی کر لے ضیاؔ ‎ گرمِ جولاں زندگی کا مرکبِ شبدیز ہے
جل گئی کشتِ امل تازہ ہوا میدانِ کار ‎ تخمِ ہمت در بغل دہقاں لبِ کاریز ہے

اٹھ بدل کشتی کا اپنی رخ ہوا کے ساتھ ساتھ
غم نہیں گر قلزمِ ہستی تلاطم خیز ہے

سوز کا نوشِ محبت کیمیا تاثیر ہے ‎ جل گیا جو خام تھا جو رہ گیا اکسیر ہے
جلوہ گر اس میں کسی کی شوخیِ تحریر ہے ‎ یوں تبسم آشنا ہر غنچۂ تصویر ہے
آج بزمِ ناز میں پھر شورِ دار و گیر ہے ‎ شمع بھی دلگیر ہے پروانہ بھی دلگیر ہے
کشتنی ہوں تنا کہنے پر کہ ہوں تم پر فدا ‎ یہ خطا میں ہے خطا تقصیر میں تقصیر ہے
آنکھ ہے تصویرِ حیرت اس میں عکسِ روئے یار ‎ شمع اندر شمع ہے تصویر در تصویر ہے
بینوائی میں نوائے سوزِ شمعِ بزم سن ‎ سوزِ پروانہ کی یہ اک آتشی تصویر ہے
آہ وہ برگِ خزاں دیدہ سوارِ دوشِ باد ‎ اسکی خاموشی میں بھی اک عالمِ تقریر ہے
محرمِ اسرار دل اور چشمِ بینا چاہیئے ‎ ذرہ ذرہ میں جمالِ یار کی تنویر ہے
کر دیا زنداں کو زنداں یوسفِ معصوم نے ‎ دار کیا ہے عصمتِ منصور کی تصویر ہے
سوزِ پروانہ میں ہے رازِ حیاتِ جاوداں ‎ یہ بقا کی شرح ہے اور موت کی تفسیر ہے

دل میں ہے نورِ سویدا آنکھ میں تصویرِ دوست
اے ضیاؔ پیشِ نظر تنویر ہی تنویر ہے

سلہ آتشدان

ضیا محمد صادق صاحب بی اے، ایل ایل بی (فائنل) ۹۰

نام محمد صادق۔ تخلص ضیا۔ خلف میاں الٰہی بخش صاحب نگوں۔ آپ یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کو بمقام چینوٹ ضلع جھنگ (پنجاب) پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق نگوں قوم سے ہے۔ جو پنجاب میں بہت با اثر اور بارسوخ مانی جاتی ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ بابا سلطان رح رنجیت سنگھ کے زمانے میں بہت عظمت و شہرت کے مالک تھے۔ چناب کے کنارے بہت بڑی زمینداری تھی، جو رانا رنجیت سنگھ کی طرف سے بابا سلطان کو مرحمت ہوئی تھی۔ یہ زمین اور زمینداری ابتک اسی خاندان میں وراثتاً چلی آتی ہے۔

ضیا صاحب سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں کے ہموطن ہیں۔ آپ کے والد بہ سلسلۂ تجارت زمانۂ شباب میں آگرہ آئے اور ابتک یہیں مقیم ہیں۔ آپ کے والد میاں الٰہی بخش نہایت کامیاب تاجر ہیں قومیات اور سیاسیات میں آپ کو غیر معمولی درک حاصل ہے۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ بزرگ اور تجارتی حلقوں میں بہت زیادہ دخل یاب ہیں۔

ضیا صاحب کی ابتدائی تعلیم چینوٹ میں شروع ہوئی۔ اور باقی تمام مراحلِ تعلیم آگرہ میں طے ہوئے۔ ۱۵ر جولائی بروز شنبہ آپ شعیب محمدیہ ہائی اسکول کے درجۂ چہارم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایل ایل، بی پریویس میں کامیاب ہوئے۔ اب مئی ۱۹۳۷ء میں فائینل کا امتحان دے چکے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسمیں بھی کامیاب ہوں گے

آپ کی اسکول کی زندگی بہت خاموش گذری۔ چونکہ طبیعت ہنگامہ پسند نہ تھی اس لئے کھیل وغیرہ میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ فرصت کے اوقات ہمیشہ مطالعے میں گذرے۔ ۱۹۲۵ء سے آپکی طبیعت میں ذوقِ شاعرانہ پیدا ہوا۔ اور رسالۂ "غنچہ" بجنور و "تاج" آگرہ میں آپنے مضامین بھی لکھے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد جب آپ آگرہ کالج میں باریاب ہوئے تو شاعری کا ذوق۔ جو اسکول لائف تک خاموش ترقی کر رہا تھا اب چمک اٹھا اور آپ کی نگاہِ کامل شناس نے اپنی رہنمائی کے لیے حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کو منتخب کرلیا۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو بدھ کے دن شام کو چار بجے آپ باقاعدہ مولانا کے شاگرد ہوئے۔ مشقِ سخن جاری رہی۔ مضمون نویسی کا ذوق ترقی کرتا رہا۔ ۱۹۳۱ء میں آپنے جریدۂ "تاج" آگرہ میں بیحد مضامین لکھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ادارۂ "تاج" میں آپ بھی شریک تھے۔ اسی زمانہ میں بعض انگریزی مضامین کا ترجمہ بھی کیا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے فلمی موضوعات پر قلم اٹھایا اور آپ کے فلمی مضامین کی شہرت تمام ہندوستان میں ہوگئی۔ ہندوستان کے فلمی افراد سے اسی زمانہ میں آپ کے تعلقات بھی ہوگئے۔ جو اب تک قائم و باقی ہیں۔ اسی سال آپ نے تقریباً ہر رسالے میں مضامین لکھے۔ مثلاً تاج۔ زمیندار۔ بندے ماترم۔ فلم اسٹیج۔ وغیرہ اور اسی سال انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرکے بی اے میں آئے۔

جب بی اے میں تعلیم پا رہے تھے تو آپ نے ادبی کام بہت انہماک سے کیا اور ورڈس ورتھ کی مشہور نظم Ode to immortality کا کامیاب منظوم ترجمہ کیا۔ جس سے آپ کا ادبی وقار دنیائے ادب میں قائم ہوگیا ۸ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو آپنے آگرہ میں سیماب لٹریری سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

۴ر جولائی ۱۹۳۳ء کو آپ کی شادی چینوٹ میں ہوئی۔ مولانا مدظلہٗ

بھی اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔ اسی سال کلکتہ کا سفر کیا اور حضرت آغا حشر کاشمیری مرحوم سے نیاز حاصل کیا۔ مرحوم نے آپ کی ادبی قابلیتوں کا نہایت کشادہ دلی سے اعتراف کیا۔

۱۹۳۴ء میں "حسن کار" کے نام سے آرٹ پر آپ کے لیکچر شائع ہوئے اور اسی سال آپ کا ڈراما "من کی آگ" پریس سے نکلا۔ اسی سال موضوعِ تعلیم پر آپ نے ایک سیر حاصل مبسوط مضمون لکھا۔ اور ہندوستان کے تمام مشاہیر کے پاس چھپوا کر بھیجا۔ اس مضمون میں ضیا صاحب نے اپنے نقطۂ نظر سے موجودہ ہندوستان کے نوجوانوں کی عام تعلیمی حالت پر بہت اہم تبصرہ کیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں آپ سیماب لٹریری سوسائٹی کے نائب صدر منتخب ہوئے اور اس وقت تک اسی عہدے پر فائز ہیں۔ ستمبر ۱۹۳۲ء میں جب مولانا مدظلہٗ اپنے مجموعۂ نظمیات "کارِ امروز" کی تسوید و ترتیب میں مصروف تھے تو ضیا صاحب نے شب و روز اس میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۵ء میں شاعر کا "کارِ امروز نمبر" بھی آپ نے بڑی محنت سے مرتب کیا۔ ۱۹۳۶ء میں جب مولانا "کلیم عجم" مرتب کر رہے تھے اس وقت بھی ضیا صاحب نے اس کی ترتیب کے سلسلے میں دست راست کا کام دیا۔

یکم ستمبر ۱۹۳۶ء کو آپ نے اپنے افسانوں کا مجموعہ "شب چراغ" کے نام سے شائع کیا جس پر ہندوستان کے بیشتر رسائل و اخبارات نے نہایت حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں مولانا سیماب مدظلہ کے ساتھ کلکتہ کا سفر کیا۔ اسی سال آپ سیماب لٹریری سوسائٹی اٹاوہ کی صدارت کیلئے اٹاوہ بھی گئے۔

۳ر جولائی ۱۹۳۵ء کو خدا نے آپ کو ایک دختر عطا فرمائی جس کا نام "زرینہ خاتون" ہے

قانون کی تکمیل کے بعد آپ کا ارادہ یورپ جا کر مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ہے۔

ضیا صاحب حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کا بے انتہا ادب کرتے ہیں اور مولانا بھی آپ سے شفقت رکھتے ہیں کیونکہ آپ ایک قابل اور ہمہ گیر نوجوان ہیں۔ اور ملک کے ان نوجوانوں میں سے ہیں جن پر ملک کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔ آپ کے خیالات قومی و ملی زیادہ ہیں۔ سگریٹ اور پان سے آپ کو نفرت ہے۔ نماز اور روزے کے پابند ہیں۔ ادبی مضامین کے علاوہ علمی اور تجارتی مضامین لکھنے میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ انگریزی نظموں کا ترجمہ بے تکلف اردو نظموں میں اتنا خوبصورت کہتے ہیں کہ ہر نظم باوجود مترجم ہونے کے تخلیقی معلوم ہوتی ہے آپ کی سیرۃ بہت ممتاز اور بلند ہے۔ اس کے متعلق ہماری نہیں دوسروں کی رائے ملاحظہ فرمائیے۔ سید محمود صاحب طرزی، کلکتے کے ایک مشہور ادیب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

> ضیا صاحب ماشاءاللہ مجسم زندگی ہیں اس لئے انہیں اپنے خط میں زندگی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ...... زندگی نام ہے جوانی اور تندرستی کا لیکن اگر اس میں فطرت اپنے خزانے سے تحفۂ پاکبازی بھی عطا کر دے تو پھر ایسا انسان انسان نہیں بلکہ فرشتوں سے بھی کچھ اونچا ہی شمار کیا جاتا ہے الحمدللہ ضیا صاحب میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ صفاتِ ملکوتی سے ہٹ کر اگر صفتِ پیغمبری میں آجائیں تو اپنی مسیحائے تحریر سے ہماری ایسے لوگوں کو نہ صرف زندہ کر سکتے ہیں بلکہ زندہ رکھ سکتے ہیں۔ خدا انہیں ہر قدم پر کامیاب کرے آمین

نمونۂ تغزل

سب رازِ خلش اپنا کہدیتا اشاروں میں — پھر طعنۂ بے ضبطی پھولوں سے سنا کرنا

اور سب گلشن میں مثلِ بوئے گل اڑ جاتے ہیں — تنگ میری ہی نئی صحنِ گلستاں ہو گیا

اب نہیں ہیں تشنۂ بانگِ درائے کارواں
اب دلِ پرشوق میرا خود حدی خواں ہوگیا

نغمہ زن ہی تربعادی لہتابِ زندگی
تشنۂ مضراب ہی میرا ربابِ زندگی

پھر رہی صحرا نوردی پھر رہی جوشِ جنوں
خار و گل میں پھر نظر آیا شبابِ زندگی

سنہ ۱۹۳۱ء

بقا ملی گی وفا سی مجھ کو یہی تو حاصل ہے زندگی کا
سکونِ مطلق نصیب میں ہے ثمر یہی ہے بیقراریوں کا

ہر ایک غنچہ یہ آج گلشن میں مست ساقی سی کہہ رہا ہے
کہ ابر اٹھا ہے مستیوں کا یہ عین موقع ہے بیخودی کا

بزمِ طرب میں کب تک امید جام و ساقی
شبنم سی کہہ رہا ہوں بادہ فروش ہو جا

کر سیر بزمِ فطرت یا شورشوں میں گم ہو
یا صرف آنکھ بن جا، یا صرف گوش ہو جا

حریمِ گل کی اسرار اور پھر اُن کی یہ رسوائی
ہوائی گل بہاروں میں ضیا افسانہ خواں کیوں ہے

بنت کی بادہ رنگ ہونٹوں سی کچھ افسانے چلے
پھول اڑانے کو بھری محفل میں پیمانے چلے

ہو گئی برہم نگاہِ ساقیہ تو اے ضیا
میکدے میں خوب شیشے اور پیمانے چلے

ضبط کی گرمی سی غنچوں کی کھنچے جاتے ہیں دل
راز گلشن کوئی اپنا آشنا پیدا کرے

کر رہی ہے یوں شبابِ گلستاں پیدا نیا
شعر جیسے شاعرِ رنگیں نوا پیدا کرے

سنہ ۱۹۳۲ء

یاد ہے آہ کا وہ رنگ و نوا ہو جانا
یوں فضاؤں میں سمٹنا کہ گھٹا ہو جانا

اس قدر کیف کہ مدہوش فضا ہو جانا
دیکھنا ساز کو اور نغمہ سرا ہو جانا

میں نے تو آگ دامنِ گل میں لگائی تھی
جل اٹھی میری شاخِ نشیمن یہ کیا ہوا

غمگین مجھ کو دیکھ کے گھبرا نہ ہمنشیں
مسرور ہو کہ آج مجھے دل عطا ہوا

ہو دیکھنے کی چیز دھندلکے میں صبح کے
سیارہ ٹوٹتا ہوا دل ڈوبتا ہوا

میں کارواں سی الگ ہو کے چل رہا ہوں ضیا
مذاقِ فہم مرا کوئی کارواں میں نہیں

آج شباب مست ہے محفلِ حسن و عشق میں
وقتِ خرام حیلۂ لغزشِ پا لئے ہوئے

سنہ ۱۹۳۳ء

یوں خیالوں میں لگی گردشِ ایام سی آگ
کہ برسنے لگی ہستی کی در و بام سی آگ

لگ گئی بادہستاں میں غمِ ایام سی آگ
مانگتے رہ گئے میکش شفقِ جام سی آگ

تو اسیرانِ قفس کا ظرف دیکھ
فصلِ گل کی تازگی کو سہہ گئے

ساز پر غنچوں کے گا یا کس نے گیت
نغمے پھولوں میں الجھ کر رہ گئے

سنہ ۱۹۳۴ء

اُسے ڈرائے گا کیوں کر مآل طوفاں کا
جو پرورش کرے طوفان کی سفینوں میں

بیٹھے تو ہم نے خاک کو آوارہ کر دیا
اٹھے تو اک نگاہ تھی برق و شرار کی

میں شہپرِ نسیم پہ آیا ہوں باغ میں
مجھ کو اڑا کے لائی ہیں موجیں بہار کی

پھر کوئی انقلابِ جدید آئیگا ضیا
بدلی ہوئی سی ہیں روشیں روزگار کی

سنہ ۱۹۳۵ء

جلوے فضا نواز ہیں آنکھیں کدھر گئیں
نغموں کی بارشیں ہیں کدھر کھو گئی رباب

بجلی چمک چمک کر رستہ بتا رہی ہے
تاریک بادلوں میں شاید ضیا نہاں ہے

تاروں سی کہو تھا میں مہتاب کا پیمانہ
میں کس سی تنگ آ کر لیتا ہوں اک انگڑائی

سنہ ۱۹۳۶ء

اگر حاصل ہوا اپنی لغزشوں پر اختیار اسکو
تو کیوں یہ قطرۂ شبنم بساطِ گل پہ تھرائے

الٰہی کس قدر ہے مستحقِ رحم اس کی ہستی بھی
بلندی سے گرے جو اور گرتا ہی چلا جائے

سنہ ۱۹۳۷ء

نمونۂ نظم

"پیامِ محبت"

کیفِ نظر سے لب کو فطرت پرست کر دو — دنیا کے نوجوانو! دنیا کو مست کر دو
رازِ حیات سے تم آگاہ کیوں نہیں ہو — آگاہ ہو تو شمعِ ہر راہ کیوں نہیں ہو
تم خود ہو اپنی منزل تم خود ہو اپنا جادہ — کیوں فکرِ راہبر میں بیٹھے ہو سر فتادہ
سر گشتۂ تعین ہے کارواں تمہارا — ورنہ زمیں تمہاری اور آسماں تمہارا
جب قوتِ نہاں سے تدبیر کام لے گی — دنیا غلام بن کر قدموں پہ آگری گی
ہیں حسن اور محبت فطرت کی ایک طاقت — چاہیں تو فتح کر لیں دونوں جہاں کی وسعت
فطرت نے حسن اپنا انساں میں بھر دیا ہے — معمور اس کے دل کو الفت سے کر دیا ہے

ان قوتوں سے انساں جس روز کام لے گا
دامانِ عرشِ رفعت چٹکی میں تھام لے گا

نمونۂ نثر

میں نے اس انسان کو مختلف حالتوں میں دیکھا ہے اور اس کی ناکامیوں پر خندہ زن بھی ہوا ہوں۔ یہ شخص میری مسکراہٹ کی آواز سنتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے کہ کوئی فوق الفطرت ہستی اسکی رہنمائی کر رہی ہے۔ اسی ہستی کی تلاش میں وہ آسمان کی طرف نظر اٹھاتا ہے لیکن نہیں سمجھتا کہ اس کی رہنما ہستی اسی کے دل میں ہے۔ اور وہ میں ہوں ــــــ

اس انسان کو اس بات کا احساس بھی ہے کہ انسان کا زیور انسانیت ہے وحشت اور درندگی نہیں ــــ انسانی زندگی کا ایک دور وحشت اور درندگی کا آئینہ دار بھی تھا۔ یہ اس دور کا بیٹا ہے۔ باپ نہیں...... دنیا خدا کی طرف پرواز کر رہی ہے ــ خدا دنیا کی انتہائی منزل ہے ــ

یہ ایک عظیم المرتبت انسان ہے اور عجیب فطرت کا حامل۔

مجھے اس انسان سے خوف معلوم ہونے لگا اگر میرا بس چلتا تو میں اس شخص کو وہیں چھوڑ کر بھاگ جاتا لیکن مجھے احساس ہوا کہ اسکی گرفت اتنی کمزور نہیں کہ

محمد صادق صاحب ضیا چنیوٹی کی نظم پر حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ کی اصلاح

"تفاوت"

(سانٹ)

ادھر ویران صحرا اور ادھر پھولوں کی محفل ہے
ادھر کانٹوں کی نوکیں ہیں ادھر شاداب کلیاں ہیں
یہ منظرِ گل بداماں اور وہ آتش بداماں ہیں
آہ، آلودہ مرا دل ہے
انہیں رنگینیوں میں عقبیٰ الجھا ہوا دل ہے
یہ رنگیں محفلیں مجھ کو پیامِ عیش دیتی ہیں
ابھاریں گی ہمیشہ یہ گنہگاری کے جذبوں کو
ہوا دیں گی جو سینے میں دبے
حسد سے بغض سے بھڑکائیں گی یہ دل کے شعلوں کو

یہ رنگیں محفلیں اذنِ مدامِ عیش دیتی ہیں
مگر ویران صحرا ہی مری جذبات کی شایاں
بیاباں کوئی
مری وحشت کو کافی ہے فضا صحرا کی یا وسعت
اسی صحرا کی شایاں اور لائق ہے مری فطرت
ہے فطرت کے مناظر ہیں
یہی فطری مناظر ہیں مری تسکین کے ساماں
یہ ویرانی فضا میری لئے رنگین محفل ہے
جو آسودہ ہو وہ
یہی کا اجڑا ہوا جنگل مری رہنے کی قابل ہے

(سنہ ۱۹۳۱ء)

آپ کا نام مہرلال سونی اور ضیا تخلص ہے۔ شمالی ہندوستان میں دریائے بیاس کے کنارے جالندھر شہر کے قریب کپور تھلہ کے نام سے ایک بہت مشہور سکھ ریاست واقع ہے۔ اسی ریاست میں اپنے ماموں کے مکان اس پوری مرحوم کے مکان میں آپ ۹ر فروری ۱۹۱۳ء کو صبح ساڑھے سات بجے پیدا ہوئے۔ لیکن ضیا صاحب کا وطن خاص فتح آباد دریائے بیاس کے دوسرے کنارے پر امرتسر کے ضلع میں ہے۔ ضیا صاحب کے والد بزرگوار لالہ منشی رام سونی ملازمت کے سلسلہ میں اس وقت پشاور پہونچے۔ جب ضیا صاحب کی عمر کچھ سات برس کی تھی۔ چنانچہ ضیا صاحب کی تعلیم کا آغاز اسی سرحدی فضا میں ہوا۔ اور کافی مدت تک گھر پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو خالصہ مڈل اسکول پشاور چھاؤنی میں داخل کرا دیا گیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ آپ کے والد صاحب جے پور منتقل ہو گئے۔ اور ضیا صاحب کو بھی راجپوتانے کی فضا کو خیر مقدم کہنا پڑا۔ ۱۹۲۹ء میں مہاراجہ ہائی اسکول جے پور سے ضیا صاحب نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ضیا صاحب کو امرتسر آنا پڑا۔ کیونکہ لالہ منشی رام صاحب سونی کا تبادلہ ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم کے سلسلہ میں جوگندر نگر ہو گیا تھا۔ آپ ہندو سبھا کالج امرتسر سے ۱۹۳۱ء میں ایف اے کا ڈپلومہ حاصل کرکے بی اے کے امتحان کے لئے فورمین کرسچین کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے آپ نے ۱۹۳۳ء میں فارسی میں آنرز کے ساتھ بی اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر ۱۹۳۵ء میں انگریزی میں ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے حاصل کی۔

اس وقت ریزرو بنک آف انڈیا کے سلسلے میں آپ مستقل طور پر دہلی میں آ گئے ہیں۔

بچپن کی ابتدائی منازل طے کر لینے کے بعد جب ضیا صاحب کی نظر سے بعض درسی کتابوں میں چند اصلاحی نظمیں گذریں تو اسی وقت سے آپ کو یہ احساس ہو گیا کہ طبیعت کا رجحان زیادہ تر شعر و شاعری ہی کی طرف ہے۔ چنانچہ جے پور میں آپ کو ایک شاعر معلم اردو اصغر علی صاحب حیا کے مل جانے پر آپ کو شوق کی تکمیل کا اور زیادہ موقع ملا اور اپنے قابل استاد کی نگرانی میں آپ نے پہلے پہل شعر گوئی شروع کی۔ اس کے بعد ایک سال تک ضیا صاحب امرتسر کے مشہور شاعر جناب فرخ سے باقاعدہ اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۳۰ء کے آغاز میں جب طبیعت یکسر شعر و شاعری میں مدغم ہو کر رہ گئی اور ذوق کی بلندی کسی بلند مرتبت استاد کی متلاشی ہوئی تو آپ کی جویا نگاہوں نے حضرت مولانا سیماب مدظلہ، کو اپنی رہبری کے لئے چن لیا اور اب تک مولانا مدظلہ ہی سے سلسلۂ اصلاح جاری ہے۔ سلسلۂ شاگردی قائم ہو جانے کے بعد ضیا صاحب حقیقی معنوں میں آگرہ اسکول کے ایک ممتاز فرد ہو گئے۔ اکثر و بیشتر آپ کو مولانا مدظلہ، سے بالمشافہ استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ مولانا مدظلہ کے مخصوص شاگردوں میں آپ کا شمار ہے۔

زمانۂ تعلیم ہی میں ضیا صاحب نے شاعری میں کافی استعداد و شہرت حاصل کر لی تھی۔ چار سال تک وہ فورمین کرسچین کالج میگزین کے حصۂ اردو کو ایڈٹ کرتے رہے اور پھر چند ماہ جریدۂ "کنول" میں بطور مدیر معاون کام کرتے رہے "کنول" کے علاوہ ضیا صاحب کا کلام ملک کے اکثر مقتدر جرائد و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ اور بالخصوص "ایشیا" اور "ادبی دنیا" میں ہمیشہ انکی

نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی ہیں۔

منصور احمد صاحب مدیر "ادبی دنیا" ضیا صاحب کے متعلق اپنے رسالے میں تحریر فرماتے ہیں "مجھے معلوم ہوا ہے کہ ضیا ایک حقیقی شاعر ہیں اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اسے انہوں نے محسوس بھی کیا ہے اور سوچا بھی ہے۔ اسی لئے ان کے کلام میں سنجیدگی اور اثر کی فراوانی ہے ان کا ذوق بلند ہے اور زبان نہایت پاکیزہ اور فصیح ہے۔"

شاہد احمد بی اے آنرز ایڈیٹر "ساقی" کی رائے ہے کہ "بحیثیت مجموعی ضیا کی شاعری داد طلب ہے" اور منشی تلوک چند محروم بی اے اپنے ایک گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ابتدا میں آپ کے کلام کی انتہائی پختگی دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی"

ضیا صاحب کی نظم نگاری کے متعلق حضرت منظر صدیقی اکبرآبادی کا خیال ہے کہ "وہ عکاسیِ فطرت کے زیادہ خوگر ہیں اور اردو میں مغربی رنگِ نظم نگاری پیدا کرنے کی صلاحیت اُن میں بدرجۂ اتم نظر آتی ہے"

ساغر صاحب نظامی تحریر فرماتے ہیں کہ "کسی شاعر کی عظمت اس کے ذوق کی صحتِ مطالعہ کی گہرائی اور مشاہدہ کے روشن و عمیق ہونے سے ہوا کرتی ہے مجھے یہ دیکھ کر روحانی مسرت ہے کہ جناب ضیا فتح آبادی شاعرانہ معیار پر صحیح اترتے ہیں"۔

ضیا کی تصانیف میں مندرجۂ ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) "طلوع"۔ قطعات و رباعیات کا ایک مختصر مجموعہ۔
(۲) "سقراط کی موت" ایک دلچسپ تحقیقی اور فلسفیانہ مکالمہ
(۳) "اُفقِ تاباں" نظموں اور غزلوں کا ایک منتخب مجموعہ

نمونۂ تغزل

حالِ اُس پہ ہی مرے دل کا نمایاں ہوتا — جس کا دل محرمِ سوزِ غمِ پنہاں ہوتا
تیری ہستی ہے رہینِ مئے انگور ابھی — مہرباں تجھ پہ وہ کیا اے دلِ ناداں ہوتا
رونا شیوہ ہے ازل ہی سے ترا ابرِ بہار — تو مرا حال نہ سنتا بھی تو گریاں ہوتا
دیکھ کر مجھ کو، ستاروں کو نہ پھر نیند آئی — اور کیا اس سے زیادہ غمِ ہجراں ہوتا
عشقِ بیتاب کو لازم ہے کہ خاموش رہے — قسمتِ حسن میں ہوتا تو پریشاں ہوتا
مجھ سے ممکن نہ ہوئی ترکِ وفا ترکِ جنوں — کیا گنہگار گنا ہوں پہ پشیماں ہوتا
فطرتِ غم کو گوارا نہ ہوا یہ بھی مگر — جینا مشکل تھا تو مرنا مجھے آساں ہوتا
ضبط نے آنکھ کو رونے کی اجازت ہی نہ دی — یوں ہی شاید کوئی پورا مرا ارماں ہوتا
ہمہ تن گوش تھے سب پھول بھی اور تارے بھی — رات کے پچھلے پہر کوئی غزلخواں ہوتا
خون روتا ہوں کہ انساں بھی نہیں ہے انساں — یہ بڑی چیز تھی انساں اگر انساں ہوتا
دل اگر عشرتِ فردا پہ نہ رکھتا امید — کیوں مہیا غمِ امروز کا ساماں ہوتا
تم نے نظروں سے گرا کر نہ کہیں کا رکھا — دل نے چاہا تھا کہ منت کشِ درماں ہوتا

میری ہونے سے گلستاں بھی بیاباں ہے ضیا
میں نہ ہوتا تو بیاباں بھی گلستاں ہوتا

چشمِ بینا کو حجابِ رخِ زیبا کیا ہے — فطرتِ حسن کو اندازِ یہ سوجھا کیا ہے
کبھی سورج ہے کبھی چاند ہے زیرِ گردوں — رات دن سوچ رہا ہوں کہ یہ ہوتا کیا ہے
عندلیبانِ قفس سے کوئی اتنا پوچھے — آخر انجامِ غم و آہ و بکا کیا ہے
کوئی ناکامِ تمنا ہی کرے اندازہ — مدعائے دلِ ناکامِ تمنا کیا ہے
بادۂ حال میں ہوں مست مجھے کیا معلوم — الم دوش تھا کیا اور غمِ فردا کیا ہے
خود کہے دیتی ہے ویرانیٔ مےخانۂ عشق — ساقیا حال ترے بادہ کشوں کا کیا ہے
رونا اس بات پہ آتا ہے کہ سوچا کیا تھا — اور اس بات پہ ہنستا ہوں کہ ہوتا کیا ہے
تیری کشتی نے مصیبت میں دیا تجھ کو جواب — ناخدا تیرے خدا کا بھی بھروسا کیا ہے

نجد میں قیس کو تا عمر جو آیا نہ نظر — دل کے صحرا میں وہ محمل نظر آتا ہے مجھے
مجھ میں تکمیلِ محبت کی کہاں تھی قوت — دوست کا ہاتھ بھی شامل نظر آتا ہے مجھے

خود بھڑک کر جگمگا دے عالمِ پست و بلند — تیرا سوزِ دل ہی اے غافل چراغِ خانہ ہے
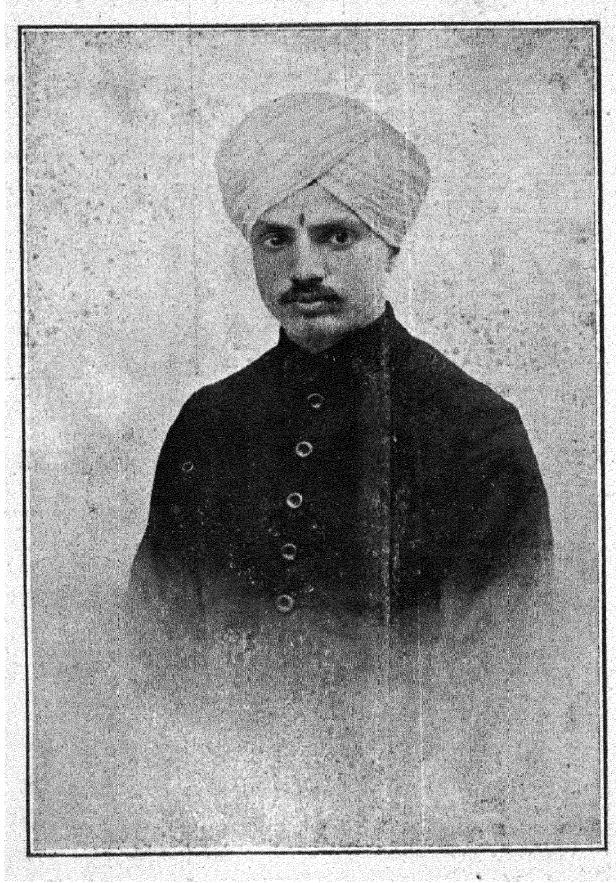
پروفیسر پنڈت نندلال صاحب طالبؔ کاشمیری ایم اے - ایم - او - ایل

نمونۂ نظم

"شاعر سجدے میں"

شاعری کی تکمیل صرف اس وقت ممکن ہے جب شاعر اپنے ماحول کی حقیر سے حقیر چیز کی پرستش کرنے لگے

اے زمیں اے آسماں اے زندگی کی کائنات
اے ہوا، اے موجِ دریا، اے نشاطِ بے ثبات

اے پہاڑوں کی بلندی، اے سرودِ آبشار
اے گھٹا جھومی ہوئی، اے نغمہ برلب جوئبار

اے مسرت خیز وادی، اے فضائے کیف بیز
اے دلِ آبادِ وحشت، اے رگوں میں خونِ تیز

اے بساطِ ریگِ صحرائی کسی دنیا نماں
اے نگاہوں کی خمارِ رقص میں رعنائیاں

اے سمندر وسعتِ آغوش پھیلائے ہوئے
اے ارادہ حادثوں کی ٹھوکریں کھائے ہوئے

اے بہارِ صحنِ گلشن، اہتمامِ رنگ و بو
اے گلوں کی سادگی، اے بلبلوں کی آرزو

اے پھلوں کی بوجھ سے سر برزمیں شاخِ شجر
اے پریشاں زلفِ سنبل چشمِ نرگس دلبر

اے عروسِ صبحِ مستی، اے شامِ بزمِ میکدہ
اے جوانی کی نظر دزدیدہ وہ ہوش آزما

اے ستاروں کی چمک، اے گردشِ خورشید و ماہ
اے سرورِ بے گناہی، لذتِ جامِ گناہ

اے دلِ بیتاب، اے موہومِ امیدِ سکوں
اے سکوتِ یاس، اے طوفانِ امواجِ جنوں

اے وقارِ حسن بزمِ زیست پر چھائے ہوئے
اے جنونِ عشق سرد آہوں کو گرمائے ہوئے

بے نیازِ مستیِ جام و سبو کر دو مجھے
اپنی کیفِ مستقل سے اس طرح بھر دو مجھے

میں تمہارا اِن کی سوز و جذب کا ماہر ہوں
دل سے وہ نغمے اٹھیں جن کے لیے شاعر ہوں

جناب مہر لال صاحب سونی ضیا فتح آبادی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

کہوں کس سے کوئی سنتا نہیں جب داستاں میری
بند رہتی ہے
مثالِ شمعِ محفل ہوں ~~نہیں کھلتی~~ زباں میری

جوانی — میری
~~شباب~~ جاوداں ~~میرا~~ نہ دنیا جاوداں میری
مجھے کو کھو دیں گی فنا سامانیاں میری
~~کسی دن گل کھلائیں گی یہی ناوانیاں میری~~

ہیں یوں تحریر اور تقریر مقبولِ جہاں میری
میری
قلم گوہر فشاں ~~میرا~~، زباں جادو بیاں میری

اب — ناامیدیوں پر بھی
یقیں آتا نہیں ہے ~~مجھ کو اپنی نا امیدی کا~~
طبیعت اس قدر کیوں ہو گئی ہے بدگماں میری

اپنے نشیمن سے
قفس میں کھینچ لائی ہے مجھے ~~اے ہم نوا بجلی~~
بنی تھی دوست اس دن کو
~~تمنائے تماشائے~~ بہارِ گلستاں میری

سے
خدا کے واسطے رہنے دے اب تو چین مجھ کو
کر لے چلی — مٹی
اڑا لے ~~جائے~~ ہے بادِ صبا تربت کہاں میری

سوئے عدم دنیا سے جاتا ہوں
ضیا اس ~~واسطے دنیا سے چلا ہوں عدم کو میں~~
کہ شاید حسرتِ دیرینہ نکل جائے وہاں میری
~~کوئی امید بر آئی نہ آئے گی یہاں میری~~

۱۹۳۲ء

مرزا عبدالمجید صاحب طالب جہلمی
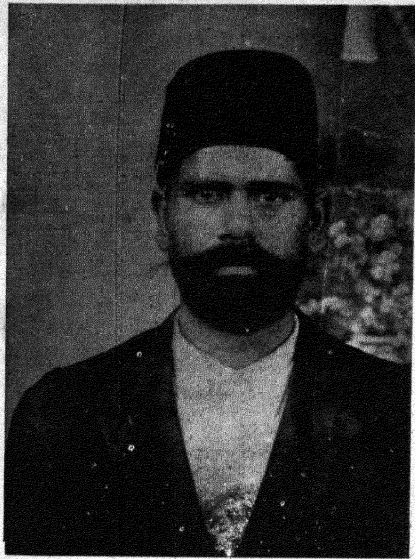
مولوی عبدالحیٔ صاحب عارف بھاگلپوری

ابوالعرفان مولوی حبیب اللہ صاحب فصالی لوملی
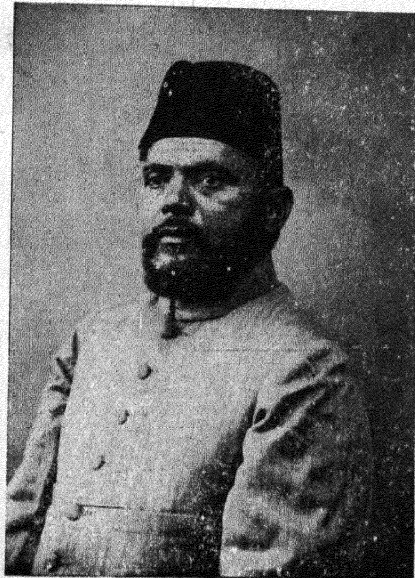
فیاض حسین صاحب فیاض الہ آبادی

طالب — پنڈت نندلال صاحب کول کاشمیری ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل — ۶۲

آپ کا نام نندلال اور طالب تخلص ہے۔ آپ کشمیری پنڈتوں کے ایک اعلیٰ اور معزز خاندان کول میں بمقام سری نگر کشمیر ۱۸۹۹ء پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد دربارِ کشمیر میں مختلف ذمہ دار اور باعزت عہدوں پر مامور رہے۔ چنانچہ آپ کے جدِ امجد راجہ رگھو ناتھ صاحب کول ریاست کے وزیرِ اعظم رہ چکے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار اس وقت بھی کشمیر کے بڑے رؤسا اور زمینداروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ سرکار کی طرف جگوک وار اراضی کا مالیہ پندرہ سو روپیہ سے زائد سالانہ اب تک ادا کیا جاتا ہے۔

آپ نے خداداد ذہانت اور قابلیت پائی ہے۔ میٹرکیولیشن امتحان سی، ایم۔ ایس ہائی اسکول سری نگر سے پاس کیا اور اپنے اسکول میں دوسرے درجے پر رہے۔ اسی سال آپ نے "سناتن دھرم" کا امتحان (جو مرحوم ڈاکٹر اینی بسنیٹ کے زیرِ اہتمام بنارس سے سالانہ لیا جاتا تھا) اعلیٰ نمبروں پر پاس کر کے ایک قیمتی انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد کشمیر گورنمنٹ کالج میں داخل ہو کر آپ نے ایف۔ اے۔ اور بی۔ اے کے امتحانات اعزاز سے پاس کئے۔ اپنی قابلِ رشک ذہانت کی بدولت طالبعلمی کے دوران میں پنجاب یونیورسٹی سے ہر سال آرٹس کے امتحانات کے ساتھ ساتھ منشی۔ منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات بھی علی الترتیب پاس کئے۔ دوسرے طلباء کے مقابلے میں دوگنا کام کرنے اور سال بھر میں دو دو امتحان پاس کرنے کے باوجود کالج میں ہمیشہ اعلیٰ نمبر حاصل کر کے وظیفہ بھی پاتے رہے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد آپ ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل اور ادیب فاضل کے امتحانات میں نہایت اعزاز سے کامیاب ہوئے۔ آخر الذکر امتحان میں فقط ایک نمبر کم پانے کی وجہ سے تمام یونیورسٹی میں دوم رہے۔

آپ کو فارسی اور اردو سے خاص لگاؤ ہے اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔

جناب طالب کی شاعری ایک وہبی عطیہ ہے۔ طبیعت بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل ہے۔ بارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے اور یہ شغل برابر جاری رہا۔ اول اول لکھنوی استادوں سے اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۱۵ء سے علامہ کیفی دہلوی سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔ اسی اثنا میں حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ کی طرف آپ رجوع ہوئے۔ چونکہ آپ ایک آزاد خیال آدمی ہیں اور بہر صورت استفادہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے دونوں استادوں سے اصلاح لیتے ہیں۔ کیفی صاحب و نیز حضرت مولانا مدظلہٗ کا انتہائی احترام کرتے ہیں۔

آپ خاص کشمیر کے باشندے ہیں۔ اردو میں یہاں سب سے اول صاحبِ دیوان ہیں۔ اکثر نئے رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ ملک بھر کے اور خاص کر پنجاب کے ادبی رسائل اور اخبارات میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ جن میں سے "دربار" لکھنؤ۔ "ظہور" "مدھر" لکھنؤ۔ "زمانہ" کانپور۔ "پیمانہ" آگرہ۔ "الہلال" دہلی۔ "ساقی" دہلی۔ "چمن" امرتسر۔ "چمنستان" امرتسر۔ "سروش" لاہور۔ "ادبی دنیا" لاہور۔ "شاہکار" لاہور۔ "ادبِ لطیف" لاہور وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

زمانۂ حال کے شائع شدہ تذکرۃ الشعراء میں تقریباً کوئی ایسا نہیں جس میں آپ کے حالات مع انتخابِ کلام نہ دئے گئے ہوں۔ علامہ کیفی دہلوی۔ نظامی بدایونی۔ اور مولوی عبدالحق (حیدر آباد) جسٹس عبدالقادر۔ محروم۔ برق دہلوی۔ لالہ سری رام دہلوی مرحوم مولف خمخانۂ جاوید۔ چودھری خوشی محمد ناظر۔ تمکین وغیرہ وغیرہ جیسے اہلِ قلم حضرات

آپ کے کلام کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

آپ کی تصانیف میں سے "کلامِ طالب" موسوم بہ "رشحاتِ التخیل" اور "تصویرِ قوم" شائع ہو کر مقبولِ خاص و عام ہو چکی ہیں۔ تاریخی ناول "حیات پرتھوی راج" کا آپ نے دسویں جماعت میں انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ جو اجرٹن پریس راولپنڈی میں چھپا۔ آپ کی بیشمار نظمیں جو اپنے نئے رنگ میں کہی ہیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سوشیل ڈراما لکھا ہے یہ بھی ہنوز تشنۂ طباعت ہے۔ عدمِ گنجائش کے باعث یہاں اُن بے شمار رسائل و جرائد کی فہرست جن میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے اور ملک بھر کے ادیبوں اور نقادوں کی آرا جو انہوں نے آپ کے کلام پر تحریر فرمائی ہیں۔ نظر انداز کرتا ہوں۔ آپ اس وقت گورنمنٹ کالج کشمیر میں فارسی اور اردو کے پروفیسر ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے طالب صاحب کے خیالات میں ندرت تخیل میں رفعت اور شعری زندگی پوری طور پر پائی جاتی ہے۔

نمونۂ تغزل

ہم نے دنیا کو دو رنگی کا تماشا جانا　　ایک اندازِ مد و جزرِ تمنا جانا
کیا کہیں تم سے کہ کیا سمجھے ہیں ہم رازِ حیات　　آنے جانے کا اسے ایک بہانا جانا

مہذب گھٹتے جاتے ہیں معذب بڑھتے جاتے ہیں
موافق دوستو ہم سے زمانا ہو نہیں سکتا

اعمال بھی سیہ ہوئے جب عمر بڑھ گئی　　پیری میں بھی شباب کچھ ہم سے دور تھا

مری آنکھوں میں حسنِ یار کی تصویر پنہاں تھی
تو میرے روکنے سے پاسباں کے ہاتھ کیا آیا

نہ غربی بن سکا ہاں شرقیت اپنی گنوا بیٹھا
تشبّہ سے بھلا ہندوستاں کے ہاتھ کیا آیا

وہ عاشق ہوں کہ وحشت میں بھی یادِ یار باقی ہے
خودی میں بے خبر اور بیخودی میں باخبر ہو کر

رہ کے دنیا میں فلک پر آشیاں رکھتے ہیں ہم
گرچہ فانی ہیں حیاتِ جاوداں رکھتے ہیں ہم

میں نہیں رونے سے تھکتا مثلِ ابرِ نیشکال　　اور خنداں برق سال برسات کے موسم میں ہوں
بحرِ ہستی کا ہے ساحل دور میں ناآشنا　　کیا مجھے معلوم کیا ہوں اور کس عالم میں ہوں
یا تو طالب ہے جنوں یا عہدِ طفلی کا سماں　　اس دو رنگی کے اثر سے میں عجب عالم میں ہوں

وحشت میں میرا گھر بھی بیاباں سے کم نہیں　　جوشِ شباب چاکِ گریباں سے کم نہیں
زخمِ جگر کی تشنگی اے ہمنشیں نہ پوچھ　　ہر شورِ نالہ شورِ نمکداں سے کم نہیں
سوزِ دروں نے ہم تک دیا سر سے پاؤں تک　　جسمِ نزار سروِ چراغاں سے کم نہیں
ہے اضطرابِ شوقِ نقابِ رخِ امید　　تارِ نگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں

مری فریاد کی ظالم خوشی سے داد دیتا ہے　　صدائے ساز ہے یا سوز مضمر میرے شیون میں
بہارِ گلستاں ظاہر ہماری خاکداں سے ہے　　پرِ طاؤس داغوں سے شجر بنتا ہے گلشن میں

یہ آگ میری بجھ نہ سکی آبِ اشک سے　　کافور ہوں کہ پانی میں بھی شعلہ رنگ ہوں

سو گیا میں جوشِ وحشت سے تفنن ہم ردیف　　آرزوئیں خندۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

ٹوٹ جائے میری پستی سے بلندی کا غرور
اس زمیں پر سایہ افگن آسماں کوئی نہ ہو

ایک تنکا تک نہ چھوڑا ہستیٔ موہوم کا
اس چمن سے آشیاں ہم دوش پر لیکر گئے

نہ مجھ سے بیٹھ سکیگا حشر گیسوئے کاکل کا
نحیف و ناتواں ہیں اور یہ زنجیر بھاری ہے

رنگ لایا ہے دم وحشت مذاق اضطراب
گریہ خونیں سے رنگیں ہے گریباں دیکھئے
سرخ آنسو بن گئے ہیں غیرتِ رنگِ چمن
دامنِ تر میں بہارِ گل بداماں دیکھئے
پھونک ڈالی آپ کی وحشت نے دنیائے جنوں
اب شرارِ سنگِ طفلاں کا چراغاں دیکھئے
انقلابِ دہر کا نظارہ گر منظور ہے
کیجئے برہم نگاہِ فتنہ ساماں دیکھئے
عاشقِ مہجور ہے پابند بھی آزاد بھی
دیکھئے ذوقِ بیاباں شوقِ زنداں دیکھئے

نمونۂ نظم

"تنہائی"

میں آغوشِ تنہائی میں جب محوِ تصور رہتا ہوں
خود گوشِ ہوش سے سنتا ہوں جو غم کی باتیں کہتا ہوں
جب غم کی باتیں کہتا ہوں میں محوِ تصور رہتا ہوں
کچھ راحت ایسی ملتی ہے اک وجد سا طاری ہوتا ہے
پھر یاد کسی کی آتی ہے دل ہوش و خرد سب کھوتا ہے
دل ہوش و خرد سب کھوتا ہے اک وجد سا طاری ہوتا ہے
اک کیف مسرت ملتا ہے گلزار کی سرد ہواؤں میں
میں نغمۂ دلکش سنتا ہوں شب کی خاموش فضاؤں میں
شب کی خاموش فضاؤں میں گلزار کی سرد ہواؤں میں
بے بادہ ہو کے عالم میں مستوں کا رنگ بدلتا ہے
دنیا کی گردش کر ہو لے وحدت کا ساغر چلتا ہے
وحدت کا ساغر چلتا ہے مستوں کا رنگ بدلتا ہے
پھر موجِ ترنم اٹھتی ہے رندانِ الست کی محفل میں
اور سازِ محبت بجتا ہے اک سناٹے کی منزل میں
اک سناٹے کی منزل میں رندانِ الست کی محفل میں
عقبیٰ کی حسرت مٹتی ہے دنیا کی یاد بھی جاتی ہے
پردہ جو دوئی کا اٹھتا ہے یک رنگی رنگ جماتی ہے
یک رنگی رنگ جماتی ہے دنیا کی یاد بھی جاتی ہے
احساسِ خودی تنہائی میں کچھ ایسا غالب ہوتا ہے
خود بندہ خدا بن جاتا ہے مطلوب ہی طالب ہوتا ہے
مطلوب ہی طالب ہوتا ہے کچھ ایسا غالب ہوتا ہے
خود رفتہ ہوں کچھ ہوش میں ہوں کچھ سنتا ہوں کچھ کہتا ہوں
میں آغوشِ تنہائی میں جب محوِ تصور رہتا ہوں
میں محوِ تصور رہتا ہوں کچھ سنتا ہوں کچھ کہتا ہوں

نمونۂ نثر

انسان کی فطرت میں اکثر ایسے لطیف اور پاکیزہ جوہر پائے جاتے ہیں جن کو جلا دینے کے لئے ادبی قابلیت کا نشو و نما پانا ضروری ہے۔ دماغی راحت کی پاکیزہ جذبات کا بیدار کرنا شاعری کا کام ہے شعر و سخن کا مذاقِ سلیم حاصل کرنے کے بعد جو کیفیت انسان کے دل و دماغ پر طاری رہتی ہے اس کا لطیف اور پاکیزہ اثر دنیا کی معمولی اور مصنوعی راحتوں کے اثر سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ شاعرانہ لطافت کا حظ اٹھانے کیلئے شعر و سخن کا مذاق صحیح ہونا لازمی ہے۔ بلا اس قید کے شاعری بے تال اور سر کے گانے سے زیادہ دلکش نہیں ہو سکتی لیکن اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ محض روزمرہ اور محاورہ کی صفائی اور زبان کے مصنوعی تکلفات کا نام شاعری نہیں ہے۔ شعر میں زبان کی پاکیزگی و لطافت کے علاوہ تاثیر بھی ہونی چاہیئے۔ برخلاف اس کے حسن کلام اور ما تقدم

---

۲ بیان بھی شاعری کے غیر ضروری جزو نہیں۔ شاعرانہ خیالات وہی ہیں جو جذبات کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور حسن بیان کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں
دلی جذبات خیالات کو تاثیر کا لباس پہنا دیتے ہیں۔ اور اس کی زیادہ [illegible]

آپ کا نام عبدالمجید اور طالب تخلص ہے۔ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء میں بمقام جہلم پیدا ہوئے آپ کے والد بابو شاہ عالم صاحب گورنمنٹ پنشنر ہیں اور ایک باعزت عہدہ پر مامور ہیں۔

آغوشِ پدری میں آپ نہایت ناز و نعم سے پلے اور آپ کے والد ماجد نے آپ کی تعلیم و تربیت میں ہمیشہ کوشش کی۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم آپ کو خاص طور پر دی گئی اس کے بعد آپ گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوگئے اور میٹریکولیشن تک انگریزی حاصل کی حصولِ تعلیم کے بعد آپ نے خود مختارانہ زندگی میں قدم رکھا۔ ایک سال آپ نے ہائی اسکول قادیان میں بھی حصول تعلیم کیلئے صرف کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے لکڑی کی تجارت شروع کی۔ لیکن آپ کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں تجارت کی ناکامی انسان کو مجبوراً ملازمت کی طرف ڈھکیلتی ہے چنانچہ آپ نے بھی چاروناچار حصولِ ملازمت کی کوشش شروع کردی کچھ عرصہ لاہور میں ملازمت کی لیکن اسے ترک کردیا۔ اب آپ جہلم میونسپلٹی میں ٹیکس سپرنٹنڈنٹ ہیں۔

آپ شاعری سے گہرا ذوق رکھتے ہیں۔ جب آپ طالب علمی کا زمانہ گذار رہے تھے اس وقت سے آپ کی فطرت میں بیداری پیدا ہو چلی تھی۔ اور آپ کی قوتِ احساس میں ایک اضطراب پیدا ہوگیا تھا تاآنکہ آپ کے جذبات اور احساسات نے شعر کی صورت اختیار کرلی۔ شعرگوئی کے بعد ایک رہبر منزل کی ضرورت ہوئی اور ۱۹۲۳ء میں حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کے تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۲۳ء کے بعد شفیق و باکمال استاد کی ہمراہی میں آپ نے بہت کچھ حاصل کیا اور آپ کا کلام بتدریج ترقی پاگیا۔ آپ کو فارسی لٹریچر سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ قدماء کے کلام کا بہ امعان نظر مطالعہ کیا ہے جس نے آپ کے خیالات میں وسعت پیدا کردی ہے۔

طالب صاحب کی شاعری میں سلاست اور روانی ہے خیالات لطیف جذبات پاکیزہ اور احساسات نازک ہوتے ہیں۔ آپ اصناف شعر میں غزل اور نظم سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن دوسرے اصناف میں بھی طبع آزمائی کرنے سے عاری نہیں رباعی اور قطعہ کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی آپ کو کمال حاصل ہے۔ ہندوستان کے متعدد رسائل میں آپ کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک فسانہ "پوٹین" کتابی صورت میں شائع ہوکر قبولِ عام حاصل کرچکا ہے۔ کئی افسانے اب بھی آپ کے پاس موجود ہیں۔ نظموں اور غزلوں کی ایک بہت بڑی تعداد آپ کے پاس ہے مستقبل قریب میں آپ کا ارادہ ان کو طبع کرانے کا ہے۔ طالب صاحب نے نظم و غزل دونوں میں آگرہ اسکول کا صحیح تتبع کیا ہے۔ اور آپ کے کلام میں وہی زور ہے جو آگرہ اسکول کے دیگر ممتاز شعراء کے کلام میں ہے۔

نمونۂ تغزل

کانٹا سمجھ کے پھینک نہ نفرت سے تو مجھے ۔۔۔ مارا ہوا ہوں میں بھی نسیم بہار کا
وہ گلستاں میں آئے ہیں کیفِ نظر لئے ۔۔۔ عالم ہے مست میکدۂ لالہ زار کا

دل دوز ہیں حسین نگاہیں حجاب میں ۔۔۔ نشتر ہے رکھ لئے ہیں چھپا کر نقاب میں
ممنون ہوں بہت نگہِ انتخاب کا ۔۔۔ آیا تمہارا حسن مرے انتخاب میں
معلوم سب کو ہوگئے انجامِ عشق کے ۔۔۔ کیوں میں نے دل کا نام لیا اضطراب میں
طالب سوال جلوۂ دیدار کیوں کیا ۔۔۔ شوقِ طلب بھی ان کو چھپا یا حجاب میں

بنائے سخن قائم ہے ہماری عشق کے دم سے　　پھر اتنی برہمی ہم سے پھر ایسی بے رخی ہم سے!!

دھواں اٹھتا ہے اس کی قلب [illegible] میں اپنا سوزِ دل کہتا ہوں جب شمعِ شبِ غم سے

ترے کوچے میں نسیمِ سحری سے پہلے　　سینہ زن جب نہیں ہوتا کوئی ہم ہوتے ہیں

بزمِ عشرت کو فلک تنگ کی نظروں سے نہ دیکھ　　اتفاقات سے کچھ لوگ بہم ہوتے ہیں

ہے مسرت غم و اندوہ کا رنگین انجام　　انہیں مژدہ ہو جو وابستۂ غم ہوتے ہیں

مست ہیں کیف سے اک مستِ نظر کے طالب

ہم کہیں طالبِ نو بادۂ جم ہوتے ہیں

اُس نے چھپ کر رازِ الفت آشکارا کر دیا　　خود بھی رسوا ہو گیا مجھ کو بھی رسوا کر دیا

حالِ غم ان کو سنا کر ناشکیبا کر دیا　　میں نے اک بیدرد دل میں درد پیدا کر دیا

غیر کی محفل میں یوں لوٹی تجلی یار کی　　اپنی نظروں کو نقابِ روئے زیبا کر دیا

زندگی کی سخت گھڑیاں سہل ہو کر رہ گئیں　　موت نے الفت کے بیماروں کو اچھا کر دیا

ہونٹ ہل جاتے تو مل جاتی حیاتِ جاوداں　　جنبشِ چشمِ کرم نے مجھ کو زندہ کر دیا

دیکھا کچھ اس نظر سے کسی نے عتاب میں　　سو بجلیاں چمک گئیں اک اضطراب میں

جادو دکھا کے جذبۂ دلِ پُر اضطراب میں　　وہ خود ہی آگئے مرے خط کے جواب میں

ہر دل میں ایک زخم ہے ہر سر میں اک جنوں　　آسودگی کہاں ہے جہانِ خراب میں

کہدو یہ حسرتوں سے کہیں اور جا رہیں　　اتنی جگہ نہیں دلِ پُر اضطراب میں

اک حشر بن گئی ہیں ادائیں اٹھان کی　　کتنی جوانیاں ہیں تمہارے شباب میں

طالب سوالِ جلوۂ دیدار کیوں کیا　　شوقِ طلب نے ان کو چھپایا حجاب میں

تماشائے حقیقت بار ہے تخئیلِ انساں پر　　رگِ جاں سے نکل کر جلوہ گر ہو چشمِ حیراں پر

مری نظریں ہیں یا رب حسن کی کس ماہِ تاباں پر　　نگہ پڑتی ہے سب کی میرے افسانے کے عنواں پر

یہ کون آیا ہے پڑھنے فاتحہ گورِ غریباں پر　　چراغاں ہو رہا ہے شام کی زلفِ پریشاں پر

غمِ جانکاہِ دل کی ترجمانی کی نگاہوں نے　　انہیں رحم آگیا آخر مرے حالِ پریشاں پر

میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں احبابِ نشیمن سے　　[illegible] صیاد جب کہتا ہے دیوارِ گلستاں پر

فروغِ داغِ دل ہے شامِ غم جب شمعِ [illegible]　　[illegible] ہوتا ہے مری چاکِ گریباں پر

نکالی ہیں ترے دامن سے کانٹے بزمِ دشمن [illegible]　　[illegible] اعتبار آتا بہارِ گل بداماں پر

لبِ گلرنگ اور اس پر تبسم اے معاذاللہ　　کہ جیسے چاند کی چھٹکی ہوئی ہو شبنمستاں پر

تری منت کروں اے ناخدا یہ ہو نہیں سکتا　　مجھے ساحل کی پروا کیا کہ [illegible] طوفاں پر

حقیقت میں نگاہوں نے جو کچھ دیکھا ہے دیکھا ہے　　ہوا ہے مجھ کو دھوکا بارہا تصویرِ انساں پر

یہ دنیا تو چھڑا لیں دستِ شورش ہائے ہستی سے

کوئی کیوں آئیگا غالب ہماری قبرِ ویراں پر

نمونۂ نظم

سروشِ مستقل

اے اسیرِ آرزو اے ناطرازِ زندگی　　اب تجھے آتی نہیں بھولی سی یادِ زندگی

ایک دن وہ تھا کہ تو ناواقفِ افتاد تھا　　تیرے دل کا گوشہ گوشہ اک سکونِ آباد تھا

آج تو ہے اور آغوشِ مزارِ بیکسی　　تیری تربت پر برستا ہے غبارِ بیکسی

ہائے وہ تیری جوانی وہ ترا عہدِ شباب

آج تو ہے قبر کی آغوش میں مصروفِ خواب

(مخاطب کی محبوبہ کی حالت لکھتے ہوئے کہ وہ تیرے لئے آج تڑپتی ہے نظم کو اس طرح ختم کرتے ہیں)

روح تیری ہجر میں اسکی اچھلتی ہے بہت　　حسرتِ واماندہ ہے اب تک مچلتی ہے بہت

لیکن اک دن آئیگا پھر عشقِ رفتہ جوش میں　　اس کا حسنِ بے نظیر ہوگا تری آغوش میں

وہ تری بربادیاں اور وہ تری واماندگی　　آہ افسانہ ترا دنیا نہ بھولے گی کبھی

رنگِ نیرنگی جھلکتا ہے تری افتاد میں

پھر بہار آئیگی تیرے گلشنِ آباد میں

عارف ڈاکٹر مولوی عبدالحئی صاحب بھاگلپوری ۶۴

آپ کا نام عبدالحئی اور عارف تخلص ہے آپ شہر بھاگلپور محلہ پرہ پورا میں جو قدرتی باغات اور مرغزاروں کے درمیان واقع ہے ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب اس ممتاز اور قدیم خاندان کے قابل فرد ہیں جو فرمانروائے سلطنت ہند اکبر اعظم کے زمانہ میں لقب "میردہ" سے شرف یاب ہوا تھا۔ اس خاندان کو بادشاہ کی طرف سے چند گاؤں تفویض کئے گئے تھے جن کی "میردہ" لوگ حفاظت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں سلطان زماں جب مشرقی ہند کی طرف بغرض معائنہ یا سیاحت۔ یا شکار تشریف لے جاتے تو ان کی خیمہ گاہ اسی شہر کی حدود میں مقرر مقام پر قائم کی جاتی تھی۔ جس کی حفاظت بھی یہی لوگ کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی رئیس سلطانِ معظم سے شرفِ ملاقات کا خواہاں ہوتا تھا تو انہیں کی وساطت سے اُس کی باریابی ہوتی تھی۔ ان خدمات کے صلے میں ان کو جاگیریں عطا ہوئی تھیں جو اب تک بعض لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ پرہ پورہ شہر بھاگلپور میں خالص مسلمان شرفا کا ایک بہت بڑا محلہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد میردہ عبدالعزیز محلے کے تعلیم یافتہ لوگوں میں تھے۔ اور اس شہر کی ایک بہت بڑی ریاست کی تحصیلداری کے عہدہ پر مامور تھے ان کو علم کا بہت شوق تھا۔ اور ہمیشہ اپنے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا ارادہ ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ مگر افسوس کہ ابھی ڈاکٹر صاحب مکتب ہی میں تعلیم پا رہے تھے۔ اور آپ کی عمر صرف سات سال کی تھی کہ والد بزرگوار کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ مگر آپ کی والدہ ماجدہ نے اپنے مرحوم شوہر کے ارادہ کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی تعلیم کا ہر طرح انتظام کر دیا۔

مکتب کی تعلیم کے بعد جب آپ انگریزی اسکول میں آئے تو شاعری کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اور یہ بالکل فطری تھا۔ اس لئے کہ نہ تو کوئی ان کا ہم جماعت شاعر تھا نہ شاعری ماحول میں پیدا ہوئے تھے تھوڑے ہی عرصہ میں اس کثرت سے شعر کہنے لگے کہ ایک مکمل تاریخ اپنے محلّے کی مسدس میں کہہ ڈالی۔ جو نہایت مقبول ہوئی۔ شاعری کے شوق نے آپ کو فارسی اور عربی تعلیم کی طرف بھی رغبت دلائی چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ پرائیوٹ طور پر فارسی اور عربی زبان میں بھی کامل دستگاہ حاصل کر لی۔

۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر صاحب نے کلکتہ سے اول درجہ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اپنے شہر کے کالج میں داخل ہو گئے خوش قسمتی سے جناب واقف بہاری مرحوم اس کالج میں داخل ہو کر آپ کے ہم جماعت ہوئے اور بہت گہرے دوست ہو گئے۔ اب تو عارف صاحب کی شاعری میں اور بھی چار چاند لگ گئے۔ آپ نے بی اے تک تعلیم حاصل کی مگر افسوس کہ بی اے کے امتحان میں چند ہفتے ہی رہ گئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی رفیقۂ حیات نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ جس کا ڈاکٹر صاحب کو بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی رفیقۂ حیات سے بےحد الفت تھی۔ مرنے والی نہایت خوبصورت۔ تعلیم یافتہ۔ روشن ضمیر اور نیک سیرت خاتون تھیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے پھر دوسری شادی اب تک نہیں کی۔ اس سانحۂ جانکاہ نے ڈاکٹر صاحب کو اس قدر مضطرب کیا کہ آخر مجبوراً تعلیم ترک کر دی۔

ڈاکٹر صاحب کو شاعری کے ساتھ مذہب سے بھی دلچسپی تھی۔ اس لئے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ تسکین

خاطر کی غرض سے قادیان تشریف لے گئے یہاں کچھ عرصہ مقیم رہ کر افریقہ پہنچے۔ یہاں تین سال اپنی جماعت کا کام کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کرتے ہوئے وطن آ گئے۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب کو علم ڈاکٹری سے بہت دلچسپی تھی اس لئے کلکتہ سے ڈاکٹری میں اعلیٰ درجہ کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد اپنی جماعت کی طرف سے حلقۂ آگرہ کے لئے امیر مقرر کئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب یہاں سات سال تک دینی خدمات میں معروف رہے۔ دوران قیام آگرہ میں ڈاکٹر صاحب کو حضرت مولانا سیماب مدظلہ سے شرفِ ملاقات کا موقع ملا۔ جوہر شناس آنکھوں نے ایک ہی نگاہ میں اپنی رہبری کے لئے مولانا کو چن لیا۔ اور حلقۂ شاگردی میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس رنگ میں اپنے لائق استاد کو دیکھا اس کے متعلق یوں فرماتے ہیں۔

سیماب

رحمت و فضلِ الٰہی شاملِ سیماب ہے — عالم اردو میں روشن محفلِ سیماب ہے
جوش زن ہو کر قلوبِ اہلِ معنے ہیں خموش — مضطرب بزمِ سخن میں اک دلِ سیماب ہے
بدمذاقی کی تلاطم میں ہے کشتیِ سخن — ضوفشاں تا دُور شمعِ ساحلِ سیماب ہے
چھوڑ دی فرہاد اور دوشت گردی چھوڑ دی — آج شیریں ہے سخن اور محملِ سیماب ہے
جزوِ اعظم کیمیا کا ہے یہی اس واسطے — کیمیا گر کو تلاشِ حاصلِ سیماب ہے
آنکھ سے شاعر کو اوجھل راہ میں کرنا نہیں — قافلے والو یہ خضرِ منزلِ سیماب ہے

کچھ تو ہے گفتار میں تاثیر عارف با یقیں
ورنہ کیوں یہ بزمِ عالم مائلِ سیماب ہے۔

نمونۂ تغزل

نالۂ خاموش ہیں ہنگامۂ ہستی میں ہم — زندگی طے کر رہے ہیں حزن کی بستی میں ہم
انتہائی بام پر ہے مادیت کا عروج — دیکھتے ہیں آدمیت کو مگر پستی میں ہم
ہوش میں جز مرگ کوئی لا نہیں سکتا ہمیں — [illegible] آسودہ ہیں اب رات دن مستی میں ہم
آرزو ہے بادۂ ظاہر نہیں ہے ہم کو شیخ — غرق رہتے ہیں مئے توحید کی مستی میں ہم
عالمِ حرص و ہوا سے اپنا عالم دور ہے — اس لئے مسرور ہیں عارف تہیدستی میں ہم

یاد ایام کہ صبحِ زندگی ضو بار تھی — دامنِ ذہنِ رسا پر بارشِ انوار تھی
بارشِ مضراب سے پُرشور تھا سازِ حیات — نغمہ زا تعمیرِ خاکی کی در و دیوار تھی
موجِ نزہت موجزن تھی گلستاں میں ہر طرف — ہر بساطِ گل وفورِ گل سے آتشبار تھی
اہتزازِ گل سے تھی پیدا بہارِ جاوداں — سرزمینِ گلکدہ نادیدۂ ادبار تھی
تھے خراماں چشمۂ کوثر فشاں زیرِ شجر — جرعۂ آبِ بقا ہر موجِ جوئبار تھی

عالمِ اخلاص میں عارف بسر کرتی تھے ہم
رشک کے قابل ہماری ہستی بیدار تھی

نمونۂ نظم

اولادِ آدم

کاشانۂ دہقاں میں دیا ہو گیا روشن — کہسار کے بازو پہ ضیا بیز ہے جوشن
آتا ہے نظر مثلِ گل و لالۂ گلشن — جس کو نہ کھٹکا ہے چھوٹی اور نہ دشمن

گلدستۂ فردوسِ بریں زیبِ نظر ہے
آئینۂ فطرت میں یہ نایاب گہر ہے

پیدا ہوئی ہر رنگ سے اک شان حیا کی — لیلیٰ نے گرہ کھول دی گیسوئے رسا کی
ضوگیر محبت ہوئی آغوش فضا کی — امواج ہوئیں نوم فشاں مست ہوا کی

ہنگامۂ پرشور ہوا سرد جہاں کا
ناقوس صدا ریز ہوا امن و اماں کا

آسودہ ہوئی خلق جہاں امنِ شب میں — محفوظ بصد امن ہے گہوارۂ رب میں
اولادِ ہے آدم کی مگر کربِ تعب میں — معتوب فقط یہ ہے عجم اور عرب میں

اس عالمِ ہستی میں نہیں چین بشر کو
ملجائے سکوں کا کوئی چھینتا ہے شر کو

حکیم الدین صاحب فہیم انصاری فیروزآبادی

مرزا اسلام اللہ بیگ صاحب فضا الہ آبادی

فضل الدین صاحب فدا الھیم کرنوی

ماسٹر سری کرشن صاحب فدا پٹیالوی

فضائی — ابوالعرفان مولوی حبیب اللہ صاحب رضا ٹونکی — ۶۵

آپ کا نام حبیب اللہ اور فضائی تخلص ہے۔ فضائی صاحب ریاست ٹونک راجپوتانہ کے باشندے اور ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے والد مفتی عبد اللہ خاں صاحب متقیل ٹونک کے علمائے مشاہیر کی صفِ اول میں شمار ہوتے تھے۔ خاندانی امتیاز اور مرتبہ کے لحاظ سے آپ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد عرصہ تک آپ بھوپال میں مقیم رہے۔

ٹونک ایک اسلامی ریاست ہے، اور وہاں دینی تعلیم و مشرقی علوم کی تحصیل پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس لئے اکثریت علوم مشرقی اور تعلیم مذہب سے آگاہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس رواج اور اصول کے ماتحت آپ کو بھی مشرقی علوم و تعلیمات سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملا۔ ادھر خاندانی روایات کے مطابق مذہبی تعلیم اور علوم مشرقیہ کا مطالعہ بھی ضروری تھا چنانچہ ریاست کی اسلامی مدرسہ میں جس کے مدرسِ اعلیٰ مولانا حکیم برکات احمد رح مرحوم اور اُن کے صاحبزادے حکیم محمد میاں رح مرحوم تھے آپ نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ عربی اور فارسی میں آپ کی قابلیت نہایت اعلیٰ اور آپ کا مطالعہ نہایت جوان و تازہ ہے۔ ذہنی طور پر آپ فلسفۂ یونان اور قدیم علمی نظریات کے دوسروں کی طرح غلام نہیں۔ آپ نہایت آزاد خیال اور مضبوط ایمان کے شخص ہیں۔ اور نقل کیساتھ عقل کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں جب حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ نے ٹونک کا سفر کیا تو مولانائے موصوف کی علم و فضل اور شعر و ادب سے آپ بھی متاثر ہوئے طبیعت میں قدرتاً شعر سے ایک علاقہ محسوس ہوا۔ اور علوم مشرقی کے سلسلے میں ابو نواس و متنبی۔ خیام و حافظ، نظیری و عرفی وغیرہ کا تمام کام جو آپ کی نگاہوں سے گذر چکا تھا۔ اپنی تمام اعجاز نمایوں کیساتھ کارفرما ہوا یہاں تک کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ ایک فطری شاعر ہیں اور اس جوہر کو صرف نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا کے تلامذہ میں داخل ہو گئے اور ادارۂ قصر الادب آگرہ کی ترغیب پر میدانِ ادب میں نمودار ہو گئے جہاں بہت جلد ہی اپنی مضبوط ادبیت کا علم گاڑ دیا۔

اسی زمانہ میں اجمیر سے صاحبزادہ اسلام علی و وزیر علی صاحب کی ملکیت و انتظام میں ایک ادبی رسالہ "کیف" کے نام سے شائع ہو رہا تھا۔ جس کے نگراں ملک کے مشہور ادیب حضرت رفیعی اجمیری تھے، آپ کی تحریک پر فضائی صاحب نے "کیف" کی ادارت قبول کر لی۔

آپ نے اپنی پوری قابلیت اور انہماک کے ساتھ "کیف" کے فرائضِ ادارت ادا کئے اور چند ماہ کے اندر ہی اسے ترقی کے منازل طے کرا دئے یہاں تک کہ اس کا شمار ملک کے بہترین رسائل میں ہونے لگا، اسی زمانے میں یعنی ۲۷، ۲۸، ۱۹۲۹ء میں ادارۂ کیف سے ایک ہفتہ وار اخبار "اتفاق" بھی جاری کیا گیا۔ اس کی ادارت بھی آپ نے فرمائی اور سیاسیات میں اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیا۔ کیف و اتفاق کی معروفیت نے آپ کے جوہر قابلیت اور روحِ ادبیت کو ملک بھر میں روشناس کرا دیا اور آپ کا شمار آپ کے کلام کے لحاظ سے ملک کے نوجوان ادیبوں میں ہونے لگا۔

آپ عربی و فارسی سے آسانی کیساتھ بامحاورہ ترجمہ کر لیتے ہیں اور ہر قسم کے مضامین خصوصاً ادبی و تنقیدی لکھنے میں مہارتِ تامہ حاصل ہے اور شعر کا معیار بہت ستھرا ہے۔

آپ کے اخلاق و عادات ایک پکے مسلمان کے سے ہیں، ملنساری اصول ہے۔ اور سچائی مشرب، جس کو دوست کہہ دیتے ہیں اس کی

دوستی سے کم انکار کرتے ہیں جس سے ملتے ہیں دل کھول کر سچائی سے ملتے ہیں، کم سخن، محبوب، از اد خیال [illegible] اور صف جلسے کے انسان ہیں
آپ کی شاعری باوجود مولوی اور عربی داں ہونے کے خشک اور مولویانہ نہیں، اشعار میں کمل شعریت ہوتی ہے۔ خیالات لطیف اور نازک ہیں۔ جذبات اور تاثرات کی جھلک ہوتی ہے۔ زمانے کے مصائب نے دل کو رقیق کر دیا ہے "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" کلام میں بڑی حد تک پختگی متانت اور ادبی بلندی پائی جاتی ہے۔ نظم اور غزل کے علاوہ افسانے اور ادبی مضامین بھی خوب لکھتے ہیں۔ آج کل بھی آپ اجمیر ہی میں قیام کرتے ہیں اور مدرسہ اسلامیہ ہائی اسکول میں دینیات و فارسی کے معلم ہیں۔

نمونۂ تغزل

مصیبت زا کہن دنیا ہے انساں کیلئے
دوسرا عالم بنا دے چشمِ عرفاں کیلئے

اک تغافل کیش سے کہنی ہے غم کی داستاں
چاہیئے خونِ جگر تہذیبِ عنواں کیلئے

چشمِ ظاہر پر ہو ستر کن اقربِ آشکار
بیخودی اک نیشتر لا دے رگِ جاں کیلئے

تو دیارِ خفتہ بختی سے اگر گذرے صبا
ڈھونڈنا اک نیند میری چشمِ گریاں کیلئے

آپ کیوں کر دیں مجھے ترکِ تعلق سے تباہ
اک سہارا ہے یہی عمرِ پریشاں کیلئے

جو ہر اشیا میں ہوتا ہے تقابل سے فروغ
بت پرستی شرط ہے تمیزِ ایماں کیلئے

چند راتیں اپنی زلفوں سے بنا کر بھیج دو
ہے ضرورت میری چشمِ انجم افشاں کیلئے

شوق نے مانگی تھی اک دن بھیک بابِ دوست پر
دیدۂ حرماں کی ٹھوکر ہے شرمِ داماں کیلئے

سازِ لب سے آپ نکلیگی فغانی صوتِ غم
سوزِ الفت چاہیئے قلبِ غزلخواں کیلئے

جذب ہے دل میں مرے وہ لذتِ لطفِ قدیم
اب نہیں ہے وہ اگر بیگانگی کی خو بڑھے

پیچھے پیچھے آئیگا پیراہنِ یوسف مگر
آگے آگے سے چلے پیغام بھر خوشبو بڑھے

ہے فغانی شرطِ عرضِ حال خودداری ضبط
کہتے کہتے جب زباں رک جائے تو آنسو بڑھے

نمونۂ نظم

"الہام پارہ"

شب کی خاموشی میں جب بجتا ہے سازِ رنج و غم
چپکے چپکے فلک کے تاروں کو سلاتا ہے کوئی

جاگ جاتا ہوں میں گھبرا کر باندازِ جنوں
چاندنی میں دشت پہ میری مسکراتا ہے کوئی

چاہتا ہوں کہ [illegible] کر لوں بند آنکھوں کو مگر
چھیڑ کر پردے تخیل کے در آتا ہے کوئی

لٹ گئیں آنکھوں کی نیندیں چھن گیا دل کا سکوں
پھر بھی یہ ممکن نہیں میں تجھ کو غارتگر کہوں

خوابِ تجلی

شب کہ میں خواب میں تھا بسترِ راحت پہ دراز
منبسطِ ظلمات میں ہر چیز تھی اک عالمِ راز

نکہت آمیز ہواؤں میں سکوں سوتا تھا
شبنمِ برگ نشیں سیکھ رہی تھی پرواز

یک بیک مطلعِ ارماں سے اجالا چمکا
صورت آرا ہوا اک جلوۂ تخیل طراز

جس کی سیرابِ تبسم سے تھی احیائے نشاط
جس کی شاداب نگاہیں تھیں حیاتِ اعجاز

عجزِ فطری پہ ہوا ذوقِ تماشا طاری
لڑکھڑا کر بے تعظیم بڑھا شوقِ نیاز

رونقِ خلوتِ پہلو وہ ہوا دل کی طرح
میرا غمخانہ بنا برقِ گہِ جلوۂ ناز

مجمرِ شوق میں اک آتشِ لذت بھڑکی
روشِ مہر فزا اس کی ہوئی عنبر ساز

زانوئے صاف پہ رکھا سرِ سودائی کو
لگیا بختِ فغانی کو سرِ اعجاز

لبِ شیریں سے پلائی مجھے تسنیمِ گناہ
آہ یہ عرشِ تعشق، یہ ہے معراجِ نیاز

اے مرے مردمِ دیدہ کی ضیائے روشن!
اے مرے آئینۂ دل کی جلا بخشِ ناز

پردۂ خواب میں محدود تجلی تاچند
سوز بن کر تنِ آلودہ میں ہو روح گداز

ایک تو یہ سکوں بن کے سما جا دل میں
ایک تصویرِ درد بن کے ہو تجانہ نواز

رنگِ کثرت بہ سبک روحیِ من طاری شد
جلوہ بنما کہ فغاں از نفسم جاری شد

عبدالستار خاں صاحب فکری بھوپالی

حکیم بدیع الزماں صاحب قمر نعمانی سہسرامی

فیاض — محمد فیاض حسین صاحب اکبر آبادی (۶۶)

آپ کا نام محمد فیاض حسین اور فیاض تخلص ہے۔ آپ کے والدِ بزرگوار شیخ محمد قادر بخش صاحب قریشی۔ تحصیلدار مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ وطنِ خاص اکبر آباد ہے۔ ۱۸۸۹ء میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد لکھنؤ کے باشندے تھے اور ریاست اودے پور کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ آپ کے جدِ امجد تحصیل فتح آباد ضلع آگرہ میں اہلکار تھے۔ آپ کے والد صاحب کے حقیقی ماموں ڈاکٹر حاجی شیخ الٰہی بخش صاحب آگرہ کے مشہور لوگوں میں تھے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر آپ کی قدر کرتے تھے۔ غدر سے پہلے آپ کے آباؤ اجداد واردِ آگرہ ہوئے۔

فیاض صاحب نے ۱۹۰۵ء میں سینٹ جونس ہائی اسکول آگرہ سے انٹرینس کا امتحان پاس کیا۔ خان بہادر مولوی اختر عادل صاحب ڈبل ایم اے۔ گورنمنٹ پلیڈر۔ ممبر کونسل و میونسپل کمشنر آگرہ آپ کے ہم جماعت تھے۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء کے قحط کے زمانہ میں چار پانچ سال تک آپ متھرا اور آگرہ میں نائب تحصیلدار رہے۔ اس کے بعد محکمۂ نمک میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۶ء تک بعہدۂ انسپکٹری فائز رہے۔ ۱۹۳۶ء سے آپ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہو گئے ہیں۔ اور سانبھر راجپوتانہ میں مقیم ہیں۔

۱۹۱۰ء میں آپ کی شادی ڈاکٹر غفور خاں صاحب مرحوم ساکن چھلی اینٹ آگرہ کے یہاں ہوئی تھی۔ لیکن شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمہ سے آپ نے ارادہ کر لیا کہ دوبارہ شادی نہ کریں گے لیکن نوعمری کا زمانہ تھا اس لئے بزرگوں اور احباب کے مشورہ سے دوسری شادی ڈاکٹر شیخ انور علی صاحب مرحوم ساکن آنادہ کی دختر نیک اختر سے کی۔ آپ کی خسرال میں ماشاءاللہ سب اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ آپ کے صرف ایک صاحبزادہ محمد اعجاز حسین ہیں جو آگرہ کالج میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس سال ایف اے کا امتحان دیا ہے۔

آپ ایک ایسی سرزمین کے باشندے ہیں جس کا ذرہ ذرہ شعریت بداماں ہے اس لئے شاعری کا ذوق ہونا لازمی تھا۔ آپ نے آگرہ کے چار مشہور اساتذہ۔ رئیس۔ نثار۔ واصف اور عالی کا زمانہ دیکھا ہے پہلے اپنے ذوق کی تکمیل کیلئے حضرتِ واصف اکبر آبادی کو اپنا رہبر تجویز کیا لیکن زیادہ عرصہ تک فیضیاب نہ ہو سکے۔ واصف صاحب کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے دامنِ ادب سے وابستہ ہو گئے اور پھر آج تک کسی دوسرے کے سامنے ایک مصرع بھی پیش نہیں کیا۔ ہم وطن اور ہم محلہ ہونے کی وجہ سے مولانا صاحب قبلہ آپ پر بہت عنایت فرماتے ہیں۔ بوجہ ملازمت اور مصروفیت شعر بہت کم کہتے ہیں لیکن کہتے ضرور ہیں۔ اکثر سانبھر اور راجپوتانہ وغیرہ کے مشاعروں میں بھی شرکت کی ہے۔ بہت کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اکثر رسائل میں آپ کا کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ انتہائی خلیق اور باوضع بزرگ ہیں۔

نمونۂ تغزل

یہ جہاں اہلِ محبت سے اب آباد نہیں — اک ہوس گاہ ہے یہ عالمِ ایجاد نہیں

یاد اتنا ہے کہ آیا تھا کبھی دورِ شباب — کب گیا اور کب آیا یہ ہمیں یاد نہیں

بال و پر نوچ کے کرتا ہے اسیروں کو رہا — یہ ستم ہے یہ کرم اے مرے صیاد نہیں

خوفِ انجامِ محبت کا ہوا ہے غالب — تم بھی اب وجہِ سکونِ دلِ ناشاد نہیں

عہد و پیماں جو کئے آپ نے سب بھول گئے
بھول جانے کے سوا آپکو کچھ یاد نہیں

آستانہ ہو بتوں کا کہ خدا کا دیکھو
کہیں مقبول دعائے دل ناشاد نہیں

زہے تقدیر کہ دل میں ہیں تمہارے ہمکو
اب یہ برباد بھی ہو جائے تو برباد نہیں

شعر کہنے کا زمانہ نہ رہا اے فیاض
اب تو اک سانس بھی افکار سے آزاد نہیں

خانۂ دل میں ہے جلوہ اُس بت بے پیر کا
خلق میں شہرہ ہے جس کے حسن عالمگیر کا

اک بہانا ہو گیا تقدیر کو تدبیر کا
معرکہ قائم رہا تدبیر سے تقدیر کا

صنعت خلاق کا ادنیٰ نمونہ ہے قمر
شمس ذرہ ہے خدا کے نور کی تنویر کا

ہاں وہی دیتا ہے سب کو فضل سے اپنے مدام
ہے جو مخزن اور منبع فیض عالمگیر کا

یا الٰہی ہو گدائی اس کی کوچہ کی نصیب
میں نہیں خواہاں ہوں تجھ سے منصب جاگیر کا

ہو گیا غالب کا مصرع لوح دل پر اپنے منقش
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا"

بلبل و گل کا تعشق حسن گل سے ہے عیاں
شاہد و مشہود حق ہے عاشق دلگیر کا

عشق کا حسنین کی صبح و مسا بھرتا ہوں دم
فیض ہے فیاض دائم شبر و شبیر کا

یکتائے روزگار ہیں دونوں کمال میں
کامل ہیں عشق میں ہم وہ حسن و جمال میں

صدمے بھرے ہوئے ہیں دل پر ملال میں
تسکین دیجئے مجھے آکر خیال میں

ثانی نہیں ترا کوئی حسن و جمال میں
میں کیوں نہ مر مٹوں تری شوق وصال میں

نکلیں گی جیتے جی نہ مری دل کی حسرتیں
ہو جائیگا وصال ہی شوق وصال میں

وہ برق جس نے میرا نشیمن جلا دیا
لہرا رہی تھی میری ہی شاخ نہال میں

کچھ ہے تری جمال میں خوئے نظر کشی
کچھ ہے مری نظر کا کرشمہ جمال میں

فیاض حشر دیکھئے زہد و گناہ کا
سب نے پناہ لی کرم ذو الجلال میں

کچھ ذوق اضطراب نے رسوا کیا مجھے
کچھ دیدۂ پُرآب نے رسوا کیا مجھے

پھر تیری اس حجاب نے رسوا کیا مجھے
بے وجہ اجتناب نے رسوا کیا مجھے

ضبط جمال نے انہیں بدنام کر دیا
اور میری اضطراب نے رسوا کیا مجھے

لاکھوں میں کہہ دیا انہیں یکتا تو یہ کہا
ظالم اس انتخاب نے رسوا کیا مجھے

جو جی میں چاہا کہہ لیا میں تن کی پی گیا
مدہوشی شراب نے رسوا کیا مجھے

صورت جو میری دیکھی تو ناراض ہو گئے
بے وجہ اس عتاب نے رسوا کیا مجھے

دیکر جواب صاف مرا رد کیا سوال
اس برملا جواب نے رسوا کیا مجھے

اس بھولے پن کی باتوں کے قربان جائیے
کہتے ہیں وہ جناب نے رسوا کیا مجھے

رکھا ہے بے نوائی پہ فیاض میرا نام
دنیا کے انقلاب نے رسوا کیا مجھے

خدا کی خاص رحمت یا رسول ہاشمی ہو گی
تمہاری ساری امت جنتی ہی جنتی ہو گی

وہ کیوں جائیگا دوزخ میں اسے کیا کام دوزخ سے
بھلا وہ کیوں جلیگا جسکی لو تم سے لگی ہو گی

زباں پر ان کی کوئی بات ہو گی تو یہی ہو گی
سر محشر صدائے امتی یا امتی ہو گی

تم اپنے گیسوؤں کا سر پہ سایہ ڈالتے رہنا
کہ آقا دھوپ میدان قیامت میں کڑی ہو گی

قلم کی دو زبانیں ہیں تو ہوں گا کام دونوں سے
خدا کی حمد بھی ہو گی نبی کی نعت بھی ہو گی

مجھے امید ہے وہ خود توجہ سے بنا لیں گے
جو میری بات محشر میں کوئی بگڑی ہوئی ہو گی

وہیں چلکر کسی پتھر سے اسکو پھوڑ ڈالیں گے
سر آشفتہ ہو گا اور طیبہ کی گلی ہو گی

تم اپنے جلوۂ روشن سے کچھ شمعیں جلا جانا
سنا ہے قبر کی خلوت میں تاریکی بڑی ہو گی

ملیگا مجھ کو اے فیاض جو کچھ ان سے مانگوں گا
سخی داتا ہیں وہ سرکار بھی انکی سخی ہو گی

محمد مصطفیٰ صلی علیٰ صدر العلا ہو کر
زمیں پر آئے ہیں بدر الدجیٰ شمس الضحیٰ ہو کر

پڑھوں یوں نعت مداح محمد مصطفیٰ ہو کر
کہ گونجے داد بزم شعر میں صلی علیٰ ہو کر

مجھے جلوہ دکھا بھی دیجئے جلوہ نما ہو کر
نکل بھی آئے پردہ سے دل کا مدعا ہو کر

دکھایا واہ کیا شق القمر کا معجزہ تم نے
مسخر کر لئے دل کافروں کے مہ لقا ہو کر

ازل میں سب سے پہلے نور حضرت کا ہوا پیدا
مگر تشریف لائے آپ ختم الانبیا ہو کر

شفاعت آپکی ہم عاصیوں کو بخشوائیگی
ہمیں جنت میں لیجائیں گے حضرت رہنما ہو کر

ہو الاول ہو الآخر سے ظاہر ہے وہ آئے تھے
فلک کی ابتدا ہو کر زمیں کی انتہا ہو کر

جسے دیکھو اسی کے دل میں ہے سرکار کی الفت
ہوئے محبوب عالم آپ محبوب خدا ہو کر

فہیم — حکیم الدین صاحب انصاری فیروز آبادی (۶۷)

آپ کا نام حکیم الدین اور فہیم تخلص ہے۔ فہیم صاحب کا وطنِ اصلی فیروز آباد کے قریب موضع نگلہ کلاں (ضلع آگرہ) ہے۔ اسی رعایت سے آپ اپنے کو فیروز آبادی کہتے ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد نے بسلسلۂ زمینداری نگلہ ملاں کو آباد کیا تھا۔ آپ کے والد شیخ حفیظ الدین صاحب اپنے زمانے کے ایک کامیاب تاجر تھے لیکن آج کل ضعیفی کی وجہ سے تجارت کے کاروبار کو ترک کر چکے ہیں۔ آپ نگلہ ملاں میں یکم دسمبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے آپ کی ابتدائی تعلیم فیروز آباد میں ہوئی دینی تعلیم کا خاص انتظام صوبۂ متحدہ کے ایسے قصبوں میں جیسا کہ فیروز آباد ہے لازمی پایا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان شہروں کے قریبی قصبات میں جو عہدِ مغلیہ میں دار السلطنت رہ چکے ہیں آفتاب علم کی شعاعیں ہمیشہ نور افشانی کرتی رہی ہیں۔ چنانچہ ان قصبات میں بھی اکثر ایسے نفوس پیدا ہوئے جن کی ذات مقامی طور پر فیض رساں ثابت ہوئی۔ فیروز آباد میں بہت سے نفوس ایسے موجود ہیں جو علومِ مشرقی کے ماہر اور فنِ شعر سے واقف ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نگلہ ملاں صوبۂ متحدہ کے جغرافیہ میں فیروز آباد اور شکوہ آباد یعنی حضرتِ منیر کے وطنِ مالوف کے بین بین ایک جگہ ہے دنیائے شاعری میں منیر شکوہ آبادی کی جو عظمت اور شخصیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نگلہ ملاں پر اس کا جو اثر پڑا ہوگا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ فیروز آباد اور نگلہ ملاں تو درکنار آگرہ بھی منیر کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا اور یہاں بھی موجودہ عہد کے مسلم الثبوت نغزگو اور ماہر فن ادیب و شاعر مرزا عاشق حسین بزمؔ اکبر آبادی نے منیر ہی کی بزمِ شعر سے اکتساب فیض کیا ہے۔ مطلب اس تمہید سے یہ ہے کہ فیروز آباد علمی اور شاعرانہ حیثیت سے ایک غنیمت مقام ہے جو انحطاط اب وہاں پایا جاتا ہے وہ خصوصی نہیں بلکہ عمومی ہے جیسا کہ تمام ہندوستان اور خصوصاً مراکزِ ادب دہلی لکھنؤ اور آگرہ میں پایا جاتا ہے۔

فہیم صاحب نے اردو، فارسی اور دینی تعلیم فیروز آباد میں حاصل کی اور اردو، فارسی، ہندی سنسکرت اور طریقِ تعلیم کے امتحانات الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کئے آپ بڑے علم دوست نوجوان ہیں کسی وقت اپنی ترقیٔ تعلیم کے خیال سے خالی نہیں رہتے۔ اور آج کل انگریزی زبان سے بھی استفادہ کر رہے ہیں۔

تکمیل تعلیم کے بعد آپ ٹیچرس ٹریننگ اسکول مڈھاکر (آگرہ) میں طریقِ تعلیم کے ماسٹر رہے۔ آج کل آپ آگرہ مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں اور سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ کے سکریٹری بھی ہیں۔

سالِ گزشتہ جولائی ۱۹۳۶ء میں آپ کی شادی قصبہ جلیسر (ضلع ایٹہ) میں سید معشوق علی صاحب گورنمنٹ پنشنر کے یہاں ہوئی ہے۔

آپ کو ابتدا ہی سے شعر و شاعری سے بطورِ خاص ذوق ہے ابتدا میں آپ نے اپنے برادرِ محترم منشی قمر الدین صاحب قمرؔ سے مشورۂ سخن کیا پھر ۱۹۲۸ء میں آپ نے حضرت علامہ مولانا سیماب اکبر آبادی مدظلہٗ سے باقاعدہ شرفِ تلمذ حاصل کر لیا۔

فہیم صاحب ان نوجوانوں میں سے ہیں جن پر ترقی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور جو اپنی تیز گامی سے منزل کے حائلات کو ٹھکراتے ہوئے آگے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ میں فہیم صاحب کے کلام اور معیار پر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ آپ ادبی دنیا میں چمکنے لگیں گے۔ فہیم صاحب میں چند خصوصیات جو میرے مطالعہ میں آ چکی ہیں اور بھی ہیں۔ اُن کا خلوص، سیرت کی نیکی، طرزِ گفتگو، اور

بغیر عذر مشکل سے مشکل کام پر آمادہ ہوجانا ہر شخص کو گرویدہ کر لیتا ہے۔
نظم و نثر دونوں میں آپ کو عبور حاصل ہے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا کلام
چھپنے والا ہے۔

نمونۂ تغزل

کیا ہماری آب و گل میں سنگ آہن ہے کہ یہ   کیوں زمیں کی دوش پر اتنی گراں ہے زندگی

حسن کو طور پہ مجبور کیا تھا میں نے   بھول سکتی نہیں تاریخ محبت مجھ کو

ستاروں میں بھریں وہ کشتیٔ مہ میں ڈالیں لنگر   مری آنسو کی بوندیں بھی فرق تیغ آسماں نکلیں
فریب حسن کی گہرائیاں کیا تھیں معاذ اللہ   وہیں پر جذب ہو کر رہ گئیں نظریں جہاں نکلیں
فہیم اپنے مذاق دید کی تکمیل ہو جاتی   یہ نظریں کیوں ہماری اور انکی درمیاں نکلیں

دل کی بھی تعمیر تعمیر تحیر خیز ہے   طور آسا جسم ہستی میں تجلی ریز ہے
ہو گئی ہے کیا اسی میں جذب تاروں کی ضیا   یہ سواد صبح گلشن کیوں تبسم ریز ہے
جنبشوں میں آ گئی بام و در کونین تک
ہستیٔ انساں فہیم زار فتنہ خیز ہے

اہل زنداں کی ہو زنداں میں کوئی تو یادگار   خون دل سے لفظ آزادی ہی لکھ جایا کریں

جب نہ نکلیں شام غم تارے تو پھر کیا کیجئے   اپنے دل کے داغ ہی تا صبح دیکھا کیجئے
اُن کی دزدیدہ نگاہی کا اثر کیا چیز ہے   ہر نظر کی ہے یہی حسرت کہ دیکھا کیجئے

یہ شعریت یہ کیف اور یہ سخن گوئی معاذ اللہ   مرصع اک غزل تیری نظر معلوم ہوتی ہے
میں دل کی روشنی میں جب نظر سے کام لیتا ہوں   تو وسعت دو جہاں کی مختصر معلوم ہوتی ہے

مرا نصیب نہ آئے اگر قرار مجھے   کوئی کرے بھی تو آسودۂ بہار مجھے
ردائے لالہ و گل میں وہ عیب گو بھی تو کیا   مذاق سیر و نظر پہ ہے اختیار مجھے
مسل کے پھینک دئے میں نے پھول گلشن کے   تری نظر میں جو آئی نظر بہار مجھے

اگر وہ حسن مطلق بے نیاز ماسوا ہوتا   تو پھر کیوں آدمی کے بھیس میں جلوہ نما ہوتا

جو ذرے خاک کو ئے یار میں مل کر بنے سورج   انھیں ذرات میں ہم ارتقائے دل سمجھتے ہیں
جو گرداب فنا میں ہم کو لے ڈوبی تو پھر ہے   جو لا اُچھلے تو دل ہے ہم اسی کو دل سمجھتے ہیں

در حقیقت سے تھے وہی لمحات موت   یاد سے تیری جو خالی رہ گئے
اٹھ نہ سکتا تھا پہاڑوں سے جو غم   دل کے ذرات پریشاں سہہ گئے

کیا کرے گی برق پیہم جستجو میری طرح   ہو تو لے پہلے خراب آرزو میری طرح
کیوں نہ ان کو انس میری آبلہ پائی سے ہو   خار بھی ہیں بے نیاز رنگ و بو میری طرح
راز فطرت سننے والا کوئی پیدا ہی نہیں   ورنہ تارے بھی ہیں گرم گفتگو میری طرح
آستان عرش پر پہونچیں گے سجدوں کے نشاں   خون دل سے دیکھ لو کر کے وضو میری طرح

جو بہار ہے تو ہوا کرے ہمیں اس سے کیا غرض کار ہے   اُسے اور آئیگا کیا نظر جو اسیر جلوۂ یار ہے
اُسے کارواں کی خبر نہیں جسے کھل کے تو نے لگا لیا   یہ فہیم زار ہے اے جنوں جو اسیر گرد و غبار ہے

شاید کبھی وہ اسمیں جلوہ گری کو آئیں   تاروں کی کھل کھل کے ہم اپنا دل بنائیں
دیپک ہے پھر بھی طائر ہم شور کیوں مچائیں   جل جائے ساز ایسے خاموش گیت گائیں
نکلے نہ چاند تارے تاریک ہے شب غم   اب داغ دل کے جگنو لاؤ ہمیں اڑائیں

نمونہ نظم

کسان

ہل چلائیں گی تری کھیتوں میں اک دن تتلیاں ۔۔۔ سر رکھیں گے آ کے تیری پاؤں پر سرمایہ دار
اس طرح ہو جائیگا اک روز مقبول انام ۔۔۔ آج جو آقا ہے ہوگا کل وہی تیرا غلام
ایک دن بسیگا حسن سطحِ خس وخاشاک پہ ۔۔۔ دن پھریں گے دیکھنا تارے اتر آئینگے خاک پہ
کھیت کی مینڈوں سے ہوگا آفتابِ نو طلوع ۔۔۔ مسکراہٹ سے تری ہوگا ربابِ نو طلوع

انقلابِ آسماں کی دھاک بٹھانے کو ہے
تو نہ گھبرا اب زمیں میں انقلاب آنے کو ہے

دیہات کی شام کا ایک منظر

کھل رہے ہیں تازہ تازہ وہ پاچتوں میں کنول ۔۔۔ جیسے ہوں کچھ سادہ سادہ شعرسازی غزل
یا تبسم جگنوؤں کا ہو کہیں جلوہ فروش ۔۔۔ یا کلیلیں کر رہی ہوں آہوانِ ذی خروش
بجلیوں کو آج پانی کی تھی شاید جستجو ۔۔۔ گاگریں لیکر جو آئی ہیں کنارِ آبجو
قلب کی وارفتگی کا نور برساتی ہوئی ۔۔۔ وہ چلی گھر کی طرف اک برق لہراتی ہوئی

رفتہ رفتہ اس طرح مقصد میں ہوکر کامیاب
سب چلی جائیں گی شاید تا غروبِ آفتاب

جناب حکیم الدین صاحب فہیم انصاری فیروزآبادی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

اسی لئے تو یہ ہے لذت خوشگوار مجھے (اصلاح: ہے یہ درد) ۔۔۔ قرار والے ہی کرتے ہیں بیقرار مجھے
پھر آئے یا کہ نہ آئے وہ سازگار مجھے (اصلاح: مرا نصیب، نہ آئے اگر قرار مجھے) ۔۔۔ کوئی کرے بھی تو آسودۂ بہار مجھے
یہ کیسے کہدوں نہیں عشق سازگار مجھے (اصلاح: خدا کرے ہو یہ عالم بھی) ۔۔۔ بنا رہے ہیں وہ تصویرِ انتظار مجھے
تری تلاش میں آوارۂ بیاباں ہوں ۔۔۔ ہر ایک ذرے سے آتی ہے اب پکار مجھے
مسل کے پھینک دئے میں نے پھول سوتا کے (اصلاح: گلشن کے) ۔۔۔ تری نظر میں جو آئی نظر بہار مجھے
حدودِ شوق سے بھی وہ بڑھ گیا آگے (اصلاح: آگے ملی جو تو وہ ہے) ۔۔۔ نظر نہ آئے گا تا حدِ انتظار مجھے
ردائے لالہ و گل میں وہ چھپ گئی تو کیا (اصلاح: بھی) ۔۔۔ مذاقِ سیر و نظر پہ ہے اختیار مجھے
جب انتظار کا آغاز ہی قیامت ہے ۔۔۔ تو کیا دکھائے گا انجامِ انتظار مجھے
فہیم اس نے کیا بے نیاز عالم سے ۔۔۔ سپرد کرکے محبت کے کاروبار مجھے

فدا — پنڈت سری کرشن صاحب پٹیالوی — ۶۸

سری کرشن نام اور فدا تخلص ہے۔ وطنِ اصلی کھوڑانی کلاں ریاست پٹیالہ ہے۔ آپ ۱۲ ارجون ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جناب شو رام صاحب پولیس کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ فدا صاحب نے ابتدا میں مڈل پاس کیا۔ اور پھر اپنے والد صاحب سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ کافی استعداد ہو جانے کے بعد انٹرینس کے امتحان کی تیاری کی امتحان سے چند روز قبل آپ سخت بیمار ہوگئے اس لئے امتحان میں شریک نہ ہوسکے۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف سے طبیعت اچاٹ سی ہوگئی۔ البتہ مشرقی علوم حاصل کرنے کا شوق رہا۔

آپ نے تعلیم چھوڑتے ہی پولیس میں ملازمت اختیار کرلی۔ دو سال تک یہ ملازمت کی۔ طبیعت کا لگاؤ اس طرف نہ تھا اس لئے محکمۂ تعلیم میں مدرس ہوگئے۔ کچھ عرصہ ہائی اسکول سامانیہ میں پڑھاتے رہے ۱۹۳۱ء میں آپ کا تبادلہ مدرسہ شیر پور میں ہوگیا۔ اب راجپورہ میں ہیں۔

۱۹۳۱ء ہی سے آپ کو شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان ہی دنوں آپ کو جناب وقار انبالوی سے تعارف حاصل ہوا۔ کچھ عرصے تک وقار صاحب سے مشورۂ کلام کرتے رہے اور آپکا کلام پنجاب کے مشہور رسائل۔ ادبی دنیا شاہکار۔ پرتاپ۔ ملاپ۔ راجپوت گزٹ۔ بھارت ماتا۔ زندگی۔ علم و عمل سدابہار وغیرہ میں چھپتا رہا۔ مزید ترقی کے خیال سے آپ کو ایک کامل استاد کی ضرورت تھی۔ لیکن انتخاب میں آپ عجلت سے کام لینا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ عرصہ تک آپ نے حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی ڈاکٹر سر محمد اقبال حضرت نوح ناروی۔ اور حضرت جوش ملسیانی کے کلام کا مطالعہ کیا۔ اور ہر چہار حضرات کے مدارج و اسلوب و اصلاح پر غور کیا اور ایک اٹل فیصلہ کے بعد ۱۹۳۵ء میں حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کی خدمت میں اپنی عرضداشت شاگردی پیش کی جو منظور ہوئی چنانچہ ذریعۂ خط و کتابت یہ سلسلہ جاری ہے۔

آپ حضرتِ قبلہ مولانا کے فیضِ سخن اور اپنے برادرِ عزیز بابو جانن رام صاحب بی اے ایل ایل بی کی اعانت سے اپنا کلام "مے عرفاں" کے نام سے منظرِ عام پر لانے والے ہیں اردو غزل کے علاوہ ہندی گیت بھی لکھتے ہیں۔ آپ غزل شور و شغب میں بھی کہہ لیتے ہیں لیکن نظم کیلئے تنہائی اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔

نمونۂ تغزل

مسموم رات دن ہے مرا دل ترے بغیر   ہر ادعائے عشق ہے باطل ترے بغیر
دیوار و در اداس ہیں شمعیں بھی ہیں خموش   ہے سرد آج گرمیٔ محفل ترے بغیر
ایسا کوئی جہان میں آتا نہیں نظر   آساں کرے جو عقدۂ مشکل ترے بغیر
ہر دم فریب لطف سی کھاتی ہیں داغ نو   ہر روز اک عذاب ہے نازل ترے بغیر
پھر لب ہیں سیکڑوں لئے نغمہ نواز آ   سونی پڑی ہے عشق کی محفل ترے بغیر
تاروں کی چھاؤں میں وہ تری ہم خرامیاں   اب کاٹتا ہے دامنِ ساحل ترے بغیر

تاریک دل فدا کا ہے بے نور ہے نگاہ
جینا کٹھن ہے اے مہِ کامل ترے بغیر

یہ ہوشیاری دکھائی خوب وقت بیخودی ہم نے   کہ پلے ناز پہ رکھدی نگاہِ ملتجی ہم نے
زمانے کی مصیبت مول لی ان کو دل دیکر   خزاں سے خود بدل ڈالی بہار زندگی ہم نے
ہم نے مانا کہ ہیں ہم ان کی نظر میں لیکن   ہم نظر آئیں گے کیا ان کی نظر ہونے تک
کمالِ شوق کا وہ اضطراب نظارہ   جمالِ حسن کا وہ اضطرار کیا کہئے
امیدیں قطع ہوئیں حوصلے بھی پست ہوئے   خزاں کے بھیس میں آئی بہار کیا کہئے
تیلیاں توڑ کے کہنہ و سلگا قفس کی صیاد   لطفِ پروازِ گلستاں کا اگر یاد آیا
رنگ پژمردہ دل افسردہ تمنا خاموش   بن کے تصویرِ نئی کشتۂ بیداد آیا

فضل الدین صاحب کیم کرنوی

آپ کا نام فضل الدین اور فدا تخلص ہے۔ ۱۲ر فروری ۱۹۰۸ء میں کیم کرن ضلع لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو آپ ریلوے میں ملازم ہو گئے چونکہ آپ ذہین اور اپنے کام میں بہت کافی ہشیار ہیں اس لئے بہت جلد ترقی حاصل کی پہلے آپ کو ساٹھ روپیہ تنخواہ ملتی تھی لیکن ۸ر نومبر ۱۹۳۵ء سے ایک روپیہ روزانہ اولاؤنس اور اسّی روپیہ تنخواہ ملتی ہے۔ آپ آج کل وان سورٹر (Ten Sorter) ہیں اس سے قبل گڈس کلرک تھے ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور سے تبدیل ہو کر آپ دینا نگر گئے اور وہاں ساڑھے پانچ سال تک کام کیا اب آپ لاہور آگئے ہیں اور اکثر دورے پر رہتے ہیں۔

دینا نگر کے قیام میں ۱۹۳۱ء سے آپ کو شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہاں مولوی برکت علی خاں صاحب شمیم مدیر رسالہ "مسلم گوجر" سے آپ کے خاص مراسم تھے۔ جب آپ نے پہلی بار غزل کہی اور شمیم صاحب کو سنائی تو موصوف نے حوصلہ افزائی کی اور شعر کہنے پر آمادہ کیا۔ جون ۱۹۳۵ء تک آپ شمیم صاحب ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ چونکہ طبیعت میں یہ جوہر بدرجۂ اتم موجود تھا اس لئے اس میں ترقی ہوتی رہی چند غزلیں کہنے کے بعد آپ نے حضرت نوح ناروی کی خدمت میں اپنا کلام بغرض اصلاح بھیجا اور نوح صاحب نے بھی فدا صاحب کی غزلوں پر نہایت محبت سے اصلاح دی۔ چونکہ طبیعت کا زور روز بروز بڑھتا جا رہا تھا ادھر نوح صاحب کے پاس سے غزلیں بھی دیر میں وصول ہوتی تھیں اس لئے آپ حضرتِ دل شاہجہاں پوری کی طرف متوجہ ہوئے اور چند غزلیں انھیں بھی دکھائیں۔ دل صاحب نے فدا صاحب کی بہت حوصلہ افزائی کی اور غزلوں کے معیار کو بلند کرنے پر آمادہ کیا۔

جون ۱۹۳۶ء میں حضرتِ کاظم دہلوی سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ کاظم صاحب جدید رنگِ تغزل کے پیرو ہیں اور ایک ہونہار نقاد ہیں کاظم صاحب نے فدا صاحب کے کلام میں سے ننانوے شعر منتخب کر کے "خوشۂ پروین" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد "نغمۂ سرکشش" کے نام سے فدا صاحب کی ننانوے رباعیاں بھی شائع کیں جو کافی مقبول ہوئیں کاظم صاحب فدا صاحب کے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ آپ نہ صرف ایک محبِّ صادق ہی ہیں بلکہ اکثر فدا صاحب کے کلام پر اصلاح بھی دیتے رہتے ہیں اور ان کا کلام کہکشاں میں بھی شائع کرتے ہیں اور انتہائی محبّت سے پیش آتے ہیں۔ اس اُنس و محبّت کا معیار اتنا بڑھ گیا ہے کہ دو حقیقی بھائیوں میں بھی اس چیز کا ملنا مشکل ہے۔ گو فدا صاحب کا زمانۂ مشقِ سخن بہت کم ہے لیکن تین حضرات کی اصلاحوں نے ان میں رفعت اور بلندی کے آثار پیدا کر دئے تھے۔ یہ فطری بات ہے کہ انسان ہر کام بقدرِ ظرف کرتا ہے۔ اور ظرف جتنا بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی ذوق بڑھتا جاتا ہے۔ یہی حال فدا صاحب کا ہوا۔ ذوقِ شعر کی فراوانی کیساتھ ساتھ آپ کی تشنگیٔ شوق بھی بڑھتی گئی۔ اب تک جتنے رہبر آپ کو ملے ان میں ہر شخص نے اپنے رنگ میں آپ کو رنگا لیکن آپ منزلِ کمال تک پہونچنے کے لئے برابر مصروف فکر و غور رہے۔ آپ لکھتے ہیں "حضرت علّامہ مولانا سیماب مدظلہ کی بہت شہرت سنی تھی اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ آپ کے یہاں سے ایک رسالہ "شاعر" بھی نکلتا ہے۔ آپ زمانہ بھر میں مانے ہوئے استاد ہیں۔ میں نے اپنی تخیّل کو اور بلند کرنے کے لئے یہ مناسب

سمجھا کہ ایک ہی طرف رجوع ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے درخواست کی اور مولانا مدظلہ نے اسے شرفِ قبولیت بخشا۔ ۱۴ مئی ۱۹۳۶ء سے برابر اصلاح لے رہا ہوں۔"

فدا صاحب نے جس نظریہ کے تحت اصلاح لینی شروع کی تھی الحمدللہ کہ وہ اس میں کامیاب ہیں اور روز مرّہ اُن کا معیار بلند ہوتا جا رہا ہے۔ ایک سال کے محدود زمانہ میں آپ کہیں سے کہیں پہونچ گئے ہیں "توشۂ پردیں" اور "نغمۂ سروش" آپ کی تصانیف ہیں۔ جن پر ملک کے شعرا کی آرا بہت حوصلہ افزا ہیں۔ آپ کو تاریخ گوئی میں بھی درک ہے اور تاریخیں خوب نکال لیتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

کیف کیا اس عالمِ ہستی میں ہو حاصل مجھے — یہ نظر آتا ہے صورت خانۂ باطل مجھے
ختم ہوتی ہے جہاں پابندیٔ دیر و حرم — اس جگہ اب لے چلی ہے بیخودیٔ دل مجھے
خاک ہو کر ذرہ ذرہ ہے تجلی آفریں — پھر نظر آنے لگا دل حسن کی محفل مجھے
بحرِ طوفاں خیز کی موجوں سے اندیشہ ہو کیا — جس جگہ میں ڈوب جاؤں ہے وہی ساحل مجھے
ذرہ ذرہ میں نظر آنے لگی تصویرِ دوست — کاش حاصل ہو کبھی ایسی صفائے دل مجھے
اللہ اللہ یہ تصور کی اثر انگیزیاں — ہر طرف آیا نظر وہ صاحبِ محمل مجھے
اس قدر مجھ کو کسی کے عشق نے بیخود کیا — غم ہے ماضی کا نہ ہے کچھ فکرِ مستقبل مجھے
مل گئیں سب خاک میں شوقِ طلب کی کوششیں — کچھ اثر تو ہی دکھا اے سعیٔ لاحاصل مجھے

کس لئے ہو جستجو دیر و حرم کی اے فدا
جلوہ گاہِ یار آتا ہے نظر جب دل مجھے

ماسوا سے کوئی بیگانہ بنے یا نہ بنے — تو عیاں ہو کوئی دیوانہ بنے یا نہ بنے
یہ تمنا ہے حقیقت کی تجلی دیکھوں — عرش میرے لئے کاشانہ بنے یا نہ بنے
نغمہ خواں روح کی گہرائی میں جب آپ ہیں — ہر نفس نغمۂ مستانہ بنے یا نہ بنے
جذبۂ ذوقِ طلب چاہئے کامل کوئی — رہبرِ کوچۂ جانانہ بنے یا نہ بنے
وسعتیں چاہئیں نظروں میں ترا دیوانہ — قابلِ کعبہ و بت خانہ بنے یا نہ بنے
انھیں ارمانِ تجلی کی خبر ہو جائے — مری رُوداد کا افسانہ بنے یا نہ بنے
طلبِ جلوہ گہِ دوست میں آوارہ ہوں — میرا انداز کلیمانہ بنے یا نہ بنے

اے فدا کیفِ حقیقت سے رہوں محوِ سرور
دم مستی مے و میخانہ بنے یا نہ بنے

حسنِ خلوت آشنا اب تو دکھا جلوا مجھے — کھو چکی ہے آرزوئے دیدۂ بینا مجھے
اک نظر میں کر دیا دل کو حقیقت آشنا — اللہ اللہ کس ادا سے آپ نے دیکھا مجھے
لے چلی ہے آج کس عالم میں مجھکو بیخودی — قطرے قطرے میں نظر آتا ہے اک دریا مجھے
حسن کی ہیں ذرہ ذرہ میں کرم فرمائیاں — کیوں نہ ہو عشرت کدہ معمورۂ دنیا مجھے
حشر میں بھی ہے نگاہِ شوق سے لذتِ حجاب — ہو کہاں تک انتظارِ وعدۂ فردا مجھے
بڑھ گیا ہوں میں صیاد راک سے آگے آج — ہر نظر پر ہو رہا ہے اب ترا دھوکا مجھے
الاماں جوشِ جنوں پر درکا عالم الاماں — تنگ آتی ہے نظر اب وسعتِ صحرا مجھے

عالمِ ہستی میں ذوقِ بیخودی دے کر فدا
کر دیا ہے عشق نے بیگانۂ دنیا مجھے

رُباعیات

ایک ایک نفس نعرۂ منصور ہوا — دُنیائے خودی سے میں یوں ہی دور ہوا
پردے جو تعیّن کے اٹھے آنکھوں سے — لاریب کہ دل نورِ علیٰ نور ہوا

بدکیش مسلماں کا ہے تقوی بیکار — خیرات میں صدقہ بھی ہے اس کا بیکار
جس کو نہیں تمیزِ حلال اور حرام — بے سود نماز اس کی ہے روزہ بیکار

ہر چند فدا شعبدہ گر ہے دنیا — آزار و غم و درد کا گھر ہے دنیا
لیکن جو رہے سعیٔ عمل میں کوشاں — اس کے لئے فردوسِ نظر ہے دنیا

دل جلوہ مستور سے معمور بھی ہے　　دراصل یہی شمع بھی ہے طور بھی ہے
اللہ رے اس ٹوٹے ہوئے دل میں فدا　　جلوہ گہِ نار بھی ہے اور نور بھی ہے

دو آئیں حیاتِ جاودانی کی طرح　　دل میں ہے تیری یاد نہ زندگانی کی طرح
باقی ہے ابھی آتش دوری کی جو فدا　　جلنے کا شوق ہے خصت ہوجانی کی طرح

اک دن یہیں عیشِ جاوداں دیکھیں گے　　ہر سمت سے جلوہ کناں دیکھیں گے
جب اٹھے گا نظروں سے دوئی کا پردہ　　ہم طور کو دل میں ضوفشاں دیکھیں گے

آپس میں ہے صلح اور صفائی اچھی　　مقصد ہے بہرحال جدائی اچھی
جس پہ ہے تجھے ناز وہ ہستی بیکار　　جس پر تو خجل ہے وہ برائی اچھی

ہوتا ہے بشر علم و ادب سے قابل　　بنتا ہے عمل کرنے سے انساں کامل
اس دہر میں کہتے ہیں شرافت جسکو　　ہوتی ہے بلندیٔ نظر سے حاصل

فضل الدین صاحب فدا ایھیم کرنوی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کی اصلاح

کفر کے عرفان سے تجدید ایماں چاہیئے　　بے نیازِ سلطنت ہونے کا ساماں چاہیئے
دولتِ قارون اب تختِ سلیماں چاہیئے　　ہم کو تیرا جلوہ گہِ محبوبِ یزداں چاہیئے
درحقیقت پیکرِ خاکی نہیں حق سے جدا　　ہاں مگر خود آشنا ادراکِ انساں چاہیئے
خاک کر کے زندہ کر برقِ تجلائے جمال　　کچھ نہ کچھ اس دہر میں کار نمایاں چاہیئے
پھر فروغِ حسن ہوجائے ضیا بار آپ کا　　دل کا ذرہ ذرہ رشکِ مہرِ تاباں چاہیئے
محشر بخششِ عصیاں تو ناممکن نہیں　　بات اتنی ہے کہ اپنا پشیماں چاہیئے
قصۂ منصور نے دنیا میں ثابت کر دیا　　بادۂ عرفاں بقدرِ ظرفِ انساں چاہیئے
بامِ عرفاں پر پہنچنا تو کوئی مشکل نہیں　　دل میں انساں کے مگر ذوقِ فراواں چاہیئے
ہو تجھے مسعود زاہد خلوتِ دیر و حرم　　اپنی نظروں میں تجلی گاہِ جاناں چاہیئے

ذرہ ذرہ دہر کا آئینہ خانہ ہے فدا
دیکھنے کو جلوہ لیکن چشمِ عرفاں چاہیئے

فضا — مرزا اسلام اللہ صاحب الہ آبادی

آپ کا نام مرزا اسلام اللہ اور فضا تخلص ہے۔ وطن الہ آباد ہے۔ ایک مشہور اور شریف النسل خاندان کے فرد ہیں۔ اس وقت پچیس سال کی عمر ہے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی۔ علوم مشرقیہ سے بہرہ یاب ہونے کیلئے ۱۹۳۰ء میں منشی کا امتحان پاس کیا اور کامل کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ آپ کامل کا امتحان دے سکیں چنانچہ بعض مجبوریاں ایسی پیش آئیں کہ آپ امتحان میں شریک نہ ہوسکے گو امتحان میں آپ کو شریک نہ ہونے کا افسوس تو بہت ہوا لیکن پھر بھی آپ نے ذاتی استعداد بڑھانے کے لئے کتب و رسائل کا مطالعہ جاری رکھا اور یہ چیز اب آپ کی عادتِ ثانیہ بن کر رہ گئی ہے۔

شاعری کا شوق آپ کو ابتدا ہی سے ہے۔ جب آپ شاعر نہ تھے اس وقت بھی مقامی اور غیر مقامی مشاعروں میں بہت دلچسپی لیا کرتے تھے ۱۹۳۲ء میں محمد خلیق صاحب جو کانھیا واڑ کے باشندے تھے آپ کے چھوٹے بھائیوں کی درس و تدریس کے لئے مقرر کئے گئے چونکہ خلیق صاحب پردیسی تھے اس لئے فضا صاحب ہی کے مکان پر اقامت گزیں تھے۔ حسنِ اتفاق سے وہ شاعر بھی نکلے ان کی صحبت میں فضا صاحب کو شاعری کا شوق ہوا۔ کچھ دنوں خلیق صاحب نے آپ کی غزلوں پر اصلاح کی لیکن جب آپ خوب شعر کہنے لگے تو خلیق صاحب نے کسی صاحبِ فن کی طرف رجوع ہونے کی رائے دی۔

فضا صاحب سب سے پہلے اپنی غزل حضرت نوح ناروی کی خدمت میں لیکر حاضر ہوئے جو الہ آباد کے نواح میں بہت مشہور ہیں۔ بہت اصرار اور جد و کد کے بعد اصلاح کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

مئی ۱۹۳۵ء میں آپ نے چند رباعیاں مختلف عنوانات پر لکھیں جن میں کچھ موضوع "ہستی" پر بھی تھیں۔ حضرت نوح نے اصلاح دینے کے بعد حاشیہ پر حسب ذیل الفاظ لکھ دئے۔

"تم نے بھی بسمل پر ہاتھ صاف کیا یہ رباعیاں ان کی خوب ہیں اور یہ اُن کا منہ چڑھانا ہے"۔

اس تحریر سے فضا صاحب کے دل پر ایک زبردست ٹھیس لگی۔ کیونکہ اُن کا مقصد مقابلہ کرنا یا ان رباعیوں کا چربہ اتارنا نہ تھا۔ شاعری میں اس کی قید نہیں ہوتی کہ جس قافیہ ردیف میں ایک نے لکھا دوسرا نہ لکھے۔ اکثر طرحی مشاعروں میں اساتذہ کی غزلوں پر بھی غزلیں کہی جاتی ہیں۔ چونکہ بسمل صاحب حضرت نوح ناروی کے عزیز ترین شاگردوں میں ہیں اس لئے جناب موصوف کو یہ بات ناگوار گذری۔

اس واقعہ کے بعد سے فضا صاحب نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ شاعری ترک کردیں گے لیکن کہیں یہ جوش رکنے والا ہوتا ہے آخر جذبات سے مجبور ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد پھر شعر کہنے لگے۔ چونکہ ابھی آپ نے بہت کم استفادہ کیا تھا اس لئے بہر طور آپ کو استاد کامل کی ضرورت تھی۔ اس مرتبہ آپ نے مختلف اساتذہ کے پاس اپنا کلام برائے اصلاح بھیجا۔ دو بزرگوں کو چھوڑکر باقی تمام استادانِ وقت نے ہمت افزائی کے خطوط بھیجے اور ہر طرح آپ کی خامیوں کو دور کرنے کا وعدہ فرمایا ان تمام اصلاح شدہ غزلوں میں آپ کو حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کی اصلاح بہت پسند آئی اور ستمبر ۱۹۳۵ء کو آپ باقاعدہ اُن کے شاگرد ہوگئے۔ اس وقت سے اب تک یہ سلسلہ بالالتزام جاری ہے۔ آپ نظم بالکل نہیں کہتے

لیکن آپ کا یہ امر وزش کے مطالعہ سے نے آپ [illegible] کا کام کیا اور مشعل ہدایت ثابت ہوا۔ چنانچہ آپ نظمیں بھی [illegible] اس کے بعد ہی دیوان "کلیم عجم" بھی آپ نے منگالیا جس نے آپ کے جذبات میں بجلیاں کوٹ کر بھر دیں۔ اصلاح کے فیض اور مولانا کی تصانیف کے مطالعہ سے آپ کے رنگ شاعری میں بہت جلد اور نمایاں ترقی ہو گئی۔ اب آپ جو کچھ کہتے ہیں بہت خوب کہتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

یہ حسن کا اعجاز یہ جلووں کا اثر ہے — خود اپنی ہی صورت پہ فدا آئینہ گر ہے
وحشی تری سر پھوڑ کے مر جاتے ہیں کیونکر — صحرائے جنوں میں کوئی دیوار نہ در ہے
یہ بیخودی جلوہ ہے میں دیر میں جا کر — کہتا ہوں بتوں سے کہ یہ اللہ کا گھر ہے

قید ہستی توڑنے کو ہے کوئی وحشت زدہ — ہو رہی ہے اب جدا اک کڑی زنجیر کی
چلدئے دامن بچا کر گو مری تربت سے تم — بچ نہیں سکتے ہو پھر بھی خاک دامنگیر کی

بنائی دست قدرت نے عجب تصویر رعنائی — کسی کا حسن کہتا ہے مجھے دیکھا کرے کوئی
نظر میں ہے نشاط ہستی موہوم بے حاصل — تماشاگاہ عالم میں تمنا کیا کرے کوئی

جب آنکھ اٹھاتا ہوں کوئی پیش نظر ہے — تاثیر نظر ہے کہ تصور کا اثر ہے
اک منتظر دید کی یہ آس تو دیکھو — دم ہونٹوں پہ ہے آنکھ مگر جانب در ہے
وحشت کا یہ عالم ہے فضا دیر میں جا کر — میں پوچھ رہا ہوں کہ خدا خانہ کدھر ہے

کچھ قفس کے کام آئی بجلیاں کچھ لے گئیں — ہم نے چن رکھے تھے جو تنکے نشیمن کیلئے
وہ جفا بھی کر نہیں سکتے بہ انداز جفا — سادگی کتنی ضروری ہے لڑکپن کیلئے

کبھی بے پردہ اگر جلوۂ جاناں ہو جائے — نگہ شوق کی حیرت ہی نگہباں ہو جائے
اس سے کیا پوچھتا ہے حال چمن اے صیاد — [illegible] گل ہوتے ہی جو داخل زنداں ہو جائے
جب چبھے دل میں اسی کہتے ہیں پیکان نظر — [illegible] تیر جو پیوست رگ جاں ہو جائے

کافر بنائیے نہ مسلماں بنائیے — اب مصلحت یہی ہے کہ انساں بنائیے
دونوں طرح یہ اپنے لئے ہے بلائے جاں — بکھرائیے کہ زلف پریشاں بنائیے

کہا قاصد نے سب کچھ پھر بھی ناکامی ہوئی اس کو
زبان غیر سے ہوتی ادا کیا داستاں میری
الٰہی کیا ہوا انجام اس گم کردہ منزل کا
جسے یہ بھی نہ تھا معلوم منزل ہے کہاں میری

وہ سر بزم مری جان لئے لیتے ہیں — جو رہ سمجھوں کہ یہ انداز مسیحائی ہے
اللہ اللہ ستم ایجاد ترا عہد شباب — جو ادا آئی ہے پیغام قضا لائی ہے
واہ کیا ضد ہے کہ اپنی ہی کہے جاتے ہیں — آئینہ دیکھ کے بھی دعوئ یکتائی ہے

نہ تھی نگاہ کی ہمت اگر تو وقت سوال — کلیم تا حد امکاں ہی آرزو کرتے
وہ رعب حسن کا عالم ارے معاذ اللہ — رہا نہ ہوش کہ ہم ان سے گفتگو کرتے

نمونۂ نثر

عورتوں کی تعلیم

مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک ان کی عورتیں تعلیم حاصل نہ کرلیں کیونکہ بچہ کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے اور پرورش میں باپ سے زیادہ ماں کو دخل رہتا ہے فی زمانہ نوے فی صدی مائیں جاہل ہوتی ہیں اس لئے جہالت کیسا تھ ساتھ ان میں بزدلی اور

اوہام پرستی وغیرہ کا ہونا لازمی ہے اور بچے پر ابتدا ہی سے ماں کی عادتوں کا اثر پڑنے لگتا ہے جو باتیں اس وقت سیکھتا ہے پھر آخر وقت تک اس کے ذہن سے نہیں ہوتیں اس لئے وہ جوان ہونے پر بھی بزدول اور جاہل رہ جاتا ہے بلند خیالات اس کے دماغ میں نہیں آنے پاتے اور اس کی طبیعت ہمیشہ پستی کی طرف مائل رہتی ہے۔

اسلام نے مردوں اور عورتوں پر تحصیل علم کو فرض قرار دیا ہے لیکن علمائے سو تعلیم نسواں کے سخت مخالف ہیں اور وہ زیادہ تر اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ مرد بھی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکیں ہمارے یہ نام نہاد مولوی اسلام اور مسلمان دونوں کے سخت دشمن ہیں ان کو ہر قدم پر اس بات کا خوف ہے کہ اگر مسلمان صحیح معنوں میں اسلامی تعلیم سے واقف ہو گئے تو ہم کو مفت میں روزانہ قورمے پلاؤ کس کے یہاں کھانے کو ملیں گے نذر و نیاز کی بے تعداد رقم کہاں سے ہاتھ آئے گی اسی لئے وہ ہر اس بات کو جس میں اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کا فائدہ ہو قطعی حرام بتاتے ہیں اور ہر ایسے شخص کو جو کسی اچھی اور مفید تحریک کا بانی ہو کافر مرتد وغیرہ کہتے ہیں اور اس کو ہر طرح ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے خلاف عوام میں جذبۂ نفرت پھیلاتے رہتے ہیں مثال کے طور پر سر سید احمد خاں بانیٔ علی گڈھ کالج کو لیجیئے۔ جس وقت کہ آپ نے انگریزی تعلیم کے متعلق اپنے خیال کا اظہار فرمایا تو ہر چہار طرف سے علمائے سوء نے ان پر کفر کی مشین گن چلانی شروع کر دی۔ لیکن سر سید نے بھی نہایت مستقل مزاجی سے ان کفر ساز فوجوں کا مقابلہ کیا اور نہایت استقلال سے اپنے کام میں منہمک رہے آج آپ کو جو مسلمان تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں یہ سر سید احمد خاں کی کوششوں کا نتیجہ ہے ورنہ علمائے سوء نے اپنی طرف سے مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان جاہل اور دشمن اسلام مولویوں کو ہٹا دیا جائے اور عوام خود اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ اگر وہ اسکول میں تعلیم دلانا پسند نہیں کرتے تو خود اپنے گھروں میں سچی اسلامی تعلیم دیں جو کہ موجودہ توہمات سے پاک رہے تاکہ آئندہ آنیوالی نسلیں صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔ اور ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔

اگر آپ اسلامی تاریخوں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اسلام میں کیسی کیسی صاحبِ کمال ہستیاں گذر چکی ہیں جن پر اسلام کو آج تک فخر و ناز ہے۔ یہ وہ مسلمان عورتیں تھیں جنھوں نے علما کی طرح فتوے بھی دیئے اور جہاد میں ایک سپاہی کے فرائض بھی ادا کئے یہ وہ عورتیں تھیں جو کہ جہاد میں مردوں کے حوصلے بڑھاتی تھیں اور اگر مرد پیچھے ہٹنے کا قصد کرتے تو انھیں غیرت دلا کر آگے بڑھاتیں۔ وہ اگر ایک طرف زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں تو دوسری طرف شوہر اور بچوں کی بھی خدمت کرتی تھیں۔ انھیں کے فرزندوں نے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک اسلام کا ڈنکا بجایا وہ صرف خدائے واحد سے ڈرتے تھے اور اسلام کی سچی تعلیم پر عمل کرتے تھے جن کا مقصد انسانوں کو دوسروں کی غلامی سے آزاد کرنا ہے۔

مرزا اسلام اللہ بیگ صاحب فضاؔ کی غزل بہ طرز حضرت مولانا سیماب صاحب

مشاہدات
تصویرِ جہاں کا اک آئینہ ہوں میں
تمہارے جلوؤں کو ہر سمت دیکھتا ہوں میں

دیارِ دوست سے آگے نکل گیا ہوں میں
خبر نہیں ہے مجھے اب کسکو ڈھونڈتا ہوں میں

اب احتیاج نہیں مجھ کو خضرِ منزل کی
خود اپنی راہِ محبت کا رہنما ہوں میں

ہے کتنی مائلِ پرواز میری فکرِ رسا
ہزار بار فلک سے گذر چکا ہوں میں

الست کی جو صدا پائی رب ارنی کی
ہر اک نوا سے تری
گمان ہوتا ہے مجھ کو گوش آشنا ہوں میں

ہر ایک چیز نظر آتی ہے فریب نظر
اگر قریب سے دنیا کو دیکھتا ہوں میں

نہیں ہے بحرِ محبت میں خوف طغیانی
کہ خود اپنی کشتیٔ الفت کا ناخدا ہوں میں

عبدالستار خاں صاحب یوسف زئی

آپ کا نام عبدالستار خاں یوسف زئی اور فکری تخلص ہے۔ آپ کے اجداد کا وطن رام پور تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں بیاور نیا نگر میں سکونت اختیار کی جسے کرنل ڈکسن نے بسایا تھا۔ اس کے بعد آپ کے دادا صاحب مرحوم نے کچھ عرصہ ریاست جودھپور میں ملازمت کی لیکن مستعفی ہو کر بیاور ہی کو مستقل قیام گاہ بنالیا حتیٰ کہ یہیں وفات پائی آپ کے والدِ محترم اللہ بیلی خاں صاحب بیاور ہی میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت ہوئی اور ختم تعلیم کے بعد ۱۸۹۵ء میں بی بی۔ اینڈ سی۔ آئی۔ ریلوے میں ہیڈ ٹکٹ کلکٹری کا عہدہ مستقل طور پر مل گیا۔ جس کی وجہ سے مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہا۔ لیکن زیادہ عرصہ آبو روڈ میں گذرا جہاں ۵ار جولائی ۱۹۱۶ء کو فکری صاحب کی ولادت ہوئی۔ سن شعور کو پہونچنے کے بعد آپ آبو کے اے۔ وی۔ ہائی اسکول میں تعلیم پاتے رہے۔ ابھی آٹھویں جماعت کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے کہ آپ کے والد بزرگوار ۱۹۳۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اس لئے آپ کو بیاور آنا پڑا چونکہ اب یہی وطن ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں بیاور میں مشن ہائی اسکول۔ قریباً ٹوٹ چکا تھا جسے مولوی معین الدین صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ سب جج بہاولپور نے (جو اس زمانے میں یہاں وکالت کرتے تھے) عیسائیوں سے لیکر از سر نو زندہ کیا اور شہید ملت بطل حریت حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہ کی یادگار میں انہیں کے اسم گرامی کیساتھ منسوب کر کے محمد علی میموریل۔ ہائی اسکول بیاور قائم کیا۔ اسلامی اسکول ہونے کی وجہ سے آپ کو بھی اسی میں داخل کرایا گیا جہاں سے آپ نے ۱۹۳۴ء میں دوسرے ڈویژن میں میٹرک (عمدہ عمدہ) کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ دورانِ تعلیم میں آپ نے مختلف انعامات حاصل کئے۔ بیاور میں نویں اور دسویں جماعت میں انجمن خیابانِ اردو قائم کردہ مولانا نورالدین صاحب انور بھوپالی کا طلباء کی جانب سے آپ ہی کو سکریٹری بنایا گیا اور انگریزی میں بھی سکریٹری کا عہدہ آپ ہی کو دیا گیا۔ ایک سوشل کمیٹی کے بھی آپ ہی سکریٹری تھے جس کا کام آپ نے نہایت مستعدی و دیانت داری سے انجام دیا۔ اور اس کے معاوضہ میں آپ کو اسکول کی طرف سے ایک سند بھی عطا ہوئی آپ کو شاعری کا ذوق بچپن سے تھا چونکہ اب تک ایسا کوئی استاد نہیں ملا تھا جس سے اصلاح لیتے اس وجہ سے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے آپ کو ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ جب بیاور آئے تو یہاں مشاعرے اور مناظمے ہوتے دیکھے اور شعر و شاعری کا بھی کافی شوق لوگوں میں پایا۔ خصوصاً مولانا انور صاحب سیمابی بھوپالی اور ان کی قائم کردہ انجمن خیابانِ اردو کی سرگرمیاں بڑے زوروں پر تھیں لہذا شاعری کا ذوق پھر تازہ ہو گیا اور اب آپ کو ایسے استاد کی تلاش تھی جس سے اصلاح لی جائے۔ مولانا انور صاحب بھوپالی جو آپ کے ہیڈ مولوی تھے اس فن میں ماہر تھے اس لئے آپ نے اپنی غزلیں ان کے سامنے بغرض اصلاح پیش کیں۔ چنانچہ انور صاحب نے آپ کی غزلیات دیکھ کر آپ کی ہمت افزائی فرمائی اور آپ انہیں سے اصلاح لینے لگے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے لیکن چند امور ایسے حائل ہوئے جن کی بنا پر کالج کو بھی خیرباد کہنا پڑا اسی دوران میں آپ نے مولانا انور صاحب سے علم عروض و دیگر فارسی کی کتابیں بھی پڑھیں اور اپنی ذہنی تربیت کی۔ فارسی کی تکمیل کے بعد

عربی بھی آپ صاحبِ خبر ہی سے پڑھی۔

چونکہ آپ کا شعری مذاق بہت بلند ہو چکا تھا اور آپ کے اشعار اس قابل ہو گئے تھے کہ ان میں ذرا سی تبدیلی سے جان پڑ جاسکے اس لئے کسی کامل الفن کی ضرورت ہوئی چنانچہ آپ مولانا آثم صاحب بھوپالی کی ترغیب و توسل سے جو خود حضرت مولانا سیماب صاحب مدظلہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، مولانا کی طرف رجوع ہوئے اور یکم ستمبر ۱۹۳۶ء کو باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔

فکری صاحب کے کلام میں ندرت، موسیقی اور روانی صد درجہ پائی جاتی ہے۔ وہ زمانہ قریب آنے والا ہے کہ آپ ملک میں نام پیدا کریں گے۔

نمونۂ تغزل

جانِ فکری یہ کیا کیا تو نے — مجھ کو دل سے بھلا دیا تو نے
جب سے جلوہ دکھا دیا تو نے — مجھے بے خود بنا دیا تو نے
نگہ لطف کے تبسم سے — مجھ کو جینا سکھا دیا تو نے
اپنی کافر حسین آنکھوں کو — دل کو اب دل بنا دیا تو نے
مجھ سے کافر کو کافر آنکھوں سے — پھر مسلماں بنا دیا تو نے
میری غم خانۂ تصور کو — آج پھر جگمگا دیا تو نے
میں وہی خانہ زادِ الفت ہوں — مجھے اتنا بھلا دیا تو نے
ایک نظارۂ سوز جلوے سے — سر سے پا تک جلا دیا تو نے
دل ابھی ہوش میں نہ آیا تھا — پھر تڑپنا سکھا دیا تو نے
یہ بھی کچھ ناز تھا کوئی آخر — مسکرا کر مٹا دیا تو نے
طیش میں جو نکل گیا منہ سے — وہی کر کے دکھا دیا تو نے

آنکھوں آنکھوں میں آج اے فکری
حالِ دل سب بتا دیا تو نے

سنا مغنیٔ کوئی حسین رنگ ناز سے — بکھر رہی تھی جو بجلیاں نوائے دلگداز سے
تھا پھیلا جو رقص میں تھا منتظر نہ وجد میں — یہ حال تھا تری کشاکشِ خرامِ ناز سے
خراب وہ رنگ در نوا نہ وہ سماں تھا وہ فضا — فسردگی سی چھا گئی تری سکوتِ ساز سے
ادھر خجستہ طلیاں کہ زندگی وبال ہے — ادھر وہ فتنہ خیزیاں تری خرامِ ناز سے
مری حسین کافرہ! تجھے بھی اس کا علم ہے — کہ اک غریب مر مٹا تری خرامِ ناز سے

نہ چھیڑنا اسکو ناصحا! کہ فکری نیم باز کا
نہیں ہے ان سے رابطہ ضبط عرض و نیاز سے

عیش کر لو ابھی جوانی ہے — چار دن کی یہ زندگانی ہے
ہم سے ایسی ہوئی تھی کیا تقصیر — کیوں یہ اس درجہ سرگرانی ہے
نہ ستا مجھ کو رحم کر ظالم! — جانتا ہوں تری جوانی ہے
سن لے اور مسکرائے جا — دلِ مجروح کی کہانی ہے
خلشِ درد دل میں باقی ہے — اب یہی اک تری نشانی ہے
ناامیدی کا دور ختم ہوا — اب فقط عیشِ جاودانی ہے
جیسے لبریز کوئی ساغر ہو — چشم بد دور کیا جوانی ہے
مجھ کو دیکھا تو پھیر لیں نظریں — یہ بھی اک طرزِ مہربانی ہے
اسے اب سن کے کیا کرو گے تم — یہ مری دکھ بھری کہانی ہے

میں کہاں قابلِ کرم فکری
یہ فقط اُن کی مہربانی ہے

عشق جب بے نقاب ہوتا ہے — آپ اپنا جواب ہوتا ہے
ذکر پہ میرے ہو گئے خاموش — یوں بھی ان کا عتاب ہوتا ہے
دل محبت میں دل نہیں ہوتا — ماہتاب آفتاب ہوتا ہے
ہم ادھر رات بھر تڑپتے ہیں — حسن اُدھر محوِ خواب ہوتا ہے
جس کو دل بھی سمجھ نہیں سکتا — کبھی وہ اضطراب ہوتا ہے
حسن کا اضطراب ارے توبہ — عشق جب کامیاب ہوتا ہے
خیر کیسا تھا آج فکری بھی — بزم میں باریاب ہوتا ہے

میر احمد صدیق شاہ صاحب قاتل لکھنوی

تلاشِ دوست کا انجام جانتا ہوں میں — ابھی سے ذوقِ تجسس میں کھو چکا ہوں میں
اب اپنے آپ کو ہر شے میں دیکھتا ہوں میں — تعینات کے پردے اٹھا چکا ہوں میں
شباب حسن، وہ جانِ شباب کیا اللہ — بس اک نگاہ سراپا بنا ہوا ہوں میں
تمام روح کھنچ آئی ہے دونوں آنکھوں میں — یہ کون سامنے ہے کس کو دیکھتا ہوں میں
میں اپنی کیف کے صدقے کہ اپنی کیف میں بھی — کسی کی کیف جوانی کو پا رہا ہوں میں
سراغِ عمرِ ابد کا تو خیر ذکر ہی کیا — سرابِ دہر میں تصویرِ نقش پا ہوں میں
حیاتِ عشق کی ناکام چند لمحوں کو — تمام عمر کا حاصل سمجھ رہا ہوں میں
تو اے مجھ کو جلانے چلی ہے اے تپِ غم — تجھے خبر بھی ہے پروردۂ فنا ہوں میں

اب آج دردِ محبت کو روؤں کیا فکری
ازل سے قہرِ محبت میں مبتلا ہوں میں

نمونۂ نثر

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ موسمِ سرما کی غیر شاعرانہ کیفیات ختم ہو جانے کے بعد ہلکی ہلکی سردی اور گرمی کی امتزاجی کیفیت کے توازنِ صحیح سے جو موسم رونما ہوتا ہے اسے "بسنت" کہتے ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ کافر موسم اپنے اندر کتنے جذبات۔ کس قدر احساسات اور کس درجہ کیفیات پنہاں رکھتا ہے۔ گلاب کی ایک پنکھڑی سے دوسری پنکھڑی پر جس قسم کا سایہ ہوتا ہے غالباً آپ نے دیکھا ہوگا۔ بس بالکل اسی قسم کا ایک ہلکا سا سایۂ ابر شفقِ شام پر چھایا ہوا تھا اور میں حسبِ معمول تالاب کے ساحل پر پانی میں پاؤں لٹکائے ہوئے ایک چٹان پر بیٹھا ہوا اپنے پہلو میں ایک ہمیشہ بے چین رہنے والے شعلۂ مالیدہ کو اسی موسم کی آتشِ سیال سے ملتہب کرنے میں مستغرق تھا ہلکی ہلکی خنک ہوا سطحِ آب پر موجوں کی زنجیر دل کا کمزور و نازک جھلل بنا بنا کر بگاڑ رہی تھی۔ میری روح پر ایک عجیب نوع کا غیر معلوم احساس مستولی تھا جس کی تعبیر میں غالباً خوشی اور رنج اور رنج و خوشی کا اختلاط پنہاں تھا۔ نہیں معلوم ایک خشیار رنگ سادھو میرے قریب ہی برگد کے درخت کے نیچے کب سے اسی فضا کی آلودہ کیفیات کو اپنے اندر جذب کرنے میں منہمک تھا اور غالباً مجھے اس کا احساس بھی نہ ہوتا اگر وہ اپنے ستار کے نہایت شیریں مگر موجوں کی طرح نرم نغمات سے میری توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرتا۔ مجھے بالکل احساس نہیں ہوا کہ میں کس وقت اپنی جگہ چھوڑ کر سادھو کے پاس جا بیٹھا اور غالباً میں یہ بھی نہ بتا سکوں گا کہ ناگنوں کی طرح بل کھانے والی بجلیوں کی طرح لہرانے والی اور موجوں کی طرح کروٹیں بدلنے والی اس کی لچیلی آواز میں اور ساز کی آواز میں کوئی امتیاز تھا لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس کی ہر تان میرے دل و جگر کے ساتھ وہی سلوک کرتی تھی جو بجلیاں خرمن کے ساتھ کیا کرتی ہیں۔ آہ ....! وہ اس کی آواز کا زیر و بم ......! ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میری روح تحلیل ہو کر اسی بحرِ نغمات میں بہہ جائیگی۔

جناب عبدالستار خاں صاحب فکری کی نظم پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

"کسی کی یاد"

وہ کسی کا دل چرانا یاد ہے — دل چرا کر بھول جانا یاد ہے
(اُف وہ تیرا) دیکھتے ہی سر جھکانا یاد ہے — سر جھکا کر مسکرانا یاد ہے
التجائے وصل پر (اک) کس ناز سے — ان کا وہ تیوری چڑھانا یاد ہے
مجھ کو رد تی دیکھ کر (ہم کو صبحِ وصال) — جاتی جاتی ٹھہر جانا یاد ہے
(کنج گل میں خندہ بر لب ...) — کنج گل میں (چھپتے چھپتے) چھپ جانا یاد ہے
ابتدائے عشق (وتمہید جنون) — وہ کسی سے دل لگانا یاد ہے
ان نشیلی انکھڑیوں کی یاد میں — بیخودی سی چھائے جانا یاد ہے

اب کہاں فکری وہ رنگیں صحبتیں
چپکے چپکے روئے جانا یاد ہے

قائل — سید شاہ محمد احمد صدیق لکھنوی — ۷۲

آپ کا لقب میر۔ اسم گرامی محمد احمد صدیق۔ کنیت ابوالقاسم۔ خطاب سیف الکلام۔ اور تخلص قائل ہے۔ نسب سید ہے۔ سلسلۂ حسب حضرت غوث الثقلین سیدنا محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مشرب چشتیہ۔ نسبت ابوالعلائیہ۔ جہانگیریہ۔ بیعت شکوریہ ہے۔ تاریخ پیدائش ۱۲ر جنوری ۱۹۰۹ء روز پنجشنبہ اور عمر موجودہ اڑتالیس سال ہے۔ آپ عربی کے عالم اور فارسی کے فاضل اور انگریزی کے ماہر ہیں۔ قدرت نے آپ کو خلق کثیر سے خلق فرمایا ہے۔ ہر شخص آپ سے مل کر ایک بار آپ کے اخلاق کریمانہ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے روئے انور پر ہر وقت فراست و محبت کی ہلکی پھوار برسا کرتی ہے۔ اور آپ کا معدل ضمیر چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا نظر آتا ہے نگاہوں کی جاذبیت نے خاص دلکشی پیدا کی ہے۔ طبیعت کچھ ایسی شگفتہ اور انداز بیان اتنا دلچسپ اور نرالا ہے کہ مخاطب کو آپ کی باتوں سے خاص حظ حاصل ہوتا ہے۔ غرض آپ بہ ہمہ صفت موصوف ہیں۔ شاعری کا ذوق سلیم بھی تعلیم کے ہم آغوش رہا اکثر مشاعروں میں شرکت بغیر غزل ہوئی۔ آخر یہ شوق رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ آپ کے ذوقِ عمل کا یہ حال تھا کہ مشقِ سخن میں چار پانچسو شعر تک لکھے اور تلف کر دیئے۔ سابرمتی اور احمد آباد کے مشاعروں میں بھی شرکت کی جہاں حضرت بہار ابوالاعجاز حضرت اعجاز بھڑوچی اور حضرت سہیل سورتی اور حضرت نوح ناروی وغیرہ اساتذہ کے ہم مشاعرہ رہے۔ اب قیام کی صورت اجمیر شریف میں ہوئی۔ یہاں بھی معرکۃ الآرا مشاعرے پڑھے۔ رئیس العارفین تاج السالکین امیر الصابرین سید الشاکرین قطب الاولیاء مولانا شاہ حضرت محمد عبدالشکور ادام اللہ اجلالہ علی روس الطالبین نے آپ کا ذوق و شوق دیکھ کر آپ کو حکم دیا کہ تم حضرت مولانا سیماب صاحب اکبرآبادی مدظلہ، کے شاگرد ہو جاؤ۔ تعمیلِ حکم میں دریں میخانہ سیمابی کھٹکھٹایا یہاں سیمابی مے نے نشہ دوبالا کر دیا۔ واجب الذکر ہے کہ پہلے آپ صنم تخلص فرماتے تھے۔ شعرائے اجمیر نے اس پر بڑی لے دے کی تو مجبوراً سیر مشاعرہ بیٹرہ بدلا۔ تخلص قائل رکھا۔ اور فی البدیہہ یہ رباعی کہی ؎

میں جانِ سخن ہوں شاعری کا دل ہوں	ہوں زینتِ بزم رونقِ محفل ہوں
حسّاد ذرا آج سنبھل کر بیٹھیں	میں پہلے صنم تھا اور اب قائل ہوں

آپ کے کلام نے روز بروز قبولیت حاصل کی۔ رفتہ رفتہ قال سے حال پر آئے تو لکھتے ہیں ؎

الّا کے مقامات سے گذرا تو یہ دیکھا	ہیں معتکف پردۂ لا احمدِ مختار

کبھی پردہ کو آپ یوں لکھا کرتے تھے ؎

چراغوں کو بجھا آئے کبھی پردوں کو ڈال آئے
شبِ وعدہ خدا جانے انھیں کیا کیا خیال آئے

مضمون کی بندش۔ بیان کی چستی۔ اور کلام کی فصاحت پختہ اور شگفتہ ہو چکی تھی۔ جس نے یہ اثر دکھایا کہ آپ سیف الکلام کہلائے۔ چنانچہ خود ان کے استاد مولانا سیماب صاحب مدظلہ نے ان کی ایک نظم پر یہ حاشیہ دیا تھا ؎

لوگ سچ کہتے ہیں اے قائل تجھے سیف الکلام	ہے خدا رکھے ترا ہر شعر تیغِ آبدار
لا میں تیری نظم پڑھ کر یہ سیفی پھونک دوں	لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیفَ اِلَّا ذُوالفِقار

طبیعت کی جولانی اور تخیل کی بلندی پر تخلص و خطاب کا اثر لازمی تھا۔ کارزارِ سخن میں وہ ہاتھ دکھائے کہ دیکھنے والے صداقت کو مان گئی

اب بھی روانیٔ طبع کا یہ عالم ہے کہ جب لکھنے بیٹھتے ہیں جذبات کے دریا بہا دیتے ہیں۔ جب تک آپ نے کوچۂ فقر میں قدم نہ رکھا تھا طبیعت نہایت شوخ اور تغزل نہایت بے باک تھا۔ لیکن اب سلسلۂ عالیہ، قادریہ، ابو العلائیہ جہانگیریہ شکوریہ سے وابستہ ہونے کے بعد مجاز حقیقت سے بدل گیا ہے۔

شیخ سلسلۂ عالیہ ادام اللہ اجلالہٗ علی رؤس العالمین آپ کو خرقۂ خلافت اور بیعت کی اجازت سے ممتاز و سرافراز فرما چکے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کو عالم کیف میں آپ اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

بیعت کی اجازت جو بہ توقیر ملی قاتل مجھے خلعتِ جہانگیر ملی
اب آئی سمجھ میں وجہِ خلقِ آدم "فی الارض خلیفہ" کی یہ تفسیر ملی

آج صرف آپ کے حلقہ بگوشوں اور مریدوں کی تعداد پچیس ۲۵ ہزار کے قریب ہے، اور آپ کے نام لیوا مریدین تمام اطرافِ ہند کے علاوہ جاپان۔ لندن۔ افریقہ۔ مکہ معظمہ۔ مدینہ طیبہ۔ بغداد شریف وغیرہ ممالک غیر میں بھی موجود ہیں۔ گذشتہ سال آپ کے ایک مرید سید محمد ہارون صاحب آئی، سی، ایس کا امتحان دینے لندن گئے ہیں۔ مریدین کے علاوہ بھی ہر مذہب و ملت کے اشخاص ہزاروں کی تعداد میں آپ کے معتقد ہیں۔ اگر آپ کارزارِ سخن میں "سیف الکلام" ہیں تو دنیائے علم و اخلاق میں مرجعِ ہر خاص و عام۔

نمونۂ تغزل

مدتوں سے کچھ تلون پر ہیں شیوے نور کے کچھ تجھے معلوم ہے ای جانیوالے طور کے
ہم بھی کشتہ ہیں کسی کے جلوہ مستور کے حشر کے دن قبر سے نکلیں گے بیٹھ طور کے
یہ شکستہ پیالیاں یہ سخت رستے طور کے کیا کریں سرکار بس میں ہیں دلِ رنجور کے
پھوٹ نکلے زخم سینے سے دلِ رنجور کے اک نظر پڑتے ہی گھر ہو گئے ناسور کے
سیکڑوں ہوسی کھڑی ہیں تشنہ برقِ جمال پھر کسی دن آ کے چمکا دے اندھیرے طور کے
جان مجھ میں کیوں نہ آ جائے نکیریں جاگ تو ہائے یہ صبحِ قیامت اور یہ نغمے صور کے
گردِ صحرا کا نہ ہو کیوں پاس غربت میں مجھے کچھ پتے ملتے ہیں اس سے کاروانِ دور کے
آئے تو میدان میں دار و رسن لیکر کوئی ہیں ابھی باقی مقلد سنتِ منصور کے
برقِ پروازی مری سوز دروں کی دیکھئے آبلے چھلکے تو پھاہے اڑ گئے کافور کے
ناخنِ دستِ جنوں میں تو بس درکار ہیں آج کرنے ہیں مجھے ٹکڑے شبِ دیجور کے
ہوش میں لغزش نہ آئے اہلِ محشر ہوشیار مست آتی ہیں کسی کی نرگسِ مخمور کے
دیکھ کر رازِ دنیاز حسن و الفت جل گیا ہم اگر ہوتے اڑا دیتے پرخچے طور کے
اب کہاں وہ آرزوئیں اب کہاں وہ ولولے آجکل خالی سے ہیں گوشے دلِ رنجور کے
تلا ہے اعظا گر آئی نہ یہ کالی گھٹا کھولدوں گا چشمہ کوثر پہ گیسو حور کے

نالہ و فریاد و شیون نوحہ و آہ و بکا
کارنامے ہیں یہ سب قاتل دلِ رنجور کے

تجلی ایک سی ہے ایک سے ہیں ٹھاٹھ تیور کے کھڑے ہیں ایک آئینہ میں دو قاتل برابر کے
یہ چمن سے پھول سب لیجائے گلچیں جھولیاں بھر کر کہیں ذہن لئے کانٹے جو تھے میرے مقدر کے
حرم ہو دیر یا ہوں راستے مسدود مندر کے ہمیں کیا فکر ہے ہم تو پجاری ہیں تیرے در کے
دکھا دی کیا بتوں نے برہمن کو صورتِ باطن یہ بتخانے میں کیسی شور ہیں اللہ اکبر کے
سنبھل اے بیخودی اب قبر سے اٹھنے کا سامان کر کہ رہ رہ کر بلاوے آ رہے ہیں صورِ محشر کے
بڑا بارِ گراں تھا نامۂ حسرت نشاں میرا ذرا سی دیر میں شل ہو گئے بازو کبوتر کے
سرِ محشر تری تیغِ ادا سے چوٹ کھیلیگا مبارک ہو تجھے قاتل کہ قاتل جی اٹھا مر کے

مل جائیں کاش ٹکڑے کچھ دامنِ جنوں کے کوتاہ دستیوں کو ہے آستیں کی حسرت
ہے ان کا آستاں بھی دلکش اک آستانہ سر میں اسی کا سودا لیکن ہے جبیں کی حسرت
بسمل بنا رہی ہیں سفاک اُن کی آنکھیں قاتل نکل رہی ہے جانِ حزیں کی حسرت

رُباعی

معتادِ گوشہ نشیں تھا میں جہاں میں ہر چند تا مجھے جلوتِ ہنگامہ سے پہنچے نہ گزند
لیلیٰ بزم کی ایما سے مگر اے قاتل "قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند"

قدسی — مولوی عبید اللہ صاحب ایچ پی ایچ ای ٹونکی (۷۳)

آپ کا نام عبید اللہ اور قدسی تخلص ہے۔ ۱۹۰۸ء میں بمقام ریاست ٹونک پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا مفتی عبد اللہ صاحب مقبل ایک عالم متبحر اور جلیل القدر بزرگ تھے۔ آبا و اجداد کا بھی مشاہیر علماء کی صف میں شمار ہوتا تھا۔ ٹونک کے اکثر بڑے خاندان نسلاً بعد نسلاً آپ کے آبا و اجداد کے شاگرد چلے آتے ہیں۔ قضا اور افتا تین پشتوں سے لا نسلہٗ قسمت ہوگئی ہے۔

آپ ابو العرفان مولوی حبیب اللہ صاحب نقشائی ٹونکی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ابتدائی تعلیم اور فارسی اپنے والد صاحب قبلہ سے حاصل کی۔ اور ان کی وفات کے بعد بھوپال میں اپنے بڑے بھائی کے پاس رہ کر عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ خانگی طور پر درسِ نظامیہ کی تکمیل کی اور عمر کے سولھویں، سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں سال میں علی الترتیب۔ مولوی۔ عالم اور فاضلِ ادب کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے اور فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔

۱۹۳۰ء سے سناتن دھرم ہائی اسکول بیاور (راجپوتانہ) میں مدرسِ فارسی رہے اور انٹر کالج ہو جانے پر ۱۹۳۲ء سے فارسی لکچرار ہیں۔

علومِ مشرقیہ کی تعلیم اور بھی انتہائی ارتقائی حیثیت سے حاصل کرنے کے بعد ایک نیر شاعر میں بھی شعری ذوق پیدا کرنے کی موجب ہوئی ہے یہ جانیکہ قدسی صاحب کے والدِ محترم اور برادرِ بزرگوار نقشائی صاحب شاعر اور ایک اچھے شاعر مانے جاتے ہیں۔ گویا آپ پیدائشی شاعر ہیں جب آپ نے دسویں سال میں قدم رکھا تو روحِ شاعری آپ میں گرمیاں پیدا کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ آخر کار آتش فشاں کی طرح یہ مادہ پھوٹ نکلا اور آپ اس وادی رنگ و بو میں تخیل کی عطر بیزی کرنے لگے۔ ابتدائی کلام سید ظہیر حسن صاحب ظہیری دہلوی مقیم بھوپال کو دکھایا جب نقشائی صاحب نے آپ میں وہ تمام خوبیاں دیکھ لیں جو ایک حقیقی شاعر میں ہوتی ہیں تو کچھ عرصہ خود اصلاح دی اور بعد ازاں حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کے دامنِ فیض سے وابستہ کر دیا۔

آپ نے ۱۹۲۸ء میں بھوپال کے علماء اور شعراء کی آویزش کے سلسلے میں ایک تنقیدی رسالہ "کحل البصیرت" لکھا۔ ۱۹۳۲ء میں ۶ ماہ تک ہفتہ وار اخبار "ریاست" دہلی میں مضامین لکھے۔ احباب کے اصرار سے اور تفننِ طبع کے لئے ہندوستان کے متعدد رسائل میں مضامین بھیجے گو نام و نمود سے ہمیشہ آپ بچتے رہے ہیں لیکن پھر بھی مجبور کرنیوالوں نے آپ کو مجبور کر ہی دیا۔ ۱۹۳۳ء میں "روح الاسلام" کتاب لکھی جو مختلف اسلامیہ ہائی اسکولوں میں نصاب "دینیات" میں داخل ہے۔ آج کل آپ ایک ٹھوس اور جامع کتاب "روح کا تخیل مشرق میں" تصنیف فرما رہے ہیں۔ اس تصنیف کا پروگرام سات سال کا ہے۔ یہ کتاب واقعی آپ کی زندگی کا کارنامہ ہوگی۔ اس کے علاوہ "محاکمہ بر موازنۂ انیس و دبیر" بھی تقریباً نصف لکھ چکے ہیں۔ اور یہ کتاب بھی بہت جلد شائع ہونیوالی ہے۔

قدسی صاحب میں اپنے خاندان اور اسلاف کی تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ بہت سے طلبا کی ذہنی تربیت آپ کے دم سے ہو رہی ہے۔ شاعری آپ کا مشغلہ عزیز ہے لیکن وقت کم ملنے

کی وجہ سے فکر [illegible] کرتے ہیں - آپ کو نثر میں بھی وہی مہارت حاصل ہے جو نظم میں [illegible]

نمونۂ تغزل

[illegible]ت وحیات وبیخودی سب ہی ملیں الگ الگ
سارے جہاں کی لذتیں ایک شب دراز میں

[illegible]وج نسیم سے جو لرزتی ہو شمع صبح   تصویر ہے وہی تو مری اضطراب کی
[illegible]نوش ودست صحبت احباب، شرب مے   ہاں نغمہ گر، یہ رات ہے عہدِ شباب کی

عمر میں گزری ہیں ایسے وقت بھی   ہم محبت کرتے کرتے رہ گئے

کسی کا جلوۂ رنگیں جو دیکھ لی زاہد   تمام حسنِ حقیقت لبِ مجاز ہے

سازِ الفت چھیڑ کر ہم دل کو بہلایا کئے   شوخیاں پہلو بدل کر درد پنہاں ہو گئیں
بس یہی ہے مختصر افسانۂ شامِ بہار   چند کافر بدلیاں اٹھیں پریشاں ہو گئیں

روحِ فردوس ہے اب چمن کی ہر موجِ نگاہ
دل کا ہر ذرہ ہے خورشید بداماں مجھ سے
ہر نظر میں تری پنہاں غمِ ہستی کا علاج
ہر نفس آتشِ خاموش بداماں مجھ سے

نگہ کو اپنی یونہی جلوہ بار رہنے دے   ہزار میکدے تجھ پر نثار رہنے دے
کسی کو دامنِ رنگیں کی لہر کیا کہنا   شفق کا سایہ سرِ جوئبار رہنے دے
وہ ایک شعلۂ رقصاں وہ ایک برق قرار   سکوتِ صبح میں وہ لالہ زار رہنے دے
چمن چمن ہے حقیقت میں پھر غبارِ انجام   شفق کی بھیس میں رنگیں غبار رہنے دے

ایک مثنوی بارگاہ خداوندی [illegible] عبودیت جس کا عنوان "تعارف" ہے ملاحظہ [illegible]

مآلِ قسمتِ گلشن ہو باغباں کیلئے   سیاہ بختیِ بلبل کو باغباں ہو تم
دہانِ کام ودہن ہو لب وزباں بنکر   محلِ نازشِ انسان کے امتحاں ہو تم
تمام حکمت وعظمت کا ہو جمال وجلال   جہانِ علم وسیاست کی پاسباں ہو تم
شرابِ عشق ومحبت محیطِ علم وعمل   نظام میکدہ، قانونِ آسماں ہو تم

نمونہ فارسی وعربی کلام

بر شمعِ روئے یار چو پروانہ سوختیم   مستانہ آمدیم وخموشانہ سوختیم
روغن ز دل گرفتہ ہمہ شب چراغ چشم   در ظلمتِ فراق بغمخانہ سوختیم
قدسی ز آتشے کہ بہ بھوپال دل گرفت   اجمیر آمدہ ہمہ کاشانہ سوختیم

ما و تو گشتہ ایم لالہ و گل   ہمنشیں حالیا نمی دانی
قدری آساز محنت عالم   ہیچ ارزد نہ عالمِ فانی
بازہ آمد خیالِ قدسیِ زار   جہد خفتن مکن کہ نتوانی

لما رکبت عنی فی الیسر کالنعامہ   انی رایت لیلا فی خلفہا قیامہ
برحسن ما بتابت نازم چرا نہ نازم   لما قدمت بیتی جلت عن الغمامہ
ایں دل شکستہ قدسی امیدوارِ لطف است   انظر الی یوماً یا صاحب الکرامہ

من و شمع محفلِ تو بہ ہمیں خیال سوزیم   بطلوعِ اول شب تو آفتاب مانی

قمر — حکیم مولوی بدیع الزماں صاحب سہسرامی — ۴۲

بدیع الزمان نام۔ قمرؔ تخلص۔ والد محترم کا نام نامی لعل زمان صاحب مرحوم ہے۔ ۱۹۱۳ء میں بمقام سہسرام ضلع شاہ آباد پیدا ہوئے۔ آپکے والد صاحب کا شمار سہسرام کے اچھے طبیبوں اور عالموں میں ہوتا تھا آپ معقولات میں بہت کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ عربی اور اُردو کی کتابیں آپنے تصنیف فرمائیں جس میں سے کچھ تو ضائع ہوگئیں جو موجود ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔

ترجمہ مختصر المعانی۔ اصولِ منطق۔ تاریخ الاقوام۔ وغیرہ سماع بالمزامیر طبع ہوچکی ہے۔

قمر صاحب کی ابتدائی تعلیم بہت انتظام سے ہوئی چونکہ آپ ایسے خاندان کے نونہال تھے جو علم وفن کا مخزن تھا اور ہے اس لئے عربی اور فارسی کی تکمیل مدرسۂ "خیریہ" سہسرام میں کی۔ سکندر نامہ بہار دانش۔ بہار عجم پنج رقعہ۔ اور عربی مشکوٰۃ شریف ملّا جلال شمس بازغہ وغیرہ کتب آپنے اسی مدرسہ میں ختم کیں۔ والد صاحب کے انتقال سے کچھ عرصہ بعد آپ کو وطن چھوڑنا پڑا چنانچہ ۱۹۳۳ء میں آپ مدرسۂ سبحانیہ الہ آباد چلے آئے اس وقت وہاں مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب بادشاہ پوری معلم تھے آپ اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء تک آپ نے تکمیل درس کرلی۔ چونکہ آپ کی خاندانی سنت طبابت ہے اور آپکے والد المحترم کے بعد آپکے برادر مکرم مولوی حکیم سیع الزمان صاحب حاذق سہسرام میں کامیابی کے ساتھ والد صاحب مرحوم کی جگہ مطب کر رہے ہیں اسلئے آپ کو بھی طب پڑھنے کی رائے دی گئی اور آپ طبیہ کالج الہ آباد میں داخل ہوگئے۔ پہلے سال امتحان دینے کے بعد وہاں کے ماحول اور طریقۂ تعلیم سے بدظن ہوکر آپ نے کالج چھوڑ دیا۔ اور تکمیل فن کی غرض سے مولانا حکیم فخرالدین صاحب جعفری زینبی بانی مدرسۂ صلاح العلما کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور طب پڑھنا شروع کردی۔ یہ سلسلہ ابتک جاری ہے۔ حکیم فخرالدین صاحب مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی کے قابل شاگرد اور مریدوں میں ہیں۔ الہ آباد میں اس وقت آپکا دم غنیمت ہے۔ امیر وغریب کسی سے آپ ایک پیسہ نہیں لیتے۔ مگر انتہائی جانفشانی سے علاج کرتے ہیں۔ امید ہے کہ قمر صاحب آپکی تربیت اور تعلیم سے آپ کے جانشین ثابت ہوں گے۔

ماحول۔ صحبت اور مطالعہ نے قمر صاحب کے شعری رجحانات کو بچپن ہی سے ابھار رکھا تھا۔ جہاں کہیں مشاعرہ ہوتا آپ ضرور سننے جاتے۔ آپ کے ایک دوست اور ہم جماعت مولوی شاہد حسین صاحب سوزؔ ناروی نائب مہتمم مدرسہ سبحانیہ الہ آباد جب غزل کہتے تو آپ کو ضرور سناتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جو شعر قمر صاحب پسند کرتے اُس پر مشاعرہ میں خوب داد ملتی۔ گویا "شعری معیار" آپ کی نگاہ و دماغ میں پیدا ہوچکا تھا۔ سوزؔ صاحب آپ کو شعر کہنے کے لئے اکثر مجبور کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سوزؔ صاحب کے پاس ایک مشاعرہ کا دعوت نامہ آیا جس کے مصرع کے ردیف قافئے "ہوش مجھے" اور "جوش مجھے" تھے۔

سوزؔ صاحب کے اصرار سے آپ نے غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا۔

اور کچھ دیر جو آتا نہ کہیں ہوش مجھے — بیخودی میں کوئی کرلیتا ہم آغوش مجھے

غزل کہنے کے بعد اصلاح کا سوال پیش ہوا۔ اسوقت حضرت مولانا شفق عماد پوری الہ آباد ہی میں مقیم تھے چنانچہ سوزؔ صاحب کی وساطت سے آپ مولانا شفقؔ صاحب کی خدمت میں پہونچے۔ مولانا نے غزل دیکھی اور بہت ہمت افزائی کی۔ اصلاح کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اسی زمانہ میں جناب عالیؔ سہسرامی اپنے کسی شاگرد سے "شاعر" کا پرچہ لائے قمرؔ صاحب نے جب یہ پرچہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور ماہ بماہ اپنی غزلیں اشاعت کے لئے بھیجتے رہے۔ اور باقاعدہ "شاعر" کا مطالعہ کرنے لگے۔ غزلوں پر اصلاح جو دفتر سے دیجاتی تھی آپ کو بہت پسند آئی۔ ادھر حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہ کی اصلاحیں جو اصلاح سخن میں شائع ہوتی تھیں آپ کے لئے بہت جاذب توجہ ہوئیں ۔ اور روز بروز شعر و شاعری سے لگاؤ بڑھتا گیا۔ گو آپ اُس وقت بھی حضرت مولانا شفق عماد پوری ہی سے اصلاح لیتے تھے لیکن بعض مرتبہ جب مولانا توجہ نہیں فرماتے تھے تو آپ کو یہ بات بہت شاق گذرتی تھی۔ گو مولانا بہت کرم فرماتے تھے یہاں تک کہ "علی منزل" جو مولانا کا دولت کدہ ہے آپ کا بھی مسکن ہو چکا تھا لیکن پھر بھی آپ کو ان الطاف بے پایاں کے باوجود اطمینان نہ تھا اور جس مقصد کی تکمیل آپ چاہتے تھے وہ نہ ہو سکتی تھی۔

جب "شاعر" آتا تو آپ اُس کے مضامین وغیرہ بطور خاص مطالعہ کرتے حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ کی عقیدت روز بروز آپکے دل میں بڑھتی جا رہی تھی ۱۹۳۳ء میں حضرت مولانا مدظلہ کی ایک غزل جو آپ نے جہلم کے مشاعرے میں پڑھی تھی شائع ہوئی اُس کا مندرجہ ذیل مطلع پڑھ کر قمرؔ صاحب جھومتے تھے اور بیتاب تھے کہ کسی طرح حضرت مولانا مدظلہ کے قدم مبارک چوم لیں مطلع یہ تھا

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

آپ نے سوزؔ صاحب سے اپنی بیتابی کا ذکر کیا مگر "باریابی کس طرح ہو" کے سوال پر وہ بھی خاموش ہو گئے۔ قمرؔ صاحب کو اب دن رات یہی فکر رہتی تھی کہ کسی طرح حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ کی خدمت میں اپنا کلام بھیجیں اور ادبی تشنگی کو بجھائیں۔ قمرؔ صاحب ایسے استاد کی فکر میں تھے جو ہر صنف پر قادر ہو انتہائی غور و فکر کے بعد بھی آپ کو سوائے مولانا مدظلہ کے اور کوئی ہستی نظر نہ آتی تھی اور ہر مرتبہ آپ کی نگاہ قصر الادب کی چہار دیواری ہی سے ٹکراتی تھی۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک یہ جذبۂ بے پایاں دلنشیں رہا تو اٹھتے بیٹھتے ایک کشش محسوس کرنے لگے۔ آخر ۲۴ جون ۱۹۳۶ء کو ایک غزل اور چند رباعیاں آپ نے لکھیں دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے خط ڈاک کے سپرد کر دیا اور غزل کی واپسی تک "الانتظار اشد من الموت" کا مزہ چکھتے رہے۔ ۹ جون ۱۹۳۶ء کو جواب ملا اور اضطراب شوق سے وارفتہ ہو کر لفافہ کھولا دل میں سینکڑوں قسم کے خیالات آ رہے تھے۔ "عدیم الفرصتی"، "تمھیں ابھی مشق کی ضرورت ہے" "فہرست تلامذہ میں جگہ نہیں" وغیرہ وغیرہ الفاظ آہستہ آہستہ زبان سے نکل رہے تھے۔ لیکن جب لفافہ میں اصلاح شدہ غزل اور رباعیاں نکلیں اور اس نوید کے ساتھ کہ "آپ کا نام فہرست تلامذہ میں لکھ لیا گیا ہے" تو بس کچھ نہ پوچھئے کتنی مسرت ہوئی کہ آپکو وہ لمحہ عمر بھر یاد رہے گا اس واقعہ کا ذکر آپ نے اپنے الفاظ میں جسطرح کیا ہے وہ میں لکھنے سے قاصر ہوں۔ لفافہ لیکر فوراً اپنے مخلص دوست جناب سوزؔ صاحب کی خدمت میں پہونچے اور انھیں خوشخبری سُنائی۔

اس وقت آپ کی عمر شاعری صرف تین سال ہے لیکن جب سے حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہ کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہوئے ہیں غزل نظم۔ رباعی۔ قطعات۔ نثر مضامین غرض سب ہی کچھ بے تکان خوب لکھ لیتے ہیں۔ آپ اپنے استاد کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں "میں بہ بانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں اور اس بات پہ میرا ایمان ہے کہ میرا استاد یگانۂ روزگار اور وحید العصر ہے۔"

کوثر — ابوالمحامد سیّد اشفاق حسین صاحب نقوی — ۵۔

آپ کا نام سید اشفاق حسین اور کوثرؔ تخلص ہے۔ آپ کا اصل وطن عراق (عرب) ہے۔ مذہباً فرقۂ ناجیۂ اثنا عشریہ سے متعلق ہیں اور حضرت امام علی نقیؑ کی اولاد ہیں۔ آپ کے بزرگ سنین ماضیہ میں بغرض تبلیغ اسلام وارد ہندوستان ہوئے۔ منجملہ دیگر بزرگان خاندان آپ کے جدِّ امجد مولانا و مقتدانا قطب الاقطاب سیدنا حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت علیہ الرحمۃ نے اوچ شریف صوبہ پنجاب میں طرح اقامت ڈالی۔ دیگر افرادِ خاندانِ عظام بسلسلۂ نشر و اشاعتِ مذہب حقہ مختلف دیار و امصار۔ اطراف و اکنافِ ہندوستان میں پھیل گئے۔ اور ہزارہا تکالیف و مصائب عظیم برداشت کرنے کے بعد کرور ہا دل گم گشتگانِ راہِ مذہب و ملت کو جادۂ مستقیم پر لا کر سلکِ اسلام میں منسلک فرمایا۔ چنانچہ عالی جناب میر شرف الدین صاحب محمود مرحوم و مغفور نے ریاست مالیرکوٹلہ میں سکونت اختیار فرمائی۔ اور مشعلِ ہدایت سے ہزاروں قلوب منور کئے۔ با عتبارِ قدامت۔ سیادت۔ شرافت۔ نجابت۔ نبالت۔ شجاعت۔ حذاقت۔ طبابت اور ماہرِ علوم و فنونِ متداولہ ہونے کے آج تک آپ کا خاندان اقصائے ہندوستان میں عظیم المرتبت و جلیل المقدرت مانا جاتا ہے۔

آپ کے جدِّ محترم حضرت میر مہدی حسن صاحب المتخلص محسن مرحوم شاگرد رشید حضرت مولانا داغ صاحب مرحوم و مغفور لکھنوی کی شادی مرحوم و مغفور عالی جناب راجہ میر محمد اکبر علی خاں صاحب بہادر والی و فرمان روائے ریاست کوٹاہہ کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی گو آپ کے جملہ خاندان کی سکونت مستقلاً مالیرکوٹلہ ہی میں ہے لیکن آپ کی جدۂ محترمہ زیادہ تر اپنے والد ماجد راجہ صاحب مغفور اعلی اللہ مقامہ کے یہاں اقامت پذیر رہیں۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محترمہ مرحومہ راجہ صاحب مغفور اعلی اللہ مقامہ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ چونکہ دستورِ زمانہ ہے کہ والدین کو بہ نسبت اولادِ کلاں کے اولادِ خورد سے زیادہ محبت و موانست ہوا کرتی ہے اسی کلیہ کے مطابق مرحومہ کا بیشتر قیام "کوٹاہہ" میں ہوا۔ اور آپ کے والد ماجد کی یہیں پیدائش ہوئی۔ بعد انتقال جدۂ محترمہ گزارہ مقررہ منجانب ریاست عالیہ کوٹاہہ ازراہِ کرم آپ کے والد ماجد کے نام منتقل کیا گیا۔ جو بدستور مل رہا ہے۔ اور کوثر صاحب بھی ریاست العالیہ ہی میں عرصۂ چار سال سے بعہدۂ اسسٹنٹ منیجر خدماتِ مفوضہ بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

آپ کی پیدائش بھی یہیں ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بروز چہار شنبہ بمقام گڑھی کوٹاہہ اپنے والد ماجد کے ننھیالی مکان میں (جو اب آپ کی قیام گاہ ہے) ہوئی تھی۔ — آپ سے چھوٹے دو بھائی اور ہیں۔ ایک کا نام سید افتخار حسین اور دوسرے کا نام جدِّ امجد نواسۂ عظام حضرت مولانا مخدوم جہانیاں جہاں گشت علیہ الرحمۃ کے نامِ نامی و اسمِ گرامی پر سید مخدوم حسین رکھا گیا ہے۔ ماشاء اللہ دونوں سعید و رشید نجیبہ و شائستہ ہیں۔

آپ کے عم محترم میر الطاف حسین صاحب اور والد مکرم میر مشتاق حسین صاحب قبلہ نقوی البخاری الجلالی مشہور عالم رحمدل۔ بردبار۔ پاک طینت۔ نیک سیرت فرشتہ خصال ہستی ہیں۔

آپ سال ۱۹۲۶ء میں اینگلو ورنیکلر مڈل پاس کرنے کے بعد یتاں وکٹاہہ سے ریاست مالیرکوٹلہ اپنے عم بزرگوار

میر الطاف حسین صاحب [illegible] مدرسۃ اقدس میں بحصول تعلیم گئے جہاں پر موصوف بعہدۂ سپرنٹنڈنٹ [illegible] خاص سرکار مالیر کوٹلہ دام اقبالہٗ فائز و مامور ہیں وہاں [illegible] تک آپ نے متعدد کتب عربی و فارسی کا بالاستیعاب مطالعہ اور مختلف علمائے کرام سے تحصیل علم کی۔ شاعری سے آپ کو بچپن سے لگاؤ تھا۔ حسن اتفاق سے قیام مالیر کوٹلہ میں حضرت شیخ بشیر حسن صاحب بشیر کی صحبت نصیب ہوئی اور وہ جوہر شاعری جو فطرتاً مبدءِ فیاض نے آپ کی طبیعت میں ودیعت فرمادیا تھا اور زیادہ چمک اٹھا۔ اور اب آپ بجائے میر اشفاق حسین کے ابوالمجاہد میر کوثر نقوی کے نام سے پکارے جانے لگے۔ بیشتر مشاعرے موصوف کی قیادت و صدارت میں آپ نے پڑھے جن سے مالیر کوٹلہ کے ادبی طبقات میں بہت جلد روشناس ہوکر ہر دلعزیز ہوگئے۔ اسی زمانے میں حضرت قبلہ محترم مولانا سیماب صاحب اکبرآبادی مدظلہٗ مالیر کوٹلہ تشریف لے گئے اور حضرت بشیر کے دولت کدہ پر آپ کو ان سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا حضرت بشیر کی جانب سے بتقریب تشریف آوری مولانا سیماب صاحب قبلہ خاص خاص شعرائے مالیر کوٹلہ کو دعوتِ افطار و طعام دی گئی تھی۔ جس میں آپ بھی مدعو تھے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"مولانا سیماب صاحب قبلہ نے بعد فراغت طعام جو غزل اس روز لحنِ داؤدی میں ارشاد فرمائی تھی وہ آواز اس وقت تک برابر میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور تا زیست براہ راست قلب پر نقش رہے گی۔ اللہ اللہ کتنا دلنشیں۔ دردناک۔ پر از حقائق و معارف کلام ہے۔

گوارا اتنی زحمت اڑانے والے کارواں کرلیں
اسیروں کی طرف سے بھی طوافِ گلستاں کرلیں

اس روز سے آج تک کوئی دن ایسا نہیں گذرا جس دن میں نے اس مطلع کو بار بار نہ پڑھا ہو۔ برخاست مجلس کے بعد جناب شیخ ظفر علی صاحب ہیڈ ماسٹر ریاست [illegible] تک جناب علامہ مدظلہ کے ہمرکاب رہنے کا مجھے بھی [illegible] حاصل ہوا۔ اور اسی شب میں نے اپنے مکان پر پہونچ کر فیصلہ کرلیا۔ کہ گو شاعری بغیر سیماب مشکل ہے ہرگز نہ تشنگی تھی چنانچہ ہم نے ہر فروری ۱۹۳۲ء کو جناب ممدوح الشان مدظلہٗ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگیا اور آج تک سرکار علامہ کے فیض روحانی سے وہ وہ نکات حاصل کرچکا ہوں جن کا بہترین اعتراف میرا قلب ہی کرسکتا ہے۔ قلم و زبان میں تو حلیۂ تشکر کی بالکل طاقت نہیں۔ دعا ہے کہ خدائے حی و قیوم ہمیشہ قبلہ محترم کو میری ہدایت کیلئے زندہ و سلامت رکھے آمین ثم آمین"

آپ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) گم شدہ دوست۔ ۲۔ آئین محبت۔ ۳۔ دامنِ کوہسار سے ایک آواز بامی۔ ۵۔ نوائے مہجور۔ ۶۔ بانسری کی صدا۔ ۷۔ چودہویں صدی کا شاعر۔ ۸۔ شہزادی کی ذہنی تصاویر۔ ۹۔ الماستان (دیوان اردو) ۱۰۔ زیور ہند (دیوان فارسی)

آپ نظم و غزل فارسی اور اردو دونوں میں کہتے ہیں۔ نہایت وسیع المطالعہ اور باذوق نوجوان ہیں۔ شکوہ الفاظ اور ندرت آپ کے یہاں بدرجۂ غایت ہے۔

نمونۂ تغزل

لب جو خوشی شام میں جو غزل کبھی سمع نواز ہو
وہ مری حکایتِ سوز ہو وہ مری حدیث گداز ہو
وہی حسنِ فتنہ خرام ہو۔ وہی عشقِ حشر نواز ہو
وہی غزنوی کا مذاق ہو۔ وہی کیفِ زلفِ ایاز ہو
میری بندگی نیاز ہو۔ ترا لطفِ بندہ نواز ہو

میر الطاف حسین صاحب کی خدمت اقدس میں بحصول تعلیم گئے جہاں پر موصوف بعہدۂ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ... اس خاص سرکار مالیر کوٹلہ دام اقبالہٗ فائز و مامور ہیں وہاں ... کئی سال تک آپ نے متعدد کتب عربی و فارسی کا بالاستیعاب مطالعہ اور مختلف علمائے کرام سے تحصیل علم کیا۔ شاعری سے آپ کو بچپن سے لگاؤ تھا۔ حسن اتفاق سے قیام مالیر کوٹلہ میں حضرت شیخ بشیر حسن صاحب بشیر کی صحبت نصیب ہوئی اور وہ جوہر شاعری جو فطرتاً مبدۂ فیاض نے آپ کی طبیعت میں ودیعت فرمادیا تھا اور زیادہ چمک اٹھا۔ اور اب آپ بجائے سید اشفاق حسین کے ابو المحامد میر کوثر نقوی کے نام سے پکارے جانے لگے۔ بیشتر مشاعرے موصوف کی قیادت و صدارت میں آپ نے پڑھے جن سے مالیر کوٹلہ کے ادبی طبقات میں بہت جلد روشناس ہو کر ہر دلعزیز ہوگئے اسی زمانے میں حضرت قبلہ محترم مولانا سیماب صاحب اکبر آبادی مدظلہٗ مالیر کوٹلہ تشریف لے گئے اور حضرت بشیر کے دولت کدہ پر آپ کو اُن سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ حضرت بشیر کی جانب سے بتقریب تشریف آوری مولانا سیماب صاحب قبلہ خاص خاص شعرائے مالیر کوٹلہ کو دعوتِ افطار و طعام دی گئی تھی۔ جس میں آپ بھی مدعو تھے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"مولانا سیماب صاحب قبلہ نے بعد فراغتِ طعام جو غزل اس روز لحنِ داؤدی میں ارشاد فرمائی تھی وہ آواز اس وقت تک برابر میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور تا زیست براہ راست قلب پر نشتر زن رہے گی۔ اللہ اللہ کتنا۔ دلنشیں۔ درد ناک۔ پُر از حقائق و معارف کلام ہے۔

گوارا اتنی زحمت اڑانے والے کارواں کرلیں
اسیروں کی طرف سے بھی طوافِ گلستاں کرلیں

اس روز سے آج تک کوئی دن ایسا نہیں گذرا جس دن میں نے اس مطلع کو بار بار نہ پڑھا ہو۔ برخاستِ مجلس کے بعد جناب شیخ ظفر علی صاحب ہاؤس ہولڈ منسٹر ریاست مالیر کوٹلہ کے مکان تک جناب علامہ مدظلہٗ کے ہمرکاب رہنے کا مجھے بھی شرف حاصل ہوا۔ اور اسی شب میں نے اپنے مکان پر پہونچ کر فیصلہ کرلیا۔ کہ گو شاعری بغیر سیماب مشکل ہے ہرگز نہ آسکے گی چنانچہ ۲۴ فروری ۱۹۳۳ء کو جناب ممدوح الشان مدظلہٗ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگیا اور آج تک سرکار عالیہ کے فیوض روحانی سے وہ وہ برکات حاصل کر رہا ہوں جن کا بہترین اعتراف میرا قلب ہی کرسکتا ہے۔ قلم و زبان میں ادائے تشکر کی بالکل طاقت نہیں۔ دعا ہے کہ خدائے حی و قیوم ہمیشہ ہمیشہ قبلۂ محترم کو میری ہدایت کیلئے زندہ و سلامت رکھے آمین ثم آمین"

آپ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) گم شدہ دوست۔ ۲۔ آئینِ محبت۔ ۳۔ دامانِ کوہسار ۴۔ اتحاد باہمی۔ ۵۔ نوائے مہجور۔ ۶۔ بانسری کی صدا۔ ۷۔ چودھویں صدی کا شاعر۔ ۸۔ بہزاد کی ذہنی تصاویر۔ ۹۔ الماستان (دیوان اردو) ۱۰۔ نیرِ ہند (دیوان فارسی)

آپ نظم و غزل فارسی اور اردو دونوں میں کہتے ہیں۔ نہایت وسیع المطالعہ اور باذوق نوجوان ہیں۔ شکوہ الفاظ اور ندرت آپ کے یہاں بدرجۂ غایت ہے۔

نمونۂ تغزل

لب جو خموشیٔ شام میں جو غزل بھی سمع نواز ہو
وہ مری حکایتِ سوز ہو وہ مری حدیثِ گداز ہو

وہی حسنِ فتنہ خرام ہو۔ وہی عشقِ حشر نواز ہو
وہی غزنوی کا مذاق ہو۔ وہی کیفِ زلفِ ایاز ہو

میری بندگی نیاز ہو۔ ترا لطفِ بندہ نواز ہو

جو نہ رابطہ ناز و نیاز ہو تو نہ اس پہ کیوں مجھے ناز ہو
میں اسیرِ منتِ عشق ہوں میں اسیرِ غمزۂ عشق ہوں
وہ حقیقت اب مجھے چاہیے جو مری مجاز نواز ہو
نہ سہی مجھے کوئی آرزو مگر اب بھی اتنی ہوس تو ہے
ترا آستانۂ ناز ہو یہ مری جبینِ نیاز ہو
مرا عشق عشق غلط سہی مرا درد درد نہیں سہی
مگر اک غلط ہی کوئی سہی کہ جو میری درد نواز ہو
یہ فریب ہمتِ پست ہے کہ اسیرِ جادۂ راہ ہوں
جو ہو میرا ذوقِ طلب جواں، نہ نشیب ہو نہ فراز ہو
ہوں رہینِ لذتِ بیخودی۔ کوئی کیف غیر نظر سہی
مجھے کوثر اس سے غرض نہیں کہ شراب میکدہ ساز ہو

زمیں کیسی گئے ذرا اپنا عروجِ آسماں تک ہے — جنوں سامانِ الفت کی تگ و دو لا مکاں تک ہے
دعائے مرگ کا بھی تو خیال آتا نہیں تیا — اثر کو دشمنی مجھ سوختہ جاں سے یہاں تک ہے
تصور منزلِ گم گشتگانِ راہِ وحشت کا — سرابِ بے نشاں تک ہے غبارِ کارواں تک ہے
گدائے میکدہ ہوں ساغرستانِ محبت کا — کہوں کیا حسرتِ بادہ کشی مجھ کو کہاں تک ہے
نہ کیوں معمورۂ عالم سراپا نور بن جائے — تمہارے حسن کی تابش زمیں سے آسماں تک ہے
جمالِ حسن ہو ارزانیٔ جلوہ ادائی تو — مری تقدیر کا بانا سودائے زیاں تک ہے
ہمیں معلوم ہے رنگِ تغزل آپ کا کوثر
یہ ساری قدر افزائی خلوصِ دوستاں تک ہے

جو زاد دیکھے گا۔ بہزاد دیکھے گا — نظر سے نہ اپنی مگر زاد دیکھے گا
سنا کر وہی نغمۂ ماعرفنا — مجھے مست و بیخود بنا دیکھے گا
وہ دن یاد ہیں کوئی کہتا تھا کوثر — ہمیں شعر اپنا سنا دیکھے گا

دیوانگیٔ حسن ہی کو نہ دیوانہ وار دیکھ — ہے دیکھنے کی چیز دلِ داغدار دیکھ
پہلے نگاہِ ناز کے تیروں پہ کر نظر — پھر میری حسرتوں کا شکستہ مزار دیکھ

ہے یہ بے محل ترانۂ آزادیٔ وطن — کوثر ابھی تو سائے وقت نہیں ساز گار دیکھ

برق سی اک تڑپ گئی گرمیٔ اشک آہ سے — کس کی نگاہ لڑ گئی میرے دلِ تباہ سے

غزل فارسی

شیوۂ حسن دگر، رنگِ محبت دگر است — شوخیٔ عشق دگر، گرمیٔ الفت دگر است
جذبِ تبریزیہ و دانیٔ جنونِ مجنوں — عالمِ جذب دگر، عالمِ وحشت دگر است
آں تفاوت کہ درین است ندانند واعظ — کوچۂ یار دگر کوچۂ جنت دگر است
آنکہ فردوس بگویند بکوئے جانان — ایں خیالست دگر کوچۂ جنت دگر است
ایں حسینانِ جہاں تفرقہ انداختہ اند — نہ ملاحت دگر است و نہ صباحت دگر است
مشتق از نورِ احد نورِ علیؑ و احمد — نہ امامت دگر است و نہ نبوت دگر است
ایں بن و بیخ یکی دو جہ ہستی دارد — نہ جوانی دگر است و نہ کہولت دگر است
ہادیٔ راہ ہدا غیرِ علی نیست کسے — نہ امامت دگر است و نہ خلافت دگر است
ظاہر و باطنِ احباب ہیں اے کوثر
حسنِ صورت دگر و خوبیٔ سیرت دگر است

نمونۂ نظم

"شہریاری و محبت"

شہریاری، طلبِ زر کا آلۂ نام و نمود — اور محبت، ارتباطِ دین و دنیا کی کشود
شہریاری، اہتمامِ تاج و تخت و مال و زر — اور محبت، شیوۂ اربابِ مخلص کا ہنر
شہریاری، لعنتِ ہامان و فرعونِ ذلیل — اور محبت، حکمتِ موسیٰؑ و ہارونِ جلیل
شہریاری، خوردن و نوشیدن و رفتن بدوش — اور محبت، جذبۂ محمود و الہامِ سروش
شہریاری چند روزہ، پھر نشانِ بے نشاں — اور محبت، زندۂ جاوید و دائم نوجواں
شہریاری، خود ذلیل ابنِ ذلیل ابنِ ذلیل — اور محبت، آتشِ نمرود میں باغِ خلیل
شہریاری، مرکزِ جور و جفا و ظلم زاد — اور محبت، رشتۂ ما بینِ معبود و عباد
شہریاری، درد و داغ و سوز و ساز و جستجو — اور محبت، بے نیازِ امتیازِ ما و تو

شہریاری، اندلیب انتقام و انتشار — اور محبت، امن ہیم نازشِ لیلیٔ و نہار
شہریاری، عالم کرب و تعجب کا رازِ خاص — اور محبت، احسنِ تقویم کا اعجازِ خاص
شہریاری کا نتیجہ غیر از خدائی دوسرا
اور محبت، حق نگاہ بے نیازِ ماسوا

نمونۂ نثر

اگر میں پھول ہوتا

تو مجھ سے تزئینِ چمن ہوتی۔ بلبلیں میری محبت کا دم بھرتیں۔ میرے چاروں طرف پھر کر بصد فخر مجھ پر قربان ہوتیں خار کو میرے قریب دیکھ کر بے چین ہو جاتیں۔ دستِ گلچیں کی دست برد سے بچانے کے لئے ہر ممکن سعی کرتیں۔ قطرۂ شبنم صبح سویرے میرا منہ دھلانے کو آسمان سے ٹپک پڑتا۔ گلشن میری خوشبو سے مہک اٹھتا۔ ہر نازنین میرا دالہ و شیدا ہوتا۔ کوئی طرۂ دستار بناتا۔ اور کوئی آویزہ بنا کر گوش میں آویزاں کرتا۔ کوئی ہار گوندھ کر زینتِ گلو و شانہ میں محو ہوتا۔ کوئی دیبا تنِ ملبوس میں مجھے بہترین جگہ دیتا کوئی گلدستۂ بوقلموں میں صدر بناتا۔ کوئی میری خوشبوئے عطر بیز و عنبر ریز سے مستِ مئے سرور ہو جاتا۔ اگر باغ میں کوئی دوشیزہ نازنین آ نکلتی تو جونہی مجھ پر نظر پڑتی ہزار جان سے مجھ پر فریفتہ ہو جاتی حصولِ قرب کے لئے ہر ممکن سعی سے کام لیتی۔ مجھ سے اپنی شان دوشیزگی کو دوبالا کرنے کے واسطے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی۔ طوطیاں ہر سو چہکتیں۔ بلبلیں لاکھ شور مچاتیں۔ مگر وہ میری عاشقِ زار اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے شاخِ گلبن سے جدا ہی کر لیتی۔ پھر کیا ہوتا؟ کبھی چشمِ فسوں ساز سے لگاتی۔ کبھی سینۂ ناز پر جگہ دیتی۔ اور بار بار لبِ لعلیں سے میرے بوسے لیتی۔

اگر مجھے کوئی شاعرِ شیریں مقال دیکھ پاتا۔ تو اس قدر میری مدح و ستائش کرتا۔ کہ اپنے طائرِ خیال کی بلند پروازیوں۔ اشہبِ فکر کی جولانیوں اور ترنم ریز نغموں کی گونج سے فضائے عالم کو معمور کر دیتا۔

دنیائے شاب میرے وجدان پرور سے سحر آفرین نگہت بند ہو رہ جاتی۔ عالی مرتبت مقتدر وجاہت ہستیاں میرے قرب کو فخر و مباہات سمجھتیں۔ اپنی شگفتگی اور سحر لوبیت سے دنیائے عشق میں بوقلمونی اور انقلابِ عظیم پیدا کر دیتا۔ ہر وقت معشوقانِ طرحدار اور نازنینانِ طرار کا طرۂ دستار ہوتا۔ اور اپنی دورِ وزہ زندگی کو مسرتوں کا گلکدہ بنا دیتا۔ لیکن میرا پھول ہونے سے فقط یہ ہی مقصد نہ ہوتا کہ صرف حسینانِ سراپا ناز و لعبتانِ طناز ——— سے ہی لطف اندوز ہوتا نہیں۔ بلکہ ہر روز شاخِ گلشن پر کھلتا۔ اور عمرِ طبعی کو پہونچکر اپنے انجام سے اہلِ دنیا کو درسِ عبرت دیتا۔ اور بے ثباتیٔ جہاں کا عبرتناک مرقع اہلِ عالم کے سامنے کھینچکر بود و نابود کی تفسیر سے ہر مستِ مئے پندار کو انا للہ و انا الیہ راجعون کی تعلیم دیتا۔ غرض ہر روز اسی طرح قدرت کا پیغام اہلِ جہاں کو پہونچاتا۔ گو اب بھی میری ہستی اہلِ جہاں کیلئے درسِ عبرت ہوگی۔ مگر ایک مرتبہ افسوس قدرت نے مجھ کو گلوں کی زمرے میں شامل نہ ہونے دیا اسکو بھی اس کی ستم ظریفی کہنا چاہیئے۔ ورنہ مجھ میں تو کوئی نقص نہیں۔

سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کی غزل پر حضرت علامہ سیماب مدظلہ کی اصلاح

سکونِ قلب رواں گشت و جوش می آید — بہار آمد و عہدِ خروش می آید
مزار تیرہ و تاریک پیش ما گردون — ایں کہ گیست برقِ تجلی بدوش می آید
نوید باد کہ کشتانِ مئے فراموشی — غمام تیرہ و سرد و خموش می آید
بیا کہ بہ تحسینِ خونِ خلیل زد دریا — کہ عہدِ باطل و ایماں فروش می آید
زمانہ مائلِ صد انقلاب می گردد — صدائے ہاتفِ غیبی بگوش می آید
سرِ مزارِ من آں ساقیٔ جمیل و حسین — بہ گرفتہ مینا بدوش می آید
گناہ کوثرِ جامی معاف خواہد گشت — ز اوجِ عرش صدائے سروش می آید

آپ کا نام شیخ منظور الٰہی ہے اور کوثر تخلص ہے والد بزرگوار کا اسم شریف شیخ محمد مبارک صاحب ہے جو ریاست جموں کی پرانے تجربہ کار ملازم ہیں۔ اور سپرنٹنڈنٹ کیمبرین جیسے عہدہ پر ممتاز ہیں۔

آپ سورج بنسی راجپوت خاندان سے ہیں آپ کا شجرہ نسب راجہ جے پال سے ملتا ہے۔ اسی خاندان کے ایک رکن راجہ جسونت رائے مشرف بہ اسلام ہو کر شیخ کرم اللہ کہلائے۔

آپ ۱۶ر فروری سنہ ۱۹۱۳ء کو مقام میانی (ضلع شاہ پور) میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں انٹرینس تک تعلیم حاصل کی۔

آپ کو چودہ سال کی عمر میں پنجابی شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۱ء تک پنجابی کی چالیس کتب و قصص وغیرہ تصنیف کیں۔ منظور ہدایت۔ جنگ نامہ کوثر۔ خطب انشائے کوثر وغیرہ پنجابی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اسی دوران میں آپ کے ضلع کے پنجابی شعرا آپ کی جانب رجوع ہوئے۔ جن میں بسمل صاحب شاد صاحب بشر صاحب ساہنی اور احمد صاحب قابل ذکر ہیں۔ آپ ان حضرات کو برابر اصلاح و مشورہ دیتے رہتے ہیں

ایک عرصہ کے بعد آخر آپ کی طبیعت پنجابی شاعری سے اُچاٹ ہو گئی سنہ ۱۹۳۲ء میں میانی میں جناب ظفر مراد آبادی سے ملاقات ہوئی جو آپ کے دوست تھے اور جنہیں اردو شاعری میں کافی ملکہ تھا۔ اُن کی صحبت میں رہ کر آپ کی طبیعت کا رجحان اردو کی طرف مائل ہو گیا۔ نغمۂ کوثر۔ جاسوس عاشق تیر دلبر اور شہید ناز افسانے لکھے۔ میانی میں بہت سے مشاعرے پڑھے۔ اُس وقت وہاں کسی کو اردو شاعری کا شوق نہ تھا۔ آپ نے "ینگ اسٹوڈنٹ سوسائٹی" کی بنیاد ڈالی۔ جو دو سال تک قائم رہی آپ کے یکا یک جموں چلے جانے سے یہ سوسائٹی درہم برہم ہو گئی۔

آپ کی اردو غزلیں تشنۂ اصلاح تھیں۔ اور آپ کو کسی کامل استاد کی جستجو تھی پنجاب میں اساتذہ کی کمی نہ تھی۔ لیکن آپکا ذوق نظر کسی اہل زبان بلند پایہ رہبر کی تلاش میں تھا۔ وہاں کوئی ایسا کامل فن استاد نظر نہ آیا جو آپ کے نقائص اور اغلاط کی تصحیح کرتا۔

آپ مدت سے گرامی حضرت قبلہ علامہ سیماب مدظلہ کی شہرت سُن رہے تھے۔ آپ کی تمنا تھی کہ آپ بھی مولانا مدظلہٗ کے خوشہ چینوں میں سے ہوں۔ آخر مورخہ ۲۷ر نومبر سنہ ۱۹۳۵ء کو حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کے تلامذہ میں شامل ہو گئے

اُس وقت سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے ہیں چند دنوں کی اصلاح سے آپ کے کلام کا رنگ کچھ سے کچھ ہو گیا گویا کہ حضرت قبلہ موصوف نے آپ کے پژمردہ قالب میں حقیقی روح پھونک دی ہے آجکل کی تصانیف جو غیر مطبوعہ ہیں اور جن کے متعلق خط و کتابت جاری ہے۔ وہ یہ ہیں طلسمی چکر، "چند افسانے" زہریلی ناگن، وغیرہ وغیرہ آپ کا کلام ہمدرد کشمیر، شاعر آگرہ، اودھ پنچ لکھنؤ، خاتون بمبئی، اور کنول، میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

کوثر صاحب نے پنجابی شاعری کو ترک کرنیکے بعد اردو شاعری پر گو ابھی بہت کم وقت دیا ہے لیکن پھر بھی حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ موجودہ کلام سے آپ کے مستقبل کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا ہے۔

نمونۂ تغزل

سوز کی تو ہین ہے بن جائیں گر ... نہیں سکتے رہینِ آتشِ بیگانہ ہم

نجد کے جنگل سے کیا مطلب کہ ہیں دیوانہ ہم
اپنا خود آباد کر سکتے ہیں اک ویرانہ ہم

ہو گئی ہے ساقیٔ فطرت سے تکمیلِ خمار
اپنے دل میں دیکھتے ہیں آجکل میخانہ ہم

شامِ فرقت آتشِ دل کی فراوانی نہ پوچھ
اپنی ہستی کو سمجھتے ہیں چراغِ خانہ ہم

قابلِ سجدہ جو کعبہ ہے تو میخانہ بھی ہے
ہر ادا میں دیکھتے ہیں جلوۂ جانانہ ہم

تیرے میخانے سے اے ساقی بہت آزردہ دل
لیکے نکلے ہیں کبھی ٹوٹا ہوا پیمانہ ہم

اپنی ویرانی پہ کوثر شکر ہے ماتم نہیں
ہو نہیں سکتے شریکِ قسمتِ بیگانہ ہم

کسطرح ہو رسائی تری بارگاہ تک
واقف نہیں ہیں پیچ و خمِ رسم و راہ سے

چھائی ہے میری سوختہ قلبِ حزیں کی گرد
اٹھے ہیں افق پہ جو بادل سیاہ سے

ایسا نہ ہو کہ ہوش میں آجاؤں بعدِ مرگ
کچھ درست کر دو تم بھی نگاہ سے

چاہوں جہاں جھکا دوں میں اپنا سرِ نیاز
آگے ہوں قیدِ مدرسۂ و خانقاہ سے

یہ سوزِ شامِ ہجر، یہ کوثر کی بے بسی
روشن چراغ کرتا ہے کمبخت آہ سے

میری روداد کا افسانہ بنے یا نہ بنے
وہ اثر گیر ہو دیوانہ بنے یا نہ بنے

تیرے میخانہ کی زینت تو بڑھے گی ساقی
دل مرا قابلِ پیمانہ بنے یا نہ بنے

کاش اک شمع بنادے کوئی خاکسترِ دل
پھر یہ ذرّے بھی پروانہ بنے نہ بنے

میری بربادیوں کا ذکر بھی ہو جائے بیاں
ارضِ کشمیر میں کاشانہ بنے نہ بنے

قابلِ قیدِ تعین مرا دل ہے کوثر
کعبہ بن جائے صنم خانہ بنے نہ بنے

ہوش والوں کیلئے، بارِ گراں ہے زندگی
کچھ بھی ہو لیکن بہت سخت امتحاں ہوگی

کیا خبر ہے کس قدم پر اپنی منزل ہو تمام
موت کا اک چلتا پھرتا کارواں ہے زندگی

جو یہ آنکھیں دیکھتی ہیں در حقیقت کچھ نہیں
خواب ہے سارا جہاں وہم و گماں ہے زندگی

کھل گئے اسرارِ پنہاں عالمِ ہستی کے بعد
داستانِ ہستی کی ترجماں ہے زندگی

کچھ بھی نہیں ہے دیدہ کے قابل ترے بغیر
جلوے ہیں سب نگاہ میں باطل ترے بغیر

چلتا ہوں دو قدم بھی تو لگتا ہوں ہانپنے بار بار
کیونکر کٹے گی عشق کی منزل ترے بغیر

مجھکو کہیں ڈبو نہ دے گردابِ بحرِ زیست
مضطر کھڑا ہوں میں لبِ ساحل ترے بغیر

کچھ دور بن رہی ہے معمہ مری حیات
کھولے گا کون عقدۂ مشکل ترے بغیر

فریاد نیم بعد ہو یا آہ نیم شب
ہوتی نہیں ہے کوئی بھی کامل ترے بغیر

دل ہو رہا ہے جنتِ کشمیر سے اچاٹ
لگتا نہیں کہیں بھی مرا دل ترے بغیر

کوثر کے سازِ دل میں ہیں پھر نغمہ آفریں
ابھی ہر ایک سانس ہے غافل ترے بغیر

نمونۂ نثر

بھولی ہوئی کہانی

بچپن کا زمانہ بھی کیسا دلفریب زمانہ ہوتا ہے جب کبھی جب کبھی یاد آتا ہے تو بے اختیار ایک آہ نکل جاتی ہے وہ ـــ برسات، وہ میری سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھولنا اکثر یاد آیا کرتا ہے۔ وہ میری جذبات آفرینی۔ وہ گداز۔ وہ جوانی کی ترنگ۔ کاش یہ سب ہوا کے جھونکے کیطرح گذر گئی ہوتیں۔ وہ آم کا پیڑ شاید اب بھی موجود ہوگا اسیں ویسی ہی شادابی ہوگی لیکن میرا شجرِ امید ناامیدی کے خشک جھونکوں نے پژمردہ کر دیا ہے۔ جب میں اپنے آپ پر نظر ڈالتی ہوں تو حسرت سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ رحیلہ کی وہ شوخی اب بھی کبھی کبھی میرے افسردہ قلب کو چھیڑ دیتی ہے۔

رحیلہ کی طرح آج ابن و ارفانی ہے جو کچھ نہیں لیکن میں ابھی تک مردہ ہوں اور اپنی حیات کی درد آفریں گھڑیاں آغوشِ مفارقت میں بسر کر رہی ہوں جب میں دو سال کی تھی تو رحیلہ اسوقت سترہ برس کی تھی وہ سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو چکی تھی اور

آپ کا نام شیخ جمن اور کلیم تخلص ہے ۔ آپ ۱۹۱۰ء میں بمقام کسارہ پیدا ہوئے ۔ آبائی پیشہ تجارت ہے ۔ اور اسی سلسلہ میں آپ وہاں مقیم ہیں ۔ آپ کے دیگر اعزا بمبئی اور اکناف بمبئی میں مشہور تاجر ہیں

چونکہ آپ ایک ایسے مقام میں پیدا ہوئے جہاں قدرتی رنگینیاں اور دلچسپیاں تو بہت ہیں لیکن تہذیب و تمدن کے دوسرے شعبے قریب قریب مفقود سے ہیں نہ وہاں کوئی اسکول ہے نہ کوئی سوسائٹی نہ کوئی ادبی دلچسپی کسارہ ۔ اگت پوری کے قریب ایک قصبہ ہے جہاں جنگلات بہت کافی ہیں چاروں طرف فلک بوس پہاڑیاں اور پہاڑ ہیں ۔ موسم گرما میں تو وہاں کچھ چہل پہل بھی ہو جاتی ہے لیکن برسات اور سرما میں یہ مقام قطعاً سونا پڑا رہتا ہے وہی سو پچاس آدمی جو وہاں کے قدیم باشندے ہیں یا تجارت کرتے ہیں ان دونوں موسموں میں وہاں رہتے ہیں ۔ چونکہ یہ ریلوے اسٹیشن بھی ہے اسلئے سامانِ خورد و نوش کے ملنے میں آسانی ہوتی ہے ایسے مقام پر انسان رہنے کے بعد کیا ترقی کر سکتا ہے ۔ کلیم صاحب نے ابتدا میں مرہٹی کی چند کتابیں پڑھیں اور اس کے بعد اردو کی چند کتابیں اپنے ذاتی ذوق کے بنا پر ختم کیں ۔ ورنہ کہاں "کسارہ" اور کہاں اردو ۔

کچھ تو فطری لگاؤ اور کچھ ماحولی رنگ سامانیوں سے متاثر ہو کر کلیم صاحب کی شعری زندگی شروع ہوئی ۔ ادبی وابستگی کے لئے چند احباب پیدا کئے انہی کی معیت میں آپ کا مذاقِ شاعری ترقی پاتا رہا یکلخت علمی استعداد جستہ جستہ ہے جس کے وجوہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں اس لئے کلام کی صحت اور معیار کی بلندی کے لئے آپ نے حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کے سامنے اپنی عرضِ اشتیاقِ شاگردی اپنے ماحول اور اپنی بے مائگی کے ذکر کے ساتھ پیش کی ۔ مولانا مدظلہ نے جب آپکی ذوق و شوق کو دیکھا تو آپ کی درخواست شاگردی منظور فرمائی ۱۹۳۲ء میں آپ کو شرفِ تلمذ حاصل ہوا ۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ کلیم صاحب اُن سینکڑوں واقعات کے باوجود بھی جو آپ کو پیش آتے رہتے ہیں نہایت اچھا شعر کیونکر کہہ لیتے ہیں ۔ اگر اس چیز کو فیضِ سخن نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے ۔

نمونۂ تغزل

یہ تو نے کیا کیا پردہ ہٹا کر رُخِ انور سے
کہ رنگِ زندگی پھر پھوٹ نکلا شام محشر سے

کہاں وہ عیش کے سامان کہاں محفلِ حیراں
میری دنیا بھی ہے محروم ہے تیری آغوش محشر سے

نگاہِ ناز سرگرم مداوائے تمنا ہے
نکالی جا رہی ہیں پھانسیں دل نشتر سے

کلیم اب اُن کے جلوے ہیں وہ تسکین نظارہ
اداسی کیوں نہ ہو تم کو ادائے حسن کے منظر سے

اب محو جستجو ہوں کہ ہے آشیاں کہاں
بجلی فلک سے آئی تھی آخر یہاں کہاں

یہ تو رواں ہیں جسم پہ موجیں سرشک کی
اے چشمِ شوق جامۂ آبِ رواں کہاں

میں منتقل جو وادیٔ بزمِ ناز میں
یاد آ گئیں شباب کی انگڑائیاں کہاں

صیاد سے میں ماجرا کیوں بیاں کروں
مانندہ ہم وطن ہے مگر ہم زباں کہاں

ویران پڑا ہے جادۂ حسن و وفا کلیم
اٹھا گرد کارواں بھی نہیں کارواں کہاں

شمشاد حسین صاحب منظر صدیقی اکبرآبادی ۔ محمد خلیل صاحب ساغر صدیقی اکبرآبادی

عبدالحمید صاحب کوثر صدیقی اکبرآبادی

شیخ جمن صاحب کلیمؔ کساردی

نثار الملک محمد علی صاحب میرؔ احمدی اجمیری

محمد محسن صاحب محسنؔ اکبرآبادی

سید منظور احمد صاحب منظرؔ رضوی بھوپالی

نیر — شیخ محمد علی صاحب احدی اجمیری — ۸۰

آپ کا نام شیخ محمد علی احدی اور نیر تخلص ہے۔ والد بزرگوار کا اسم گرامی شیخ امراؤ علی صاحب احدی تھا۔ احدی آپ کا خاندانی لقب ہے۔ ۱۸۸۵ء میں گلی احدیان محلہ چوک بنی گرہن اجمیر شریف میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کی عمر اکیاون سال ہے۔ اجمیر شریف کے ایک مشہور خاندان سے ہیں۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ معین الاسلام درگاہ معلیٰ اجمیر شریف میں پائی۔ قرآن پاک۔ اردو۔ فارسی اور ہندی کی تکمیل کی۔ آپ انگریزی بالکل نہیں جانتے۔ کثرت مطالعہ نے آپ کو زبردست مدد پہونچائی۔ اردو اور فارسی میں آپ کو کافی دستگاہ ہے۔

نیر صاحب نے ۱۹۰۸ء میں شاعری شروع کی ابتدا میں آپ نے مولانا عبدالمعبود صاحب حقی اجمیری کو اپنا کلام دکھایا۔ ۱۹۱۵ء میں حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے شاگرد ہوئے۔ چونکہ آپ کی مشق کافی بڑھ چکی تھی اس لئے مولانا مدظلہ کے فیض اصلاح سے آپ بہت جلد ترقی کر گئے۔ اور چند سال ہی میں فارغ الاصلاح ہو گئے۔

نیر صاحب نے اپنی زندگی میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا۔ جس نے آپ کو ملک سے روشناس کرا دیا۔ ابتدائی دور شاعری میں آپ نعت یا عشقیہ غزلیں کہتے تھے اور بہت زیادہ کامیاب تھے۔ لیکن یکایک آپ کی طبیعت نے ایک پلٹا کھایا اور آپ۔ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے رنگ میں ایسے رنگے کہ ملک کا بچہ بچہ آپ کو جاننے اور ماننے لگا۔ حقیقت میں آپ نے حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے رنگ کی صحیح تقلید کی ہے۔ ہندوستان کو ایسی چیز کی ضرورت تھی۔ ملک کے مشہور رسائل اور اخبارات میں آپکا ظریفانہ کلام چھپتا رہتا ہے۔ نعت بھی لکھتے ہیں۔

اس وقت تک آپ کی ۳۰ تصانیف شائع ہو چکی ہیں جو ملک میں بے حد مقبول ہیں۔ مثنوی نظارہ عرس خواجہ۔ دربار خواجہ۔ روضۂ خواجہ۔ ریاض خواجہ۔ انوار مدینہ۔ نور دربار خواجہ۔ محامد پیغمبر۔ محشر جذبات۔ مینا خوش نذر جستان۔ تاثرات نیر احدی۔ رشحات نیر احدی۔ فیضی شاعر۔ تاج مرصع نیر اجمیر۔ ارض خواجہ۔ مدحت المعین۔ شوکت خواجہ۔ عظمت خواجہ۔ الفت خواجہ۔ بزم اسلام۔ ترغیب تجارت اور گلکدۂ نعت۔ آپ کی غزلیں اکثر ریکارڈ کمپنیوں میں بھی ریکارڈ ہو چکی ہیں۔

آپ کا لباس نہایت سادہ اور مزاج نہایت شگفتہ ہے۔ بات بات سے ظرافت ٹپکتی ہے۔ کلام میں پختگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ گو آپ نے انگریزی بالکل نہیں پڑھی لیکن اپنے ظریفانہ کلام میں متعدد جگہ انگریزی الفاظ ان صحیح معنی میں آپ نظم کر جاتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

(بیک قافیہ)

میں اسیر غم جو نکلا گھر بنانے کے لئے — تیلیاں پائیں قفس کی آشیانے کے لئے

دیکھنا قسمت کہ رہ رہ کر وہیں بجلی گری — شاخ جو بلبل نے ڈھونڈی آشیانے کے لئے

ہو مبارک بلبلوں کو موسم گل اب کے سال — تنکے خود آئی ہیں اڑ کر آشیانے کے لئے

دست گلچیں آتش گل برق خالف باد تند — [illegible] آئی وہ میرے آشیانے کے لئے

آشیاں جو شب کو کتنے گل اٹھا لائی صبا — صبح تک بلبل نے ڈھونڈا آشیانے کے لئے

گھر میرا آیا جب سے گلچیں نے بنی لی بزاز — آشیاں میرا میں کھلنے میں آشیانے کے لئے

مہرباں صیاد ہو دلکش بنا سے کیا قفس — تیلیاں بھی لا کر آکر آشیانے کے لئے

تیغِ ابرو پہ ہوا جاتا ہی قربان مرغ جاں   شاخ ڈھونڈی ہی غضب کی آشیانے کے لئے
دشمنی کتنی ہی مجھ دل سوختہ سے ...   ... لا سب چمن اک آشیانے کے لئے
گا بجلی گر پڑی اکبار دم مرنے آئی   جب چنے دو چار تنکے آشیانے کے لئے
عمر بھر کرتے رہیں گے جد و جہد اے عندلیب   ہم وطن کیواسطے تو آشیانے کے لئے

کیا بلند آہنگ ہے اے میر اپنا مرغِ طبع
ڈھونڈتا ہے شاخِ سدرہ آشیانے کے لئے

تیغِ ادا کے زخمی قاتل کو ڈھونڈتے ہیں   آسانیوں کی خواہاں مشکل کو ڈھونڈتے ہیں
مجنوں نے عمر اپنی سب خاک میں ملا دی   فندوں میں نجد کے ہم محمل کو ڈھونڈتے ہیں
آآکے بیٹھتے ہیں سینے میں تیر اُن کے   بچھڑے ہوئے مسافر منزل کو ڈھونڈتے ہیں
دنیا کی خواہشوں سے کرتے ہیں ہم کنارا   دریا سے تنگ آکر ساحل کو ڈھونڈتے ہیں
حق کی طلب میں عاشق کرتے ہیں دید کعبہ   لیلیٰ کی آرزو میں محمل کو ڈھونڈتے ہیں

گو میر ہر طرف ہے نا اہلیت کا رونا
قابل مگر ہمیشہ قابل کو ڈھونڈتے ہیں

درِ خواجہ پہ ارمانوں کی کثرت لیکے آیا ہوں   محبت کا ہوں دیوانہ محبت لیکے آیا ہوں
بہت مدت سے آنکھوں کو زیارت کی تمنا تھی   میں اے خواجہ ترا شوقِ زیارت لیکے آیا ہوں
محبت کا نشہ ہندوستاں کی دولت سکہ ہے   ازل سے ساتھ یہ مہرِ صداقت لیکے آیا ہوں
مجھے اے حضرتِ خواجہ تمہارے آستانے پہ   عقیدت لیکے آئی ہے عقیدت لیکے آیا ہوں

صدا کرتا ہوں ہر دم میر میں دربارِ خواجہ میں
گدا ہوکر بھی سلطانوں کی قسمت لیکے آیا ہوں

عجب دستور ہی ہندوستاں کی ... کا   بجائے گل کے اپنے باغ میں پیر خار بوتے ہیں
چھپا لیکر نکر نہ جو تماہ ... ہند مسلماں میں   مناہے آگرے کو شوشے معتبر ملتے ہیں

نہ کہیں قسم میری شاعری کی سب بلا ہیں   مرے شعر اشعار ملتے ہیں بہ لستی کا مشاعرں میں

سفر کی دقتیں آکر وطن میں بھول جاتے ہیں   قفس کی یاد کیوں بلبل کو آئی آشیانے میں

نظر پڑتی ہی دنیا کی ہمیشہ خوش لباسوں پر   نمائش کے ہیں گویا اہلِ دنیا دیکھنے والے
تعجب کیا اگر کل قسمت بدل دے تیرا نقشہ بھی   نہ خوش ہو میری بربادی کا نقشہ دیکھنے والے

انتہا ہی یہ پورا یا نہ پورا آزمائش میں   مرے دل کو بھی رکھکر دیکھ لو دلبی نمائش میں

پڑھ کے انگلش شیخ بھی نیچر کا قائل ہوگیا   دیکھنا لکھا پڑھا انسان جاہل ہوگیا

سبق حاصل کیا ہمدردی لوگوں کا پھر دل نے   پتہ منزل کا پایا میر کی گم کردہ منزل نے
بحمد اللہ ہوئیں پھر بار آور محنتیں ساری   مری اُمید کے گلشن میں پھر غنچے لگے کھلنے
بھلا پھر کیوں نہ اے حسن ترقی تجھکو ڈھونڈیں   کبھی دیکھا تجھے چاہا ہو جن آنکھوں نے جس دل نے
مری تقدیر جب چمکی بھلے دن جب قریب آئے   مری کشتی کی لیں بڑھ کر بلائیں دستِ ساحل نے
میں وہ شاعر ہوں میرا تذکرہ اعزاز سے چھایا   کبھی انگلش جرائد نے کبھی اخبار و رسائل نے
منائی جا رہی ہی جوبلی صد سالہ کالج کی   کیا ہی جمع پروانوں کو اپنی شمعِ محفل نے

تجھے اے میر مشہورِ جہاں کر ہی دیا آخر
تری روشن خیالی نے تری علمی مشاغل نے

حاصل ہوا یہ رتبہ اُس بت کی نوکری میں   پنشن سے پیشتر ہی ہم آگئے کمی میں
کیا چیز آدمی ہی کیا شے ہے آدمی میں   ہیں دو جہاں کے جلوے اس بزمِ عارضی میں
گھیرا ہی ہر طرف سے تاریکیوں نے ہم کو   اندھیر ہو رہا ہی بجلی کی روشنی میں
جب سے کرا چکا ہوں میں زندگی کا بیمہ   مر جائیں ہو شوں میں بیمہ عطا ... ہی جی میں
منت کے بعد جا کو بیمہ گری کی سوجھی   مجنوں نے نوکری کی سنگر کی کمپنی میں

میر حزیں ہوا ہے اب آگرہ میں حاضر
یہ پوسٹر لگا دو اُس شوخ کی گلی میں

منظر — شمشاد حسین صاحب صدیقی اکبرآبادی — ۷۹

آپ کا اسمِ گرامی شمشاد حسین صدیقی اور منظر تخلص ہے۔ آپ میرے برادرِ معظم اور حضرت قبلہ علامہ مولانا سیماب مدظلہٗ العالی کے خلفِ اکبر ہیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ کانپور۔ اجمیر اور ٹونڈلہ ضلع آگرہ میں گذرا اور یہیں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جب حضرت مولانا مدظلہٗ بسلسلۂ ملازمت ٹونڈلہ میں قیام پذیر ہوئے تو آپ وہاں ریلوے ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ ابھی انٹرنس تک تعلیم حاصل کی تھی کہ مولانا مدظلہٗ مستقل طور پر آگرہ تشریف لے آئے۔ یہاں آنے کے بعد برادرِ معظم حضرت منظر صدیقی سخت بیمار ہو گئے۔ اور بیماری نے ایسا طول کھینچا کہ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا اطبا اور ڈاکٹروں کے مشورے سے آپ کو دماغی سکون کے لئے دو سال تک تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا

فارسی۔ عربی اور اردو کی تعلیم آپ نے مدرسۂ عالیہ جامع مسجد آگرہ اور مدرسۂ محمدیہ آگرہ میں حاصل کی۔ اصل میں تمنائے فطرت کچھ اور تھا فطرت برادرِ معظم سے کچھ اور کام لینا چاہتی تھی۔ ایسا کام جس کے لئے ایک سکون یافتہ دل و دماغ کی ضرورت تھی اور غالباً اسی لئے آپ کو ادبی جدوجہد سے پہلے کچھ عرصے کے لئے دماغی سکون بخش دیا۔ آپ نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ ادبِ اردو کی گود میں پرورش پائی۔ اور حضرت قبلہ مولانا مدظلہٗ کے سایہ میں زندگی کی انیس بہاریں گذاریں۔ یہ تربیت کا نتیجہ تھا۔ کہ سنِ شعور کے پہونچنے کے بعد ہی آپ نے خدماتِ ادب کے لئے زندگی وقف کر دی

اپنی زندگی برادرِ منظر صاحب نے جس ادبی انہماک میں بسر کی ہے اسکی مثال نوجوان طبقہ میں ذرا مشکل سے مل سکتی ہے۔ آپ کی ادبی کاوشیں سنہ ۱۹۲۳ء سے شروع ہوتی ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ مستقلاً آگرہ تشریف لائے تھے اور قصرالادب سے پیمانہ شائع ہوا تھا۔ خدا نے آپ کو انتظامی قابلیت بدرجۂ اتم ودیعت فرمائی تھی اچنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۲۶ء تک جب کہ حضرت مولانا مدظلہٗ تمام اکنافِ ہند کا دورہ کر رہے تھے۔ اُس وقت آپ قصرالادب کے تمام انتظامی امور نہایت حسن و خوبی سے انجام دے رہے تھے۔ "پیمانہ" کے ہنگامی انتظامات کے ساتھ ساتھ آپ نے کتب خانہ کی بھی بنیاد ڈال دی تھی۔ اور تنہا اتنے بڑے ادارے کی دیکھ بھال فرما رہے تھے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ نے اپنے چند احباب اور تلامذہ کے مشورے سے قصرالادب کو لاہور منتقل کیا۔ تو آپ نے وہاں بھی بہت سرگرمی سے کام کیا کچھ عرصے تک فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں بھی کام کیا۔ جس وقت لاہور سے قصرالادب آگرہ لایا گیا تو قصرالادب سے آپ ہی کی ادارت میں ایک ماہنامہ "ثریا" کے نام سے شائع ہوا۔ جو کچھ عرصے کے بعد آپکی بے انتہا دیگر مصروفیتوں کی نذر ہو گیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب حضرت مولانا مدظلہٗ نے اخبار "تاج" جاری فرمایا۔ تو اُس وقت "پیمانہ" کے ساتھ ساتھ "تاج" کا بھی تمام انتظام آپ ہی کے سپرد تھا۔ آپ نے جس حسنِ انتظام کے ساتھ اخبار تاج کی مالی نگرانی کی اُس سے ہندوستان کی ادبی اور سیاسی دنیا اچھی طرح واقف ہے ابھی آپ کی ادبی زندگی کو چند اور ہنگامی چیزوں کی ضرورت تھی چنانچہ قبلۂ معظم حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ العالی کی سرپرستی اور اپنی ادارت میں پندرہ روزہ رسالہ "شاعر" شائع کیا۔ جس نے ادبی دنیا میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ اور آج آپ ہی کے لگائے ہوئے اور سینچے ہوئے پودے کی آبیاری میں کر رہا ہوں یہ انتہائی قابلیت تھی کہ آپ تاج۔ شاعر اور پیمانہ

تینوں پرچوں کو بڑی سرگرمی کے ساتھ وقت پر شائع فرماتے رہے۔

حضرت مولانا مدظلہٗ کی خدمت اور نگرانی میں عرصہ دراز تک کام کرتے کرتے آپ کی تربیت اور قابلیت نشو و نما اتنی مکمل اور اچھی طرح پر ہو چکی تھی کہ تمام زندگی گنوا کر بھی دوسرا شخص اس پایہ کو نہیں پہونچ سکتا۔ جس وقت میں نے قصر الادب کے انتظامی معاملات اپنے ہاتھ میں سے لئے تو آپ کو کچھ سبکدوشی حاصل ہوئی۔ اور آپ نے ماہنامہ "شاعر" آگرہ اور ماہنامہ "یادگار" لاہور میں بطور مدیر کام کیا۔ اپنے دس سالہ تجربہ کی بناء پر آپ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا رسالہ آگرہ سے شائع کیا جائے جس میں مرحوم رسالہ "پیمانہ" کی جھلک نمایاں ہو۔ اور جو پنجاب کے شہرت یافتہ رسالوں میں ممتاز جگہ پا سکے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں "ماہنامہ کنول" مرکز اشاعت ہینگ کی منڈی آگرہ سے جاری کیا۔ جس نے اپنی بہت ہی کم عمر میں مشہور ادبی صحائف کی صف اول میں ممتاز جگہ پائی۔ اس کے ساتھ ہی آپ اپنے مخلص دوست جناب محمد خلیل صاحب سائر صدیقی اکبرآبادی کے ساتھ ساتھ "رفاہ عام پریس" آگرہ کے انتظامی معاملات میں بھی دخیل ہیں۔

ابتک میں نے برادر معظم کی ادبی زندگی پر بہت ہی مختصر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن شعری زندگی ہنوز باقی ہے۔ آپ کی شاعری کے متعلق میں بھلا کیا لکھ سکتا ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہوگا۔ آج تمام ہندوستان آپ کی شاعری سے متعارف ہے۔ آپ جیسے ادیب جلیل اور شاعر بے مثل کے فرزند اکبر ہیں۔ اسی اعتبار سے اگر آپکے کلام پر روشنی ڈالی جائے تو ایک طویل مضمون مرتب ہو سکتا ہے برادر معظم میں چند خصوصیات ایسی ہیں جو آپ کے درجہ کو آگرہ اسکول کے افراد سے ممتاز کرتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کو حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ کا فرزند اکبر ہونے کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ عرصہ دراز تک آپ نے مولانا مدظلہٗ کے دوش بدوش حاضر رہ کر اپنی مشق کی تکمیل کی ہے۔ مولانا مدظلہٗ کی صحیح جانشینی کا حق حاصل ہے۔ [illegible] کے علاوہ تمام ادبی خصوصیات جو مولانا مدظلہٗ میں پائی جا[illegible]رجہ اتم موجود ہیں۔ شاعری کی ہر صنف پر قادر ہیں [illegible] کے تمام تلامذہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں متعدد شاعر ایسے بھی ہیں۔ جو آپ کے فیض سخن سے ترقی پا رہے ہیں۔ ہندوستان کے ہر مشہور رسالے اور اخبار کو آپکے کلام، مضمون اور افسانوں کے شائع کرنے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ کوئی بڑا مشاعرہ ایسا نہیں ہوا جس میں آپ نے شرکت نہ کی ہو۔ برادر معظم کی شعری خصوصیات کے متعلق ملک کی رائیں جو کچھ ہیں وہ ادبی ذوق رکھنے والوں کی نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں۔

آپ نہایت خاموش۔ سنجیدہ اور خلوت پسند انسان ہیں۔ گو آپ کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ اور آپ آئے دن بیمار رہتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی زیادہ سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ آپ کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں عام فہم عروض بہت مقبول ہوئی ہے۔ اشاعت کلام اور دیگر ادبی مضامین اور افسانوں کے متعلق آپ کا خیال ہے۔ کہ جب تک ایک ادیب معیار کی انتہائی معراج تک نہ پہونچ جائے اور ملک کو اُس کے کلام اور کام کی ضرورت محسوس نہ ہو اُس وقت تک ملک کے سامنے کسی تصنیف کو پیش کرنا لاحاصل ہے۔

نمونۂ تغزل

یہ خانہ سوز میری چاندنی کو یہ کدورت تھی — کہ آئی بھی تو آئی روزن دیوار زنداں تک

اٹھاؤں غم دل مجبور پہ زمانے کا — یہ مدعا تھا مرے آدمی بنانے کا

دل خراب کی سرمستیاں معاذ اللہ — اسے ہم اور بھی کر کے خراب دیکھیں گے

میں پوچھتا ہوں یہ دنیا کے بامرادوں سے — وہ کیا کرے کہ جو ناکام آرزو ہو جائے

رکھ لیا سینہ پہ پھینکا ہوا خنجر میں نے — مجھ سے دیکھا نہ گیا اُن کا پشیماں ہونا

تمہاری باتیں کسی میں ہوتیں تو کیا مرے دل کا حال ہوتا
جو تم سے دو چار اور ہوتے تو میرا جینا محال ہوتا
خدا نے کچھ سوچ کر سمجھ کر کیا تمہیں لاجواب پیدا

جسے منظور ہو بربادیٔ مطلق منظر — آئے اور جامۂ ہستی کا گریباں ہو جائے

لڑکپن تھا کہ تھی ہر چیز پہ اک سادگی طاری — جوانی ہے کہ اک دنیا جواں معلوم ہوتی ہے

تاریکیٔ لحد کو رنگینیاں مبارک — آنکھوں میں لے چلا ہوں تیرا جمال بھر کے

یہ جتنے کارواں ہیں سب نہیں گے خاک منزل کی — نیا اک کارواں خاکستر منزل سے نکلے گا

تری بیداد سر آنکھوں پہ مگر سن تو سہی — اس پہ بیداد ہے جو قابل بیداد نہیں

عبادت ہے کہ سجدے روز کرتا ہوں خدا کو میں — طبیعت ہے کہ اب تک بت پرستی کو ترستی ہے

کچھ بن نہ سکی ہستیٔ ناکام ہماری — کوشش تو بہت کی کوئی دیوانہ بنا دے

تجھکو اے منظر مبارک ہمنشینیٔ جمال — کل کسی کے دست نازک میں تری تصویر تھی

دیکھئے کس نام سے ہو ذکر مرگ عاشقی — نام میری بیخودی کا زندگی مشہور ہے

ستارے چپ فضا خاموش پھیلی شب کا سناٹا — مناسب وقت ہے دل چاہتا ہے اک فغاں کر لیں

اک کیف تازہ میں ہے اک موج ہے چمن میں — کوثر مرے وطن میں جنت مرے وطن میں

پھیلی ہوئی ہے میری تربت پہ چاندنی سی — یہ داغ عاشقی ہے یا چاند ہے کفن میں
مزدور کو عطا کی معراج عاشقی کی — قدرت شریک نکلی تقدیر کوہکن میں
صیاد اب چمن سے کیا کیجے کنارا — جینا اسی چمن میں مرنا اسی چمن میں

میں نزع میں ہوں مگر وہ ستائے جاتی ہیں — نظر ملا کے ستم بخشوائے جاتے ہیں
شباب ماہ میں وہ جگمگائے جاتی ہیں — حیات عشق کو وحشی بنائے جاتے ہیں
شبا مجھے نگہ بے پناہ سے اپنی — اسی طرح تو فسانے بنائے جاتی ہیں

اب کہیں تیری تمنا کا ٹھکانا بھی نہیں — دیکھ انجام تمناؤں کے ٹھکرانے کا

مرا دل مر گیا تو زندگی کو رو دیگی دنیا — نشاطِ محفلِ ہستی عبارت ہے مرے دل سے

عجب اک چیز ہے انساں کا ہونا بھی نہ ہونا بھی — جہاں آباد ہوتا ہے وہیں برباد ہوتا ہے

سینے میں اپنے میں لئے پھرتا ہوں ایک قبر — تیرے فریب لطف کی برباد کی ہوئی

یہ ثابت ہو رہا ہے انقلاب چرخ امکاں سے — کسی دن قصر آزادی بنے گا خشت زنداں سے

دل کے ٹکڑے آنسوؤں میں بہہ گئے — اب بتا اے حسن ہم کیا رہ گئے

فطرتِ غمناک نے انگڑائی لی
ایک موج آئی سمندر بہہ گئے

کبھی تو نہ غیر سے اگر احوال پوچھ لیتا
جو نہ چارہ ساز تھا تو زمانہ ساز ہوتا

برباد کر کے دے نہ فریب التفات کے
اب ہم تری نگاہ کے قابل کہاں رہے

جب میں نہ تھا تو دل کا تعین محال تھا
جب دل نہ تھا تو آپ کے جلوے کہاں رہے

نمونۂ نظم

تصویرِ حیات کے دو رخ

ہستی و مستی ـــــــــــ عبرت و ویرانی

انقلاب اُف کس قدر عبرت بداماں انقلاب
ذرہ ذرہ خندہ زن ہے اے منظر نمایاں انقلاب

اک طرف ہستی و مستی کی بہاریں موجزن
اک طرف خاموش دنیا غرقِ سیلابِ محن

اک طرف صبحِ چراغاں اور دنیائے بہار
اک طرف تاریکیاں تاریکیوں میں انتشار

اک طرف کچھ قصر کچھ کاخِ بلند و بےنظیر
اک طرف ویرانیاں قیدِ تعین میں اسیر

اک طرف سورج کی تابانی فروغِ زندگی
اک طرف عبرت کا آئینہ اُداسی شام کی

اک طرف شغلِ شبِ مہتاب کی بادہ فروش
اک طرف کچھ ظلمتیں عبرت بکف عبرت بدوش

اک طرف تارے زمیں کی سمت خود ڈھلتے ہوئے
اک طرف خاموش قلعے موت کی گودی ہوئے

آہ ان قلعوں میں رہتی تھیں کبھی آبادیاں
گونجتی تھی ساز کی لے پر فضا جاوداں

صبح کو جلوے نئے تھے شام کے تیور نئے
پیش کرتا تھا شفق کا آئینہ منظر نئے

رات آتی تھی یہاں بن کر مجسم کہکشاں
مسکراتا تھا ہر اک ذرے میں مہرِ ضوفشاں

تھے ضیا افروز اوراقِ کتابِ زندگی
اب کہاں وہ نزہتِ دورِ شبابِ زندگی

تھے یہی قلعے جہاں جھکتا تھا فرقِ آسماں
آج بن کر رہ گئے ہیں مرثیِ نظمِ خزاں

لٹ گئی وہ بزم وہ رنگِ بہارِ گلستاں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا ہندوستاں

اب یہاں عبرت کی ہیبتناکیاں کہلاتی ہیں
مرثیہ خوانِ زوالِ عالمِ ایجاد ہیں

اک طرف ہنگامۂ نو اک طرف عالمِ کہن
اک طرف تابندگی اور اک طرف خوف و ہراس

آہ کیا نظارۂ پُر درد و غم آثار ہے
صدمۂ بےانتہا ناقابلِ اظہار ہے

دیکھ کر ناظرؔ نئی دہلی یہ ویرانے بھی دیکھ
ناز تھا جن پر زمانے کو وہ کاشانے بھی دیکھ

نمونۂ نثر

حسن و جمال کی نادر ترین تصویر، حیاتِ انسانی کی ممتاز ہستی، طاؤسہ اپنے وقت کی ایک ہی عورت تھی۔ وہ اتنی حسین تھی، اتنی جمیل تھی کہ اُسے دیکھنے کے بعد کیفِ نظارہ سے ناظر پر بیخودی سی طاری ہوتی تھی۔ اس کے خداداد حسن کے اثرات کی بنا پر وہ جب اپنی قیمتی اور مرصع موٹر میں بیٹھ کر سیر کیلئے نکلتی تو بازاروں میں ایک حشر برپا ہو جاتا۔ دیکھنے والے ساکت رہ جاتے۔

وہ ایک پارسی کی لڑکی تھی۔ جو ایک تھیٹریکل کمپنی کا مالک تھا اور بےانتہا دولتمند، طاؤسہ کو تھیٹر، سینما اور ایسی ہی دوسری تفریحات سے سخت نفرت تھی۔ اس کا یہ تنفر بڑی حیرت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ اور لوگوں کو تعجب تھا کہ ایک تھیٹر کے مالک کی بیٹی کی فطرت اتنی مختلف کیوں ہے۔ طاؤسہ جتنی حسین تھی اتنی ہی سنجیدہ بھی تھی۔ اُسے کسی نے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا اور وہ کبھی قہقہے لگاتی ہوئی نہیں پائی گئی۔ اور یہ خیال بھی فضول تھا کہ یہ حالت اس کے غمِ دروں کی ترجمان ہو۔ وہ مطلق غمگین نہیں رہتی تھی۔ اور حقیقتاً اسے کوئی غم بھی نہ تھا

کوثرؔ۔ عبدالحمید صاحب اکبرآبادی ۸۰

تلمیذ حضرت منظرؔ صدیقی اکبرآبادی مدیر کنول، آگرہ

آپ کا نام عبدالحمید صدیقی اور کوثرؔ تخلص ہے۔ آپ عبدالعزیز صاحب زعمؔ صدیقی اکبرآبادی مرحوم شاگرد رشید حضرت نثارؔ اکبرآبادی مرحوم کے خلفِ اکبر ہیں

۱۰ جولائی ۱۹۰۸ء بروز چہارشنبہ بمقام بندا گنج آگرہ پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ نقشہ نویسی ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ اُستاد عیسیٰ صدیقی (جن کا مزار ہیوٹ پارک آگرہ کی بیرلین کے پیچھے ہے) کا وطن البانیہ تھا۔ تلاشِ معاش میں آفندی تشریف لائے اور وہاں سے ہندوستان وارد ہو کر شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں بمشاہرۂ الف روپیہ ماہانہ نقشہ نویسی پر مقرر ہوئے تاج محل آگرہ کا نقشہ تیار کیا اور "نادر العصر" کا خطاب پایا۔

کوثر صاحب نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی ۱۹۲۶ء میں مطبع کا کام شروع کیا۔ ۱۹۳۰ء میں کچھ عرصہ کے لئے ملٹری اسٹیٹس آفس میرٹھ سرکل آگرہ میں بحیثیت نقشہ نویس کے کام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں پھر ایک مطبع رفاہِ عام پریس کے نام سے قائم کیا۔ جو بمعیت جناب محمد خلیل صاحب سائرہ آجکل انتہائی ترقی پر ہے۔ آپکے دو بھائی ہیں۔ حفظ القدیر صدیقی اور ظفر المعید صدیقی متعلم تھرڈ ایر سینٹ جانس کالج آگرہ۔

شاعری آپ کو ورثتاً ملی ہے۔ اسکول کی زندگی میں بھی آپ ادبی صحبتوں میں شرکت کرتے تھے۔ ابتدائی دور میں مولوی بشارت علیخاں الہامان آفریدی اکبرآبادی سے اصلاح لی اور اس کے بعد سے برادرِ معظم حضرت منظر صدیقی اکبرآبادی سے اصلاح و مشورہ فرماتے ہیں۔ آپ کا کلام صاف۔ اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ مشاعروں میں بھی کبھی کبھی شرکت فرماتے ہیں۔ نہایت خوش مزاج اور باوضع انسان ہیں۔

نمونۂ تغزل

سوزِ ماضی، فکرِ مستقبل میں ہر فرزانہ ہے ۔۔۔ جس کو جتنا ہوش ہے اتنا ہی وہ دیوانہ ہے

ہر نظر ہے آپکی برہم زنِ ہوش و حواس ۔۔۔ آپ دیوانہ جسے کہدیں وہی دیوانہ ہے

کر گئے کوثر وہ بیخود مجھ کو چشمِ مست سے

اب مری آنکھوں سے پیدا عالمِ میخانہ ہے

دل محبت میں پریشاں ہے یہ کیا انداز ہے ۔۔۔ جانے کس مضراب کا مرہون دل کا ساز ہے

بے نیازِ دو جہاں ہوں میں طفیلِ زندگی ۔۔۔ غم مرا ہمدم ہے اور درد چارہ ساز ہے

بس گئی دنیا اُمید و بیم کی میرے لئے ۔۔۔ اک کرشمہ بن گئی ہستی تری میرے لئے

بے نیازی تیری عادت عجز شیوہ ہے مرا ۔۔۔ بے خودی تیرے لئے اور بیخودی میرے لئے

ہے نفس کی آمد و شد پر مدارِ زندگی ۔۔۔ موت کی تصویر ہے یہ زندگی میرے لئے

جب کبھی صحنِ چمن نے دعوتِ گلگشت دی ۔۔۔ ہر کلی تیرا تبسم بن گئی میرے لئے

اسکی یاد اور شباب اے توبہ ۔۔۔ روح صرفِ عذاب اے توبہ

اُن کا کافر شباب اے توبہ ۔۔۔ عشق کا اضطراب اے توبہ

چاند پر جیسے ابر کا سایہ ۔۔۔ حسن زیرِ نقاب اے توبہ

سو رہی ہیں جوانیاں لاکھوں ۔۔۔ حسن ہے محوِ خواب اے توبہ

دردِ فرقت نے کر دیا مجبور ۔۔۔ ورنہ میں اور شراب اے توبہ

یہ بلا نوشیاں مری کوثر

پی گیا بے حساب اے توبہ

غمِ فراق میں انساں نہ دل لگا رہے ۔۔۔ قرار کی ہے یہ صورت کہ بیقرار رہے

رہے نہ درد ہی باقی خلش ہی رہ جائے ۔۔۔ کوئی تو عہدِ محبت کی یادگار رہے

کچھ اس طرح ہو محبت کے فرض کی تکمیل ۔۔۔ زبانِ شوق پہ ہر وقت ذکرِ یار رہے

چلا تو ہوں رہِ الفت میں ہمتِ دل سے ۔۔۔ بہک نہ جاؤں کہیں ضبط، ہوشیار رہے

ملی نہ دردِ محبت سے بعدِ مرگ نجات ۔۔۔ ہماری خاک کے ذرے بھی بیقرار رہے

حصولِ موجِ حقیقت نہیں محال مگر ۔۔۔ یہ ایک شرط کہ انسان ہوشیار رہے

آپ کا اسم گرامی محمود علی خاں اور ماہر تخلص ہے۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ مگر پچیس ۲۵ چھبیس ۲۶ سال سے دہلی ہی میں مطب کرتے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد نے اسلامی سلطنت کے زمانے میں طبی کمالات کے وہ وہ جوہر دکھائے تھے کہ بادشاہِ وقت نے خوش ہو کر بڑے بڑے منصب اور جاگیریں بخشی تھیں۔ آج بھی حکیم صاحب موصوف نے اپنے فنی کمالات کے ذریعہ ہندوستان والوں کو عموماً اور دہلی والوں کو خصوصاً گرویدہ کر رکھا ہے۔ آپ کا مطب بھی بہت کامیاب ہے۔ اور روزانہ صدہا مریض اس چشمہ سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہو کہ بلا معاوضہ خدمتِ خلق کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ گذشتہ تجربوں سے یہ بات بھی ثابت ہوئی ہے۔ کہ وبائی امراض میں حکیم صاحب خدمتِ خلق کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ پبلک خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے آپ کو "خان صاحب" کا خطاب عطا کیا ہے۔ آپ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے۔ کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مرض کی بہت جلد تشخیص کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کے مطب میں روزانہ دور دور سے مریض آتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دیسی ریاستوں سے بھی آپ کا تعلق ہے۔ ان مصروفیتوں کے باوجود آپ بہت سی طبی اخلاقی اور مذہبی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کتابوں کو جو یونانی اطبار کے بخل کا شکار ہو رہی تھیں۔ آپ منظرِ عام پر لے آئے ہیں۔ آپ نے اپنی تصانیف میں اپنے خاندانی مجربات شائع کرنے کے علاوہ دوسرے اطباء کے خاندانی مجربات بھی حاصل کر کے شائع کئے ہیں۔ آپ کی تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے۔ (۱) بیاضِ ماہر (۲) اکسیر ماہر (۳) جوہر ماہر (۴) صدائے ماہر (۵) مجرباتِ ماہر طبی چٹکلے (۶) تحقیقاتِ ماہر (۷) محافظِ شباب (۸) تعلیمِ شباب (۹) تحفۂ شباب (۱۰) علاج الانسان باجزاء الحیوان (۱۱) رسالہ چائے اور کافی (۱۲) رسالہ سل و دق (۱۳) رسالہ آتشک و سوزاک (۱۴) رسالہ بواسیر (۱۵) سرخ رسالہ چیچک سے نجات (۱۶) رسالہ ہینگ (۱۷) دستور علاج اطبار دہلی۔ (۱۸) معاشرتِ افغانان (۱۹) ابو حنیفہ (۲۰) سلیقہ بیگم، علم الحروف وغیرہ

اخبارات و رسائل میں بھی آپ کو خاص شہرت حاصل ہے۔ آپ کی ادبی اور طبی مضامین اکثر جریدوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ علاوہ نثر نویسی کے آپ ایک کامیاب شاعر بھی ہیں۔ آپ کا ذوقِ شعر گوئی بہت قدیمی ہے۔ آگرہ کے شعر زار سے آپ کو تعلق ہے۔ اس لئے ان تمام مصروفیتوں کے باوجود بھی آپ کا شاعر ہونا عجبات سے نہیں۔ آپ غزل بہت ٹھاٹ سے پڑھتے ہیں۔ یہ سب فیض حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ کا ہے۔ آپ عرصہ سے مولانا مدظلہٗ سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ بیرونجات کے مشاعروں میں آپ کی رباعیاں نظمیں اور غزلیں بڑے ذوق شوق سے سنی جاتی ہیں۔ عنقریب آپ کی رباعیوں اور نظموں کا مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔

نمونۂ تغزل

جب شام غم تصورِ گیسوئے یار تھا — دل کا دھواں بھی سایۂ ابرِ بہار تھا

وعدے کا بھولنا تو نئی تھی نہ کوئی بات — تکلیف یوں ہوئی کہ ترا انتظار تھا

کچھ روز ہم جہاں میں رہے کچھ بہ نامراد — کچھ روز رہتے ہم نہ ہمارا مزار تھا

درماں تھا اس کا کوئی، نہ اس کا کوئی علاج — ماہر عجیب چیز غمِ ہجرِ یار تھا

میکشی یوں مرے ساقی مجھے منظور نہیں
ملتفت آج تری نرگسِ مخمور نہیں

سوز درکار ہے اے حسن مجھے ناز نہیں
پھر تجلی کا مزہ کیا ہے جو دل طور نہیں

سوچتا ہوں کبھی افسانۂ غم ختم کروں
کبھی کہتا ہوں محبت کا یہ دستور نہیں

یہیں منزل ہے، یہیں دیر، یہیں کعبہ ہے
ساری دنیا ہے مرے پاس جو تو دور نہیں

دل تصور میں تو رہتا ہے ترے قدموں پہ
اپنے سجدوں کی نمائش مجھے منظور نہیں

قابلِ عشق کوئی اور جہاں پیدا کر
اس خدائی میں تو یارب کوئی مسرور نہیں

لینے آئی ہیں بہاریں مجھے واپس کر دے
اے جنوں گھر ابھی صحرا سے بہت دور نہیں

ماہرِ فنِ حذاقت ہوں مگر اے ماہر
مجھے معلوم دوائے دلِ رنجور نہیں

کیا روؤں اب فریبِ امیدِ سحر کو میں
ماہر سمجھ گیا نگہِ چارہ گر کو میں

پھیلا رہا ہوں ذوقِ نشاطِ نظر کو میں
اب حسن مضطرب ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

بے اختیار و بے خود و بیہوش و بے خبر
کس شان سے چلا ہوں تمہاری خبر کو میں

ہر خار ہے جنوں میں قدم گیر و پرنواز
یہ حال ہے تو لوٹ چکا اپنے گھر کو میں

آنکھیں جھکا کے بیٹھ گیا انکی بزم میں
سمجھا نظر سے پہلے مآلِ نظر کو میں

اے محتسب نہ توڑ مرا جامِ آتشیں
پیتا ہوں اسمیں گھول کے برقِ شرر کو میں

ہوگی طلوع میرے گریباں سے صبحِ گل
پہچانتا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں

اس درجہ اکتسابِ تجلی کا شوق ہے
اٹھتا ہوں نصفِ شب سے نمازِ سحر کو میں

دنیا سے دور اپنا شوالہ بناؤں گا
لے جاؤں گا اٹھا کے ترے سنگِ در کو میں

ماہر دیارِ نجد میں مجنوں کی قبر پر
جاتا ہوں روز پرسشِ دردِ جگر کو میں

کیوں نہ مٹ جاؤں کہ احساسِ فنا رکھتا ہوں میں
شعلہ و شبنم کا رنگ انتہا رکھتا ہوں میں

غم کے انجام مسرت کا پتا رکھتا ہوں میں
اپنے دل کو اس لئے غم آشنا رکھتا ہوں میں

کرتا جاتا ہے مجھے معراجِ منزل کے قریب
جو قدم راہِ محبت میں بنا رکھتا ہوں میں

اس زمانے میں سخن فہمی کا قحطِ عام ہے
مدعی سے کیا کہوں جو مدعا رکھتا ہوں میں

جن میں اہلیت بغیر برق جل جانے کی ہو
ایسے تنکوں پر نشیمن کی بنا رکھتا ہوں میں

کیا خبر کب آگ ہستی میں لگا دینی پڑے
شامِ غم نالوں کے کچھ شعلے بچا رکھتا ہوں میں

شاد ہوں ہر وقت تحصیلِ مآلِ کار سے
منزلوں کا حاصل اک بوریا رکھتا ہوں میں

حسن کے شعلوں کی خود کرتا ہوں دل میں پرورش
یعنی پروانے سے بڑھکر حوصلہ رکھتا ہوں میں

ماہر مجبور درمانِ جراحت کیا کروں
زخم بن جاتی ہے وہ بھی جو دوا رکھتا ہوں میں

نظروں سے سمجھ لو دلِ مایوس میں کیا ہے
افسانے کا عنوان ہی افسانہ نما ہے

اب عشق کی قسمت نہ وفا ہے نہ جفا ہے
اے حسن کبھی تجھ پہ بھی یہ وقت پڑا ہے

ہے بیخودی و کیفِ خودی مظہرِ انساں
بندا ہے تو بندا ہے، خدا ہے تو خدا ہے

اچھا تو ہوا چھوڑ گئے قافلے والے
اب اپنی ہر اک سانس بھی بانگِ درا ہے

دیکھ آکے بہاریں دلِ صد پارہ کی میرے
سینے میں بنا اک گلِ صد برگ کھلا ہے

دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہوں مائلِ صحت
اور میری یہ حالت کہ دعا ہے نہ دوا ہے

سنتا ہوں کہ تم واقفِ انجامِ وفا ہو
مجھ کو بھی بتا دو مری تقدیر میں کیا ہے

کافر نہ سمجھ مجھ کو جو مایوس ہوا ہوں
جب دل ہو نہ قابو میں تو سجدہ بھی ریا ہے

اب مائلِ تخریب ہے سو رنگ سے فطرت
یہ خاک کو انسان بنانے کی سزا ہے

ہر لحظہ ہوں میں چشم و لبِ دوست کا ناظر
ماہر یہ مرا دورِ اشارات و شفا ہے

نمونۂ رباعیات

گلیوں میں وطن کی پھر کے، نازاں ہونا
گویا جنت میں ہے خراماں ہونا
ہے عرشِ علا پہ سجدہ خوانی ماہر
مینار پہ تاج کے غزلخواں ہونا

قسمت میں تھا کل جو کیف وہ آج نہیں
حاصل مجھے زندگی کی معراج نہیں
کیا دل لگے اس شہر میں ماہر اپنا
دہلی میں سبھی کچھ ہے مگر تاج نہیں

دہلی کی فضاؤں سے یہ شکوا ہے مجھے
ہم صورتِ خاک کس نے پیسا ہے مجھے
اے کاش یہ میری خاک اڑ کر ماہر
ہو آگرے میں دفن، تمنا ہے مجھے

مضطر — محمد عبداللہ صاحب عالم گڑھی — ۸۲

آپ کا نام محمد عبداللہ اور مضطر تخلص ہے۔ موضع عالم گڑھ ضلع گجرات (پنجاب) کے ایک معزز اور متمول خاندان میں یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی آپ کی عمر صرف دو سال ہی کی تھی۔ کہ آپکے والدِ محترم کا سایۂ عاطفت آپ کے سر سے اُٹھ گیا۔ مگر اس سانحۂ عظیم کے باوجود بھی آپ کی پرورش اور نگہداشت میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ آپ کی تربیت اور تعلیم کا انتظام بطور خاص کیا گیا۔ اور آپنے اپنا تعلیمی نصاب امتیازات کے ساتھ پاس کیا۔ دورانِ تعلیم میں آپنے سرکاری وظائف بھی حاصل کئے۔

یہ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہی فوراً لاہور ریلوے اکاؤنٹس آفس میں آپ کو ملازمت مل گئی۔ آج تک آپ وہیں ملازم ہیں۔

اوائلِ عمر ہی سے آپ کو شعر و سخن سے حد درجہ شغف رہا ہے مناظرِ قدرت سے فطری لگاؤ ہے۔ اکثر برسات کی راتیں فطرت کے مطالعے کی نذر ہو چکی ہیں۔ جب آپ چھٹی جماعت میں تھے تو آپ کی ایک قومی نظم جریدہ "لاحول" میں شائع ہوئی۔ اور یہی نظم آپ کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی۔ ملازمت کی مصروفیت نے ایک ایسا انقلاب پیدا کیا کہ کچھ عرصہ تک شعر و شاعری کا ذوق سرد پڑا رہا۔ لیکن پھر احباب کے اصرار سے شوقِ سخن جاری کر دی اسی اثنا میں آپ کی ملاقات حضرتِ احسان دانش کاندھلوی سے ہوئی۔ احسان صاحب نے آپ کو اصنافِ سخن سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرنے کا وعدہ کیا۔ دراصل احسان صاحب کا احسان مضطر صاحب کی شاعرانہ تربیت پر بہت زیادہ ہے۔

۱۹۲۹ء سے آپ استاذ السلطان فصاحت یار جنگ حضرت جلیل مانکپوری کو اپنی غزلیں بغرضِ اصلاح بھیجتے رہے۔ جو ضروری اصلاح کے بعد واپس آتی رہیں۔ اور آپ کو حضرت جلیل سے فیض حاصل ہوتا رہا۔ یہ سلسلۂ فیض رسانی چند وجوہ کی بنا پر زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔

اس کے بعد اگرچہ آپ کا ذوقِ عمل خاموش تھا۔ لیکن نگاہ برابر کسی خضرِ راہ کی تلاش میں تھی ناگہاں بعض رسائل میں آپکی نظر حضرت قبلہ علامۂ مولانا سیماب مدظلہ العالی کے نام پر پڑی۔ ضمیر اور ذوق نے فوراً ذاتی رائے سے مولانا کے حضور زانوئے تلمذ طے کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ یہ ۱۹۳۴ء کے آغاز کی بات ہے۔ آپ نے اپنی درخواست مولانا مدظلہٗ کے پاس بھیجی۔ اور مولانا مدظلہٗ کے سرچشمۂ سخن سے آپ سیراب ہونے لگے۔ آپ کو مولانا سے ایسی دلی محبت ہے۔ جو ارادت مندوں اور عقیدت کیشوں میں بھی کم ہوتی ہے چنانچہ اُن کا یہ ایک شعر ہر پہلو ایک دفترِ عقیدت ہے ؎

مری ہستی پہ تنقیدی نگاہیں ڈالنے والو
میں سیمابی ہوں مجھکو خادمِ سیماب کہتی ہیں

مضطر صاحب ایک جوان ادیب ہیں۔ انتہائی سعید انتہائی سنجیدہ دل میں ملک و قوم کا درد ہے۔ نظم و غزل۔ رباعی۔ افسانے۔ مضامین غرض سب کچھ لکھتے ہیں۔ نصر الادب کی طرف سے اُن کے دل میں ایک ایسا جذبہ ہے جسے وہ ظاہر نہیں کہہ سکتے۔ حقیقتاً مجھے اُن کے خطوط سے حقیقی خلوص کی بو آتی ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ آپ اپنے اُستادِ محترم کا نام دنیا میں روشن کریں گے۔

ابھی تک آپ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ آجکل آپ عہد حاضر

کے مشاہیر شعرا کا تذکرہ "نیازگانِ مشرق" کے نام سے مرتب فرما رہے ہیں
خدا آپ کی مساعی کو کامیاب کرے۔

نمونۂ تغزل

نظر بلند ہر جلوہ گاہ کر نہ سکے — گناہگار تو ہیں، گو گناہ کر نہ سکے
اُنھیں کسی کی محبت کی قدر کیا معلوم — جو ایک لمحہ کسی سے نباہ کر نہ سکے
بڑھا دی قیدِ تعلق کی اور بھی میعاد — کسی طرح وہ مجھے جب تباہ کر نہ سکے
ہمیں گلہ ہے یہ تجھ سے کشاکشِ ہستی — کہ اپنی فردِ عمل پر نگاہ کر نہ سکے
دلِ تباہ کی دنیا سے کھیلنے والے — مرے خیال کی دنیا تباہ کر نہ سکے
کچھ ایسے وقت پہ محشر میں ہم بلائے گئے — کسی کو اپنی وفا پر گواہ کر نہ سکے
گناہ اصل میں اک جزوِ آدمیت ہے — وہ آدمی ہی نہیں جو گناہ کر نہ سکے
بہت ہی اپنا گلستاں میں مختصر تھا قیام — نسیمِ صبح سے بھی رسم و راہ کر نہ سکے

حریمِ حسن سے مضطرؔ حجاب اُٹھ نہ سکا
ہم اک نظر کے برابر گناہ کر نہ سکے

نورِ سحر میں آکے بس ظلمتِ شام سے گزر — آگ سے کھیلتا ہوا جلوتِ عام سے گزر
کردہ نادمِ گئیں، طور کی جس سے وادیاں — برقِ جمال پھر اُسی طرزِ خرام سے گزر
ساقیِ دلنواز کا منتظرِ نظر نہ ہو — پردۂ بیخودی اُٹھا، لذتِ جام سے گزر
رہروِ راہِ عاشقی! منزلِ عشق ابھی کہاں — چاک کر آفتاب کو، ماہِ تمام سے گزر
دیر و حرم ہوں سرنگوں حسنِ نظر فریب سے — کھول کے زلف اس طرح منظرِ عام سے گزر
گلشنِ دہر کی بہار! غیر بہار ہی سہی — مضطرِؔ بیخبر تو اس عشرتِ عام سے گزر

پائمالی سے چمک جاتی ہیں بجذوبانِ عشق — چرخ پر انجم بقدرِ تیرگی روشن ہوئے
ہاں وہی لمحے نشاطِ دو جہاں کی تھی کفیل — آہ وہ لمحے کہ صرفِ نالہ و شیون ہوئے

وفا کی جس قدر رسمیں یادگارِ بیں ہو گئیں ویراں — سجا لا از سرِ نو حسن کا دربار پھولوں سے

کہیں ایسا نہ ہو بلبل پہ ذوقِ سیر کھل جائے — زبانِ غنچہ بن کر کیجئے گفتار پھولوں سے
ارادہ ہے انھیں بزمِ تصور میں بلانے کا — نگاہِ شوق جا اور مانگ لا کچھ ادائیں پھولوں سے
یہ ہنس ہنس کر رہِ تسلیم میں برباد ہو جانا — خدا توفیق دے تو سیکھئے ایثار پھولوں سے

موجِ دریائے محبت میں بہا جاتا ہوں — دُور سے دیکھ رہے ہیں مجھے ساحل والے

دیارِ عیش و عشرت کے مکینو — تمھارا رازِ طشت از بام ہوں میں

اس اسیری پہ بھی میری اک عالم کو ہے رشک — دیکھنے آتی ہیں اکثر مرغِ بستانی مجھے

غم نہ کھا اپنی پائمالی پر — یوں بھی بگڑی بنائی جاتی ہے

جلوے ہر سو دکھائی دیتے ہیں — جلوہ فرما نظر نہیں آتا

سحر کو جب شگفتہ ہر گلِ تر دیکھ لیتا ہوں — کسی گل پوش کی محفل کا منظر دیکھ لیتا ہوں

بس نام اتنی دیر کا فصلِ بہار ہے — گلشن میں جتنی دیر وہ جلوہ فشاں رہے
بربادیِ نصیب کا آخر علاج کیا! — ہم گھر کے باوجود بھی بے خانماں رہے
کر جذب میری قوتِ نظارہ اے جمال — اچھا نہیں حجابِ نظر درمیاں رہے
تو اپنی دھن میں پھول وفا کے کھلائے جا — پھر باغ میں بہار رہے یا خزاں رہے

نقابِ رنگ و بو میں چھپنے والے کیا قیامت ہے — سرِ منزل پہنچ کر لٹ رہا ہے کارواں میرا

ہر اک تدبیر ہے ناکام دیکھا چاہئے کیا ہو — مری آغاز کا انجام دیکھا چاہئے کیسا ہو
ازل سے میکدہ والوں میں جس کا ذکر سنتے ہیں — ذرا پی کر سے گلفام دیکھا چاہئے کیا ہو

مبارک میکشو! پھر ساقیِ ابرِ بہار آیا — سنبھالو اپنا اپنا جام دیکھا چاہیئے کیا ہو

پائے استقلال میں فطرت کی جنبش آگئی — کون اُٹھا آخری فریاد کرنے کے لئے
ہیں سکونِ بیخودی سے دُور یہ دیر و حرم — میکدے میں چل خدا کو یاد کرنے کے لئے
لب پہ آہیں مضطرب، آنکھوں میں آنسو بیقرار — یوں چلا ہوں حسن سے فریاد کرنے کے لئے
میں جسے سمجھا تھا مضطرؔ لطفِ نگاہِ التفات — اک بہانہ تھا مرے برباد کرنے کے لئے

نمونۂ نظم

"مزدور"

دھوپ میں مزدور بیچارہ کی ہے ہونٹوں پہ جان — دیکھئے انجامِ غفلت کوشیِ اہلِ جہاں
محنتِ پیہم سے چہرہ مضمحل، زار و نزار — جھریاں بھیگی ہوئی بالوں میں کچھ گرد و غبار
دلولے مردہ، آرزو بے کیف، آہیں بے خروش — حسرتیں پامال، ارماں منفعل، جذبے خموش
خشک لب، پچکے ہوئے رخسار، پیشانی پہ گرد — خال و خط بے نور، افسردہ نگاہیں رنگ زرد
بھوک کا پروردہ، فاقہ مست، مشتِ استخواں — منزلِ ہستی میں درماندہ غبارِ کارواں
پا برہنہ، تن کی عریانی سے دل میں شرمسار — آستیں کرتے کی گم، جیب و گریباں تار تار
منہمک ہے تندہی سے فرض کی تکمیل میں — جان کی پروا نہیں ہے عزم کی تعمیل میں

درد سے بیگانہ، محرومِ نوائے سوز و ساز — جلوۂ احساس کی تابش سے یکسر بے نیاز
محو کیفیتِ رنگِ سرابِ زندگی — بیخودِ پندار، مخمورِ شرابِ زندگی
مائلِ سامانِ نائو نوش جس کا دل رہے — جان دے آغاز پر انجام سے غافل رہے
چٹکیاں لیتی ہوں جس کے دل میں ارمانِ حیات — جو سمجھتا ہے حصولِ زر کو ایمانِ حیات
جس کا دن کٹتا ہے الوانِ طرب میں بیگماں — شب بسر ہوتی ہے جس کی محوِ شوقِ دلبراں
قہقہے مارے کسی کو خون رلواتے ہوئے — مسکرا دے دیکھ کر جو پھول مرجھاتے ہوئے
لیکن اے ہنگامہ آرائے جہانِ ہست و بود — فصلِ گل کا باغ افسردہ میں ممکن ہے ورود
فطرتِ حسنِ ازل کا اس سے کچھ مقصد بھی ہے — جور و استبدادیت کی کوئی آخر حد بھی ہے
سیلِ دریا ایک ہی جانب کو بہہ سکتا نہیں — ایک حالت پر نظامِ دہر رہ سکتا نہیں
مضطرب ہے پردۂ فطرت میں نیرنگِ شہود — ٹوٹنے کو ہے طلسمِ سحر کا باطل جمود
کائناتِ دہر پہ چھایا ہے رنگِ اضطراب — شورشِ حاضر سے اٹھتی ہے صدائے انقلاب

اب کوئی دم میں قیامت کی سحر ہونے کو ہے
یہ نظامِ زندگی زیر و زبر ہونے کو ہے

محمد عبداللہ صاحب مضطرؔ کی غزل پر حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ کی اصلاح

پلا ایسی پلا اور اسقدر اے پیرِ میخانہ — کہ ہر سو آنکھ میں پھرتی رہے تصویرِ میخانہ
جو ممکن ہو تو سر کے بل چل اے رہگیرِ میخانہ — کہ ہر ذرے پہ ہے اک آیۂ تطہیرِ میخانہ
اٹھا اے ساقی، وہ مغرب سے سحابِ قیر گوں اٹھا — وہ کھڑکا دی کسی لب تشنہ نے زنجیرِ میخانہ
تخیل کیا ہے بیداری کی معنی آفریں صورت — تصور کیا ہے کیفیت نما تصویرِ میخانہ
میں ہر ذرہ سے نوشا نوش کی آواز سنتا ہوں — مری آنکھوں سے دیکھو وسعتِ تعمیرِ میخانہ
ستارے، چاند، سورج، کہکشاں، ارض و سما، گلشن — یہ سب کیا ہیں فقط خال و خطِ تصویرِ میخانہ
یہ کس مے نوش نے سجدے میں آج اپنی جبیں رکھ دی — کہ استقبال کو مجبور ہے خود پیرِ میخانہ
اسی میں اپنے ہوش و دانش کی دنیا بسا لونگا — مجھے کافی ہے مضطرؔ خاکِ دامنگیرِ میخانہ

آپ کا نام محمد لطیف اور موزون تخلص ہے۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی راجہ علی اکبر خان ہے۔ جو علاقہ دار (اعلیٰ جاگیردار) ہیں۔ موضع اسلام آباد چکار ضلع مظفر آباد (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر چوبیس سال ہے۔ آپ کا خاندان "ککہ مسلم راجپوت" کے نام سے مشہور ہے۔ جو ریاست جموں کشمیر میں زمانۂ قدیم سے ایک اعلیٰ خاندان مانا جاتا ہے۔ ضلع مظفر آباد کا بہت سا حصہ اسی خاندان کی جاگیر میں شامل ہے۔ گو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں اس قوم کی گذشتہ عظمت و وجاہت باقی نہیں رہی۔ پھر بھی بحالتِ موجودہ اس خاندان کا وقار مسلّم ہے۔ کشمیر کی قدیم مستند تاریخوں مثلاً راج ترنگی وغیرہ میں اس خاندان کے حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

موزون صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی پر حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے سری نگر (کشمیر) چلے گئے۔ وہاں مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ لیکن اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے دسویں جماعت تک ہی تعلیم حاصل کر سکے۔ پنجابی اور دیگر زبانوں میں آپ کو اردو، فارسی سے خاص شغف تھا۔ عربی بھی بقدرِ ضرورت پڑھی آپ کو بہت چھوٹی عمر سے شاعری کا شوق ہوا۔ لیکن عرصہ تک آپ پنجابی شاعری کرتے رہے۔ اور کچھ عرصہ بعد یہ ذوق پنجابی سے اردو کی طرف منتقل ہو گیا۔ ایک ایسی زبان کی شاعری کو چھوڑ کر جو مادری ہو۔ دوسری زبان کی شاعری شروع کرنا معمولی کام نہیں۔ موزون صاحب نے بہت جلد اس کمی کو پورا کر لیا۔ اردو شاعری کی جب آپ نے ابتدا کی تو رہبری کے لئے آپ نے ۲۰ راگست ۱۹۳۳ء کو اپنی درخواستِ شاگردی حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ العالی کو بھیجی جسے شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ جب سے آپ برابر غزلیں دکھا رہے ہیں اب آپ کے کلام میں بہت زیادہ ترقی ہو چکی ہے آپ کو قومی خدمات میں حصہ لینے کا بھی بہت شوق ہے۔ بہت خلیق اور ملنسار ہیں۔

نمونۂ تغزل

تصوّرات کی دنیا بسا رہا تھا میں — تعینات کے پردے اٹھا رہا تھا میں
سمجھ رہا تھا کہ جلوہ ہے تیرا نظروں میں — جبھی تو چاند سی نظریں چرا رہا تھا میں
بلا ہی کیوں نہ لیا مجھ کو اپنی محفل میں — یہ سب غلط کہ تمہیں یاد آ رہا تھا میں
تجھے خبر ہی نہ تھی اے مرے دلِ برباد — مٹا مٹا کے تجھے کیا بنا رہا تھا میں

نہ یہ حسن نغمہ فروش ہے۔ نہ یہ عشق نالہ طراز ہے
یہ ندائے عالمِ راز ہے۔ یہ صدائے صورِ مجاز ہے
کوئی جستجو نہیں جستجو، کوئی آرزو نہیں آرزو
ہے تعینات سے ماورا یہی ذوقِ عشق کا راز ہے
تو رہینِ منتِ گوش ہے، یہ فریبِ عالمِ ہوش ہے
نہ مغنّی ہے نہ رباب ہے، ترا ذوق نغمہ طراز ہے
میں سناؤں کیا تجھے ہمنشیں کبھی وارداتِ دلِ حزیں
تو نہ سن سکے گا اسے کبھی یہ حدیثِ سوز و گداز ہے
میں خرابِ حسن و وفا نہیں، ہوں تری نگاہ کا شیفتہ
مجھے سرفرازِ نگاہ کر، تری شان بندہ نواز ہے
تری سرد مہریوں نے مجھے، عجب ایک چیز بنا دیا

نہ ہوائے عیش و نشاط ہے، نہ مذاقِ راز و نیاز ہے
یہ ہزار جلوہ طرازیاں، یہ مری نگاہ نوازیاں
یہ کمال آئینہ کا نہیں، یہ کمالِ آئینہ ساز ہے
یہ دل شکستہ کی اک نوا، نو ہے مطربِ طرب آشنا
مرا ساز نوحہ طراز ہے، ترا نغمہ عشرت ساز ہے
مرے ذوقِ عجز طراز نے، کیا راز مجھ پہ یہ منکشف
جو میں بے نیازِ سجود ہوں، یہ کمال ذوقِ مجاز ہے
میں سما ہی جاؤں گا ایک دن، نگہ مزاج شناس ہیں
مرا دل ہی خرمنِ آرزو۔ وہ نگاہِ ذرہ نواز ہے
ہے کلام کیوں ترا بے اثر تجھے آج موزوںؔ کیا ہوا
نہ وہ نغمہ ہے طرب آفریں، نہ حدیثِ سوز و گداز ہے

میں نے مذاقِ عشق میں یک طرح گذار دی
میں نہ خزاں میں تھا ملول اور نہ خوش بہار میں
شمع میں ترا سوز ہے، پھول میں تیرا رنگ و بو
تیری ہی آگ ہے مری ہستیٔ شعلہ بار میں

کس کو مونس جانئے اور کس سے سودا کیجئے
کس کو کہیے آشنا، کس کی تمنا کیجئے
حضرتِ دل اب حیاتِ رفتہ کا احساس کیا
مر کے جی اٹھنے کا پھر ساماں مہیا کیجئے
کون انکی بزم سے نکلا ہے ہو کر سرخرو
اپنی محرومی کا ناحق ان سے شکوا کیجئے
بربطِ ہستی کا زیر و بم ہے گو فردوسِ گوش
ساز کے پردے میں رہ کر سوز پیدا کیجئے
میری تیرہ بختیوں کی انتہا بھی ہو چکی
اب تو ظلماتِ تصور میں اجالا کیجئے
شوق کی گنجائشیں وسعت طلب ہو گئیں
تنگ دامانیٔ دل کو رشکِ صحرا کیجئے
درد ہے بیزارِ ضبط اور عشق ہے پابندِ ضبط
دل کی اس آشفتگی کو یا خدا کیا کیجئے
ہیں یہ سب انکی نگاہِ پرفسوں کی سازشیں
درد کو کیا کیجئے اور عشق کو کیا کیجئے
تارکِ منزل ہوئے کیوں تھک کے موزوںؔ عشق میں
اک تڑپ اک سوز دل میں اور پیدا کیجئے

جناب راجہ محمد لطیف خاں صاحب موزوںؔ کی غزل پر حضرت مولانا سیمابؔ ظلّہٗ کی اصلاح

کس لیے اے قیس تو پھرتا ہے محمل کے قریب
لیلیٔ مقصود پنہاں ہے ترے دل کے قریب

سے تھا ہیں
تیری پردہ داریوں نے رکھا محروم نظر
تو چھپا بیٹھا تھا میری آنکھ کے تل کے قریب

کہیں
تھا حجابِ کم نگاہی حائل اپنی راہ میں
شاہدِ مقصودِ ہستی تھا مرے دل کے قریب

سا روز اٹھتا
دیکھ کر ارزانیٔ جنسِ محبت ہمنشیں
اک شرر سی بھڑک اٹھتی ہے مرے دل کے قریب

زندہ باد اے کاوشِ دردِ محبت زندہ باد
ایک ہنگامہ سا رہتا ہے مرے دل کے قریب

مرحبا شوقِ وصال
کھچتا
مرحبا ذوقِ شہادت تجھ پہ صد تو مرحبا
خود ہی کھچا جا رہا ہوں کوئے قاتل کے قریب

نامرادی دیکھیے ان رہروانِ شوق کی
کارواں لٹ جائے جن کا آ کے منزل کے قریب
تیرہ بختی ہو رہی ہے میری رخصت کے لیے
شمع نور روشن ہو رہی ہے محفل دل کے قریب
ادا
تیرہ بختی آج رخصت ہو رہی ہے دل سے
ہو گئی روشن شمع محفل دل کے قریب

تم بھی موزوںؔ ان نگاہوں کے کرشمے دیکھ لو
دیکھ لو تم بھی اے موزوںؔ ان نگاہوں پر ذرا

کیا کیا
رقص کرتی ہیں وہ دیکھے آج بسمل کے قریب

آپ کا تاریخی نام مظہر الدین اور مظہر تخلص ہے۔ آپ کے والد محترم حضرت مولانا نواب دین صاحب "فاتح قادیان" پنجاب کے مشہور و معروف علما اور مناظرین میں سے ہیں۔ آپکی پیدائش ۱۳۳۲ھ میں بمقام تلکوہا ضلع گورداس پور (پنجاب) ہوئی۔ آپ کا آبائی وطن رام داس ضلع امرتسر ہے۔ ابتداً آپ کی تعلیم کے لئے آپ کے والد ماجد نے مولانا عبدالرزاق صاحب رام پوری کو مقرر کیا۔ اور آپ نے بارہ سال کی عمر تک مولانا موصوف ہی سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں آپ کے والد بزرگوار اپنے وطن مالوف رام داس تشریف لے آئے۔ اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جب یہاں سکونت اختیار کئے کچھ عرصہ گذر گیا۔ تو ریاست پٹیالہ کے مشہور تاجر شیخ فیض الحسن صاحب مع اپنی اہلیہ محترمہ کے آپ کے والد صاحب کی زیارت کے لئے رام داس تشریف لائے۔ شیخ صاحب کی اہلیہ محترمہ جو حافظ قاری اور حاجی ہونیکے علاوہ شعر و سخن سے بھی انتہائی ذوق رکھتی ہیں مظہر صاحب کو کلام پاک حفظ کرانے کے لئے اپنے ساتھ پٹیالہ لے گئیں۔ اور آپ نے اُن سے ایک سال میں کلام پاک حفظ کر لیا۔ پھر رام داس آکر مولوی فضل الرحمٰن صاحب خطیب جامع مسجد سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ مگر مولانا موصوف کا ۱۹۳۲ء میں انتقال ہو گیا۔

۱۹۳۳ء میں آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے اتبک آپ کو اپنے شعری رجحانات پر زیادہ وقت دینے کا موقع نہ ملا تھا۔ دیوبند آنے کے بعد جب آپ کو تعلیم کی طرف سے اچھی طرح اطمینان ہو گیا۔ تو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ گو آپ عرصہ سے شعر کہہ رہے تھے۔ لیکن طبیعت اصلاح طلب تھی۔ اور آپ کسی باکمال استاد کی تلاش میں تھے۔ آپ کی نگاہِ انتخاب نے حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کو چن لیا۔ اور ۱۹۳۳ء سے آپ سلسلۂ "سیمابیہ" میں شریک ہو گئے۔ اختتام سال کے بعد جب آپ گھر واپس آئے تو آپ کے والد نے آپ کو حزب الاحناف ہند لاہور میں داخل کرا دیا۔ اور آپ ہنوز وہیں تعلیم پا رہے ہیں۔

آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ نے اپنے شہر رامداس کی دلفریبی کے متعلق ایک فارسی مثنوی میں اس طرح لکھا ہے۔

چہ رامداس شہرے چہ رامداس نام — بحسنش بود معترف خاص و عام
بیک جانبش جائے دریا گرفت — بیک جانبش بوستاں جا گرفت
بگردش نظر کن کہ آبِ رواں — روانست چوں خامۂ شاعراں
ندیدی گر ایں خطۂ خوشنما — بیا بنگر امروز ایں شہر را

آپ کے اردو کلام میں بھی جاذبیت اور رنگینی ہے۔ بہت آزاد خیال اور آزاد روش نوجوان ہیں۔ جس ماحول میں آپ نے پرورش پائی ہے اس کا اقتضا تو یہ تھا۔ کہ آپ یکسر خشک ہو کر رہ جاتے ــــ لیکن ایسا نہیں ہوا

نمونۂ تغزل

اسکی صوتِ لحن اقربِ جاگزینِ گوش ہے — آشنائے پردہ ہوا مجھ سے کہ اب روپوش ہے
تیری محفل میں یہ کیسا شغلِ نا و نوش ہے — کوئی بیخود، کوئی دیوانہ، کوئی مدہوش ہے
جس کے اک جلوے سے امکاں کی فضا بیہوش ہے — وہ تصور میں ہماری زینتِ آغوش ہے
ماجرائے دردِ دل کس کو سنائیں ہمنشیں — انجمن میں کون ایسا ہے کہ جسکو ہوش ہے

آپ مظہر کو نہ سمجھیں فارغِ عقل و حواس
جتنا وہ بیہوش ہے اتنا ہی اُس کو ہوش ہے

مریضِ عشق کا جینا تو غیر ممکن ہے — کہو کہ زحمتِ درماں نہ چارہ ساز کرے
شبِ وصال وہ سنتے ہیں ماجرائے فراق — میں کہہ رہا ہوں خدا عمرِ شب دراز کرے
میں ہم صفیرِ سگِ آستانِ احمد ہوں — خدا جہاں میں نہ کیوں مجھ کو سرفراز کرے
رسائی اسکی جو ہو جائے کوئے جاناں تک
گداگری پہ بھی مظہر ہزار ناز کرے

فنا کے بعد بھی دل کو ہے اُسکی جستجو باقی — رہی جسکی محبت میں نہ کچھ بھی آبرو باقی
مرے مٹنے کا کیوں اس عالمِ فانی میں چرچا ہے — سبھی مٹنے کو ہیں اک دن رہیگی ذاتِ ہو باقی
ٹھہرے دل ابھی موقع نہیں مایوس ہونیکا — ابھی تو بزم میں ہے گردشِ جام و سبو باقی
نمازِ نعشِ مظہر میں ابھی جلدی نہ فرماؤ — ابھی تو خون سے قاتل کو کرنا ہے وضو باقی

وہ گرنا برق کا وہ آشیاں کا خاک ہو جانا — قفس میں اب بھی آتا ہے خیالِ آشیاں کیا کیا
مجھے غیرت رہینِ بخیہ گر ہونے نہیں دیتی — جنوں میں گرچہ تنگِ پیرہن ہے جسم و جاں کیا کیا

یہ کانٹوں پہ مرا خوں اور پھولوں پہ ترے گنو — ہوئی ہیں تری الفت میں مری رسوائیاں کیا کیا
کسی بے مہر نے شاید کیا تھا یاد اے مظہر
بوقتِ جاں سپردن میں نے لی ہیں ہچکیاں کیا کیا
محال ہے مرا ایفائے عہد تک جینا — تمہارے وعدۂ فردا میں کچھ کلام نہیں

تو دل میں جلوہ گر ہے اس لئے دل عرشِ اعظم ہے — مکانوں کی فقط توقیر ہوتی ہے مکینوں سے

اک عمر سے رہی ہے ہماری شریکِ غم — ہم خوب جانتے ہیں شبِ انتظار کو
رہنے لگا ہوں صد گل و صد گلستاں بدل — نظروں میں جذب کر کے عروسِ بہار کو
اے لالہ زارِ حسن محبت ترے بغیر — مظہر خزاں سمجھنے لگا ہے بہار کو

نمونہ فارسی

در باغ صبح دم چو گذر آں نگار کرد — گل پیرہن ز جوشِ جنوں تار تار کرد
آں سنگدل حکایتِ غم چوں ز من شنید — مانندِ ابر گریۂ بے اختیار کرد
پنداشتم کہ ساکنِ خلدِ بریں شدم — بختِ رسا چو مدفنِ من کوئے یار کرد
مظہر چہ پرسی از دلِ بیچارۂ فراق — بے کس چناں تپید کہ آخر قرار کرد

آپ کا نام گور بخش سنگھ اور مخمور تخلص ہے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سردار کبیر سنگھ ہے۔ آپ ایک متمول راجپوت خاندان کے فرد ہیں۔ آبائی پیشہ سوداگری ہے۔ آپ دیوالی کے دن ۱۹۱۵ء میں بمقام جالندھر پیدا ہوئے۔

گو آپ نے تجارتی ماحول میں آنکھ کھولی تھی لیکن تعلیمی ذوق و شوق فطرتاً لے کر آئے تھے۔ اس لئے آپ کو ہائی اسکول میں حصولِ تعلیم کے لئے داخل کرا دیا گیا۔ آپ نے بہت جلد اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر کالج کی زندگی میں سانس لی۔ طبیعت میں تعلیم کی طرف سے خاص لگاؤ تھا اس لئے دوسرے مشاغل کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ کالج پہونچنے کے بعد علم عروض پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور آخر کار اُسکی تکمیل کر کے چھوڑی۔ مختلف اساتذہ سے فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بی۔ اے تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ کورس کی کتابوں کے علاوہ ادبی رسائل کتب بھی مطالعہ میں رہیں۔ جن کی وجہ سے دماغ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو گئی جس نے سوئی ہوئی شعری قوتوں کو بیدار کر دیا۔

آپ کو بچپن سے ہی شعر و شاعری سے رغبت تھی۔ شعرا کا کلام سننے کا اس قدر اشتیاق تھا کہ دور و نزدیک اگر کوئی "محفلِ مشاعرہ" ہوتی تو آپ اس میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ آپ شعر فہمی سے شعر گوئی پر اتر آئے۔ بارہ سال کی عمر سے آپ نے شاعری سے دلچسپی لینی شروع کی۔ کالج کی زندگی کے بعد جب آپ کو وقت اور فرصت ملی تو آپ اس طرف اپنا وقت صرف کرنے لگے۔ زمانۂ تعلیم میں آپ جو غزل کہتے تھے وہ مقامی اساتذہ کو دکھانے کے بعد مشاعرہ میں پڑھ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ ذوقِ شعری کے ساتھ معیار میں بھی رفعت پیدا ہوئی۔ تکمیلِ ذوق کے لئے مختلف اساتذہ کو اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجا۔ لیکن آپ کی تسلی نہ ہوئی۔ آخر آپ کی تجسس آمیز نگاہوں نے قصر الادب کا حصار کیا۔ اور ۱۸ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو قبلۂ معظم حضرت علامہ مولانا سیماب مدظلہ کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ طے کر لیا۔ آپ مولانا مدظلہ کی اصلاح سے اس درجہ مطمئن اور مسرور ہیں کہ اصلاح کا ایک ایک نقطہ آپ کے لئے وجدان آفریں ہوتا ہے۔ عقیدت اور ارادت کا یہ عالم ہے کہ اگر مولانا مدظلہ کی خیریت معلوم نہیں ہوتی تو آپ بےچین رہتے ہیں۔ جب سے آپ مولانا مدظلہ کے شاگرد ہوئے ہیں آپ کی شہرت اور کلام کے معیار میں ایک زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔

آپ مقامی "بزمِ شعر" کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ آپ کا کلام اکثر ایجوکیشنل گزٹ "شاعر" "زمیندار" "ملاپ" "پرتاپ" اور دیگر رسائل و اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ نثر بھی لکھتے ہیں۔ کئی افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں خوب کہتے ہیں۔ کلام میں زور اور سلاست ہے۔ دن کا بیشتر حصہ آپکا مطالعے میں گذرتا ہے۔ آجکل ایک ڈرامہ "نیک انسان" لکھ رہے ہیں۔

نمونۂ تغزل

کلی کلی کی جراحتوں سے جمال ہے بےنقاب تیرا
بہار کی تازگی سے پیدا ہے عنفوانِ شباب تیرا

مری نگاہیں تو دیکھ لیتی ہیں ذرّے ذرّے میں تیرا جلوہ
وسیع کرتا ہے میرے ذوقِ نظر کو شوقِ حجاب تیرا

یہ میری ہی سرد مہریاں ہیں جو مجھکو برباد کر رہی ہیں
جو میری غفلت نہ حد سے گزرے تو کیوں ہو نزولِ عذاب تیرا

شراب سے بے نیاز ہوتے ہوئے بھی مخمور بادہ کش ہے
ہوا ہے تحلیل اسکی رگ رگ میں کیفِ حسنِ شباب تیرا

نعت

جلوہ اُس کا خورشید میں ہے، نور اُس کا چاند اور تاروں میں
جس کو درسِ توحید ملا تاریک اور تنہا غاروں میں
وہ پھول کہ جس کے کھلتے ہی خوشبو پھیلی گلزاروں میں
اک بادِ عنبر بیز چلی میدانوں میں کہساروں میں
جو آپ کے سادہ لفظوں میں گیرائی اور دل دوزی تھی
وہ توڑ نہ تھا پیکانوں میں، وہ کاٹ نہ تھا تلواروں میں
پیغامِ خدا دینے والا وہ آخری اک پیغمبر تھا
فطرت کے شاہ سواروں میں وحدت کے علمبرداروں میں
وہ مہرِ منور جب چمکا سب کفر کی ظلمت دور ہوئی
پابوس ہوا قصرِ کسریٰ بارش ہوئی آتش زاروں میں
داعیِ مساواتِ عالم، حامیِ مساکیں، شاہِ امم
ناداروں میں نادار رہا سردار رہا سرداروں میں
اے ساقیِ روم و شام و عجم، اے ماہِ مدینہ مہرِ حرم
ہے تشنہ لبِ الطاف و کرم مخمور ترے میخواروں میں

معراجِ عشق منزلِ عجز و نیاز ہے
مغرور جو نہیں ہے وہی سرفراز ہے
اپنا دلِ شکستہ ترے پاس لائے ہیں
سنتے ہیں ہم نظر تری آئینہ ساز ہے
لے کر تمہارا نام تمہیں یاد کر لیا
اب تو یہی طریقِ ادائے نماز ہے
مجھ سے تو آج تک یہ معمہ نہ حل ہوا
پہلو میں تیرا درد ہی یا چارہ ساز ہے
محسوس ہو رہا ہے جنوں کا اثر مجھے
آب و ہوائے میکدہ دیوانہ ساز ہے
مخمور رہ کر شکوۂ تشنہ لبی ہو کیوں
انکی نگاہِ مست تو میخانہ ساز ہے

مذاقِ آہ و فغاں سے تو اجتناب نہیں
مگر مآلِ فغاں کیا جو مستجاب نہیں
جو آگ دل میں لگی ہے بجھاؤں کیوں اسکو
تری نگاہ کی تفریح ہے عتاب نہیں
مقابلہ نہ ہو جس کا نئی مصیبت سے
وہ عشق خام ہے وہ عشق کامیاب نہیں
نگاہِ مست کا طالب ازل سے ہوں مخمور
مذاقِ عشق تشنۂ شراب نہیں
نالہ وہ کر جو ابھی صورِ قیامت ہو نکے
آہ وہ کھینچ جو برہم کنِ محفل ہو جائے

مری دنیائے دل میں اک قیامت کر گیا برپا
وہ پہلی مرتبہ ملنا ترا درد آشنا ہو کر
پڑا رہنے دے تو یا قتل کر دے تیری مرضی ہے
کہاں جا کر رہونگا میں ترے در سے جدا ہو کر
غریب و بینوا مخمور تو ہے بیضرر الناس
تمہیں نقصان کیا پہونچائیگا تم سے خفا ہو کر

رہتے ہیں جلوہ گر وہ نگاہوں کے سامنے
مجھ سے مرا طریقِ عبادت نہ پوچھئے
میرے لئے بہار قیامت سے کم نہیں
ہے آجکل جو رنگِ طبیعت نہ پوچھئے
وہ مفت مے پلاتے ہیں جب چشمِ مست سے
مخمور سے پھر اُن کی عقیدت نہ پوچھئے

غرورِ اب نگہِ حسن پر نہیں ہے مجھے
نصیبِ دردِ جراحت اثر نہیں ہے مجھے
وہ راز دار ہے میرا وہ رازِ دل ہے مرا
نہیں ہے داورِ محشر کا ڈر نہیں ہے مجھے
مجھے تلاش جنوں کی ہے یا جنوں کو مری
میں راہبر ہوں کہ رہرو خبر نہیں ہے مجھے

دادخواہی کا خدا سے تو یقیں ہے مجھ کو
نہیں منظور مگر تیرا پشیماں ہونا
کرے شاید نہ گوارا دلِ دشوار پسند
نئی مشکل مری مشکل کا ہے آساں ہونا
ساری دنیا مجھے ویران نظر آتی ہے
کیا قیامت ہے مرا بے سروساماں ہونا

رنگین اک فسانہ لکھوں نوکِ خار پر
خوں ریز میرے پاؤں کے چھالے ہوئے تو ہیں
مل جائے ہم کو منصبِ آدم تو کیا عجب
محفل سے اُسکی ہم بھی نکالے ہوئے تو ہیں

میکدے پر چھاگئی رحمت گھٹا کی بھیس میں — آج شاید پھر کوئی میکش پشیماں ہوگیا

تھی آرزو کہ مانگیں گے کچھ کیفِ دلنواز — لیکن جواب دے گئی ہمت سوال کی

مخمورؔ اس زمانے میں ملتی نہیں نظیر

سیمابؔ خوش بیان و عدیم المثال کی

دل میں پہلے کچھ مذاقِ سوز پیدا کیجئے — پھر کسی کے غم میں جلنے کی تمنا کیجئے

جب نہیں رہنا گلستاں میں ہمیشہ کیلئے — برق کا خوف اور فکرِ آشیاں کیا کیجئے

سرد پڑتا جا رہا ہے جوشِ خونِ آرزو — اسمیں پھر گرمی نگاہِ ناز سے پیدا کیجئے

اہلِ وحشت کو کہاں بخیہ گری کی فرصت — وہ تو ہشیار ہیں دامن جو سیا کرتے ہیں

اپنے مسکن سے محبت ہی انھیں بھی آخر — کیوں ہمیں لوگ نشیمن سے جدا کرتے ہیں

شکریہ اُن کی نوازش کا ہو کیونکر مخمورؔ

جب وہ کرتے ہیں کرم حد سے سوا کرتے ہیں

اہلِ جنوں کا حشر تھی دنیائے رنگ و بو — جتنے ملے بہار میں آشفتہ سر ملے

اے راہ گیرِ نجد یہ تیرا سفر بخیر!! — کہنا مرا سلام "محبت" اگر ملے

کھینچی جو آہ جل گیا اپنا ہی آشیاں — کی تھی دعا کہ نالوں کو یارب اثر ملے

مخمورؔ کیا اُسے ہوسِ جام و بادہ ہو

قسمت سے جس کو روز شرابِ نظر ملے

کاش پہلے ہی سے ہوتا ناتواں پائے طلب — ضعف سے جب گر پڑا تھک کر تو اُنکا در ملا

قدر اپنے اضطرابِ دل کی کچھ مجھ کو ہوئی — ذرّے ذرّے میں مجھے جب اک دلِ مضطر ملا

ہر داغِ لالہ جلنے لگا صورتِ چراغ — ہم جا کے نالہ کش ہوئے جس لالہ زار میں

میں غیر موجودگی میں اُسکی ہزاروں باتیں بنا رہا ہوں

ابھی وہ آجائے تو فقط اک سوال ہی لاجواب کردے

کچھ نہ کچھ تو یہ جنوں میرا بنا دے مجھکو — خاکِ صحرا ہی سہی حاصلِ صحرا نہ سہی

جسم و جاں قلب و جگر سب ہیں لیا کیا ہے — سب تمہارے ہی سہی کوئی ہمارا نہ سہی

اپنے ہی سوزِ محبت سے بھڑک اٹھیں گے — گر نہیں برق فزا دل ترا جلوہ نہ سہی

آنکھوں آنکھوں میں ہی پی لیں گے خوشی سے مخمورؔ

آج ساغر نہ سہی آج پیالا نہ سہی

یہ بجلیاں تھیں کہ جلوہ دکھا گئے ہو تم — اک آگ سی مرے دل میں لگا گئے ہو تم

تمہاری یاد میں رہنا نماز ہے میری — مرے جہانِ تصوّر پہ چھا گئے ہو تم

تہِ صحنِ چمن کی خاک غنچے گل فشاں ہو کر — محبت میں سکوں ملتا ہی شاید رائیگاں ہو کر

سُنے بانگِ درا کچھ دیر تک سویا ہی اٹھ بیٹھے — اٹھا جب میں تو اٹھوں گا امیرِ کارواں ہو کر

جوانی کیا ہے آفت ہے مصیبت ہے تباہی ہے — تمہیں کیا ہم بھی لاکھوں الجھنوں میں ہیں جواں ہو کر

دنیا کو محبت میں ہے کیوں غم کی شکایت — مجھ کو تو محبت میں کبھی غم نہ ہوا تھا

سنگِ درِ کافر پہ ہوا ناصیہ فرسا — وہ سر جو کبھی پیشِ خدا خم نہ ہوا تھا

مخمورؔ وہ دل ہے مری آہوں سے پریشاں

جو کاوشِ غم سے کبھی برہم نہ ہوا تھا

ذوقِ نظر ابھی ترا حسن آزما نہیں — جلوہ نما وہی ہے جو جلوہ نما نہیں

رہرو جہاں گرے تو وہی ہے مقامِ دوست — لیکن یہ جانتے ہوئے گرنا روا نہیں

شمع کا کام جلانا ہے جلا دیتی ہے — اس کو کیا تربتِ پروانہ بنے یا نہ بنے

داغِ دل تو ہی ضیا افروز ہو — کچھ شبِ غم میں اُجالا چاہئے

کر چکے مخمورؔ ہم اقدامِ عشق

اب مآلِ کار دیکھا چاہئے

نمونۂ نظم

کیفیتِ روزگار

(سانیٹ)

آگ لگی ہے چار سو عالمِ ممکنات میں
بحر میں انتشار ہے کوہ کو اضطراب ہے
شرخ دفورِ غیض سے چہرۂ آفتاب ہے
وقت سا پیرِ کہنہ بھی مائل انقلاب ہے
حربۂ فتنہ و فساد دہر میں کامیاب ہے
آئے گا سخت زلزلہ کارگہِ حیات میں

جنگ و جدل پسند ہیں اہلِ جہاں کو آجکل
قومیں ہیں آج منہمک جنگ کے اہتمام میں
جوش بھی دیدنی ہے جذبۂ انتقام میں
ملک ہیں سب پھنسے ہوئے حرص و ہوس کے دام میں
ذہن ہیں خاص و عام کا محو خیالِ خام میں
ذریع البشر کی عقل پر آج ہے خندہ زن اجل

ظلم و ستم کے ہاتھ میں آج ہے انتظامِ دہر
صاحبِ زر کے ہاتھ میں قوت و اختیار ہے
ہے یہی پاسبانِ قوم گرچہ سیاہ کار ہے
ملک کا گلہ بان کساں مفلس و لنگار ہے
بندۂ بدنصیب کا فاقہ کشی شعار ہے
نیک خصال محنتی آدمی ہے شکارِ قہر

ملک میں اب تمدنِ کہنہ کا ذکر تک نہیں
طرزِ معاشرت نئی اور نیا نظام ہے
اب نہ وہ پہلی صبح ہے اب نہ وہ پہلی شام ہے
بندۂ حرص و آز کا آدمی جس کا نام ہے
بھول چکی ہیں عورتیں جو کہ انکا جو کام ہے
کام ہے سیر و عیش سے بچوں کی فکر تک نہیں

ہے جو یہ دورِ انقلاب خیر نہیں جہان کی
اُٹھے گی آگ یہ زمیں برقِ فلک گرائے گا
آپ خموشِ بحر بھی جوش پہ جوش لائے گا
دور نہیں ہیں اب وہ دن وقت وہ جلد آئیگا
بھائی جب اپنے ہاتھ سے بھائی کا خوں بہائیگا
سوئے رہے تو اب بھی ہم ہوگی نہ پھر سحر کبھی

جناب گوربخش سنگھ صاحب مخمورؔ جالندھری کی غزل

حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ العالی کی اصلاح

جسے ڈھونڈا کیا وحشت زدہ ہو کر بیاباں میں
اُسے موجود پایا میں نے اپنے چاکِ داماں میں

ہر اک ممکن فضیلت اس کو ہے
~~فضیلت سب حاصل ہے~~ اسے مینائے امکاں میں
خدا جانے وہ ایسی کونسی خوبی ہے انساں میں

خدا گر باد سن لے گا
~~کوئی~~ پھیر کے گا کس کی امداد کا دکنا سے
دعا کرنا خدا اور ڈال دی کشتی کو طوفاں میں

اگر
تعجب کیا جو اس سے ہی طلوعِ صبح محشر ہو
نہاں خورشید ہیں لاکھوں ہمارے
~~کہ لاکھوں عبر افشاں~~ ہیں داغ پنہاں میں

ہنسنا اس کا رونا ہے نہ ہنسنا اس کا ہنسنا ہے
~~ہنسو~~ تھی کبھی دیکھا ~~نہ ہنستی ہی کبھی پایا~~
الٰہی آگ لگ جائے دلِ افسردہ ساماں میں

ہوا جذب
وہیں کا ہو لیا مجھ کو جنونِ فتنہ ساماں نے
ارادہ تھا اٹھا لاؤں بیاباں کو گلستاں میں

مجھے تو ہوش ہے اتنا تجھے جب میں نے دیکھا تھا
تو اک بجلی سی کوندی تھی مرے قلبِ پریشاں میں

اگر بے پردہ ہو جائیں
لگا دیں آگ عالم میں ~~تڑپ کر جو بگلیں~~
وہ نغمے اے مغنی جذب ہیں سازِ رگِ جاں میں

وہ دل تھامے ہوئے جو گئے میرے پاس بیٹھے
~~کسی کی جو نہ سنتی تھی~~ ~~ہو بیٹھے~~
کشش ایسی ہی تھی کچھ میرے افسانے کے عنواں میں

فغاں کرتے ہوئے
~~دفعتاً کسی کے~~ مرا ہونا قیامت تھا
کہ اک لرزش سی ہے اب تک درو دیوارِ زنداں میں

نفس کی آمد و شد سے مجھے احساس ہوتا ہے
لرزاں ہے
کوئی آتش نوا مطرب ہے نغمہ زن رگِ جاں میں

مسلماں ہوں مگر اک شوخ کافر سے محبت ہے
مدد ملتی ہے ذوقِ عشق سے تکمیلِ ایماں میں

تصور کو مبارکباد دی اے ذوقِ نظارہ !!
~~ملا سکتا ہوں اسی نظر اس واسطے ہو دم~~
جھلک اپنی نظر آنے لگی تصویرِ جاناں میں

سرخوش ہو
نگاہوں میں نگاہیں ڈالکر مخمورؔ تو پی جا
بہت
~~بھری~~ ہے نشۂ آور مے نگاہِ مستِ جاناں میں

منظر ۱۰۶

سیّد منظور احمد صاحب رضوی بھوپالی

آپکا تاریخی نام سید منظور احمد اور منظر تخلص ہے۔ آپ بمقام قصبہ گنگہ ریاست بھوپال میں ماہ محرم الحرام میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد کا اسمِ گرامی مولوی محمد علی ہے۔ آپ صحیح النسب سید ہیں۔ خاندانی اعتبار سے آپ کا درجہ بہت بلند ہے۔ آپ کے خاندان پر سید ہونے کا اور آپ پر ماہِ ولادت کا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ نتیجتاً آپ اور آپ کے گھر کے تمام افراد تمام عمر انتہائی پریشانی اور نکبت و افلاس کے شکار رہے ہیں۔

منظر صاحب کو کلام پاک کی تعلیم آپ کے والدِ محترم ہی نے دی فارسی تعلیم کے حصول کے لئے آپ کو مولوی عبدالقادر صاحب اور مولوی عبدالغفور صاحب بھوپالی کے سپرد کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ ان بزرگوں سے تعلیم حاصل کر کے مدرسۂ سبحانیہ بھوپال میں منشی فاضل کے کورس کی تکمیل کی۔ بوجوہ آپ اس سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے اور ۱۹۲۲ء میں پولیس میں ملازمت کر لی۔ لیکن وہ بھی بعض واقعات کی بنا پر ترک کر دی اور گھڑی سازی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ کے خاندان میں اس فن کو غلامی کا درجہ حاصل ہے۔ گویا آپ کا پورا خاندان معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر اس فن کا ماہر ہے۔ آپ نے مختلف مقامات پر اپنی ذاتی دوکانیں قائم کر دی ہیں۔

آپ کو شاعری کا ذوق بچپن سے ہے۔ آپ کی آغازِ شاعری کا ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ جب آپ کی عمر بارہ سال کی تھی اور آپ کی ہمشیرۂ مرحومہ جو آپ سے صرف ایک سال چھوٹی تھیں اور آپ کے ہی ساتھ تعلیم پا رہی تھیں۔ شب برات کے دن ایک طباق میں میٹھی ہوئی حلوہ کھا رہی تھیں۔ اتفاق سے آپ کے چچا صاحب تشریف لے آئے اور مذاقاً حلوے کا طباق اپنے سامنے رکھکر حلوہ کھانا شروع کر دیا۔ اُس وقت آپ کی مرحوم ہمشیرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک شعر برجستہ کہا ۔

رکھا سامنے اپنے سارا طباق   چچا ہوکے کرتے ہو ایسا مذاق

آپکی ہمشیرہ کا یہ شعر کہنا اور آپ کے چچا صاحب کا انعام دینا آپ کے لئے تازیانہ ہو گیا۔ اُس دن سے آپ نے دن رات شعر کہنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر خاموش ہو رہے ۱۹۲۲ء میں آپ کو احساس محبت نے گرمایا۔ دل میں سوز کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ اور ایک نگاہِ شاعر گرنے بغیر محنت و توجہ آپ کو شاعر بنا دیا اور آپ بے ساختہ شعر کہنے لگے۔ لیکن اصلاح کے لئے کسی مصلح کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی پہلی غزل حبیب احمد صاحب افق امروہوی کی خدمت میں پیش کی جس کے دو شعر مع اصلاح یہاں دئے جاتے ہیں۔

کیا کروں

اُن سے ملنے کی بن آتی کوئی تدبیر نہیں   ~~[illegible] ہے~~ میری موافق مری تقدیر نہیں

کیوں جگر تھامے ہوئے آپ چلی آتی ہیں

~~[illegible] کی دنیا کہ ہے [illegible]~~   پھر تو کہئے کہ تری آہ میں تاثیر نہیں

کچھ عرصے کے بعد آپ کو مشاعروں میں شرکت کرنے سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ حضرت افق دور تھے۔ اور وقت پر اصلاح شدہ غزل کا ملنا مشکل تھا اِس خیال سے آپ حضرت سرشار کسمنڈوی (جو بھوپال کے علاقۂ دیلوری میں مقیم ہیں) کی طرف رجوع ہوئے۔ دو شعر حضرت سرشار کے اصلاح شدہ بھی دئے جاتے ہیں۔

غم نے طاقتِ   ہجر نے گھبرا کے

مذاقِ ضبط ~~نے کھوئی~~ آہ و فغاں کھو دی   مریضِ غم ~~نے اک ہچکی~~ میں جانِ ناتواں کھو دی

یہ تم نے کیا کیا تم ہر پرستش کیوں چلے آئے

~~چلے آئے عیادت کو [illegible]~~   تمہارے اس کرم نے لذتِ دردِ نہاں کھو دی

اتفاق سے حضرت مولانا محمد حسین صاحب محوی لکھنوی جو حضرت سرشار کسمنڈی کے استاد ہیں بھوپال تشریف لائے۔ آپ بھی انکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی زمانہ میں اٹارسی میں ایک مشاعرہ تھا۔ چونکہ سرشار صاحب اس وقت بھوپال میں نہ تھے اس لئے منظر صاحب نے اپنی غزل حضرت محوی کی خدمت میں پیش کر دی۔ موصوف نے بڑی شفقت سے اصلاح دی۔ آپ کو مولانا محوی کا طریقِ اصلاح بہت پسند آیا۔ اور آپ مستقلاً انھیں کو اپنی غزلیں دکھانے لگے۔ دو شعر مولانا کی اصلاح کے مندرجہ ذیل ہیں۔

بے اثر — گلشن

کھل نہیں سکتی ہیں کلیاں خاطرِ ناشاد کی — ہیں بہاریں حاصلِ اس عالمِ ایجاد کی

قوت

آسماں دیکھا کیا فطرت نے کروٹ تک نہ لی — حسن کی دولت نے دنیا عشق کی برباد کی

اس کے بعد آپ کی شاعری نے کیا رنگ بدلا وہ آپ نہایت لطیف پیرایہ میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"ابھی میرا ذوقِ تکمیل کو نہ پہونچا تھا کہ میری آشفتہ سری نے مجھے بھوپال سے سیکڑوں میل دور پھینکدیا۔ کسی کے جلوۂ رنگین نے اپنی طلعتِ صبیح کے ساتھ آگرہ آنے کی دعوت دی اور میں ذوقِ کلیم لئے ہوئے طورِ ادب، مینائے حسن و محبت، محشرستانِ سخن اکبر آباد پہونچ گیا۔ یہاں پہونچ کر ذرہ ذرہ نے دعوتِ شعر گوئی دی۔ حسن کی سامعہ نواز موسیقی نے عالم ہی بدل دیا۔ جذبات کی بہتی ہوئی رَو میں حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ العالی کی خدمتِ اقدس میں آخوشِ تلمذ کے کر پہونچا۔ آپ نے شفقت فرمائی اور اپنی آغوشِ ادب میں لے لیا۔ عرصہ تک مولانا کی خدمت میں رہا۔ زمانۂ قیام اکبر آباد میں قریب قریب ہر مشاعرہ میں مضمون۔ نظم۔ غزل وغیرہ کہہ کر شریک ہوتا رہا۔ لیکن افسوس کہ اکبر آباد کے چھ سال کے قیام میں فکرِ معاش سے آزاد نہ ہو سکا مجبوراً اکبر آباد سے اپنا ذوقِ ناتمام لے کر نکل کھڑا ہوا۔ میں چھ سال سے مستقل طریقہ پر مولانا مدظلہٗ کے فیضِ صحبت سے فیضیاب ہوتا ہوں"

۱۹۳۴ء میں آپ اپنے عزیز دوست اور شاگرد شہزادہ غلام محی الدین صاحب غلزئی۔ سے ملنے بمبئی گئے۔ اتفاق سے ڈگویر فلم کمپنی کے مالک سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے آپ کو اپنی کمپنی میں بحیثیت ڈرامہ نگار رکھ لیا۔ آپ نے وہاں رہ کر دو فلمی ڈرامے صدائے حق اور محبت کا تیر لکھے لیکن دونوں ڈرامے اسکرین پر نہ آسکے۔ بمبئی کی آب و ہوا موافق نہ آئی اس لئے واپس چلے آئے۔

آپ ہندوستان میں اپنے معاصرین کی طرح کافی متعارف ہو چکے ہیں۔ کئی شاعروں کی صدارت بھی کر چکے ہیں۔ آپ نے اس قدر مشاعرے پڑھے ہیں کہ آپ کی طبیعت اکتا سی گئی ہے لیکن ادبی خدمت سمجھ کر کبھی کبھی شریک ہو جاتے ہیں۔ ورنہ زیادہ وقت تنہائی اور فکر و غور میں گذرتا ہے۔ آپ کے متعدد شاگرد بھی ہیں۔

آپ ہر وقت خوش رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن نہیں رہ سکتے۔ ہمیشہ کسی خیال میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں۔ اپنے احباب کی اعانت کے سلسلے میں ہمیشہ قربانیاں کرتے رہے ہیں۔ آپ کبھی کسی مخالف سے انتقام نہیں لیتے۔ اکثر و بیشتر اپنے احباب کے اخلاقی جرائم اپنے سر لے کر اپنی پریشانیوں میں اضافہ کر لیتے ہیں۔

آپ نے اس وقت تک کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جو ہنوز تشنۂ طباعت ہیں۔ آپ کی مالی کمزوریاں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ تاہم آپ مایوس نہیں ہیں۔ "گناہِ محبت"، "جوشِ وفا" دو ناول مکمل ہیں۔ ایک رسالہ فنِ عروض پر بھی لکھا ہے۔ مذہبی معلومات، انتظامِ خانہ داری اور ایک دیوان، "مکمل نقوشِ فطرت" بھی موجود ہے۔

نمونۂ تغزل

کیا چرخ پہ تمام غم نو انجمن آرا تھا — طلعت میں ستاروں کی میں تجھ کو دیکھتا تھا

آنسو جو محبت کے عنوان سے نکلا تھا   سمٹا ہوا قطرہ تھا بہتا ہوا دریا تھا
جس دل کو تری چشمِ پرکیف نے دیکھا تھا   گرتی ہوئی بجلی تھا ٹوٹا ہوا تارا تھا
کھلتی ہوئی پھولوں میں دہکی ہوئی شعلوں میں   تھی گرم نظر تیری یا تیرا رخِ زیبا تھا
وہ جلوہ کہ دنیا یہ کشمکشِ محشر   ہم سے بھی تو کچھ کہتی کیا آپ کا منشا تھا
لٹتی ہوئی دنیا کو کیوں دیکھنے آئی ہو   اس حال سے پہلے بھی تم نے کبھی پوچھا تھا
عرفانِ حقیقت نے دنیا ہی بدل ڈالی   ہم حسن جسے سمجھے نظروں کا وہ دھوکا تھا
تھی شرط پرستارِ مظلوم کی قربانی   آزادی کی دیوی پہ تلوار مرا کاٹا تھا
بدلی نہ کسی صورت تقدیرِ نیاز و ناز   کعبہ وہی کعبہ تھا سجدہ وہی سجدہ تھا
جذبات کی دنیا پہ کیا وقت تھا ای منظر
جب چاند کی کرنوں نے اک گیت سا چھیڑا تھا

مری دل پہ ہی طاری طلعتِ جانانہ برسوں سے   سکوں نا آشنا ہی خاطرِ دیوانہ برسوں سے
کہاں جائیں کسے ڈھونڈیں کسے دیکھیں کسے سمجھیں   ہم اپنے حال سے بھی اب تو ہیں بیگانہ برسوں سے
کسی کی حسنِ روز افزوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا   زمانے بھر میں رسوا ہی دلِ دیوانہ برسوں سے
سکھائے سیکڑوں آداب مینے بزمِ فطرت کو   ہی آئینِ جہاں گیری مرا افسانہ برسوں سے

مجرم ہی مرا ذوقِ نظر پوششِ نظر کا   اب ذوقِ نظر کو مرے دیوانہ بنا دے
پھر طور سے دی جذبۂ خود دار کو آواز   پھر ہو کے مخاطب مجھے دیوانہ بنا دے

فطرتاً درکار ہی اک رہبرِ کامل مجھے   کوئی لادے ڈھونڈ کر گمراہِ الفت دل مجھے
مستقل اک آگ ہی سوزِ غمِ پنہاں نہیں   اک جہنم دیدیا ہی یا دیا ہے دل مجھے
نصف آدابِ غلامی مینے ناقص کر دئیے   اور اک سجدہ کرلے آزادیٔ کامل مجھے
مذہبِ ملت جہاں انسانیت کا ساتھ دیں   منعقد کرنی ہے اک ایسی نئی محفل مجھے
حسن کا عشرت کدہ ہو عشق کا ماتم کدہ   کس سے مانگوں کون دے سکتا ہے ایسا دل مجھے

حسن کو آفتاب ہونا تھا   زندگی کو خراب ہونا تھا
فطرتاً ہی نسائیت مغلوب   اُن کو مجھ سے حجاب ہونا تھا

نمونۂ نظم

کافر گھٹائیں

گھٹا کی دیویاں آئیں پری جمائی ہوئے   نگاہِ شوخ میں کچھ بجلیاں چھپائی ہوئے
شگفتہ نغمے جلو میں وہ رعد کے ہمراہ   سکونِ دہر پہ اپنا اثر جمائے ہوئے
کبھی سیاہ کبھی سرخ اور کبھی کاہی   ہزار رنگ سے رنگیں فضا بنائی ہوئے
وہ قطرے پانی کے آغوشِ ابر میں لرزاں   کچھ آنسو آنکھ میں جیسے ہوں ڈبڈبائی ہوئے
شبابِ کیف پہ وہ کفر کی گھٹا توبہ   ہزار فتنے نگاہوں میں مسکرائی ہوئے
کچھ اس ادا سے اٹھیں جیسے صبح سے پہلے   حسین بال بکھیرے اٹھیں نہائی ہوئے
وہ اُن کے عکس سے باغوں میں انبساط بہا   وہ اُنکے سائے سمندمیں تھرتھرائی ہوئے
کچھ اس ادا سے فضاؤں پہ چھا گئیں آکر   حسین پھول ہوں جس طرح لہلہائی ہوئے
حسین شانوں پہ بکھرائے کاکلِ مشکیں   فضائے تاج کو رشکِ ارم بنائی ہوئے
کسی کی یاد یہ کافر گھٹائیں لائی ہیں
مجھے بہار میں وحشی بنانے آئی ہیں

نمونۂ نثر

فلسفۂ شہادت

صبح ازل جب حسنِ خود نما کی بیتابیاں تنہائی سے تنگ آکر اپنے اعلان پر مجبور ہو گئیں تو عالمِ کیف و جذب میں "کُن" کہہ کر آرائشِ جمال میں مصروف ہو گئیں۔ حسن۔ جلال و جمال سے مرصع ہو کر تختِ شہود پر جلوہ افروز ہوا اور مقربانِ خاص کو پردۂ حجاب اُٹھانے کا حکم دیا۔ پردہ اٹھا۔ برقِ حسن مسکراتی ہوئی بڑھی اور دیکھنے والوں کو بیخودی کا پیغام دے کر پھر آسودۂ حجاب ہو گئی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ضیائے جمال سے معمور و مخمور ہو رہا تھا۔ اور ہر وہ چیز جو اس وقت عالمِ فانی میں موجود

کیفیتِ عشق سے سرشار و مدہوش تھی۔ اور یہی وہ وقت تھا کہ جب انسان اس نعمتِ عظیم سے سرفراز ہوا۔ دربارِ حسن کے نقیبوں نے دعوتِ امتحان پیش کی ——— اور اہلِ دل نے بسم اللہ کہہ کر نذرانہ پیش کیا۔

پروانہ نے تڑپ کر بےتابانہ حسن کے جلووں میں کھو جانا چاہا حسن اس جرأت پر مسکرایا، پروانہ اس تبسمِ برق پاش کی تاب نہ لاسکا منہ سے بیساختہ آہ نکلی اور خاکستر کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔

بلبل نے پرِ پرواز کھولے اور فضائے بسیط میں اُڑ کر بہارِ حسن کا طواف کرنا چاہا۔ لیکن اس تبسمِ گل بیز کی یہ بھی تاب نہ لاسکا اور دیوانہ ہوکر سر پٹکنے لگا۔

قمری نے بھی جرأت کی اور تحفۂ عشق پیش کیا جو حق سرہٗ کے نغموں میں تبدیل ہوکر آج تک بےچین ہے۔ "پپیہا" "جگنو، کوئل، سرو، نرگس، چکور، غرضکہ کائنات کے ہر فرد نے اپنی بساط کے موافق اظہارِ محبت کیا لیکن حسن کی خودداریاں کسی اور ہی کی تلاش میں مصروف تھیں۔ انسان نے اس راز کو سمجھا اور اُسے جذب کرلینے کی التجا کی۔

اشجار جھومے، ٹھنڈی ہوائیں چلیں، پرندوں نے نغمۂ مسرت الاپا۔ چاند، سورج، نے اپنی زرین شعاعوں کے ساتھ انسان کی اس عظیم الشان جرأت کو دیکھا، مقربانِ خاص نے بھی جنبشِ ابرو سے اظہارِ حیرت و تعجب کیا۔ فطرت نے انسان کی جرأتِ عشق پر خلعتِ خوشنودی و شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔ اسکے بعد عشق کی پریشانیاں اور تکالیف بھی ایک لطیف درد کے ساتھ انسان کو عطا فرمائی گئیں انسان نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

دنیا عالمِ وجود میں آئی، نسلِ انسانی نے عروج حاصل کیا اور اپنی محبت کے وہ جوہر دکھائے کہ کائنات محوِ حیرت ہوگئی۔ مقربانِ حسن انسانی تہذیب و تمدن کے مداح تھے۔ لیکن ابھی تک وہ غبار باقی تھا جو حسن و عشق کے امتزاج و قبولیت کے وقت پیدا ہوا تھا

سید منظور احمد صاحب منظر رضوی بھوپالی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

سو بار ہو چکی اسی مشکل کے سامنے — صدموں کا ذکر کیا دلِ بسمل کے سامنے

بجلی غریب آ ڈگی کیا دل کے سامنے — یہ کر چکا ہے جلوۂ کامل (دل) کے سامنے

آئینہ ~~دیکھنے سے دل~~ (یوں نہ دیکھئے عقل) کے سامنے — ~~آسان نہیں ہیں~~ (کرتا ہے کوئی) مدِ مقابل کے سامنے

ہر چند شکوۂ غمِ ~~ہجراں~~ (ہستی) کا قصد تھا — خاموش ہو کے رہ گئی قاتل کے سامنے

گرتی ہے آشیاں پہ مرے شوق سے گرے — رو دی گی برق بیٹھ کے حاصل کے سامنے

دیکھا ہے چشمِ شوق نے تیرے جمال کو — جھینپے گی کیا یہ جلوۂ باطل کے سامنے

~~کیا انہیں مری کشش بسمل کی خطا~~ (میرے ذاتی عشق کا انجام دیکھنا) — پہونچا ہوں حشر کو جو پہ قاتل کے سامنے

اللہ رے بیخودی دل ~~...~~ (ہوش رہے) آشنا — منزل کو ڈھونڈتا ~~ہوں میں~~ (نہیں) منزل کے سامنے

اب بھی ~~نہ سرفراز نہیں~~ (سرفراز کوئی ہو) ~~کیا علاج~~ — گردن جھکی ہے خنجرِ قاتل کے سامنے

~~عجب جمال یار سے کچھ بھی نہ کہہ سکا~~ (وحشت نمائے قیس ہے ہر ذرہ نجد کا) — ~~مجنوں تڑپ کے رہ گیا محمل کے سامنے~~ (مجنوں کھڑے ہیں سینکڑوں دل)

آسائشِ حیات سے دل سیر ہو چکا! — راحت کا ~~لطف~~ (مذاق) کچھ نہیں مشکل کے سامنے

کہہ دو فلک سے منہ کی نہ کھانا (کھائی) پڑے کہیں

اچھے نہیں ہیں منظر بیدل کے سامنے

محسن — ۸۷

آپ کا نام محمد محسن اور محسن تخلص ہے۔ ۱۸۹۱ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم شیخ حافظ حبیب صاحب مرحوم بھی آگرہ ہی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد ساکنانِ پنجاب سے تھے جد بزرگوار پنجاب سے دہلی اور دہلی سے آگرہ تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ آپ کے بزرگ جواہرات کی تجارت کرتے تھے۔ آپ کے والد نے جبل پور اور دوسرے پہاڑی مقامات پر پلٹنوں میں "کافی شاپ" کے ٹھیکے لئے۔ بعدہٗ ایک دوکان انگریزی سامان کی صدر بازار جبل پور میں احتراماً اپنے برادر بزرگ شیخ اللہ بخش صاحب کے نام سے قائم کی جس کو غیر ممالک تک شہرت ہوئی۔ اور کافی عروج پایا۔ اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں ایک دوکان صدر بازار آگرہ میں اسی نام سے قائم کی۔ اس دوکان کو جبل پور والی دوکان سے زیادہ ترقی ہوئی۔ اور ہندوستان کے اعلیٰ افراد اور حاکموں سے سارٹیفکٹ حاصل کئے۔

۱۸۹۴ء میں جب آپ کی عمر ۳-۴ برس کی تھی۔ آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور کاروبار آپ کے چچا مولا بخش صاحب نے سنبھالا۔ ۱۹۲۳ء تک آپ آگرہ اور جبل پور میں ایک زبردست جائداد کے مالک تھے۔ جس میں مکانات۔ دوکانیں۔ کوٹھیاں وغیرہ شامل تھیں۔ ان کے علاوہ آپ کے کئی کام اور بھی چل رہے تھے۔ لیکن انقلاب وقت نے اس جائداد کی ایک اینٹ تک باقی نہیں ہے۔ ۱۹۲۳ء تک تباہی اور بربادی کے سیاہ بادل ایسے چھائے کہ ہر طرف ظلمت ہی ظلمت نظر آنے لگی۔ اس تباہی کے بعد فوراً ہی آپ کے عزیزوں کی تحریک پر آپ کے ایک محب صادق نے صدر بازار آگرہ میں فرنیچر کی ایک دوکان جنرل اسٹورز کے نام سے جاری کرادی۔ جس میں محسن صاحب بحیثیت مینیجر فائز ہیں اور ۱۹۲۳ء سے اب تک یہی کام کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ بھی قریب قریب مالکانہ ہی ہے۔

آپ نے آٹھویں جماعت تک اسکول میں انگریزی تعلیم حاصل کی اردو، فارسی کی مکمل تعلیم مدرسوں میں پائی۔ اسکول کی تعلیم کے بعد پرائیوٹ طور پر ایک ماسٹر اور مولوی سے تینوں زبانوں میں درس لیا۔ کتب بینی کا شوق آپ میں اس قدر تھا کہ اگر دو منٹ بھی آپ کو مہلت ملتی تو آپ کوئی کتاب یا رسالہ اٹھا کر کچھ نہ کچھ پڑھ لیتے تھے۔ آجکل فکر معاش اور پریشانیوں نے آپ کو رسائل اور اخبارات کے مطالعے سے بھی محروم کر دیا ہے۔

۱۹۱۰ء سے آپ میں مذاقِ شاعرانہ پیدا ہوا۔ اور شاعری کی حیثیت یہ تھی کہ آپ روزانہ شام کو اپنے دوست سراج الدین صاحب رواںؔ کے ساتھ چہل قدمی کے لئے جایا کرتے تھے۔ راستہ میں بطورِ مشق شعر گوئی کا سلسلہ جاری رہتا۔ عرصہ تک اسی طرح مشق جاری رہی۔ کچھ عرصے بعد آپ کے بڑے بھائی کے دوست مقبول احمد صاحب جبل پور سے آگرہ تشریف لائے۔ جب آپ نے محسن صاحب میں شاعری کا ذوق دیکھا تو فرمایا کہ تمہیں آگرہ ہی میں ایک استاد بتاتا ہوں جس کا جواب اس وقت ہندوستان میں نہیں مل سکتا چنانچہ مقبول صاحب اپنے ہمراہ آپ کو اور رواںؔ صاحب کو حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ العالی کی خدمت میں لائے اور ۱۹۱۳ء میں شاگرد کرادیا۔ تین سال تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ پھر آپ

آشوب چشم کی شکایت میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۵ء تک مبتلا رہے اور لکھنے پڑھنے کا سلسلہ بالکل مفقود ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس مرض سے نجات ملی اور احباب کے پیہم اصرار سے پھر آپ نے شاعری شروع کر دی۔ الحمد للہ کہ اب آپ برابر مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ گو خانگی پریشانیوں کی وجہ سے بہت کم وقت ملتا ہے لیکن پھر بھی جو کچھ کہتے ہیں۔ اُس سے آپ کی کہنہ مشقی ٹپکتی ہے

نمونۂ تغزل

کیا اُنکی نظر دے گئی پیغام محبت ۔۔۔ کیوں آج مزاجِ دلِ مضطر نہیں ملتا
لیجاؤں کہاں اب دلِ دیدار طلب کو ۔۔۔ محشر میں بھی وہ فتنۂ محشر نہیں ملتا

ہماری آرزو اشکوں میں ملکر بہہ گئی آخر ۔۔۔ ٹکا جائے نہ جس دلمیں وہ آنکھوں میں کیا ٹھہرے
دم رخصت کہا میں نے کہ اُلٹے پاؤں پھر آنا ۔۔۔ تو فرمایا کہ ہم انسان کیا ٹھہری ہوا ٹھہرے!
وہ میخانہ پر ساقی کھڑا ہو دیر سے محسن ۔۔۔ نہ دے شیشہ مگر اتنا تو کہدے جیا ٹھہرے!

ہر وفا زمانہ کے دل سے نکل گئی! ۔۔۔ تیری نظر بدلتے ہی دنیا بدل گئی
اکثر خزاں میں داغ ہرے دلکے ہو گئے ۔۔۔ بے فصل بھی یہ شاخ کئی بار پھل گئی
لے آئی ہیں مجھے نئی دنیا میں وحشتیں ۔۔۔ کوسوں زمینِ کوچۂ جاناں نکل گئی
وحدت پرست دل میں کہاں جائے ماسوا ۔۔۔ پہلو میں جب وہ آئے تو حسرت نکل گئی
ہے اِس جہاں میں میری جوانی کی یہ مثال ۔۔۔ سردی کی دھوپ تھی کہ چڑھی اور ڈھل گئی

کیا جلوہ فگن ہوگا وہ خورشید منور ۔۔۔ کیا چرخ چہارم دلِ دیوانہ بنے گا
گلشن میں عجب جوش پہ ہے فصل بہاری ۔۔۔ جو پھول کھلے گا وہی پیمانہ بنے گا
تم شمع بنے بیٹھے تو ہو گرم نہ ہونا ۔۔۔ جو آئے گا محفل میں وہ پروانہ بنے گا

وہ اُنکی منتیں نیچی نظر سے ۔۔۔ وہ میرا حشر میں فریاد کرنا
تمہیں ہو باعثِ بربادیٔ دل ۔۔۔ تمہیں آکر اسے آباد کرنا

مٹجاؤں وہ عشق میں ایسا خدا کرے ۔۔۔ رہجاؤں ہو کے خاک تری رہگزار میں
تیرا ہی رنگ فصل خزاں میں ہوا آشکار ۔۔۔ تیری ہی زینتیں رہیں عروسِ بہار میں
محسن یہ دل ہے عالم فانی میں بیقرار
اِس کو قرار آئے گا دار القرار میں

سوئے بزم دوست آتا ہوں ازل کی گود سے ۔۔۔ کس غضب کی طاقت پرواز پیغام میں ہے
تب بھی آتے ہیں تصور میں تو وحدت آفریں ۔۔۔ کعبہ بن کر دیر میرے دلکو کاشانے میں ہے
تم نے محسن عمر بھر کی ہے بتوں کی بندگی
آج کیوں سجدہ ندامت کا خدا خانے میں ہے

پیر فلک کو میری جوانی پہ رشک ہے ۔۔۔ اور میری آرزو ہے ہمیشہ جواں ہوں

در دیوار مقتل وجد میں تھے رقص بسمل سے ۔۔۔ گری تو پھر نہ اٹھی تیغ براں دست قاتل سے
ڈبو دی آبروئے عشق تو نے اے دلِ بسمل ۔۔۔ پناہیں مانگ کر آسودگی کی تیغ قاتل سے
یکایک ہو گیا رخت سفر محسن تہ و بالا
تلاطم میں پڑی کشتی نکل کر دور ساحل سے

دے نظر کو اپنی وسعت دیکھ پھر آئین کا جواب ۔۔۔ ہیں ہزاروں طور لاکھوں کلیاں تیرے لئے
سر جھکا محسن جہاں دل چاہے پھر بندگی ۔۔۔ ہر جگہ موجود ہے اِک آستاں تیرے لئے

دم نے ابھی اے یوسف کنعاں کوئی دن اور ۔۔۔ ہے دم سے ترے رونق زنداں کوئی دن اور
مقسوم کا لکھا ہوا ہو کر ہی رہے گا ۔۔۔ کرلیں وہ مرے درد کا درماں کوئی دن اور
نکلیں گی ابھی دل سے الم ناک صدائیں ۔۔۔ گو بجے گا اگر سازِ رگ جاں کوئی دن اور

مجھے گر بیخودی میں ہوش تھا تو ہوش تھا اتنا ۔۔۔ کوئی آنسو برابر پونچھتا تھا اپنے دامن سے

محفوظ الرحمٰن خاں صاحب مرادآبادی

آپ کا نام محفوظ الرحمٰن اور تخلص محفوظ ہے۔ ۲۱ر رجب ۱۹۰۱ء بروز سہ شنبہ بمقام مرادآباد پیدا ہوئے۔ آپ کے والد منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن کبھی منظرِ عام پر آنے کی کوشش نہیں کی۔ سی پی کے محکمۂ پولیس میں بعہدۂ انسپکڑی فائز تھے۔

آپ نے فارسی اور اردو کی تعلیم مکمل طور پر اپنے والد صاحب مرحوم سے حاصل کی۔ اس کے بعد انٹرنس تک ہیوٹ مسلم اسکول مرادآباد اور اسلامیہ اسکول بریلی میں تعلیم پائی۔

جب آپ بریلی سے مرادآباد واپس ہوئے۔ اُس وقت مرادآباد میں مشاعروں کا بہت زور تھا۔ آپ کے احباب اپنی غزلیں آپ کو سنایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ آپ کو بھی شعر کہنے کا ذوق پیدا ہوگیا۔ اور اپنے ماموں جعفر علی بیگ صاحب اصغر (جن کے شاگرد رشید جناب اخگر مرادآبادی ہیں) سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اُنھوں نے آپ کے والد مرحوم سے سفارش کی آپ کے والد صاحب نے جب طبیعت کا رجحان مطلقاً شعر و شاعری کی طرف دیکھا تو مولوی فرید احمد صاحب وفا مرادآبادی کی طرف رجوع کر دیا۔ آپ کے ماموں صاحب نے ایک مصرع آپ کو غزل کہنے کے لئے دیا۔ "کیوں میرے مسیحا مجھے اچھا نہیں کرتے" اس پر آپ نے غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے۔

بیمارِ محبت ہوں مدا وا نہیں کرتے
کیوں میرے مسیحا مجھے اچھا نہیں کرتے

دوسرے دن آپ وفا صاحب کی خدمت میں غزل لے کر حاضر ہوئے۔ وفا صاحب اُس وقت اپنے ایک شاگرد شیدا صاحب کی غزل دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے شیدا صاحب کے منہ پر ایک ہلکا سا طمانچہ مارا اور کہا کمبخت بوڑھا ہوگیا اور ابھی تک شعر کہنا نہیں آیا۔ آپ وفا صاحب کی یہ سخت گیری دیکھ کر خاموشی کے ساتھ واپس چلے آئے۔ دوسرے روز وفا صاحب کے بجائے حکیم بشیر احمد صاحب رفیق مرحوم کے شاگرد ہوگئے۔ آپ نے کمال محبت سے اصلاح دی۔ اور مشاعرے میں اپنے ساتھ لے جاکر غزل پڑھوائی۔ دو سال تک آپ رفیق صاحب سے اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۱۸ء میں آپ بسلسلۂ ملازمت "آسن سول" چلے گئے۔ اور رفیق صاحب گوالیار تشریف لے گئے۔ اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

۱۹۲۲ء میں ملازمت ترک کر کے جب آپ مرادآباد آئے اُس وقت رفیق صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے دو غزلوں پر احمد شاہ صاحب جوہر مرادآبادی سے اصلاح لی۔ ۱۹۲۶ء میں پھر "آسن سول" چلے گئے۔ اور ۱۹۳۳ء تک پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ۱۹۳۴ء میں جب آپ مرادآباد آئے تو جوہر صاحب سے ملاقات ہوئی اور اپنا دیوان جس میں تین سو غزلیں تھیں جوہر صاحب کو برائے اصلاح دے آئے۔ چند ماہ بعد آپ کی آنکھیں دکھنے آگئیں۔ اور ۹ ماہ تک آپ لکھنے پڑھنے سے معذور رہے۔ اسی اثنا میں جوہر صاحب کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور آپ کا دیوان بھی اُنھیں کے ساتھ فنا ہوگیا۔ چونکہ آپ نے مسلسل کسی اُستاد سے اصلاح نہیں لی تھی اس لئے آپ میں بہت سی کمیاں تھیں۔ جن کو ہر وقت آپ محسوس کرتے تھے۔ ہر چہار جانب آپ اُستادِ کامل کی تلاش میں اپنی نظریں دوڑا رہے تھے

...گاہِ انتخاب حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ پر پڑی۔ اور ۱۹۳۶ء کے اوائل میں آپ مولانا کے شاگرد ہو گئے۔ ذریعۂ خط و کتابت اصلاح کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اور روز بروز آپ ترقی کر رہے ہیں شعر بہت سمجھ کر کہتے ہیں۔ اگرچہ اسکول کا رنگ طبیعت پر غالب آتا جاتا ہے۔

نمونۂ تغزل

حنا ہے دستِ نازک میں نہ غازہ روئے روشن پر
کسی کا رنگ جچتا ہی نہیں اُس شوخ پرفن پر

میرا نقدِ سکون و صبر کیا تم نے ہی لوٹا ہے
تمہاری آنکھ نیچی ہو گئی کیوں ذکرِ رہزن پر

ٹھہر صیاد قبل از قید مجھکو اتنی مہلت دے
نظر اک آخری میں ڈال لوں اپنے نشیمن پر

نہیں دنیا میں کوئی آجکل جویا حقیقت کا
ریا کا رنگ ہی کا شانۂ شیخ و برہمن پر

کہاں کی شمع کیسے پھول کسکی چادرِ زریں
کسی نے خاک بھی ڈالی نہ آکر میری مدفن پر

قیامت تک خدا معلوم اس کا حال کیا ہوگا
ابھی سے بیکسی چھائی ہوئی ہے میری مدفن پر

سمجھ کر اپنی محفل آگیا تھا تیری محفل میں
خبر کیا تھی گراں ہو جاؤں گا میں بزمِ دشمن پر

تجلی دیکھتا ہوں اُسکی میں آئینۂ دل میں
نہیں میری نظر اب جلوہ ارزانیٔ ایمن پر

یہ ہیں مجبوریاں محفوظ آئینِ محبت کی
بجائے شادمانی رو رہا ہوں مرگِ دشمن پر

بارگاہِ عشق و بزمِ حسن کے قابل نہیں
جو نہیں صرفِ وفا سنگِ گراں ہے دل نہیں

وہ ہجومِ آرزو وہ اضطرابِ دل نہیں
میں اب اس عالم میں ہوں جس میں کوئی مشکل نہیں

کشتیٔ امید ہو گی پار کیونکر مان لوں
ناخدا، حدِ نظر تک تو کہیں ساحل نہیں

ہیں دو عالم کی بہاریں میری نظروں میں مگر
ہجر میں تیرے کوئی وجہ سکونِ دل نہیں

آہ یہ بادِ مخالف اور یہ جوشِ بحرِ غم
کشتیٔ امید کی تقدیر میں ساحل نہیں

آئے للہ اسکی آبرو رکھ لیجئے
خندہ زن ہے بیکسی کوئی انیسِ دل نہیں

کیا تصدق ہوگا وہ دل تیری شمعِ حسن پر
ہمتِ پروانہ محفل میں جسے حاصل نہیں

مست ہیں سب اپنے اپنے رنگ میں
کون سنتا ہے فسانۂ دردِ دل

تم نے میری جاں نثاری کا صلہ
کیا دیا مجھ کو سوائے دردِ دل

میرے مشرب میں وہ انساں ہی نہیں
جو نہیں ہے مبتلائے دردِ دل

سننے والا ہو تو ہر آہِ خموش
کہہ رہی ہے ماجرائے دردِ دل

آسماں بیداد، دنیا بے وفا
اب کوئی کس کو سنائے دردِ دل

کیا خبر محفوظ کیا ہے مدعا
پوچھتے ہیں وہ بنائے دردِ دل

دل میں نظروں میں جمالِ یار ہے
پھر بھی ہم کو حسرتِ دیدار ہے

خونِ دل کا کر چکی بیگانگی
آشنا اب کیوں نگاہِ یار ہے

سن رہا ہے سب کی کہتا کچھ نہیں
تیرا دیوانہ بڑا ہشیار ہے

ہم نہیں محفوظ مطلب آشنا
گو زمانے کی یہی رفتار ہے

دلکو مرے سکوں ہو گیا سیرِ گل و گیاہ سے
جانِ بہار چھپ گیا تو ہی اگر نگاہ سے

رازِ الم نہ چھپ سکا کوششِ ضبطِ آہ سے
ہو گیا حالِ دل عیاں یاس بھری نگاہ سے

آہ یہ میری بیکسی کوئی شریکِ غم نہیں
دیکھ رہا ہوں چار سو رحم طلب نگاہ سے

دل تمہیں دیکے پڑ گئی جان مری عذاب میں
موت سے شاد ہوں کہ خوش زندگیٔ تباہ سے

آہ خیالِ دید میں یہ بھی نہیں مجھے خیال
دور ہوں یا قریب ہوں آپ کی جلوہ گاہ سے

واہ رے ذوقِ بندگی رکھ ہی دیا قدم پہ سر
لاکھ وہ روکتے رہے برہمیٔ نگاہ سے

عشق کی بارگاہ کا رتبہ سوا ہے کم نہیں
شیخ ذرا کہ دیکھ لے مسجد و خانقاہ سے

آئینہ دیگا داد کیا تیرے جمالِ حسن کی
اسکو تو میرے دل سے پوچھ دیکھ مری نگاہ سے

پھول تو پھول خاک ہی ڈالدے آکے قبر پہ
اتنی امید ہی نہیں اس بتِ کینہ خواہ سے

میں تو وہ ہوں کہ بار ہا دیکھا ہے جلوہ آپکا
خیرہ ہو میری آنکھ کیا تابشِ مہر و ماہ سے

یہ وہ سرور ہے نہیں جسکو اتار دے کوئی
آئے ہیں مست ہو کے ہم میکدۂ نگاہ سے

بھول گیا ہوں سب گلے مٹ گئیں ساری کلفتیں
دیکھ لیا کسی نے جب پیار بھری نگاہ سے

ساقیٔ بزمِ ناز بس اب نہیں جام کی ہوس
جھوم رہا ہوں میں تری کیف بھری نگاہ سے

آئے ہیں بام پر تو وہ محفوظ اب میں کیا کروں
فرصتِ دید ہی نہیں کثرتِ اشک و آہ سے

ناقد — ۸۹
مولوی سید حامد علی صاحب بی۔ اے (علیگ)

آپ کا نام سید حامد علی اور ناقد تخلص ہے۔ راجپوتانہ کے مشہور شہر جے پور سے پچاس میل جنوب میں ایک پرانا قصبہ مالپورہ ہے جہاں سید جلال الدین بخاریؒ کے ماموں سید ناصر الدین شہید بڑے والے کے دو فرزند سید ابراہیم اور سید فرید الدین سنہ ۱۳۶۰ بکرمی میں آباد ہوئے تھے۔ ان دونوں کی اولاد چودہ مختلف خانوادوں کے نام سے کچھ اوپر دو سو گھروں کی تعداد میں اب بھی آباد ہے۔ اس خاندان میں شاہان مغلیہ کے زمانے سے مالپورہ اور ٹوڈہ رائے سنگھ کی قضاۃ نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب ان ہی سادات کے خانوادہ سید علی سے وابستہ ہے۔ جو سید وزیر الدین کے فرزندوں میں سے تھے۔ آپ کی ولادت مالپورہ ہی میں یوم یکشنبہ ۱۶ رمضان سنہ ۱۳۰۴ھ کو ہوئی۔

آپ کے والد مولوی حافظ سید احمد علی صاحب پہلے مڈل اسکول مالپورہ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ابتدائی تعلیم ناقد صاحب نے اسی اسکول میں حاصل کی۔ مجوزہ نصاب کے علاوہ اردو کے چند دیوان اور فارسی ابتدائی کتابیں آپ نے اپنے والد ہی سے پڑھی تھیں۔ آپ نے اپنے ایک عزیز منشی سید جمال علی صاحب کی مدد سے جو آجکل اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں اور اُس زمانہ میں ریاضی کے مدرس تھے۔ آتمارام گھوش کی چکرورتی، برنارڈ اسمتھ کی کتابیں، ذکاء اللہ اور رام نرائن کی علم المساحت اور اقلیدس کے دو مقالے تیرہ سال کی عمر میں ختم کردئے تھے۔ جب آپ مہاراجہ کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے تو بھورامل تھوکانی مدرس ریاضی آپ کی استعداد دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ آپکے ہم جماعتوں سے کہا کرتے تھے کہ یہ غلط مشہور ہے کہ مسلمانوں کو حساب نہیں آتا۔ دیکھو یہ (ناقد صاحب) ہمیشہ سو فیصدی نمبر حاصل کرتا ہے۔

جب آپ مالوہ اسکول سے ورناکیولر کا فائنل امتحان پاس کرچکے تو آپ کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ریاست کی طرف سے وظیفہ مل گیا۔ اور آپ مہاراجہ کالجیٹ اسکول میں داخل ہوگئے آپ کو صرف انگریزی میں محنت کرنی پڑی۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں ہائی اسکول اسکالرشپ الہ آباد کا امتحان پاس کیا۔ اور دو سال کے لئے پھر ۸ روپیہ ماہوار آپ کا وظیفہ مقرر ہوگیا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں آپ نے انٹرنس پاس کیا۔ اور دو سال کے لئے پھر آپ کو وظیفہ ملا۔ جب آپ کالج میں داخل ہوئے تو غلطی سے آرٹس کا کورس لے لیا۔ اصولاً آپ کو ریاضی لینی چاہئے تھی۔ فرسٹ ایر میں آپ نے فارسی پڑھی اور سیکنڈ ایر میں عربی لے لی اور اسی کے ساتھ الیف۔ اے پاس کیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے احناف اور عاملین بالحدیث کے مناقشات میں عملی حصہ لیا۔ کتب مناظرہ پڑھیں اور مسائل مختلف فیہ کی تحقیق کی۔ حنفیوں کی تائید اور غیر مقلدوں کی تردید میں جس قدر تصانیف شائع ہوچکی تھیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈھ کر اُن کا مطالعہ کیا۔ کچھ عرصہ یہی سلسلہ قائم رہا۔ الیف۔ اے پاس کرنے کے بعد آپ کو سنہ ۱۹۱۱ء میں دربار ہائی اسکول ٹونک میں پچاس روپیہ ماہانہ کی اسسٹنٹ ٹیچری مل گئی۔

ملازمت کے بعد آپکا ذوقِ تحصیل علم اور زیادہ بڑھ گیا۔ سررشتہ تعلیم میں ترقی کرنے کے لئے ڈگری حاصل کرنا ناگزیر تھا۔ لیکن پرائیویٹ طور پر بی۔ اے کی تیاری کرنے کے لئے یہاں اسباب نہیا تھے۔

اسکول لائبریری بہت مختصر تھی۔ پبلک لائبریری مفقود اور انگریزی
زبان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت عنقا تھی۔ پہلے آپ نے بی۔اے
کے امتحان کی تیاری کے لئے (اقتصادیات) لی۔ لیکن طبیعت کا رجحان
نہ ہونے سے درمیان میں اُسے بدلنا پڑا۔ اور تاریخ لے لی۔
تاریخ انگلستان کی خشک اور بے سروپا داستانیں آپ کے
لئے ایسی ثابت ہوئیں جیسے ایک عرب کے لئے سنسکرت ہوتی ہو
القصہ عربی اور تاریخ کے ساتھ آپ نے الہ آباد جاکر ۱۹۱۶ء میں
بی۔اے کا امتحان دیا۔ آپ کو جو خدشہ تھا وہی ہوا۔ یعنی آپ امتحان
میں ناکامیاب ہوئے۔ اور تاریخ کے پرچوں میں آپ کی تمناؤں
کا خون ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں دوبارہ آپ نے امتحان کا ارادہ کیا لیکن
آپ تپ لرزہ میں مبتلا ہوگئے۔ اور تین چار مہینے صاحبِ فراش رہے
۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا کا شکار ہوگئے۔ اور مہینوں آپ کسی دوسرے
کام کے قابل نہ رہے۔ چونکہ تحصیلِ علم کا ذوق ابھی سیراب نہ ہوا تھا
اس لئے ڈگری کے خیال کو چھوڑ کر آپ نے عربی، فارسی اور بھاشا
کی اعلیٰ تعلیم اختیار کی۔ آپ کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے۔ چند کے
نام پیش کئے جاتے ہیں۔ صرف و نحو مولوی جناب علی شاہ مرحوم
مولوی محمد اسحاق صاحب مرحوم اور ملا حبیب اللہ صاحب کابلی
سے پڑھی۔ عربی ادبیات میں مفتی سیّد احمد مجتبیٰ مرحوم۔ مولوی
محمد اسحاق مرحوم۔ مولوی محمد طلحہ صاحب حال پروفیسر اورنٹیل کالج
لاہور۔ مولانا محمود حسن خاں صاحب حال دکن دارالترجمہ حیدرآباد
سے استفادہ کیا۔ کچھ عرصہ مولانا سید محمد سورتی سے بھی مستفید
ہوئے۔ ہندی میں رامائن پنڈت گنگا پرشاد شرما سابق انسپکٹر مدارس
دیہات سے پڑھی۔

دربار ہائی اسکول میں آپ کی خدمات کا ہمیشہ اعتراف کیا گیا لیکن
چونکہ آپ گریجویٹ نہیں تھے۔ اس لئے ۱۹۳۳ء میں سررشتہ
تعلیم نے قبل از وقت آپ کی پینشن کی تجویز کردی۔ آپ نے اس کے
خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ آخر یہ طے ہوا کہ آپ ۱۹۳۴ء
میں بی۔اے پاس کرلیں، پینشن ملتوی کردی گئی۔ آپ نے اپنی
انتھک کوششوں سے اسی سال سیکنڈ ڈویژن میں بی۔اے
پاس کرلیا۔ اب تو آپ کی تشنگی تعلیم اور بھی بڑھی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء
میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے پریویس کا امتحان پاس کیا
اب گذشتہ ماہ اپریل ۱۹۳۷ء میں آپ نے ایم۔اے فائنل کا امتحان
بھی دے دیا ہے۔ خدا کامیاب کرے۔

جے پور میں آپ کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ جن میں اکثر ذہین اور
طباع لوگ تھے۔ چنانچہ شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ ڈاکٹر
ایم جی زبیر احمد (حال پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی) مولوی رضوان اللہ
صاحب کلیم (وکیل ہائی کورٹ مظفر نگر) منشی رضی الدین صاحب جوش
جو آپ کے ہم جماعت تھے، وغیرہ وغیرہ اپنے دوستوں میں دن رات
اُٹھنے بیٹھنے سے آپ میں بھی مذاقِ شاعری پیدا ہوگیا۔ ویسے بھی
جو شخص اس درجہ ہمہ گیر علوم و فنون سے دوچار ہوچکا ہو۔ اُس کا
شاعر ہوجانا یقینی تھا۔ لیکن طبعی لگاؤ کو بھی اس میں دخل تھا۔
آپ نے ابتدا میں حضرت جوہر مرحوم سے مشورۂ سخن کیا۔ اور اساتذہ
کی ہمت افزائی نے آپ میں ایک برقی رو پیدا کردی۔ آپ کا مندرجۂ
ذیل شعر ظہیر مرحوم نے مکرر پڑھوایا تھا۔ اور بہت داد دی تھی۔

پی کے ہر جام میں ہوتا تھا اشارۂ ساقی
بے خودی کی بھی یہ صورت تھی کہ ہشیار رہا

آپ کی ابتدائی غزلیں "الکمال" میں شائع ہوتی رہتی تھیں
ملازمت کے بعد عرصہ تک آپ کا یہ ذوق مردہ رہا اور بجائے شعر گوئی
کے شعر فہمی کا مذاق آپ میں بہت زیادہ پیدا ہوگیا۔ آپ نے ڈاکٹر
سر محمد اقبال کے کلام کا بطورِ خاص مطالعہ کیا تو دوسروں کے اشعار

آپ کو پھیکے نظر آنے لگے۔ جب آپ کی طبیعت پھر شعر گوئی کی طرف راغب ہوئی اور رنگ شاعری بدلا تو آپ کی نگاہیں اُسی معیار کا اُستاد تلاش کرنے لگیں، جس معیار پر آپ آ چکے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی جب ٹونک تشریف لے گئے تو وہاں کی فضا کو انکی ضیا پاش صحبتوں نے چمکا دیا۔ ٹونک کا ذرہ ذرہ آپ کیطرف چمکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ آپ بھی مولانا مدظلہٗ کے خرمنِ کمال سے خوشہ چینی کرنے لگے۔ شعر و شاعری سے آپ کو فطری لگاؤ ہی ابتدائی مشق کا کلام تلف ہو چکا ہے۔ آپ اپنے تخلص کے اعتبار سے بھی بہت مخصوص ہیں۔ ناقد نے صحیح معنوں میں آپ کو "ناقد" بنا دیا ہے۔ آپ سعادت لٹریری سوسائٹی ٹونک کے سکریٹری ہیں۔ ٹونک میں ایک قومی درسگاہ ہے۔ جس کے بارہ سال سے آپ آنریری سکریٹری ہیں قومی خدمت کو اپنے لئے وجہ سعادت اور وسیلہ نجات سمجھتے ہیں۔

آپ کی تعلیم جس درجہ معیاری ہے اسی پایہ کا کلام ہے۔ آگرہ اسکول کے ممتاز شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ بھی بطورِ خاص آپ پر شفقت فرماتے ہیں۔ اس وقت آپکی عمر پچاس سال ہے۔ امید ہے کہ مستقبل قریب میں آپ کی ذات سے ادبِ اردو میں حیرتناک اضافے ہوں گے۔

نمونۂ تغزل

پھرا ہوں عندلیبِ آسا ہزاروں گلستانوں میں — مگر اب تک نہیں اک پھول کی بھی رازدانوں میں
خدا محفوظ رکھے گلستاں کو دستِ گلچیں سے — کہ احساسِ زیاں باقی نہیں اب باغبانوں میں
فنا ہو کر رہیگا زیر و بم میں نغمۂ ہستی — ہم آہنگی کی طاقت گر نہیں ہم ناتوانوں میں
رہینِ منتِ بیگانہ ہو جا مصلحت یہ ہے — نظر جب تک نہ آئے محبت کی یگانوں میں
تمدن کی بلندی نے کیا ہی مائلِ پستی — وہ اگلی سی کہاں ہیں ہمتیں اب نوجوانوں میں
اٹھا سکتا نہیں جو بارِ احسانِ یک تنکا — وہ میرا آشیانہ ہے چمن کے آشیانوں میں

تمہارے در کی منزل کہاں اُنکو ملا آئی — ہمارا کارواں ملتا نہیں ہے کاروانوں میں
جہاں خاکِ نیاز اپنی جبینِ ناز ہو جائے — کوئی ایسا بھی یارب آستاں ہے آستانوں میں
یہ ہنگامِ سحر کیسی سماعت دل کا ہو جانا — مؤذن نام اُنکا ہی نہ لیتے ہوں اذانوں میں
ہمارے نقطۂ دل میں نظر آتی ہیں وہ عالم — نہ تھیں گنجائشیں جنکی زمین و آسمانوں میں

بفیضِ حضرتِ سیماب ہے ناقد کہ دنیا میں
شمار اپنا بھی اب ہونے لگا ہے نکتہ دانوں میں

یہ جبین کے داغِ سجدہ خوں چکاں کیوں ہو گئے — اُن کے در پہ ہم ہی ننگِ آستاں کیوں ہو گئے
ہم شہادت کو جنوں میں رائیگاں کیوں لے گئے — فدیۂ ذوقِ حیاتِ جاوداں کیوں ہو گئے
برق بن کر کاش گرتے خرمنِ دل پر مرے — آپ ان غنچوں میں چھپکر گلفشاں کیوں ہو گئے
مائلِ پرواز ہیں سب زندگی کی دوڑ میں — یا الٰہی ہم ہی گردِ کارواں کیوں ہو گئے
ربطِ باہم عشق میں اور حسن میں گر کچھ نہ تھا — اُنکا افسانہ ہماری داستاں کیوں ہو گئے
کیا فرشتے ہو نہ سکتے تھے شریکِ امتحاں — ایک ہم ہی حاملِ بارِ گراں کیوں ہو گئے

دشمنِ ایمان و جاں جن کو سمجھتے تھے کبھی
آج وہ ناقد ہمارے رازداں کیوں ہو گئے

دل بے کھلا کنول ہے تو سینہ ہے داغ داغ — اپنی ہے وہ بہار کہ جس کو خزاں نہیں
لکھا گیا ہے خضر ہمارا دوام بھی — اک عمر آپ ہی کی یہاں جاوداں نہیں
تیرے کرم نے ایک ٹھکانہ بتا دیا — ورنہ مرے گنہ کو کہیں بھی اماں نہیں
سنتا ہوں کوئل اور پپیہے کا مست راگ — گو مدتیں ہوئی ہیں کہ میں نغمہ خواں نہیں
پیوستہ جسکی راکھ سے اب تک شرار ہیں — پھر یہ کس کا گھر ہے جو مرا آشیاں نہیں

ناقد بھی آ گیا ہے اُسی بزم میں جہاں
جوہر شناس اہلِ سخن کے گراں نہیں

جنوں تو وہ آرائیں دیکھیاں فصلِ بہاری میں — کہ پھولوں کی رگوں پر عالمِ تارِ گریباں تھا
صحیفہ حسنِ فطرت کا پڑھا تو ہو گیا باور — یہیں آتش افسانۂ رنگیں کا اک رنگین عنواں تھا
نہیں جلوؤں سے کچھ کم آہ ان کے جلووں کا تصور بھی — مری راتوں پہ جو نورِ صبح کا عالم نمایاں تھا

مری نگاہ کو جلووں میں جذب ہونے دے　　جمالِ دوست مجھے دیکھنے کی تاب نہیں

کمالِ آگہی ہے خود دلیلِ محرومی　　جو بیخبر ہیں یہاں اُن سے کچھ حجاب نہیں

ہوا ہو اسی منزہ ہماری بزمِ خیال　　یہاں تمہارے سوا کوئی باریاب نہیں

شکستِ شیشۂ دل کی صدائے بیخودہوں　　رہینِ منتِ چنگ دف و رباب نہیں

خدا تو لاکھ ملیں گے یہاں ہر اک شے کے　　وفا کا بندہ خدائی میں دستیاب نہیں

نگاہِ حسن کو دیتا ہوں دعوتِ تجدید　　ہنوز مجھ میں بپا کوئی انقلاب نہیں

ازل سے سرخوشِ صہبائے حسن ہوں ناقدؔ
مذاقِ عشق مرا تشنۂ شراب نہیں

راز آشنا ہے دل اسے کیونکر سنبھالئے　　اس کو تو عرش ہی کا نہا خانہ چاہئے

ساقی ہی تیرے دستِ کرم پر مری نگاہ　　ٹوٹا ہوا سہی مجھے پیمانہ چاہئے

نمونۂ نظم

"ان پورنا"

آہ اے ان پورنا کب سے کھڑا ہی تو یہاں　　کب کسی نے بنائے تیرے سر پہ یہ مکاں

سنتری ہی ٹونک کا تو یا ہی اس کا پاسباں　　تو زبانِ حال سے کچھ کہہ تو اپنی داستاں

اک مورخ کے لئے تو دفترِ پارینہ ہے
درسِ عبرت سے مگر معمور تیرا سینہ ہے

سچ بتا تو یہ مجھے ان پورنا کیا راز ہے؟　　جو کسی کے منہ سے نکلے وہ تری آواز ہے

گونجنے والا کوئی فطرت کا کیا تو ساز ہے　　یا تری خاموش گوئی ہی ترا اعجاز ہے

کیا کوئی الہام ہی تیری صدائے بازگشت؟
پھونکتی ہے سازِ دل میں جو نوائے بازگشت

تجھ پہ سرد و گرم کا کوئی اثر ہوتا نہیں　　تیری خشکی میں تری کا بھی گذر ہوتا نہیں

کوئی گذری تیرے آگے تو خبر ہوتا نہیں　　تیری بیباکی سے پیدا کوئی ڈر ہوتا نہیں

میرا تو ہر تاکس کے آگے سر جھکاتا ہوں مگر
صرف ازدل سے تو رہتا ہے بے خوف خطر

دل کشادہ منظر او مرغزار زندگی　　کیف زا تیری فضا و غمگسار زندگی

تیرے سینے میں نہاں ہی کیا شرار زندگی　　جو عیاں کرتا ہی ساون میں بہار زندگی

تیرا دامن ہے تماشا گاہِ عالم بیگماں
دعوتِ شیراز کی تکرار ہوتی ہے جہاں

سرکشوں کے آگے تجھکو سرکشی منظور ہے　　عاجزوں کو سر جھکانے میں مگر مسرور ہے

علم و استقلال و پامردی میں تو مشہور ہے　　پائمالِ خلق ہونے کے لئے مجبور ہے

تیرے دامن میں مویشی ہی نہیں پاتی غذا
پارہ ہائے دل ہیں تیری رازقِ خلقِ خدا

اے کہ تو اک پہلواں ہی فطرتِ آزاد کا　　عجز ہی کو جو سمجھتا ہے صلہ بیداد کا

یاد آیا مجھ کو مصرع حضرتِ اُستاد کا　　"بزمِ فطرت میں عروج انجام ہی افتاد کا"

اپنی ہستی سے تو واقف اور مجھ میں یہ کمی
"معنیِ انسانیت بھولا ہوا ہے آدمی"

نوٹ :— ان پورنا شہر ٹونک کے مشرق میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس پر ان پورنا دیوی کا مندر اور کچھ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ اس کے دامن میں وسیع مرغزار ہے۔ جس میں مویشی چرا کرتے ہیں۔ اور ساون کے مہینے میں ہر جمعرات کو ہندوؤں کا میلہ ہوتا ہے۔ اور اکثر گوٹیں ہوا کرتی ہیں۔

ناقدؔ

---

۹۰ نذیر احمد صاحب شیر کوٹی

آپ کا نام نذیر احمد اور نذیرؔ تخلص ہے۔ شیر کوٹ آپ کا وطن ہے۔ والد صاحب قبلہ کا نام جلال الدین صاحب ہے۔ آپ ۵ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ بروز جمعہ قصبہ ٹھور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ اور وہاں سے اپنے والدین کے ساتھ شیر کوٹ آ گئے۔ سات برس ہی کی عمر میں موت نے والد ماجد کی سرپرستی سے محروم کر دیا۔ قصبہ ٹھور میں آپ نے مولوی ظہور الحسن صاحب کے زیر سایہ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہو گئے۔ ذوقِ علم اس قدر تھا کہ باوجود ہزار مشکلوں اور مجبوریوں کے آپ برابر حصولِ علم میں کوشاں رہے۔

جب آپ جوان ہوئے تو آپ کو ذمہ دارانہ زندگی کی دنیا میں قدم رکھنا پڑا۔ پہلے پہل مختلف شعبوں میں ملازمت کی۔ اس کے بعد آپ کراچی چلے گئے۔ جہاں آپ نے تجارت شروع کر دی۔ اور چار سال تک کراچی میں مقیم رہے۔ شعر و ادب سے ذوق فطری تھا۔ اس لئے تمام مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ اسکی بھی تکمیل ہوتی رہی۔ کراچی کی "بزم سخن" میں آپ کی برابر شرکت ہوتی تھی۔ اور آپ کے تاثرات خلوص دل سے سنے جاتے تھے۔ فنی نقائص اور تکمیلِ ذوق کے لئے آپ کو ایک رہبر کی تلاش ہوئی جستجو کے بعد ۱۹۲۵ء میں آپ حضرت مولانا سیماب مدظلہ کے تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ آج کل آپ جالندھر میں قیام پذیر ہیں۔

آپ طبیعت کے نہایت خلیق ہیں۔ اور ملنسار آدمی ہیں۔ آپ کے دوستوں کا حلقہ بھی نہایت وسیع ہے۔ جس سے ملتے ہیں۔ محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اور ہر شخص آپ سے مل کر خوش ہوتا ہے نہایت وضع دار اور خوبیوں کے انسان ہیں۔

آپ کے کلام میں ایک خاص قسم کی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ شعر سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ کلام میں بڑی حد تک پختگی اور تغزل میں کیف پایا جاتا ہے۔ آپ کے کلام سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ آپ ایک ہونہار شاعر ہیں۔ طبیعت میں جولانی بدرجۂ اتم ہے۔ جدت پسند بھی واقع ہوئے ہیں۔ متین اور لطیف شعر کہتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

آئیں وہ بن کر نشاطِ دوش کیوں — چاند بن جائے مری آغوش کیوں

بیخودی ہے عین ہشیاری کا نام — راز یہ سمجھے نہیں مے نوش کیوں

کیوں نہ اپنا رازِ دل ان سے کہوں — میں رہوں اس بزم میں خاموش کیوں

اس کو اندازہ ہے میرے ظرف کا — دے مجھے وہ بادۂ سرجوش کیوں

ختم شاید ہو گیا سب خونِ دل — کم ہوا ہے آنسوؤں کا جوش کیوں

سب کے دامن تم نے پھولوں سے بھرے — رہ گیا میں ہی تہی آغوش کیوں

جگمگاتا ہو جو بزمِ روح میں — ہو نگاہوں سے مری روپوش کیوں

ہیں قدم بہکے ہوئے دل مست ہے — بیخودی کو میری آئے ہوش کیوں

دیکھنے اس کو گئے تھے دیکھتے — طور پر موسیٰ ہوئے بیہوش کیوں

زندگی تو حاصلِ کونین تھی — ہو گئی ہے پھر وبالِ دوش کیوں

داستاں اپنی نذیرؔ اس بزم میں
کہتے کہتے ہو گئے خاموش کیوں

اب فقط تیرا ہی پیکر ہے نظر کے سامنے — اب تری الفت نے دنیا بھر سے غافل کر دیا

نہ آنا کبھی اپنے وعدے پہ تم — وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا

ملی ہو زندگی ناکام ہو کر ڈوب جانے میں
جنازہ ڈوبنے والے کا کیوں ساحل سے نکلیگا

تم مرے دل میں چلے آئے ہو نشتر بن کر
درد کا بھیس لیا ہے تو دوا ہو جانا

گریباں چاک دل برباد خاک آلود بیٹھا ہوں
تمہیں اب تو مرے حالِ پریشاں کا یقیں آیا

یہ وقتِ صبح یہ رنگِ دل کش یہ بارشِ نورِ حسنِ فطرت
چمن کی نزہت بتا رہی ہے کہ ہو رہا ہے شباب پیدا
یہ تیری آنکھوں کا اک فسوں ہے یہ تیری نظروں کا ہی کرشمہ
جدھر بھی اٹھ جائے مست ہو کر وہیں ہو موجِ شراب پیدا

تاریکیوں پہ نور کے انوار چھا گئے
یہ آج کون روح میں جلوہ نما ہوا
کام آئی عمر بھر کی جبیں سائی شکر ہے
میں اس قدر مٹا کہ ترا نقشِ پا ہوا

ہنسنا مشکل، رونا مشکل، جینا مشکل، مرنا مشکل
انجام محبت کا میری اے چارہ گرِ دل کیا ہو گا
سنتا ہوں شہیدانِ الفت محشر میں بلائے جائیں گے
اس فکر میں ہوں خاموش کہ مجھ سے شکوہ قاتل کیا ہو گا

خلش کی خوگر ہے میری فطرت، ہیں وصل اور ہجر سب برابر
وہ میرے پاس آئیں گے شبِ غم مگر مجھے انتظار رہے گا
نذیرؔ اور بزمِ نازِ قاتل، کبھی نہیں ماننے کے قابل
یہ لائقِ التفاتِ محفل، کوئی غریب الدیار رہے گا

دل کو مذاقِ عشق نے بیکار کر دیا
سجدہ بنا کے خاکِ درِ یار کر دیا

خون کے چھینٹوں کا اندازِ شگفتن دیکھیو
ذبح کرتے کرتے قاتل گل بداماں ہو گیا

تم بھی تو بہاروں کی تصویرِ مجسم ہو
خلوت کو مری اک دن گلخانہ بنا دینا

شورشِ بادِ حوادث کی خبر دیتا ہے
داغِ پنہاں کا چراغِ تہِ داماں ہونا
غمِ دنیا سے رہائی تو میسر ہے نذیرؔ
خوش نصیبی ہے شکارِ غمِ جاناں ہونا

کچھ اور بڑھا شدتِ بیداد سے آنکی
وہ درد جو سینے میں ابھی کم نہ ہوا تھا
تم نے کئے پیدا دلِ خاموش میں نغمے
یہ ساز کسی سے مترنم نہ ہوا تھا
ہر پھول میں لبریز ہیں یا رب سحر آنسو
ایسا کبھی عالم سحرِ غم نہ ہوا تھا

مرے سینے میں کھٹک کر ہی خلش فضا تو کیا ہے
جو خدنگِ تھا یہ نالہ تو فلک کے پار رہتا
مرے عشق میں جھلکتی جو تجلیٔ حقیقت
تو نذیرؔ عشق شاید مجھے سازگار رہتا

یہ ابر اور یہ جوشِ بہار فصلِ شباب
یہ موجِ بادہ لبِ جوئبار کیا کہنا
وطن سے چھوٹ کے غربت میں جان دی آخر
ترا نذیرؔ غریب الدیار کیا کہنا

وہم دوئی اٹھا تو تمام اٹھ گئے حجاب
کوئی نگاہِ شوق میں حائل نہیں رہا
عفوِ گناہ کی مجھے دیتے ہیں وہ نوید
جب میں کسی گناہ کے قابل نہیں رہا

اس جرم پہ سزا مجھے دی اس نے موت کی
میری ہی خطا تھی کہ میں بے قصور تھا

عشق کی رسوائیوں نے کر دیا ذلت نام
پوچھتے ہیں اہلِ محفل اب ہمارا نام کیا
بے تعیّن دی جو کچھ دنیا ہوا ساقی تجھے
میکشِ دیرینہ ہوں بادہ تعلقِ جام کیا

تاریک ہوگئی مری دنیا [illegible] تیری نظر کے ساتھ ہی کیا پھر گیا نصیب

ہم دونوں زندگی کا اک گیت گا رہے ہیں میرا نفس ہے نالہ، تیری نظر ترانہ

ہے اپنی زندگی کی روداد صرف اتنی کچھ دن رہے قفس میں کچھ دن رہے چمن میں

ہے تامل اُنکو میری خون کے اقرار میں سُرخیاں شرمائی جاتی ہیں لبِ انکار میں

پہونچی ہیں آسمان تک فریاد کی صدائیں گردِ غم و الم میں تارے نہ ڈوب جائیں

شاعری پہ مجھے کیوں ناز نہ ہو اپنی نذیر میرے اوستاد کا ثانی کوئی استاد نہیں

مشربِ عشق میں کہاں عیش و سکونِ زندگی جس سے نہ صبر ہو سکے دل پہ وہ چوٹ کھاؤ اور کہاں

تدبیر رفع رشک کی یہ بھی ہے اک نذیر دشمن کو دیکھتا ہوں میں اُنکی نگاہ سے

وہ قتل تھا جو ہم نے جان دی محبوب کیلیے یہ محشر ہے کہ اب لیتے ہیں بدلا اپنے قاتل سے

میرے افسانے سے دنیا بھر کے افسانے بنے کتنا عالمگیر میرے عشق کا افسانہ ہے

آیا ہوں مانگنے میں تری بارگاہ سے جلوہ کی بھیک آج اُٹھا کر نقاب دے

اے حسن اُٹھا رُخ سے حجاباتِ مجازی آ اور بھری بزم کو دیوانہ بنا دے

وہ نکہت جو نہیں ملتی کسی کو چرا لایا ہوں زلفِ عنبریں سے

روح جاگے اور عرفانِ حقیقت ہو مجھے دل اگر تیری تجلیات کا مظہر بنے
شمع بھی تو کیا ہوا حسن کا نور بڑھ گیا چاند سے مانگ لی ضیا محفلِ ناز کیلئے

نمونۂ نظم

محویت

ہوگئی ہے آشنا کیا عشق کی آواز سے کس کا نغمہ سنا ہے تو نے دل کے ساز سے
چلتے چلتے رک گئی ہے ایک خاص انداز سے اٹھ گیا پردہ کوئی شاید حریمِ راز سے
محو ہو کر دیکھتی کیا ہے نگاہِ ناز سے

یاد شاید بھولنے والے کی پھر آئی تجھے ہو رہا ہے غالباً احساسِ تنہائی تجھے
کونسی ایسی کشش تھی جو یہاں لائی تجھے دے رہی ہے طعن کیا کیا جلوہ آرائی تجھے
آہ لیکن کچھ نہیں ہے خوفِ رسوائی تجھے

غالباً عہدِ محبت یاد تجھ کو آگیا دلنشیں منظر کوئی شاید تجھے تڑپا گیا
عشق کے ہاتھوں کنول دل کا ترے مرجھا گیا سہتے سہتے غم مسلسل جی ترا گھبرا گیا
آج خوش بختی سے محویت کا عالم چھا گیا

ہو کے خود سے بے خبر کیوں ہوگئی محوِ خیال سوچتی ہے غالباً دردِ محبت کا مآل
دستِ نازک ہے کمر پر روئے رنگیں پر جمال ضبط کی خوگر ہے چہرے پر نہیں گردِ ملال
بن گئی ہے پھر بھی خاموشی تری خود اک سوال

مضطرب ہے روح دادِ ضبط پانے کیلئے دل میں جذبے گھٹ رہے ہیں لب تک آنے کیلئے
ڈھونڈتی ہے کوئی پہلو مسکرانے کے لئے چاہتی ہے جاگنا جادو جگانے کے لئے
عشق کیوں آتا نہیں تجھکو منانے کے لئے

ترجماں ہے تیری مایوسی کی محویت تری واقعہ یہ ہے سراپا درد ہے صورت تری
یہ ہوا اندازہ مجھ کو دیکھ کر حالت تری غم نے لوٹا ہے تجھے ناکام ہے الفت تری
کاش ایسا ہو کہ اب مٹ جائے ہر کلفت تری

نثار

ماسٹر نثار حسین صاحب نثار اٹاوی

۹۱

نثار حسین نام نثار تخلص فرماتے ہیں۔ مورخہ یکم مارچ ۱۹۱۲ء کو بمقام شہر اٹاوہ پیدا ہوئے۔ پیشۂ آبائی تجارت اور کاشتکاری تھا جب آپکی عمر ۵ سال کی تھی تو تحصیل علم کے لئے اسکول میں داخل کردئے گئے آپکی زبان اول ہندی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں ہندی مڈل کا امتحان درجہ اول کے طلباء کے ساتھ پاس کیا اور بعدہٗ گورنمنٹ انٹر کالج اٹاوہ میں انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا مگر ایک سال کے بعد خانگی مجبوریوں سے کالج چھوڑنا پڑا اور آپ نے مدرسہ انجمن ہدایت الاسلام میں بعہدۂ معلمی ملازمت اختیار کرلی لیکن ذوقِ علم نے سلسلۂ تعلیم منقطع نہ ہونے دیا۔ لہذا آپ نے ۱۹۳۲ء میں اردو مڈل کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۳۳ء میں اردو اعلیٰ قابلیت اور انگریزی مڈل کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۳۴ء میں الہ آباد بورڈ سے ہائی اسکول انگلو امینشن کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اور ۱۹۳۵ء میں ہندی وششٹ یوگیتا کا امتحان پاس کیا۔ آپنے فارسی اور سنسکرت کی بھی تعلیم حاصل کی ہے۔ اور ان علوم میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔

ذوقِ شاعری آپ کی فطری میراث ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں حضرت شیدا اٹاوی مرحوم آپکے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے لہذا انھیں کے پُر اثر کلام نے نثار صاحب کے اس فطری جذبہ کو اُبھارا۔ کچھ عرصہ تک آپ اپنا کلام شیدا صاحب کو دکھاتے رہے۔ لیکن آپ جدید شاعری کے دلدادہ تھے۔ اور شیدا صاحب مرحوم پرانی روش کے پیرو، لہذا نثار صاحب کو ایک ایسے اُستاد کی ضرورت محسوس ہوئی جو عصرِ حاضر کی روشِ کلام پر کامل عبور رکھتا ہو۔ آپکی نظرِ انتخاب حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہٗ العالی پر پڑی اور اکتوبر ۱۹۳۳ء میں آپ مولانا موصوف کے رشتۂ تلامذہ میں منسلک ہوگئے۔ ابھی تک آپ صرف غزل کہتے تھے لیکن مولانا کے حکم سے آپ نے نثر و نظم کو بھی اپنی قلم کی جولانگاہ بنایا اب آپ نثر بھی لکھتے ہیں۔ نظم بھی کہتے ہیں۔ غزل، مخمس، رباعی میں بھی کافی مہارت ہے۔ اور شعر بہت جلد کہہ لیتے ہیں۔

آپ کی ادبی خدمات سے خوش ہوکر اراکین بزمِ ادب اٹاوہ نے آپ کو اپنا سکریٹری منتخب کیا۔ لیکن یہ بزم زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی۔ لہذا آپ نے ۲۴ر فروری ۱۹۳۵ء کو سیماب لٹریری سوسائٹی اٹاوہ کا افتتاح کیا۔ اس سوسائٹی کے ذریعہ آپنے شہر میں ادبی بیداری پیدا کردی۔ نثر و نظم کی ترویج اس سوسائٹی کا مقصد ہے۔ آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف شہر کے اخبار و جرائد نے بھی کیا ہے۔

آپ اس چھوٹی سی عمر میں بھی کثیر التلامذہ استاد ہیں۔ شہر کے مبتدی شعرا آپ سے مشورہ کرتے ہیں۔ آپ کی طبیعت میں سوز و گداز بہت زیادہ ہے۔ اس لئے آپ کے کلام سے بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ آپ کی عمر کا زیادہ تر حصہ آلام و مصائب میں بسر ہوا ہے۔ لہذا آپکے اشعار آپکے دلی جذبات کی تصویر ہیں آپکا کلام شہر میں بہت مقبول ہے۔ آپ کی غزلیں اور مخمس شہر کے گلی کوچوں میں گائی جاتی ہیں اور محفلِ رقص و سرود کو گرماتی ہیں۔

آپکی تصانیف میں سیر پرستان ایک مقامی طویل نظم ہے۔ جو شائع ہوچکی ہے۔ ایک ناول زیرِ تصنیف ہے۔

نمونۂ کلام

سحر آئی بساطِ بزمِ جانانہ اٹھانا ہو — مژدہ اے شمعِ محفل نعشِ پروانہ اٹھانا ہو
وہ جلوے حسن کو زاہد ز... — ...جلوؤں سے میں ... تماشا اٹھانا ہو

اب یہ کہکر دل کو بہلاتا ہوں انکی یاد میں — میں ہی کیا ناشاد ہوں سارا جہاں ناشاد ہے

آہیں ہی پھوٹ پڑا ان کے رنگ لالہ و گل — چمن سے ضبطِ دورِ شباب ہو نہ سکا

مری نظر نے کیا منتخب رنگ لالہ و گل — مری بلا سے اگر موسم بہار نہ ہو
ہوئے ہیں جمع عروسِ سخن کے دیوانے — اسی ہجوم میں دیکھو کہیں نثار نہ ہو

بے حجابی نے کیا دیدۂ حیرت مجھ کو — آئینہ بن کے دکھا دی مری صورت مجھ کو

تو وہاں کچھ بھی نہیں ہے کہ جہاں ہے ظاہر — تو وہاں حاصلِ کل ہے کہ جہاں لا زمیں ہے

کلی کلی میں تجھے رنگ بار دیکھا ہے — چمن چمن میں یہ شکلِ بہار دیکھا ہے

اے درِ رہنمائی دل تیرے ہاتھ ہے — میں اس جگہ کھڑا ہوں جہاں نقشِ پا نہیں
کتنا بڑا کرم یہ کیا ہے نصیب نے — مجھ سے خفا ہیں وہ مری دل سے خفا نہیں

کچھ حسن کے فسانے ترتیب دے رہا ہوں — دفتر الٹ رہا ہوں ہر پھول ہر کلی کے
شامِ غریب نکلے صبحِ ازل کے جلوے — دنیا سے ... دھوکے میں زندگی کے

ابھی وہ مجھ تماشائے اضطراب نہیں — ابھی نثار ترا درد کامیاب نہیں
زمیں قبر سے اپنے جو کیوں اٹھاتا ہے — کہ اس زمین سے آتی ہے بوئے یار مجھے

ہر سحر کو جستجو ... — زندگی دامن کشِ ایام ہے

کچھ کہو تو نثار آخر کیوں ... ہو — کیا تو ہی پریشاں ہے دنیا ہی پریشاں ہے
سجدۂ فطرت کی محراب نمایاں ہے — کافر تری انگڑائی غارتگرِ ایماں ہے
کیوں عالمِ وحشت میں صحرا کی طرف جاؤں — اللہ کی رحمت سے گھر ہی میں بیاباں ہے

مجھکو پینے سے عشق کوئی عذر نہیں — صرف پہلے مجھے انجام بتا دے ساقی
تیرے میخانے میں ایسا بھی کوئی تشنہ ہے — جو مجھے صاحبِ اسرار بنا دے ساقی

ڈبو بھی دے ناخدائی کشتی کہ ڈوب کر تہ کا راز پاؤں
کسی کا دستِ کرم بڑھا ہے طلوعِ موجِ رواں نہیں ہے
نثار ہم کو وہ یوں ہماری وفاؤں پہ دے رہے ہیں طعنے
انھیں کے منہ میں زباں ہے گویا ہمارے منہ میں زباں نہیں ہے

نمونۂ نظم

جگنو

مری پیارے چھوٹے چمکدار کیڑے — تری روشنی شمعِ راہِ ہدایت
تری برق ریزی سے جنگل فروزاں — تری نور باری تماشائے قدرت
اندھیرے میں ضو باریاں بال و پر سے — اُجالے میں جھاڑی تجھے بزمِ عشرت
تجھے دریا بازیچہ گاہِ تبسم — تجھے جھاڑیاں جلوہ گاہِ شرارت
کسانوں کے بچوں کا ارزاں کھلونا — سمجھدار لڑکوں کو وجہِ مسرت
ترے دم سے روشن ہے بچوں کی ٹوپی — تجھے دیکھکر منقلب رنگِ ظلمت
منور ہے جلووں سے صحرا کی محفل
اندھیرے میں لوگوں کو تو خضرِ منزل

نازش — سیّد عنایت علی رضوی — ۹۲

آپ ۵ر جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کو بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن مشہد مقدس ہے۔ نازش صاحب کے دادا سید حسن علی صاحب اب سے ساٹھ برس قبل بغرض سیاحت وارد پنجاب ہوئے چونکہ یہیں کی خاک دامن گیر تھی۔ لہٰذا دورانِ سفر میں بمقام سیالکوٹ سفرِ آخرت اختیار کرکے وہیں پیوندِ خاک۔ نازش صاحب کے والد سید امیر علی صاحب جو اس وقت جوان تھے۔ اور واپس وطن نہ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد لاہور کے معزز سادات گھرانے میں شادی کرلی۔ اس طرح لاہور ہی ان کا وطن قرار پایا۔ حسب دستورِ قدیم نازش صاحب نے ابتدائی معمولی تعلیم اپنے گھر ہی میں حاصل کی اور اس کے بعد اپنے ذہنِ رسا کی بدولت اٹھارہ سال کی عمر میں عربی، فارسی، اردو اور بقدرِ ضرورت انگریزی علوم پر حاوی ہوگئے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے چند علم دوست احباب کے اصرار پر اردو فارسی کے اعلیٰ امتحانات بھی پاس کئے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں نازش صاحب نے حکومتِ ہند کے مصارف پر عراقِ عرب کا سفر اختیار کیا۔ اور کامل تین برس تک وہاں رہنے کے بعد آپ اپنے مقاصد میں بحسن وخوبی کامران واپس آئے۔

نازش صاحب کو ابتدائے عمر ہی سے شعر و شاعری اور مضمون نگاری کا شوق تھا۔ جس کی تکمیل کے لئے آپ نے روزنامہ سیاست، رسالہ نیرنگ خیال۔ دلکش۔ بہارستان اور ادبی دنیا جیسے متعدد سیاسی و ادبی اداروں میں کام کیا۔ اور بالآخر اپنی طبع خداداد کی بدولت نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے ادبا و شعرا کی صفِ اول میں شمار کئے جانے لگے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں آپ گورنر بہادر پنجاب کے دربار میں شریک ہونے کے لئے مقامی عمالِ حکومت کی طرف سے گورنر ہاؤس لاہور مدعو کئے گئے۔ جہاں آپ کے مرصع قصائد کی سر دربار بیحد تعریف کی گئی۔ اسی سال کے آخر میں آپ گراموفون کمپنی کے ریکارڈنگ اسٹاف میں شامل ہوئے۔ جہاں آپ آج تک برابر اپنے فرائضِ منصبی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ بلحاظِ سیرت آپ نہایت ظریف الطبع خنداں مزاج، شگفتہ طینت اور منہ توڑ واقع ہوئی ہیں اور اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے دن بھر اپنے احباب و اہلِ دفتر کو خوش رکھتے ہیں۔ آپ کو شاعری کے تمام اصناف پر قدرت حاصل ہے۔ اردو۔ فارسی، ہندی اور پنجابی میں بلاتکان شعر کہتے ہیں۔ بالخصوص آپ کے ہندی بھجن اور پنجابی گیت خاص طور پر قابلِ تعریف ہوتے ہیں۔ آپ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے موسیقار بھی ہیں۔ آپ کے پڑھنے کا انداز نہایت دلکش اور موسیقیت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ شاعری اور موسیقی کے علاوہ آپ کھانا پکانے اور کھانے یعنی پرخوری میں فی زمانہ اپنا جواب نہیں رکھتے اور اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ کوئی بھلا آدمی آپ کو کسی تقریب پر بھی دعوتِ طعام نہیں دیتا۔ لیکن اس پر بھی آپ کی صحت ماشاء اللہ قابلِ رشک ہے۔ باوجود ان تمام اوصاف کے آپ پابندِ صوم وصلوات اور مسلمانوں

آغا عشری فرقہ کے ممتاز رکن ہیں۔ خدا نے آپ کی طبیعت میں رواداری اور حسن سلوک کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اپنے احباب کے جذبات کا احترام آپکا خاصۂ فطرت ہے۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۲ برس کے قریب ہے۔ شکل و شباہت اور لباس کے اعتبار سے نیز دہلی میں رہنے سہنے کی بدولت پورے دہلوی معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت بیخود دہلوی مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی حضرت صفی لکھنوی اور علامہ تاجور نجیب آبادی سے وقتاً فوقتاً اصلاح لی ہے۔ آجکل حضرت سیماب مدظلہٗ العالی کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔ فارسی کلام اکثر سالک صاحب کو دکھایا ہے۔ اردو زبان کے عاشق اور ہر اہلِ زبان کو اپنا اُستاد اور پیشوا سمجھتے ہیں۔ اپنے معاصرین سے نہایت پُرخلوص طریقے سے ملتے اور مشاعروں میں مرنجان مرنج مشہور ہیں۔

نمونۂ کلام

گیا ہوں لیکے تہِ خاک آرزو تیری   ہے میری خاک کے ذرّوں کو جستجو تیری
چمن میں آکے کبھی اپنا ذکرِ خیر تو سن   کلی کلی کی زباں پہ ہے گفتگو تیری
دھلا رہی ہے چمن میں ہر اک کا منہ شبنم   کہ پتّہ پتّہ کرے یاد با وضو تیری
چمن میں غنچہ و گل پہ ہے فیض عام ترا   کسی میں رنگ ہے ترا کسی میں بو تیری

نہ ہوا ہائے علاجِ غمِ پنہاں نہ ہوا   میری جینے کا کوئی آپ سے ساماں نہ ہوا
ہم رہے چشمۂ الفت میں کنول کی صورت   دامن اپنا کبھی آلودۂ عصیاں نہ ہوا

چشمِ حق بیں کی نظر میں ہے گنہگار وہی   جو کبھی اپنے گناہوں پہ پشیماں نہ ہوا
شیخ کے تقویٰ کا محفل میں بھرم کھل جاتا   ہائے اسوقت مرا دشمنِ ایماں نہ ہوا

آئے اور وہ گئے وہ غیر کی تصویر بنے   اب بتائے کوئی اس خواب کی تعبیر مجھے
وہ جو رہتا ہے ہمیشہ رگِ گردن سے قریب   اُس سے ملنے کی بتا دے کوئی تدبیر مجھے
حشر میں سے لے ہی گئی داورِ محشر کے حضور   بخشوا کر رہی آخر مری تقصیر مجھے

گئے تلاش و تجسس میں بارہا نہ ملا   جنابِ شیخ کو کعبے میں بھی خدا نہ ملا

حضرتِ رضواں سے ہوتا مرتبہ میرا بلند   کاش ملجاتی کسی کے در کی دربانی مجھے
اعترافِ معصیت ہی باعثِ بخشش ہوا   لے گئی آخر کو جنت میں پشیمانی مجھے
اور آفت ڈالدی یاروں نے پہنا کر کفن   پہلے ہی بارِ گراں تھی تن کی عریانی مجھے

شکایت کیا کریں دردِ نہاں کی   عنایت ہے کسی نامہرباں کی
یہ کیسا خواب دیکھا ہے قفس میں   الٰہی خیر میرے آشیاں کی

وہ کہتے ہیں کہ ہو شکل ماہ تم بھی خموش   جگر کے داغ جب آنکو دکھائے جاتے ہیں
میں اُن کی راہ کو پلکوں سے صاف کرتا ہوں   وہ میری راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں

جسے کہتی ہے اک دنیا قیامت   شرارت ہے تری نیچی نظر کی

شکل کوئی پہاڑ نہیں جو نہ ٹل سکے   لیکن ذرا سی ہمت مردانہ چاہیئے

نسیم — حبیب احمد صاحب متھراوی — ۹۲

آپ کا نام حبیب احمد اور تخلص نسیم ہے آپ یکم جنوری ۱۶ء کو بمقام متھرا محلہ گھاٹی ملا پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد مولوی رضی الدین صاحب متھرا کے معزز خاندان اور باوقار لوگوں میں سے ہیں آپ کے خاندان میں عہد شاہی سے خطابت کا عہدۂ جلیلہ چلا آتا ہے چنانچہ سلسلہ بہ سلسلہ نسیم صاحب کے والد ماجد خطابت کے عہدہ پر مامور ہوئے اور آپ نے اپنے فرزند رشید نسیم صاحب کو ہوشیار اور لایق دیکھ کر یہ عہدہ اپنی حیات ہی میں ان کے سپرد کر دیا چنانچہ ۱۹۳۴ء سے نسیم صاحب ہی عیدین میں خطبہ پڑھتے ہیں۔

نسیم صاحب نے ابتدائی تعلیم مولوی عبد المجید صاحب سے حاصل کی اور ۷ برس کی عمر میں کلام مجید ختم کر کے حفظ کرنا شروع کر دیا ابھی دو پارے ہی حفظ کئے تھے کہ آپ کے والد بزرگوار نے بمشورۂ جناب مولانا مولوی محمد حسین صاحب مفتی و پیش امام جامع مسجد متھرا کو علم فارسی و عربی کی طرف رجوع کیا اور مفتی صاحب مذکور نے نسیم صاحب کو اپنے تلامذہ میں شامل کیا چنانچہ نسیم صاحب نے چار برس کے عرصہ میں زبان فارسی میں آمدنامہ سے لے کر گلستان بوستاں اور سکندر نامہ وغیرہ کتب کا مطالعہ کیا اور عربی میں صرف و نحو کی تکمیل کی اس کے بعد آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو آگرہ اپنی سسرال میں بغرض تحصیل علم بھیجدیا آپ کے نانا بزرگوار جناب سید سرفراز علی صاحب نے آپ کو مدرسۂ عالیہ جامع مسجد آگرہ میں جماعت منشی میں داخل کرا دیا اور نسیم صاحب نے ۱۹۲۸ء میں بعمر ۱۲ سال الہ آباد یونیورسٹی سے منشی کا امتحان پاس کیا اور دوسرے سال کامل کے امتحان میں شرکت کی اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔

امتحان کامل کے کچھ عرصہ کے بعد آپ کی والدۂ ماجدہ کا انتقال ہو گیا اور آپ کو چند وجوہ کی بنا پر آگرہ سے متھرا منتقل ہونا پڑا نسیم صاحب اردو، فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ ہندی زبان سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جبکہ متھرا میں سینسز آفس (مردم شماری کا دفتر) کا سنیٹر مقرر ہوا اور نسیم صاحب بعہدۂ سورٹری مقرر ہوئے تو آپ کو کل کام ہندی زبان میں کرنا پڑا۔ اور آپ اپنے کل گینگ میں جو تمام اہل ہنود پر مشتمل تھا اوّل آئے۔ مردم شماری کا کام ختم ہونے پر آپ پھر آگرہ پہنچے اور مارچ ۳۲ء میں مدرسۂ احمدیہ حنفیہ آگرہ میں بعہدۂ سیکنڈ ماسٹر مقرر ہوئے اس سال آپنے اردو اعلیٰ قابلیت کا بھی امتحان پاس کیا ۱۹۳۲ء میں آپ نے بنگالی اورنیٹل پرائیویٹ انسٹیٹیوٹ آگرہ سے انٹرنیس کے امتحان میں داخلہ کرایا مگر بوجہ علالت شریک نہ ہو سکے۔ مارچ ۳۳ء میں نسیم صاحب کی شادی منشی وحید الدین صاحب ٹھیکہ دار متھرا کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی اس کے بعد آپ مدرسۂ احمدیہ حنفیہ سے مستعفی ہو کر مئی ۳۳ء سے مدرسۂ تعلیم القرآن متھرا میں ہیڈ مدرس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شاعری کا شوق آپ کو اوائل عمری ہی سے ہے چنانچہ طالب علمی کے زمانہ میں بھی اکثر اشعار کہا کرتے تھے لیکن طبیعت کا کامل رجحان فارغ التحصیل ہونے پر ہوا آپنے اکثر غیر اصلاح شدہ غزلیں مشاعروں میں پڑھیں اور اچھی خاصی داد حاصل کی لیکن بعض مخلص احباب کے مشورہ سے آپ کو ایک راہبر کامل کی ضرورت ہوئی۔ اور آپ یکم مارچ ۳۵ء کو حضرت مولانا سیماب صاحب اکبرآبادی مدظلہٗ العالی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے اس وقت سے آپ مسلسل اپنے کلام پر مولانا موصوف سے اصلاح لے رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح سے پہلے نسیم صاحب کا رنگِ تغزل قدیم رنگِ تغزل تھا اور آپ پرانی شاعری کے دلدادہ تھے لیکن

حضرت سیماب مدظلہٗ العالی کی نظرِ عنایت نے آپ کا رنگ تغزل بدل دیا۔ اور آپ نے آگرہ اسکول کی پیروی شروع کردی۔ اسی سلسلے میں آپ نے اپنے چھوٹے بھائی صبا صاحب کے مشورہ سے ایک بزم موسومہ روحِ ادب کی بنیاد بھی ڈالی جس کا مقصد متھرا کے ادبی جلسوں میں خطبہ خوانی۔ مناظمہ اور مناثرہ کا رواج دینا ہے۔ آپ اس کمیٹی کے سکریٹری ہیں اور یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ متھرا کے ادبی جلسوں میں مذکورہٗ بالا باتوں کا اضافہ ہو گیا ہے آپ کی شاعری آگرہ اسکول کے جدید رنگ میں رنگی ہوئی ہے غزل کے ساتھ ساتھ آپ نظم بھی بہ آسانی کہہ لیتے ہیں۔ آپ کا شمار متھرا کے خوش فکر اور خوش گو شعراء میں کیا جاتا ہے آپ صاحبِ تلامذہ بھی ہیں آپ کے خاص تلامذہ میں۔ ظفر، میر، محشر، رونق، شفق اور فاضل متھراوی ہیں شاعرہ شاعر ماہ فروری ۱۹۳۶ء کے انعامی مقابلہ میں آپنے تمغہ میڈل حاصل کیا ہے مدارس اسلامیہ کی دینی تعلیم کے واسطے ایک کتاب موسومہ دین کی باتیں جو چار حصوں میں منقسم ہے آپ کی تصنیف کردہ ہے اور مستقبل قریب میں شائع ہونے والی ہے۔

نمونۂ تغزل

انجمن کہتی ہے کیوں سوختہ فطرت مجھکو　　گرمیِ زیست ہے یہ سوزِ محبت مجھکو
بھول یہ ہوگئی مجھ سے، نہ کہا روزِ ازل　　عشق دیتا ہے تو دے دل بھی قدرت مجھکو
چھپنے والے مری نظروں سے اٹھا دے پردے　　کبھی معلوم تو ہو اپنی حقیقت مجھکو

میں انساں کا نہیں انسانیت کا بھی ہوں فریادی　　یہی اک راز پوشیدہ ہے مجھ بیکس کے شیون میں
تری شورش سے اے برقِ ستم مٹ نہیں سکتا　　ہمارے آشیاں کا ذکر ہے تاریخ گلشن میں
پتہ چلتا ہے مجھکو اضطرابِ برقِ سوزاں سے　　نہاں ہے جذب کی قوت بھی ترکیبِ نشیمن میں

چھپا جو بنا جائے مرے تاریک زنداں کو　　اے ایسی موج آجائے تری زلفِ پریشاں کو

نظر والے محبت کا یہی ہنگامہ سمجھتے ہیں　　بگولوں کو بیاباں کو پہاڑوں کو گلستاں کو
مری ایذا پسندی اب یہاں تک [illegible]　　کہ ساحل پر پہنچکر پھر بلا لیتا ہوں طوفاں کو
ٹھکانہ جنکا وسعت میں نہیں دنیائے فانی کی　　انھیں آکر بسانا چاہئے گورِ غریباں کو

نسیم زار آخر آہ و زاری سے بھی کیا حاصل
تحمل کی ضرورت ہے ہر اک صاحب ایماں انساں کو

اور کیا تھا یہ جو تیرے عشق کا حاصل نہ تھا　　کوئی مشکل کام میرے واسطے مشکل نہ تھا
کشتیِ امید میں بھی تھا میں طوفاں در کنار　　سامنے ساحل تھا پھر بھی سامنے ساحل نہ تھا
بڑھ گئی دنیا کی رونق کاروانِ حسن سے　　یہ خرابہ ورنہ یوں تو قابلِ منزل نہ تھا

نیاز و ناز میں کیوں ربط استوار نہ ہو　　ازل سے عشق محبت کا رازدار رہا
نسیم گلشن ہستی میں جب بہار آئی
مرادِ داغ بھی اک ابرِ نو بہار رہا

ملا ہے اوجِ علو اور منصب ماہ کامل کا　　یہ عزت ہے مرے دل کی یہ رتبہ ہے مرے دل کا
جسے ذوقِ براہیمی ملے اور فطرتِ آذر　　پجاری وہ بنے آکر یہاں سے کعبۂ دل کا
مری حیرانیوں نے دفعتہً گم کر دیا مجھکو　　نشاں مجھکو نظر آنے لگا جب تیری منزل کا
تمہارا نام لے کر گر پڑا تھا بحرِ الفت میں　　نہ تہ کا کچھ پتہ معلوم تھا مجھکو نہ ساحل کا

نسیم زار تجھکو فخر جتنا بھی ہو تھوڑا ہے
کہ تو شاگرد ہے سیماب سے استادِ کامل کا

گر اجازت دیں ہمیں یہ عشق کی خودداریاں　　ابتدائے عشق میں ہم انتہا پیدا کریں
منزلِ مقصود کا یوں تو پتہ مل جائے گا　　جذبِ ذوقِ جستجو میں فطرتِ صحرا کریں
نور بن کر چھا رہا ہے تو بساطِ دہر پر　　ڈھونڈنے والے تجھے ہر رنگ میں ڈھونڈا کریں

لے چلیں موجیں مجھے آغوشِ طوفاں میں نسیم
اہلِ ساحل دیدۂ حسرت سے اب دیکھا کریں

حریم ناز کے پردے نہیں ہیں یہ حقیقت میں　　مری چشم تمنا پاسباں معلوم ہوتی ہے
سنبھالے اعتبارِ دل کہاں جاؤں کدھر جاؤں　　مجھے ہر شے جہاں کی بدگماں معلوم ہوتی ہے

یہ اندازِ تکلم دیکھ تصویرِ تصور کا .... کہ ہر اک شے میں زبان معلوم ہوتی ہے

ذوقِ سجدہ لے ہی پہنچا آستانِ ناز پہ .... قطرہ دریا ہو گیا سرمستیٔ تقدیر سے
دوریٔ منزل مرے ذوقِ نظر کی ہے کمی .... ورنہ وابستہ ہے منزل رشتۂ تدبیر سے
آہ لے شامِ محبت یہ سیہ بختی تری .... روشنی پاتی نہیں امید کی تنویر سے
جلوہ گاہِ ناز میں ہے حسنِ جلوہ کی کمی .... وسعتیں دل کو ملی ہیں عشق کی تاثیر سے

ہمارے عشق کا احسان ہے دنیا پر .... کہ ذرے ذرے میں دیدا یار دیکھا ہے

شادماں ہے زندگی ناشادماں ہے زندگی .... عالمِ امکاں میں یکسر امتحاں ہے زندگی
ہے غریبوں کا یہ نالہ ہے یتیموں کی یہ آہ .... سچ تو یہ ہے منتشر سا اک دھواں ہے زندگی
شاہکارِ بزمِ فطرت حاصلِ کون و مکاں .... جو حقیقی زندگی ہے وہ کہاں ہے زندگی

دامنِ شوق میں تاروں کو درخشاں دیکھا .... یہ اثرِ اشکِ محبت کا نمایاں دیکھا
کوششوں سے تو کبھی تجھ کو نہ پایا ہم نے .... بے ارادہ حرمِ دل میں درخشاں دیکھا

پھر ہے ترتیبِ نشیمن کی تجھے فکر نسیم
کیا قفس میں کوئی پھر خوابِ گلستاں دیکھا

نمونۂ نثر

کاش تم بھی میرے پاس ہوتے

بہار آئی اور ہزاروں رنگینیاں اپنے ساتھ لائی —
غنچے کھلے - پھول مہکے .... درختوں پر شباب آیا —
جانوروں نے مسرت کے شادیانے بجائے - بلبل نے شاخِ گل پر گیت گائے - سب کچھ ہوا — مگر ایک تمہارے نہ ہونے سے میرا سازِ دل مضرابِ مسرت سے محروم رہا

کاش تم بھی میرے پاس ہوتے!

ساون کی اودی اودی گھٹائیں آئیں اور آسمان پر چھا گئیں - بادل آئے اور برس گئے — فضاؤں نے کروٹیں بدلیں — نئے نئے روپ کھائے اور سبزہ زار - لالہ زار - مرغزار - سمن زار فریبِ نظر بنے ..... مگر میری چشمِ تمنا تمہارے دیدار سے منور نہ ہوئی

کاش تم بھی میرے پاس ہوتے!

چاندنی رات ہے نہر کا کنارہ ہے - خاموش منظر اور پُر سکون فضا میں پانی کی لہریں سوئے ہوئے جذبات کو ہچکولے دے رہی ہیں - آسمان پر تارے چمک چمک کر اپنی مترنم آواز میں خاموش سا گیت گا رہے ہیں - بیداریٔ روح کا سب سامان موجود ہے - مگر میرے معمورۂ دل پر تمہارے فراق کی غمگین اور اداس تاریکی چھائی ہوئی ہے

کاش تم بھی میرے پاس ہوتے!

چاند نکلا — عید کا چاند نکلا — جذبات ابھرے — امنگیں پیدا ہوئیں — ہر شخص کی روح نے مسرت کی انگڑائیاں لیں — کل عید ہے — بیشک عید ہے - مگر بغیر تمہارے مجھ ہجراں نصیب کی عید کیسی!

کاش تم بھی میرے پاس ہوتے!

ابوظفر جناب نازش رضوی
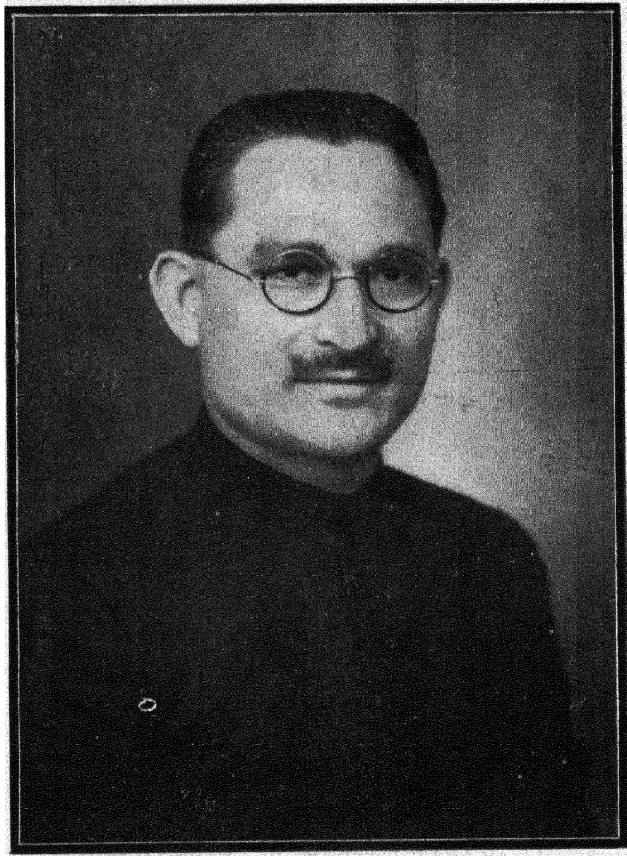
وفا (۹۳) شنکر لال صاحب اکبر آبادی

آپ کا نام شنکر لال اور وفا تخلص ہے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۱ء کو بمقام شہر آگرہ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام بھوانی پرشاد ہے۔ آگرہ کے معتبر بزرگوں میں سے ہیں۔ اور یہی آپ کا وطن ہے۔

جب وفا صاحب سن شعور کو پہونچے تو آپ کو مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ باعتبار مذہب آپ کو ہندی پڑھنا ضروری تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندی سے زیادہ اردو اور فارسی میں آپ کی طبیعت لگتی تھی۔ مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بوجوہ آپ اسکول میں داخل نہ ہو سکے اور گھر ہی پر تینوں زبانوں کی تکمیل کی۔ انگریزی بھی بقدرِ ضرورت آپ جانتے ہیں اور صدر بازار آگرہ میں ملازم ہیں۔

صدر بازار آگرہ ہمیشہ اچھے شاعروں کا مسکن رہا ہے اور ہے۔ چنانچہ مقامی مشاعروں میں شرکت کرتے کرتے ۱۹۳۱ء سے آپ بھی میدان شعر میں اتر آئے۔ ایک سال کی خاموش مشق کے بعد ۱۹۳۲ء میں اپنی غزلیں محمد اسمٰعیل خاں صاحب رنگین میرٹھی کو دکھاتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں رنگین صاحب میرٹھ تشریف لے گئے تو آپ محمد محسن صاحب محسن سیمابی اکبر آبادی کو اپنا کلام دکھانے لگے اور محسن صاحب ہی کے ایما سے ۱۹۳۶ء میں حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ آپ قریب قریب تمام مقامی مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔ بہت سمجھدار اور خلیق آدمی ہیں غزل بھی خوب پڑھتے ہیں امید کی جاتی ہے کہ جب آپ تکمیل مشق کو پہنچیں گے تو ایک اچھے شاعر ہو جائیں گے۔

نمونۂ تغزل

قطرۂ خون حاصل جذبات کامل ہو گیا
رفتہ رفتہ منجمد ہو کر مرا دل ہو گیا

شعلہ پیکر صورتِ پروانہ ہر دل ہو گیا
یا حسیں محفل میں آیا شمع محفل ہو گیا

راز سے واقف وفا ہر فردِ محفل ہو گیا
ایک نالہ مظہرِ افسانۂ دل ہو گیا

کیا ہوئیں تارِ نفس کی وہ ترنم خیزیاں
آج کیوں خاموش سازِ محفلِ دل ہو گیا

دیکھ او مست آنکھ والے ساقیٔ رنگیں ادا
دیکھتے ہی دیکھتے کیا رنگِ محفل ہو گیا

اے وفا اک خونِ ناحق کے مرکب لفظ پر
اختتامِ سرخیٔ دیباچۂ دل ہو گیا

اہلِ ساحل سے تو مل لوں ناخدا جلدی نہ کر
پھر خدا جانے میسر ہو نہ ہو ساحل مجھے

درحقیقت خالصاً وہ جلوہ گاہِ یار ہے
نام کہنے کے لئے میدانِ محشر رکھ دیا

جبھی ہوتے ہیں بجز در رموزِ عشق کامل سے
سبق لیتے ہیں دل والے مرے افسانۂ دل سے

ہمارا اور تمہارا اب اسی پر فیصلہ ٹھہرا
تم آؤ ورنہ یہ جاؤ یہ اپنی یاد بھی دل سے

گذرتے ہیں وفا ایام غم جیسے گذرتے ہیں
کٹا کرتی ہے لیکن غمزدوں کی رات مشکل سے

دونوں میں کتنا فاصلہ چشم زدن میں ہو گیا
روح بنی فلک نشیں جسم رہا مزار میں

حسن کی تیرے خیر ہو بخش سکون دل مجھے
آیا ہوں بھیک مانگنے دامن تار تار میں

سر سودہ زدہ مجھ پہ۔ ہا بار گراں برسوں
بہت ڈھونڈھا کیا تیرا سنگ آستاں برسوں

دکھا کر ان کو آئینہ بغل میں رکھ لیا میں نے
بس اتنی بات پر مجھ سے رہے وہ بدگماں برسوں

ہے طرفہ تماشا جسے جنت سے نکالا
پھر پیکرِ انساں وہی جنت کیلئے ہے

بے گاکام کیا رضواں مراد و یک ساغر میں
نہا لینے دے جی بھر کر مجھے اب حوضِ کوثر میں

کونسا ایسا راز تھا نغمۂ نے نواز میں
اپنا اثر بٹھا دیا محفل سوز و ساز میں

ڈوبتے سے پوچھئے امید بھی کیا چیز ہے
مارتا ہے ہاتھ تنکے کا سہارا دیکھکر

یاور ۹۴ حسن یاور نقوی چاندپوری

آپ کا نام حسن یاور، اور یاورؔ تخلص ہے ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء بوقت دو بجے صبح شب پنجشنبہ کو اپنی ننھیال ملک سادات میں پیدا ہوئے

آپ کے اجداد سید نثار علی پسر سید غلام کریم پسر سید محمد شاہ جن کے اجداد سلاطین مغلیہ کے ہمراہ بہ عہدہ ہائے جلیلہ ہندوستان آکر قصبہ کڑا ضلع الہ آباد میں آباد ہوئے۔ کیونکہ وہ وہاں کی صوبہ داری پر فائز تھے اور اپنے نام سے ایک محلہ آباد کیا جس کا نام بخاری محلہ ہے سادات نقوی حضرت علی نقیؓ کی نسل سے سید جلال بخاری رحمتہ اللہ کے فرزندوں میں سے تھے۔ خاندانی شکر رنجیوں سے متاثر ہو کر ترک وطن کر کے دہلی چلے آئے اور شیخ محمد شاہ صوبہ دار اودھ کے ہاں جن کا علاقہ بیرون حدود دہلی سے لیکر بجنور میں نجیب آباد تک تھا ملازم ہوئے زیدی سادات میں شادی کی کچھ عرصہ دہلی رہ کر آخر زمانہ میں چاندپور ضلع بجنور چلے آئے جو صوبہ دار موصوف کی ایک تحصیل تھی یہاں مکانات بنوائے اور جائداد قائم کی۔ بہ سلسلہ خیرخواہی ایک موضع کے معافی دار بھی تھے۔ ان کے ایک لڑکا ہوا جن کا نام سید محمد نقی تھا۔ اب انگریزی حکومت کا دور شروع تھا یہ محکمہ نمک میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے اور پنجاب میں تعنیات رہے۔ برسوں میں چھٹی پر گھر آتے تھے کیونکہ سفر میں آج کل کی سی سہولتیں نہ تھیں۔ ان کے فرزند آپ کے پردادا سید علی نقی صرف ایک ہی اولاد نرینہ ہوئے باپ کے پنشن یاب ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی یتیم ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب بھگدڑ پڑی ہے تو قصبہ "چاندپور" میں آپ کے پردادا کے والد ہی کا مکان تھا جس پر باغیوں کی یورش ہوئی۔ آپ کے مکان کی بالائی چھت سے گھر لوٹنے والوں کو بندوقوں سے نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ اس وقت آپ کے پردادا صاحب مرحوم سید علی نقی کی عمر تقریباً ۱۴ سال تھی جن کو ملازمین عورتوں کے ہمراہ بستی سے جلاوطن کر دیا تھا۔ خدا جانے کہاں کہاں یہ بے خانماں قافلہ پھرا کیا امن ہونے کے بعد بستی واپس آیا چونکہ گورنمنٹ میں دادا و پردادا صاحب کے خاص مراسم تھے اس وجہ سے بعہدۂ انسپکٹری محکمۂ نمک میں ملازم ہوئے مگر ناموافقت آب و ہوا کے باعث جلد پنشن لے لی اور اپنی جائداد کی آمدنی پر چاندپور میں خانہ نشین رہے۔ بڑے صاحبزادے (آپ کے دادا) سید علی کریم کو اپنی جگہ ملازم کرا دیا جن کو اپنے ساتھ رکھکر انگریزی تعلیم دلائی تھی ان کو اپنی ملازمت سے دلچسپی نہ ہوئی اس لئے مستعفی ہو گئے اس کے بعد اول محکمہ انجینئری ریلوے میں ملازم رہے لیکن بعد میں دیسی ریاستوں میں کارندہ کی حیثیت سے رہے اپنے ننھیالی رشتہ داروں کی طرفداری میں ایک جائداد نزاع کا بڑا مقدمہ خرید لیا۔ چودہ سال تک مقدمہ بازی میں اپنی بھی جائداد تلف کر کے آخر بعارضۂ ہیضہ اچانک انتقال فرمایا۔

آپ کے والد محترم کا نام سید علی اطہر صاحب نقوی ہے۔ مرغوبؔ تخلص فرماتے ہیں اور مرزا داغؔ دہلوی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ غزلوں کا ایک غیر مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ آپ ملٹری محکمہ میں اورسیر ہیں اور آج کل رانی کھیت میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اب شعر کہنا بہت ہی کم کر دیا ہے لیکن پھر بھی اکثر رباعیاں اور قصیدے وغیرہ کہتے رہتے ہیں۔

آپ کا نام حسن یاور نقوی ایک بشارت کا نتیجہ ہوا آپکے والد صاحب

ٹنکر لال صاحب وفاؔ اکبر آبادی

نثار حسین صاحب نثارؔ اٹاوی

سید حسن یاور صاحب یاورؔ نقوی

قبلہ کو خواب میں دی گئی تھی آپ کے نقوی بخاری خاندان میں ایک خاص نسلی امتیاز اب تک باقی ہے کہ اس خاندان والوں کی ایک خاص علامت ہوتی ہے جس سے یہ لوگ اپنے خاندان کے افراد کو پہچان لیتے ہیں۔

یاور صاحب کی ابتدائی تعلیم سبئی اور دیولالی میں ہوئی جہاں آپ کے والد صاحب قبلہ تعینات تھے اس کے بعد ان کا تبادلہ ہوجانے کی وجہ سے آپ بھی جھانسی چلے آئے اور آپ نے یہیں اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۳۴ء میں آپ نے میکڈانل ہائی اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد فوراً ہی سر عزیز الدین مسلم اسکول میں بعہدہ ایسسٹنٹ ٹیچری ملازم ہوگئے۔

شاعری کا شوق آپ کو بچپن میں طالب علمی کے ہی زمانے سے تھا چنانچہ اسکول میں اکثر "اردو یونین" کے مشاعرے وغیرہ کراتے رہے اور آپ ان میں دلچسپی لیتے رہے چونکہ آپ شاعر ابن شاعر تھے اس لئے بغیر کسی کاوش و فکر کے بہت جلد اس میدان میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھانے لگے لیکن آپ جو کچھ لکھتے تھے اس سے مطمئن نہ تھے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اپنی رہبری کے لئے رہبر کامل کو تلاش کر رہے تھے۔ آخر آپ کے ایک دوست نے حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کی طرف رجوع ہونے کا پیام دیا اور یہ مشورہ آپ کو پسند آیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں آپ نے مولانا سیماب مدظلہ سے درخواست کی کہ وہ آپ کو اپنے تلامذہ میں شامل کرلیں۔ درخواست کو شرف قبولیت حاصل ہوا اور آپ مولانا مدظلہٗ سے مستفید ہونے لگے۔

یاور صاحب نوجوان اور مرنجان و مرنج انسان ہیں۔ کیا باعتبار اخلاق کیا باعتبارِ وضع و قطع اور کیا باعتبارِ ذوقِ سلیم آپ ایک ممتاز نوجوان ہیں۔ یاور صاحب کی شاعری میں لوچ۔ رنگینی اور اثر ہے۔ نظم۔ غزل۔ فسانہ۔ سب کچھ لکھ لیتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

رباعی

بیخود مجھے للہ بنا دے ساقی ۔۔۔ فکرِ غمِ ایام بھلا دے ساقی
جو کیفِ شباب جاودانی دے دے ۔۔۔ وہ چیز مجھے آج پلا دے ساقی

شکر ہے انکی جفا و ستم سے نہیں میں بدگماں ۔۔۔ میری قسمت ہی میں یہ ہنگامۂ آلام تھا
ہر نفس فطرت مجھے کام آشنا کرتی رہی ۔۔۔ اس عنایت پر بھی میں ناکام کا ناکام تھا

ہم نے مانا گناہ ہے لیکن ۔۔۔ مفت پینے میں عار کون کرے
آج ہی کیوں نہ توڑ دیں توبہ ۔۔۔ انتظارِ بہار کون کرے
شام سے صبح، صبح سے پھر شام ۔۔۔ آپ کا انتظار کون کرے
اس نے یہ کہ کے مجھکو بخش دیا ۔۔۔ اس کے عصیاں شمار کون کرے

محوِ خوابِ اجل ہوں اے یاور
اب مجھے ہوشیار کون کرے

فراقِ دوست کی تنہائیاں الٰہی توبہ ۔۔۔ جو غمگسار تھے اب وہ بھی غمگسار نہیں
بطورِ وعدہ دئے جا تسلیاں پیہم ۔۔۔ نہ ہو اگر ترے وعدوں کا اعتبار نہیں

میں جانتا ہوں وہ ہرگز نہ آئینگے یاور
مگر یہ کہہ نہیں سکتا کہ انتظار نہیں

کبتک اے یاور ستم یوں ہم پہ ڈھائے جائینگے ۔۔۔ ہم کہیں گے حالِ دل وہ مسکرائے جائینگے
آپ کی محفل میں جبتک غیر آئے جائینگے ۔۔۔ کون پوچھے گا ہمیں ہم کیوں بلائے جائینگے
عاجزی لیلے گی خود نازو ادا سے انتقام ۔۔۔ آپ روٹھے جائیے ہم بھی منائے جائینگے

دل مانگتی ہے اک نگہ ناز دیکھئے ۔۔۔ ہوتا ہے میرے عشق کا آغاز دیکھئے

بہکی بہکی نگاہ ہے زلفیں ہیں منتشر مستی کا کھل نہ جائے کہیں راز دیکھئے
جس میں سما نہ سکتا تھا اک قطرہ خون کا وہ دل ہے آج حاملِ صد راز دیکھئے

منحرف مجھ سے نگاہِ ناز ہے یہ محبت کا مری آغاز ہے
جتنا جی چاہے ستائے جا مجھے مجھ کو تیری ہر جفا پر ناز ہے
ہم بتائیں کس کو اپنا رازِ دل یہ زمانہ تو زمانہ ساز ہے

نوجوانی میں بتوں سے پیار کیوں عیش کے موسم میں یہ آزار کیوں
آج خود ساقی ہے پیمانہ بدست ہو کسی کو جرأتِ انکار کیوں

خلش کو دلِ میں نہاں چارہ ساز رہنے دے یہ راز ہے اسے للہ راز رہنے دے
حدیثِ ماتم و سوز و گداز رہنے دے نہ چھیڑ اے دلِ غمگین یہ ساز رہنے دے
وہ ایک لمحہ بہت ہے جو عیش میں گذرے نہ دے مجھے غمِ عمرِ دراز رہنے دے
جفا شعار قسم ہے تجھے جفاؤں کی جو دردِ دل میں کوئی امتیاز رہنے دے
حقائق اپنے کسی اور کو سنا واعظ مجھے خرابِ فریبِ مجاز رہنے دے
کیا ہے خون کے قطرہ سے دل کو دل جس نے وہی، وہی کرمِ دل نواز رہنے دے
نہ پھاڑ جیب و گریباں کو اپنے دیوانے جنون و عشق میں کچھ امتیاز رہنے دے

یہ کون آج محو گلگشت ہے چمن میں بادہ برس رہا ہے پھولوں کی انجمن میں
ہوتا ہے میرے دل میں اک دردِ میٹھا میٹھا پچھلے پہر پپیہا جب بولتا ہے بن میں
بندے ہیں سب غرض کے کیں بندۂ وفا ہوں کتنا ہے فرق میرے اور ان کے چلن میں
وہ جس سے روزِ محشر پہچان جائیں مجھکو ایسی بھی اک نشانی رکھنا مرے کفن میں
تلمیذ سب جناب سیماب کا سمجھ لیں
وہ بات ہو نمایاں یا رو مرے سخن میں

آ پھر سکونِ دل نہیں حاصل ترے بغیر جینا ہے تیری یاد میں مشکل ترے بغیر

تو جانِ زندگی تھا تجھی تک تھی زندگی اب کچھ نہیں ہے زیست کا حاصل ترے بغیر
دنیا کی ہر خوشی میں ہے اک رنج کی کسک دل عیش کا نہیں متحمل ترے بغیر
اک بوند خون جس میں بجز یاس کچھ نہیں اب دل نہیں رہا ہے مرا دل ترے بغیر
جب تو نہیں ہے ساتھ تو کیا لطفِ شام غم داغِ سیاہ ہے مہِ کامل ترے بغیر

اُس کو دنیا بھر نے دیکھا اور کچھ حاصل نہیں اُس نے جسکو اک نظر دیکھا وہ اسکا ہو گیا
تم نے دیکھا اور رہا کُ اٹھی مری دنیائے دل تم نے نظریں پھیر لیں خونِ تمنا ہو گیا

آہِ دل بے اثر نہیں ہوتی ہو مگر اس قدر نہیں ہوتی
جانتا ہوں گناہ ہے لیکن بے پئے بھی گذر نہیں ہوتی

غم و عشرت سمونا چاہتا ہوں خوشی میں بھی میں رونا چاہتا ہوں
تجھے اپنا بنانا غیر ممکن میں خود ہی تیرا ہونا چاہتا ہوں

جب چھائے ہوئے ساون کے بادل کالے کالے ہوتے ہیں
وہ شیشہ بکف اور ہم سب کے ہاتھوں میں پیالے ہوتے ہیں
اک دیدنی منظر ہوتا ہے میخواروں کا میخانوں میں
بغلوں میں شیشے ہوتے ہیں ہاتھوں میں پیالے ہوتے ہیں
ہر اک کو ستا کر خوش ہونا، ہر اک سے دعائیں لے لینا
ان کافر زلفوں والوں کے انداز نرالے ہوتے ہیں

بس ایک تصویر ہے نظر میں نہ جاگتا ہوں نہ سو رہا ہوں
وہ بے حجابانہ جلوہ گر ہیں، میں ان پہ قربان ہو رہا ہوں
کسی کی محفل کسی کا گھر ہے، کسی کا زانو ہے میرا سر ہے
یہ خواب الٰہی ہے یا حقیقت، میں جاگتا ہوں کہ سو رہا ہوں
میں ان کا دامن پکڑ رہا ہوں وہ اپنا دامن بچا رہے ہیں
وہ ہٹ رہے ہیں میں بڑھ رہا ہوں وہ ہنس رہے ہیں میں رو رہا ہوں

سید حسن یاور صاحب رضا یاور نقوی کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

میرے خیال میں بھی وہ آ کے مجھے ستائے کیوں — جس نے مجھے بھلا دیا وہ مجھے یاد آئے کیوں

کیا میرے پاس دل نہیں
~~کیا میں نہیں ہوں آدمی~~ رشک مجھے نہ آئے کیوں — غیر کو آپ دیکھ کر بزم میں مسکرائے کیوں

آپ کے غم نصیب پر رحم زمانہ
~~تم نے جسے مٹا دیا غیر اس پہ~~ رحم کھائے کیوں — کوئی مری مصیبتوں میں مرے کام آئے کیوں

موت کا انتظار ہے، موت ضرور آئے گی — ابھی چلے کسی طرح، آج ہی آ نہ جائے کیوں

ان کو ہی کیوں نہ ہو خیال مجھ کو ہی
وہ بھی تو ہیں جفا شعار میں ہی نہیں ہوں بیقرار — ~~ان ہی کو ہو نہ کیوں خیال مجھ ہی کو~~ صبر آئے کیوں

ہو کسی طرح مہرباں — ربط نہ ہو جو درمیاں
لے کے وہ میرا امتحاں، ~~ہو بھی تو جائے مہرباں~~ — ~~جس کو نہ ہو کبھی خیال~~، وہ مجھے آزمائے کیوں

وہ تو جفا پرست ہیں اپنی ہی دھن میں مست ہیں
~~رحم نہ کھا کے وہ کہیں جور و جفا ابھی چھوڑ دیں~~ — میرا فسانۂ الم ان کی سمجھ میں آئے کیوں

وہ مرے بعد
جس نے نہ زندگی میں کی، قدر ذرا مری کبھی — میرا نشانِ قبر بھی ~~بعد مرے وہ~~ پائے کیوں

غالب و وارثی کے بعد کھولے زباں کیوں کوئی

یاور دل شکستہ بھی
~~یاور غم نصیب بھی~~، اپنی غزل سنائے کیوں

بے ترتیب تذکرے

حیدر — بابو امیر الدین صاحب صدیقی اکبرآبادی — ۹۵

آپ کا نام امیر الدین اور تخلص حیدر ہے۔ ۱۹۰۳ء میں بمقام لوہا منڈی آگرہ پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ تجارت ہے۔ ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے پردادا صاحب مرحوم اور دادا منیر الدین صاحب ہندوستان کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ پردادا صاحب کی وفات کے بعد آپ کے دادا صاحب عرصہ دراز تک حرم خاص میں ملازم رہے۔ غدر میں جب شاہی خاندان اور خود بادشاہ جلا وطن کر دئے گئے تو آپ بھی وہاں سے چھپ چھپا کر آگرہ تشریف لے آئے۔

منیر الدین صاحب اس وقت بفضلہ ایک سو دس سال کی عمر میں بقیدِ حیات ہیں۔ گو قوٰی میں اضمحلال پیدا ہو گیا ہے لیکن اب بھی ہمت و جرأت جوانوں سے زیادہ ہے۔ آپ کبھی سواری میں نہیں بیٹھتے ۔ میلوں پیدل سفر کر سکتے ہیں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ غدر اور مابعدِ غدر کے حالات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ برادرِ محترم حیدر صاحب کے والد جناب بشیر الدین صاحب ایک سنجیدہ اور خود دار انسان ہیں بمبئی میں زری کا ایک بڑا کارخانہ کے مالک ہیں۔

برادرم حیدر صاحب نے شعیب محمدیہ ہائی اسکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ چونکہ ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اس لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج میں باریاب نہ ہو سکے۔ اور اپنے والد صاحب کے پاس بمبئی تشریف لے گئے۔ جہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر "ٹراموے کمپنی" میں ملازمت کی۔ اسی سال آپ کی شادی میری ہمشیرہ عزیزہ دخترِ اصغر حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ سے ہوگئی ڈیڑھ سال تک ٹراموے کمپنی کی ملازمت کے بعد آپ بی بی اینڈ سی۔ آئی۔ آر میں ایک ذمہ دار عہدے پر مامور ہیں۔

چونکہ برادرِ محترم بچپن ہی سے بمبئی میں رہے ہیں۔ اس لئے بمبئی ان کے لئے وطن سا ہو گیا ہے۔ پھر بھی سال میں دو بار آپ آگرے ضرور تشریف لاتے ہیں۔ انتہائی خوش مزاج۔ آزاد خیال۔ سادگی پسند اور خود دار انسان ہیں۔

شادی کے رشتہ سے پہلے بھی آپ سے اور برادرِ معظم حضرت منظر صدیقی سے دوستانہ تعلقات تھے۔ شادی ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک آپ نے کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ آپ شعر کہتے ہیں چونکہ شادی کے بعد آپ ایک شاعر خاندان کے فرد بن چکے تھے اس لئے یہ جذبہ آپ زیادہ عرصہ تک نہ چھپا سکے۔ ماحول کی خشک سامانی اور ملازمت کی مصروفیت اب بھی آپ کو اس طرف کافی متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ لیکن کبھی کبھی یہ شغل ضرور جاری رہتا ہے مشاعروں کی شرکت سے آپ ہمیشہ بیزار سے رہتے ہیں۔ گو بمبئی کے ادبی حلقوں میں آپ بہت اچھی طرح متعارف ہیں۔ لیکن لوگوں کے اصرار کے باوجود بھی شعر نہیں سناتے۔ اور نہ کسی مشاعرے میں شرکت فرماتے ہیں۔ مطالعہ سے قلبی لگاؤ ہے۔ چنانچہ اپنی ذاتی کتابوں کے علاوہ آپ جب بھی آگرہ آتے ہیں۔ تو قصر الادب سے

رسائل۔ اخبارات، کتابیں وغیرہ اپنے ساتھ بمبئی ضرور لے جاتی ہیں۔ برادرِ محترم کو شہرت اور نام و نمود سے نفرت ہے۔ فرائض کی انجام دہی کو مقدم اور افضل تصوّر فرماتے ہیں۔ شعر بہت بلند لیکن سادہ کہتے ہیں۔ ایک سال کا عرصہ ہوا جب سے آپ نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے مشاعروں میں بحیثیت سامع کے شرکت فرما چکے ہیں۔ نظم کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی شوق ہے مضامین لکھ لکھ کر جمع کرتے جاتے ہیں۔ رسائل و اخبارات میں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔

نمونۂ تغزل

ناکام و نامرادِ وفا جان کر مجھے　　دیتا رہا فریب وہ جادو نظر مجھے
پہونچا دیا ہے عشق نے یہ کس دیار میں　　ملتی نہیں ہے اب کہیں اپنی خبر مجھے
آتے ہی اُن کے زندگی تو ہوئی نصیب　　حیرت سے دیکھتے ہیں مرے چارہ گر مجھے
ہے غالباً یہ دردِ محبت کی انتہا　　محسوس ہو رہی ہے خلش تا جگر مجھے
نیت یہ ہے کہ شرحِ مذاقِ وفا کروں　　غم سے ترے ملے کبھی فرصت اگر مجھے
دیکھوں کسی کو کیا میں ترے جلوؤں میں ہوں اسیر　　آتا نہیں ہے تیرے سوا کچھ نظر مجھے
مختارِ حسن اُن کو بنایا تو کیا ہوا　　مانا گیا ہے عشق کا پیغامبر مجھے
چھائی ہیں جب سے دل پہ گھٹائیں فراق کی　　اُس وقت سے ہیں ایک ہی شام و سحر مجھے

یوں بار بار جاؤں نہ اُس بزمِ ناز تک
حیدرؔ رکچھ اختیار رہو دل پہ اگر مجھے

یوں نظر پڑتی ہے اُنکی قلبِ مضطر کی طرف　　جیسے کوئی دیکھ لے گورِ غریباں کی طرف
پھر قدم بڑھنے لگے میری بیاباں کی طرف　　پھر نگاہیں ہیں جنوں کی جیب و داماں کی طرف
ہستی بے مایہ ہوں لیکن ہے ستارِ وفا　　آپ کیوں دیکھیں مرے حالِ پریشاں کی طرف
کیا خبر صیاد کا گھر یا نشیمن کیا جلا　　اک دھواں سا ہمنے دیکھا تھا گلستاں کی طرف
پھر بہار آئی بڑھیں دیوانوں کی پھر وحشتیں　　ہاتھ پھر بڑھنے لگے جیب و گریباں کی طرف
رہگذر میں چلمن یوں ہٹنا دشوار تھا　　تو نے دیکھا ہی نہیں حسنِ غزلاں کی طرف
آ گئی اے ہمنشیں شاید جنوں کی فصل پھر　　دل کھچا جاتا ہے خود کوہ و بیاباں کی طرف
چین لینے ہی نہیں دیتا مرا ذوقِ جنوں　　جانبِ گلشن ہیں آنکھیں دل بیاباں کی طرف
دیکھئے اب کس کو بخشی جائیں سوز آرزو کیا　　اک نظر دل کی طرف ہے اک رگِ جاں کی طرف

دو جہاں میں ہے یہی حیدرؔ امینِ بارِ عشق
دیکھتے ہیں کیا فرشتے ظرفِ انساں کی طرف

پھر ہوش و خرد مستیوں کے زیرِ اثر ہیں　　پھر مست نگاہیں کرم ساقی کی ادھر ہیں
شاید یہ حریفِ اثرِ سوزِ جگر ہیں　　نظروں کو تری دیکھ رہا ہوں کہ جدھر ہیں
ہے صرف تری ایک اشارے کی ضرورت　　آنکھیں تو ازل ہی سے مری جلوہ نگر ہیں
ہنستے ہیں نہ روتے ہیں تمہارے جگر افگار　　نالے بھی اگر ہیں تو باندازِ دگر ہیں
اے تو کہ ہے جانِ نظر و جانِ گلستاں　　رنگیں ترے جلوؤں ہی سے یہ شام و سحر ہیں
اک لمحہ بھی اب سوز سے فرصت نہیں ملتی　　کس درجہ جگر دوز محبت کے اثر ہیں

اے دوست نہ کر جلوؤں سے حیدرؔ کو پریشاں
کیوں چھیڑ رہا ہے ہمیں؟ درماندہ نظر ہیں!

قسمت سے اگر وہ ستم ایجاد نہ ہوتے　　ہم بھول کے بھی مائلِ فریاد نہ ہوتے
ہوتی ہی انھیں کیوں ستم و جور کی ہمت　　اچھا تھا جو لذت کشِ فریاد نہ ہوتے
کیا خوب تھا، تو جلوہ نما دل ہی میں ہوتا　　یوں طور پہ جلوے ترے برباد نہ ہوتے
ہوتی نہ اگر دہر میں یوں رسمِ جنوں عام　　ویران بیاباں کبھی آباد نہ ہوتے

حیدرؔ کو بھلا بیٹھے ہیں یہ اُن کا کرم ہے
اے کاش کہ حیدرؔ کو بھی وہ یاد نہ ہوتی

مسٹر اے بی فلپس بی-اے اکبرآبادی

آپ جنوری ۱۹۱۳ء میں بمقام اکبرآباد پیدا ہوئے آگرہ کے مشہور ڈاکٹر مسٹر فلپس کے بھتیجے ہیں۔ جو اپنے تمول اور شہرت کے لحاظ سے مرنے کے بعد بھی اب تک زندہ ہیں۔ ڈاکٹر فلپس کا "مکسچر" ہر قسم کے بخاروں کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا تھا۔ آپ مذہباً عیسائی ہیں۔ لیکن آپ کا مشرب صرف انسانیت اور محبت ہے۔

شاعری کا آغاز بیت بازی کے شوق سے ہوا۔ کچھ روز الہ آباد میں بھی تعلیم حاصل کی۔ بورڈنگ میں رہتے تھے۔ جہاں اکثر دال میں کیڑے نکلتے تھے۔ وارڈن صاحب کی توجہ مبذول کراتے کراتے تھک گئے۔ تو ایک روز ایک سیر حاصل نظم بعنوان "کیڑے" تصنیف کر ڈالی۔ جس کا ایک مصرعہ یہ ہے۔

"خدا نے بنائے ہیں کیڑے بھی کیا کیا"

یہ نظم چونکہ بہت پسند ہوئی۔ اس لئے آپ کو محسوس ہوا کہ آپ شعر کہہ سکتے ہیں۔ طبیعت بہت حساس تھی۔ پھر تو ذرا ذرا سی بات پر شعر کہنے لگے۔ جس نے ذرا نظر بدلی اس کے لئے فوراً چبھتے ہوئے شعر کہہ ڈالے۔ جس قدر عمر بڑھتی گئی۔ عمر شاعری بھی بڑھتی گئی۔

اسکول کی تعلیم کے زمانے میں مولوی مجاز حسین صاحب شاد رامپوری مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول آگرہ آپ کی رہنمائی کرتے رہے جب آپ کالج میں داخل ہوئے تو مولانا حامد حسین قادری پروفیسر سنیٹ جانس کالج کے فیض صحبت نے اس شوق پر اور جلا کی۔

۱۹۳۰ء میں آپ سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخل ہوئے۔ جناب ابرار حسین قادری مرحوم مدرس اردو سنیٹ جانس کالج کیطرف سے فرسٹ ایر میں ہر سال ایک طلائی میڈل کلاس میں اول آنے والے لڑکے کو ملتا تھا۔ چنانچہ یہ میڈل سالانہ امتحان کے بعد آپکو مرحمت ہوا۔ بعض طلبا کو رشک پیدا ہوا۔ اور بعض لوگوں نے اسے مولانا کی طرفداری پر محمول کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اُن کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ آپکو اردو سے لگاؤ ہے۔ تو یہ غلط احساس خود بخود دور ہو گیا۔ سینٹ جانس اور آگرہ کالج میں اکثر سالانہ انعامی مشاعرے ہوتے ہیں۔ جن میں دونوں کالجوں کے طلبا شریک ہوتے ہیں۔ آپ کو ان مشاعروں میں اکثر اول انعامات ملے ہیں۔

۱۹۳۲ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ کے سالانہ مشاعرہ میں آپ کو غزل میں اول آنے پر ایک نقرئی میڈل عطا ہوا۔

اس زمانہ میں آپ جناب مولانا نجم اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ آپ مرزا نجم کے شاگرد ۱۹۳۲ء میں ہوئے تھے۔ مولانا نجم کی شاگردی کو آپ اپنے لئے باعث صد فخر و شرف سمجھتے تھے۔ لیکن جب وہ حیدرآباد چلے گئے تو آپ کو بہت افسوس ہوا۔ آپ لکھتے ہیں۔ کہ میں شعر و شاعری سے بالکل دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ مولانا نجم نے میرا جیتی جاگتی شاعری سے تعارف کرا دیا تھا۔ مجھے شعر کہنے اور حسن فطرت کے مطالعے میں لطف آنے لگا تھا۔ ایسے استاد کا داغ مفارقت میرے لئے اپنے پدر مرحوم کے ماتم سے کم نہ تھا کوشش کی کہ یہ سلسلہ بذریعہ خط و کتابت قائم رہے۔ لیکن اُنکی گوناگوں درباری مصروفیات اور مشیت ایزدی نے ایسا نہ ہونے دیا۔ غرض ۱۹۳۵ء کے ماہ ستمبر میں میری نظر انتخاب ایک ایسی ہستی پر پڑی۔ جس کی ضرورت میرے لئے اتنی ہی ضروری تھی

جتنی زندگی کے کسی چیز کی۔ علامہ سیماب کی شخصیت ہندوستان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اگر دنیا علامہ کو بجائے سیماب کے "شیکسپیئر" کہے تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جو ہر صنف سخن پر یکساں قادرالکلام ہے۔ علامہ سیماب کی شاگردی میں ہیں نہایت مطمئن اور ترقی پذیر ہوں۔ مولانا بھی میرے حال پر خاص طور سے شفقت فرماتے ہیں۔"

نظم کے علاوہ آپ نثر سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ نے کچھ دن ہوئے ایک کتاب "مضامین" تصنیف کی ہے۔ جو علامہ سیماب کی نظرثانی کے بعد شائع ہوگی۔ ایک افسانہ بعنوان "انقلاب نظر" زیر تصنیف ہے۔

زمانہ کی موجودہ روشِ تنقید سے پریشان ہو کر آپ ایک مختصر کتاب "اصول تنقید" کے نام سے لکھ رہے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں آپ سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ کے "ڈکٹیٹر" بنا دئے گئے تھے آپ کے زمانے میں سوسائٹی کے جلسے نہایت اچھے پیمانے پر منعقد ہوتے رہے۔ مگر آپ بعض ذاتی انہماک کی وجہ سے سبکدوش ہوگئے اور باہر چلے گئے۔

آپ بہت شریف الطبع، اور علم دوست نوجوان ہیں۔ اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ کے ساتھ مشقِ سخن شروع کی تھی اُن میں سے اکثر آپ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ مستعد اور محنتی بہت ہیں۔ کالج کی تحریکات میں نمایاں حصہ لیتے رہے ہیں۔

آپ نے ایم۔ اے سالِ اول تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد سے اسکول میں مدرس ہیں۔

نمونہ تغزل

آشنا اپنی حقیقت سے اگر دل ہو جائے — خود بخود اُٹھ کے الگ پردۂ حائل ہو جائے
حسرتیں جمع ہوں میری تو بنے اُن کی شبیہ — مُشکلیں جو ہوں یکجا تو مرا دل ہو جائے
ذرے سب حسن کی بگڑی ہوئی تصویریں ہیں — جمع کر دامن میں اشک اور تو مرا دل ہو جائے
جب پریشان خیالات کی تصویروں کو — اک قرینہ سے سجا دیجئے محفل ہو جائے
اثرِ حسن جہاں سوز مسلّم لیکن — عشق بھی بات پہ آجائے تو قاتل ہو جائے

ایک آشوبِ مسلسل ہے یہ دنیا صابر
صبر فطرت میں نہ شامل ہو تو مشکل ہو جائے

خاک میں عشق کا جوہر جو نہ پنہاں ہوتا — کیوں بشر خاک کے پردہ سے نمایاں ہوتا
ذرہ ذرہ ہی سے تھا روزِ ازل اُن کا خطاب — بول اٹھتا جو مری طرح سے انساں ہوتا

وہ شاید معنی و مفہوم رازِ لامکاں سمجھے — مری نقشِ جبیں کو جو تمہارا آستاں سمجھے
کلیجہ تھام لے ہر سانس پر اس بزمِ ہستی میں — خدا توفیق دے تو ہر نفس کو امتحاں سمجھے
محبت حسن بے نقطہ ہے یا لفظِ بے معنی — نہ کچھ اہلِ زمیں سمجھے نہ اہلِ آسماں سمجھے
جنازہ جا رہا تھا دل کے ذراتِ پریشاں کا — مگر کیا دیکھنے والے تھے گردِ کارواں سمجھے
وہ حرفِ مدعا سن کر تسلی کیلئے صابر — ہمیں بھی کچھ سمجھتے ہیں تو کہدیتے ہیں ہاں سمجھے

ہزاروں پردوں میں بےپردگی نے کام کیا
حجاب محرمِ رازِ حجاب ہو نہ سکا
ترے جمال کا دُھندلا سا عکس تھا مرا دل
تمام حسن کا عالم جواب ہو نہ سکا

ظالم لہو لگا کے شہیدوں میں مل نہ جائے — دل کے لہو سے زینتِ پیکاں نہ کیجئے
کیا سہل و مختصر ہے اصولِ حیاتِ عشق — مرنے کی فکر جینے کا ساماں نہ کیجئے

شہادت کی تمنا میں رہا ہوں نیم جاں برسوں — فنا کی گود میں کھیلی ہے عمرِ جاوداں برسوں

قفس میں وہ نشیمن سے زیادہ یاد آتا ہے رہا تھا باغ میں جو پھول شمع آشیاں برسوں

نہ جانے کیا ملا ہے کیسا خانۂ دل میں
گریباں کے قریب آتا ہے او صابر دھواں برسوں

جز کراماتِ نظر کیا کہئے حسن کو اپنا ہی جلوا کہئے
راز کہہ دوں جو تبسم کا تو آپ میرے ہنسنے کو بھی رونا کہئے
ہم بھی سر پھوڑ رہے ہیں در پہ یہی سجدہ ہے تو سجدا کہئے

پی کے اک جامِ ازل تا صبحِ حشر بیخودی و ہوش سے اُلجھا کیا
مٹ گیا آج اختلافِ مرگ و زیست ناامیدی کام یہ اچھا کیا

زیست ہے ایک رقصِ بے آرام موت کیا اک سکونِ بے ہنگام
مضطرب تھی فضائے دو عالم ہائے وہ حسن و عشق کے ایام
کھینچ کر ایک آہِ زیرِ لبی بے لبی پر بھی رکھ دیا الزام

موت کو زندگی بنا صابر
زندگی آئے گی ترے کس کام

بیخودی نے کر دیا آوارۂ منزل مجھے
ڈھونڈھ سکتے ہوں تو ڈھونڈیں اب نگاہ و دل مجھے
بے کناری عشق کی مقسوم تھی میرے لئے
پار کرنے کو ملا دریائے بے ساحل مجھے
ایک ٹھنڈی سانس بن جاتی ہے ساری کائنات
یاد آجاتی ہے جب وہ گرمیٔ محفل مجھے
آج اس میں وسعتیں طوفاں کی پیدا ہو گئیں
کل تلک اک موجِ سرِ ساحل تھی موجِ دل مجھے
میری مشکل نے تجھے قطرے سے دریا کر دیا
دو قدم بڑھ کر اٹھا لے کائناتِ دل مجھے

دل کا ذرہ ذرہ صابر جلوہ گاہِ حسن ہے
کیوں نہ ہو لازم طوافِ جلوہ گاہِ دل مجھے

یہاں نگاہ کو پابندیٔ حجاب نہیں شباب عشق ہے یہ حسن کا شباب نہیں
پھر اُن کے اور مرے درمیاں ہے کیا حائل نظر ہے عینِ تصور نظر حجاب نہیں

چند مقطعے

برائے نام ہوں صابر یہ کہتی ہے دنیا کہ صبر اور محبت میں اعتدال کہاں

صبر کی خو پڑ نہ جائے نام صابر سے مجھے عشق کی دنیا میں ورنہ نام رکھا جائیگا

صابر مجھے مفہومِ صابر سے نہیں نسبت یہ نام فقط دل کے سمجھانے کو رکھا تھا

ریاض — ریاض الدین احمد صاحب اکبر آبادی — ۹۰

آپکا نام ریاض الدین اور تخلص ریاض ہے۔ والدِ محترم کا اسم گرامی فیاض الدین ابو العلائی ہے۔ جو حضرت شاہ سید محمد محسن صاحب داناپوری کے خلیفہ ہیں۔ ریاض صاحب ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ وطن خاص اکبر آباد ہے۔

ابتداءً چھ سال تک اردو فارسی اور عربی تعلیم کی تکمیل حضرت مولانا مولوی سید نثار علی صاحب اکبر آبادی سے کی۔ جب علوم مشرقیہ میں آپ کو درک حاصل ہو گیا تو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ مفید عام ہائی اسکول اور تعیب محمدیہ ہائی اسکول آگرہ میں انگریزی تعلیم حاصل کی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ریاض صاحب کی اردو اور انگریزی میں بہت اچھی قابلیت ہے۔ ۱۹۲۹ء سے عدالتِ دیوانی میں ملازم ہیں۔

آپ کی ادبی زندگی قابلِ ذکر و تقلید ہے۔ ریاض صاحب اُن نوجوانوں میں سے ہیں۔ جن کے دل میں وطن۔ قوم اور ملک کی خدمات کے سمندر موجزن ہیں۔ جو اپنی گرم لوائی اور حسنِ عمل سے پیکرِ ملت میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ آپ کی ملازمت برائے بیت ہے۔ سرکاری فرض کی ادائیگی کے بعد جتنا بھی وقت ملتا ہے۔ اُس میں آگرہ کی بیداری وفلاح کا جذبہ آپ کے دل ودماغ میں کام کرتا رہتا ہے۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ آگرہ میں اس وقت ریاض ایک تنہا نوجوان ہے۔ جو دیوانوں کی طرح اپنے وطن کی خدمت میں اپنا عزیز وقت، روپیہ اور دماغ صرف کر رہا ہے۔ وہ جھڑکیاں سنتا ہے۔ لوگ اُس کی مخالفت کرتے ہیں۔ دوست احباب اُس کا ساتھ نہیں دیتے۔ لیکن اللہ رے جذبہ صادق کہ وہ اپنی دھن میں مسلسل لگا ہوا ہے۔

ریاض صاحب نے بہت کم عرصہ میں اپنے مخلصین کے ایما اور اپنی کوششوں سے آگرہ کی اخلاقی وادبی فضا میں کئی اچھے اضافے کئے ہیں۔ مسلم لائبریری آگرہ جو کئی سال سے قائم ہے آپ ہی کی سعیٔ پیہم کا نتیجہ ہے۔ دو سال سے آپ نے "عید ڈنر" کی بھی بنیاد ڈالدی ہے۔ جس میں عید کے دن تمام مقامی اکابر کو دعوتِ طعام دی جاتی ہے۔ اور تقریروں وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اردو لٹریری سوسائٹی اور مسلم یونین کا وجود بھی ریاض صاحب کے کارنامے ہیں۔ آپ سی۔ سی ایم۔ او۔ ایسوسی ایشن کے جوئنٹ سکریٹری اور صوبہ کی جمعیت التبلیغ کانفرنس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر بھی ہیں عرصۂ دراز سے آپ ساعی تھے کہ آگرہ میں مسلم گرلس ہائی اسکول قائم کیا جائے۔ آپ اپنی کوششوں میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب یہ اسکول بھی جلد قیام پذیر ہونے والا ہے۔

جس طبیعت میں وطنی خدمت کا رجحان ہوگا۔ اُس میں ادبی ذوق کچھ نہ کچھ ضرور پایا جائے گا۔ ریاض صاحب نے جس ماحول میں تربیت پائی اور جس نوعیت سے تعلیم حاصل کی اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپ کو آسودگیٔ دماغ اور روح کی شگفتگی کے لئے شعر کہنے پڑے۔ جذباتی ہنگامی

وطن کی محبت، اکبر آباد جیسے دیارِ شعر سے لگاؤ۔ ان سب نے مل جل کر اس نوجوان شاعر کو اٹھایا۔ اور وہ بھی پورے جوش کے ساتھ مشاعروں میں شرکت۔ غزلیں سننا اور سنانا عرصہ تک یہی ہوتا رہا۔ اب مقامی جماعت بندیوں سے اثر گیر ہو کر مشاعروں کی شرکت آپ نے قطعی بند کر دی ہے۔ شعر کم کہتے ہیں۔ لیکن کہتے ہیں۔ اپنے احباب کو سناتے ہیں۔ اور خود محظوظ ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء سے آپ نے شعر کہنا شروع کیا ہے اور اسی وقت سے حضرت قبلہ علامہ مولانا سیماب مدظلہ کے شاگرد ہیں۔ طبیعت بہت اچھی پائی ہے۔ محنتی، خاموش کار، سنجیدہ اور فہیم نوجوان ہیں۔ شعر سمجھ کر کہتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ابھی چھیڑا ہے میں نے قصۂ غم قلبِ مضطر کا
ابھی سے رنگ کیوں اڑنے لگا اربابِ محشر کا

غم قیدِ قفس ہے اب نہ رنجِ یادِ گلشن ہے
کلیجہ کر چکے ہیں آشیاں برباد پھر کا

تجھے دیکھیں گے یا اعمال نامہ اپنے دیکھیں گے
وہی دن ہے ترے دیدار کا جو دن ہے محشر کا

وہ رنگِ خونِ ارماں وہ بہاریں زخمِ حسرت کی
ریاض اکثر مجھے دھوکا ہوا دل پہ گلِ تر کا

مرا خیال اگر صرفِ جستجو ہو جائے
تو کیا مجال کہ پھر پردہ پوش تو ہو جائے

اسی امید پہ گردن جھکائے بیٹھا ہوں
کہ تیری تیغ قریب رگِ گلو ہو جائے

ہیں ان پہ حالِ دلِ زار آئینہ کردوں
ذرا سی دیر اگر ان سے گفتگو ہو جائے

شگفتگی ہو نصیب بہارِ ذوق ریاض
کہ دل میں بند محبت برنگِ بو ہو جائے

دل لیکے مجھ سے دیتے ہو داغِ جگر مجھے
یہ بات بھولنے کی نہیں عمر بھر مجھے

مرنا ہی اُنکے پاؤں پہ رکھکر سر نیاز
کرنا ہے آج قصۂ غم مختصر مجھے

اللہ رے شوقِ دید کی حیرت فزائیاں
یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے

کرنا ہے آج حضرتِ ناصح کا سامنا
مل جائے دو گھڑی کو تمہاری نظر مجھے

تم دور ہو تو کس لئے دل میں مقام ہے
میں پاس ہوں تو کیوں نہیں اپنی خبر مجھے

دنیا نئی قفس کی ہے اپنے سوا جہاں
ڈھونڈے سے بھی ملا نہ کوئی نوحہ گر مجھے

پہلا سا لطفِ دل کی کھٹک میں نہیں ریاض
بھولی ہوئی نہ ہو نگہِ فتنہ گر مجھے

دیکھے کوئی کرشمے اس حسنِ فتنہ گر کے
خوش ہو رہا ہے ظالم دنیا تباہ کر کے

کیا میری دل کے ٹکڑے ملجائیں گے مجھی میں
اے جمع کرنے والے اجزائے منتشر کے

فطرت نے اپنی ظاہر کر دی ہے خوش مذاقی
بلبل کو درد دے کر گل کو حسین کر کے

اُس سے نظر ملا کر برباد ہو گئے ہم
افسانے رہ گئے ہیں ناکامیٔ نظر کے

تو نے کیوں چھیڑ دیا صحنِ چمن کا قصہ
اے صبا مجھکو نشیمن کا ذرا ہوش نہ تھا

ہائے اس جرم پہ معتوب ہوا جاتا ہوں
کہ نشیمن کی تباہی پہ میں خاموش تھا

کب مرے دستِ جنوں نے نہ دکھایا اعجاز
کب گریباں مرا دامن سے ہم آغوش نہ تھا

چند شاعرہ خواتین تلمیذ مولانا سیماب مدظلہ العالی

حیا — خورشید اقبال بیگم صاحبہ میرٹھی — ۹۸

آپ کا نام خورشید اقبال بیگم اور حیا تخلص ہے۔ زبیری خاندان کے مشہور و معروف گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی صوفی نفیر حسن ہے جو تقریباً ۲۷-۲۸ سال سے بسلسلہ ملازمت میرٹھ میں مقیم ہیں اور اب میرٹھ آپ کا وطن سا ہوگیا ہے آبا و اجداد مارہرہ شریف کے رہنے والے تھے۔

حیا صاحبہ نے کسی مدرسہ یا اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی اور یہ چیز حیرت انگیز ہے کہ آپ نے خود اپنے ذاتی ذوق و شوق سے کئی زبانوں میں مہارت حاصل کی ہندی۔ عربی اور انگریزی میں آپ کی قابلیت معراج کمال کو نہ پہونچ سکی لیکن اردو اور فارسی میں تو آپ نے وہ تجربہ حاصل کیا ہے کہ بایدو شاید۔ رسائل۔ اخبارات اور کتابوں کے مطالعہ کا شوق آپ کو اس قدر ہے کہ آپ کا انہماک دیوانگی پر محمول کیا جاتا ہے۔

۱۹۲۴ء میں آپ نے یکایک اپنے دل و دماغ کو شعری موجوں کے تلاطم سے بھرا ہوا پایا۔ اور بغیر کسی مدد و معاونت کے غزل گوئی شروع کر دی۔ کچھ نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن آپ کی رہنمائی کے لئے کسی اچھے شاعر کا کلام آپ کے سامنے نہ تھا۔ غزل کے بعض عام اور فرسودہ اشعار دیکھنے کے بعد آپ نے مستقل طور پر نظم کی طرف رخ کیا۔ اور اس انقلاب نے آپ کو چمکا دیا۔ اُسی زمانہ میں اکثر زنانہ رسائل میں آپ کی نظمیں شائع ہوئیں جو بے انتہا مقبول ہوئیں ایڈیٹر صاحب "عصمت" دہلی نے لکھا تھا کہ "آپ نے دردِ دل کی طرح نہایت آسان الفاظ میں تمام منظر بہت خوبی کیساتھ کھینچ کر رکھدیا ہے"۔ آپ لکھتی ہیں "اس تعریف کی مستحق نہ تو میں تھی اور نہ ہوں، لیکن اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری نظمیں اس زمانہ میں کس نگاہ سے دیکھی جارہی تھیں۔ مگر حقیقتاً جس ذرہ کو آفتاب بنا دیا وہ حضرت مولانا سیماب صاحب قبلہ مدظلہ کی ہستی ہے"۔

۱۹۲۵ء میں آپ حضرت مولانا مدظلہ کی شاگرد ہوئیں اور جب سے اب تک نثر و نظم پر اصلاح لے رہی ہیں ۱۹۲۹ء میں آپ کو ایک زنانہ رسالہ نکالنے کا شوق ہوا۔ بعض ہستیوں کے اصرار نے اس ذوق کو اور بھی بڑھا دیا آخرکار "خاتونِ مشرق" کے نام سے میرٹھ سے ایک ماہنامہ نکالا۔ جسے بہت زیادہ قبولیت حاصل ہوئی اور زبانی و تحریری ہمت افزائی کے لاتعداد پھول آپ پر نچھاور کئے گئے ہر طرف سے شورِ تحسین اٹھا۔ لیکن بیکار۔ اور قطعاً لاحاصل عملاً کوئی ہاتھ بٹانیوالا نہ تھا۔ آپ اپنی "صنف" کو زندگی اور عمل کی طرف لے جانا چاہتی تھیں لیکن اس پر ایک خوابِ گراں مستولی تھا۔ اور ہے۔ کچھ تو اس سبب سے اور کچھ آپ کی صحت کی خرابی کی وجہ سے رسالہ ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں پھر آپ نے ہمت کی لیکن اس مرتبہ صرف آٹھ پرچے نکل کر رہ گئے۔ آپ کو اپنی بہنوں سے زبردست شکوہ ہے لیکن آپ نے ابھی ہمت نہیں ہاری ہے ۱۹۳۲ء میں "چاندنی" کے نام سے ایک رسالہ اور نکالا۔ اور وہ بھی کچھ عرصہ بعد بند ہوگیا۔ اس کے بعد آپ بہت سخت بیمار ہوگئیں۔

۱۹۳۴ء و ۱۹۳۵ء میں آپ نے مسلسل محنت و کوشش سے "میڈیکل سائنس آف ہومیوپیتھی" میں مہارت حاصل کی صرف اس غرض سے کہ اسی طرح اپنی صنف اور قوم کی کچھ خدمت کر سکیں۔ آج کل آپ علوم مشرقیہ کے امتحانات کی تیاری میں مصروف

ہیں۔ پہلا امتحان آپ نے پنجابی یونیورسٹی سے منشی فاضل اردو کا دیں گی۔

میرٹھ میں ایک انجمنِ "اصلاح الخواتین" قائم ہے جس کی بانی بیگم صاحبہ نواب اسمٰعیل خاں صاحب ہیں، اس کے ذریعہ آپ خواتین کے جمود کو دور کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

حیا صاحبہ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں بہت اچھی طرح متعارف ہیں۔ ہندوستان کا کوئی مشہور رسالہ ایسا نہیں جس میں آپ کی نظمیں، مضامین اور افسانے شائع نہ ہوتے ہوں خصوصیت کیساتھ "پیمانہ" آگرہ میں تو بالالتزام آپ کا کلام چھپتا تھا۔ نثر و نظم دونوں پر آپ کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ بہت شگفتہ اور صاف شعر کہتی ہیں چند وجوہ کی بنا پر ابھی تک اپنا کوئی مجموعۂ کلام نہ چھپوا سکیں۔ ترتیب میں مشغول ہیں۔ غزل، نظم، گیت۔ افسانے اور نثر مضامین سب کچھ بے تکلف لکھ لیتی ہیں۔ ہندوستان کی ادب دوست خواتین میں آپ کو درجۂ امتیاز حاصل ہے۔

نمونۂ تغزل

قابلِ تحسین کیا پامردئ راحل نہیں — عشق میں دلکو خیالِ دوریٔ منزل نہیں

اندمال اندوز میرے زخمہائے دل نہیں؟ — کیا میں تیری اک نگاہِ لطف کے قابل نہیں

آپ اور تشریف لائیں پرسشِ غم کیلئے — بے اثر اتنی تو فریادِ دلِ بسمل نہیں

میری آہوں سے لرز اٹھے گی ساری کائنات — اک یہی مشکل ہے ورنہ امتحاں مشکل نہیں

کچھ نہ پوچھو اے ہمنشیں! کیفیت بربتِ حال — مختصر یہ ہے سکوں اب تک مجھے حاصل نہیں

او ستمگر یہ تغافل، یہ فراموشی تری — آج تجھ کو یادِ خورشیدِ شکستہ دل نہیں

جو میسر بر بنائے دورِ عالم ہو گئی — وہ مسرت بھی شریکِ قسمتِ غم ہو گئی

گردشِ ایام کو کیا ہو گیا حاصل سکوں — کیوں شبِ غم دل کی دھڑکن دفعتاً کم ہو گئی

مر گئی میں اے حیاؔ تو کیوں ہے یہ ماتم بپا — کون سی چیز اس سرائے دہر کی کم ہو گئی

نمونۂ نظم

شبِ ماہتاب میں

آسماں سے تا زمیں بکھرا ہوا ہے کیفِ نور — زندہ ہوئی کوہ پھر کیا داستانِ کوہِ طور

لیلئ شب کا تبسم نور سے معمور ہے — اور رنگِ نو میں دوشیزگی مسرور ہے

چاندنی سے ہو رہی ہے پتی پتی ضوفشاں — وادی و کہسار میں ہر ذرہ ہے تابش چکاں

ہر ستارہ مست ہے، بدمست ہے، بیہوش ہے — ذرہ ذرہ پہ عیاں اک مستئ خاموش ہے

تابشیں بکھری ہوئی ہیں دامنِ نظارہ پر — جم گئی ہے آنکھ دورِ انجمِ آوارہ پر

جوش پر احساسِ غم ہے شور ہے جذبات میں

اک طلاطم سا بپا ہے بحرِ محسوسات میں

اپنی اپنی قسمت

وہ ہو گا کوئی جسے زندگی میں راحت ہے — مری نظر میں تو جینا بھی اک مصیبت ہے

یقین ہو مجھے کیوں کر کہ ہے جہاں میں خوشی — میں کس طرح اسے مانوں یہاں مسرت ہے

یہ بات بھی نہیں ہوتی کسی طرح باور — کہ اس جہاں میں فقط رنج اور کلفت ہے

تو پھر میں مضطر و بیتاب دل سے کہتی ہوں

"اے غم نصیب مرے" اپنی اپنی قسمت ہے،

برسات

آج پھر سبزہ خلد آرا ہے — یعنی برسات کارفرما ہے

اوڑھ لی ہے زمیں نے سر تا سر — دلکش اور گہری سبز اک چادر

ہو گئی دشت آج لالہ زار — ہو گئے سبز پوش سب کہسار

باغ میں رنگ کا ہے ہنگامہ — دشت ہیں تر ہیتوں کا مجموعہ

سارے منظر ہیں آج گل پیرا — تو رہے بھر گئے ہیں سب دریا

ہے چمن میں بہار کا سیلاب — رشکِ جنت ہے عالمِ اسباب

بلبلوں کی نوا ہے کیف بدوش ۔ "پی کہاں" کی صدا ہے غارت ہوش

شب کی گہری سیاہی میں ہر سو
جگمگاتے ہیں سیکڑوں جگنو (ناتمام)

رباعی

دنیا نہیں مجھ کو، اپنے گھر سے اچھی ۔ عصمت، رسوائی نظر سے اچھی
عریانی مغرب ہوئی جس سے رسوا ۔ مشرق تری شام اس سحر سے اچھی

قطعہ

حدِ خیال سے بلند اپنا اک آسماں بنا ۔ عرش سے بھی جو ہو پرے اسکو تو آستاں بنا
تیری حیات کا فلک جس سے کہ جگمگا اٹھے ۔ سعی و عمل کے نور سے اک نئی کہکشاں بنا

نمونۂ نثر

اُمید

بیرحم امید! تو میرے دل کو اپنا مسکن کیوں بنائے ہوئے ہے۔؟
جب تیرا طلسم باطل ہو جائے گا، تو مجھے نہ جانے کتنے تلخ آنسو بہانے پڑیں گے!!
تو میرے افقِ خیال پر نئے نئے روپ میں طلوع ہوتی ہے !
کبھی تیرے جلوے آفتاب کی سی شانِ تجلی کیساتھ نمایاں ہوتے ہیں!!
جس طرح آفتاب کائنات کو نور و روشنی میں ڈبو دیتا ہے اسی طرح تیرے جلووں سے میرا دل منور ہو جاتا ہے۔!
یاس کے دھندلکے چھٹ جاتے ہیں، لیکن — آہ! چند مختصر ثانیوں کے لئے — !
اس کے بعد پہلے سے بھی زیادہ شدید تاریکیاں چھا جاتی ہیں — !
کبھی تو اُن معصوم روشن ستاروں کی طرح آتی ہے، جو ہمیشہ اندھیری راتوں میں طلوع ہو کر آسمان کو حسن اور زندگی بخشتے ہیں — رات بھر چمکتے ہیں اور صبح ہوتے ہی آسمان کا نور اور حسن لیکر غائب ہو جاتے ہیں،
تیرا سلوک بھی میرے دل کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے!
تو یاس دائم سے مغلوب ہو کر میرے دل کی روح لیکر اڑ جاتی ہے۔
تیری تابانیاں ظلمت سے بدل جاتی ہیں!
تو میری جمیل آرزوؤں، اور شیریں مگر عظیم خوابوں کو اپنے ہمراہ لیجانے کہاں لے جاتی ہے۔؟
وہ خواب جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے!
وہ آرزوئیں، جن کیلئے، شاید مٹ جانا ہی مقدر کیا جا چکا ہے —
آہ! بیرحم امید!!
اے وہ! جو مجھے خیال اور موہوم مسرتوں سے ہمکنار کرتی ہے — اور پھر — جب اس کا طلسم باطل ہو جاتا ہے تو — دل شکستہ و مضمحل، چھوڑ کر چل دیتی ہے،
پہلے تو میرے دل کی مملکت کو شیریں اور دلفریب خوابوں سے معمور کرتی ہے، پھر ان آرزوؤں، اور مٹ جانیوالی خوشیوں سے مملو کر دیتی ہے — اور پھر یاس کی مہلک قوتیں چشم زدن میں اس نگری کو اجاڑ کر رکھدیتی ہیں، جسے تو نے میرے مستقبل کے درخشاں، مگر تصوری مناظر سے بصد نزاکت سجایا تھا!
آہ! اے امید! کاش یہ مناظر غیر تغیر پذیر ہوتے! — مگر اب جبکہ وہ غیر تغیر پذیر نہیں ہیں تو — میرے ساتھ تو یہ کھیل کیوں کھیلتی ہے ؟

آپ کا نام گوہر اقبال اور تخلص حورؔ ہے۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی صوفی محمد نظیر حسن زبیری ہے۔ حورؔ صاحبہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو شہر میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد محترم مارہرہ شریف کے زبیری خاندان کے مشہور و معروف بزرگ ہیں۔ اور مارہرہ ہی آپ کا وطن ہے۔ آپ خورشید اقبال صاحبہ حیاؔ میرٹھی اور جناب تاجؔ زبیری میرٹھی کی چھوٹی بہن ہیں۔ حورؔ صاحبہ کو پانچ سال کی عمر میں مدرسے میں داخل کرادیا گیا۔ ابتدائی تعلیم اُردو اور کلام پاک وغیرہ کے بعد آپ کو گھر پر ہی تعلیم دی گئی۔ چونکہ گھر کا ماحول تعلیمی تھا اس لئے بغیر کسی زور و جبر کے آپ کے شوق نے خود انگریزی اور فارسی و عربی کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اردو کی اعلیٰ کتابیں اور رسائل بھی آپ کی نظر سے گذرتے رہے۔ اس طرح علومِ مشرقیہ میں آپ کو مہارتِ تام حاصل ہوگئی۔

آپ کی بڑی ہمشیرہ حیاؔ صاحبہ کو شعر و شاعری سے حقیقی عشق تھا اور آپ کے بھائی جناب تاجؔ صاحب جب مشاعروں سے واپس آتے تو آپ کو اُن کی روداد سناتے ان دونوں باتوں سے اثر لیتے ہوئے۔ آپ کا فطری ذوق ابھر آیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتی گئیں۔ آپ نے سب سے پہلی نظم ۱۹۲۶ء میں کہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماہانہ "پیمانہ" اپنے پورے شباب پر تھا۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے حیاؔ صاحبہ کی وساطت سے اپنا کلام حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہ کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجا اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی غزلیں۔ نظمیں اور فسانے وغیرہ "پیمانہ" عصمت، عفت، سہیلی۔ خاتونِ مشرق۔ چاندنی نیرنگِ خیال۔ لیلیٰ۔ ساقی، شاعر اور خلافت وغیرہ میں شائع ہونے لگے آپ کو ذوقِ شعری کیساتھ ساتھ دیگر فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی ہے مثلاً موسیقی اور مصوری وغیرہ وغیرہ شاعری پاکیزگیٔ جذبات کی حامل ہے۔ اور رنگینی و خوش ذوقی نے مل جل کر کلام میں کیف پیدا کر دیا ہے آپ کی طبیعت تنہا پسند ہے۔ عموماً ہر طبیعت کے خلاف بات اور خصوصاً غم و الم سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔ غزل سے زیادہ نظم کی طرف طبیعت کا رجحان ہے۔ نثر عبارت لکھنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کی تحریر میں ایسے ادبی لطائف ہوتے ہیں جو اکثر اُدبا کی تحریر میں بھی نہیں ملتے۔

نمونۂ تغزل

گلہ اگر ہے تو ہے چشم خونفشاں سے مجھے — نہیں ہے کوئی شکایت غم نہاں سے مجھے
تسلیوں ہی میں انجام کار جان گئی — کھلا فریب وفاؤں کا امتحاں سے مجھے
تجھی سے مجھ کو شکایت ہے کاتب تقدیر — گلہ نہ ظلم کا اُن سے نہ آسماں سے مجھے
تمہیں گراتی ہو نظروں سے وائے ناکامی — تمہیں نے کر دیا بیگانہ دوجہاں سے مجھے
اسیر ہونے کا عالم ابھی نظر میں ہے — نہ دور جانا، صیاد آشیاں سے مجھے
وہ انقلاب نہ آیا میں جس سے مٹ جاتی — گلہ یہ رہ گیا نیرنگیٔ جہاں سے مجھے
میں اس لئے رہِ الفت میں خاک ہو کے رہی — نشان اپنا ملانا ہے بے نشاں سے مجھے

نہ ٹوٹے چار ستارے بھی شامِ تنہائی
بڑا گلہ ہے یہ اے حورؔ آسماں سے مجھے

نمونۂ نظم

پریم ساگر کی ایک رات

فضاؤں پر اُداسی چھا رہی ہے — دلِ غمناک کو سہا رہی ہے
فسردہ رات کی تاریکیوں میں — مری تخئیل کھوئی جا رہی ہے

ہوائیں ہلکی ہلکی چل رہی ہیں — مری ہر سانس رک رک آ رہی ہے
ستاروں کی نگاہیں تھک گئی ہیں — [illegible] جا رہی ہے
سمندر، رات، اور مطلق اداسی — [illegible] جا رہی ہے
کنارے پر درختوں کی وہ سائے — وہ لمبی گھاس جو لہرا رہی ہے
پرندے پر سمیٹے سو رہے ہیں — ہوا کچھ موہنی سی گا رہی ہے
وہ پھولوں سے بھرا شاداب جنگل — مسلسل جن کی خوشبو آ رہی ہے
میں سب سے دور ہوتی جا رہی ہوں — مجھے ہر چیز چھوڑے جا رہی ہے

اُفق پر دور اک ننھا سا تارا
امیدوں کا ہو دھندلا سا سہارا

چمک کر اس نے پھر چھیڑا ہے دل کو — کرن پھر اس کی بڑھتی آ رہی ہے
مرا کھویا ہوا وہ عہدِ ماضی — اسی کی یاد، دل پر چھا رہی ہے
تصور میں ہے اک گذرا زمانہ — پھر اک امید دل گرما رہی ہے
مری تخئیلِ مسحورِ محبت — کہانی پھر وہی دُہرا رہی ہے
تباہی میں مجھے ڈالا ہے جس نے — وہی امید پھر بہکا رہی ہے

شکستہ اور تنہا میری کشتی — دھندلکے میں بھٹکتی جا رہی ہے
الٰہی! دور تک ساحل نہیں ہے
محبت کس طرف لیجا رہی ہے

نمونۂ نثر

"رومان سے"

ا۔ اے رومان! اے جمالِ ازلی! میں تیرے ساتھ چلوں گی۔

تیری ضیائے بسیط نے، ان تاریک اور مہیب زنجیروں کو شکستہ کر دیا ہے جو مجھے جکڑے ہوئے تھیں، اور . . . اب میں تیرے ساتھ چل سکتی ہوں!

تو جہاں چاہے مجھے لے چل۔

[illegible] ہو گئی۔ بہت [illegible] آنکھیں تیری چمک سے ماند نہ ہونے پائی تھیں۔

میرا دل ایک سنگ ریزے کی طرح بے حس، اور برف کی مانند سرد پڑا تھا۔ میں تیرے چمکیلے پروں کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکی تھی، جس وقت تک۔ تو میرے سپہرِ حیات پر طلوع نہ ہوا تھا، تو میرے لمحاتِ زندگی اس طرح بسر ہو رہے تھے جیسے کوئی رہرو حیات اپنے جادۂ مدعا سے بھٹک کر کسی ہیبتناک اور تاریکیوں سے گھرے ہوئے غار میں گر پڑا ہو۔

کسی میں دلکشی نہ تھی۔ ہر پھول بے رنگ و بو تھا۔

پُر مسرت قہقہے۔ عشرت آمیز نغمے۔ ایک دلدوز چیخ معلوم ہوتے تھے دل میں کوئی تڑپ نہ تھی۔

شاید ..... اس ..... سیاہیوں کے طوفان خیز دریا کی تاریک اتھاہ گہرائیوں میں اس قدر ڈوب جاتی کہ پھر کبھی نہ ابھر سکتی ..... کہ ..... ایک طاقتِ بے پناہ ..... ایک اثر ..... ایک سحر ..... اچانک مجھ پر چھا گیا ... اور اس تباہ کن اندھیرے سے جو ہر طرف چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا، میری امیدوں، تمناؤں۔ اور لاتعداد آرزوؤں کے مرکز دل کو ابھار لایا۔

میری آنکھیں اندھی ہونے کے باوجود روشن ہو گئیں۔ ہلکی ہلکی نرم کرنوں نے مجھے گھیر لیا، اور میں نے دیکھا کہ

اے رومان! تو ایک تابناک سورج کی طرح میرے سر پر ضیا پر توفشاں تھا۔ تو نے اپنی پوری تابانیوں کیساتھ طلوع ہو کر میری تاریک خانۂ دل کو جگمگا دیا۔

ای سورج سے زیادہ بلند و روشن رومان! اب جبکہ تیری پر تو نے میرے ہر ذرۂ دل میں، تابشیں تخلیق کر دی ہیں۔

تو نے اپنا سحر انگیز راگ میرے کانوں تک پہنچا دیا ہے۔

اپنے بازو بھی میرے لئے پھیلا دئے

میں تیرے ساتھ جانیکو تیار ہوں۔ تو جہاں چاہے لے چل۔

نسیم مسرت جہاں صاحبہ اکبرآبادی ثم الدہلوی ۱۰۰

آپ کا نام مسرت جہاں اور تخلص نسیم ہے۔ والد محترم کا اسم گرامی فخر الاطباء خانصاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی ہے۔ آپ ۱۰ ستمبر ۱۹۱۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم مذہبی کے بعد اردو فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔

چونکہ آپ کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق ہے اور ایک حکیم و فاضل باپ کی بیٹی ہیں اس لیے خاندانی اور موروثی اثر کے تحت آپ بارہ سال کی عمر میں مضامین لکھنے لگیں۔ ادھر خدا اور رسول کی محبت سے آپ کے جذبات پر تھے نتیجہ یہ ہوا کہ نثر نگاری کیساتھ ساتھ ۱۹۳۲ء میں آپ نعتِ رسول کریم صلعم اور حمدِ ربِ قدوس کے کیف و کم میں سرشار ہو کر رہ گئیں۔ اسی زمانہ میں حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ دہلی تشریف لے گئے اور اپنے دیرینہ دوست خانصاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر کے دولتکدہ پر قیام فرمایا۔ حکیم صاحب نے بہن نسیم کو مولانا مدظلہٗ کی شاگردی میں دیدیا اور ذریعۂ خط و کتابت اصلاح کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۹۳۳ء میں آپ کے نعتیہ کلام کا ایک مختصر مجموعہ "فکرِ معصوم" یا "مقدس کلیاں" کے نام سے منظرِ عام پر آ کر بہت مقبول ہوا۔ جو مفت تقسیم کیا گیا تھا۔ ۱۰ مارچ ۱۹۳۴ء کو آپ کی شادی محمد عبدالحمید صاحب قریشی بی اے سے ہو گئی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ شادی کے بعد لڑکیاں خانہ داری کے مشاغل و انتظام میں ایسی مصروف ہو جاتی ہیں کہ ادبی ذوق و شوق یکسر فنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن بہن نسیم کا محبوب مشغلہ نعت گوئی، کتب و اخبارات اور رسائل کا مطالعہ برابر جاری ہے۔ وہ اس قسم کی شاعری کو اپنا ذریعۂ نجات سمجھتی ہیں۔

نمونۂ تغزل

دے نہیں سکتا کوئی حسنِ پیمبر کا جواب ۔۔۔ مل نہیں سکتا کہیں بھی روئے انور کا جواب
سارے گل، سارا گلستاں خاک ہے کچھ بھی نہیں ۔۔۔ ہے کہاں دنیا میں زلفِ معطر کا جواب

یا نبی دامنِ رحمت میں چھپانا مجھ کو ۔۔۔ عرصۂ حشر میں جب ہونگے گنہگار طلب

سب کام میرے ہو گئے آسان نام سے ۔۔۔ بے ساختہ کلمہ اٹھی میں ہر بار "محمد"

مدینے بلا لیں مجھے میرے مولا ۔۔۔ مری شامِ غم کی خدایا سحر ہو

طور کی شمع کا پروانہ ہے ذوقِ موسیٰ ۔۔۔ میری آنکھوں سے تو دیکھو کہ مدینہ کیا ہے
آپ کے رُخ کی قسم آپکی زلفوں کی قسم ۔۔۔ میرے دن رات یہ ہیں پھر مجھے سودا کیا ہے
نہ سہی مجھ کو جو جنت نہ ملی اے واعظ ۔۔۔ میں نے دیکھا ہے مدینہ مجھے پروا کیا ہے
اے نسیم شہِ لولاک سے دنیا ہے بہشت ۔۔۔ ورنہ اس بزمِ گہِ خاک میں رکھا کیا ہے

آ رہی ہے شافعِ محشر کے قدموں کی صدا ۔۔۔ فرشِ رہ ہر چشمِ مومن عرصۂ محشر میں ہے

تمہارے نور سے دنیا کا ذرہ ذرہ روشن ہے ۔۔۔ مٹادی کفر کی جس نے سیاہی وہ ضیا تم ہو

عشقِ احمد میں مرے واسطے کانٹے بھی ہیں پھول ۔۔۔ مجھکو فردوس سے مطلب ہے میں گلزار طلب
ہے ترے واسطے خاکِ درِ احمد کافی ۔۔۔ ہے یہی تیری دوا اے دلِ بیمار طلب
سر کے بل جاؤں نسیم میں ادب سے یثرب ۔۔۔ ہے مرے واسطے آساں رہِ دشوار طلب

آئینہ — بنیادی بیگم صاحبہ فرخ آبادی — ۱۰۱

بنیادی بیگم نام۔ آئینہ تخلص۔ فتح گڈھ کے زنانہ مدرسہ سرکاری میں معلمہ ہیں۔ آپ کے دل میں علم کی محبت جنوں کے درجے کو پہونچی ہوئی ہے۔ اور تحصیل علم وکمال کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکی ہیں۔ آپ کو علمی ترقی اور اعلیٰ امتحانات پاس کرنے کا بیحد شوق ہے۔ اور ہر سال آپ کوئی نہ کوئی امتحان دیتی رہتی ہیں۔

ذوقِ شاعری بھی آپ کے علمی شوق کا نتیجہ ہے۔ اور آپ نے اپنی علم دوستی کی وجہ سے ہی شاعری کو اختیار کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے مولانا مدظلہٗ سے ذریعۂ خط وکتابت رشتۂ شاگردی قائم کیا۔

آپ کو مولانا مدظلہٗ سے بیحد محبت ہے ۱۹۳۲ء میں جب مولانا کو سارن گڈھ ممالک متوسط سے واپسی میں "مان ندی" کا حادثہ پیش آیا تو آئینہ صاحبہ نے اس وقت اپنے جذبات کا اظہار نظم کی صورت میں کیا یہ نظم تاج میں شائع ہوئی تھی اس نظم سے آئینہ صاحبہ کی نہ صرف محبت وسعادت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان کی طبیعت کی روانی بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے اور آپ ایک دختر کی والدہ بھی ہیں جس کا نام فاطمہ بیگم ہے۔

"حادثۂ مان ندی کے بعد" جو نظم آپ نے کہی وہ پیش کی جاتی ہے۔

نمونۂ نظم

"حادثۂ مان ندی کے بعد"

(اپنے شفیق استاد علامہ مولانا سیماب مدظلہٗ کی جناب میں ایک حقیر تحفۂ مبارکباد)

جوش پر آئی ہوئی موجِ پریشاں کی قسم — مان ندی کی قیامت خیز طوفاں کی قسم

ان مناظر اس فضائے خوف ساماں کی قسم — موت کی جس میں نظر آتی تھی ہیبتناک شکل

تھا جو اس کی گود میں اس طفلِ ناداں کی قسم — تھی جو کشتی میں[1] قسم اس غمزدہ خاتون کی

سانپ دل پر لوٹتا ہے زلفِ پیچاں کی قسم — یاد جب آتا ہے وہ نظارۂ طوفانِ بحر

کیا مقدس وقت تھا مریم[2] کے داماں کی قسم — جب خدا خود مستعد تھا ناخدائی کیلئے

دل بہت بیچین ہے خورشیدِ تاباں کی قسم — تاج میں جب سے مینا کی نظم آئی ہے نظر

میری نظریں مضطرب ہیں چشمِ حیراں کی قسم — دیکھ لوں کس طرح اپنے مہرباں استاد کو

چال سوچی تھی بڑی چرخِ ستم ایجاد نے

از سرِ نو زندگی پائی مرے استاد نے

آج جو آنکھوں میں طوفاں ہے وہ دریا میں نہیں — کونسا اشکِ خوشی چشمِ تماشا میں نہیں

اور کوئی چیز دامانِ تمنا میں نہیں — میں نچھاور کر رہی ہوں تجھ پہ موتی اشک کے

کوہساروں، وادیوں میں اور صحرا میں نہیں — یہ وہ موتی ہیں عقیدت کے مری جن کا جواب

ہے وہ کیا دولت جو میری فکرِ زیبا میں نہیں — ہیں ترے ذہنِ منور میں خزانے عرش کے

آج تجھ سا ناخدا اِ شاعری دنیا میں نہیں — تیرے دامن سے ہیں وابستہ ہزاروں کشتیاں

کوئی میرا رہنما اس راہِ تنہا میں نہیں — اک نگاہِ لطف مجھ پر بھی کہ ہوں تیری کنیز

اور حسرت کوئی قلبِ موج آسا میں نہیں — تجھ سے امیدیں ہیں وابستہ حصولِ علم کی

کی رہا کشتی تیری اللہ نے طوفان سے

تو بھی کر مجھ کو سبکسر علم کی ہیجان سے

[1] اس کشتی میں ایک ہندو خاتون اور اس کا دو دن کا بچہ بھی تھا۔
[2] محمد صادق صاحب مینا بی اے۔

عزیزہ عابدہ خانم مرحومہ متھراوی

عزیزہ عابدہ خانم نام۔ نسرین تخلص۔ منشی ذکاءاللہ وکیل متھرا کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ اور عابد رضا خاں صاحب جمال صابری سیمابی کی بیوی تھیں۔ جمال صاحب کو ان سے بیحد محبت تھی۔ بڑی سلیقہ شعار اور علم دوست خاتون تھیں۔ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ذوقِ شعری سے متاثر ہوکر خود بھی شعر کہنے لگیں۔ اور چونکہ ان کی خسرال میں کئی شاعر تھے اس لئے ذوقِ شاعری کی تکمیل میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

ابتدائی ذوقِ شاعری کی تکمیل کے بعد آپ نے اپنے شوہر کی تحریک پر مولانا مدظلہٗ کی طرف رجوع کیا۔ آپ کی اکثر غزلیں اور نظمیں پیمانے میں شائع ہوئیں۔ افسوس کہ آپ کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ آپ بہت اچھی شاعرہ ہوتیں۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ ایک بچہ شاہد جمال آپ کی یادگار ہے۔ جمال صاحب کو اپنی مرحومہ بیوی سے اس قدر محبت تھی کہ آپ نے اب تک دوسری شادی نہیں کی۔

نمونۂ نظم

عورت اور عمل

خلا میں سانس سے کچھ کام لینا بھی عمل ہی تھا — گری اور گر کے دل کو تھام لینا بھی عمل ہی تھا
زبانِ لا بیاں سے کام لینا بھی عمل ہی تھا — سحر سے اٹھ کے وقتِ شام لینا بھی عمل ہی تھا
کمر پر گیسوئے شب فام لینا بھی عمل ہی تھا — مذاقِ جم سے فالِ جام لینا بھی عمل ہی تھا
جھکا کر سر تری احکام لینا بھی عمل ہی تھا — شبِ تاریک میں آرام لینا بھی عمل ہی تھا
مقدر میں غم و آلام لینا بھی عمل ہی تھا — بلا سے گردشِ ایام لینا بھی عمل ہی تھا
سرِ منزل حسابِ گام لینا بھی عمل ہی تھا — نظر سے امتحانِ سام لینا بھی عمل ہی تھا

مری ہر سانس جب اس درجہ مصروفِ عمل ٹھہری
تو میری زندگی کیوں اس قدر طولِ امل ٹھہری

مری سینے میں جب معظم ہی کار دو جہاں یا رب — تو کیوں معذور رکھتی ہیں مجھے ناکامیاں یا رب
مری آواز پر چلتی ہیں جب سب کارواں یا رب — مری آواز پہ جب جھومتی ہیں بادباں یا رب
تکلم پہ مری جب لوٹ ہے رنگِ بیاں یا رب — مری جنبش پہ تحرک ریز ہے جب ہر بلا یا رب
جبیں افروز ہر سر جب ہے میرا آستاں یا رب — مری در کی گدا ہیں جب سلاطینِ زماں یا رب
مری انداز پر جب اس قدر ہے ناز آں یا رب — مری ہر ناز میں جب اس قدر ہیں سختیاں یا رب
مری اعجاز سے جب ہل گئی کوہِ گراں یا رب — مری ہر سانس سے جب تک گئی ہفت آسماں یا رب

تو کیوں اس درجہ روکی جا رہی ہوں کارواں ہو کر
مسافر بن گئی ہوں ختمِ منزل کا نشاں ہو کر

مجھی اک سانس تو لینے دو قامت کی درازی میں — مجھے کچھ کام کرنے دو نظر کی سحر سازی میں
ہزاروں حکمتیں پنہاں ہیں میری عشوہ بازی میں — ہزاروں قوتیں ہیں ایک میری نازک طرازی میں
وہ میرا فلسفہ تھا اجتہادِ فخر رازی میں — جھلکتی تھی مری فطرت تجلائے ایازی میں
میں در پردہ محرک ہر عراقی و حجازی میں — میں بے پردہ عیاں ہر طرۂ رنگِ مجازی میں
چمن کی رنگ بیزی میں کلی کی بے نیازی میں — عجب نیرنگ ہے میری نقوشِ امتیازی میں
مری آزادیاں تحلیل ہیں ہمت گدازی میں — پھر آخر دیر کیوں اتنی ہے میری دلنوازی میں؟
مری پابندیوں کو نغمۂ فتورِ عمل کر دو — مجھے آزاد کر دو اور مجبورِ عمل کر دو

نوٹ:- رابعہ خاتون پنہاں اور بلقیس جمال جمال بھی مولانا مدظلہٗ سے ایک عرصے تک اصلاح لیتی رہی ہیں۔ اب شادی ہو جانے کے بعد ان دونوں شاعرہ خواتین کا ذوقِ شعری خاموش ہے۔

یادِ رفتگاں

"تلامذۂ خلد منزل"

۱۹۳۷ء

چھُپنے والی صورتوں کو دے نہ الزامِ حجاب
خاک میں کردی گئیں پنہاں، کہ پنہاں ہوگئیں؟

سیماب

آسودگانِ منزل کے نام!

موت تو انسانِ فانی کے لئے قانون ہے ... فطرتِ شاعر بقائے خاص کی ممنون ہے
نفسِ شاعر فطرتاً نقشِ فنا پیرا نہیں ... یعنی اُس کی زندگی میں موت کا جھگڑا نہیں (سیمابؔ)
زندگی اس کی نشاطِ روح کی تفسیر ہے ... موت اسکے محو ہو جانے کی اک تصویر ہے

دنیا کی رنگینیاں اور بوقلمونیاں اپنی جگہ کتنی ہی جاذبِ توجہ کیوں نہ ہوں، لیکن "واہ" کے ساتھ کبھی کبھی "آہ" ـــــ بھی نکل ہی جاتی ہے موت کا مضبوط چنگل نہ تو امیر کو چھوڑتا ہے نہ غریب کو۔ نہ حکیم کو نہ فلسفی کو نہ شاعر کو اور نہ ادیب کو۔ غرض یہ وہ تلخی ہے جو مرنے والے کے لئے بادۂ سکوں اور آنسو بہانے والوں کے لئے باعثِ اضطراب ہے۔

میرے دیکھتے دیکھتے میرے کتنے ہی معنوی بھائی یعنی حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کے ہونہار شاگرد بساطِ دہر کی شورسامانیوں اور رنگینیوں کو چھوڑ کر روحِ بادہ بنکر اڑ گئے ـــــ آج اُن کی یاد سے اُن کے ہر عزیز کا سینہ گرم ہوگا۔ لیکن مجھ سے پوچھئے جب میں تمام تذکرے ختم کر چکا اور اپنے یہ مرحوم بھائی مجھے یاد آئے تو دل یکسر خون بنکر رہ گیا۔ اِن میں "آگرہ اسکول" کے ایسے ایسے ہیرو تھے جن سے مستقبل کو درخشانیاں ملتیں۔ لیکن اللہ رے ـــــ بے نیازی کہ بجائے دنیا کو اپنے نفوس سے شعلہ بار کرنے کے آسمانوں پر نور باریاں کرنے چلے گئے۔

میرے مرحوم بھائیوں کی روحیں مجھ سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ میں اُن کا ذکر بھی ضرور کروں۔ اور حقیقتاً اس تذکرے کی اشاعت سے میرا مقصدِ اوّل یہی تھا کہ میں اپنے تمام مرحوم بھائیوں کے کلام و کام کو یکجا کروں لیکن افسوس کہ صرف چند مرحومین کے حالات اور تصویریں مل سکی ہیں اور میں انھیں پر اکتفا کر رہا ہوں۔ ان مرحوم زخشندہ ستاروں میں جو اب غروب ہو چکے ہیں حاجی محمد عمر عمرؔ اکبرآبادی مرحوم۔ ارشاد احمد خاں ارشادؔ نظامی اکبرآبادی مرحوم۔ سید عباس علی سرورؔ اکبرآبادی مرحوم۔ غلام حسین تبشرؔ بی۔ اے ابجؔ تسری مرحوم۔ محمد حنیف ہاشمی خمارؔ بی۔ اے مرحوم۔ محمد یٰسین دلکش علائی مرحوم۔ منشی بلدیو سہائے صحرائیؔ سروری سیمابی مرحوم مہر الٰہی انجمؔ میرٹھی مرحوم بشیر الدین بشرؔ اکبرآبادی۔ احمد بخش تائبؔ نصیرآبادی مرحوم۔ غلام جیلانی ثمرؔ اکبرآبادی مرحوم منشی الطاف حسین جوہرؔ اکبرآبادی مرحوم جان محمد اسمٰعیل سیٹھ جانیؔ مرحوم۔ منشی امیرالدین نظرؔ اکبرآبادی مرحوم شفیع احمد وفاؔ متھراوی مرحوم وغیرہ ہم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میں **یادِ رفتگاں** کے اس حصّہ کو ایصالِ ثواب فاتحہ کے بعد

"اِن مقدّس اور شعر پرور روحوں"

کے نام معنون کرتا ہوں۔ جن مرحوم برادرانِ عزیز کے حالات میں اس حصّے میں نہ دے سکا اُن کی روحوں سے معافی خواہ ہوں۔

اعجاز صدیقی اکبرآبادی

آپ کا نام سید عباس علی اور سرور تخلص تھا۔ ۱۹۰۲ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے خاندان کا سلسلہ آگرہ کے مشہور نواب عابد علیخاں مرحوم سے ملتا ہے (پورا شجرہ حیاتِ جانی میں دیا گیا ہے) آپ کے والد محترم کا نام سید یعقوب علی ہے۔

مرحوم نے ابتدائی تعلیم کی تکمیل مولوی نجم الدین صاحب مرحوم سے کی تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مختلف ذریعہ اختیار کئے گئے۔ کیونکہ آپ کے والد صاحب کا سلسلۂ ملازمت ایک جگہ بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں محکمۂ تار میں بشاہرۂ ۵۰؍ ملازم ہوئے لیکن ذوقِ تعلیم بدستور تشنہ رہا۔ اور حتی الامکان اپنے ذوق کی پذیرائی کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں چند وجوہات کی بنا پر سرکاری ملازمت ترک کرکے ریلوے کے محکمۂ تار میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڈھ یونیورسٹی کے امتحانِ میٹرک میں شریک ہوئے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ ڈگریاں حاصل کریں۔ لیکن نصابِ تعلیم کی خرابی اور ناقص تعلیم سے یہ ہی مناسب سمجھا کہ پرائیویٹ طور پر اپنی قابلیت بڑھائی جائے۔ چنانچہ اسی خیال کو مدِنظر رکھ کر آپ نے مطالعہ کو جاری رکھا۔ اور اُس کو اس معیار پر پہونچا دیا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں انگریزی مضامین لکھنے شروع کئے۔ یہ اس جذبہ کے ماتحت تھا کہ اسلام اور اکابرینِ اسلام کے خلاف جو مضامین اس زمانے میں شایع ہو رہے تھے اُن کا جواب دیا جائے۔ چنانچہ لاہور کے "ایسٹرن ٹائمز" میں مرحوم کو جگہ مل گئی اور اُن کے مضامین کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ مضامین نہایت پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ اور ایڈیٹر صاحب نے خاص نوٹ کے ساتھ مرحوم کے مضامین شایع کئے۔ اسی زمانہ میں میرٹھ سے ہفتہ وار اخبار "تاج" شایع ہوتا تھا اس میں سرور مرحوم نے انگریزی کے بہت سے مضامین کو ترجمہ کرکے اُس کے صفحات کو چار چاند لگائے۔ ترجمہ کرنے میں اس درجہ اہلیت تھی کہ بیک وقت بغیر کسی وقت کے صفحے کے صفحے ترجمہ کر دیتے تھے۔

۱۹۲۸ء میں مرحوم مولانا سیماب مدظلہ کے شاگرد ہوئے۔ شعرگوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ مولانا مدظلہ کی شفقت اور اُن کی ارادت نے بہت جلد مقامی اور غیر مقامی شعرا میں مرحوم کو ایک ممتاز درجہ دے دیا تھا۔ نہایت ملنسار۔ منکسر۔ اور خاندان پرور جوان تھے۔

۱۹۲۸ء میں ٹیگور کے انگریزی افسانوں سے متاثر ہوکر مرحوم نے اخبار "ریاست" دہلی میں چند افسانے بھیجے اور ان کی مقبولیت پر بیشتر رسائل اور اخبارات میں یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ ریاست دہلی۔ مشیر سلطنت دہلی۔ "پیمانہ" آگرہ۔ تاج آگرہ میں ان کے افسانے مسلسل شایع ہوتے رہے۔

مرحوم کو علمی شغف اس درجہ تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن ملازمت کی مصروفیتوں اور اپنی پیہم شدید علالت کے باعث دل کی حسرت نہ نکال سکے۔ ۱۹۳۴ء میں مرحوم دردِ گردہ میں مبتلا ہوئے اور زندگی کی آخری سانسوں تک پھر ادبی ہنگاموں میں شریک نہ ہو سکے۔ مرحوم نے ایک قلیل عرصہ میں کئی تصانیف مرتب کرلی تھیں۔ ایک امریکن انشا پرداز "ہوتھورن" کے ایک طویل افسانے کا ترجمہ کیا۔ اور "قربانِ روح" کے نام سے طبع کرایا۔ آگرہ کے

ایک مشہور شاعر جناب جانی اکبرآبادی جو ریختی کے استاد تھے اُن کی سوانح حیات اور کلام کو اپنے ہی خرچ سے طبع کرایا۔ حیات "تھامس ڈے" اور اپنے افسانوں کا مجموعہ اپنی زندگی میں شایع نہ کر سکے۔ ۸ نومبر ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ عالم نزع میں اپنے ورثا سے وصیت کی کہ میرے مرنے کی اطلاع میرے استاد مولانا سیماب اکبرآبادی کو ضرور دے دینا۔ انتہائی خلیق۔ بردبار۔ مسکین طبیعت اور حسّاس نوجوان تھے۔ فطرت کو منظور نہ تھا کہ سرور اپنے سحر آگیں نغموں سے دنیا کو زندگی اور زندہ دلی کا مرکز بنائے رکھیں۔ مرحوم کو مزاحیہ افسانہ نگاری میں ایسا ملکہ تھا کہ لوگ ہنستے ہنستے پریشان ہو جاتے تھے۔

نمونۂ کلام

بے نقاب اُن کا اگر چہرۂ زیبا ہو جائے — چشمِ نظارہ میں اک حشر سا برپا ہو جائے
موت اور زیست کا جو راز ہے افشا ہو جائے — کاش خاموش ہنگامۂ دنیا ہو جائے
وسعتیں حسن کی ہیبت سے سمٹ جاتی ہیں — ورنہ ہر ذرّہ اگر چاہے تو صحرا ہو جائے

عشق میں دل کا ماجرا بارکشِ زباں نہیں — جس کو نظر بیاں کرے نوکِ زباں پہ آئے کیوں
حسن تباہ کن سہی عشق ہلاک کن سہی — جس پہ تری نظر رہے اس کو کوئی مٹائے کیوں

دل ہی نہیں ہے ماتمیٔ مرگِ آرزو — دنیا مری نگاہ میں اب سوگوار ہے
شبنم تو اک فریب ہے اپنی نگاہ کی — پڑ ہی میں ان گلوں کے کوئی اشکبار ہے

نشیمن تک تو آ پہونچا ہوں لیکن کیا سے کیا ہو کر — غبارِ کارواں ہو کر چراغِ رہنما ہو کر

اے گنہگارِ محبت تو نے توبہ کی فضول — فردِ عصیاں میں بھی گنجایشِ تقصیر تھی

رنگینیٔ گلشن سے نظارہ پریشاں ہے — آغوش میں پھولوں کی شاید کوئی پنہاں ہے
یہ آگ محبت کی محدود نہیں ہم تک — ہر ذرہ محبت میں صد شعلہ بداماں ہے

تاثراتِ محبت کا پردہ دار ہوں میں — اور اس پہ مرگِ تمنا کا سوگوار ہوں میں

آہ وہ دن جب تو سل سے نگاہِ شوق کے — ایک میں نے اور اک شرط آپ نے منظور کی

حسرت ہے جس کی چشمِ تماشا لئے ہوئے — موسیٰ بھی تھے اسی کی تمنا لئے ہوئے

نمونۂ مزاح نگاری

"جس طرح مداری کا بکرا کھونٹے پر چاروں پاؤں سے کھڑا ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح فجّو کے ابّا پاؤں اُٹھائے ایک اینٹ پر بیٹھے ہوئے متواتر تین گھنٹے سے برساتی مینڈک کی طرح ٹرٹر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے ہائے ہائے کیسا زمانہ آگیا ہے! پہلے ہڈی کو دیکھتے تھے ہڈی کو روپیہ کے سوا من گیہوں آتے تھے۔ ایک کماتا تھا دس کھاتے تھے وہ پہلی سی رنگ رلیاں ہی باقی نہیں ہیں پہلے لوگ پانچ پانچ سیر گاجریں کھا جاتے تھے۔ تندرستیاں اچھی تھیں جگہ جگہ اکھاڑے تھے۔ لوگ گلی کوچوں میں گیڑیاں کھیلتے تھے۔ اور رات رات بھر محلوں میں جگار رہتی تھی۔ کیا مجال جو تنکا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔"

یہ طول طویل نصیحتیں جو فجّو سے نہ سنی گئیں تو وہ یکایک سے کبوتروں کا دانہ تیار کرتے کرتے اُٹھا۔ تیل ملے ہوئے بدن پر کبوتروں کی بیٹ اور پر چپکے ہوئے تھے لنگوٹ باندھے ہوئے اکڑتا ہوا

باپ نے کہا ... اور مٹھی باندھ کر اپنی کلائی کو دکھاتے ہوئے
کہا "... کلائی کی ہڈی ذرا دیکھو کتنی چوڑی ہو گئی
ہے اور ذرا دیکھو پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا! کتنی چربی ہے کبوتر میں
چراتا ہوں اور دو سیر دون کے ٹکڑاتا ہوں سب کو بچا کر اپنی خوراک
کا انتظام کرتا ہوں، سوتے وقت سیر بھر دودھ، صبح ایک آنہ کی
قیمہ بھری کچوریاں اور پاؤ بھر گڑ کے سیو، دوپہر کو تین سیر گنڈیوں
کی یخنی اور آدھ سیر بھنا ہوا گوشت کھاتا ہوں۔ تم دیکھتے نہیں ہو
ایک سانس میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو ٹھیکس بھی لگا لیتا ہوں مگر تم سے
پھر بھی کہیں شادی کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ دو سو کبوتروں کی دیکھ بھال
کوئی کھیل نہیں روزانہ دو ڈلیاں بیٹ کابک سے نکالتا ہوں دو سیر دانہ
بھگو کر خود بیٹھ کر چگاتا ہوں۔ شام اور صبح تین تین گھنٹے کھڑے ہو کر
انھیں اڑاتا ہوں چیختے چیختے بعض وقت حلق میں کانٹے پڑ جاتے
ہیں اور سیٹی بجاتے بجاتے ذرا میرے ہونٹھ تو دیکھو کیسے ڈبل روٹی
ہو گئے ہیں گھر میں عورت ہو تو کام میں ہاتھ بٹائے کبوتروں کی پرد
اور بڑھائی جائے۔ نصیرا کو دیکھو جب سے شادی کی ہے سو کبوتروں
کے چار سو کر لئے ہیں۔"

(نظر) منشی امیر الدین وارثی اکبرآبادی (۱۰۷)

امیر الدین نام نظر تخلص۔ اگرہ کے محلہ نیل کٹرہ میں رہتے
تھے۔ نظر مرحوم مولانا کے بہت قدیم شاگردوں میں تھے۔
سال تلمذ غالباً ۱۸۹۶ء ہے شعر بہت سلیس اور عام فہم
کہتے تھے۔ چھریرہ بدن اور ضعیف الجثہ آدمی تھے۔ مگر
بڑے محنتی تھے۔

۱۸۹۷ء میں جب کان پور کی مشہور نورتھ ویسٹ ٹینری
میں بحیثیت مستری ملازم ہو گئے تو مولانا کو بھی اپنے پاس
بلا لیا۔ جہاں وہ کان پور کی اسی ٹینری میں بحیثیت کلرک کچھ
عرصے تک ملازم رہے۔ مسٹر دکونہ اور ڈی ایسائی دو عیسائی
نوجوان بھی اسی ٹینری میں ملازم تھے جو اردو شاعری سے بیحد
دلچسپی رکھتے تھے یہ دونوں بھی مولانا مدظلہ کے شاگرد ہوئے۔

۱۸۹۹ء میں نظر مرحوم مولانا کو اپنے ساتھ دیوہ شریف
لے گئے۔ جہاں ان کی تحریک اور مشیت الٰہی کی تائید سے
مولانا حضرت حاجی سید وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید
ہوئے۔ نظر صاحب قبلہ حاجی صاحب قدس سرہ کے پہلے سے
مرید تھے۔ محلہ گوال ٹولی کان پور میں مولانا اور نظر مرحوم ایک ہی
مکان میں رہتے سہتے تھے دونوں عیال دار تھے۔ اور دونوں
میں یگانگت بڑھتے بڑھتے رشتہ داری کی حد تک پہونچ
گئی تھی۔

برادر محترم حضرت منظر صدیقی اسی زمانے اور اسی مکان
میں بمقام کان پور پیدا ہوئے تھے۔ اور نظر مرحوم نے انھیں
گودوں میں کھلایا تھا۔

۱۹۰۵ء میں نظر صاحب کا کان پور میں بعمر جوانی
انتقال ہو گیا۔ منشی قمر الدین باغ اور نظر مرحوم دونوں کی
شاگردی کا زمانہ ایک ہی ہے۔ باغ صاحب اب تک بقید حیات
موجود ہیں مگر اب مدتوں سے شعر نہیں کہتے۔ حاجی عبد الستار
صاحب سغیر اکبرآبادی بھی انھیں کے ساتھی ہیں مگر اب وہ
بھی مذاق سخن سے معرا ہیں۔

افسوس ہے کہ نظر مرحوم کا کوئی ایک شعر بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

عمر — حاجی محمد عمر صاحب اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۸)

آپ کا نام محمد عمر اور تخلص عمر تھا۔ حاجی صاحب کے مورثِ اعلیٰ ڈیڑھ صدی قبل عہدِ شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں قصور سے ہجرت کر کے آگرہ آئے تھے اور فرمانِ شاہی کے مطابق آگرہ کے ایک محلہ قاضی پاڑہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ مرحوم کے اسلاف بڑے زبردست تاجر تھے خود حاجی صاحب آگرہ کے مشہور اور بڑے سوداگر تھے اور یہاں کے رئیسوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ ۱۲۱۹ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا نام شیخ محمد عظیم تھا۔ جو ایک زبردست تجارت پیشہ بزرگ تھے۔ آگرہ میں ان کا خاص اثر تھا۔ لوکل ایجنسی۔ میونسپل بورڈ اور سنٹرل جیل کے ممبر بھی تھے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ تجارت پیشہ لوگوں میں تعلیم کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے لیکن قدیم زمانہ میں تجارت پیشہ حلقوں میں تعلیم بحدِ کافی تھی۔ جس کی تاریخ شاہد ہے۔ عمر خیام نیشاپوری ایک تجارت پیشہ باپ کے فرزند تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ حاجی صاحب جس عہد کے بزرگ تھے۔ اُس عہد میں مشرقی تعلیم جزوِ زندگی سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ آپ کو بھی عربی فارسی اور مذہب کی تعلیم دی گئی۔ البتہ آپ مغربی زبانوں سے نا آشنا رہے لیکن تجارت میں آنے کے بعد انگریزی میں بھی مہارت تام حاصل ہو گئی۔ آپ کو تجارت کے ساتھ ساتھ تصوف سے ہمیشہ گہری دلچسپی رہی۔ کیونکہ حاجی صاحب کا دل معرفت اور روحانیت سے پُر تھا۔ اس لئے ہمیشہ رہبرانِ معرفت سے عقیدت رہی۔ تمام عمر فقرا اور صوفیائے کرام سے فیض اُٹھایا۔ حضرت مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا بخاری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت بابا احمد علی شاہ صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید لطیف احمد شاہ صاحب سہوانی سے آپ کو فیضِ روحانی پہونچا۔ یہ حقیقت ہے کہ نیک انسانوں کی صحبت خدا رسیدہ بزرگوں کی خدمت انسان کی روح کو روشن اور پاکیزہ کر دیتی ہے، چنانچہ حاجی صاحب میں عرفان الٰہی کی جھلک نمایاں ہو گئی تھی۔ ان کے پند و نصائح اور ارشادات سے لوگ مستفیض ہوتے تھے۔ آپ نہایت صلح کل، خلیق، مردم شناس۔ صوفی منش، خاندان پرور اور بزرگ ہستی تھے۔ آپ کی وفات سے ڈیڑھ سال قبل فالج کا اثر ہوا اور اسی مرض میں ۱۳۵۲ھ میں انتقال فرمایا۔ اور اپنی بنائی ہوئی درگاہ واقع "پچکویاں" میں دفن ہوئے۔ جہاں ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔

حاجی صاحب کا شاعر ہونا بھی معجزات سے تھا۔ جوانی اور عالمِ شباب کی حدود سے گذر کر جب آپ پیری کے نشیب و فراز کو طے کرنے لگے تو ۵۲ سال کی عمر میں شعر گفتن کا شوق پیدا ہوا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حاجی صاحب مرحوم تصوف اور معرفت کی بہت سی حدیں طے کر چکے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ ایک بشارت کے ماتحت حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ کے شاگرد ہوئے لیکن حال یہ تھا کہ مصرعے موزوں بھی نہ تھے۔ مولانا مدظلہٗ نے چند ہدایتیں کیں اور پھر تو ایک ہفتے بعد آپ پردۂ الہام

جنوں پرست ہے اور اس کے باوجود اس کا مطمحِ نظر کس قدر بلند ہے۔ اُردو کے مطالعے کے متعلق امید ہے آپ ہدایات سے مستفید فرمائیں گے۔ اور یہ بھی اُمید ہے کہ میرے اغراض و مقاصد جنکا میں نے ذکر کیا ہے آپ تک ہی محدود رہیں گے۔ یہ عبارت واقعی اس وقت بے ربط ہے لیکن آپ انسانی جذبات کی طغیانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے امید ہے معاف فرمائیں گے۔

والسلام۔ نیاز مند محمد حنیف خمار

اُن کا دل جذباتِ حسن و عشق اور محبت کے غیر فانی اثرات سے پُر تھا مرحوم کی موت میں اس چیز کے اثرات بھی شریک تھے فرض شناسی اور اپنے سے متعلق لوگوں کا مرحوم کو بہت خیال رہتا تھا۔ چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت اور اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت کو حاصلِ زندگی سمجھتے تھے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ دنیا نے اُنھیں چین نہ لینے دیا اور یہ ہونہار پودا بہت جلد کمھلا گیا۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ مرحوم کے افسانے کس کے پاس ہیں۔ مرحوم نے اپنا کچھ کلام اپنے مرنے سے کچھ عرصہ قبل مولانا سیماب مدظلہٗ کی خدمت میں بغرضِ اصلاح بھیجا تھا۔ وہ میرے پاس محفوظ ہے انشاءاللہ بہت جلد اُسے کتابی صورت میں پیش کروں گا۔

نمونۂ تغزل

تو اور چارہ سازیٔ اہلِ وفا درست! اب ہم کو تجھ سے شکوۂ بے جا نہ چاہیے
شاید کہ غم کشانِ محبت کو ہو سرور ساغر میں عکسِ چہرۂ جانانہ چاہیے

کوئی مرا رازدار کیوں ہو، کوئی مرا غمگسار کیوں ہو
خانہ سوزِ شامِ غم پر کوئی مرے اشکبار کیوں ہو
خلش سے محرومِ خواب کیوں ہو، نظر کوئی اشکبار کیوں ہو
طویل راتوں کی خامشی میں کسی کا دل سوگوار کیوں ہو
حجابِ عریاں کی کشمکش سے جمالِ رنگیں کی تابشوں سے
خیال میں چھپ کے رہنے والے مری نگہ شعلہ بار کیوں ہو
نہ میرا دل پردہ دارِ وحشت، نہ تیری آنکھیں امینِ محشر
سکوت غمازِ دردِ دل ہے نگہ تری رازدار کیوں ہو
نظر کی ہلکی سی تلملاہٹ، نشانِ بیتابیٔ جگر ہے
تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی بتا تو دو بیقرار کیوں ہو

نمونۂ نظم

دہقانی لڑکی

جو سی فردوس لیے منی ہے اگر صحرا میں ہے بادۂ رنگیں نقابِ ساغرِ سادہ میں ہے
نکہتِ گلگوں ہے کنجِ گل سے نکلی ہو ابھی تتلیوں کے رقص میں ہے محوِ رنگیں تیتری
ہمنشیں ابر ہے صحرائے وحشت کوش ہے حسنِ بے پردہ سراپا محشرِ خاموش ہے
ایک بھولا پن ہے، سر سے پاؤں تک چھایا ہوا صبح رنگیں چہرے کو بڑھ کر چوم لیتی ہے فضا
سادگی سے زلف بکھری ہے جبینِ صاف پر سر پہ آنچل بھی نہیں اُف کس قدر ہے بیخبر
حسنِ رنگیں کو تو ہے ہنگامہ آرائی پسند حسنِ دہقانی کو ہے دنیا میں تنہائی پسند
زینتِ محفل بھی ہے ہنگامۂ محفل بھی ہے حسن آبادی میں وقفِ عشقِ لاحاصل بھی ہے
یہ مگر وہ پھول ہے کھلتا ہے جو ویرانے میں خاک ہو کر پھر چلا جاتا ہے خلوت خانے میں
نکہتِ بے سود ہے یا دامنِ کہسار میں لمعۂ مہتاب ہے سنسان سبزہ زار میں
یہ تو کہہ سکتا نہیں احساسِ رعنائی نہیں ہاں قتیلِ لذتِ ذوقِ خود آرائی نہیں
شوخیاں سینے میں بھی ہیں ہر چند خوابیدہ سی ہیں بجلیاں چتون میں ہیں گو لاکھ دزدیدہ سی ہیں
میری چشمِ شوق سے اس کو پشیمانی بھی ہے شرم میں ڈوبی ہوئی گلرنگ پیشانی بھی ہے
کچھ شناسائی ادائے سادہ میں مضمر بھی ہے مسکراہٹ بے سبب وجہ ہونٹوں پہ بھی ہے
مضطرب کر دے نہ اندازِ شباب اس حور کو آگ لگ جائے نہ ان شعلوں سے برقِ طور کو

جانیؔ ۱۱۰ سیٹھ جان محمد صاحب مرحوم کوچین

آپ کا نام سیٹھ جان محمد اور جانیؔ تخلص تھا۔ والد محترم کا نام سیٹھ اسمٰعیل تھا۔ ۱۲۹۴ھ میں شہر کوچین میں پیدا ہوئے۔ جانیؔ مرحوم میمن قوم کے ذی علم۔ حافظِ قرآن اور خوشگو شاعر تھے۔ مرحوم نے حاجی عبداللہ حاجی آدم سیٹھ مرحوم کے مدرسہ میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم۔ مولوی سید علی موسیٰ رضا صاحب مرحوم اور مولوی رفیع الدین صاحب عرفیؔ ویلوری مرحوم سے حفظِ قرآن پاک اور اُردو فارسی کی تکمیل کی۔ ملکی زبان گجراتی، ملاباری اور انگریزی میں بھی استعدادِ تامّہ رکھتے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اُردو سے دلی لگاؤ تھا اس لئے جذبات نے شعریت کا جامہ اختیار کیا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے وارفتہ کردیا اور "نعت" میں آپ اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ ابتدائی زمانہ میں مرحوم نے جناب حسینا ویلوری مرحوم، جناب عرفیؔ ویلوری مرحوم اور جناب منعم مدراسی سے اصلاح لی تھی اور کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کے شاگرد ہوگئے تھے۔ یہ آخری سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا۔ مرحوم کو تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ اپنی عمر میں سینکڑوں تاریخیں لکھیں آخری عمر میں نابینا ہوگئے تھے مگر ذوقِ سخن بینا تھا۔ خود کہتے تھے اور دوسروں سے لکھواکر غزلیں و قطعات بغرضِ اصلاح بھیجا کرتے تھے۔

۸ شوال شب یکشنبہ بعد مغرب ۱۳۵۴ھ مطابق ۴ جنوری ۱۹۳۶ء کو وفات پائی۔ پسماندگان میں ایک بیوی اور دو لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ جنکی شادی ہوچکی ہے۔ جانیؔ مرحوم اپنے استاد محترم پر دل و جان سے فدا تھے۔ مرنے سے کچھ عرصہ قبل مرحوم نے خود اپنی تاریخ وفات لکھی تھی جو درج ذیل ہے۔

من کدامم تا کہ یابم طولِ عمر　　کے چشیدم قطرہ از آبِ بقا

نیست باقی در جہاں جز ذاتِ حق　　کلُّ شیئٍ ہالکٌ اِلّا خدا

بر لبِ بامم آمدہ مہرِ حیات　　عنقریب آید بہ تعرفنا

من گنہ گارم ندارم زادِ راہ　　دستگیرم شافعِ روزِ جزا

از مجانم زِ سالِ رحلتم　　گر کسے پرسد ز تو بادِ صبا

از سرِ باقی بگو تاریخ فوت

جانیؔ ہے ہے کرد ازیں دنیا قضا

نمونۂ تغزل

وردِ ہر روز و شبا نیم رسولِ مدنی　　غیر زیں ورد ندانیم رسولِ مدنی

ما غلامانِ ترا فخر نہ باشد بر ایں　　کہ فلاں ابن فلانیم رسولِ مدنی

صرف کردیم ہمہ عمر بہ افعالِ قبیح　　اندریں غم بہ فغانیم رسولِ مدنی

چشم داریم بہ طیبہ بہ رویم از اینجا　　مدح بر روضہ بخوانیم رسولِ مدنی

تا زمانیکہ حیاتست دریں دارِ فنا　　عافیت باد بجانیم رسولِ مدنی

شرِ شیطاں بہ رمِ نزع بنا شد رہزن　　نہ رسد ہیچ زیانیم رسولِ مدنی

چوں کند روح حزیں ایں تنِ خاکی پرواز　　باد جاری بہ زبانیم رسولِ مدنی

بعد مردن چو کفن پوش رویم اندر گور　　باد قرآں بہ قرانیم رسولِ مدنی

ملتجی ایم بافضالِ خداوندِ جہاں　　عیش بادا بہ جنانیم رسولِ مدنی

عرضِ جانیؔ ست کہ بر دشمن حاسد حاصل

فتح باشد بہ جہانیم رسولِ مدنی

بشر

غلام حسین بی اے۔ امرتسری مرحوم

۱۱۱

غلام حسین نام اور بشر تخلص تھا۔ مرحوم امرتسر کے رہنے والے تھے۔ ایک تہذیب یافتہ اور اتقا پسند خاندان کے فرد تھے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر ہی میں حاصل کی اور وہیں سے بی اے پاس کیا۔ تعلیمی ماحول سے نکلنے کے بعد بمقتضائے طبیعت ادبی مشاغل اختیار کر لیے۔ ۱۹۲۵ء میں امرتسر سے کئی ادبی پرچے شائع ہوتے تھے۔ مرحوم ان میں بطور مدیر معاون کام کرتے تھے۔

بشر مرحوم مرنجان ومرنج نوجوان تھے۔ طبیعت نہایت سنجیدہ اور خاموش پائی تھی۔ جذبات محبت سے ان کا سینہ گرم تھا۔ انہیں جذبات نے انہیں شاعری سکھائی۔ مرحوم کی موت یکایک واقع ہوئی جس میں ان کے جذبات بے پایاں کو بہت زیادہ دخل تھا۔ جس وقت اس نوجوان کی موت واقع ہوئی تمام امرتسر میں ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ گو مرحوم گوشہ نشیں تھے لیکن ان کے اخلاق وعادات کی وجہ سے ان کا دائرۂ احباب بہت وسیع تھا۔

۱۹۲۴ء میں اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں مرحوم کو رہنے کی بہت آرزو تھی جب اُن کے ماحول نے انہیں امرتسر سے نہ نکلنے دیا تو امرتسر ہی میں اپنے استاد محترم کو بلایا اور ہندو سبھا کالج میں ۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو ایک زبردست مشاعرہ منعقد کیا جس کے پوسٹر وغیرہ انہیں کی طرف سے شائع ہوئے۔ بشر مرحوم بزم سخن ہندو سبھا کالج اردو کے سکریٹری بھی تھے۔

اُن کا کلام رسائل اور اخبارات میں بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنے نام کے ساتھ "بشر سیمابی" ضرور لکھتے تھے۔ افسوس کہ مرحوم کے اس سے زیادہ حالات باوجود کوشش بھی مجھے نہ مل سکے۔ غالباً ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۸ء میں بعمر نوجوانی آپ کا انتقال ہوا ہے۔

نمونۂ تغزل

میں سراپا ہوں خموشی، اور سراپا شاد بھی ہوں — خود ہی مقتول بھی ہوں آپ ہی جلاد بھی ہوں

قیدیِ زلف بھی ہوں پیکرِ آزاد بھی ہوں — گل و گلزار بھی ہوں، بلبل و صیاد بھی ہوں

میں سراسر ہوں وہی جس کی تمنا ہے مجھے — رنگ تصویر بھی ہوں، مانی و بہزاد بھی ہوں

میری ہی نور سے ہے باغِ جہاں میں رونق — خود اندھیروں میں یہاں مائلِ فریاد بھی ہوں

کس کی طاقت ہے جو دے کفر کا فتویٰ مجھ کو — میں ہی موجود بھی ہوں باعثِ ایجاد بھی ہوں

اے بشر کوئی حقیقت کو نہ میری پہنچا
ماہ و خورشید بھی ہوں، ذرۂ برباد بھی ہوں

نمونۂ نظم

نمازِ بتکدہ

(۱)

صنم کدہ ہے دل تیرا — بنے ہوئے ہیں بت خدا

جو دل صنم سے ہے جدا — چراغ ہے بجھا ہوا

حقیقتیں ہوں تجھ پہ وا — اگر ہو جذبِ مدعا

تری نظر میں ہے خدا — جو آئے تجھ کو دیکھنا

جو جا ہے روح کی بقا — تو ہو ضمیر آشنا

نہ تیرا سجدۂ ریا — نہیں نشانِ حق نما

خیالِ زہد و اِتقا غلط ہے ایک راستہ
سُن آ رہی قلب سے صدا بہوش باش زاہدا!

تو پڑھ نمازِ بتکدہ

(۲)

جبین کو سجدہ زار کر نظر کو شعلہ بار کر
جگر کو بیقرار کر رہینِ اضطرار کر
نگہ کو ہوشیار کر طلب کو خوشگوار کر
نیاز اختیار کر خلوص استوار کر
حصولِ انکسار کر یقین پائیدار کر
بتوں سے دل فگار کر بتوں پہ جاں نثار کر
بتوں کیساتھ پیار کر بتوں پہ انحصار کر
خودی کو اپنی مار کر لباسِ زہد اُتار کر

تو پڑھ نمازِ بتکدہ

(۳)

صنم کدے کا ہو مکیں بتوں پہ دل میں رکھ یقیں
پسند کر بتوں کا دیں یہ ہے طریقِ بہتریں
ہے بت فلک ہے بت زمیں ہے کون شے جو بت نہیں؟
جہاں ہیں بت خدا وہیں وہی ہے حُسن آفریں
یہ ان کی شکل مرمریں ہے نورِ ذات کی امیں
تسلیٔ دلِ حزیں حصول اگر نہیں کہیں
تو رکھ دے شوق سے جبیں تو پائے بت پہ بالیقیں
کوئی زماں مکاں نہیں ابھی ابھی یہیں یہیں

تو پڑھ نمازِ بتکدہ

(۴)

معابدِ جمال میں مساجدِ جلال میں
سُرور میں ملال میں کمال میں زوال میں
بدن کے بال بال میں جبیں کے خال خال میں
سرودِ پُر شکال میں [illegible] و اشتعال میں
نکاتِ قیل و قال میں رموزِ وجد و حال میں
فراق میں وصال میں تصورِ جمال میں
غرورِ انفعال میں عروج و ابتذال میں
جنوب میں شمال میں غرض ہر ایک حال میں

تو پڑھ نمازِ بتکدہ

ارشاد احمد خاں صاحب نظامی اکبرآبادی مرحوم

۱۱۲

ارشاد احمد خاں نام، ارشاد تخلص، آگرہ کے رہنے والے تھے محلہ توپخانہ میں موروثی مکان ہے۔ آپ کے والد منشی الفت خاں ناظم مرحوم میرے جد مرحوم مولانا محمد حسین نور اللہ مرقدہٗ کے دوست ہموطن، ہم عمر اور معاصر تھے، اجمیر شریف میں دونوں۔ توں ایک جگہ رہے سہے تھے۔ اس لئے قبلہ مولانا مدظلہٗ اور ناظم صاحب کے صاحبزادوں میں بھی ایک قسم کا محبانہ ربط قائم تھا۔ ارشاد صاحب کے بڑے بھائی شفیع احمد خاں شفا مولانا کے شاگرد ہو چکے تھے ارشاد مرحوم غالباً سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا کے شاگرد ہوئے اور پھر اس قدر خلوص بڑھا کہ اس وقت مولانا کے ہمدردوں میں ان سے زیادہ کوئی اور نہ تھا۔

مولانا کے اوقات فرصت انہیں کے پاس صرف ہوتے تھے۔ مرحوم خواجہ حسن نظامی دہلوی کے مرید تھے اور اسی نسبت سے انہوں نے پہلے آگرہ میں "نظامیہ کمیشن ایجنسی" کے نام سے ایک کتب خانہ کھولا اور پھر ٹونڈلہ میں بطور ٹرینس کلرک ملازم ہو گئے پھر انہیں کی جد و جہد اور کوشش تھی کہ آخر مولانا مدظلہٗ کو بھی ٹونڈلہ جیسے گاؤں میں کھینچ لیا

انہیں کے زمانہ مراسم میں مولانا نے سب سے پہلے سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا سے خط و کتابت کر کے مشہور مثنوی "زہر عشق" کو کتب ممنوع الاشاعت کی فہرست سے نکلوا کر آگرہ سے شائع کیا، اس کے بعد اس کی اشاعت تمام ہندوستان میں عام ہو گئی۔

ارشاد مرحوم استاد صاحب کے زمانہ شاگردی سے کے بعد تک زندہ رہے۔ مشاعروں میں غزل پڑھنے کے عادی نہ تھے مگر شعر کہنے کا انہیں بیحد شوق تھا۔

کچھ عرصے کے بعد انہیں ریلوے نے ٹکٹ کلکٹری کا عہدہ دے دیا۔ راتوں کو مسلسل جاگنے کی وجہ سے ان کی تندرستی میں فرق آگیا۔ اور بالآخر مرض دق میں بمقام آگرہ بعمر ۲۶ سالہ سنہ ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا۔

ارشاد مرحوم کو دنیوی امور سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ بزمانہ ملازمت آپ نے "نظامیہ بستی" کے نام سے چند مکانوں کا ایک احاطہ بھی ٹونڈلے میں بنوایا تھا۔ انہیں اپنے استاد کی طرح اپنے مرشد سے بھی بے حد محبت تھی۔ اور وہ انہیں دونوں کو "دین و دنیا" سمجھتے تھے۔

ارشاد مرحوم صاحب تصنیف بھی تھے۔ ان کی کئی کتابیں ان کی زندگی ہی میں چھپ گئی تھیں۔ عرس نامہ۔ نہر عشق۔ عربی لگن۔ عاشقانہ خط و کتابت۔ زندہ بھوت، پرچھم وغیرہ ان کی یادگاریں ہیں۔ اور ان کا غیر مطبوعہ دیوان ان کے برادر محترم جناب شفا اکبرآبادی کے پاس محفوظ ہے۔

ارشاد مرحوم مولانا کے ایسے دوستوں اور شاگردوں میں تھے جن کی یاد مولانا کے دل میں اب تک تازہ ہے۔ اور جن کا وہ اکثر ذکر رنج اور افسوس کیساتھ کیا کرتے ہیں۔

نمونۂ تغزل

عارضی حسن ہر اک پھول کی رعنائی ہے — باغ عالم کی بہاروں پہ نہ اترا اتنا

پھر رہی قبر کا اک گوشۂ تنہائی ہے — زندگی ہے تو فقط چند نفس تک باقی

ٹھوکریں کھائینگی جنگل میں کہاں ان کی قبریں | آہ دنیا جنھیں نازِ مسیحائی ہے
ہیں یہ سب راحت و آرام سنہری ... | ان کا انجام فقط ذلت و رسوائی ہے
چشمِ شبنم سے اسی وقت گرے ... | باغ میں جب کبھی پھولوں کو ہنسی آئی ہے
صرف دنیا کی حد تک ہیں یہ رشتے ناطے | کہ کوئی بھائی کسی کا ہے نہ ماں جائی ہے
رہ گیا عالمِ فانی میں فسانہ باقی | یہ سکندر کا زمانہ ہے نہ دارائی ہے
آج معروف ہے تو کل یہ فنا ہی میں | ان درختوں کی ہزاروں نے ہوا کھائی ہے
فرق آیا نہیں قدرت کی کسی حالت میں | وہی تارے ہیں وہی گنبدِ مینائی ہے
ہاں مگر جو ہوا پیدا، ہوا ناپید ضرور | کون ایسا ہے جسے موت نہیں آئی ہے
پھر وہی بیخودیٔ مرگ وہی بربادی | چار دن کیلئے دنیا کی خود آرائی ہے
خواب ہے پچھلے پہر کا "جسے کہتے ہیں حیات" | اور دنیا کی کشش صبح کی انگڑائی ہے

جبکہ دنیا کی یہ حالت ہے تو میرے اے ارشاد
کس کا سودائی ہے تو کس کا تمنائی ہے

کسی کے عشق کا بیمار ہوں میں | خود اپنی جان سے بیزار ہوں میں
جسے ہی دیکھ کر حیرت میں عالم | اسی کا آئینہ بردار ہوں میں
نہیں اب ضبط کا دل میں ٹھکانا | بہت بے صبر ہوں لاچار ہوں میں
چھپا جو پردۂ خاکی میں جا کر | اسی کا پردۂ اسرار ہوں میں

بتا دو موت کی تدبیر ارشاد
کہ مرنے کیلئے، تیار ہوں میں

نعت

شفیعِ امت بیمار ہو تم | انیسِ بیکس و لاچار ہو تم
تمہیں ہی اختیارِ دین و دنیا | جنابِ احمدِ مختار ہو تم
ہماری قافلے کو کیا ہے کھٹکا | ہماری قافلہ سالار ہو تم
غمِ دنیا و دیں آئے ستانے | ہمیں کیا غم ہے جب غمخوار ہو تم
گنہگاروں کو گویا عید ہے آج | شفاعت کیلئے تیار ہو تم
تمہارے ذکر سے ملتی ہے راحت | کہ تسکینِ دلِ بیمار ہو تم

کہیگا پاؤں پر سر رکھ کے ارشاد
مری آقا مرے سرکار ہو تم

اعجاز حسین صدیقی پرنٹر و پبلشر نے رفاہِ عام پریس آگرہ میں چھپوا کر قصر الادب نائی کی منڈی آگرہ سے شائع کیا